سب رس



جناب محبوب حسین جگر



ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

ادارۂ ادبیاتِ اردو
حیدرآباد

سن اجراء ۱۹۳۸ء — بہ یادگار سید محی الدین قادری زور — فون 310469

ماہنامہ سب رس حیدر آباد

جلد: ۵۸ — جنوری ۱۹۹۶ء — شمارہ: ۱

فی پرچہ	:	۱۰ روپے
زرسالانہ	:	۱۰۰ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۲۵ روپے

مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ	:	۳۵ ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۷ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر: ادارۂ ادبیات اردو

پنجہ گٹہ روڈ، حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۸۲

کمپیوٹر کتابت: شارپ کمپیوٹرس

رمن راج سکسینہ، ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے ایس۔ ایس گرافکس میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

پہلی بات

ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۵ء میں بہ اتفاق آرا جناب محبوب حسین جگر صاحب یک مدیر روزنامہ سیاست۔ حیدرآباد) اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (نائب صدر انجمن ترقی اردو۔ ہند) کو اردو زبان و ادب کی ترقی کے سلسلے ان کی گراں بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے رفیق ادارہ منتخب کیا۔

جناب محبوب حسین جگر ۳۰/ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو عثمان آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں وہ گلبرگہ چلے گئے تھے۔ یہیں سے ں نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات کامیاب کیے۔ پھر حیدرآباد آکر جامعۂ عثمانیہ سے بی۔ اے کیا۔ بعد ازاں سرکاری ملازمت اختیار پولس ایکشن کے بعد ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور جناب عابد علی خاں صاحب کے ساتھ (جو ان کے زمانہ۔ طالب علمی کے ساتھی تھے) اخبار ست سے وابستہ ہوئے۔ اخبار سیاست ۱۵/ اگست ۱۹۴۹ء کو جاری ہوا۔ اخبار سیاست کے علاوہ حیدرآباد کی تمام اہم علمی ادبی سرگرمیوں میں عابد علی خاں صاحب کے رفیق کار رہے۔

جناب محبوب حسین جگر طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر و ادب سے دلچسپی لینے لگے تھے وہ شعر بھی کہتے تھے اور افسانہ نگار کی حیثیت ، اپنا ایک مقام بنایا تھا۔ حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں ان کا بھی حصہ رہا۔ وہ اس کے فعال رکن تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں رآباد میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے انعقاد میں انھوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ کرشن چندر نے "پودے" کے نام سے اس کانفرنس پورتاژ تحریر کیا تھا جس میں جناب محبوب حسین جگر کے کردار کو ہیرو کے طور پر پیش کیا تھا۔ جب وہ بی۔ اے کے طالب علم تھے فبروری ۱۹/ کے رسالہ۔ نگار میں مخدوم محی الدین پر ان کا مضمون شائع ہوا جس کے ذریعے مخدوم شمالی ہندوستان کے ادبی حلقوں میں متعارف ئے۔ مخدوم محی الدین کی شاعری پر اس سے قبل کوئی مضمون شائع نہیں ہوا تھا۔

۱۹۹۳ء میں آرگنائزیشن آف انڈرسٹانڈنگ اینڈ فریٹرنٹی کی جانب سے محبوب حسین جگر صاحب کو اردو جرنلزم کا موقر اوارڈ دیا گیا۔

جگر صاحب ادارہ۔ ادبیات اردو کی سرگرمیوں سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ۲۱/ جولائی ۱۹۱۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ام۔بی۔بی۔ ایس کیا۔ یکل پریکٹس غالباً کبھی نہیں کی کیوں کہ طالب علمی کے دور ہی میں وہ سیاست میں عملی حصہ لینے لگے تھے۔ مخدوم محی الدین کے ساتھ ونسٹ پارٹی سے وابستہ رہے۔ ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ تلنگانہ تحریک اور آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ، بنا پر قید کی سزا بھی بھگتی۔ ۱۹۵۲ء میں اسٹیٹ اسمبلی کی طرف سے راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہوئے۔ کمیونسٹ پارٹی کے رکن اور ریٹری کی حیثیت سے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ سوویت یونین اور یورپ کے کئی ملکوں میں منعقدہ کانفرنسوں اور سیمناروں میں ٹی کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو اردو زبان سے خاص لگاؤ ہے۔ اردو زبان کی بقا اور تحفظ کے لیے وہ مسلسل جدوجہد میں مشغول ہیں۔ ان ں انجمن ترقی اردو (ہند) کے نائب صدر ہیں۔ ریاست آندھرا پردیش کی انجمن ترقی اردو کی رہنمائی بھی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا ن ترقی پسند مصنفین سے بھی گہرا ربط ہے۔ وہ اردو کے اچھے ادیب اور نقاد ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے تین مجموعے "ادبی مطالعے" بی جائزے" اور "ادبی تناظر" شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں بھی ادبی اور سیاسی موضوعات پر ان کی کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ہم ادارہ، ادبیات اردو کے ان دونوں رفقا کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔

مجلس انتظامی ادارہ، ادبیات اردو کے فیصلے کے بموجب ادارے کے ذیلی شعبوں کی تشکیل جدید عمل میں لائی گئی ہے۔ ان شعبوں سے جو اصحاب پہلی بار وابستہ ہوئے ہیں، ہم ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کے تعاون سے ادارے کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔

اردو کے ممتاز ادیب اور افسانہ نگار جناب ممتاز مفتی کی وفات ایک سانحہ عظیم ہے۔ ان کی وفات سے دنیائے ادب میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ اردو زبان کو ممتاز مفتی کی دین نہایت گراں قدر ہے۔

ممتاز مفتی کا پیدائشی نام مفتی ممتاز حسین تھا۔ وہ ۱۱ / ستمبر ۱۹۰۵ء کو بٹالہ (گورداسپور) میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۲۹ء میں بی۔اے۔ کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء تک پیشہ تدریس سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۷ء میں بمبئی آکر فلمی دنیا سے منسلک ہوئے اور سلور فلمز کے لیے "رضیہ سلطانہ" کی کہانی لکھی۔ یہ فلم فسادات کی نذر ہو گئی۔ اسی سال وہ لاہور واپس ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں پی۔ سی۔ آر۔ سی پاکستان ایر فورس میں بحیثیت سائیکالوجسٹ کام کیا۔ ۱۹۵۰ء میں ریڈیو سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں حکومت پاکستان کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۶۶ء میں وظیفے پر سبک دوش ہوئے۔

ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا پھر افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ ان کا پہلا افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" ادبی دنیا لاہور ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ ممتاز مفتی حلقہ ارباب ذوق کی تحریک سے متاثر تھے۔ انھوں نے نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ تحلیل نفسی سے کام لیتے ہوئے متعدد کہانیاں لکھیں اور نفسیاتی حقیقت نگاری کو فروغ دیا۔ گذشتہ برسوں میں وہ تصوف سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ بعض کہانیوں میں تصوف کی مابعد الطبیعات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ "دکھیں دکھن" اس طرز کی ایک غیر معمولی کہانی ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانوں کے آٹھ مجموعے: ان کہی۔ گہما گہمی، چپ، اسمارائیں، گڑیا گھر، روغنی پتلے، سے کا بندھن، کہی نہ جائے اور افسانوں کا کلیات "مفتیات" شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ایک ڈراما "نظام سقہ" لکھا تھا۔ جو چھپ چکا ہے۔ ممتاز مفتی کے سوانحی ناول علی پور کا ایلی اور الکھ نگری کا شمار آزادی کے بعد لکھے جانے والے چند اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی کی دیگر تصانیف میں خاکوں کے دو مجموعے پیاز کے چھلکے، اوکھے لوگ، حج کا سفر نامہ "لبیک"، سفرنامہ، ہند "ہند یاترا" قابل ذکر ہیں۔ ممتاز مفتی نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھی تھیں۔ مطبوعہ تصانیف کے علاوہ کئی ریڈیائی ڈرامے، ریڈیائی فیچر، نشری تقریریں، مضامین اور خاکے غیر مطبوعہ ہیں۔ ممتاز مفتی کو حکومت پاکستان نے "ستارہ، امتیاز" کا اعزاز عطا کیا تھا۔

(ادارہ)

o o o

کتاب: "مرزا غالب"

مصنفہ: ڈاکٹر نتالیا پری گارِنا

مترجم: اُسامہ فاروقی

باب ۱۲

ابرِ گُہربار

بادل پھر امنڈ کر آئے ہیں اور انھوں نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا ہے۔ کینہ پرور آسمان پھر ایک بار میری بربادی پر تل گیا ہے۔ پوشکن

اسلامی ممالک میں قدیم سے پیری مریدی کا رواج چلا آرہا تھا۔ ہندوستان کے اسلامی حلقوں میں بھی اس رواج کی پورے اعتقاد کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی۔ سماجی حیثیت کے اعتبار سے پیر اپنے مرید سے نسبتاً کم رتبہ ہو سکتا تھا، تاہم مرید کی نظروں میں پیر کی روحانی وقعت ہمیشہ اونچی ہوتی تھی۔ صوفی سلسلوں اور برادریوں کی بنیاد پر شروع ہونے والا پیری مریدی کا رواج اپنے ساتھ معاشرے میں کچھ نئے رشتے بھی لایا۔ ایسے تعلقات اور اختیارات معرض وجود میں آئے جن کا یوں کہنا چاہیے کہ "فہرست مراتب" میں تو کہیں نام و نشان نہیں تھا لیکن جو مسلمانوں کے عرف و عادت (رسوم و رواج) کا ایک جزو بن گئے تھے۔ غالب کے زمانے میں دلی کے سبھی دانش ور رو داروں، بہ شمول بہادر شاہ ظفر کا میلان طبع ایک حد تک، مروجہ اسلامی اصولوں سے آزاد خیالانہ انحراف کی طرف تھا۔ اس کے باوجود مسلمانوں کے مذہبی پیشوا اپنے پیرؤوں کے احوال پر جو کسی کے ساتھ نظر رکھتے تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں غالب دلی میں عام طور سے رائج سنی مسلک کے طرف داروں میں سے قطعاً نہیں تھے اور اسی لیے ہو سکتا ہے کہ لاطائل باتوں اور لامذہبیت کے الزام سے بچنے کے لیے انھوں نے پنے کو شیعہ ظاہر کیا ہے۔ شمالی ہند میں اودھ کا دارالحکومت لکھنو شیعیت کا گڑھ مانا جاتا تھا۔

قید سے چھوٹنے کے بعد غالب، جن کا کوئی ذاتی مکان نہیں تھا، اپنی بیوی اور نوکر چاکر کے ساتھ نصیر الدین کالے میاں صاحب عرف کالے شاہ کے مکان میں آکر رہے تھے۔ غالب کے منہ بولے بیٹے عارف، جو اب شادی شدہ تھے، اور جن کے ہاں پہلونی کے بچے کی پیدائش متوقع تھی، اپنے سسرالی رشتے داروں کے مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

قسمت کی کرنی کہ کالے شاہ صاحب، جنھوں نے غالب اور ان کے کنبے کو اپنے مکان میں رہنے کا ٹھکانا دیا تھا، بہادر شاہ ظفر کے پیر تھے۔

اسیری میں گزارے ہوئے تین منحوس مہینوں کی وجہ سے دلی والوں کی نظروں میں غالب کی نیک نامی کو دھکا لگا تھا۔ میاں کالے صاحب کو احساس تھا کہ غالب کی نیک نامی کو بحال کرنے کا کام بڑی اہمیت رکھتا ہے، چناں چہ اس غرض سے انھوں نے اپنے روحانی اثر و رسوخ کو استعمال کیا اور نتیجتاً بہادر شاہ نے مرزا کو اپنے دربار میں باریاب کیا۔ یہ سچ ہے کہ دربار میں باریابی سے غالب کے ذرائع آمدنی میں کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں ہوا، بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ سماج کی نظروں

میں ان کا وقار ایک حد تک بحال ہوا۔ پہلے کی طرح اب بھی خود بادشاہ نے غالب سے کسی طرح کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں کوئی عجلت نہیں دکھائی۔ غالب کی اہم تصنیفات میں سے ایک، یعنی مثنوی "ابر گہر بار" کی تخلیق کم و بیش اسی زمانے میں ہوئی۔

مثنوی کا آغاز اس خالق کائنات ذات الٰہی کی روایتی حمد و سپاس سے ہوتا ہے جو ان اسلامی نظریات کے مطابق، جنھیں تصوف میں خاص طور سے بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، فن کاروں کے شعور کو ان کی تخلیقات کے خاکے اور ان کے قلم کو طاقت بخش کر خود انھیں فن پاروں کی تخلیق پر راغب کرتا ہے:

سپاسے کزو نامہ نامی شود
سخن در گزارش گرامی شود

اسی شکر سے نامہ نامی بنے
سخن جس سے نامی گرامی بنے

(ترجمہ: مضطر مجاز)

فن پاروں کی تخلیق کے اس تصور کے مطابق شاعری کو حقیقت کا اظہار ہونا چاہیے، اس کے باوجود کہ اس حقیقت کے ادراک کی راہیں، مختلف مذاہب اور عقائد کے مابین فرق کا تو مذکور ہی کیا، ایک ہی مذہب کی حدود میں بھی مختلف ہو سکتی ہیں۔ مختلف مذاہب والے ملک ہندوستان کا باشندہ ہونے کے ناطے غالب ایک سچے فلسفی اور مفکر کی وسیع النظری کے ساتھ ہر راستے سے حق کی تلاش کی اہمیت اور حق کے سبھی متلاشیوں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں:

اگر دیو ساریست بے ہوش و ہنگ
کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ
بہ بت سجدہ زان رو روا داشتہ
کہ بت را خداوند پنداشتہ
دگر خیرہ چشمیست نیر پرست
بہ درد مے از جام اندیشہ مست
بہ مہرش ازان راہ جنبیدہ مہر
کزین روزنش دوست بنمودہ چہر
گرو ہے سراسیمہ در دشت و کوئی
خداوند جوئی و خداوند گوئی
زرسمے کہ خود را برآن بستہ اند
بہ یزدان پرستی میان بستہ اند

اگر کوئی بت گر بہ صد سر خوشی
تراشے جو پتھر سے پیکر کوئی
تو سمجھے وہ بت کو ہے سجدہ روا
کہ بت کو وہ گردانتا ہے خدا
یوں ہی خیرہ چشم ایک نیر پرست
جو ہے جام اندیشہ سے اپنے مست
سوئے مہر ہو کر چلے سوئے دوست
کہ آجائے شاید نظر سوئے دوست
سراسیمہ ہیں سب بہ ہر دشت و کو،
خداوند جوی و خداوند گو!
جو لوگ ایسی رسموں میں ہیں سر بہ سر
ہیں یزداں پرستی پہ باندھے کمر

(ترجمہ: مضطر مجاز)

یہاں غالب وحدت الوجودی نظریہ حیات کی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں جو ان کو مغرب کی فلسفیانہ وجودیت کے قریب لاتا ہے۔ یہ قدرتی طور پر مذہب کے تعلق سے ان کی وسیع النظری اور انفرادیت کا لازمی نتیجہ ہے۔

جہان چیست آئینہ آگہی
فضائے نظرگاہ وجہ الٰہی
زہر ذرہ کارے بہ تنہائیش
نشان بازیابی زیکتائیش

جہاں کیا ہے، آئینہ آگہی
فضائے نظر گاہ وجہ الٰہی
یہ ہر ذرہ کام اس کی تنہائی کا
نشاں پاؤگے اس کی یکتائی کا

اس کے بعد غالب دنیا کے خاتمے، یوم حشر اور یوم الحساب کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ وہ پھر عفو گناہ کے موضوع کی ط
لوٹتے ہیں۔ انسان پر مسرت زندگی گزارنے کا حق دار ہے اور وہی اپنے کیے کا ذمے دار بھی ہے، چاہے وہ ایسا کوئی فعل
کیوں نہ ہو جس پر وہ انصاف کی تلاش میں مجبور ہوا ہو یا پھر یہ انسانی کمزوریوں سے ایک طرح کا سمجھوتہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر
غلطیوں پر ایک بااختیار حاکم یا خود خدا اس کی جتنی مذمت نہیں کرتا اور جتنی سزا اسے نہیں دیتا اس سے کہیں زیادہ وہ
ملامت خود کرتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے گناہوں کی معافی کا خواستگار نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس اپنی ذات سے سر
ہونے والے گناہوں کی چھان بین کو بھی بے سود سمجھتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ خدا نے تعالیٰ کی جانب سے عفو گناہ ہی ا
کے اعمال و افعال کی مناسب سزا ہو سکتی ہے۔

به دوشِ ترازو منه بار من
نسنجیده بگزار کردار من
به کردار سنجی میفزائے رنج
گران باری درد عمرم بسنج
چه پرسی چوآن رنج و درد از تو بود
غمے تازه دربهر نورد از تو بود

ترازو میں اعمال مت رکھ مرے
مجھے بے حساب اے خدا بخش دے
نہ دے رنج مجھ کو تو لے کر حساب
بھلا مت مری زندگی کا حساب
جو تجھ ہی سے ہیں درد و غم تو بھلا
بتا پھر حساب و کتاب اس کا کیا
(ترجمہ: مضطر مجاز)

اور اگر گناہوں کا حساب دینا ہی پڑے، تو مناسب ہو گا کہ خدا نے تعالیٰ پہلے حق بات سن لے، چاہے وہ کتنی ہی کڑو
کیوں نہ ہو۔ شاعر سے بہتر اور کون جانتا ہے کہ فن کاری کی دریافت کی ہوئی حقیقت حکم رانوں کو کم ہی بھاتی ہے۔ خدا عالم
ہے اور بندوں کے دل کی کیفیت اس کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے:

همانا تو دانی که کافر نیم
پرستار خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را به ابر یمنی
نبردم زکس مایه در رہزنی

عیاں ہے یہ تجھ پر میں کافر نہیں
پرستار خورشید و آذر نہیں
نہ مارا کسی کو بہ ابر یمنی
نہ لوٹا کسی کو بہ پئے رہ زنی
(ترجمہ: مضطر مجاز)

یہ سچ ہے کہ مثنوی کے میرا فسانہ کو اپنے ایک گناہ، عرق تاک کے بے جا شوق، کا احساس ہے۔ لیکن شاعر، جس کے
پیچھے مشرق کی کلاسیکی شاعری میں شراب کی قصیدہ خوانی کی طویل شعری روایت ہے، اپنی اس کم زوری کا ذکر اس قوت ا
خوش اسلوبی سے کرتا ہے، کہ کانوں کو ایسا لگتا ہے کہ یہ معذرت میں کہے گئے الفاظ تو کیا، شراب ناب کی شان میں نغمہ ح
ہے:

مگر مے که آتش به گورم ازوست
به ہنگامه پرواز مورم از وست
من اندوه گین و مے اندہ ربائے
چه می کردم اے بندہ پرور خدائے
حساب مے و رامش و رنگ و بوئے
زجمشید و بہرام و پرویز جوئے

مگر یہ کہ مے سے ہوں آتش بہ گور
اسی سے مری چال رفتار مور[1]
میں اندوہ گیں اور مے اندہ ربا
میں کیا کرتا اے بندہ پرور خدا
حساب گل و رامش و جام مے
ہو لینا تجھے تو جم و کے سے لے
(ترجمہ: مضطر مجاز)

۱۔ چیونٹی

واقعی کہاں قدیم ایرانی کے شہنشاہوں کی وہ شان دار بزم ہائے طرب و نشاط، جن کی آئی امنگ کے ساتھ شاہ نامہ فردوسی اور متعدد دیگر تخلیقات میں قصیدہ خوانی کی گئی ہے اور کہاں وہ گناہ، جن کا الزام شاعر پر عائد کیا جاتا ہے۔

نہ از من کہ از تاب مے گہ گہ
بہ دریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

نہ مجھ سے، کہ مے پی کے میں گہ گہ
کیا کرتا تھا اپنا چہرہ سیاہ
(ترجمہ: مضطر مجاز)

جب محفل عیش و نشاط میں، موسیقی، نغمہ سرائی اور شعر خوانی کا لطف اٹھاتے ہوئے مے نوشی کی جاتی ہے تو اسے قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔

نہ رقص پری پیکران بر بساط
نہ غوغائی رامشگران در رباط
شبانگہ بہ مے رہنمونم شدی
سحرگہ طلبگار خونم شدی
تمنائے معشوقہ بادہ نوش
تقاضائے بے ہودہ مے فروش
بہا روز باران و شب ہائے ماہ
کہ بودست بی مے بہ چشمم سیاہ

میسر نہ رقص پری پیکراں
مہیا نہ غوغائے رامش گراں
بنی میری راتوں میں مے کا دیا
سحر گہ طلب کرتا تھا خوں مرا
تمنائے معشوقۂ بادہ نوش
تقاضائے بے ہودۂ مے فروش
کئی روز باراں و شب ہائے ماہ
تھے بن بادہ و جام یک سر سیاہ
(ترجمہ: مضطر مجاز)

لیکن مزاح کا رنگ لیے ہوئے اپنے "گناہوں" کے تذکرے سے اب شاعر اپنے مصائب کی داستان پر آتا ہے۔ اس داستان میں واقعات کے سبھی موڑ ہمارے جانے پہچانے ہیں، اور رسمی اور خیالی باتوں کی جگہ لہجے کے انتہائی خلوص اور میلان طبع کی المناکی سے جھنجھوڑ دینے والے، نفسیاتی اعتبار سے بچے تلے طرز تحریر نے لے لی ہے:

جہان از گل و لالہ پر بوی و رنگ
من و حجرہ و دامنے زیر سنگ
دم عیش جز رقص بسمل نہ بود
باندازہ خواہش دل نہ بود
اگر تافتم رشتہ، گوہر شکست
وگر یافتم بادہ، ساغر شکست
بہ ناسازگاری ز ہمسایگان
بسرمایہ جوی ز بے مایہ گان
سر از منت ناکسان زیر خاک
لب از خاک بوسِ خسان چاک چاک

جہاں پر گل و لالہ و بوئے و رنگ
میں اور حجرہ اور دامنِ زیرِ سنگ
دم عیش جز رقص بسمل نہ تھا
بہ اندازہ خواہش دل نہ تھا
اگر ڈور باٹی تو ٹوٹا گہر
گرا ساغر مے، ملی مے اگر
تھے ہمسائے برگشتہ اور منہ پھلائے
تھا ناداروں کے آگے کاسہ اٹھائے
اٹھاتا رہا منتِ ناکساں
پھٹے لب! زہے خاک بوسِ خساں!
(ترجمہ: مضطر مجاز)

لیکن ایسی ناگوار زندگی گزارنے کے باوجود شاعر اخلاقی اعتبار سے ٹوٹا نہیں، ایسی زندگی بھی اسے دنیا سے برگشتہ نہیں کر پائی۔ اس میں زندگی سے نظریں ملانے کی ہمت ہے اور اس کو پورا یقین ہے کہ بعد از مرگ موعودہ جنت کی کوئی بھی راحت اس دنیا کی تکالیف کا جواز نہیں ہو سکتی۔ حیرت انگیز شاعرانہ کمال کے ساتھ جنت کی خود اپنے دل میں تلاش کے موضوع کو

ف غالب نے ان چار مصرعوں میں ایک دلچسپ صنعت استعمال کی ہے۔ پہلے مصرعے کو تیسرے مصرعے اور دوسرے مصرعے [illegible]

آگے بڑھاتے ہوئے، وہ مضمون کو غیر معمولی مادی خصوصیات عطا کرتے ہیں، گویا کہ اپنے تخلیق کیے ہوئے "جنت بے کیف" کے تصور کو ایک مرئی پیکر میں منتقل کر دیتے ہیں۔ بعد میں بیسویں صدی عیسوی کے شاعر محمد اقبال کے کلام میں یہ موضوع اس جذباتی دعوت میں متبدل ہو جاتا ہے، جو انسان کو جد و جہد اور عمل کی طرف، دنیوی مسرت کے حصول کی طرف اور انسان کی فطری صلاحیتوں کی ترقی اور فروغ کے لیے نئے سماجی حالات کی تشکیل کی طرف راستہ دکھاتی ہے۔

غالبؔ کے اشعار میں ان کی لاجواب ظرافت اور اس طنز کے دل نشیں سر صاف سنائی دیتے ہیں جو جنت کے بارے میں گڑھی ہوئی سبھی لاطائل باتوں اور قصہ کہانیوں کی حقیقت کو آشکار کرتا ہے:

چون آن نامرادی بیاد آیدم
بفردوس ہم دل نیاسایدم
صبوحی خورم گر شرابِ طہور
کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دمِ شب روی ہائے مستانہ کو
بہ ہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دران پاک میخانۂ بے خروش
چہ گنجائی شورش نای و نوش
سیہ مستیِ ابرو باران کجا
خزان چون نہ باشد بہاران کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ
غمِ ہجر و ذوق وصالش کہ چہ

جو واں نامرادی یہ یاد آئے گی
تو اک آنکھ جنت نہ پھر بھائے گی
صبوحی میں حاضر شراب طہور
کہاں زہرہ صبح و جام بلور
نہ راتوں کی سرمستیاں ہی کہیں
نہ رندوں کی خرمستیاں ہی کہیں
وہ جنت کا مے خانۂ بے خروش
نہیں جس میں گنجائشِ نائے ونوش
سیہ مستیِ ابرِ باراں کہاں
خزاں ہی نہیں تو بہاراں کہاں
ملے حور تو کیوں پھر اس کا خیال
غمِ ہجر کوئی نہ ذوقِ وصال
(ترجمہ: مضطر مجاز)

اسلام میں جنت کی وہ روایت، جس کی رو سے زہد و اتقا کا انعام مادی تشفی کی صورت میں قرار پاتا ہے، شاعر کی نظروں میں، جس کو سچی ارضی محبت کا تجربہ تھا اور جس کو اس کی روحانی قدر و قیمت کا ادراک تھا، ایک مضحکہ انگیز افسانے سے زیادہ نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ شاعر کی دلیل خاصی "فطرت پسندانہ" ہے، وہ جنت کی "مادی" راحتوں کے وعدوں کی نکر کی ضرور ہے۔ لیکن شاعری کی دلیل کے پیچھے صوفیوں کے پیش کیے ہوئے "خلد در ذات" کے اس فلسفیانہ نظریے کو تاڑنا مشکل نہیں ہے، جس کی رو سے انسان کی جنت خود اس کی ذات میں مضمر ہوتی ہے۔ یہ بات بھی بہت دل چسپ ہے کہ زبلوتسکی کے الفاظ میں گویا کہ "کائنات کے دو مختلف گوشوں میں" عالمی ادب کے دو صاحبان بصیرت، گوئٹے اور غالب، تقریباً ایک ہی وقت حوران بہشتی کو دیکھتے ہی وجود ارضی کی اہمیت پر اصرار کرتے ہوئے، اپنی نگاہ آسمان سے ہٹا کر زمین پر مرکوز کر دیتے ہیں، گوئٹے "دیوان مشرق و مغرب" میں اور غالب اپنی مثنوی میں:

چہ منت نہد ناشناسا نگار
چہ لذت دہد وصلِ بے انتظار
گریزد دمِ بوسہ اینش کجا
فریبد بسوگند دینش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گوئی
دہد کام و نبود دلش کامجوئی

مزہ دے گا کیا اجنبی اک نگار
کہ ہے بے مزہ وصل بے انتظار
کہ بوسے پہ ظالم گریزاں نہ ہو
قسم جھوٹی کھانے کا امکاں نہ ہو
بجالائے ہر حکم میرا سدا
نہیں تلخ گوئی سے لب آشنا
کرے گی وہ پوری مری آرزو
[illegible] آرزو

نظر بازی و ذوقِ دیدار کو
بفردوس روزن بدیوار کو

نظر بازیوں کا بھی ساماں نہیں
نہ وہ ذوقِ دیدار روئے حسیں
بڑی پختہ دیوار فردوس کی
نہ ہوگا کہیں جس میں روزن کوئی
(ترجمہ: مضطر مجاز)

اور شاعر خدا سے وہ سوال کرتا ہے جو ایک عرصے سے اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا ہے:

بفرمانے کاین داوری چون بود
کہ از جرمِ من حسرت افزون بود

بتا کیا ہے آخر تری داوری
کہ ہے جرم سے بڑھ کے حسرت مری

غالب نے "خلد در ذات" ، خود اپنے "دل خوں شدہ" میں چھپی ہوئی جنت ، کے بارے میں بارہا لکھا ہے۔ اس نظریے کی بھی اسلام میں اتنی ہی قدیم روایت ہے جتنی کہ اسلام پر عقیدہ رکھنے والی اقوام کے فلسفے میں عقلیت پسندانہ رجحانات کی۔ قرونِ مظلمہ میں قدیم یونانی فلسفے کی مشعل کو کامیابی کے ساتھ روشن رکھنے والی ان اقوام کی، انسانیت کے فکرِ فلسفیانہ کے خزانے کو بیش بہا دین سے سبھی واقف ہیں۔ "خلد در ذات" کا تصور، انسان دوستی کے اس جذبے سے مملو ہے، جو انسان کو اپنی صلاحیتوں نیز انفرادی تجربے اور منفرد انسانی زندگی کی اہمیت پر اعتماد پر آمادہ کرتا ہے۔

لیکن، جیسا کہ ان کا خاصہ ہے، غالب زمانہ ماقبل میں کسی کے ذہن میں کوندنے والے خیال کو محض دہراتے نہیں، وہ اس کو آگے بڑھاتے ہیں، اس کو پیکر خیالی کا نیا لباس پہناتے ہیں اور کبھی کبھی تو اس کو مضحک شکل دے کر لغویت کی حد تک پہنچا دیتے ہیں: "میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور، وہی ایک حور۔"

1850ء میں بہادر شاہ کے شخصی معالج اور غالب کی فارسی شاعری کے شیدائی حکیم احسن اللہ خاں کے اصرار پر مرزا کو چھ سو روپے سالانہ تنخواہ پر درباری مورخ کی خدمت کی پیش کش کی گئی۔ غالب کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ شایان شان فارسی میں شاہی خاندان کی تاریخ لکھیں۔ اس طرح سے زندگی میں پہلی بار غالب کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ "پنشن" کے علاوہ بھی کسی مستقل ذریعہ آمدنی کی امید رکھ سکیں۔ طے یہ ہوا کہ تنخواہ چھ ماہ میں ایک بار ملا کرے گی۔ جب بہ حیثیت درباری مورخ ملازمت کے چھ مہینے گذر گئے تو غالب کو فکر ہوئی کہ معاہدے کی شرائط کی پابندی ہوگی یا نہیں۔ بہ صورت دیگر انھوں نے اس کام کو خیرباد کہنے کا تہیہ کر لیا۔

اس خدمت پر تقرر کے ساتھ ساتھ غالب کو نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا سہ منزلہ خطاب بھی عطا ہوا۔

اس کے علاوہ، جیسا کہ حالی بیان کرتے ہیں، انھیں چھ پارچے کا خلعت، مع تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل مروارید کے مرحمت فرمائے گئے۔ اس موقع پر غالب نے ایک لاجواب اردو غزل کہی، جس میں ان واقعات کی آواز بازگشت صاف سنائی دیتی ہے:

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے ؟
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

یہ غزل اتنی واضح ہے کہ کسی خاص تشریح یا تبصرے کی محتاج نہیں ہے۔ وہ رتبے میں "مہر و ماہ" سے بھی اونچے مقام تک پہنچ جانے والے اور شاہی ملازم کے اعلی منصب کے حصول میں بالآخر کامیاب ہوجانے والے شاعر کی ذہنی کیفیت کی خاصی وضاحت کے ساتھ آئینہ دار ہے۔ بلاشبہ شاعر کی انا کو تسکین ملی، لیکن بس ایک حد تک۔ بہرحال اشعار میں خوشی سے باغ باغ ہونے کے کوئی ایسے سر نہیں سنائی دیتے۔ اس کے برعکس اس کبیدہ خاطری کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں، جس کے ساتھ شاعر شکوہ کرتا ہے کہ اس کی قدر کانچ کے ان رنگ برنگے ٹکڑوں سے بھی کہیں کم ہے، جن کو "لعل و زمرد و زر و گوہر" کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں بھی تمام امتحانوں سے گزر جانے والے انسان کے لیے مستقل مزاجی کا مظاہرہ لازمی ہے۔ وہ دنیا میں بہ حیثیت "پیالہ و ساغر" کے نہیں آیا ہے، جس کو ساقی اس وقت تک حلقہ بادہ گساراں میں گردش میں رکھتا ہے، جب تک کہ وہ خالی نہ ہوجائے یا ٹوٹ نہ جائے، وہ غلطی سے دوبار لکھا ہوا "حرف مکرر" نہیں ہے۔ اس کے پاس اپنا مقصد زندگی ہے اور اپنی قسمت ہے، جس کو آزمانا اس کا فرض عین ہے۔

غالب تاریخ نویسی کے کام میں خوشی سے منہمک ہوگئے۔ حقیر کے نام اپنے خط میں وہ اطلاع دیتے ہیں کہ ان کا ارادہ اس تصنیف کو دو حصوں میں مرتب کرنے کا ہے۔ حصہ اول کا نام "مہر نیم روز" ہوگا اور حصہ دوم کا "ماہ نیم ماہ" اور بہ حیثیت مجموعی کتاب "پرتوستان" کہلائے گی۔ قدرتی طور پر جیسا کہ ایک مسلمان شاہی خاندان کی ایک معقول تاریخ کے لیے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تاریخ کی کسی بھی کتاب کے لیے لازمی ہے، اس کتاب کے لیے بھی ضروری تھا کہ اس کا "آغاز" بالکل شروع ہی سے یعنی تخلیق کائنات سے کیا جائے اور اس کے ابتدائی الفاظ ہی میں تخلیق کی غرض و غایت اور اس کی تکمیل کے بارے میں نظریہ پیش کیا جائے، پر عظمت وحدت الوجود کی وہ پوری تصویر کھینچی جائے، جس میں اس مادی دنیا کے مظاہر کی کثرت سے کوئی خلل نہیں پڑتا۔

یہ علمی کاوش آغاز و انجام آفرینش، دونوں ہی کا احاطہ کرنے والی، صرف ایک جملے پر مشتمل، مندرجہ ذیل عبارت سے

شروع ہوتی ہے:

"اگر چرخ گردوں کی مشرق سے مغرب کی طرف تیز رفتار گردش اور دیگر افلاک کی مغرب سے مشرق کی جانب حرکت، اگر محافظ فلک کے عہدے پر فائز کیوان، علوم کی تحصیل میں کامیابی کا ضامن مشتری، لڑائی کے میدان سر کرنے والا مریخ، اپنی ضیا پاشی میں دنیا کا سرتاج سورج، زہرہ جس نے اپنے نغمے سے ہاروت کو فریب دیا، کلمہ حکمت کی صلاحیت رکھنے والا عطارد، رات کے آسمان پر تیز رفتاری سے تیرنے والا چاند، اگر آتش جہاں سوز اور جھونکے لینے والی ہوا، اگر آب رواں اور اپنی جگہ پر برقرار زمین، اگر معدنی اشیا، معدنوں کی خلوت کو خوش گوار بنانے والے الماس و یاقوت، اگر اناج اور پھولوں سے لدے پودے، اور مملکت اشجار کے قوانین کے مطابق بارآور ہونے والی شاخیں، اگر زمین پر گورخر کی چال اور والاگہر بارہ سنگھے کی دوڑ اور فضائے بسیط میں دراج اور کبوتر کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ، اگر بنی نوع انسان کے درمیان گردش کرتا ہوا، پیمانۂ آگہی اور اس وادی رنج و محن میں روزی اور مکان کی تحصیل کے راز کو پانے کا تمسک، اگر ملکوں کی تسخیر اور لشکروں کی پیشوائی کے دعوے دار فاتحین عالم کے قلوب اور فوجی کارناموں کے لیے آمادہ فولاد بدن سورما، اگر نگاہ ناز کے تیروں سے اپنے شکار کے دل و جگر کو نشانہ بنانے والی شوخ و شنگ جفا شیوہ حسینائیں، اگر اپنے شعلۂ آہ سے گنبد گردوں کو زمین کے اوپر تھامے رکھنے والے ستونوں کو جلا کر خاک کرنے کی طاقت رکھنے والے وفا پیشہ، اگر پیالوں کو خم میں ڈبونے والے سیہ مست، اگر سطح آب پر ہلکورے لیتی ہوئی لہروں میں بھی جانماز کا مشاہدہ کرنے والے حق پرست، اگر قبروں کے نہاں خانوں میں گل کر خاک ہوتے ہوئے دل رباؤں کے کاسہ ہائے سر، اگر ان کی تباہ و تاراج املاک جو عظمت کے دعوے دار تھے اور خود چیونٹیوں اور کیڑوں کا لقمہ بن گئے، اگر منتشر اعضا کو دوبارہ یک جا کرنے والی صدائے صور، اور اگر قبروں سے اٹھ کھڑی ہونے والی برہنہ اور سراسیمہ مخلوق، اور باغ میں آگے بھی اور پیچھے بھی ایستادہ درختوں کی مانند مردوں کے اٹھ کھڑے ہو جانے والے جسم، اشجار کے درمیان چڑیوں کی طرح ہر ایک کے دائیں اور بائیں ہر طرف لہراتے ہوئے نامہ ہائے اعمال نیک و بد، اور اگر باغ جنت میں ہر طرف بہتی ہوئی دودھ اور شہد کی نہریں، اور درمیان میں شراب طہور سے لب ریز حوض، اور دل فریبی میں ہوا کے جھونکوں سے ڈولتے ہوئے نازک پودوں کی مانند، ہاتھوں میں ہاتھ دیے شجر طوبیٰ کے زیر سایہ رقص کناں حوران بہشت، اور اگر نے شکر کے جھنڈ میں پہنچ جانے والے طوطوں کی مانند، سعادت کے درجے تک پہنچنے والے اور حوض کوثر کے کنارے ایک ایک گھونٹ سے لطف اندوز ہونے والے صالحین، اور اگر دوزخ اپنی اس آگ کے ساتھ جو سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اور جس کے لیے پوشیدہ و ظاہر ایک ہیں، اور حلقہ ہائے چشم سے دیدوں کو صاف کھا جانے والے اور کلیجے کو آر پار کتر دینے والے سانپ اور اژدہے، اور سوجے ہوئے ہونٹوں سے "یالیتنی کنت ترابا" پکارتے ہوئے لوگوں کے انبوہ اور "خدایا اس جگہ سے نجات دے" پکارتے ہوئے لوگوں کے جم غفیر، اگر وہ جن کا آہ و زاری سے دم گھٹ گیا ہے، اگر کثرت کی یہ سب بہتات وحدت کو نقصان پہنچانے بھی تو اس کے باوجود کوئی شے "اللہ علیٰ کل شیئ محیط" کے دائرے سے باہر نہیں آنے گی، عالم اعیان ثابتہ سے لے کر یوم حشر کے نفخ صور تک وہی ذات واحد ہے اور خود اپنے آپ پر جلوہ گر ہے۔۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر دنیائے "مجازی" کے خاتمے تک کو محیط، وجود کی اس تصویر سے، جس کی صرف ایک نحوی ساخت ہی قاری کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہے، غالب کا تصور تاریخ واضح ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر، تخلیق عالم کے ساتھ ہی تیمور کا معرض وجود میں آنا مقدر ہو چکا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ وسطی ایشیا میں شکست کا سامنا کرنے کے بعد تیمور کے اخلاف ہندوستان آئیں گے اور یہاں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھیں گے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس علمی کاوش کا حصہ اول "مہر نیم روز" تخلیق کائنات سے لے کر بادشاہ ہمایوں تک کے تاریخی عہد کا احاطہ کرے۔ لیکن بہ وقت تخلیق کائنات خالق کائنات نے خاص توجہ ایران، توران، وہاں کے سورماؤں اور بالخصوص افراسیاب اور اس کے اخلاف یعنی

ن خیل افراسیاب کی طرف دی، جس میں خود تاریخ نویس کے خاندان کی جڑیں پیوستہ تھیں تو قدرتی طور پر مغلیہ خاندان کی سرگذشت میں ان تمام تفصیلوں نے بھی اچھی خاصی جگہ گھیر لی جن سے ہم نے اپنی یہ داستان شروع کی تھی۔

ابوالفضل علامی کی تاریخ "اکبر نامہ" بہ طور قابل تقلید نمونہ غالب کے پیش نظر تھی۔ اسی زمانے میں نوجوان صلاحیت فاضل سید احمد خاں (1898 ـ 1817ء) نے، جو مرادآباد میں منصف کے عہدے پر مامور تھے اور مرزا سے عقیدت رکھتے تھے، اپنی علمی کاوش ان کے پاس تقریظ لکھنے کے لیے بھیجی۔ یہ "اکبر نامے" کا وہ حصہ موسوم بہ "آئین اکبری" تھا جو ضروری تصحیح کے بعد انھوں نے اشاعت کے لیے مرتب کیا تھا۔ "آئین اکبری" میں مغل سلطنت کے نظام حکومت کے بارے میں معلومات یک جا کر دی گئی ہیں، ثقافتی زندگی کا تعارف کرایا گیا ہے اور مشہور شعرا کا کلام پیش کیا گیا ہے۔ سید احمد خاں کا کام محض کافی علمی ریاض کا مطالبہ کرنے والا، تاریخ کی ایک کتاب کے تدوین متن کی کاوش ہی نہیں تھا۔ سید احمد خاں جو بعد میں روشن خیال رہ نما اور شمالی ہند کے مسلمانوں کی روشن خیالی سے عبارت علی گڈھ تحریک کے بانی کی حیثیت سے مشہور ہوئے، اس کاوش کا مفہوم ہندوستانی مسلمانوں کی اس وقت کی زندگی میں اصلاح کی خاطر قابل تقلید نمونے کی تلاش میں دیکھتے تھے۔ ایسا نقطہ نظر روایت کے عین مطابق بھی تھا۔ نصب العین کی تلاش میں پیچھے کی طرف دیکھنے کا مطلب ہمیشہ اور ہر حالت میں اس نقطہ آغاز تک پہنچنا ہوتا تھا جہاں مبادیات کی داغ بیل پڑتی ہے اور اس روایتی نظام فکر میں ایسا نقطہ آغاز قرآن ہی ہو سکتا تھا۔

اسلام سے اپنی تہذیبی جڑیں پیوستہ رکھنے والے، عہد جدید کے مفکرین میں سے معدودے چند ہی سماج کی رہ نمائی مستقبل کے آدرشوں کی طرف کرتے ہیں، اسلام کی روایات میں سوچتے وقت رہ رہ کر ماضی پر نظر ڈالنے کی عادت نہ صرف یہ کہ پہلے بلکہ بڑی حد تک اب بھی ہر نقطہ نظر سے ایک فطری بات ہے، دوسرا کوئی چارہ تھا ہی نہیں۔

اس کے باوجود، خود اپنی تاریخی تحقیقات میں منہمک اور بادی النظر میں سبھی روایات کے پابند غالب کا رد عمل بالکل غیر متوقع تھا۔ انھوں نے "آئین اکبری" میں جدید ہندوستانی سماج کی ترقی کے لیے کسی بنے بنائے ضابطہ حیات کو ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کی ہنسی اڑائی۔ غالب نے، جن کو اگلے کئی سال تک کے لیے حال کے تمام امور کی وجہ معقول ماضی میں تلاش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، گویا کہ خود اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے، سید احمد خاں کی کاوش پر اتنی نہیں، جتنی ان کے نظریہ حیات پر سخت تنقید کی۔ سچ بولنے سے نہ ڈرنے والے شخص کی صاف گوئی کے ساتھ وہ مصنف اور اس کی کاوشوں کی جھوٹی منہ تعریف سے بھی احتراز کرتے ہیں، کیوں کہ یہ کاوشیں ان کی رائے میں سید احمد خاں کی "عالی ہمتی کے لیے ننگ و عار" ہیں۔

برچنیں کارے کہ اصلش این بود	کام کی ایسے ہو اب توصیف کیا
آن ستاید کش ریا آئین بود	یعنی توصیف اس کی ہے کار ریا
من کہ آئین ریا را دشمنم	میں کہ اک دشمن ریا کا ہوں سدا
در وفا اندازہ دان خود منم	دین اور آئین ہے میرا وفا
گر بدین کاوش نگویم آفرین	میں اگر کہتا نہیں ہوں آفریں
جانے آن دارد کہ جویم آفرین	مستحق آفریں ہوں بالیقیں

(ترجمہ: مضطر مجاز)

اور آگے وہ انگریزوں کے کارناموں کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں، "تقریظ" کے یہ اشعار ہم غالب کے سفر کلکتہ والے باب میں نقل کر چکے ہیں۔

غالب اپنی "تقریظ"، حیرت میں ڈال دینے والے دانش مندانہ اور الہامی الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔ سید احمد خاں کو۔ ہ

الفاظ خاص طور سے ناگوار لگے تھے ، تاہم اگر غالب سید احمد خاں کی قسمت کا حال بتانے کا بیڑہ اٹھاتے ، تو وہ روشن خیالی کے اس ہندوستانی علم بردار کی ساری الگی زندگی کے سوز و گداز کے اظہار کے لیے شاید ہی ان سے بہتر الفاظ ڈھونڈھ پاتے۔

صنعت و حرفت کے میدان میں ان کے کارہائے نمایاں کے پیش نظر انگریزوں کی مدح سرائی کے بعد غالب پکار اٹھتے ہیں:

پیشِ این آئین کہ دارد روزگار ؟	آئیں جو رکھتا ہے ان کا روزگار
گشتہ آئینِ دگر تقویم پار	اس کے آگے دوسرے ، تقویم پار
ہست ، اے فرزانۂ بیدار مغز	یہ بتا فرزانۂ بیدار مغز
درکتاب اینِ گونہ آئینہائی نغز	ایسے ہیں کیا اس میں آئیں ہائے نغز
چون چنین گنجِ گہر بیند کسے ؟	تو جب ایسے اس میں ہیں گوہر بھرے
خوشہ، زان خرمن چرا چیند کسے ؟	خوشہ اس خرمن سے کوئی کیوں چنے
طرزِ تحریرش اگر گوئی خوش ست	طرزِ تحریر اللہ اللہ خوب ہے
نے فزون از ہرچہ می جوئی خوش ست	غور سے جو کچھ بھی دیکھا خوب ہے
ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است	پھر بھی ہر خوش کے لیے خوش تر بھی ہے
گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است	سر اگر ہے تو وہاں افسر بھی ہے
مردہ پروردن مبارک کار نیست	نا مبارک ، شغل مردہ پروری
خود بگو کان نیز جز گفتار نیست	کچھ نہیں ، یہ ہے فقط گفتار ہی !

(ترجمہ: مضطر مجاز)

قدرتی بات ہے کہ نتیجتاً سید احمد خاں سے غالب کے تعلقات ایک لمبے عرصے کے لیے خراب ہوگئے لیکن اس کے بدلے میں تاریخ ادب کو اپنی نوعیت کی وہ واحد دستاویز ملی، جس کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ روشن خیالی کے اولین علم بردار غالب ہی تھے اور اس تحریک کے ممتاز ترین نمائندے بلاشبہ غالب، ان کے ذاتی اثر اور تاریخی عوامل کے نئے ادراک کے لیے ان کی جدو جہد کے مرہون منت تھے۔

سمجھا جاتا ہے کہ کم و بیش اسی زمانے میں زبان کے تعلق سے غالب کے نقطہ نظر میں تبدیلی آتی ہے ، وہ پھر اردو کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔

یہ کیوں سمجھا جائے کہ "تقریظ" کے نام پر سید احمد خاں کو ملامت کرتے وقت غالب کے پیش نظر کلکتے ہی کے تاثرات تھے اور وہ راست تاثرات نہیں، جو اس عرصے میں وہ دہلی ہی میں انگریزوں سے اپنی ہم سائگی کے سبب قبول کر سکتے تھے ؟ اس دور میں بھی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے انگریزوں سے غالب کے روابط قائم تھے اور ان تمام مایوسیوں کے باوجود، جن کا انھیں سامنا کرنا پڑا وہ ان "مردمان ہشیار" کے کارناموں کے اب بھی معترف تھے۔ بات بہ ظاہر یہ ہے کہ ان روابط کی نوعیت کیا تھی۔ دہلی میں انگریز نوواردوں کی اپنی الگ زندگی تھی اور مسلمان رو داروں اور دہلی کے دانش وروں سے انگریزوں کے تعلقات اپنے ڈھرے پر چل رہے تھے۔ انگریزوں میں بھی بلاشبہ طرح طرح کے لوگ تھے ، لیکن 1840ء کے دہے میں ہندوستانی معاشرے کے سربرآوردہ لوگوں سے ان کے تعلقات میں بعض مخصوص رجحانات ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ مثال کے طور پر انگریزوں کے ملکی باشندوں کے تعلق سے رویے کی زندہ مثال خود وہی ہاکنس تھا، جس نے دلی کا ریذیڈنٹ بننے کے بعد غالب کے پنشن کے دعوے کی حمایت سے انکار کر دیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ عہدہ داروں کی پچھلی پیڑھی کے برخلاف ، نرے دلیان کی طرح اس کا بھی رویہ کچھ دوسرا ہی تھا، جس کا اظہار مغل دربار نیز دہلی کے

معاشرے کے مختلف نمائندوں کے تعلق سے اس کی "بے تکی حرکتوں" کی ایک لمبی فہرست سے ہوتا ہے۔ اسپیر کے الفاظ میں ہاکنس کے طرز عمل کی بنیاد ان تمام روایات پر برطانوی تہذیب کی مکمل برتری تھی، جن کو اس وقت تک اس کے پیش رو برائے نام ہی سہی لیکن تسلیم کرتے آئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستانی عموماً اس لائق نہیں ہیں کہ ان کے تعلق سے کسی طرح کے عزت و احترام کا اظہار کیا جائے، چاہے وہ محض ظاہرداری ہی کے لیے کیوں نہ ہو، چناں چہ وہ آداب مجلس کے تمام ضابطوں کی خلاف ورزی کرتا تھا اور ایک بار تو اس نے ایسی حرکت کرنے کی جرات کی جو اس سے پہلے سننے میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس کا کوئی واقف اس کے پاس آیا۔ چوں کہ وہ "عجوبوں" میں دل چسپی رکھتا تھا، اس نے لال قلعہ اور شاہی محل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ دہلی کے روایتی آداب مجلس کو بالکل خاطر میں نہ لانے کی اس کی عادت کی وجہ سے ہاکنس کو شاہی محل میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے بادشاہ کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اور اس کا دوست گھوڑوں پر سوار قلعے میں داخل ہوگئے اور نہ صرف یہ کہ گھوڑوں سے اترے بغیر اس کی تمام عمارتیں گھوم گھوم کر دیکھیں بلکہ انھوں نے شاہی محل کے اندر بھی چھاپہ مارا اور دیوان عام اور دیوان خاص کے قیمتی سنگ مرمر کے فرش پر بھی اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔ اس بلاشبہ انوکھے واقعے کی وجہ سے عام ناراضگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور اس کی خبر کمپنی کے ارباب حل و عقد تک بھی پہنچی، جنھیں اس دربار سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لینے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی، جس کے نام سے وہ شمالی ہندوستان کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔

تاہم بالعموم انگریز دہلی میں خاصی الگ تھلگ زندگی گزارتے تھے اور عام طور پر ہندوستانیوں سے اتنے قریبی تعلقات نہیں رکھتے تھے کہ موخرالذکر کو ایک تہذیب کی دوسری پر برتری کا قائل کر سکیں۔ مزید برآں دہلی کے ہندوستانی معاشرے کی، روایات سے وفاداری برقرار تھی۔ ہر انحراف رد کر دیا جاتا تھا، جس کے لیے اشتعال علما کے ان فتووں سے ملتا تھا جن میں چال چلن کے قابل اعتراض واقعات کی نشان دہی کی جاتی تھی اور نسبتاً بعد کے زمانے میں بھی یہ صورت حال برقرار تھی۔

مغربی تہذیب اور انگریزوں کے عادات و اطوار کی ظاہری علامات کو اپنانے کی، روشن خیالی کے اولین علم برداروں کی کوششوں کی سخت مخالفت کی جاتی تھی اور ان کا زبانی بھی مذاق اڑایا جاتا تھا اور بہ ذریعہ تحریر بھی۔

جہاں تک انگریزوں کا تعلق ہے تو انھیں نہ تو ہندوستانیوں کے گھروں کے طرز تعمیر کی ایسی خصوصیات کو اپنانے میں کوئی عار تھا، جن سے شدید گرمی میں بھی ٹھنڈک برقرار رہتی ہے اور نہ ہی حقہ نوشی کی عادت اور مشرقی ٹھاٹ باٹ یا بہ الفاظ دیگر نوابوں کے طور طریقے اپنانے میں۔ لیکن بالعموم وہ سبھی انگلستان کے مسلمہ اصولوں کے مطابق جیتے اور چاہے ساری زندگی ہندوستان ہی میں بسر کیوں نہ ہوئی ہو، اپنے اطراف ایک "چھوٹا سا انگلستان" بسائے رکھتے۔ روسی سیاح سلتی کوف لکھتا ہے: "اپنے مفاد کے سنجیدہ کاموں میں حد سے زیادہ مصروف، انگریز ان سب چیزوں کا جن سے ہندوستان کی آب تاب، نفاست اور دل کشی عبارت ہے، بالکل لطف نہیں اٹھاتے۔ ان کے لیے یہ سب پیش پا افتادہ اور معمولی چیزیں ہیں۔ بالعموم وہ ہر اس چیز کو حقیر جانتے ہیں جو ان تصورات سے مختلف ہیں، جن کے وہ عادی ہو چکے ہیں، ہندوستان کے دل فریب سیدھے سادے اور ساتھ ہی ساتھ عجیب وغریب اور پرشوکت قدرتی مناظر فضول ہی ان کے سامنے اپنی رعنائیاں بکھیرتے ہیں: ڈیوڑھی کی جگہ انھیں بس پارک چاہیے۔ اپنی عمارتوں سے ہر اس چیز کو جو ایشیا کی یاد دلائے انگریز دور ہی رکھتے ہیں۔" اس مفہوم میں اس دور کی دہلی میں انگریزوں کے رہن سہن اور زندگی کی وہ متعدد رودادیں جو ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے مورخین نے بڑے چاؤ سے اکٹھا کی ہیں، کافی دل چسپی کی حامل ہیں۔ یہاں ہم اس زمانے کی نوآبادیاتی انتظامیہ کے سربرآوردہ نمائندوں میں سے ایک یعنی سر طامس مٹکاف کے طرز زندگی کی تفصیل نقل کرتے ہیں: "سر طامس پست قد لیکن گٹھے ہوئے جسم والے تھے، ان کے ہاتھ پاؤں چھوٹے اور آنکھیں نیلی تھیں، بال سفید اور چندیا صاف تھی۔ ان کے چہرے

سے اکثر تلون مزاجی ظاہر ہوتی تھی۔ بچپن میں چیچک ہوگئی تھی، جس کے داغوں نے ان کے حلیے پر خراب اثر ڈالا تھا۔ نچلے نہیں بیٹھتے تھے، ان کی آواز کانوں کو خوش گوار لگتی تھی، مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک جنٹل مین تھے۔ اپنی ظاہری شکل اور عادات واطوار کے لحاظ سے وہ حد درجہ نفاست پسند تھے اور ہمیشہ لندن کے ایک اونچے درجے کے ٹیلر ماسٹر کے ہاں سلے ہوئے ملبوس ان کے زیب تن رہتے تھے، جو ان کے لیے سوٹ برابر بھیجتا رہتا تھا۔

صبح پانچ بجے بیدار ہوتے اور گون پہن کر برآمدے میں آجاتے جہاں ان کے لیے "چھوٹا حاضری" یعنی صبح سویرے کا ناشتہ تیار رہتا۔ پھر برآمدے میں چہل قدمی کرتے ہوئے نوکروں کو دن بھر کے لیے ہدایات دیتے۔ سات بجے سے ان کا حوض میں نہانے کا معمول تھا۔۔ کپڑا بدل کر اور خانہ گرجا میں عبادت کر کے ٹھیک آٹھ بجے وہ ناشتے کے لیے برآمد ہوتے۔ تمام امور میں حد درجہ وقت کی پابندی کا لزوم رہتا اور گھر کے تمام کام ایسے ہوتے جیسے گھڑی سامنے رکھ کر کیے جا رہے ہوں۔ ناشتے کے بعد حقہ لایا جاتا اور ان کی آرام کرسی کے سامنے ایک عمدہ قالین پر رکھا جاتا، جو ان کی جان پہچان کی انگریز میم صاحبوں نے انھیں تحفے میں دیا تھا۔ حقے کی نیک ڈھلی ہوئی چاندی کی تھی جس کا قطر تقریباً اٹھارہ انچ تھا اور حقے کی نلکی، جو خوش بودار تمباکو کے قوام کے دھویں کے کش لینے کے کام آتی تھی چھ سے آٹھ فٹ لمبی ہوتی، جس کے سرے پر نہایت نفیس چاندی کے کام کی منہ نال ہوتی۔ ایک میز پر عام طور سے ٹھنڈے پانی کی ایک قاب رکھی رہتی اور سر طامس اس میں منہ نال کو ڈباتے، اس ڈر سے کہ کہیں اس میں کیڑے مکوڑے نہ گھس گئے ہوں۔ حقہ پی چکتے تو وہ عموماً اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں جاتے اور خطوط لکھتے، جب تک کہ ٹھیک دس بجے گھر کی برساتی کے سامنے ان کی بگھی آکر کھڑی نہ ہو جاتی۔ وہ نوکروں کی قطار کے سامنے سے گزرتے ہوئے بگھی کی طرف جاتے۔ نوکروں میں سے ہر ایک ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی چیز تھامے رہتا: ایک ان کی ہیٹ، تو دوسرا ان کے دستانے، تیسرا ان کا رومال تو چوتھا سنہری دستے والی چھڑی اور پانچواں سرکاری کاغذات والا بستہ لیے کھڑا رہتا۔ وہ بگھی میں بیٹھ جاتے، ان کا جمعدار گاڑی بان کے برابر اپنی نشست سنبھالتا اور بگھی، جس کے پیچھے کے تختوں پر دو سائیس کھڑے رہتے، روانہ ہو جاتی۔۔

طامس مٹکاف ان لوگوں میں سے تھے جو دوسروں کے ذوقِ حیات کی بھی قدر کرنا جانتے تھے۔ ان کے دلی کے دانش وروں اور درباری حلقوں سے گہرے روابط تھے۔ غالب ان کا اپنے قریبی واقفوں میں شمار کرتے تھے۔ بہ قول اسپیر ہندوستانیوں اور انگریزوں میں روابط یا تو بالکل بلندی پر قائم ہوتے تھے یا پھر سب سے نیچی سطح پر۔ سرمایہ دارانہ اور متاخر جاگیر دارانہ نظریوں کے بیچ کی کھائی اب بھی برقرار تھی۔ لیکن وقت گزر رہا تھا اور صورت حال میں، بہت آہستہ ہی سہی، لیکن تبدیلی آ رہی تھی۔ لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ دلی والے انگریزوں کے طرزِ زندگی کے مقابلے میں کہیں زیادہ چستی سے مغرب کے خیالات کا اثر قبول کر رہے تھے۔ خیالات کا باہمی عمل لوگوں کے باہمی روابط سے زیادہ موثر ثابت ہو رہا تھا۔ نئے خیالات کی ترسیل میں سب سے اہم کردار دلی کالج اور وہ بھی اس کے مغربی نہیں بلکہ مشرقی شعبے کا تھا۔

آگے چل کر وہ بھی وقت آنے گا کہ دلی کالج کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے ایک، یعنی نذیر احمد "ابن الوقت" نام کا ایک تیکھا صحافیانہ ناول لکھیں گے۔ ناول کو عنوان اس کے ہیرو کے نام پر دیا گیا ہے، جس کے دو مختلف مفہوم ہیں: فرزند دوراں اور زمانہ ساز۔ ناول کے ہیرو کے روپ میں نذیر احمد مغربی اور مشرقی نظام تعلیم کے امتزاج سے پیدا ہونے والے ان تضادات کو پیش کریں گے جو روایات کے پابند معاشرے کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کو اپنانے کا راستہ اختیار کرنے والے اولین مسلمانوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنائیں گے، ان پر خود انحصاری کے فقدان اور زمانہ سازی کا الزام لگائیں گے۔ وہ صورت حال، جس کی نذیر احمد نے نشان دہی کی حد درجہ پیچیدہ تاریخی عمل، دو عظیم تہذیبوں کے ثقافتی ارتباط کا صرف ایک رخ ہے، ان مختلف نقاط میں سے ایک ہے جن پر مغرب اور مشرق کا اتصال ہوتا ہے۔ مشرق و مغرب کے مابین مکالمے کی ایسی کوششیں بے شمار ہوں گی۔ مذہب کو برقرار رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے، بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا، کہ اس

میں مداخلت نہ کرتے ہوئے، روشن خیالی کے اولین علم بردار، مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر نئی، مغربی طرز کی تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت پر زور دیں گے۔ عوامی حفظانِ صحت کی فوری ضرورت ذہن نشین کرائیں گے اور دعوت دیں گے کہ دونوں تہذیبیں اپنی اپنی خوبیوں کے تبادلہ باہمی سے ایک دوسرے کو مالا مال کر دیں اور مسلمانوں کی تحریک روشن خیالی کے اولین علم برداروں میں سے ایک پانی پت کے متوطن، متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے منکسر المزاج پڑھے لکھے آدمی، غالب کے دہی دوست اور شیدائی الطاف حسین حالی (1837-1914) ہوں گے، جن کی "یادگار غالب" کے حوالے ہم اس کتاب میں اتنی کثرت سے دیتے آئے ہیں۔

اسی بیچ میں، دہلی میں انگریزوں کی زندگی کے پڑوس ہی میں، لیکن اس سے کسی طرح بھی متقاطع ہوئے بغیر، مغل دربار کے وہ معمولات بھی اپنے ڈھرے پر چل رہے تھے، جن میں اب غالب کو بھی بہ حیثیت نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ پوری تن دہی سے اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اسپیر بیان کرتا ہے "آخری مغل بادشاہ آداب و رسوم کی، جہاں تک ہو سکے، جوش و خروش سے پابندی کرتے تھے۔ مختصر اور ہاتھی دانت پر بنی ہوئی اس زمانے کی تصویروں سے سڑکوں پر نکلنے والے ان دھوم دھام کے جلوسوں کا نقشہ ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے، جن سے مذہبی تقریبوں اور شاہی گھرانے کی شادیوں کے موقعوں پر دربار اپنا جی بہلاتا تھا۔ ان مذہبی یا دیگر تقاریب کے موقع پر بادشاہ یا ان کا کوئی نمائندہ جامع مسجد میں ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ بادشاہ سلامت ہاتھی پر سوار ہوتے، ان کے پیچھے کی نشست پر ولی عہد یا امرا میں سے اور کوئی بیٹھا ہوتا۔ جلوس کے آگے آگے نفیری نواز اور نقارچی ہوتے۔ بادشاہ کے جلو میں آگے پیچھے گھوڑسوار اور پیدل پہرے کے سپاہیوں کا جم غفیر ہوتا۔ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا: جانوروں کا شوخ رنگوں میں رنگا ہوا سازو سامان، جواہرات سے جگمگاتا ہوا امرا کا لباس، سپاہیوں کی وردیوں کا ارغوانی رنگ تماشائیوں اور خود جلوس میں شامل لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتا۔ شاہی محل کے اندر دربار منعقد ہوتے۔ یہ دربار کسی معینہ نظام الاوقات کے مطابق نہیں بلکہ تقریبات یا کسی اعلیٰ انگریز عہدہ دار کی ملاقات کی غرض سے آمد کے موقع پر بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کیے جاتے۔ عمل درآمد بالکل وہی تھا جیسا کہ اورنگ زیب کے زمانے میں، فرق بس اتنا تھا کہ ٹھاٹ باٹ اور دربار کے شرکا کی تعداد میں کمی آگئی تھی۔ سر جھکائے کھڑے ہوئے درباریوں کی قطاریں، تحائف کی پیش کشی، باہمی تعظیم و تکریم، سرکاری بات چیت، پر تکلف ورود و رخصت، سبھی کچھ قدیم دستور کے مطابق ہوتا تھا۔ ... اگلے زمانے کے تحفوں کا شاہانہ کر و فر اب ایک حد تک روبہ تنزل ہو کر سونے کی مہروں کی پیش کشی میں تبدیل ہو گیا تھا، حد درجہ نازک کام کے ململ کی خلعتوں کی جگہ نوٹنکیوں میں استعمال کے لائق بھدے اور بھڑکیلے لباس نے اور جواہرات کی جگہ رنگ برنگے شیشے کے ٹکڑوں اور پوت نے لے لی تھی۔ دیوان عام کے سامنے سے کسی زمانے میں گزرنے والے ہاتھیوں اور گھوڑوں کے جلوس کی جگہ ایک عدد گھوڑے، اونٹ یا گینڈے جیسے کسی عجوبے نے لے لی تھی۔ بادشاہوں کی طرف سے معزز مہمانوں کو عطا کیے جانے والے عمدہ نسل کے شان دار گھوڑوں کی جگہ ان بوڑھے مریل ٹٹوؤں نے لے لی تھی جن کو اس اعزاز کے مستحق انگریز ملاقاتیوں کے سامنے کئی بار پھرایا جاتا تھا اور دربار کے برخاست ہوتے ہی ان کو لوٹنے چھوٹے اصطبل میں واپس پہنچا دیا جاتا تھا۔ ماضی کے نقطہ نظر سے یہ انحطاط کی محض ایک شہادت تھی، لیکن ہندوستانی ہم عصروں کی نظر میں اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے تماشا برا قطعاً نہیں تھا آخر کار یہ کچھ بھی نہیں سے تو بہتر تھا اور اس سے گزشتہ نام وری کی کچھ تو تلافی ہو جاتی تھی۔"

اب قلعے کے مشاعروں میں شرکت بھی غالب کے فرائض منصبی میں داخل تھی۔ ان کے بعض خطوط کے لہجے کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان کے لیے، کچھ سال پہلے کی طرح، باعث مسرت ہونے سے زیادہ باعث زحمت تھا۔

غالب اپنے دوست میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں: "یہ بات نزدیکوں کے واسطے باعث مسرت اور دور والوں کے لیے یک گونہ بشارت ہے کہ بادشاہ سپہر جاہ نے فرمان جاری کیا اور ناظر بارگاہ نے سخن وروں کو ایوان نظارت میں اس امر کی اطلاع

دی کہ جمعہ کے دن، ماہ فروری کی پچیس تاریخ کو اس خجستہ نشیمن میں آئیں اور جام سخن سے ایک دوسرے کے ساتھ بادہ پیمائی کریں۔ شہزادگان باہر کی ایک جماعت اور آزادگان شہر میں سے کچھ اشخاص جمع ہوئے۔ سب سے پہلے سلطان الشعرا شیخ ابراہیم ذوق نے حضرت والا کی غزل اس خوش الحانی کے ساتھ پڑھی کہ زہرا، جو مغنیہ فلک ہے، آسمان سے نیچے اتر آئی۔ بعد ازاں شہزادہ یوسف دیدار، ہمایوں آثار، مرزا خضر سلطان بہادر نے اس طرح تازہ میں اپنی غزل پیش کی، گویا اپنے اشعار گوہر نثار کی صورت میں بساط بزم پر ستاروں کی بارش کر دی۔ اس کے بعد مرزا حیدر شکوہ، مرزا نورالدین اور مرزا عالی بخت نے کہ عالی تخلص کرتے ہیں، ساز سخن چھیڑا اور نغمات شعر کو بلند آہنگ کیا۔ غالب آشفتہ نوا نے کہ مرزا عالی بخت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اپنی طرف سے دس شعر اس بزم سخن میں پیش کیے۔ محوی نام ایک امردنے کہ خم کدہ صہبائی کے مے نوشوں میں ہے اپنی صدا نے طفلانہ کے ساتھ اہل محفل کو متوجہ کیا۔ مرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعروں پر مشتمل، اپنی غزل طرح میں پڑھی اور سامعہ اہل انجمن کو اپنا یہ شاعرانہ تحفہ پیش کیا۔ میں آب گزاری کا بہانہ کرکے، محفل سخن سے باہر آیا اور اپنے غم کدے کی راہ لی۔ دکانوں کے در کھلے ہوئے تھے اور چراغ روشن تھے۔ ابھی یہ کہیے نصف شب کا وقت نہیں گزرا تھا، میں نے بوریا نے بے ریائی پر اپنی محفل سجائی، دو چار جام چلے اور بادہ ناب کی جرعہ کشی کی۔ بعد صبح پھر ارک ہمایونی (لال قلعے) میں گیا۔ چاروں مغل شہزادوں نے، جن کا نام اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے، زمزمہ شبانہ کو تازہ کیا۔ میں نے بھی دوبارہ غزل پڑھی۔" ترجمہ: (ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

رفتہ رفتہ اس طرح کے مشاغل اور محل کی دوسری تفریحیں شاعر کے لیے دو بھر ہو گئیں۔ مزید برآں غالب کو اندازہ ہونے لگا کہ وہ اونچا سننے لگے ہیں۔ ہر حقیر کے نام اپنے خطوط میں سے ایک میں وہ کئی دن تک جاری رہنے والے پتنگ بازی کے مقابلوں، درباروں اور نئے جھگڑوں کا ذکر کرتے ہیں اور افسردگی کے ساتھ لکھتے ہیں: "خلاصہ یہ کہ صبح کو جاتا ہوں، دوپہر کو آتا ہوں، کھانا کھا کر پانچ چار گھڑی دم لے کر جاتا ہوں۔ چراغ جلے آتا ہوں۔ بھائی، تمھارے سر کی قسم! رات کو مزدوروں کی طرح تھک کر پڑ رہتا ہوں۔"

1852ء میں منہ بولے بیٹے عارف کی موت کا سخت صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ عارف کی بیوی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ اور اب باپ کے انتقال کے بعد ان کی نشانی دو یتیم و یسیر بچے رہ گئے تھے، جن میں سے ایک لڑکا پانچ سال کا تھا اور دوسرا دو سال کا۔ غالب نے عارف کے غم میں ایک غزل بہ طور نوحے کے لکھی:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد وستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

غالب نے چھوٹے لڑکے اور کچھ عرصے کے بعد بڑے لڑکے کی بھی سرپرستی کی ذمہ داری اپنے سر لی۔

اس سے ذرا پہلے مشہور شاعر اور غالب کے دوست مومن کا انتقال ہوا۔ مومن خاں غالب کے ماحول کے زیادہ تر شاعروں کی طرح، مذہبی آدمی تھے، لیکن ان کے مذہبی خیالات میں اس اسلامی وطن دوستی کا امتزاج تھا، جو اس زمانے میں فکر اسلامی کے اس اہم اصلاحی اور مخالف انگریز رجحان کی شکل میں سامنے آئی تھی، جس کو عرف عام میں وہابی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کہ غالب کے ایک اور قریبی دوست فضل حق اس رجحان کو سخت مذہبی گمراہی سمجھتے تھے اور کسی زمانے میں انھوں نے دباؤ ڈال کر غالب سے مخالف وہابی میلان رکھنے والی ایک مثنوی بھی لکھوائی تھی، غالب مانتے تھے

ان کے دوستوں کو اپنے ذاتی عقائد پر قائم رہنے کا پورا حق ہے۔ شعر و شاعری کے معاملے میں نازک مزاجی سے دست بردار نا ان کے بس میں نہیں تھا اس لیے غالب اس امر کو چھپاتے نہیں تھے کہ ان کے خیال میں مومن ایک ایسے اوسط ‌ہے کے شاعر ہیں جن کے پاس کبھی کبھی کامیاب تخلیقات بھی مل جاتی ہیں۔ مومن سے میل جول رکھتے ہوئے وہ اس امر سے لاعلم نہیں رہ سکتے تھے کہ ان کی بہت سی تخلیقات، پر تکلف شاعری کی اسلوبیات کے پردے ہی میں سہی، لیکن بہ ہر حال ن میلانات کی آئینہ دار تھیں۔ ہندوستانی محقق کنور محمد اشرف اپنے مضمون "مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے نمائندے اور 185 ء کے واقعات۔ میں مومن کے خیالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام بریلوی (سید احمد شہید بریلوی) سے منسوب اپنی ایک مثنوی کو شاعر دعوت جہاد پر اور اس دعا پر ختم کرتا ہے کہ اسے بھی "مجاہدین اسلام" کے ساتھ شہادت صیب ہو۔

مومن کی موت پر غالب نے ایک رباعی لکھی جس میں بہ ظاہر تلازمات کا اسلامی رنگ، جو بہ حیثیت مجموعی غالب کی شاعری سے ہی میل کھاتا ہے، محض اتفاقی نہیں ہے۔

شرطست کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر
خون نابہ بہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگِ مومن
چون کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

لازم ہے کہ روئے دل کو نوچوں ہمہ عمر
آنکھوں کے لہو سے چہرہ دھوؤں ہمہ عمر
کافر ٹھہروں جو مرگِ مومن کے بعد
کعبے سی سیہ قبا نہ پہنوں ہمہ عمر
(ترجمہ: مضطر مجاز)

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، حجر اسود، جس کو مسلمان بے حد مقدس مانتے ہیں، چھوٹی سی کعبہ نام کی مسجد کی دیوار پر نصب ہے ریہ عمارت باہر سے سیاہ رنگ کے غلاف سے ڈھکی رہتی ہے)۔

1853ء میں غالب کو طامس مٹکاف کے انتقال کی خبر ملی۔ موت پر اسرار حالات میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد مزید اعلیٰ انگریز عہدہ داروں، ایلیٹ اور طامس، کی موتیں بھی واقع ہوئیں، مزید برآں جیسا کہ اسپیر لکھتا ہے، ان تینوں نے ولی عہد سلطنت کے تعین کے کام میں بھی حصہ لیا تھا۔ ان ولی عہد کا بھی مٹکاف سے پہلے ہی اچانک انتقال ہو گیا۔ اسپیر درباری سازشوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس کے خیال میں اس طرح سے بادشاہ کی بیوی زینت محل اپنے بیٹے کی تخت نشینی کے لیے استہ صاف کر رہی تھیں۔ تینوں واقعات کی امتیازی خصوصیت کسی ایسی جڑی بوٹی سے لاحق ہونے والی سمیت کی علامات تھیں، جس سے مقامی معالج بہ خوبی واقف تھے۔ تاہم موت کی دوسری وجہیں بھی ممکن تھیں اور، جیسا کہ اسپیر کا خیال ہے ب اس معمے کو حل کرنا قطعاً نا ممکن ہے۔ تاہم خود یہ خیال کہ انگریزوں کو اس طرح کیفر کردار تک پہنچایا جا سکتا ہے ان عوام کے ذہن میں ہلچل مچا دینے کے لیے کافی تھا جو ویسے بھی اس زمانے میں اس طرح کے واقعات میں نوشتہ دیوار دیکھنے کو تیار رہتے تھے۔ 1853 میں غالب نے مشاعرے میں وہ مشہور غزل پڑھی جو اپنے اداس اور دردناک لہجے سے سب کو متاثر کرتی ہے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
ہے موج زن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

غالب نے "مہر نیم روز" پر اپنا کام پورا کر لیا اور 1854ء میں یہ تصنیف شائع ہوگئی۔ 1854ء کو غالب کی درباری ملازمت کا نقطہ انقلاب سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سال وہ ملک الشعرا بن گئے۔ یہ موقع ان کو ذوق کی وفات کے بعد ملا، جن سے آخر تک غالب کے تعلقات میں کشیدگی برقرار رہی۔ آخری چپقلش، یوں کہنا چاہیے کہ فرائض منصبی کی ادائگی کے سلسلے میں وقوع پذیر ہوئی۔ دربار سے تعلق کے نتیجے میں مختلف تقریبوں کے موقع پر اشعار لکھنا بھی غالب کے لیے ضروری تھا۔ شاہی محل میں ایک شادی کے موقع پر انھوں نے ایک "سہرا" لکھا۔ اس میں اس زمانے کی روایت کے مطابق تعلی کا رنگ لیے ہوئے چند خاصے بے ضرر اشعار بھی شامل تھے۔ شاعر نے اپنی نام وری میں اضافے کے لیے اپنے کلام کی تعریف میں کچھ ایسے اشعار کہے تھے، جن میں قدرتی طور سے اس کے حریفوں کی مذمت کا پہلو بھی نکلتا تھا۔ تاہم ہوا یوں کہ سہرے میں دوسرے شعرا کی طرف تخاطب کو، کہ وہ ذرا اس سے بہتر کہہ کر دکھادیں، بادشاہ نے اپنی طرف محمول کیا۔ استاد شہ ذوق نے بھی سمجھا کہ اشارہ ان کی طرف ہے اور برا مان گئے۔ اچھا خاصہ قضیہ کھڑا ہوگیا اور غالب کو اپنی صفائی میں معذرت کے اشعار لکھنے پڑے۔ اسی لیے جب اس کے کچھ ہی عرصے بعد ذوق کا انتقال ہوا تو غالب کے ردعمل سے کسی غیر معمولی رنج کا اظہار نہیں ہوتا، گو کہ ایسے موقعوں کے لیے مناسب خدا ترسی کا رنگ اس میں ضرور جھلکتا ہے۔

اس وقت تک غالب کے دل میں، دربار میں اپنے لیے کوئی اونچا مقام بنانے کی ذرا سی بھی کوئی خواہش نہیں رہ گئی تھی۔

حالی لکھتے ہیں "1271 ہجری میں جب کہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوگیا، بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہوگئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادل ناخواستہ سرانجام کرتے تھے۔ ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوان عام میں بیٹھے تھے کہ چوب دار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا: ذرا ٹھہر جاؤ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذات رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں، وہ لے آؤ۔ وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے جو اس کو کھولا تو اس میں سے آٹھ نو پرچے، جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے، نکالے اور اسی وقت قلم دوات منگوا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھ کر چوب دار کے حوالے کیں۔ ناظر مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں ان کو اس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک مشاق استاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دے کر درست کر دے۔ جب چوب دار غزلیں لے کر چلا گیا تو مجھ سے کہا کہ حضور کی کبھی کبھی کی فرمائشوں سے آج مدت کے بعد سبک دوشی ہوئی ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب جو کچھ اپنی طرز خاص میں لکھتے تھے، نظم ہو یا نثر، اس کو بڑی کاوش اور جان کاہی سے سرانجام کرتے تھے، چناں چہ خود انھوں نے جابہ جا اس کی تصریح کی ہے۔ مگر جب کبھی

خاص روش پر چلنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی اس وقت ان کو فکر پر زیادہ زور ڈالنا نہیں پڑتا تھا۔

ہمارے خیال میں ایک چھوٹے سے واقعے سے ہم اس بدگمانی کا جو سربرآوردہ علما کے حلقے میں غالب کی طرف سے تھی کم و بیش صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حالی کے بیان کے مطابق، جس کا ہم اوپر بھی ذکر کر چکے ہیں، نواب شمس الدین والے مقدمے کے دوران بھی ان حلقوں نے غالب کے تعلق سے معاندانہ موقف اختیار کیا تھا۔ اب واقعہ یہ پیش آیا کہ بادشاہ کی علالت کے دوران ان کے ایک عزیز جو لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ جب بادشاہ کو کسی علاج سے آرام نہ ہوا تو مہمان نے ایک "مجرب" نسخہ آزمانے، یعنی خاک شفا، بہ الفاظ دیگر کربلائے معلی کی خاک سے اپنا علاج کرنے کی صلاح دی۔ (کربلا، جیسا کہ سب جانتے ہیں، شیعوں کا مقدس مقام اور وہ شہر ہے جہاں امام حسینؑ ابن علی نے شہادت پائی) حالی لکھتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہو گئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا۔ بادشاہ کے دیگر مقربین کی اعانت سے غالب کو اس افواہ کی تردید اشعار کی شکل میں کرنی پڑی، تاہم جب لکھنؤ والوں نے دریافت کیا کہ کیا آپ نے شیعہ مذہب کے بارے میں اپنے ذاتی خیالات ان اشعار میں ظاہر کیے ہیں تو مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں، جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے، اس کی اسی طرح سے تعمیل کرتا ہوں۔

غالب کے بارے میں سنجیدہ علمی کاوش "حیات غالب" کے مصنف شیخ محمد اکرام بعض تفصیلات کا اضافہ کرتے ہیں: "1853-54ء میں جب بہادر شاہ کے شیعہ ہو جانے کی شہرت ہوئی اور دہلی کے علما و مشائخ نے بادشاہ کو دھمکی دی کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو جمعہ اور عید کے خطبوں سے اس کا نام نکال دیا جائے گا تو بہادر شاہ نے مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھوا کر، اس افواہ کی تردید کی۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک کتاب "حقیقت مذہب اہل سنت والجماعت" تصنیف کی جس پر مرزا نے زور و شور سے تقریظ لکھی اور خاص و عام کو اعلیٰ حضرت کا ثبات قدم مسلک سنن پر باور کرایا۔"

اگر بادشاہ کے شیعہ مذہب اختیار کر لینے کی افواہ کے پھیلتے ہی خود ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی تیاری ہو رہی تھی تو یہ امر خارج از امکان نہیں ہے کہ 1830ء کے دہے میں غالب کے تشیع کے بارے میں مستقل چہ می گوئیاں مذہبی ارباب اقتدار کی ناراضگی کا باعث بن گئی ہوں اور انھوں نے شہر میں شاعر کے خلاف برہمی کو اشتعال دیا ہو۔ سنی حلقوں کے نقطہ نظر سے یہ امر اتنا قابل اعتراض تھا کہ غالب کو شاہی ملازمت اختیار کرنے کے بعد بھی کبھی کبھی اپنی صفائی دینی پڑتی تھی۔ ان کی ایک غزل میں "گنہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں" والا مصرع شاید بلاوجہ نہیں ہے۔

غالب کی الطاف حسین حالی سے جان پہچان اسی زمانے میں ہوئی۔ حالی کی عمر سترہ سال سے کچھ ہی زیادہ تھی اور وہ دہلی کے ایک مدرسے میں اسلامی علوم کا درس لے رہے تھے۔ حالی کو اس وقت بھی اپنی شاعرانہ استعداد کا احساس تھا اور وہ ذوق شعر رکھنے والے نوجوانوں کے ہم راہ کوئی بھی ایسا مشاعرہ نہیں چھوڑتے تھے، جس میں غالب اپنا کلام سنانے والے ہوں۔ انھیں غالب سے شخصی طور سے متعارف ہونے کا بھی موقع مل گیا۔ حالی نے شاعر سے غزلوں کے بعض مشکل مقامات کا مفہوم سمجھانے کی درخواست کی، جس پر غالب بہ خوشی رضامند بھی ہو گئے۔ ایک دفعہ حالی نے مرزا کو اپنے اشعار دکھائے۔ غالب نے ان سے کہا: "اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا، لیکن تمھاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔" بعد میں الطاف حسین حالی کو غالب سے اکثر ملاقات کا موقع ملتا رہا، جب بھی وہ دہلی میں ہوتے، ان کی کوشش ہوتی کہ اس دیرینہ سال شاعر سے ملاقات ضرور کریں۔ حالی نے اپنی زندگی کے آٹھ سال نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ساتھ ان کے فرزند کے اتالیق کی حیثیت سے گزارے۔ جیسا کہ معلوم ہے شیفتہ نہ صرف غالب کی شاعری کے پرجوش قدر دان، بلکہ ان کے دوست اور محسن بھی تھے، اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصے میں حالی شیفتہ کے گھرانے میں چھائی ہوئی غالب پرستی کی دل فریب فضا سے متاثر رہے۔

دربار میں استاد شہ اور "ملک الشعرا" کے عہدے پر مقرر ہونے کے نتیجے میں غالب کی مالی حالت میں نمایاں بہتری

پیدا ہوتی۔ 1854-1858 کے دوران ان کے عالی مرتبت شاگردوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوا، جن میں ولی عہد بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ ان کی لیاقت کے اعتراف کے طور سے نواب اودھ نے ان کے نام پانچ سو روپے سالانہ کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ تاہم 1856 میں بہادر شاہ کے ولی عہد کا انتقال ہو گیا اور اسی سال انگریزوں نے دار الحکومت لکھنؤ سمیت اودھ کا اپنی عمل داری میں الحاق کر لیا۔ غالب نے موخر الذکر واقعے کو اپنا ذاتی نقصان مانا۔ اپنے خطوط میں سے ایک میں وہ خاصے محتاط الفاظ میں اس واقعے کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اسے سارے ہندوستان کی غلامی کا المناک پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ (غالب کے ہاں اس طرح کی راست زنی خال خال ہی ملتی ہے) غلام حسنین بلگرامی کے نام اپنے خط میں وہ لکھتے ہیں: "تباہی ریاست اودھ نے، باآں کہ بے گانہ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ حال کر دیا، بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔"

حتی الامکان غالب کوشش کرتے تھے کہ قسمت کی ٹھوکروں سے مقابلے میں ہمت نہ ہاریں۔ اب ان کی سرپرستی میں دو پوتے بھی تھے، جن سے انھیں دلی محبت تھی، لیکن اس طرح ان کے افراد خاندان کی تعداد بڑھ گئی تھی اور ضرورت اس کی تھی کہ آمدنی بھی بڑھے۔ دربار کی ملازمت، جس کے، ایام جوانی میں، وہ اتنے آرزو مند تھے، اب جب کہ وہ تقریباً ساٹھ سال کے ہو چکے تھے، ایک بوجھ بن کے رہ گئی تھی۔ شاعرانہ بصیرت، "دل آشفتہ" کے احساس کرب کو کچھ بڑھا ہی دیتی ہے۔

غالب تمام مراسم دربار کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے اور گرد و پیش کے لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا کہ انھیں دکھاوے کے اعزازات، درباروں اور گورنر کی استقبالی دعوتوں میں "داہنی طرف دسویں کرسی" کے استحقاق، تمغے یا انعام و اکرام کی اشرفیاں پا کر تسکین ملتی تھی۔ لیکن وہ اپنے آپ سے یہ بات نہیں چھپا سکتے تھے کہ وہ اب جس مقام پر ہیں وہاں ان کا مقدر تعطل کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمیشہ کے لیے بندھے ہوئے دستور کے غیر متزلزل ہونے کا احساس ان کے لیے سوہان روح تھا اور وہ سنہری پنجرا، جس میں وہ "طوطی خوش بیان" کا کردار ادا کر رہے تھے ان کے لیے بے حد تنگ تھا۔

گفتی قفس خوش ست توان بال و پر کشود
بارے علاجِ خستگیِ بندِ دام چیست ؟

بولا قفس تو خوب ہے، لے بال و پر تو کھول
پر ہے علاجِ خستگیِ بندِ دام کیا ؟

(ترجمہ مضطر مجاز)

اپنی نئی حیثیت کی افادیت انھیں بس اس میں دکھائی دیتی تھی کہ اس سے ان کو اپنی عالی نسبی کی توثیق کا موقع ملتا تھا اور خود کو سرکاری طور سے ملک کا سب سے سربرآوردہ شاعر منوانے کا بھی۔ یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ یہ تو محض انا کی تسکین تھی، دراصل روایت ہی ایسی تھی۔ مزید برآں ان کے درجے کے شعراء نہ صرف حکم ران دہلی بلکہ ولایت کی طرف سے بھی اعزاز و اکرام کے مستحق تھے۔ چناں چہ مرزا نے ایک قصیدہ اس درخواست کے ساتھ لندن روانہ کیا کہ ان کی لیاقت کے اعتراف میں انھیں مالی انعام و اکرام سے نوازا جائے۔ اس درخواست کی قبولیت کا انھیں کافی انتظار بھی تھا۔

اس لیے جب محض ایک سال کے اندر دہلی کا تخت شاہی زمین بوس ہو گیا اور اس شاہی خاندان کی حکم رانی کا خاتمہ ہوا، جس کی تاریخ کو وہ اپنی تصنیف "مہر نیم روز" میں صرف نیم روز (یعنی دوپہر) تک ہی قلم بند کر پائے تھے، تو روزی روٹی کی تلاش میں انھوں نے اپنی نگاہیں انگریزوں کی طرف دوڑائیں۔ انگریزوں کا اب بلا شرکت غیرے ہندوستان پر قبضہ ہو چکا تھا اور "ملکہ معظمہ کی رعایا کی فلاح و بہبود" کی ذمہ داری اب انھوں نے روایات کی کسی قسم کی اوٹ کے بغیر راست اپنے سر لے لی۔ اس بادشاہ کے ہاں، جو اب برما میں جلاوطنی میں اپنی زندگی کے بچے کچھے دن گزار رہا تھا اپنی سابقہ ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے غالب کو دربار میں اپنی خدمات کے لیے کوئی اچھے الفاظ نہیں ملتے، اور اگر شاہی دربار سے ان کے تعلقات کا سارا

پس منظر محوظِ خاطر رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسے محض دروغ مصلحت آمیز ہی سمجھا جائے۔ "جب سات سال قبل دہلی کے حکمران اعلیٰ (بہادر شاہ ظفر۔ مصنفہ کتاب) نے مجھے اپنے ہاں بلایا اور میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ میں چھ سو روپئے سالانہ تنخواہ کے عوض خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھوں تو میں نے یہ تجویز قبول کرلی اور کام میں لگ گیا۔ جب سابقہ استاد شاہ کا انتقال ہوگیا تو اصلاح کلام کی ذمہ داری بھی مجھے سونپی گئی۔ بڑھاپے اور ضعف بدن کی وجہ سے میں مائل بہ خلوت نشینی ہوگیا اور اپنی بڑھتی ہوئی گراں گوشی کی وجہ سے میں اوروں کیلیے بوجھ بن کر رہ گیا تھا یہاں تک کہ شعر و سخن کی محفلوں میں مجھے شعرخوانوں کی جنبشِ لب پر نظر رکھنی پڑتی تھی ہفتے میں دو ایک بار قلعہ کو جانا میرے فرائضِ منصبی میں داخل تھا۔ اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تو مجھے کچھ وقت ان کے حضور میں گزارنا پڑتا اور یا پھر میں دیوان خاص میں بیٹھ کر اشعار لکھتا اور ان کے ہاں بھیج دیتا اور اس کے بعد گھر لوٹ آتا۔"

لیکن اس زمانے میں بھی غالب کی طباعی میں بہرحال کوئی فرق نہیں آیا اور پہلے ہی کی طرح ظرافت ان سے پھوٹی پڑتی تھی۔ اس سے وہ سب کا دل بھی موہ لیتے تھے اور زندگی کو اپنے لیے گوارا بھی بنا لیتے تھے۔

دارم دلِ شاد و دیدۂ بینائے	رکھتا ہوں دل شاد و دیدہ بینا میں
وز کری گوشم نہ بود پروائے	بہرا ہوکر ہوا ہوں بے پروا میں
خوبست کہ نشنوم زہر خود رائے	اچھا ہے کہ سنتا نہیں ہر خودسر سے
گلبانگ انا ربکم الاعلائے	گلبانگ انا ربکم الاعلیٰ میں

(ترجمہ: مضطر مجاز)

1857ء میں غالب کے پرانے دوست فضل حق کی تحریک سے نواب رام پور نے غالب کو ان کے اصلاح کلام کی ذمہ داری قبول کرنے کی دعوت دی۔ غالب نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ رام پور بھیجا۔ اسی سال اس درخواست کا جو انھوں نے انگلستان بھیجی تھی امید افزا جواب بھی آیا۔ چناں چہ ایسا لگتا ہے کہ بادل، جو روایت شعری کے مطابق زرخیزی اور دولت کی علامت ہیں شاعر کے سر پر پھر موتی برسانے کے لیے تیار تھے۔

لیکن غالب قسمت کے ایسے کھوٹے تھے کہ ابر بھی ان کے لیے اچھا شگون نہیں ثابت ہوتا تھا۔ اس کے بجائے بدشگون نہ معلوم کیوں کبھی غلط نہیں نکلتا تھا۔

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے\
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

یہ ۱۸۵۷ء کا موسم بہار تھا۔

(سلسلہ ص ۲۸)

***

بعض مغربی اور مشرقی ادبی شہ پارے ایسے ہیں کہ انھیں میں نے ایک سے زاید مرتبہ پڑھا ہے۔ ایک مغربی مفکر کا قول ہے۔

" A great book is like a great symphony which must be heard many times before it can be really understood."

میں محسوس کرتا ہوں کہ کتابوں اور دانش وروں کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ میں نے زبان رنگ و نسل کے تفرقوں سے کر مغرب و مشرق کے سرچشمہ ہائے علم سے اپنی پیاس بجھائی ہے۔

خرد افروز مرا درس حکیمان فرنگ\
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

00 00 00

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی

وہ کتابیں جنھوں نے مجھے متاثر کیا

زندگی مختصر ہے اور فن طویل۔ اس کہاوت کی سچائی کا آج مجھے کچھ زیادہ ہی احساس ہو رہا ہے۔ جب کہ ایک محدود وقت میں مجھے اپنے ذہنی نشو و نما کی داستان کو بیان کرنا ہے۔

میرے سامنے سیکڑوں برس کا علمی اور ثقافتی ورثہ ہے جسے کچھ ذہین اور علم دوست دانش وروں نے کتابوں کی صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو ہم اپنے ماضی سے کٹ کر محض حال کے لمحوں میں اپنی شناخت کے لیے ہاتھ پیر مار رہے ہوتے۔

میں نے اپنی طالب علمانہ اور نسبتاً طویل تدریسی زندگی میں سیکڑوں کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کے علاوہ اخبار، پاپولر رسالے اور کتابچے ہیں جن کا ہم اپنی روزمرہ زندگی میں مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ بعض مرتبہ تو یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک مختصر مضمون یا ایک چھوٹی نظم ہمارے قلب و دماغ پر ایک دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہے۔

کتاب ایک شئے کی حیثیت میں ہماری ایک خاموش ساتھی ہے جس کا مطالعہ ہمارے ذہن پر مثبت اور منفی ہر دو طرح کے اثرات چھوڑ سکتا ہے۔ مگر ان خاموش ساتھیوں کے علاوہ کچھ زندہ اور چلتی پھرتی کتابیں بھی ہوتی ہیں یعنی ہمارے ہم عصر استاد، دانش ور اور ادیب ہیں جو ہمیں بلاواسطہ طریقے پر متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ہر دو صورتوں میں واضح طور پر ہمارے ذہن کی تربیت اور تہذیب ہوتی ہے۔

"کسی دانش ور کا قول ہے کہ ہر آدمی اک کتاب ہے۔ اگر آپ یہ جان لیں کہ اسے کیسے پڑھا جائے"۔

" Every man is a volume if you know how to read him"

جہاں تک نفس مضمون کا تعلق ہے کتابوں کی بھی اتنی ہی اقسام ہیں جتنی کہ علوم و فنون کی اقسام ہو سکتی ہیں۔ ہمارے آج کل کے معاشی، تجارتی اور ٹکنیکل اعتبار سے ترقی کے دور میں علوم کو ان کی افادیت اور غیر افادیت کی بنیاد پر جانچنے کا رجحان عام ہو گیا ہے جسے میں ایک مارواڑی رجحان سمجھتا ہوں۔ تعلیم کا اصل مقصد فرد کی شخصیت کی ہمہ جہتی تشکیل ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ آدمی کا مقصد حیات محض شکم سیری نہیں ہے۔ Man does not live by bread alone

کتابوں کے مطالعے کے تعلق سے یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کچھ افکار کتاب اور اس کے مصنف کی عدم شناخت کے باوجود ہمارے ذہن کے لاشعوری گوشے میں محفوظ رہتے ہیں۔ اس طرح کی عدم شناخت کے میکانزم کا باعث یہ ہے کہ ہمارے حافظے کی صلاحیت میں ایک طرح کی اکونومی عمل پیرا ہوتی ہے۔

میرے ذہن کی تشکیل میں جن کتابوں اور دانش وروں نے حصہ لیا ہے ان کی فہرست کافی طویل ہے۔ یہاں اس امر کی گنجائش نہیں کہ میں فرداً فرداً ان کا تذکرہ کروں۔ میں صرف مذہبیات، فلسفیانہ اور سماجی علوم اور ادب کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ ظاہر ہے ادب کو میں نے اس کے وسیع معنیٰ میں لیا ہے جس کے اندر فکشن، تنقید، ڈرامہ، شاعری وغیرہ آتے ہیں۔

[illegible] کتابیں مذہبیات کے تحت ملتی ہیں ان میں سرِفہرست الہیاتی [illegible] تھیں کے مطالعے نے میری روح کو [illegible]

جہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مذہب کے بارے میں کسی قسم کی منطقی موشگافیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے باوجود کچھ دا[illegible] دروں نے مذہب کے تعلق سے یہ بنیادی سوال اٹھایا ہے کہ کیا مذہب ممکن ہے؟ (IS RELIGION POSSIBLE?) ا[illegible] سوال کا شافی جواب تلاش کرنے کے لیے مذہبی مفکرین نے ازمنۂ قدیم سے لے کر آج تک ہزاروں لاکھوں صفحات سیاہ کیے ہیں۔ مگر ا[illegible] بنیادی مسئلے کے بارے میں جس تحریر نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا وہ ہماری صدی کے عظیم مفکر شاعر علامہ اقبال کا وہ معرکۃ الآ[را] لکچر ہے جو IS RELIGION POSSIBLE کے عنوان سے ان کے خطبات مدارس کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس لکچر میں اقبال نے خالص فلسفیانہ بنیادوں پر مذہب کی اہمیت و ضرورت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہ الفاظ دیگر مذہبی زند[گی] کو انھوں نے تین ادوار کے تحت رکھا ہے۔ اول تو ایمان ہے، دوسرا تفکر ہے اور تیسرا انکشاف ہے۔ اس طرح مذہبی شعور کی سار[ی] داستان انھیں تین ادوار میں سمٹ آتی ہے۔

جدید یوروپی فلسفے کی تاریخ میں جرمن فلسفی ایمانیول کانٹ اپنے فلسفۂ انتقاد کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ اس کا سب سے [بڑا] کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فلسفیانہ تفکر کو ہیوم (HUME) کی مہلک تشکیک کے دلدل سے باہر نکالا۔ کانٹ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ا[س] نے علم کی تحدید اس لیے کی ہے کہ ایمان کے لیے جگہ نکلے۔ اس کے برخلاف فلسفے کی وہ اہم شق جس کو مابعد الطبعیات یا میٹافزکس کہا جا[تا] ہے اور جس کی بنیاد اکثر فلاسفر نے عقلیت پر رکھی ہے اس کو کانٹ ناممکن قرار دیتا ہے۔ اقبال کے اسی لکچر میں دورِ جدید کے مشہو[ر] نفسیات داں کارل گستاف ینگ کے مذہب کے بارے میں خیالات کی تنقید ملتی ہے۔

جہاں تک مذہبی شعور کی نفسیاتی تشریح و توضیح کا تعلق ہے امریکی دانش ور ولیم جیمس کی کتاب 'arieties of Religious Experience جدید مذہبی لٹریچر میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کا بہترین اردو ترجمہ (زیادہ تر آز[اد] ترجمہ) استاذی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے "نفسیات وارداتِ روحانی" کے نام سے اب سے کئی سال پہلے شائع کیا تھا۔

دورِ وسطیٰ کے اسلامی مفکروں کی حد تک ذہنی طور پر میں امام غزالیؒ سے بہت زیادہ قریب رہا ہوں۔ اس ذہنی قربت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امام غزالیؒ کا فلسفۂ تصوف میرے ریسرچ کا موضوع رہا ہے۔ غزالیؒ بلاشبہ ایک جامع الکمالات شخصیت کے مالک ہیں۔ [و]ہ بیک وقت مذہبی مفکر، فلسفی و فقہ و حدیث کے ماہر، فلسفۂ اخلاق کے مبصر اور صوفی ہیں۔ ایسے سارے کمالات ایک نابغۂ عظیم کی ذا[ت] ہی میں اکٹھا ہو سکتے ہیں۔ امام غزالیؒ کے نقاد انھیں عام طور پر ادعائیت پسند (DOGMATIC) کہتے ہیں مگر جن لوگوں نے امام صاحب کی خود نوشت سوانح المنقذ من الضلال پڑھی ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ غزالیؒ نے اپنی فکری زندگی کا آغاز شک (DOUBT) سے کیا حتیٰ کہ مسلمہ مذہبی عقائد بھی تشکیک کی زد سے نہیں بچ سکے تھے۔ یہ وہی طریقہ ہے جسے لگ بھگ پانچ سو سال بعد جدید مغربی فلسفے کے دیکارٹ نے اختیار کیا تھا۔ چناں چہ امام صاحب کے اعترافات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے فکری سفر کے دوران وہ ادعائیت سے شک، اور شک سے انتقاد تک پہنچے تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ امام صاحب کا فکری سفر آخر کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ ان پر منکشف ہوا [کہ] حقیقتِ اولیٰ کا تحقیق عقلی اور فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعے نہیں بلکہ وجدان کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ وہی وجدان و جذب جو عاشقِ صو[فی] کا طریقہ ہے۔ گویا

آزمودم عقلِ دوراندیش را
بعد ازاں دیوانہ کردم خویش را

بہرحال اپنے ریسرچ کے موضوع کے اطراف مجھے بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا ہے۔

[illegible] (MYSTICISM) دنیا کے ہر [illegible] مذہب کا [illegible]

تصوف میں ہے۔ فرانس کا مشہور مستشرق (ORIENTALIST) لوئی ماسینیوں لکھتا ہے کہ تصوف ہی کے طفیل اسلام ایک عالمگیر مذہب کہلاتا ہے[illegible]۔ چنانچہ یہ متصوفانہ طرزِ فکر ہے کہ جس نے بعد ایرانی شاعری کے ایک بڑے حصے کو انسانیاتی (HUMANIST) شان سے مالا مال کیا۔ عربی میں شیخ محی الدین ابن عربی کی ترجمان الاشواق، فارسی میں ابو سعید ابو الخیر سے لے کر سعدی، جامی، رومی، حافظ، امیر خسرو کی شاعری متصوفانہ طرزِ فکر کی غماز ہے۔ وہ متصوفانہ نظریہ حیات ہی تھا کہ جس نے سلطان الاولیا حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی زبان سے یہ کہلوایا تھا

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اور پھر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب یہ دو مصرعے (بعض محققوں نے اس انتساب پر شک کا اظہار کیا ہے)۔

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا
عاشقاں آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا

جہاں تک اردو کی متصوفانہ شاعری کا تعلق ہے دہلی کے خواجہ میر درد اس روایت کے سرخیل نظر آتے ہیں۔ دوسرے کئی شعراء متقدمین نے کسی نہ کسی عنوان سے تصوف کے مضامین کو اپنی شاعری میں داخل کیا ہے۔ اردو کا ہمارا عظیم شاعر غالب جو نہ تو عملی اعتبار سے ایک صوفی ہے اور نہ نظری اعتبار سے اسے صوفی کہا جاسکتا ہے اس نے اپنے اشعار میں اس قدر حکیمانہ انداز میں متصوفانہ نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے کہ بقول اس کے (تعلّی کے انداز میں) اگر وہ بادہ خوار نہ ہوتا تو لوگ اسے ولایت کے مرتبے پر فائز کرتے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

استاذی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے تقریباً ۵۵۰ صفحات (کراؤن سائز کے) پر مشتمل ایک نہایت ہی بصیرت افروز کتاب مرزا غالب کے اردو اور فارسی (زیادہ تر فارسی) اشعار کو سامنے رکھ کر ان کی تشریح و توضیح کی غرض سے لکھی ہے (افکار غالب، ناشر مکتبہ معین الادب، لاہور، سنہ طباعت: دسمبر ۱۹۵۴ء)۔

ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں کہ "غالب کی ایک امتیازی خصوصیت جس نے اس کو اہل علم میں ہر دل عزیز بنایا اس کا حکیمانہ انداز تفکر ہے۔ وہ فلسفی نہیں لیکن فلسفیانہ شاعر ہے۔ اس کے اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسفہ اور تصوف کے مسائل سے پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ نہ فلسفی ہے نہ صوفی لیکن فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار سے لذت حاصل کرتا اور دوسروں کو حسن بیان سے لذت بخشتا ہے عملاً وہ صوفی نہیں بلکہ عام معنی میں مذہبی شخص بھی نہیں لیکن حقیقی مذہبیت کا احترام کرتا ہے، شاعرانہ اور حکیمانہ انداز میں تصوف کے زاویہ نگاہ کو درست سمجھتا ہے"۔

دل چسپ بات تو یہ ہے کہ اقبال جنھوں نے عجمی تصوف کو اپنی سخت تنقید کا ہدف بنایا تھا وہ بھی تصوف کے اثر سے نہیں بچ سکے۔ ان کا مرشد معنوی رومی خود ایک صوفی ہے جو انھیں عقلی غبار کی گرفت سے آزاد کر کے عاشقی کا سبق پڑھاتا ہے اور اس طرح وہ بو علی کی محفل سے اٹھ کر رومی کی بزم میں آ بیٹھتے ہیں۔

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

چنانچہ اقبال کے شعری اور نثری تصانیف نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔

فلسفہ اور نفسیات تو میرے خاص مضامین رہے ہیں اور یوں بھی مجھے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں انھیں مضامین سے زیادہ سروکار

ہے [illegible] اس کے بعد کچھ

مسلمان حکماء نے ان کے فلسفے کے رد میں رسائل لکھے ہیں لیکن ابن رشد ارسطو کے فلسفے کا اس قدر مداح ہے کہ اس کو قرآن کی الٰہیات اور ارسطو کی تعلیمات میں کوئی تناقض نظر نہیں آتا۔ [illegible] ہمارے استاد مولانا عبد الباری ندوی [illegible] کہ وہ جب اسلامی فلسفے کے تحت ابن رشد پر لیکچر دیتے تھے تو اس کے نام کے ساتھ [illegible] ضرور [illegible] دیتے تھے۔ جب امام غزالی نے فلسفے کے رد میں تہافتہ الفلاسفہ لکھی تو ارسطو پرست ابن رشد اس قدر برافروختہ ہوا کہ اس نے امام صاحب کی کتاب کے جواب میں تہافتہ التہافتہ تصنیف کی۔ اقبال افلاطون کے فلسفے کو فلسفہ گوسفندان کہتے ہیں۔ مگر ایک مغربی مفکر افلاطون کے فلسفے سے اس قدر متاثر ہے کہ وہ لکھتا ہے۔ "جدید فلسفہ افلاطون کے فلسفے کے حاشیے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے"۔

" Modern Philosophy is nothing but
Foot notes on the text of Plato"

وہ افلاطون ہی ہے جس کے ذریعے یونان قدیم کی جاذب توجہ شخصیت سقراط سے ہم واقف ہوتے ہیں جو یونان (ایتھنز) کے وجہ اخلاقی اقدار کا سب سے بڑا علم بردار تھا اور جس کو جمہور نے زہر ہلاہل پینے پر مجبور کیا تھا ممکن ہے کہ جب اقبال نے طرز جمہوری کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا تھا تو ان کے لاشعور میں سقراط کے انجام کی مثال بھی رہی ہو۔

گر ہزار طرز جمہوری علاجے پختہ کارے شد
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

جدید مغربی فلاسفہ کی حد تک دیکارت (DESCARTES) سے لے کر برٹرنڈ رسل تک کئی نام آتے ہیں جن کی تصانیف سے میں بہرہ ور ہوا ہوں۔ تاریخ فلسفہ مغرب کے سلسلے میں دو کتابوں کا خاص طور پر ذکر کروں گا۔ ایک تو ول ڈیوران کی داستان دانش (The study of Philosophy) ہے اور دوسری برٹرنڈ رسل کی ہسٹری آف ویسٹرن فلاسفی ہے۔ ول ڈیوران کا عظیم الشان کارنامہ کئی جلدوں پر مشتمل اس کی تالیف Story of Civilization ہے۔ بہر حال ان دونوں دانشوروں کا اسلوب نگارش اس طرح کا ہے کہ انھوں نے فلسفے کو ادبی شہ پارے کا روپ دے دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برٹرنڈ رسل کو ادب کے نوبل انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا حالاں کہ رسل بنیادی طور پر ایک فلسفی اور ریاضی داں ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد یورپ میں فلسفے کا وہ مکتب فکر نمایاں ہو کر سامنے آیا جسے وجودیت (EXISTEN TIALISM) کہا جاتا ہے۔ باوجودیکہ وجودیت کو ہمارے اکیڈمک فلاسفر جن میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے فلاسفر پیش پیش ہیں بہ نظر حقارت دیکھتے ہیں۔ اس کی اثر پذیری اور مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ میں وجودیت کو ایک باقاعدہ نظام فلسفہ کے بجائے ایک طرح کا Style of Philosophising سمجھتا ہوں جس سے ادیبوں اور فنکاروں کو بھی دل چسپی ہے۔ وجودی فلسفے کے علم برداروں میں ژاں پال سارتر کو میں نے بالتفصیل پڑھا ہے اور اس کے افکار اور ادبی تخلیقات کے بارے میں بہت کچھ لکھا بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سارتر ہی کے ایک ہم عصر ادیب البرٹ کامو نے اپنے وجودی فلسفی ہونے کا انکار کیا ہے اس کے باوجود کامو کے ناول اور ڈراموں کے تھیم وہی ہیں جن سے دوسرے وجودی مصنف سروکار رکھتے ہیں۔ یعنی زندگی کی مہملیت Absurdity کا لوژیکل حد تک پہنچا ہوا احساس۔ آج کے انسان کا کرب اس کی یاسیت اور اس کا احساس علاحدگی یہ تمام مباحث وجودی فلسفے اور ادب میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ مختصراً وجودیت کا اصل پیغام یہ ہے کہ آدمی یا تو عالم کو اپنے [illegible] میں [illegible] لے [illegible] یا پھر ایک جہنم کو جھیلنے کے لیے تیار ہو جائے۔ وجودی فلسفیوں کے نزدیک گناہ یا بدی کے [illegible] میں [illegible]

دوسری دنیا کے اسلامی تصور کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اسی دنیا کا جہنم ہے۔ سارتر کے Hell is other people کی توضیح کے لیے راقم کے طویل مضمون مطبوعہ "صبا" ۱۹۶۳ء سے رجوع کیا جا سکتا ہے)۔

جہاں پر جرمنی کے عظیم فلسفی مارٹن ہائیڈگر کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جس کے افکار نے یورپ کے ہم عصر فلسفے کو بڑی حد تک متاثر کیا تھا۔ مگر حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ اتنا بڑا دانش ور نازی ازم کا آلہ کار بن گیا تھا اور یونیورسٹی کے ریکٹر کی حیثیت میں اس نے تمام یہودی دانش وروں کو نکال باہر کیا تھا۔

نفسیات (سائیکالوجی) طالب علمی کے زمانے ہی سے میرا خاص موضوع رہا ہے۔ ابھی میں انڈر گریجویٹ ہی تھا کہ سگمنڈ فرائیڈ کے افکار اور تعلیمات سے میری واقفیت اس کی کتابوں کے انگریزی تراجم کے ذریعے ہوئی۔ فرائیڈ کے تحلیل نفسی (Psycho analysis) کو میں نہ صرف نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے کا ایک کارآمد طریقہ سمجھتا ہوں بلکہ نفسیاتی اور نیوراتی (Neurotic) مریضوں کے لیے وہ ایک کارگر طریقہ علاج بھی ہے۔ ایک طرح سے تحلیل نفسی ادب پاروں اور آرٹ کے شاہکاروں کو جانچنے کا معیار بھی ہے۔ فرائیڈ کی جس کتاب نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ Das Traumdeuting یعنی خواب اور اس کی تعبیر ہے۔ خواب ایک ایسا نفسی مظہر ہے جس سے ہر فرد و بشر اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے کافی عرصے تک خواب کا مظہر اپنی تشریح کے لیے اوہام اور ظن و قیاس کا محتاج رہا ہے لیکن فرائیڈ نے پہلی بار خواب کے مظہر پر سائنٹفک انداز میں روشنی ڈالی اور ذہن انسانی کے اس اہم گوشے کے انکشاف تک پہنچا جس کو اس نے لاشعور (Unconscious) کا نام دیا ہے جس کے بغیر خواب اور دیگر نفسی مظاہر کی تشریح و توضیح ممکن نہیں ہے۔ اتفاق سے پوسٹ گریجویٹ ڈگری کے لیے میں نے جو مقالہ استاذی پروفیسر صلاح الدین مرحوم کی نگرانی میں سپرد قلم کیا تھا وہ فرائڈ کا نظریہ خواب اور اس کی تشریح و تنقید کے بارے میں تھا۔ (یہ مقالہ جامعہ عثمانیہ لائبریری کے مقالوں کے سیکشن میں حال حال تک محفوظ تھا لیکن اب ندارد ہے) مگر فرائڈ کے افکار کی اہمیت کو ایک حد تک تسلیم کرنے کے باوجود ہر طبع کی نفسیاتی الجھن کی تہہ میں Sex (جس کو فرائڈ اصطلاح میں libido کہتا ہے۔) کو ایک بنیادی عنصر قرار دینا درست نہیں ہے۔ چناں چہ فرائڈ کے اسی نقطہ نظر کو سخت تنقید کا ہدف بنایا گیا ہے۔

فرائڈ کے علاوہ ینگ، ایڈلر، میڈوگل اور ایرک فرام کی تصنیفات سے بھی میں نے استفادہ کیا ہے۔ ہربرٹ مارکوس کو میں اس صدی کا ایک اہم دانش ور تسلیم کرتا ہوں۔ خاص طور پر اس کی تصنیف Eros and Civilization سے میں متاثر ہوا ہوں کیوں کہ اس میں فرائڈین نظریہ حیات کی تنقید ملتی ہے۔

فکشن کی حد تک میں نے زیادہ تر یوروپی مصنفوں کی تخلیقات پڑھی ہیں۔ گوئٹے کا ناول ورودر کے غم، تھامس مین کا جوزف اینڈ برادرس، دستوسکی اور تورگنیف کے سب ہی ناول، کافکا کے ناول اور کہانیاں، کامو کا اجنبی، سارتر کی ٹرائی آلوجی (TRILOGY) آزادی کی راہیں، اور نوشیا، رومن رولاں کی ژاں کرسٹوفی، کو میں جدید یوروپی ادب کی عظیم تخلیقات میں شمار کرتا ہوں۔

فن ڈرامہ میں شیکسپیر کے ٹریجیڈی ڈرامے (مجھے یاد ہے کہ ہمارے بی۔ اے۔ کے نصاب میں شامل شیکسپیر کا ڈرامہ انٹونی اور کلیوپٹرا، پروفیسر ویر احمد روڈو پڑھاتے تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شیکسپیر کے بعض ڈراموں کے حافظ تھے) گوئٹے کا فاؤسٹ، شلر (گوئٹے کا ہم عصر) کا Robers ، ہنرک ابسن، برناڈشا، آرتھر ملر (ARTHER MILLER) کامو اور سارتر کے ڈراموں سے میں متاثر ہوا ہوں۔

برصغیر کے اردو مصنفوں اور شعرا کی حد تک اقبال، شبلی، سرسید، شیخ محمد اکرام، خلیفہ عبدالحکیم، رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر سید وحید الدین، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین کے ادبی کارناموں سے متاثر ہوا ہوں۔

ڈاکٹر محمد علی اثر

دکنی اردو میں خمریہ شاعری

خمریہ شاعری سے مراد وہ شاعری ہے، جس میں شراب اور اس کے متعلقات جیسے مئے خانہ ۔ ساقی ۔ رند ۔ پیر مغاں ۔ جام ۔ صراحی ۔ مستی و بے خودی وغیرہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے ۔ عربی اور فارسی میں بھی یہ موضوع کافی مقبول رہا ہے چناں چہ عربی میں ابو نواس اور فارسی میں خیام اور حافظ نے خمریاتی شاعری کو اوج کمال تک پہنچا دیا ۔ فارسی شاعری کے اتباع اور اثر پذیری کی وجہ سے اردو شاعری کا دامن، ہر زمانے میں، خمریات سے مالا مال رہا ہے اور شاعروں کے نزدیک یہ موضوع دل چسپی اور کشش کا باعث رہا ہے ۔

خمریہ شاعری کے سلسلے میں یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ خمریات میں جس شراب کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے وہ لازماً افشردہ ۔ انگور نہیں ہوتی بلکہ شراب معرفت بھی ہو سکتی ہے ۔ چوں کہ صوفی شاعروں نے مشاہدہ ۔ حق کی گفتگو بھی بادہ و ساغر کے پردے میں کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے ان کے نزدیک شراب سے مراد بادہ ۔ عرفان الٰہی، ساقی سے خمستان ازل کا ساقی، پیر مغاں سے مرشد کامل ۔ ساغر سے دل اور مئے کدے سے پیر طریقت کی خانقاہ ہے ۔ چند شعر دیکھیے : ۔

اٹھے کبھی گھبرا کے تو مئے خانے کو ہو آئے ۔۔۔ پی آئے تو پھر بیٹھ گئے یاد خدا میں
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو ۔۔۔ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
اللہ اللہ کیا مزا مرشد کے مئے خانے میں ہے ۔۔۔ دونوں عالم کی حقیقت ایک پیمانے میں ہے

شراب اور اس کے متعلقات سے شعرا نے نہ صرف بھٹی کی شراب اور بادہ ۔ معرفت کے تجربات اور مشاہدات کی عکاسی کی ہے بلکہ سماجی، سیاسی اور انقلابی موضوعات کی ترجمانی کے سلسلے میں بھی خمریہ شاعری کی اصطلاحوں سے کام لیا ہے ۔

یہ مئے خانہ ہے جام جم نہیں ہے ۔۔۔ یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے
ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے ۔۔۔ ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے
یہ بزم مئے ہے یاں کو تاہ دستی میں ہے محرومی ۔۔۔ جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے ۔۔۔ مزا تو جب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی

جہاں تک اردو میں خمریہ شاعری کا تعلق ہے، اس کے اولین نمونے دکنی ادب میں ملتے ہیں اور پھر بعد کے زمانے میں جن شاعروں نے اس موضوع پر بطور خاص داد سخن دی ہے، ان میں مرزا غالب ۔ ریاض خیر آبادی ۔ جگر مراد آبادی ۔ عبدالحمید عدم ۔ ساغر ۔ جوش اور صبا اور نگ آبادی کے نام اہمیت رکھتے ہیں ۔

یوں تو جوش ملیح آبادی، خمریاتی شاعری کے حوالے سے اپنے آپ کو حافظ و خیام کہتے ہیں ۔

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں ۔۔۔ کہ وہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریاض خیرآبادی اردو خمریات کے بادشاہ ہیں اور بقول محمد احسان الحق ان کے کلام میں ایک ہزار کے قریب اشعار خمریہ مضامین سے متعلق ہیں۔ (حفیظ صدیقی کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد ص ۷۳)

جہاں تک دکنی ادب میں خمریات کا تعلق ہے موجودہ معلومات کی روشنی میں قطب شاہی عہد کا شاعر سید محمود اردو کا قدیم ترین شاعر ہے جس کے کلام میں شراب اور اس کے متعلقات کا تذکرہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے "دیوان حسن شوقی" کے مقدمے میں محمود کی ایک غزل اور "تاریخ ادب اردو" (جلد اول) میں اس کی غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار درج کیے ہیں جن میں سے درج ذیل اشعار خمریات سے متعلق ہیں۔

شیخ و میں ہم مشرباں ہیں لیک ہنگام بہار
وہ چھپا پیوے شراب ہور میں پیدا شراب

جیو جدھاں ہمراہ ہوے باغ سوں بہتر ہے دشت
یہاں بھرے بھر بھر پیالے وہاں بھرے پینا شراب

خلق نے رنداں منیں محمود پینا کھول دیکھ
جیو شراب ہے، دل شراب، سر شراب ہے پا شراب

قطب شاہی عہد کے دوسرے شاعروں میں محمود کے بعد سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء) دوسرا شاعر ہے جس کے کلام میں خمریات کے وافر نمونے ملتے ہیں۔ محمد قلی اردو کا پہلا صاحب دیوان اور قادر الکلام ہے جس نے پچاس ہزار اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ محمد قلی ہی نے اردو میں خمریاتی شاعری کی طرف باقاعدہ توجہ کی ہے۔ وہ شباب اور شراب کا رسیا تھا۔ آئے دن اس کے محلوں میں رقص و سرور کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، جن میں ساغر و جام کے دور چلتے اور مطرب بادشاہ وقت کی غزلیں سازوں پر پیش کر کے انعام و اکرام حاصل کرتے تھے۔ محمد قلی ایک حقیقت پسند شاعر تھا اس نے اپنی نجی زندگی کی ساری تفصیلات اپنے کلام میں بے کم و کاست بیان کی ہیں جس میں اس کی عشق کوشی اور شغل مے نوشی بھی شامل ہے:

سکی آج پیالا انند کا پلا مج دو یاقوت ادھراں کی مستی دلا مج
اتے نیں ہے سورج چاند پیالے کی پروا تمھارے ہونٹ اچھیں گے جیسے بھائے قدح

سرمستی و سرشاری اور کیف و مستی کے علاوہ محمد قلی کی خمریات کی ایک اور نمایاں خصوصیت نغمگی و موسیقیت بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی بیشتر غزلیں ساز اور آواز کا جادو جگانے کے لیے لکھی ہیں:

ساقیا آشراب، رباب کہاں چند کے پیالے میں آفتاب کہاں
مد کے پیالیاں کا دور چلتا ہے نقل مد کا کہاں کباب کہاں
او کنول مکھ میں نیر ہے سنپور اس کے انگے تنک شراب کہاں

محمد قلی نے بعض مسلسل اور مربوط غزلوں میں "شراب" اور "ساقی" کے الفاظ کو ردیف کے طور پر استعمال کر کے خمریاتی شاعری سے اپنی والہانہ دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔

سہاگی تو مکھ دیکھ پیالا شراب   کہ پینا نشہ ساعت میں پینا شراب
ترے حسن تے وان دے شاہ کوں   تو مکھ کے عرق تے سو پینا شراب
تری نین مستی ہو روں روں چڑی   پرت سے بھریا دل کا پینا شراب
عشق ساز کے تار مطرب بجاؤ   کہ قانون تاناں میں پینا شراب
ازل تے نبیؐ حب قطب پیوتا   ترے پیالے سوں ساقی دینا شراب

....

مئے لعلی تے مکھ زردی ہمارا دور کر ساقی   مجالس زہرہ رقاصی سوں توں پر نور کر ساقی
جکوئی ہے عشق میں ثابت سدا ہے جیونا اس کا   سو اس کے ماؤں سوں مئے خانہ سب معمور کر ساقی
نہ جانوں روز محشر کیوں اچھے کا جاب و پرسش مج   کہ مئے خواراں منے اب تو ہمن مشہور کر ساقی

محمد قلی فارسی شاعری سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے خواجہ حافظ کا اثر بھی قبول کیا۔ وہ حافظ شیرازی کا پہلا مترجم بھی ہے۔ بقول ڈاکٹر
ر" محمد قلی کی شاعری پر سب سے زیادہ حافظ کا رنگ مسلط ہے۔ اس نے سینکڑوں غزلیں اسی رنگ میں لکھیں اور حافظ کی پچاسوں غزلوں کا
و میں ترجمہ بھی کیا۔ اور یہ ترجمہ نہایت کامیاب سمجھا جاسکتا ہے" (کلیات محمد قلی قطب شاہ ص ۴۶) خمریات کے موضوع پر حافظ کے
عار کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

آنکس کہ بدست جام دارد   جو کو ہتیلی جام لیا
سلطانی جم مدام دارد   سلطانی جم مدام لیا
آبی کہ خضر حیات ازو یافت   پانی کہ خضر حیات پایا
در مے کدہ جوکہ جام دارد   مد گھر تے تنک سو جام لیا
گل بے رخ یار خوش نباشد   پھل بن رخ یار خوش نہ دسے
بے بادہ بہار خوش نباشد   بن مد پھلی بہار خوش نہ دسے
طرف چمن و طواف بستاں   گشت چمن و ہوائے گلیاں
بے لالہ عذار خوش نباشد   بن پیالے کنار خوش نہ دسے

....

سخن درست بگو نمی توانم دید   درست بات کتا ہوں نہ جاسے مج تے دیکھیا
کہ مے خورند حریفاں ومن نظارہ کنم   شراب پیوے حریفاں و میں نظارہ کروں
گدائے مے کدہ ام لیک وقت مستی بیں   شراب خانہ کا مسکیں ہوں دیکھ مستی میں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم   کہ ناز ابر پہ کروں حکم تل ستارہ کروں
مراکہ نیست رہ و رسم لقمہ پرہیزی   جو مج میں نہیں ہمیں پر بھیزگاری کے کالاں
چرا مذمت رند شراب خوارہ کنم   شراب خور کوں پلاتے سوں کیوں اشارہ کروں

محمد قلی نے اپنی محبوباؤں کو مخاطب کر کے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں بھی خمریاتی شاعری کی جھلک موجود ہے:

پیالا لیو مرے لیچے لالا
کہ او پیالا ہے سورج تے نرالا

محمد قلی کی خمریاتی شاعری، صرف غزل اور نظم تک محدود نہیں بلکہ رباعی کی صنف میں بھی یہ اپنی بہار اور رنگارنگی دکھاتی ہے۔ محمد قلی کے دیوان میں ایک سے زاید ایسی رباعیاں موجود ہیں جن میں شراب اور اس کے متعلقات کا تذکرہ ملتا ہے:

مستی کے ملک میں ہے جہاں بانی منج   خوباں کوں دیکھن میں ہے مسلمانی منج
خمار کا خم خانہ اہے ٹھاؤں میرا   ہر مد کا سو بند نگیں سلیمانی منج

درج ذیل رباعی کے مطالعہ سے عمر خیام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

ہے بھل کا ہنگام مدسوں باراں حاضر   پھولاں کے نمن سارے ہیں یاراں حاضر
اس وقت میں کیوں توبہ کیا جائے منج   توبہ شکناں ہور نگاراں حاضر

محمد قلی کے علاوہ قطب شاہی عہد کے دیگر شاعروں میں جنھوں نے خمریات کو موضوع سخن بنایا ہے، ان میں عبداللہ قطب شاہ اور ملک الشعرا غواصی کے نام اہمیت رکھتے ہیں محمد قلی قطب شاہ کی طرح عبداللہ قطب شاہ کی غزلوں میں بھی محبوب کے حسن و جمال، رفتار و گفتار، لب و رخسار اور چشم و ابرو کی تعریف و توصیف بھی ملتی ہے اور خمریاتی شاعری کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اپنے ماما کی طرح اس نے بھی شراب کی تعریف میں متعدد شعر کہے ہیں: (۶)

ہوا کا وقت ہے خوش اس ہوا میں   صراحی ہور پیالے سات گمنا
مستانے سب گئے ہیں مئے خانے آج گھر گھر   مد پینے کی رضا کی جی تھے ہے چاند بالا
ہوا مد پینے کا آیا ہے پیارے   توں مد پینے کو سن کرتا اتالا
خبردے جام کوں ساقی کہ دور آیا ہے پھر جم کا   صراحی بات میانے لے انگن میں چاند ہو جھمکا

عبداللہ قطب شاہ کی خمریات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کلام میں ایک سے زاید قوافی کے اہتمام کی وجہ سے لفظوں کی جھنکار اور نغمگی اور موسیقیت کا احساس نمایاں ہو جاتا ہے:

پیالے پیالے پیالے یو پینا دنیا میں دنیا میں
یہی کچ ہے جینا

امنگ سوں آج اے ساقی دے پیالے بھر مئے باقی   کہ گزری حد تھے مشتاق حرت کر عیش کا چارا

بسنت کے تیوہار کے موقعے پر بھی شغل مئے نوشی بادشاہ وقت کی خوشیوں کو دوبالا کرتا ہے۔

بسنت آیا کھلایا پھول لالا   سکھی لیا اب صراحی ہور پیالا
لا صراحی کو پیالے سوں لگے   سر خوشی کا کام فرمایا بسنت

عبداللہ قطب شاہ کا ملک الشعرا غواصی بھی خمریاتی شاعری کا دل دادہ تھا۔ اس کے کلام میں شراب و مئے خانہ۔ صراحی و پیالہ اور ساقی و خرابات کا بار بار تذکرہ ملتا ہے۔ چند شعر دیکھیے:

پلا مست اے ساقی کہ مج عادت ہے پینے کا   ہو سرخوش دور یک دھرتے کروں کا رنگ سینے کا

دنیا ہے رہ گذر معشوق سوں خوش بیس پیالے پی   کہ ہوتا ہے کدورت دور پیالے دوئی پینے میں

ملک الشرا غواصی کو قدیم خمریاتی شاعری میں اس لیے بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس نے "پیالا" کی ردیف میں ایک ایسی مسلسل غزل لکھی ہے، جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دکنی شاعری میں "ساقی نامہ" کی طرح "پیالا" بھی ایک صنف سخن تھی۔ غواصی کا بیان ہے کہ اس کے پیش رو اور ہم عصر متعدد شاعروں نے اس صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ غواصی کا "پیالہ" ملاحظہ کیجیے:

پیا کے مست ادھر کی پایا جب خبر پیالا   پرت والیاں کوں شکرانے کی بانٹیا تب شکر پیالا
صراحی گردن اونچی کر اُسس سوں آئے خدمت میں   کیا اپنی محبت ہور کرم کا جیوں نظر پیا لا
طلب پیالے یہ دھرپتے ہیں پیالا اس سبب شاہاں   جو رازاں عین باطن کے کتا ہے کھول کر پیالا
جو کوئی عاشق ہو پیالا پیو نے جانیا لقیں جانو   اسے ہرگز نہ کر سکے کدھیں کوں بے خبر پیالا
مری ہستی منے لبستی سو مستی کد نہ ہوے خالی   کرم کر ساقی کوثر دیے ہیں مج کوں بھر پیالا
اگرچہ شاعراں بولے ہیں پیالے خوب خوب اما   غواصی کا پیالا سب کے پیالاں میں امر پیالا

قطب شاہی عہد میں محمد قلی، عبداللہ قطب شاہ اور غواصی کے یہاں خمریاتی شاعری کا مسلسل اور مربوط ارتقا ملتا ہے۔ ان کے خمریہ اشعار میں رندی و سرمستی کے ساتھ ساتھ ہوسناکی، خوبرویوں سے چھیڑ چھاڑ اور جذبات کی جولانیوں کی تصویر کشی بھی ملتی ہے۔ اس عہد کے دوسرے شعرا کے یہاں شراب اور اس کے متعلقات کی ترجمانی خال خال ہی نظر آتی ہے چند شعر دیکھیے:

مدھاں تے منے پرستی سو ہوا رنداں کے مذہب میں   تدہاں نے ناؤں بھاتا نئیں مجے ہرگز نمازی کا
ائم شراب شوق کوں پی کر متا اچھوں   باتاں چھپے سو کھول کے نت بولتا اچھوں
ترے بات میں شاہ جم جام اچھو   ہمیشہ بغل میں دل آرام اچھو

جہاں تک عادل شاہی دور میں خمریات نگاری کا تعلق ہے اس عہد میں قطب شاہی دور کی طرح خمریہ شاعری کا مربوط اور مسلسل ارتقا نہیں ملتا نصرتی۔ حسن شوقی، شاہی، ہاشمی اور شاہ سلطان اور شغلی جیسے صاحب دیوان شاعروں کے ہاں بھی شراب اور اس کے لوازمات کا تذکرہ ضمنی طور پر صرف اکا دکا اشعار ہی میں ملتا ہے۔ سوائے شاہ معظم کے، بیجاپور کے کسی بھی شاعر نے خمریات کو باضابطہ موضوع سخن نہیں بنایا شاہ معظم کے تذکرے سے قبل اس عہد کے دوسرے شاعروں کے خمریاتی اشعار ملاحظہ کیجیے:

سرمست نصرتی سوں چل سی نہ تج حریفی   خوباں کی انجمن کا ہے او رند لا ابالی (نصرتی)
ہوئیں مست تج نین تے جنم عاشقاں کے من   جس منے میں تج کرشمہ نہ ہوے سو اثر نکو (؍؍)
مجے دیدار ساقی کا ہوا تو دوہی دسے عالم   سکندر کا وو درپن لے کروں کیا جام لے جم کا (ہاشمی)
تب تے شراب کوں میں بولیا پلیت پانی   چاکھا ہوں پاک جب تے اے دھن ترے ادھر مست (؍؍)
تج ادھر منے شوق سوں چا کیا سو متوالا ہوا   آزلو مستاں ہوئے کر چھب سوں نروالا ہوا (سلطان)

تج حسن کا دیپک جنے دیکھا سو پروانہ ہوا　　　تیرے ادھر کا مئے جنے چاکیا سو دیوانہ ہوا　(شغلی)
تج وجہ کی مئے تاب تھے ناتاب لیا بے تاب تھا　　　تج بچن آواز تے بے ہوش تھے دانا ہوا　(〃)

جیسا کہ اس سے پہلے کہا گیا ہے، شاہ محمد حسینی معظم، عادل شاہی دور کا ایک ایسا قادر الکلام شاعر ہے، جس کی شاعری میں خمریات کے وافر نمونے ملتے ہیں اس نے بادہ و جام اور ساقی و میخانہ کی تعریف میں متعدد شعر کہے ہیں۔ معظم، ملک الشعرا نصرتی اور ہاشمی بیجاپوری کا ہم عصر شاعر ہے۔ اس نے متعدد غزلوں میں خمریاتی مضامین باندھے ہیں۔ بعض غزلیں تو ابتدا سے آخر تک اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہیں:

مجھے دلبر کے لب تھے نت پینا جم جام خوش لگتا　　　بچھڑیا مجھ کو بھاتا نئیں وصل آرام خوش لگتا
ایمان دے کتے ہیں کہنہ شراب لینا　　　دوچار جام پی کر دارو خمار کرنا
اے ساقی مہرباں تجھ سے عرض ہے یک پیالے کا　　　کدھیں ہوتا تو بہتر تھا نقل تجھ لب رسالے کا
مشرق طرف صبح کا دستا ہے دیکھ اجالا　　　ساقی منگا تو بیگی وہ نقل ہور پیالا
جنت منے کہاں ہے یہ جام ارغوانی　　　خالص شراب لاکر تجھ ہات سوں پلانا
صراحی نے سے پر کر کر لیا تھا ہات میں اپنے　　　مجھے بھی مست کرنے کو نشہ سرشار آیا تھا
مجھ کو اس دنیا منے کیا خوب مئے خانہ دسیا　　　روشن منور ہے بدل نادر سو خم خانہ دسیا
جب سے پیا ہوں جام میں اس مست کے دیدار کا　　　تب سے دیکھو دستا مجھے سب شہر اور بازار مست
مل یار سے پینا مئے باقی حیات ہے لگ　　　پینا بھی اور پلانا ساقی یہ سات ہے لگ
بات سوں ساقی کے جم جس کو میسر ہے جام　　　دولت عظمیٰ کتے عیش ہے اس کو مدام

مندرجہ بالا اشعار میں معظم نے شراب انگور کی تعریف اور اس سے رونما ہونے والے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن اس کے خمریہ اشعار صرف و محض شراب مجازی کے عکاس و ترجمان نہیں بلکہ بادہ۔ عرفان سے بھی لبریز ہیں۔ وہ حضرت قادر لنگا کو تال کا معتقد اور مرید تھا اور اپنی غزل کے کم و بیش ہر مقطعے میں اپنے مرشد کا نام لینا ضروری سمجھتا ہے۔ معظم کی شراب حقیقی کے چند مرقعے ملاحظہ ہوں:

پلا مجھ دور پھر ساغر اے حضرت ساقی کوثر　　　معظم عرض کرتا ہے پیالے اور نوالے
جس کیف کے پیے سے روشن ضمیر ہوتا　　　پیدا کتے ہیں اول جم کا او جام پینا
ساقی ہے تو ہمارا دے جام بھر لبالب　　　سرمست کر دکھا مجھ سرشار یا محمدؐ
قادر ہوا ہے ساقی ڈرتا ہے کیوں معظم　　　قاضی اپر ہے ظاہر کیا ہے حجاب لے لے
پیتے ہیں زاہداں سب کیوں نئیں پیتا معظم　　　قادر ہوا ہے ساقی اور گل عذار خوش تر

معظم نے اپنے خمریاتی کلام میں نہ صرف شراب مجازی اور بادہ۔ عرفان کے مضامین اور نکات پیش کیے ہیں بلکہ انھیں اردو کا پہلا "ساقی نامہ" لکھنے کا اعزاز بھی حاصل ہے (ڈاکٹر حسینی شاہد۔ شاہ معظم ص، ۱۹) ساقی نامہ اگرچہ ساقی و شاہد، مئے و مینا، نغمہ و مطرب اور کیف و مستی کے مضامین سے عبارت ہے لیکن اس میں کبھی کبھی تصوف و حکمت، دنیا کی ناپائیداری اور غم روزگار کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔ ایک عرصہ تک محمد قلی قطب شاہ... محمد قلیبہ دردمند کے ساقی نامے کو اردو کا پہلا ساقی نامہ سمجھا جاتا تھا لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں، اردو کا پہلا "ساقی نامہ" لکھنے کا

سہرا شاہ معظم کے سر ہے۔۔ڈاکٹر حسینی شاہد معظم کے ساقی نامے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"معظم کے ساقی نامے کا موضوع بظاہر مئے و نغمے کا مجازی موضوع معلوم ہوتا ہے لیکن پوری مثنوی بار بار پڑھ جائیے اس کے باوجود یہ تصفیہ کرنا مشکل ہوگا کہ شاعر کے فکر و فن کو قوت محرکہ حقیقت سے مل رہی ہے یا مجاز سے تاہم معظم کے یہاں یہ چیز کھٹکتی نہیں ہے۔اس لیے کہ وہ مجاز و حقیقت کے تار حریر دو رنگ سے اپنی نظم کا تانا بانا تیار کرنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔(شاہ معظم ص ۹۵)

معظم نے موضوع کے اعتبار سے اپنے "ساقی نامہ" کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے حصے میں شیشہ و ساغر اور سرمستی و سرشاری کے مضامین شاعرانہ حسن کے ساتھ پیش کیے ہیں جب کہ اس کا دوسرا حصہ مطرب و نغمہ یا ساز اور آواز سے پیدا ہونے والی سرور و نشاط کی کیفیات کا عکاس ہے۔"ساقی نامہ" کے آغاز میں خدا، حضور اکرمؐ اور حضرت علیؓ کی ساقی گری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

الہٰی توں ساقی ازل سوں مدام   پلاتا ہے توں جام سب کو تمام
ہمارا ہے ساقی خدا کا رسول   مناجات میرا کرے گا قبول
نبی کا سو نائب علی ہیں کتے   او بر حق خدا کا ولی ہیں کتے
اسی سونچ محشر میں مجھ کام ہے   اسی سونچ دنیا میں آرام ہے

ساقی حقیقی سے تخاطب کے بعد پھر معظم شراب کی التجا اس انداز سے کرتے ہیں جیسے یہ شراب انگور ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ رات کے گذر جانے کے اندیشے کا اظہار بھی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ طلوع آفتاب سے پہلے جس قدر پی سکتے ہوں پی لیں۔(شاہ معظم ص ۸۸)

قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنت کے زوال کے بعد اردو شعر و ادب کی سرگرمیاں گولکنڈہ اور بیجاپور سے اورنگ آباد منتقل ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اورنگ آباد علم و ادب اور شعر و سخن کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے سرزمین دکن پر ابھر آیا۔

ولی اور سراج، اورنگ آباد کے شاعروں میں آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں یہی وہ قد آور اور باکمال سخن ور ہیں جن کے ساتھ ایک طرف دکنی شاعری کی عظیم روایات اختتام کو پہنچی ہیں تو دوسری طرف ان شاعروں نے قدیم اردو شاعری کی روایت کا تسلسل شمالی ہند کی شاعری سے ملانے کی بیش بہا خدمت انجام دی۔جہاں تک اس دور کی خمریہ شاعری کا تعلق ہے، دیوان ولی میں شراب اور اس کے لوازمات کے بارے میں اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔البتہ سراج (۱۷۱۵ء تا ۱۷۶۳ء) نے خمریات کو باقاعدہ موضوع سخن بنایا ہے۔سراج کی شاعری کا ایک اہم موضوع تصوف ہے۔عشق میں ان کی از خود رفتگی مجاز اور حقیقت کی حدوں کو ایک کر دیتی ہے اور محبت کا دائرہ وسیع ہو کر کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔وہ حضرت شاہ عبدالرحمن چشتی کے مرید تھے۔اکثر و بیشتر ان کے اوپر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔بے خودی کے عالم میں اپنے گھر سے نکل کھڑے ہوتے، رات دن صحرا نوردی کرتے اور اپنا زیادہ تر وقت حضرت برہان الدین غریب کے آستانے پر گزارتے تھے۔سراج کی شاعری میں ایک طرف بادہ، حقیقت کا رنگ دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف افشردہ، انگور کی جھلک نظر آتی ہے۔

اردو شاعری میں تصوف کی روایت بہت عام ہے۔متعدد شاعروں نے مسائل تصوف سے اپنی دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔اردو غزل گو شاعروں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو سینکڑوں شاعر ایسے مل جاتے ہیں جنھیں تصوف سے عملاً کوئی تعلق نہیں، اسی وجہ سے ان کے کلام میں تصوف کے مسائل خشکی پیدا کرنے والے مسائل بن جاتے ہیں اس کے برخلاف سراج کے کلام میں روحانی کیفیات اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ

نمایاں ہیں۔ انھوں نے مسائل تصوف کو سادہ اور موثر انداز اور عشقیہ لب و لہجہ میں پیش کیا ہے:

شراب معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے　　در و دیوار اس کوں مظہر محبوب ہوتا ہے

جام مئے الست میں بے خود ہوں اے سراج　　دور شراب و شیشہ پر مل سیں کیا غرض

شراب نور جلالی میں بس کہ ہے لب ریز　　سراج چرخ میں ہے آفتاب کا شیشہ

اے ساقی دل آگاہ کر دردسر سیں فارغ　　مخمور ہوں عطا کر جام ازل کی مستی

اردو کے صوفی شاعروں میں سراج کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ صاحب دل صوفیوں کی صحبت میں بسر کیا تھا اور ان کے کلام میں روحانی تجربات کی حرارت بھی ملتی ہے لیکن ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ان کے ضخیم کلیات میں سو دو سو اشعار کو چھوڑ کر تصور عشق خالص مادی اور مجازی ہے۔ یہی حال ان کی خمریات کا بھی ہے جن میں شراب انگور کا کیف اور مستی " بادہ عرفان " کی سرشاری کے مقابلے میں زیادہ نظر آتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پی کر شراب شوق کوں بے ہوش ہو بے ہوش ہو　　جیوں غنچہ لب کوں بند کر خاموش ہو خاموش ہو

پلاکر جام اپنی چشم کی گردش سیں پے در پے　　کیا ساقی نے مج کوں بے خبر آہستہ آہستہ

بہار ساقی ہے، بزم گلشن، ہیں مطربان چمن شرابی　　پیالہ گل، سرو سبز شیشہ، شراب بو اور کلی گلابی

مئے نوش محبت نہ کرے منت مینا　　تجھ لب کی لطافت لب ساغر کوں کہاں ہے

جس کوں ہے ذوق مئے ساغر مدہوشی کا　　ہے اسے شغل تری چشم سیں مئے نوشی کا

ارے شراب خرد کے کیفی نہ کرتوں دعوائے پختہ مغزی　　مئے محبت کا جام پی توں کہ اب تلک ظرف خام ہے گا

مثال شیشہ کروں کیوں نہ سجدہ ساقی کوں　　شراب شوق ستی جام دل کیا لب ریز

سراج نے اپنے بعض خمریہ اشعار میں ناصح، زاہد اور شیخ کی ظاہر داری اور ریاکاری کی طرف طنزیہ انداز میں اشارے بھی کیے ہیں چند شعر دیکھیے:

اگر مسجد میں اے زاہد و مست نیم خواب آوے　　ترے ہر دانۂ تسبیح میں بوئے شراب آوے

اس ادب گاہ کوں تو مسجد جامع مت بوجھ　　شیخ بے باک نہ جا گوشۂ مئے خانے میں

ترے سخن میں اے ناصح نہیں ہے کیفیت　　زبان قلقل مینا سیں سن کلام شراب

پری کی مجلس میں تجھ کوں زاہد ہنوز پروانگی نہیں ہے
مئے محبت کوں نوش کرتوں کہ اب تلک تجھ کوں خادم دستا

سراج کو شیشہ و جام، مئے و مینا اور اس کے متعلقات سے فطری لگاؤ تھا جس کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے متعدد غزلوں کی ردیف " شراب " باندھی ہے۔ مثال کے طور پر ایک غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو:

ہوا ہے خط جبیں جس کو خط جام شراب　　نگین دل پہ کیا نقش اس نے نام شراب

ہے عکس چہرہ خورشید رو پیالے میں　　سراج جلوہ نما ہے مہ تمام شراب

--------OOO--------

مصحف اقبال توصیفی

کچھ بات نہیں کرتے ہم سے

کچھ کھوئے کھوئے رہتے ہو
کچھ بات نہیں کرتے ہم سے
کوئی اپنا روٹھ گیا جیسے
کوئی ساتھی جیسے چھوٹ گیا
اک خواب تھا۔جو شب ڈھلتے ہی
بالیں سے گرا
اور چھن سے جیسے ٹوٹ گیا

○

کیوں اپنے لہو کی گردش میں
اس خواب کی چیخیں سنتے ہو؟
کتنی صبحیں، شامیں بیتیں
تم آج بھی اپنی پلکوں سے
اس خواب کی کرچیں چنتے ہو
اب تم کو کیسے سمجھائیں
وہ رات گئی۔وہ بات گئی
دن نکلا ہے، تم سے ملنے
کتنی خوشیاں، غم آئے ہیں
دیکھو تو سہی۔ہم آئے ہیں
کچھ بات نہیں کرتے ہم سے!!

●●●

حمید الماس

عرش سے پرے ہوتا...

گھومتا پھرتا ہوں روز و شب
مکاں کی جستجو میں
شہر کی خاموش گلیاں
میری آہٹ سن کے دامن کھینچ لیتی ہیں
کشادہ راستوں میں
چلتے چلتے پاؤں زخمی ہو گئے ہیں
عزت و شہرت
مشقت اور محنت
مل گئیں سب خاک میں
سر برہنہ ہے زمیں
خواب کی دنیا مگر آباد ہے
اوڑھ کر سو جاؤں تاروں کی ردا
چارہ گر کوئی نہیں اس کے سوا

○○○

سلطانہ شرف الدین احمد

تحفہ

(۱)

اندھیری رات میں خاموشیوں کا گہرا ہجوم
ہیں لوحِ وقت پہ نقوش چند تحریریں
سلگتی بجھتی ہیں اکثر مرے تخیل میں
بس ایک یاد ابھرتی ہے پھلجھڑی جیسے
پھر ایک مار سیہ پھن کو اپنے پھیلائے
مرے وجود کو ڈسنے کا منتظر جیسے
عجیب خوف سے اک جھر جھری ابھرتی ہے

(۲)

سحر کے وقت وہ تازہ ہوا کے جھونکوں میں
گلوں کا رقص ، سبک سار جھولتی بیلیں
ہیں گویا تجھ سے مخاطب چمن کے گوشوں سے
وہ چہچہاتے پرندے ، صدا ، وہ جھرنے کی
یہ دل فریب گلستاں کسی کا تحفہ ہے
میں بھول جاتی ہوں کرب آشنا فسانے کو

رفعت سروش

لفظوں کے گھروندے

چند لفظوں کے گھروندے
اور کچھ بوسیدہ کاغذ
عمر بھر کی ہے کمائی
زندگی! بس اتنی مہلت
ان گھروندوں کو بہادوں
وقت کی چنچل ندی میں

کیا خبر یہ بہتے بہتے
جالگیں اک ایسے ساحل پر،
جہاں بے لفظ، بے معنی ہو دنیا
اور پھر بے آسرا مخلوق
ان میں دو گھڑی آرام کر لے
زندگی کے نفس مطلب کو سمجھ لے
آنسوؤں اور درد کی تحریر پڑھ لے۔

مظہر مہدی

قدیم دوست کے لیے

تم میں
میرا بچپن کہیں
چھپ کے بیٹھا ہے
میرے سفید بالوں میں
وہ ایک کونہ
جو ابھی وقت کی دست رس میں نہیں
وہی تمھاری یاد کی سوغات ہے
ہزاروں دنوں کے بیچ بھی
وہ دن کیسے منور ہیں
کہ ان کی کوئی رات نہیں
میری دھندلی بصارتوں میں
وہ سارے لفظ
یوں روشن ہوتے جاتے ہیں
جیسے سورج کی پہلی کرنیں
تمھارا خیال مجھے کھلے میدانوں کی
سیر کرواتا ہے
جہاں لمس کے لہلہاتے پھول کھلتے ہیں
کیا تم بھی کبھی
ان سیاہ راتوں میں
ان اجلے دنوں کو یاد کرتی ہو۔

ایک نظم

کھڑکی سے باہر
کھلے میدان میں
جہاں چاروں جانب، دھند کہرا
گھرے دھند اور کہرے میں
دو بچے کھیل رہے ہیں
یا، اس کوشش میں ہیں
کہ گیند کو اپنے بس میں کرلیں
تم اور میں
ایک دوسرے کو اپنے بس میں کرنے کی کوشش میں
بے بس ہو کر
کھڑکی سے باہر
کھلے میدان کی جانب
یوں دیکھ رہے ہیں
جیسے وہاں ہمارا وجود
پوشیدہ ہو۔

ستار صدیقی

حرفِ کن

پانی ——— کہ جسے
مادرِ آتش نے
رو رو کر جنم دیا
اور
ہنس ہنس کر خود کو بھی اسی میں تحلیل کر دیا
بطنِ خاک میں فولاد نے آہیں بھریں
خنجر بننے کی تمنا میں
صحن ہوا میں شاخِ نباتات نے انگڑائی لی
بھوک اگانے کے لیے
اور ہا نپتی کانپتی زندگی ایجاد کی
پھر
فطرت نے کسی بے چین گھڑی میں
دو آنکھیں مصور کیں
دیکھنے والی
سوچنے والی
اور
برسنے والی،
تاکہ
اس چنگاری کو
جو کبھی
"حرفِ کن" میں دبی رہ گئی تھی
بجھا سکے سا

راہی فدائی

انتقام
(مادرانِ بوسنیا کے نام)

ان گنت عفیفائیں
بے قصور رحموں میں
ظلم و کفر کالاوا
پالنے پہ ہیں مجبور!
چشم و لب گریزاں ہیں
ذہن بھی پریشاں ہے
قلب بھی پشیماں ہے
مرگِ ناگہانی کیوں
حرف بے معانی ہے
عدل کی نگاہوں میں
پیش گوئی لکھی ہے
"کوہ آتشیں اک دن
خود ہی پھوٹ نکلے گا
قید کرنے والے کو
راکھ کر کے چھوڑے گا۔"

••••••••••••••

مصحف اقبال توصیفی

○

ں اٹھ کے آ تو گیا اس کے در کی چوکھٹ سے
بار میرا وہیں سو گیا ہے سر رکھ کے

میٹے اپنے پروبال میں نے منزل پر
یں آگیا ، مرے نقش قدم نہیں پہنچے

زار سنگ ہی تو ہی آئینہ ہے مرا
۔ مجھ کو دیکھنا چاہے۔ ذرا تجھے دیکھے

ہی جو غیر نے ، اب کیسے سہلاتا ہے
ہ ایک بات جو میں تھک گیا ہوں کہہ کہہ کے

وہ گیت کب کے ہواؤں میں ہوگئے تحلیل
جو آنسوؤں نے مرے دل کی ریت پر لکھے

" غزل ہے سب سے الگ اس کی " ۔ کون کہتا تھا؟
کبھی سنے نہیں اشعار میرے مصحف کے

اقبال متین

○

پو پھٹے میرے بغیچے کا عجب منظر ہے
کوئی پھولوں میں بسائے ہوئے چشم تر ہے

یوں چلا جاتا ہے رستہ ہوں میں جیسے اس کا
اس طرح آتا ہے دل جیسے اسی کا گھر ہے

ٹوکتا رہتا ہے ہر ایک قدم پر مجھ کو
وہ مرا دوست نہیں ہے جو مرے اندر ہے

کون دیکھے مری پہچان یہی " لفظ " تو ہیں !
دوست دہلیز تک آکر بھی نہ سمجھے در ہے

مزاحمتوں کو چھپاکر بھی سرخ رو رہنا
منافقت ہی ، پندار شعبدہ گر ہے

اور کیا ہوگا نگاہوں کی بلندی سے پرے
ہم تو یہ سوچ کے چپ ہیں ، یہیں خیر و شر ہے

ہائے کیا بات لیے بیٹھے ہو اقبال متین
وہ بڑے لوگ ہیں ، بے چاروں کے دل میں سر ہے

رضا صفی

کھلی آنکھوں میں ایسا خواب منظر کس لیے ہے
ہمارے جسم پر زخموں کی چادر کس لیے ہے

وہی صحرا، وہی سورج سروں پر کس لیے ہے
سلگتی ریت پر پھولوں کا لشکر کس لیے ہے

جو مدت سے ہے آنگن میں ہمارے، اس شجر کی
ہری ٹہنی پہ افسردہ گُل تر کس لیے ہے

وہ خوش بو ہے اسے تو قید کوئی کیا کرے گا؟
وہ یوں سمٹا ہوا خود اپنے اندر کس لیے ہے

نہیں ہے اپنے چہرے کی اسے پہچان شاید
یہ ہم کو دیکھ کر آئینہ ششدر کس لیے ہے

اگر ہم پاک طینت، پاک سیرت، پاک دل ہیں
دریدہ اپنے کھوتے کی چادر کس لیے ہے

ارادہ کیا ہے، کیا نیت ہے، کیا منصوبہ اس کا
ہوا کے ہاتھ میں پنہاں یہ خنجر کس لیے ہے

گدائیں ساری عاجز، بیلچے لاچار ہیں سب
زمیں مہرووفا کی اتنی بنجر کس لیے ہے

جو اپنا مدعا ہے، اپنی حسرت، اپنا ارماں
وہ سرتابہ قدم پتھر ہی پتھر کس لیے ہے

خدا حافظ کہے ان کو زمانہ ہوگیا ہے!
یہ اک کہرام سا سینے کے اندر کس لیے ہے

سمندر ہی سمندر ہے وجود اس کا تو وصفی
ہماری پیاس کے صحرا سے باہر کس لیے ہے

وقار خلیل

○

دنیا کے غم سہتے رہنا اچھا ہے
آنکھوں سے آنسو کا بہنا اچھا ہے

روز روز کا ملنا ویسے ٹھیک نہیں
گاہے ماہے ملتے رہنا اچھا ہے

بے مقصد جینا تو کوئی بات نہیں
مقصد کی خاطر ہی جینا اچھا ہے

بستی بستی یوں بھی گزراوقات کرو
خوش بھی رہنا، دکھ بھی سہنا اچھا ہے

سچ کہتے اک عمر کٹی، گھاٹے میں رہے
کبھی کبھی تو جھوٹ بھی کہنا اچھا ہے

برا نہیں ہے سیکھنا اور زبانیں بھی
اردو لکھنا، اردو پڑھنا اچھا ہے

●○●

(نوٹ: شاعر نے قوافی میں آزادی لی ہے
لیکن یہ درست نہیں ہے۔)

شمس اعجاز

○

خوشیوں کو بیاں مانتے نہیں یہ لوگ
علامتوں کی زباں جانتے نہیں یہ لوگ

بدن پہ ریشم و کم خواب ٹانک لے بھائی
غریب شخص کو پہچانتے نہیں یہ لوگ

غلط کہوں گا تو سب ہی یقین کرلیں گے
جو سچ کہوں تو اسے مانتے نہیں یہ لوگ

مجھی سے پوچھیے اس پارسا کے بارے میں
مری طرح اسے پہچانتے نہیں یہ لوگ

یوں آسمان سے تارے بھی توڑلائیں گے
زمیں کی خاک مگر چھانتے نہیں یہ لوگ

کسی سے کوئی شکایت نہیں مجھے اعجاز
میں جانتا ہوں مجھے جانتے نہیں یہ لوگ

●○●

امراؤ طارق

اکیسویں صدی کا سقراط

ہم سب اندھے ہو چکے تھے اور جانے کب ہمارے پاؤں کے نیچے سے وہ قالین کھینچ لیا گیا تھا جس پر بیٹھ کر ہم سب بہت اونچی اڑانوں پر نکل جایا کرتے تھے اور سب مل کر فضاؤں کی تسخیر کے خواب بنا کرتے تھے۔ ہمیں یہ راز معلوم تھا کہ ہر نئی تخلیق یا فتح سے پہلے خواب بھی دیکھنا ضروری ہے خواب دیکھے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم فضاؤں کی تسخیر کے خواب بھی اسی لیے دیکھتے تھے کہ خواب، ہم بیان کریں گے تعبیر دوسرے لے آئیں گے۔ مگر ہمارے پاؤں کے نیچے سے وہ قالین ان لوگوں نے کھینچ لیا تھا۔ ہم سب زمین پر ہتھیلیاں پھیر پھیر کر قالین تلاش کر رہے تھے، ہم میں سے بعض کا خیال تھا کہ بینائی جانے کے باعث، ہم غلط سمت میں نکل گئے ہیں اور قالین، ہم سے دور ہو گیا ہے۔ ہمیں صحیح سمت معلوم نہیں۔ ہماری بصارت زیادہ اونچائی سے سورج کو دیکھتے رہنے کے باعث ضائع ہوئی تھی، ہمیں تو صرف یہ علم تھا کہ گہنائے ہوئے سورج کو دیکھنے سے بینائی چلی جاتی ہے اور گہنائے ہوئے چاند کو دیکھنے سے حاملہ عورت کے رحم میں بچے کے کسی عضو کے ضائع ہو جانے کا احتمال رہتا ہے سو، ہم اپنے مزے سے قالین پر بیٹھے خواب دیکھنے میں معروف رہے اور ہمیں یہ بتایا گیا کہ سورج دیکھ کر اندھے ہونے والوں کے لیے سرکاری ہسپتالوں میں ضروری دوائیں، مناسب سہولتیں اور آنکھوں کے ڈاکٹر نہ تھے۔ ہر سال میڈیکل کالجوں سے ہزاروں ڈاکٹر پاس ہو کر نکلتے ہیں پھر ہاؤس جاب کرتے ہیں۔ انھیں میڈیکل اگر نہ ممکن ہو سکا تو انجینیرنگ کالج میں ادبدا کے داخلے مل جاتے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان وہ دیتے ہیں بھاگ دوڑ ماں باپ کرتے ہیں غرض کہ اتنے فی صد نمبر مل جاتے ہیں جتنے میڈیکل اور انجینیرنگ کالج میں داخلے کے لیے ضروری ہوتے ہیں پھر ہاؤس جاب کرتے ہیں جو ان کا انتظار کرتی رہتی ہے اور امریکہ اور برطانیہ کا ویزا ہمیشہ ان کے پاسپورٹ پر اس طرح لگا رہتا ہے جیسے لمبے سفر پر روانہ ہونے والی جیپ کی پٹرول کی ٹنکی لبالب بھری رہتی ہے اور ویزے کی تاریخ گزرتے ہی انجن آئل کی طرح نئی ڈلوالی جاتی ہے۔ یہ تمام زحمت ان کے ڈرائیور اٹھاتے ہیں ڈاکٹر اور انجینیر بننے والے لڑکے ہوسٹلوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کلاشنکوف کاندھے پر لٹکائے اوپر سے چادر ڈالے لینڈ کروزر میں بیٹھے لڑکیاں تاڑتے رہتے ہیں یا ڈاکے مار لیتے ہیں اور پانچ سال میں اتنا کما لیتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ کی تعلیم کے دوران شراب کے خرچ کا بوجھ والدین پر نہ پڑے۔

ہم قالین کے موہ میں زمین پر ہتھیلیاں پھیرتے پھیرتے تھک گئے اور لہولہان ہتھیلیوں سے ٹیسیں اٹھنے لگیں تو زمین پر بیٹھ کر رونے لگے۔ ہم نے تسخیر کائنات کے جو خواب دیکھے تھے وہ اب بکھر گئے تھے اس لیے، ہم نے چپ سادھ لی اور ایک دوسرے سے دور چلے گئے۔

وہ سب ادھر ادھر پھیل گئے اور سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے لوگوں میں سے کسی ہمدرد کو روک کر پوچھتے آپ نے وہ قالین تو نہیں دیکھا ہے۔

"کون سا قالین؟" لوگ سوال کرتے۔

"وہی جس پر بیٹھ کر ہم نے تسخیر کائنات کا خواب دیکھا تھا۔"

لوگ یہ سن کر ہنسنے لگتے۔

"بابا۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں لوگ آپ کو پاگل سمجھیں گے۔"

"نہیں بیٹے میں پاگل نہیں ہوں۔ میں نے اپنے جیسے بہت سے سوچنے والوں کی طرح بہت سے خواب دیکھے تھے۔ ابھی کوئی سو سال پہلے کی تو بات ہے۔ مگر تم ان خوابوں سے ناآشنا ہو اس لیے مجھے پاگل سمجھ رہے ہو میری دماغی صحت پر شبہ نہ کرو میری باتیں غور سے سنو۔"

"ہم تمھاری بات غور سے کیا سنیں تم جس لب و لہجے میں بات کرتے ہو وہ ہم مشکل سے سمجھ پاتے ہیں۔ کہیں تم اصحاب کہف کی طرح کسی غار میں روپوش رہ کر تو نہیں نکلے۔ ہمیں دکھاؤ تمھاری جیب میں کون سے سکے ہیں اور ان پر کس زبان میں قدر کا تعین ہے اور ان سکوں کا جاری کرنے والا کون ہے اور تمھارے ساتھ کوئی کتا بھی ضرور ہو گا۔"

"تمھیں، ہماری شناخت کے لیے سکوں اور کتوں کی نشانیاں دکھائی ہوں گی۔ ہمیں تعداد کا تو علم نہیں مگر جب ہمارا قالین ہم سے نہ چھنا تھا تو ہمارے گرد کتے ہی کتے تھے جو ہر وقت بھونکتے رہتے تھے۔ ہمارے چاروں طرف کتوں ہی کی آوازیں تھیں، طرح طرح کی، غراتی ہوئی، دھمکاتی ہوئی، للچائی ہوئی، بھاری بھرکم، ہلکی پھلکی اور نقلی دوسروں کی منھ میں ڈالی ہوئی آوازیں۔ ان آوازوں ہی سے ہم موسم کا حال معلوم کر لیتے تھے اور اپنی چھتریاں ساتھ لے لیتے تھے۔ ہمیں ایک دن پہلے علم ہو جاتا تھا کہ کل کا موسم کیسا ہو گا اور ہمارے سکوں کا وزن اپنا نہ تھا قدر بھی اپنی نہ تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہمارا سکہ تو سکہ تھا ہی نہیں۔ سکہ تو اس کا چلتا ہے جس کی عزت ہوتی ہے کوئی وقار ہوتا ہے کوئی قوت ہوتی ہے۔ ہم تو مرد سے نامرد ہوئے پھر وہ بھی نہ رہے تو ہمارا سکہ کیا چلتا۔

ہمارا قالین بالآخر ہمیں نہ مل سکا۔ ہمارے خواب ادھورے رہ گئے۔ روشنی سے ہمارا رشتہ منقطع ہو گیا تب ہم نے اسے تلاش کیا جو ہمارے قالین کے راستوں اور سمتوں کا تعین کرتا تھا۔ وہ اس دن بھی ہمارے ساتھ ہمارے قالین پر موجود تھا مگر اس نے ہمیشہ کی طرح اس دن بھی گہرے سیاہ رنگ کے شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی اس کی آنکھیں بصارت چھین لینے والی شعاعوں کی زد سے محفوظ تھیں لیکن اس نے ہمارے ساتھ گم شدہ قالین کی تلاش ترک کر دی اور گوشہ نشین ہو گیا۔ ہم نے اس کی گوشہ نشینی اور پھر جلاوطنی قبول کر لی اس لیے کہ ہمیں علم تھا کہ وہ اسے زندہ نہ چھوڑیں گے۔

"اس کی بصارت محفوظ ہے" سب حیران ہیں۔

"وہ بہت دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے" سب خوف زدہ ہیں۔

"وہ اب بھی خواب بنتا ہے اور ہم انتظار کی حالت میں ہیں۔" وہ سرگوشیاں کرتے ہیں۔

"اسے گرفتار کر لو۔ اس پر ہماری بنائی عدالت میں مقدمہ چلاؤ اور اسے پھانسی دے دو ـــــ یہی آخری اور متفقہ فیصلہ ہے۔"

"مگر وہ ہماری دست رس سے دور ہے۔" اطلاعاً عرض ہے۔

"ایک پیالے میں مشروب تیار کرو اس میں زود اثر زہر ملادو پھر اسے اتنا مجبور کرو کہ وہ زہر کا پیالہ بہ رضا و رغبت منھ سے لگالے اور زہر پی لے۔ سقراط نے یہی کیا تھا۔"

"اوکے سر۔"

اس نے مگر ہم سے کہا ہے کہ اپنی بصارت اور دانش کی حفاظت کرو ورنہ خالی ہاتھ رہ جائیں گے اور ہاتھ بھی قلم ہو سکتے ہیں۔

○ ○ ○

مقصود الٰہی شیخ

رگ سنگ

بیتے ہوئے لمحوں، گذرے دنوں اور ماضی میں ڈھل گئے برسوں کا شمار اپنے ہی زخموں کے انگور پھوڑنے کے سوا انگاروں پر چلنے اور شعلوں میں جلنے کا ایسا عمل تھا جو شاہ جہاں بیگم کو ہرگز پسند یا منظور نہیں تھا مگر اپنے اوپر بیتی ذرا ذرا یاد تھی۔ شاہ جہاں بیگم نگم پلی سے چلی اور حیدر آباد کالونی آتو گئی تھیں مگر اپنے پیچھے اپنے ہی قدموں کا بنایا ایک ایک نشان ساتھ ساتھ مٹاتی آئی تھیں۔۔

کاش! انھوں نے کراچی سے لندن آتے ہوئے بھی یہی عمل دہرایا ہوتا!

آج شاہ جہاں بیگم کی کوکھ سے جنم لینے والی ان کی اپنی بیٹی ممتاز محل پاشا یہ نہ کہتی "اماں! یاں سے چلے جاؤ!!" انھوں نے اپنے شوہر کی طرف کس بے لبی سے دیکھا تھا؟

کراچی ایک پڑاؤ تھا جس کی طرف پلٹنے کی سوچ انھیں آہی نہیں سکتی تھی۔

"پاشا ٹھیک بولتے ہیں" اکبر علم دار نے بیٹی سے نظریں ہٹا کر شاہ جہاں بیگم پر محبت بھری نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"عمرہ کرتے ہوئے جاؤ۔۔۔ اماں! اللہ تمھیں معاف کرے گا!!" ممتاز محل پاشا نے بظاہر جھجھکتے ہوئے لہجے میں تو نہیں کہا تھا مگر شاہ جہاں بیگم کے کلیجے پر جیسے کٹاری چل گئی ہو۔۔۔ انھوں نے گھائل نظروں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جیسے پکار رہی ہوں، ظالم! ظالم! ظالم!!

ممتاز بیگم پاشا ہی وہ ہدف تھا جسے پالینے، جیت لینے کے لیے شروع سے انھوں نے اپنا آپ داؤ پر لگا دیا تھا۔ زندگی جس موڑ پر، اتنی بڑی ہار پر، ان کی آنکھوں تک خشک ہو گئیں۔۔۔۔۔

کوئی آنسو نہ گرا۔

ان کی آنکھوں سے دو آنسو گرتے بھی تو ایک میں پورا حیدر آباد اور دوسرے میں ساری دلی غرق ہو جاتی۔۔۔ کراچی ممتاز محل پاشا کا جہیز تھی۔ جس طرح بیٹی کو جہیز دینے کے بعد محل کٹیا بن کر رہ جاتا ہے، کراچی شاہ جہاں بیگم کے لیے خالی خانہ تھا۔ کیا اب وہاں جا کر ان کو ٹھکانا بنانا ہو گا؟؟ انھوں نے گھبرا کر اکبر علم دار کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اکبر نے، ان کے شوہر نے، ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں یوں تھاما جیسے شاہ جہاں بیگم کا پہلا اور آخری سہارا وہی تو ہیں! اکبر علم دار نے بھی تو دنیا تیاگ کر اس ایک عورت کو اپنایا جو ان کے لیے جہان اندر جہان تھی۔

اکبر پہلے۔۔۔ اشوک چاؤلہ تھے۔

اشوک چاؤلہ ایک سرکاری کانفرنس کے سلسلے میں چند روز کے لیے دہلی سے حیدر آباد آئے تھے۔ شاہ جہاں بیگم گریجویشن کے بعد نئی نئی ملازمت میں آئی تھیں اور محکمے کی طرف سے استقبالیہ کمیٹی کے رکن کے طور پر مہمانوں اور مندوبین کے قیام و طعام کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھیں۔ دھان پان، دراز قد، نازک، نازک، خوب صورت اور مستعد۔۔۔ پہلی ہی نظر میں دونوں ایک دوسرے پر فدا ہو گئے مگر شاہ جہاں بیگم نے شری اشوک چاؤلہ سے صاف صاف کہہ دیا "آپ جتنا میری طرف جھک رہے ہیں شاید میں اس سے بہت زیادہ آپ کی طرف مائل ہوں مگر آپ مسلمان نہیں ہوں گے اس لیے ہماری شادی نہ ہو سکے گی اور اگر شادی نہیں ہوتی تو آمنا سامنا ہو جانے پر نظریں

کے بجائے نظریں چرا کر وقت گزارنا ہو گا" ۔

تیسرے روز، چپ چپاتے اشوک چاؤلہ نے قاضی مرگھے کا جاری کردہ سرٹیفکیٹ پیش کر دیا کہ وہ اب اشوک چاؤلہ نہیں اکبر علم دار شاہ جہاں بیگم ان کو اپنے گھر لے گئیں ۔ ان کے ابا بدر الدین احمد اور امی بتول جہاں نے سارا وقت نئے اکبر کو پرانا اشوک سمجھا اور اسی ے پکارا ۔ ابا تو مرد تھے، اماں تک مکر گئیں "شاہ جہاں بیگم ان کی بیٹی نہیں" ۔ مجبور ہو کر دونوں نے سول میرج کر لی ۔

شاہ جہان بیگم کو اپنی اماں، اپنے ابا اور چھوٹی بہن مشرف جہاں بیگم سے بڑی محبت تھی مگر شاید ان سے کسی کو محبت نہیں تھی ۔ ان ے کے دروازے بند ہو گئے ۔

وہ میاں کے ساتھ سسرال آگئیں ۔

چاؤلہ تعلیم یافتہ تھے ۔ اکثر مرد اور عورتیں بھی اونچے سرکاری عہدوں پر فائز تھے ۔ خاندان بڑا اور پھیلا پڑا تھا ۔ سب کے سب آزاد تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اتنے بھی نہیں کہ غیر ان کے گھر میں آکر بیٹھ جائیں! شاہ جہاں بیگم سسرال کی نظروں میں آنے، اچھا بننے کی کوشش کرتے ہ ایک بچی کی ماں بن گئیں ۔ بچی تین سال کی ہو گئی مگر دادا، دادی تک نے نظر اٹھا کر نہ دیکھا ۔ شاہ جہاں بیگم کی سسرال نے بہو اور بہو یٹ سے جنی پوتی کو قبول نہ کیا ۔ اکبر بیوی اور بیٹی پر نثار اور نچھاور ہوتے مگر شاہ جہاں بیگم روز بروز اپنے سے زیادہ بچی کے لیے پریشان ۔ بچی سمجھ دار ہو رہی ہے ۔ وہ اس طرح الگ تھلگ کیے جانے پر تنہائی اور مایوسی کا شکار ہو گئی تو؟ ان پر ہر دم یہی سوار رہتا "شیلا کا کیا ہو؟"

پھر،

ایک روز،

اچانک شاہ جہاں بیگم کو حیدرآباد جانا پڑا ۔ ان کی چھوٹی بہن مشرف جہاں بیگم نے چھت سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی اور اماں ے سے باؤلی ہو گئی تھیں ۔

دہلی سے حیدرآباد کا سفر طویل ہی نہیں تھا، اس لحاظ سے اہم بھی تھا کہ شاہ جہاں بیگم نے تمام راستہ بڑی گہری سوچوں میں طے کیا ۔ ہر سوچ آخر میں اپنی بیٹی کے محور پر آکر رکتی ۔ انھوں نے میکے پہنچتے پہنچتے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ سسرال واپس نہیں آئیں گی ۔ گاڑی سے تے ہی انھوں نے اکبر علم دار کو تار دے دیا "خواہ دیر سے آؤ مگر آؤ تو تبادلہ کرا کے یا سرکاری ملازمت چھوڑ کر مستقل قیام کے لیے آنا" ۔

انھیں اطمینان تھا اشوک اکبر دیر سویر آجائیں گے ۔

شاہ جہاں بیگم کو دیکھ کر ابا نے منہ پھیر لیا ۔ اماں گلے مل کر روئیں، خوب روئیں ۔ بظاہر وہ ٹھیک ٹھاک تھیں مگر کام دھام سے ہو کر پان لگانے بیٹھتیں تو خود کلامی پر اتر آتیں ۔

"آخر میرے اندر ہندو لوگاں کائے کو گھس گئے؟ بڑی بیٹی ہندو کے ساتھ بھاگ کو گئی ۔ دوسری بھی بھاگ رہی تھی ۔ باوا کو پتہ چل ۔ گھونٹ کر مار ایچ دیا" ۔ پھر وہ بلند آواز میں بولتیں "اے بتول جہاں تم بھی کاں کے مسلمان ہو؟" پان کی گلوری منہ میں ڈال کر کتھے کی ں انگشت شہادت ڈبو کر ماتھے پر لگاتیں پھر ساری کا پلو سر پر ڈال کر بدر الدین احمد کے پاؤں چھو کر خالی ہاتھ ہوا میں گھمانے لگتیں جیسے لے رہی ہوں!

اکبر علم دار اپنی بیٹی کی چوتھی سالگرہ والے دن حیدرآباد پہنچے تو وہ دلی سے تمام رشتے ناتے توڑ آئے تھے ۔ جب انھوں نے اماں کی

ست دیکھی کہ بیٹھے بیٹھے وہ کیا سے کیا ہو جاتی ہیں تو ان کے بھیتر کسی کونے میں خود مجرمی کے احساس کا خار دار پودا پھوٹ نکلا۔ ایک ان کی ت کی وجہ سے کتنے "فطلیس لوگاں" کا خاندان چوپٹ ہو گیا۔۔۔ وہ بھی، وہ نہ رہے۔ طبعی شوخی، چنچلتا غائب ہو گئی۔ مسکرانے کا ڈھنگ ول گئے۔ محبت تو انھیں شاہ جہاں بیگم سے شروع سے تھی مگر اب وہ محبت میں بالکل ڈوب گئے، فنا ہو گئے۔

حاجی بدر الدین احمد آج بھی بیٹی سے بولتے نہیں تھے البتہ داماد سے کسی قدر گھل مل گئے تھے۔ نواسی شیلا اشوک جو اب چار سال سے ی ہو چکی تھی اور شمامہ ممتاز محل پاشا کہلاتی تھی جب اس کے اسکول میں داخلے کا وقت آیا تو بدر الدین صاحب نے نواسی کا نام صرف ممتاز ل لکھوایا۔ اکبر نے سوچا تھا نانا اور نواسی دونوں کس قدر مانوس ہو چکے ہیں۔ دہلی کے مقابلے میں یہاں اس معصوم بچی کی پذیرائی اور محبت سے خوش دل، چونچال اور چہکتار کھتی ہے۔ اکبر جانتے تھے کہ کئی مسلم گھرانوں میں بچیوں کو شیلا پکارا جاتا ہے مگر حاجی صاحب پکے مسلمان تھے ھیں شمامہ میں بھی شیلا کی بو باس آتی ہو گی اور پھر شاہ جہاں بیگم کی بیٹی کا نام ممتاز محل سے زیادہ کوئی دوسرا نام موزوں بھی نہیں ہو سکتا۔ ہ بڑے میاں کی خوشی میں خوش تھے

ایک روز اکبر نے حاجی بدر الدین احمد صاحب سے، اپنے خسر سے ان کے لہجے میں پوچھا "ابا! یہ بتاؤ ہندوستان میں سارے کے سارے سلماناں عرب اور ایران سے تو نئیں آئے۔ بہت سارے لوگاں تو یہیں کے ہیں جو ہندواں سے مسلماناں ہوئے پھر آپ میرے کو اشوک لیوں بتلائیں؟ کیا آپ کو میرے اسلام پر شبہ ہے؟" حاجی بدر الدین احمد کئی مہینوں میں پہلی بار مسکرائے اور جواب دیا "اسلام کی کیا باتاں ر تیئں جی۔۔۔۔ وہ تو ہجرت کر کے پاکستان چلا گیا!" پھر وہ سنجیدہ ہو گئے۔ "اب تو نوے ہندوستان میں کوئی عرب یا ایران سے آنے کو ہے ئیں۔۔۔۔ نہ ہی کوئی ہندواں سے مسلماناں ہونے کو ہے۔ ہندواں کے گھر ہندو اور مسلماناں کے گھر مسلماناں ہوں گے۔ ہندو مسلماناں کو قتل کرتے، ہندواں تو مسلماناں کو بودھوؤں کی طرح ملیامیٹ کر دینا چاہ تئیں جو ہندو مت میں گھل مل نئیں ہو گا وہ زندہ نئیں رہے گا"۔
س کے بعد اکبر علم دار نے حاجی بدر الدین احمد سے اس مسئلے پر کبھی بات نہ کی۔ وہ سمجھ گئے ان کے دل و دماغ پر اتنا دباؤ ہے کہ وہ کبھی اسے مسلمان تسلیم نہ کریں گے۔ ویسے اکبر کو اب یہ اطمینان ہو گیا کہ حاجی صاحب نفرت نہیں کرتے۔ اکبر میں قناعت تھی وہ اس صورت حال پر قطعی کر ہو گئے۔

شاید زندگی یوں بھی گذر جاتی کہ اچانک اماں دیوانگی کا دورہ پڑنے پر فشار خون کے نتیجے میں دماغ کی شریان پھٹنے سے فوت ہو گئیں۔ ان کے جہلم کی رسم ادا کی جا رہی تھی کہ قرآن کی تلاوت کرتے کرتے حاجی بدر الدین احمد بھی حرکت قلب بند ہو جانے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ س گھر میں موت کی آندھیاں یوں چلیں کہ گھر ہی اجڑ کے رہ گیا!!

ہرے حادثات اور واقعات کا اثر اکبر اور شاہ جہاں کی نجی زندگیوں پر ایک دوسرے کے بالکل برعکس اور الٹا پڑا۔ اکبر علم دار زیادہ حلیم اور منکسر المزاج ہو گئے اور بالکل ہی بیوی کی مٹھی میں چلے گئے۔ دوسری طرف شاہ جہاں بیگم زیادہ پختہ رائے، فعال، مضبوط ارادے کی اندر اور باہر کے امور پر حاوی ہو گئیں۔ خاندان کے اجڑنے کا صدمہ روگ بن کر ان کو ڈھانے اور بگاڑنے کی بجائے ان کے اند وٹ کوٹ کر قوت مدافعت بھر گیا انھوں نے دم بھر کو یہ نہ سوچا کہ شاید ان کے ہی ایک قدم نے سارے کنبے کی تقدیریں بدل ڈالی ہوں؟ کیا کیا اثرات مرتب ہوئے! نہیں انھوں نے کبھی گھر کے المیے کے لیے اپنے تئیں مجرم، خطاوار، دوشی یا ذمہ دار نہیں سمجھا۔ اب وہ زیادہ مستعد ر چاق و چوبند ہو چکی تھیں۔ زیادہ نڈر اور بے باک ہو گئی تھیں۔ ان کے ہر فعل میں پھرتی آ گئی تھی، وہ نکھر بھی گئی تھیں پہلے اگر وہ خو صور وں میں شمار ہوتی تھیں تو اب ان میں خوب صورتی کے ساتھ ساتھ وقار کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کی شخصیت سے اعتماد کا چشمہ

ا پڑتا تھا!! شہابی رنگت، سیاہ کالے بال، جنوبی ہند کی پر کشش کالی کالی آنکھیں، ابھرا ستا ہوا بدن، پتلی پتلی انگلیاں، اس پر ذہانت اور
ت، ہرنی کی سی باخبری اور چوکنا پن۔ جو دیکھتا رعب حسن کے آگے ڈھیر ہو جاتا اکبر خوش اور نازاں ہونے کہ ساتھ ساتھ قطعی بیوی کے
، بن چکے تھے۔ جہاں تک ممتاز محل پاشا کا تعلق ہے دونوں کا خیال تھا کہ جیسے تیسے اپنی بچی کو اپنے ماضی سے الگ تھلگ رکھیں گے۔ یہ بچی
مستقبل ہی تھا کہ اکبر علم دار نے بغیر چوں و چرا کیے اپنی محبوب بیوی شاہ جہاں بیگم کا یہ فیصلہ قبول کر لیا کہ اب وہ کراچی چل کر آباد ہوں
۔۔۔ نئی دنیا بسائیں گے۔

کراچی کی بستی، بستے بستے بہت زیادہ پر رونق ہو گئی تھی۔ اکبر اور شاہ جہاں تو اک نئی دنیا بسانے آئے تھے۔ اپنی بچی ممتاز محل پاشا کے
نئے محل، نیا نگر تعمیر کرنے آئے تھے۔ انھیں یہ واہمہ بھی نہ تھا انھیں یہاں ایسی ایسی مشکلات کا سامنا ہو گا جن کی نوعیتیں دہلی اور حیدر آباد
دیکھی، بھگتی کٹھنائیوں سے بالکل الگ ہوں گی۔ دنیا تو نئی تھی مگر غیر مانوس، نیا آسمان، نئی زمین جہاں دھوپ ہو گی سایہ نہ ہو گا۔ کنواں
کر پانی پینا ہو گا، بادل اٹھیں گے۔ زیادہ گھرے زیادہ گہرے زیادہ موٹے اور زیادہ کالے ہوں گے، برسیں نہ برسیں۔ بادلوں کا کیا ہے "
، یاد پیز، ہر دم دوڑتے بھاگتے ہاتھ نہیں آتے۔

آتے سے ان کے ہاتھ جو لگا وہ کراچی لے آئے تھے۔ اکبر تقریباً سارا جمع جتھہ دہلی سے منگوا چکے تھے۔ شاہ جہاں بیگم کو تو خدائی تحفے گھر بھر
رتیں دے گئی تھیں۔ تمام نئے نقشے گویا ان کے دماغ میں صاف صاف گڑے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے حیدر آباد کالونی میں
بڑے مکان کا ضرورت لائق حصہ کرائے پر لیا پھر وہ حصہ خرید لیا۔ ممتاز محل پاشا کو انگریزی میڈیم اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ
رگ یے ۔ باں کے ساتھ روزانہ صبح ملازمت کی تلاش میں نکلتیں، شام کو دونوں مایوس لوٹ آتے۔ بھرم رکھنا مشکل ہو گیا۔ قیمتی
باں اور پارچہ جات اور "نظام کراکری" فروخت کر کے گذارہ چل رہا تھا شاہ جہاں اس ٹوہ میں رہتیں کہ کالونی میں کون سے حیدر آبادی
نے میں شادی بیاہ ہے۔ وہی "لوگاں" حیدر آبادی فیشن کے ملبوسات اور کھڑے دوپٹوں کے اصل قدر دان اور قیمت سے واقف تھے۔
، سے اچھے دام بھی مل جاتے تھے۔ ایسے میں جب اکبر علم دار بیمار پڑے تو شاہ جہاں کو دنیا اندھیر لگی مگر وہ بڑی باہمت خاتون تھیں۔ شوہر
بارداری کے ساتھ ساتھ بچی کے اسکول کا ناغہ اور ملازمت کی تلاش سے غفلت نہ برتی۔ اکبر لوٹ پوٹ کر کھڑے تو ہو گئے مگر اب ناتواں
ضعیف نظر آنے لگے تھے۔ دونوں ساتھ ہوتے تو جوڑ کھٹکتا تھا۔

ایک روز شاہ جہاں نے دیکھا کہ پار گلی کے نکڑ والے ریستوران میں اکبر علم دار بیرا گیری کر رہے تھے۔ ان کا دل ایسا کٹا کہ ہمت
، ہونے لگی۔ دوسرے روز وہ اپنی اماں مرحومہ کی دو ہیرے کی قیمتی انگوٹھیاں چپکے سے فروخت کر آئیں اور اس طرح گرہستی چلانے لگیں
، انھیں جز وقتی ملازمت مل گئی ہے۔

ملازمت ان کو واقعی مل گئی۔ ان میں یہ صلاحیت تھی "جیسا دیس، ویسا بھیس" نئی جگہ ہو تو بولی ٹھولی ہی نہیں بدلتی بہت سے
مدے اور خانون" بھی بدلے ہوئے ملتے ہیں۔ وقت کی بے رحم تیز دھار نے شاہ جہاں بیگم میں ڈھل جانے اور بدل جانے کی صلاحیت پیدا
ی تھی۔ ان کی ذاتی خوبیوں اور پر اعتماد شخصیت کی وجہ سے پانچ ستاروں والے ہوٹل میں ان کو نگران بے محکمہ کا تقرر مل گیا اور جب
ں معلوم ہوا کہ ہوٹل کے مالک منان صاحب ہیں تو انھیں اپنی خوش قسمتی پر یقین آگیا۔ دیر آید درست آید آخر ان کی محنتوں کا ثمر ایک
ملنا تھا۔ منان صاحب کی بیٹی کی شادی پر مسز منان نے شاہ جہاں بیگم سے کچھ سامان خریدا تھا چناں چہ انھوں نے منان صاحب سے انٹرویو
اور چھوٹتے ہی یاد دلایا وہ ان سے سات گھر پرے رہتی ہیں اور ان کی بچی کے جہیز کے لیے کئی نادر اشیا بہت ہی ارزاں قیمت پر فراہم کر کے

ش اور مسرور ہیں ۔ یہ کہنے اور یاد دلانے کا مطلب صرف اتنا تھا کہ وہ کوئی عام "لوگاں" نہیں وہ "بے جگہ" کی بجائے با جگہ بلکہ داخلی ئہ لینا پسند کرتی ہیں ۔ اس طرح انھیں وقتی طور پر کچن کا سپروائزر بنادیا گیا لیکن شاہ جہاں بیگم بہت جلد سبزی، ترکاری اور آٹے دال کے ساب اور چوزے، گوشت کے ٹوکروں کے ٹوکرے خراب ہوجانے کے بہانے گھلے کی خرد برد سے اپنے دامن پر چھینٹے پڑنے کا ڈر محسوس نے لگیں ۔ آخر ایک روز انھوں نے پھر کر ہمت باندھی اور منان صاحب سے ملاقات کی اور ان کے سامنے بالکل نئی تجویز رکھی جس پر عمل سے ہوٹل کا بھلا ہوتا سو ہوتا وہ اپنی سفید پوشی کو بڑی خاموشی سے قائم رکھ سکتی تھیں: یہ ایک نئی لائن تھی شاہ جہاں بیگم نے اپنے ایک دور کے رشتے دار کے ولایت سے آنے کے بعد کاروبار کے خیالی پلاؤ پکانے کے سلسلے میں سنی تھی ۔ انھوں نے دہلی کے پنجابی سوداگران کے ایک میاب تاجر منان صاحب کو اپنی خداداد عقل و فراست سے قائل کرلیا ۔ وہ اپنی نئی جاب میں خوش تھیں ۔ سفید کوٹ پہن کر مقررہ اوقات یں وہ ایک بریف کیس لے کر کمروں میں جاتیں اور خوب صورت ٹیلی فون ڈس انفیکٹ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو خوش بو دار بنا آتیں ۔ س کا فوری اچھا اثر پڑا ۔ ہوٹل کا ٹیلی فون ایکسچینج یک دم مصروف سے مصروف ترین ہوگیا ۔ وہ تمام فوائد جو شاہ جہاں بیگم خوب صورت لفظوں میں بیان کر رہی تھیں اور منان صاحب کو زبانی، فرضی اور کتابی لگتے تھے اپنی عملی شکل میں ٹکسال سے نکلے نئے چمک دار سکوں کے روپ میں نظر آنے لگے ۔ منان صاحب بڑے تیز ذہن کے کاروباری تھے ۔ انھوں نے اپنے ہوٹل کا یہ کام تو شاہ جہاں بیگم کے ہاتھوں میں رہنے یا اور ان کو کہا کہ وہ اس کام کے لیے ایک مناسب سائز کی قابل اعتماد ٹیم تیار کریں تاکہ اس کام کو وہ اپنے اس ہوٹل کے علاوہ دیگر اداروں میں بھی متعارف کراسکیں ۔ منان صاحب نے نئے نام سے ایک ادارہ قائم کرکے اس کا مینیجنگ ڈائریکٹر اپنے بڑے بیٹے جبار کو بنایا اور شہر بھر کے ہوٹلوں اور بڑے کاروباری اداروں کا ٹھیکا لے لیا ۔

اب شاہ جہاں بیگم اس کام کی ماہر سمجھی جانے لگی تھیں ۔ خود انھوں نے اس نئی ذمہ داری کی بنیاد پر بہت کچھ سیکھا ۔ ہر کمرے کا مکین دوسرے سے الگ تھا ۔ وہ چہرے پڑھنے اور چہروں پر چڑھے غلافوں کے پیچھے اصلی صورتوں کو پڑھنے اور پہچاننے لگیں ۔ ٹیلی فون سے بو باس دور کرتے کرتے عجیب عجیب "لوگاں" کی عجیب عجیب "باتاں" سونگھنے میں ان کی ناک تیز ہوگئی ۔ اس سونگھنے کو کام میں لاتے ہوئے انھوں نے اپنے اکبر علم دار صاحب کے لیے بھی ایک نئی جاب نکلوالی ۔ اکبر ہوٹل میں نئے آنے والوں کے ساتھ انتظامیہ کے سلوک پر نظر رکھتے ۔ انتظار کی زحمت سے بچانا یا اسے محسوس نہ ہونے دینا ۔ سفر میں اونچ نیچ یا گم شدگیاں رفع کرانے میں رہ نمائی اور مدد دینا ان کا کام تھا ۔ وہ بھی اپنے کام میں ماہر، اہل اور کامیاب ثابت ہوئے ۔

حسن اتفاق سے شاہ جہاں بیگم اب جن خاص خاص کمروں کے ٹیلی فون خوش بو دار بنایا کرتی تھیں ان میں سے ایک کمرے میں ایک صاحب جو اکبر علم دار کے "بڑے بھائی کی عمر اور تقریباً ویسی ہی شباہت کے تھے اور ی ہفتوں سے ٹھہرے ہوئے تھے، ایک روز، خلاف معمول کمرے سے نہ نکلے ۔ واپسی سے پہلے مجبور شاہ جہاں بیگم اپنے فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں اندر چلی گئیں ۔ سوچا شاید وہ چلے گئے ہوں اور ان کو پتہ نہ چلا ہو ۔ لیکن وہ صاحب کمرے میں نیم بے ہوش پڑے، سخت تیز بخار میں مبتلا تھے ۔ شاہ جہاں بیگم نے فوری طور پر ہوٹل کی فرسٹ ایڈ طلب کی، ڈاکٹر کو بلایا اور وہاں ٹھہری رہیں ۔ اسی دوران لندن سے اجمل احمد کی کال آگئی جو اپنے والد محترم سید فصیح الدین احمد فاروقی سے بات کرنا چاہتے تھے ۔ فاروقی صاحب تو گول ہو رہے تھے ۔ شاہ جہاں بیگم نے ہوٹل کی نمائندے کے طور پر اپنا تعارف کراتے ہوئے اجمل احمد فاروقی کو اطمینان دلایا، تسلی دی اور تجویز کیا کہ کل اسی وقت دوبارہ ٹیلی فون کریں ۔

دوسرے دن سید فصیح الدین احمد فاروقی کی طبیعت کچھ سنبھل گئی ۔ ان کے بیٹے نے مقررہ وقت پر ٹیلی فون کیا اور گزرے کل کی

روداد بیان کی۔ بس یہاں سے فاروقی صاحب سے شاہ جہاں بیگم کا تعارف شروع ہوا تو شاہ جہاں لندن کے لاکھوں پتی پاکستانی تاجر فاروقی صاحب کا مکمل اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو گئیں۔ فاروقی صاحب ستر سے اوپر ہوں گے۔ چار شادیاں کی تھیں۔ ایک کامیاب شادی سے چار بیٹے ہوئے۔ اجمل، اکمل، اسلم اور انور۔ چاروں انگریز لڑکیوں سے شادیاں کر چکے تھے۔ ان کی کئی فیکٹریاں تھیں، ریستوران، اسپورٹس کلب، تھیٹر اور کمپیوٹر کے کاروبار تھے۔ اپنا اپنا ہیلی کاپٹر تھا۔ فیملی ہوائی جہاز تھا۔ وہ سب ایک ایسے محل میں رہتے تھے جو ایک بھی تھا اور چار گھر بھی تھے۔ بڑے فاروقی صاحب نے پاکستان کے ساتھ کاروبار کی کل ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی ہوئی تھی۔ ان کو وطن سے جو محبت تھی ویسا جذبہ ان کے بیٹوں کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اس میں بھی منافع کا کچھ حساب نہ تھا۔ اس لیے بچوں کو کوئی اعتراض بھی نہ تھا۔ لندن جاتے ہوئے بڑے فاروقی صاحب نے شاہ جہاں بیگم کو اپنا ذاتی نمائندہ مقرر کر کے گراں قدر اعزازیہ مقرر کر دیا۔ اکبر علم دار کی موجودگی میں انھوں نے شاہ جہاں کی تعریف ان لفظوں میں کی تھی "بی بی! آپ کی قابلیت، صلاحیتیں اور پختگی اور پر کشش شخصیت دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں آپ سے پہلے کیوں نہ ملا۔ آپ اکیلی ہوتیں تو میں شادی کر لیتا!!"۔ پھر انھوں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تھا "میں آپ دونوں کی عزت کرتا ہوں۔ آپ دونوں میں جو چاہت ہے اس کی قدر کرتا ہوں"۔

یوں تو دونوں میاں بیوی اپنی اپنی جگہ خوش ہوئے مگر شاہ جہاں بیگم نے سوچا تھا۔ میں اکیلی ہوتی کیوں؟ میں تو بنی ہی اکبر کے لیے تھی۔ وہ ان کے علاوہ کسی اور کی ہو بھی کیسے سکتی تھیں؟ لیکن دماغ میں فتور آنے سے کون روک سکتا ہے۔ معاً ان کو خیال آیا ممکن ہوتا تو وہ ممتاز محل پاشا کو فاروقی صاحب کے کسی بیٹے یا خود فاروقی صاحب کے نکاح میں دے دیتی۔ پھر وہ اس نامانوس اور غیر مناسب فتور پر جھینپ گئیں۔ ان کو اپنی بیٹی سے محبت بھی تو بہت تھی۔ وہ جیسے جیسے جوان ہو رہی تھی ان کے دل میں چھپا یہ وہم بھی تازہ ہوتا رہتا تھا کہ بے شک ان کی پیاری بیٹی کا نام ممتاز محل ہے مگر اس کی تقدیر ملکہ نور جہاں جیسی ہوگی۔ وہ بیوگی کا غم اور داغ اٹھائے گی۔ (یہ غم وہ اٹھائیں گی مگر بیٹی کو غمگین نہ ہونے دیں گی) اس کے بعد آباد ہوگی تو سدا حکومت کرے گی، خوش و خرم رہے گی۔

شاہ جہاں بیگم کو ذرا ذرا یاد ہے۔ بار ہا وہ اس وحشت میں گرفتار ہو گئیں کہ انھوں نے ساری دنیا کھو کر، لٹا کر صرف یہی پاشا ہی کو تو پایا ہے۔ ان کی ساری کائنات یہی لڑکی ہے۔

پاشا بیگم اپنی ماں کی طرح خوب صورت اور طرح دار تو نہ تھی مگر جوانی اور جوانی میں بھولی صورت، مناسب نین نقش اور سرو قد دوشیزہ تھی۔ سو کی نہیں تو دو کی نظروں میں کھب جانے والی صورت۔ ذہانت اور معاملہ فہمی میں ممتاز محل پاشا اپنی ماں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ باپ سے اسے قناعت اور کم گوئی ورثے میں ملی تھی۔ ماں کے مقابلے میں تھوڑی مغرور اور تھوڑی سست۔ یہی دو نقص تھے جو ماں کے لاڈ میں پیدا ہو گئے ہوں گے۔ کچھ بھی ہو وہ اپنی اماں کی آنکھوں کا چاند تھی۔ اگر ممتاز محل پاشا کی سوچ "بلند خیالی" کے اس درجے میں چلی گئی تھی جیسے وہ فرانسیسی پچی جس کا یہ کہا رہتی دنیا تک کسی نہ کسی حوالے سے گونجتا رہے گا کہ غریبوں کو روٹی نہیں ملتی تو وہ کیک لے کر کیوں نہیں کھا لیتے! ممتاز محل پاشا کو تو اس کی امی نے برے وقتوں میں بھی کیک ہی کھلائے تھے!

فاروقی صاحب کے کمپلی منٹس نے شاہ جہاں بیگم کی سوئی ہوئی سوچ کو جگا دیا۔ وہ سوچ رہی تھی ہاں اب پاشا کی عمر شادی کی ہو چکی ہے راستے میں یہی بات انھوں نے اکبر علم دار سے کی تو انھوں نے بھی اتفاق کیا۔۔۔۔

اب یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ "ناوقت" گھر پہنچ گئے۔ فاروقی صاحب کو ایئرپورٹ تک چھوڑنے گئے تو خلاف توقع جہاز وقت پر اڑا اور وہ سیدھے گھر آ گئے۔ وہاں کا منظر غیر متوقع تھا اس لیے دونوں چونک کر متوحش ہو گئے۔ پاشا بیگم ایک نہایت ہی خوب صورت نوجوان کے

ساتھ خوش گپیوں ہی نہیں خوش فعلیوں میں مشغول و معروف تھیں۔ اکبر تو منہ پھیر کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شاہ جہاں بیگم وہیں صوفے پر ڈھے گئیں۔ پاشا نے بڑے اطمینان سے اپنے دوست کا تعارف کرایا۔ ارسلان مہرولی والا۔ انگلستان سے آبائی وطن جانے کی بجائے قسمت بنانے کراچی چلا آیا۔ جہاں اس کا اپنا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ ایک سال سے پاشا کے کالج میں انگلش لٹریچر پڑھا رہا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا "آنٹی میں نے آنکھ نہیں لڑائی۔ پاشا کو مجھ سے محبت ہوگئی اور اس نے مجھے اپنی محبت سے جیت لیا۔ اب میں یہیں رہوں گا۔ میں شادی کا قائل نہیں مگر آپ چاہیں تو نکاح پڑھوالیں بلکہ جلدی پڑھوالیں، پاشا ماں بننے والی ہیں" وہ چپ ہوا تو ممتاز محل پاشا نے اپنی ذہانت کو قطعی بے وقوفی کا رنگ دیتے ہوئے کہا "امی! آپ کی شادی بھی تو محبت کی شادی تھی!!"

شاہ جہاں بیگم چپ کی چپ، دھیرے سے اٹھیں اور دوسرے کمرے میں جاکر اکبر علم دار سے لپٹ کر بے تحاشا رونے لگیں۔ سوچا تھا کیا، کیا ہوگیا؟ اکبر خاموش تھے۔ لگتا تھا وہ بوڑھے ابھی اسی پل اسی لمحے ہوئے ہیں ابھی ابھی ان کی کمر ٹوٹی ہے۔ جب شاہ جہاں بیگم کے دل کا غبار آنسو میں نکل گیا تو انھوں نے اکبر سے کہا" لڑکا بڑا ہی خوب صورت ہے یقیناً پاشا کی کمزوری بن چکا ہے آپ جاکے مولوی صاحب کو بلا لاؤ ان کا مطلب تھا گل کھل چکا ہے لاپروائی یا سختی سے گل سڑ کر بدبو پھیلائے گا۔

ارسلان جتنا خوب صورت تھا اتنا ہی اس کی سیرت خراب اور بھدی تھی۔ خود غرض، مطلبی، پھوہڑ اور بدمزاق، کسی حد تک طوطا چشم اور بڑی حد تک ابن الوقت۔ انگلستان سے تمام بری باتیں سیکھ کر آیا تھا۔ نشے کی لت تھی، آوارگی کا مارا تھا۔ اس نے پاشا کی آڑ میں اپنے لیے اس گھر میں ضرور جگہ بنالی تھی مگر نکاح کے بعد بھی پاشا کے والدین کے دلوں میں جگہ نہ بناسکا۔ بے غیرتی اور نشہ کرنے کی بنا پر جلد ہی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا۔ بڑے تحکمانہ انداز میں انکل یا آنٹی سے ضرورت کے لیے روپے طلب کرلیتا۔ جیسے جیسے پاشا کا پیٹ پھولتا گیا، ارسلان اپنے پیر پھیلاتا چلا گیا۔ اس نے چند ہی دنوں میں منان صاحب کا سراغ لگالیا اور ان کے دوسرے چھوٹے بیٹے غفار سے دوستی کرلی پھر بناپوچھے کچھے پاشا کی مدد سے گھر میں جھاڑ و پھیر پھار غفار کی شراکت میں کاروبار شروع کرلیا۔ بڑے دعوے کیے کہ گالف کلب میں اپنی اسپورٹس اور فیشن شاپ بہترین منافع بخش کاروبار ثابت ہوگی۔ کاروبار کیا چلنا تھا، وہ ہیروئن کا ہیرپھیر کرنے والے جتھے کا مستقل ٹھکانہ بن گیا۔ منان صاحب کو پولیس کا چھاپہ پڑنے پر پتہ چلا۔ اپنے بیٹے کو انھوں نے سوئٹزرلینڈ علاج معالجے کے لیے بھیج دیا۔ شاہ جہاں بیگم کا گھر تو تباہ ہوگیا تھا، خالی ہوگیا تھا مگر منان صاحب کو یہ معلوم نہ ہوا کہ ارسلان کا شاہ جہاں بیگم کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ شاہ جہاں بیگم اور اکبر علم دار نے سب مال و منال کھو کر بھی سمجھا کہ ان کا کچھ نہیں گیا۔

ارسلان جیل کاٹ کر آیا تو اب اس کی انتہائی بے تکلفی کا دور شروع ہوا۔ وہ اپنی ساس پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا۔ ایک روز اکبر علم دار پر اس بری طرح گرجا جیسے وہ ان کو اپنا ناجی ملازم سمجھتا ہو۔ ادھر ممتاز محل پاشا کی ایسی مت ماری گئی وہ ارسلان کی حمایت میں اپنے ماں باپ سے لڑ پڑی۔ ان کو مورد الزام ٹھہرایا۔ شاہ جہاں اور اکبر دونوں بجھ کر رہ گئے۔ یہ ناگہانی مصیبت کیا ان کے گلے آپڑی۔ حالات سدھرنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ انھوں نے طے کیا کہ خواہ کچھ ہی ہوجائے وہ دونوں منان صاحب کے ہوٹل میں اپنی ملازمتوں پر آنچ نہ آنے دیں گے اور شاہ جہاں بیگم جیسے تیسے فاروقی صاحب کے مفادات کا خیال بھی رکھیں گی۔

شاید ان کے دن یوں بھی گزر جاتے کہ ناگہانی اکبر علم دار اسٹروک کے حملے میں آگئے۔ شاہ جہاں بیگم ایک ہی مہینے میں لڑکھڑا گئیں۔ انھوں نے پہلی بار فاروقی صاحب کو لکھا کہ وہ ان کو انگلستان بلوالیں۔ دو سال گذر چکے تھے مگر فاروقی صاحب نے پاکستان کا دورہ نہ کیا تھا۔ وہ شاہ جہاں بیگم کے کام سے مطمئن تھے۔ انھوں نے جواباً لکھا جب تک پاکستان میں ان کا کام سنبھالنے والا تسلی بخش اور قابل اعتماد آدمی نہ مل

مائے وہ ان کو انگلستان نہیں بلواسکتے ۔ شاہ جہاں بیگم سے یہ چوک ہو گئی تھی کہ انھوں نے یہ نہ لکھا وہ اس غرض سے انگلستان آنا چاہتی ہیں کہ کبر کا علاج کرانا مقصود ہے ۔۔ بہرحال سید فصیح الدین احمد فاروقی نے لکھا تھا وہ آئندہ سال پاکستان آئیں گے تو کوئی صورت نکالیں گے ۔۔۔۔ بلی سے جواب آیا ماتا پتا سورگ باش ہوئے ۔ جائیداد کا بٹوارا ہو گیا ۔ اشوک چاؤلہ (اکبر علم دار نہیں) اپنا حصہ ، جائیداد خاندانی وکیل سے رابطہ کر کے حاصل کر سکتے ہیں ۔

یوں شاہ جہاں بیگم کے پیروں تلے سے دو سال اور کھسک گئے ۔ انھیں ماضی کی تلخ یادوں کے زخم ہر پل ہر لمحہ رستے اور رپیڑ دیتے نئے سرے سے رلانے اور درد کی ٹیسیں دینے لگے تھے ۔ پھر بھی وہ سمجھتی تھیں کہ جو کچھ ہوا وہ ہونا ہی تھا ۔ انھیں امید تھی اکبر اچھے ہو جائیں گے ، باشا کو "عقل" آجائے گی ۔ دن پھر جائیں گے بہار آجائے گی ۔۔۔ شاید سب کچھ بدل جاتا لیکن ارسلان کیسے بدل سکتا تھا ۔ وقت تو دگرگوں ہو کر نکل گیا اب ارسلان کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے خسر اور خوش دامن کو گھر سے نکال باہر کرے ۔ پاشا کو دوسرا کوئی کام نہ تھا وہ اپنے بیٹے عدنان اور ارسلان کی دیکھ بھال کے علاوہ کچھ کرنے یوگ کہاں تھی ۔ باپ کی بیماری کا بہانہ بنا اور بتا کر وہ تمام ملنے والوں سے قرض لالا کر رسلان کا نشہ پورا کرتی اور بھینٹ چڑھا رہی تھی ۔

اس رات ،

شاہ جہاں بیگم ہوٹل سے پلٹیں تو گھر سے منان صاحب کا خادم نکل رہا تھا ۔ انھوں نے دروازے پر ہی حالات معلوم کیے ۔ اندر دستر خوان بچھا تھا ۔ کئی کھانے لگے تھے ۔ ارسلان اور پاشا کھانے میں مگن تھے ۔ شاہ جہاں بیگم نے پوچھا "ابا کو کچھ دیا ؟" پاشا نے جواب دیا "اماں! غلطی بھول گئی ۔۔۔" شاہ جہاں بیگم اندر گئیں ۔ اکبر علم دار کو دیکھا پھر میز سے کھانا لیا اور میاں کو کھلانے چلی گئی ۔ انھوں نے کچھ نہ کھایا ۔ تب دوبارہ بیٹی اور داماد کے پاس آئیں تو پاشا عدنان کو کھلا رہی تھیں ۔ ارسلان ابھی تک لقمے توڑ رہے تھے ۔۔۔۔

"ممتاز محل پاشا یہ کھانا کس نے بھجایا ؟" ان کو معلوم تھا مگر انھوں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے سوال کیا ۔ "امی! عدنان بھوکا تھا ۔ ارسلان کو بھی بھوک لگی تھی ، گھر میں پکانے کا پورا سامان نہیں تھا ۔ میں آنٹی منان کو ٹیلی فون کر کے کھانا منگوالی!!"

یہ حد تھی ۔ کبھی برہم نہ ہونے والی ، ہمیشہ غصہ پی جانے والی ، ہردم حواس متوازن رکھنے والی شاہ جہاں بیگم نے اکبر علم دار کی چھڑی ٹھائی جو ہوا خوری کے لیے جاتے وقت وہ کتوں سے بچاؤ کے لیے پکڑ لیتے تھے ۔ شاہ جہاں بیگم نے زندگی میں پہلی بار اپنی نازوں کی پلی بیٹی ممتاز محل پاشا کو دھن ڈالا ۔ وہ زبان سے چپ تھیں مگر ان کے ہاتھوں کی رفتار اور چھڑی کی شدید ضربات ان کی اندرونی اور باطنی کیفیات کا پورا اظہار کر رہی تھیں ۔ وار پر وار ہو رہا تھا ۔ ابتدا میں پاشا گم سم بلکہ سن ہو گئی پھر اس نے بے تحاشا غل مچانا شروع کر دیا ۔ در و دیوار ہل گئے ۔ گود میں عدنان بھی زد میں آیا ۔ وہ الگ اونچی آواز میں رو رہا تھا ۔ ارسلان مہر دلی والا ، عدنان کا ابو اور پاشا کا چاہنے والا خاموشی سے بیٹھا حلق سے اتارتا رہا ۔ جب اس نے فارغ ہو کر ہاتھ منہ پونچھ لیا تو ساس کی طرف بڑھا ، جیسے وہی اس طوفان کو روک سکتا تھا ۔ مگر اس کی طرف سے پہل کی نوبت ہی نہ آئی ۔ پاشا کو چھوڑ کر جب شاہ جہاں بیگم نے ارسلان کو نشانہ بنایا تو وہ منظر بڑا عجیب و غریب تھا ۔ پاشا چپ ہو کر رسلان کو پٹتا دیکھنے لگی ۔ جب شاہ جہاں بیگم تھک کر چور ہو گئیں تو وہ چھڑی کو آسمان کی طرف اچھالتے ہوئے صوفے میں دھنس گیا ۔ وہ دونوں اپنی چوٹیں سہلاتے ، وہیں بیٹھے رہے ۔ شاید اب ان میں ہلنے کی بھی سکت نہ تھی ۔ ننھا عدنان چپ چپ نانی کو گھور رہا تھا ۔ دم لے کر شاہ جہاں انھیں تو انھوں نے یک بارگی ارسلان کے سر کے بالوں کو مٹھی میں دبوچا اور گھسیٹتے ہوئے باہر دالان میں جا پٹکا ۔ ممتاز محل پاشا یہ دیکھ کر بجلی کی سرعت سے انھیں عدنان کو کرسی پر بٹھایا اور دہائی دی "ارے ۔۔۔ میرے کے امی! کیا ہمارے میاں کو مار اچ دیں گے ؟" شاہ

جہاں بیگم نے خشم گیں آنکھوں سے بیٹی کو دیکھا اور پے در پے کئی چپتیں لگا دیں پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے بھی مہر دلی والے کے پاس دے کر پہنچا دیا۔ یہی نہیں وہ پھرتی سے واپس آئیں ننھے عدنان کو اٹھایا اور اسے بھی ماں کے پاس بٹھلا کے دروازہ بند کر لیا۔

انھیں احساس ہو چکا تھا کہ وہ اپنے کیے دھرے پر پانی پھیر رہی ہیں۔ ان کی نازوں پلی بیٹی سب آرام عیش اور لاڈ پیار بھول کر ان تازہ سلوک ہی یاد رکھے گی۔ لیکن یہ بھی تقدیر میں پہلے سے مرقوم تھا! وہ اس حالت میں تھیں کہ رو کر دل کی بھڑاس بھی نہ نکال سکتی تھیں۔

شاہ جہاں بیگم ساری رات کھانے کی میز کے کونے والی کرسی پر ٹنگی رہیں۔ گھر پر طاری اداسی آمیز ہیبت اور بیوی کی تنہائی کا احساس کرتے ہوئے اکبر علم دار بھی پاس آبیٹھے۔ ان دونوں میں کسی قسم کی گفتگو نہ ہوئی۔ خاموشی میں جو کلام ہو رہا تھا وہ دونوں کا دل چھلنی کر چکا تھا۔ صبح دم شاہجہاں بیگم کو نیند کے پہلے اور معمولی جھونکے سے اکبر نے ہلا کر بیدار کر دیا۔ پہلا خیال ان کو یہی آیا اکبر کیا تمام شب جاگتے تو نہیں رہے دوسرے لمحے ان کو پاشا کی عاجزی اور گڑگڑا، گڑگڑا کر پکارنے نے متوجہ کر لیا "اماں! میرے میاں کو دیکھنے کو آنا!" وہ منت سماجت کر رہی تھی۔ اکبر علم دار بھی اشارہ کیا۔ شاہ جہاں بیگم سمجھ گئیں۔ ارسلان کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ علامتیں صاف بتا رہی تھیں چناں چہ وہ اٹھ کر بغیر بولے چالے کیسٹ کے یہاں چلی گئیں اور جانے کیا لا کر ارسلان کے سامنے پھینک دیا۔ جیسے ہی ارسلان کو ذرا سکون آیا، پاشا پھرتی سے اٹھی، عدنان کو بغل میں دبوچا اور جا کر سیدھی اپنے بستر میں گھس گئی۔ شاید وہ رضائی کی اوٹ سے باہر تاک بھی رہی تھی۔ جب دیکھا ارسلان قابو میں آچکا ہے تو اسے بھی تھام تھوم کر کمرے میں لے آئی۔

وہ دن گیا پھر ماں نے بیٹی سے کلام کرنا چھوڑ دیا۔ داماد سے بھی وہ چھڑی کے ذریعے پیغام رسانی کرتیں۔ چھڑی اٹھا کر اکبر علم دار کے کمرے کی طرف اشارہ کرتیں پھر چھڑی میز پر مار کر گھڑی کی طرف رکھتیں۔ ارسلان سمجھ جاتا۔ حکم صادر ہوا کہ خسر کو وقت پر کھانا کھلا دیا جائے۔ شاہ جہاں ہومل چلی جاتیں ارسلان پوری طرح ماما گیری کرتا۔ وہ کھانا بناتا بیوی بچے کو کھلاتا۔ خسر کی دیکھ بھال کرتا اور تب خود کھاتا۔ پاشا پوتڑوں کی بگڑی اس سے کچھ ہو تا ہی نہیں تھا۔ ایک روز ماں نے پاشا کو صوفے سے گھسیٹ کر فرش پر پٹکا اور کمرے میں رگڑتے رگڑتے گھما دیا اور چپ چاپ کام پر چلی گئیں۔ جب شام کو وہ گھر آئیں تو گھر کی صفائی، جھاڑ پونچھ ہو چکی تھی۔ ان کی بیٹی لاڈلی تو تھی مگر عقل مند بھی تھی۔ وہ اشارہ سمجھ گئی تھی۔ اس گھر میں رہنے کے لیے اب اسے بدلنا پڑے گا۔ سکھ کے بدلے کلفتوں کا مزہ چکھنا ہوگا۔ لیکن اس کے شیشۂ دل پر ماں کی طرف سے بال آگیا تھا۔ وہ ارسلان کی محبت میں اندھی تھی۔ وہ اسے آمادہ کرتی کہ چلو یہاں سے نکل چلیں، ارسلان کے بس کی یہ بات نہیں تھی۔ شاہ جہاں بیگم اسے اچھی لگیں یا نہیں وہ اسے اس کی "دوا" کی تین خوراکیں، سفید سفوف کی تین پڑیاں فراہم کر دیتی تھیں۔ اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ بیوی کے سکھانے پڑھانے پر اس نے ایک بار پر پرزے نکالنے کی تمہید باندھی تھی کہ شاہ جہاں نے آزمائے ہوئے نسخے پر عمل کیا اور چھڑی سے وہ چار چوٹ کی مار ماری کہ ارسلان نے اپنا سارا غصہ پاشا پر نکالا۔ ساس سے وہ اب بالکل دبک گیا تھا۔ تیر کی طرح سیدھا ہو کر ہر اشارہ پر چلنا فرض جانتا تھا۔

شاہ جہاں بیگم اندر ہی اندر جل بجھ اور سلگ رہی تھیں۔ وہ روز رات کو اکبر کے سینے پر سر رکھ کر دل کا غبار نکالا کرتیں۔ بار بار پوچھتیں "میرے کو قسمت کا اور کون تماشا دیکھنا ہے!" پھر سوال کرتیں "میرے کو بتلاؤ چپ کی دیوار کیسے توڑوں، پاس نہ ہو تو پاشا بیگم سے بات کرنے کو ترستی ہوں۔ وہ سامنے آ کو آتی دیکھ کر ہونٹ سل جاتے ہیں ارے میری بیٹی کو اتی گل بھی نئیں کہ ماں سے دو لفظاں کہہ کر مانگ لے"۔ ان کے دل میں بیٹی کی محبت کا لاوا پھوٹ بہنے کے لیے ابل رہا تھا۔ انھوں نے ایک راستہ یہ نکالا کہ کراچی کے دستور کے مطابق برتن بھانڈے دھونے کے لیے اور گھر کی جھاڑ پونچھ کے لیے ملازمہ رکھ لی۔ انھوں نے کھانا بنانے کے لیے خانساماں بھی رکھ لیا۔ یہ لوگ

وقت پر آتے، کام کرتے اور چلے جاتے ۔ داماد اور بیٹی سے حتی کہ نواسے سے بول چال بند تھی ۔ شاہ جہاں بیگم ان دونوں پوری توجہ اکبر علم دار کی صحت کی بحالی پر دے رہی تھیں ۔ اکبر کچھ کچھ چلنے کے قابل ہو چکے تھے ۔ زبان صاف اور رواں ہو چکی تھی ۔ وہ اپنے نواسے سے کھیلتے اور خوب بولتے تھے ۔ یہ ان کی قلبی مدد تھی ۔ عدنان بھی نانا کے ساتھ خوش رہتا تھا ۔ نانی کے گھر آنے پر وہ ان کی طرف للچائی للچائی نظروں سے دیکھا کرتا مگر نانی دور دور رہتی تھی ۔

ایک شام وہ سب لوگ چائے کی میز پر بیٹھے تھے اور اوپر کا کام کرنے والی عورت رخصت ہو رہی تھی کہ طلب سے مجبور ہو کر ارسلان نے اپنی "دوا" براہ راست شاہ جہاں بیگم سے مانگ لی ۔ دراصل وہ صبح ہوٹل جاتے ہوئے دو ہی پڑیاں اس کے سامنے پھینک کر چلی گئی تھی ۔ شاید "دوا" ختم تھی ۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ہیروئن کا عادی ذرا سے ناغے سے کتنے عذابوں سے گذرتا اور جان سے کس قدر زچ آجاتا ہے ۔ وہ بھولنے والی نہ تھیں واپسی میں راستے سے کیمسٹ کے یہاں سے متبادل "دوا" لے آئی تھیں ۔ ارسلان کے تقاضے نے یاد دلایا ۔ وہ "پڑیا" پرس سے نکالنے لگیں تو ناک کھجلا گئی ۔ انھوں نے چھینک کو چٹکی سے چھوا تو جانے ارسلان کیا سمجھا وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے میز پر تین بار ناک رگڑ دی ۔ ٹوٹتے نشے کے شکار ارسلان نے یہ حرکت کچھ اس بے ساختگی سے انجام دی کہ شاہ جہاں بیگم بے اختیار کھلکھلا پڑیں ۔ نانا کی گود میں براجمان عدنان بھی قہقہے لگانے لگا ۔ دونوں کو ہنستا دیکھ کر ممتاز محل پاشا بھی ہنسنے لگیں ۔ اپنی حماقت کا کچھ احساس ارسلان کو بھی ہو گیا وہ بھی کھسیایا کھسیایا ہنسنے لگا ۔ گھر کی فضا اور ماحول مدت بعد ہر سمت تیرتے تناؤ سے منٹوں میں آزاد ہو گئی ۔ اتنے میں اوپر والی جاتے جاتے پلٹ آئی ۔ اس نے اطلاع دی کہ مہمان آئے ہیں ۔ سامنے فصیح الدین احمد فاروقی نمودار ہو رہے تھے ۔ ارے ۔ ۔ اچانک ۔ ۔ ۔ اس طرح ۔ ۔ ۔ بے خبر رکھ کر ۔ ۔ ۔ ۔ آیئے ۔ ۔ ۔ آیئے ۔ ۔ ۔ ۔ !! فوراً ان کے لیے چائے کا اہتمام ہوا ۔ واقعی شاہ جہاں بیگم اور اکبر علم دار ان کو دیکھ کر بے حد خوش ہو گئے تھے ۔

فاروقی صاحب نے بیٹھتے ہی کہا "آپ کا بیٹا بڑا خوب صورت ہے مگر بیمار سا کیوں لگتا ہے ۔ ۔ ۔ ؟ اور آپ کا یہ پوتا تو بالکل باپ پر گیا ہے" ۔ انھوں نے اکبر علم دار کے پاس لگ کر کھڑے گول مٹول عدنان کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

"کاش! باپ بیٹے کی قسمت بھی خوب صورت ہوتی" ۔ اچانک بلا ارادہ شاہ جہاں بیگم کے منہ سے ایک لا پروا، آوارہ سا فقرہ نکل گیا ارسلان اٹھ کر اندر چلا گیا ۔ پھر ممتاز پاشا اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی اندر چلی گئی ۔ ماحول اداس ہو گیا ۔ فاروقی صاحب نے تشاو اظہار کیا تو شاہ جہاں بیگم نے خدا جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر بیٹھے بیٹھے ایک کہانی گھڑ لی ۔ ۔ ۔ ۔

ان کی بہو دو سال پہلے منے عدنان کو اکیلا چھوڑ کر خدا کو پیاری ہو گئی ۔ ارسلان کی نوکری جاتی رہی ۔ وہ ہیروئن کا عادی ہو گیا ۔ کاروبار کیا وہ تباہ ہو گیا ۔ مال دولت مٹی میں رل گئی ۔ کوئی ایک مصیبت ہو تو آدمی بھگتے یہاں تو ایک کے بعد دوسرا بحران درپیش تھا ۔ بچی سر الگ بیٹھی ہے ۔ مناسب رشتہ نہیں ملتا ۔ اکبر صاحب الگ بیمار پڑے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ سارے بوجھ شاہ جہاں بیگم کے ناتواں کاندھوں پر دھرے رکھے تھے ، انھوں نے جان بوجھ کر لندن کا ذکر نہ کیا ۔ ان کی دانائی پوری طرح جاگ اٹھی تھی ۔ وہ اپنے نہ بلانے کا ذکر کر کے فاروقی صاحب کو دفاع کا موقع دے کر اس وقت انگڑائی لے کر پوری طرح بیدار ہوتی ہمدردی سے محروم ہونے کا موقعہ نہیں گنوانا چاہتی تھیں ۔ ۔ ۔ فاروقی صاحب دیر تک افسوس اور ملال ظاہر کرتے رہے ۔

دوسرے روز ہوٹل سے ، ہمدردی میں ڈوبے فاروقی صاحب نے ٹیلی فون پر خوش خبری سنائی کہ وہ ان سب کو اپنے ساتھ انگلستان لے جا رہے ہیں ۔ ان کو لے جانے کی راہ نکال رہے ہیں ۔ وہ سب تیار رہیں ۔ وہ تھوڑے سے خفا بھی ہوئے ۔ ٹھیک ہے شاہ جہاں بیگم نے

بلوانے کا لکھا تھا مگر یہ اشارہ تو نہ دیا تھا کہ ان پر کیا بیت رہی ہے ۔ وہ کس قدر سلامت روی سے ان کے تجارتی مفادات کی دیکھ بھال کرتی رہیں ۔ ان کی نجی زندگی کا سایہ تک ان کی کارکردگی پر نہ پڑا ۔ اتنا کچھ سہنے کی بجائے انھیں خبردار کرنا ضروری تھا ۔ اگلے روز انھوں نے اسلام آباد سے ٹیلی فون کیا "جتنی جلدی ہو سکے ، سب اسلام آباد پہنچ جائیں! "کراچی سے نپٹ کر آئیں ۔ وہیں سے ، اسلام آباد سے لندن روانگی ہوگی ۔

جناب فصیح الدین احمد فاروقی نے شاہ جہاں بیگم سے الگ اکبر علم دار کو ٹیلی فون کر کے بتایا کہ وہ ان کی بیٹی سے دکھاوے کی ، سہولت کی شادی کریں گے ۔ باقی لوگ وزیٹر بن کر چلیں گے پھر وہ خصوصی حالات میں ، خصوصی اجازت لے کر ان کے بیٹے (انھوں نے پوچھا اپنے بیٹے کا نام تو بتایئے تو اکبر کے منہ سے بے ساختہ ارسلان نکل گیا) کو وہ اپنے کسی بھی ادارے میں کھپالیں گے ۔ اور وہ دونوں میاں بیوی ان کے ذاتی معاونین کے طور پر کام کیا کریں گے ۔۔۔ انھوں نے ارسلان کا علاج کرانے کی تسلی بھی دی تھی ۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا! علم دار صاحب! آپ کی بیٹی کے لیے اچھا سا رشتہ بھی ، ہم ڈھونڈ دیں گے! "شاہ جہاں بیگم اور اکبر علم دار فاروقی صاحب کے رکھ رکھاؤ کے قائل اور خلوص سے گھائل قسمت کے اس مذاق کی سنگینی پر پچھتا بھی رہے تھے اور ان کے پاس اس کو پلٹا کر درست کرنے کے لیے کوئی علاج یا مداوا بھی نہ تھا ۔ آخر انھوں نے پاشا اور مہرولی والے سے ہی پوچھا "کیا وہ اتفاقا "گڑھی گئی کہانی کا کردار بنیں گے ؟ "شاہ جہاں بیگم نے کہا تھا ۔ وہ ان دونوں کو معاف کر دیں گی ۔ اگر وہ یہ وعدہ کریں کہ اپنے پیروں پر کھڑا کو "حقیقی" زندگی اور اس میں درپیش مسائل کا "مقابلہ" کرنے پر تیار ہو جائیں ۔۔۔ کیا خبر لندن جا کر کیا سامنے آئے ۔ وہاں کی زندگی کیسی ہو ۔ "میرے کو یہ بھی نئیں پتہ پکی بات معلوم ہونے پر فاروقی صاحب کا کیا ردعمل ہوئیگا ؟"

لندن کی زندگی اور لندن کے شب و روز سے ارسلان مہرولی والا اچھی طرح واقف تھا ۔ کسی اور کو مغالطہ ہو تو ہو وہ نشے کی لت چھوڑنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا ۔ دو دن کی مہلت گزرنے سے پہلے ہی ارسلان نے مٹھی کھول کر اپنے پتے میز پر رکھ دیے ۔ اس نے کہا "وہ ساتھ جانے پر تیار ہے " ۔ کسی بھی حیثیت میں جانے پر تیار ہے ۔ وہ ممتاز محل پاشا کو بہن ہی نہیں ماں ماننے کے لیے بھی تیار ہے ۔ وہ قسم کھانے لگا کہ یہ راز قبر میں ساتھ لے جائے گا کہ وہ ان کا اصلی بیٹا نہیں ۔ ارسلان نے شاہ جہاں بیگم کو آنٹی کے بدلے اماں کہنا شروع کر دیا ۔۔۔ مگر پاشا اڑ گئی ۔ پھر اس نے چپ سادھ لی ۔ بیٹی ماں کی کمزوری تھی ۔ اس سے بھی بڑی جتنی پاشا کے لیے ارسلان!! مگر شاہ جہاں بیگم کوئی کمزور ماں نہیں تھیں انھوں نے اتنے دنوں بعد براہ راست ممتاز محل پاشا کو مخاطب کیا "میرے کو تمھارے جنتے ہوئے جتنی تکلیفاں ہوئی تھیں اس سے زیادہ اب تمھارے کو چھوڑ جانے پر ہوں گی! تم جانتے ہو میرے میں مقابلے کی بڑی طاقت ہے " ۔ جب تیاریاں ہو رہی تھیں اور مہرولی والا اپنے ساتھ جانے کو یقینی بنانے کے جتن کرتا نظر آیا تو پاشا پھسک پڑی ۔ اس نے شوہر کو کوسا پیٹا تو شوہر اس کا مطلب سمجھ گیا ۔ اس نے پاشا کا سامان بھی باندھنا شروع کر دیا ۔ وہ خاموش بیٹھی تکتی رہی ۔۔۔

سب جانتے تھے پاشا تو ہاتھ ہلانے سے رہی!

تیسرے روز ،

نگم پلی سے ،

کراچی کی حیدر آباد کالونی میں آکر بس جانے والی مضبوط ارادے اور نازک اعضا ، اور کومل بدن کی سدا بہار خاتون شاہ جہاں بیگم جن کا شوہر عشق میں اپنا آبائی گھر اور گھر والے تمام عزیز و اقارب چھوڑ کر ان کی مٹھی میں آگیا تھا اب پھر ایک بار ان کے سنگ نئی دنیا بسانے جا رہا تھا کہ اس کی تو وہی تھیں ۔

کراچی سے وہ لوگ حیدر آباد (سندھ) کے لیے روانہ ہوئے جہاں ان کا دور کا ایک رشتہ دار رہتا تھا، وہی جس کے کاروبار کے خیالی پلاؤ سن کر شاہ جہاں بیگم نے "میلی فوماں" کو "خوش بودار" بنانے کی ترکیب پنجابی سوداگر ان کے سرکردہ رکن عبدالمنان صاحب کے گوش گزار کی اور اس طرح وہ سلسلہ شروع ہوا جو ان کے جیون کے صحرا کو کچھ مدت کے لیے انتہائی خوشبوؤں بھرے نخلستان میں بدل گیا تھا۔ اس غیر ضروری مگر کسی حد تک جذباتی ملاقات کے بعد اسلام آباد اور وہاں سے انگلستان کا کوچ تھا۔ وہ منزل جہاں وہ برائے برائے تذکرہ کہ سکتی تھیں کہ وہ کراچی میں اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ کر، دل پر پتھر رکھ کر آئی ہیں۔

اب یہ ان کی تقدیر کا لکھا تھا یا محض بھول تھی یا چھپا ہوا مستقبل ـ ـ ـ ـ شاہ جہاں بیگم "اپنے بیٹے" ارسلان مہرولی والا کی "دوا" گھر بھول آئی تھیں۔ جیسے جیسے کراچی دور ہو رہا تھا ارسلان کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ بے قابو ہو رہا تھا اس کی حالت بگڑ رہی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ "اپنی" امی سے، آنٹی سے، ساس سے الجھ گیا۔ وہ ایک ہی وقت میں تین تین متنازعہ قسم کی شخصیتوں سے الجھ رہا تھا۔ امی سے جو اس کی امی نہ تھی۔ آنٹی سے جو اس کی آنٹی بھی نہ تھی اور ساس سے۔ وہ نئے رشتے کے بعد ساس بھی نہ رہی تھی ـ ـ ـ مگر سامنے تو ایک ہی عورت بیٹھی تھی جس سے اسے کوئی محبت نہ تھی۔ اسے اس کی بیٹی سے بھی کوئی خاص محبت نہ تھی۔ اب اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا کہ وہ ایسی عورت یا عورتوں کے آگے میمنا بنے جن کو وہ تقریباً تقریباً ناپسند بھی کرنے لگا تھا۔ آخر شاہ جہاں بیگم نے جگ ہنسائی کے خوف سے بدحواس ہو کر کہا "جاؤ میاں، میرے کو کچھ نہ بولو۔ کراچی جاؤ ریل سے کود و اور بھاگ کر جاؤ دوائیوں والی الماری میں رکھی اپنی پڑیاں لے آؤ ـ ـ ـ ـ ـ"

ارسلان مہرولی والا جو پڑھا لکھا تھا، وجیہہ و خوب صورت تھا، جوان تھا، مہم جو تھا مگر نشے کی بھٹی میں جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ نشے کی طلب کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی بیوی کو بہن ملنے پر تیار ہو چکا تھا۔ جو پہلے ہی انگلستان سے کراچی آتے سے قسمت کی یاوری آزمانے کے لیے اپنوں کے لیے غیر بن کر، ان کو بھلا بیٹھا تھا۔ بھول گیا کہ وہ کہاں ہے، کیا کر رہا ہے؟ جیسے ہی اس کے کان میں یہ صدا پڑی، جاؤ ریل سے کود جاؤ۔ دوڑ کر جاؤ اور دوائیوں والی الماری میں پڑی اپنی خوراک لے آؤ تو وہ ایک بار پھر سب حتیٰ کہ اپنے بیٹے کو فراموش کر بیٹھا ـ ـ ـ ـ وہ اٹھا اور ریل سے کود گیا!

کوئی قیامت برپا ہوئی۔
ریل تھم گئی،
پاشا کی دنیا بھسم ہو گئی۔

ممتاز محل پاشا بین کر رہی تھی، رو رہی تھی، بال نوچ رہی تھی، ماں کو "خاتل، خاتل" پکار رہی تھی۔ گاڑی کے مسافر ہم راہی ہق دق سب دیکھ رہے تھے۔ شاہ جہاں بیگم الگ سسکیاں بھر رہی تھیں۔ اکبر علم دار پورے کے پورے غم بردار بنے نظر آرہے تھے۔ لوگوں نے حادثہ ہوتے دیکھا تھا۔ حادثے کی وجہ، حادثے کا کارن کسی کو معلوم نہ تھا۔ رونے والے بے قصور اور مظلوم نظر آرہے تھے۔ ان کی دیکھتی آنکھوں ایک نوجوان اٹھا اور بلاوجہ ریل سے کود گیا۔ چرچا ہو گا ـ ـ ـ!

ارسلان کی ہڈیاں بوٹیاں چن چن کر جمع کی گئیں اور حیدر آباد میں دفنا دی گئیں۔ وہاں سے یہ لٹا مٹا قافلہ کئی دنوں کی تاخیر سے اسلام آباد پہنچا۔ یہ المیہ، یہ حادثہ، یہ جاں کاہ واقعہ اردو، انگریزی چھوٹے، بڑے ہر اخبار کے پہلے صفحہ کی سرخی بنا ـ ـ ـ سرخی تو بننا ہی تھی اس خاندان کا ہر دلعزیز راہ داری بھی بن گیا ـ ـ ـ

اور

ایشیائی ملکوں کے مقابلے میں انگلستان میں وقت جس تیزی سے دوڑتا بلکہ اڑتا ہے اس کا احساس سب سے پہلے شاہ جہاں بیگم کو ہوا۔ ان کی بیٹی جو اُن سے ناراض تھی وہ دوسروں سے ہنستی بولتی تھی۔ فاروقی صاحب کے بیٹے اور بہوئیں اس کی ہم عمر تھیں۔ سب کی آپس میں بن رہی تھی۔ پھر اس نے ایک حیران کر دینے والی ادا کے ساتھ فاروقی صاحب کو تجویز کیا کہ وہ بچ بچ اس سے شادی کر لیں۔ رجسٹرار کے سامنے چل کر دکھ سکھ کا ساتھی بن کر زندگی گزارنے کا پیمان باندھیں۔۔۔۔اسلام آباد کا سہولتی نکاح اسلامی شادی اور لندن میں رجسٹرار کے سامنے اقرار قانونی بیاہ!

ایسا ہی ہوا۔۔۔۔۔!

ایک ماہ بعد اس نے اپنی امی شاہ جہاں بیگم کو کاغذات دکھاتے ہوئے خبر دی تھی کہ اب عدنان اس کا "بھتیجا" نہیں اس کا او فاروقی صاحب کا "گود لیا" بیٹا ہے۔۔۔۔

اور

جب پارٹی ختم ہوئی۔ وہاں ممتاز محل پاشا۔ اس کے ابا اکبر علم دار اور اماں شاہ جہاں بیگم ہی رہ گئے تو ممتاز محل پاشا نے بڑے اعتماد سے، جذبات سے خالی لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔

"اماں۔۔۔یہاں سے چلے جاؤ۔۔۔۔میں تمھارے بغیر جی سکتی ہوں۔ جی لیوں گی"۔

شاہ جہاں بیگم نے حیران، پریشان ہو کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا" جس کی خاطریاں آئے وہ اج بولے کہ جاؤ۔۔۔۔"

اکبر علم دار نے بیٹی سے منہ پھیر کر اپنی چہیتی بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ انھوں نے شاہ جہاں بیگم کا نازک پتلا، مخروطی لانبی انگلیوں والا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے کی پناہ میں لے لیا تو شاہ جہاں بیگم نے بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ التجائی لہجے میں پوچھا "کیا میرے کو خاتل بولنے کو رہ گیا میرے کو بتلاؤ کس واسطے اس اجاڑنے میکہ چھوڑا، سسرال چھوڑی اور پردیس کو چلی آئی تھی؟"

(سلسلہ ص ۶۰)

○ ○ ○

اس کی پلکوں پہ رکھوں ہونٹ تو یوں جلتے ہیں
اس کے سینے میں کہیں آگ لگی ہو جیسے

شہر کے چوک پہ خیرات لٹانے والے
یہ بھی سوچا کہ پڑوسی ترا بھوکا ہوگا

اس کے آنسو ہی بتاتے تھے نہ اب لوٹے گا وہ
اس سے پہلے تو بچھڑتے وقت یوں روتا نہ تھا

رہ گیا تنہا میں میں اپنے دوستوں کی بھیڑ میں
اور ہمدم وہ بنا جس سے کوئی رشتہ نہ تھا

"مہمان" کے مطالعے سے ایک طرح کا اطمینان ہوتا ہے اردو شاعری کو زندہ رکھنے کی سعی کرنے میں آنے والی نسلیں بھی مصروف ہیں۔ عتیق الظفر بیان کی ندرت کے ساتھ زبان کی صحت کا خیال بھی رکھیں اور اس سے بے اعتنائی نہ برتیں تو ہم ان سے بہت اچھے کلام کی توقع کر سکتے ہیں۔ ہمارے عصر کی جس نسل سے عتیق الظفر کا تعلق ہے اس کے کرب اور اس کی مسرت کے تجربے ان کی عمر کے لحاظ سے مختلف ہیں اور ان کے اظہار کے لیے اس نسل کو نئی تشبیہات اور نئے استعارے ایجاد کرنے پڑیں گے لیکن تشبیہہ اور استعارے کے استعمال میں ان کے تلازمے کا خیال رکھنا اور شعر میں برتنا ضروری ہے۔ آج کل فن کی نزاکتوں اور لوازمات کا کم خیال رکھا جاتا ہے لیکن چوں کہ عتیق الظفر شاعری میں دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے ان کو چاہیے کہ اپنے کلام کا فن کی اساس پر تنقیدی جائزہ لیا کریں تاکہ ان کا کلام زیادہ نکھری ہوئی شکل میں ہمارے سامنے آئے۔

(راشد آذر)

نقد و نظر

[تبصرے کے لیے دو کتابیں بھیجی جائیں۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

نام کتاب: مولانا باقر آگاہ ویلوری شخصیت اور فن　مصنف: ڈاکٹر ذاکرہ غوث　ضخامت: ۶۱۶ صفحات

قیمت: ۱۵۰/ روپے۔　سائز: ڈیمائی　ناشر: ذاکرہ غوث۔ ۱۴۴، لائیڈز روڈ، مدراس ۸۶

ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، علی گڑھ، بمبئی

"مولانا باقر آگاہ ویلوری شخصیت اور فن" ڈاکٹر ذاکرہ غوث کا ایک تحقیقی شاہکار ہے۔ اس کی اشاعت اردو ادب میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔ جنوبی ہند کی ادبی تاریخ میں مولانا باقر آگاہ کی شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے ان کا شمار اپنے وقت کے معتبر عالموں میں ہوتا ہے۔ ہم عصر تذکرہ "گلزار اعظم" میں انھیں عالم باعمل، محدث بے بدل، عارف روشن ضمیر، فقیہ بے نظیر، جامی دوراں، اور بیدل زماں جیسے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ باقر آگاہ کئی علوم اور متعدد زبانوں کے عالم اور ماہر تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی، اور اردو میں شاعری کی اور ان زبانوں میں تصنیفات کا گراں بہا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا۔ جن کی تعداد (۳۰۳) بتائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور رقم طراز ہیں کہ "آگاہ اردو کے بڑے محسنوں میں سے ہیں نثر اور نظم دونوں پر قابو تھا ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے واقعہ یہ ہے کہ دکنی علم و فضل اور شعر و سخن ان پر ختم ہو گیا ان کے بعد جنوبی ہند میں اتنا بڑا ادیب اور شاعر پیدا نہ ہو سکا۔ وہ میر اور سودا کے ہم عصر تھے لیکن زبان قدیم استعمال کی ہے۔"

باقر آگاہ نے اردو میں اپنے علمی کام کا آغاز اس وقت کیا جب کہ ہندوستان میں سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے فارسی کے بجائے اردو کی سرپرستی کی جارہی تھی۔ انگریزوں کا منشا بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ "صرف یہ تھا کہ مسلمان اپنے سابقہ علمی سرمائے سے محروم ہو جائیں اور فارسی بھول کر صرف اردو لکھیں اور بولیں اور اردو میں دینی کتابیں نہ ہوں تو جلد عیسائی بن جائیں مگر تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ باقر آگاہ، قاضی بدر الدولہ وغیرہ نے اتنا اچھا دینی ذخیرہ اردو میں تیار کر دیا کہ وہ ملی ضرورتوں کے لیے کافی تھا۔" اس طرح باقر آگاہ اور ان کے شاگردوں کے فیض عام نے تشنگان علم و کمال کو ایک مدت دراز تک سیراب کیا ہے۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے بانی اور پہلے معتمد مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم نے اسی (۸۰) پچاسی (۸۵) سال پہلے باقر آگاہ کی گراں قدر علمی خدمات خصوصاً ان کی زرین اردو خدمات سے علمی دنیا کو روشناس کرایا تھا۔ گذشتہ نصف صدی میں باقر آگاہ کی علمی خدمات پر بہت سے مضامین اور تعارفی مقالے لکھے گئے۔ ان کے عربی اور اردو دیوان کی تدوین پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی عطا ہو چکی ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ دلچسپ، معلومات آفریں تحقیقی کام ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے کیا ہے انھوں نے بیس سال پہلے "باقر آگاہ کی عربی، فارسی اور اردو خدمات" انگریزی میں ایک مقالہ لکھ کر مدراس یونیورسٹی سے ایم۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان کا انگریزی مقالہ ہر ممکنہ کوشش کے باوجود زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا لیکن ریسرچ کی دنیا میں باقر آگاہ کی روز افزوں بڑھتی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے خود ڈاکٹر ذاکرہ غوث

نے اپنے انگریزی مقالہ کا ایک اہم حصہ "مولانا باقر آگاہ ویلوری شخصیت اور فن" کے عنوان سے اردو میں شائع کر دیا ہے۔ یہ مقالہ (۱۱۹ صفحات اور (۱۳) ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں باقر آگاہ کی حیات، شخصیت، ان کے عہد، ان کی فکری و فنی اساس، ان کی مثنویوں، قصیدوں، مرثیوں، غزلوں اور رباعیوں کا تحقیقی و تنقیدی نقطہ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ آگاہ کی شخصیت اور ان کے فن میں اس عہد کے رجحانات کا عکس تلاش کریں۔ انھوں نے آگاہ کی اردو شاعری خصوصاً ان کی تمام مثنویوں سے اردو دنیا کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ متعارف کروایا ہے۔ اس کے علاوہ آگاہ کے قصیدوں، مرثیوں، غزلوں اور رباعیوں کا بھی سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ ان کا یہ تحقیقی کارنامہ اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے پہلی بار باقر آگاہ کو نثرنگار کی حیثیت سے پیش کر کے ان کے تمام دیباچوں کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ باقر آگاہ نے اپنی مثنویوں اور اردو دیوان کے شروع میں جو طویل نثری دیباچے لکھے ہیں وہ نہ صرف بڑی اہمیت بلکہ تاریخ نثر اردو میں بھی اولیت کے حامل ہیں۔ آگاہ نے مختلف ادبی امور پر مدلل قلم آرائی کی ہے۔ اس طرح نثر میں شمالی ہند کے اس دور کے شعرا کے کلام کے مقابل آگاہ کا کام بہت ہی نمایاں اور اہم ہے۔

باقر آگاہ کی عظمت کا مناسب اعتراف ابھی شمالی ہند والوں نے اپنی لسانی عصبیت اور لاعلمی کی بنا پر نہیں کیا ہے۔ امید ہے یہ کتاب باقر آگاہ کو ان کا صحیح مرتبہ دلانے میں معاون ہوگی اور اردو دنیا میں اس کتاب کی اچھی پذیرائی ہوگی۔

(ڈاکٹر افضل الدین اقبال

نام کتاب: پہچان (مجموعۂ کلام)   مصنف: عتیق النظر   ضخامت: ۱۹۲ صفحے
سائز: ۸/ اڈمائی   قیمت: اسی روپے   ناشر: نئی آواز بٹلہ ہاؤس، اوکھلا، دلی ۲۵

اردو شاعری کی دنیا میں ۱۹۸۰ء کے بعد داخل ہونے والوں میں جن کا نام ممتاز شعراء کی فہرست میں آتا ہے ان میں عتیق النظر بھی ایک نام ہے۔ عتیق النظر کا پہلا مجموعۂ کلام "پہچان" ۱۲۹ صفحوں پر مشتمل ایک خوب صورت تحفہ ہے جو انھوں نے اردو دنیا کو دیا ہے۔ اس میں ۹۸ غزلیں اور ۲۳ نظمیں ہیں۔ اس مجموعے میں نظمیں کم بھی ہیں اور نسبتاً کمزور بھی اور ان کا تاثر بیانیہ انداز کی یکسانیت میں دب گیا ہے۔ غزلیں زیادہ بھی ہیں اور اچھی بھی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ عتیق النظر اپنے لہجے کی شناخت بنانے کی طرف توجہ بھی کر رہے ہیں اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اپنے پہلے ہی مجموعے پر اپنے لہجے کی شناخت کی مہر لگانا آسان نہیں ہے۔ ان کو ان کے انداز بیاں کی تازگی، نئے پن اور اچھوتے پن سے پہچانا جا سکتا ہے۔ آگے چل کر یہ وصف ان کے انفرادی لہجے کی تشکیل میں معاون ثابت ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ وہ اپنے لہجے کی انفرادیت پہچانیں اور مسلسل ریاض کے ذریعے اس کو نکھاریں۔ ویسے تو "پہچان" میں اچھے شعر کافی تعداد میں ہیں لیکن اختصار ضرورت کے پیش نظر یہاں صرف چند شعر دیے جا رہے ہیں۔

کہیں چھپے نہ ہوں پھولوں میں آتشیں گولے   کسی سے پھول کا تحفہ کوئی لیا نہ کرے
ساون اور بھی اچھا ہوتا   ساتھ اگر تو بھیگا ہوتا
فاصلے پر جو مجھے ہر شخص سے اچھا لگا   اب وہی سب سے برا نزدیک آکر ہوگیا
بچھڑتے وقت اتنا درمیاں تھی ورنہ   منانا دونوں نے اک دوسرے کو چاہا تھا (آگے جگر

ادارے کی خبریں

رفقائے ادارہ

ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کے اجلاس منعقدہ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۵ء میں جناب محبوب حسین جگر (شریک مدیر روزنامہ سیاست حیدرآباد) اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر انجمن ترقی اردو (ہند) کی اردو زبان و ادب کی ترقی کے سلسلے میں گراں بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں بہ اتفاق آرا ادارے کا رفیق منتخب کیا گیا۔

ادارہ ادبیات اردو کے ذیلی شعبوں کی تشکیل جدید

ادارہ ادبیات اردو کے ذیلی شعبوں کی بطور ذیل تشکیل جدید عمل میں لائی گئی ہے۔ یہ شعبے تاریخ تشکیل (یکم نومبر ۱۹۹۵ء) سے دو سال کی مدت تک کارگزار رہیں گے۔ معتمد عمومی بہ اعتبار عہدہ تمام شعبوں کے اجلاسوں میں شرکت کریں گے۔

(۱) شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ

صدر: پروفیسر سید سراج الدین نائب صدر: پروفیسر تقی خاں معتمد: جناب محمد منظور احمد منظور

اراکین:۔ پروفیسر تقی علی مرزا پروفیسر انور معظم پروفیسر ست نارائن سنگھ پروفیسر یوسف کمال ڈاکٹر مصطفی کمال ڈاکٹر محمد علی اثر جناب اسامہ فاروقی (انچارج دفتر: جناب خواجہ محمد سرور)

(۲) شعبہ سب رس

مجلس مشاورت:۔ صدر: پروفیسر جعفر نظام نائب صدر: جناب زاہد علی خاں معتمد: پروفیسر مغنی تبسم

اراکین: پروفیسر گوپی چند نارنگ پروفیسر سید سراج الدین جناب رمن راج سکسینہ جناب محمد منظور احمد منظور جناب غلام جیلانی ڈاکٹر بیگ احساس۔

مجلس ادارت:۔ مدیر: پروفیسر مغنی تبسم معاونین: جناب غلام جیلانی ڈاکٹر بیگ احساس۔

(انچارج دفتر: جناب اقبال احسن علوی)

(۳) شعبہ کتب خانہ

صدر: جناب جواد رضوی نائب صدر: جناب منظور الامین معتمد: ڈاکٹر مصطفی علی خاں فاطمی

اراکین:۔ پروفیسر میر مصطفی حسین جناب سید صفی الدین قادری جناب موہن پرشاد جناب صلاح الدین نیر محترمہ فاطمہ عوض سعید۔ (انچارج دفتر: جناب محمد عبد الرشید)

(۴) شعبہ میوزیم

مشیر: ڈاکٹر ایم۔ ایل۔ نگم صدر: ڈاکٹر ای۔ کے۔ شرما معتمد: ڈاکٹر رحمت علی خاں

اراکین:۔ جناب کوکب دری پروفیسر احمد اللہ خاں ڈاکٹر داؤد اشرف ڈاکٹر مصطفی علی خاں فاطمی ڈاکٹر صادق نقوی

ڈاکٹر زینب حیدر   ڈاکٹر میر کمال الدین علی خاں   (انچارج دفتر: فرحت نقوی صاحبہ)

(۵) شعبہ امتحانات

صدر: پروفیسر جعفر نظام   نائب صدر: جناب ظہیر الدین علی خاں   معتمد: پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

شریک معتمد: ڈاکٹر محمد انور الدین

اراکین :- پروفیسر یوسف سرمست   پروفیسر شریف النسا بیگم انصاری   جناب محمد رحیم خاں   ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

جناب ہاشم حسن سعید   جناب خالد قادری   ڈاکٹر عبدالمجید صدیقی   جناب علی الدین قادری   ڈاکٹر صبیحہ نسرین

جناب کے۔ راملو   (انچارج دفتر: جناب وقار خلیل)

(۶) شعبہ خواتین

صدر: محترمہ فاطمہ عالم علی خاں   نائب صدر: محترمہ سلطانہ شرف الدین   معتمد: پروفیسر اشرف رفیع

شریک معتمد: محترمہ قمر جمالی

اراکین :- محترمہ بلقیس علاء الدین   محترمہ رفیعہ منظور الامین   پروفیسر حبیب ضیا   محترمہ لکشمی دیوی راج

محترمہ جمیلہ نشاط

(۷) ایوان اردو ڈیولپمنٹ کمیٹی

چیرمین: جناب پرمانند سنگھی   اراکین: جناب زاہد علی خاں   ڈاکٹر ام۔ ال۔ نگم

••••••••••••••••••••

شعبہ خواتین ادارہ ادبیات اردو

○ شعبہ خواتین کا ادبی اجلاس ۳/ ڈسمبر ۱۹۹۵ء کو پروفیسر حبیب ضیا سابق صدر شعبہ اردو ویمنس کالج حیدرآباد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروگرام کے مطابق اجلاس میں محترمہ فاطمہ عالم علی خاں نے قاضی عبدالغفار کی حیات اور شخصیت پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ محترمہ فریدہ زین نے اپنا افسانہ "لمحوں کی گزرگاہ" سنایا اور محترمہ ناز حیدر صاحبہ نے اپنی شعری تخلیقات پیش کیں جن پر مختلف اصحاب نے اظہار خیال کیا۔ پروفیسر اشرف رفیع معتمد شعبہ خواتین نے کہا کہ محترمہ فاطمہ عالم علی خاں کا مضمون اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے والد قاضی عبدالغفار کی حیات کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ فاطمہ عالم علی خاں صاحبہ کا انداز تحریر منفرد ہے۔ یہ مضمون زبان وبیان کے اعتبار سے نئی نسل کے لکھنے والوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ محترمہ فریدہ زین کا افسانہ ان کے پچھلے افسانوں سے مختلف ہے۔ انھوں نے پہلی بار علامت نگاری سے کام لیا ہے۔ یہ بڑی خوش آیند تبدیلی ہے۔ ناز حیدر صاحب کہنہ مشق شاعرہ ہیں۔ کلاسیکی رنگ میں شعر کہتی ہیں۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین نے بھی تخلیقات پر تبصرہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر مصطفیٰ علی خاں فاطمی، جناب ایس۔ اے۔ رضوی اور جناب محمود حامد نے مباحث میں حصہ لیا۔

اس اجلاس میں انگلستان سے آئے ہوئے مہمان شعرا جناب اکبر حیدرآبادی اور جناب مصطفیٰ شہاب نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

پروفیسر حبیب ضیا نے اپنی صدارتی تقریر میں شعبے کی کارکردگی کو سراہا اور اجلاس میں پیش کردہ تخلیقات کی ستائش کی۔ شریک معتمد محترمہ قمر جمالی نے اجلاس کی کارروائی چلائی۔ ان کے شکریے پر محفل اختتام کو پہنچی۔

○ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش، ادارۂ ادبیات اردو، انجمن ترقی پسند مصنفین اور مخدوم سوسائیٹی کے زیر اہتمام اردو کے ممتاز شاعر ساغر نظامی (مرحوم) کے نو دسالہ یوم پیدائش پر سہ روزہ تقاریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ پہلی تقریب ۲۰/ دسمبر ۱۹۹۵ء کو شعبۂ خواتین ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ایوان اردو پنجہ گٹہ میں منعقد ہوئی۔ محترمہ فاطمہ عالم علی خاں نے صدارت کی۔ اس اجلاس میں محترمہ ذکیہ سلطانہ نیر (بیگم ساغر نظامی) اور ڈاکٹر سلمیٰ شاہین کا خیر مقدم کیا گیا جنھوں نے ساغر نظامی کی شخصیت اور فن پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ساغر نظامی ایک عظیم قومی شاعر تھے۔ وہ جوش ملیح آبادی کے ساتھیوں میں تھے۔ وہ حریت پسندی کے نقیب اور قومی استحکام کے حامی تھے۔ شاعری کے مجموعوں کے علاوہ نثر میں بھی ان کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر اشرف رفیع نے ساغر نظامی کی شخصیت اور فن پر ایک سیر حاصل مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین نے "عصری سماجی کشمکش میں عورت کا رول" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔

بعد ازاں محترمہ ذکیہ سلطانہ نیر اور ڈاکٹر سلمیٰ شاہین نے اپنا کلام سنا کر سامعین سے داد حاصل کی۔ محترمہ فاطمہ عالم علی خاں نے صدارتی تقریر میں ساغر نظامی کی حیات اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بیگم ساغر نظامی اور ڈاکٹر سلمیٰ شاہین کا خیر مقدم کیا۔ محترمہ قمر جمالی کے شکریے پر یہ خوش گوار محفل اختتام کو پہنچی۔

معائنہ ادارۂ ادبیات اردو

ماہ نومبر اور ماہ دسمبر ۱۹۹۵ء میں حسب ذیل اصحاب نے ادارۂ ادبیات اردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور اپنے تاثرات سے نوازا۔

۱۔ جناب منوہر پرشاد ۲۔ جناب نیرج کمار ۳۔ پروفیسر رام موہن رائے۔ (کیلیفورنیا اسٹیٹ یونیورسٹی)
۴۔ پروفیسر انیل کے چوپڑا (یونیورسٹی آف کیلیفورنیا۔ برکلے) ۵۔ محترمہ حمیدہ چوپڑا

تاثرات اور آرا

میرے والد رائے جانکی پرشاد اکثر ایوان اردو آیا کرتے تھے اور میں اپنے بچپن میں ان کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ آج تقریباً پچیس سال کے بعد پھر اس ادارے کو آنے کا اتفاق ہوا اور ادارے کے مختلف گوشوں کو دیکھنے کے بعد خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ خدمات کی یہ بہترین مثال ہے جو اس ادارے کے کارکن انجام دے رہے ہیں۔ کیوں کہ اگر اس ذخیرے کو Self-Self Preserve نہ کیا گیا تو کچھ سال کے بعد ان کتابوں اور مخطوطات کا ذکر بھی نہیں رہے گا۔

منوہر پرشاد
(ڈی۔ایس۔پی۔انڈسٹریز)

۲۹/ نومبر ۱۹۹۵ء

It was a very treasured experience to see the excelently maintained artifacts and manuscripts of our glorious Hyderabadi heritage. The

experience was specially privileged to meet the people, who are instrumental in preserving this treasure.

26-11-1995. Neeraj Kumar

(New Mallepally, Hyderabad)

کیا اظہار کروں۔ آج کے دن کا مجھے کئی دنوں سے انتظار تھا۔ ڈاکٹر زور کی کافی یاد آئی۔ ۱۹۵۰ء میں جب کہ وہ میرے استاد تھے چادر گھاٹ کالج میں انھوں نے مجھے یاد دلایا تھا میرے بزرگوں کے دیوان خانوں کے بارے میں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ انھیں جناب جسونت رائے (میرے پرداوا) کے دیوان خانے کی اردو یاد تھی۔ مجھے جناب زور کی اردو اور ان کی سیر گولکنڈہ آج یاد آئی ہے۔ یہ بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے کہ ادارہ ادبیات اردو آج بھی گولکنڈہ اور شہر حیدرآباد کی یادگاروں کو زندہ رکھنے میں معروف ہے۔

رام موہن رائے

۲۸/نومبر ۱۹۹۵ء

(Dept. of Political Science, California State University U.S.A.)

اتفاق بھی زندگی میں کیا چیز ہے۔ حسامی بک ڈپو سے اردو کی کتابیں خریدنے گئی تھی وہاں زاہد بھائی (ایڈیٹر روزنامہ سیاست) کا ذکر ہوا۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ذریعے ادارہ ادبیات اردو کا پتہ لگا۔ یہاں مغنی تبسم صاحب اور اکبر بھائی سے ملاقات ہوئی۔ بہت اچھی صحبت رہی۔ ادارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بڑی نادر کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ یہ لوگ سب بہت محنت کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اردو پھر پروان چڑھے گی۔

پرخلوص تمناؤں کے ساتھ

حمیدہ چوپڑا

(برکلے۔ کیلیفورنیا۔ یو۔ ایس۔ اے)

[illegible]/ڈسمبر ۱۹۹۵ء

•••••••••••••••••

سن اجراء ۱۹۳۸ء
بہ یادگار سید محی الدین قادری زور
فون 310469

ماہنامہ **سب رس** حیدر آباد

جلد: ۵۸ فبروری۔ مارچ ۱۹۹۶ء شمارہ: ۳۰۲

فی پرچہ	: ۱۰ روپے
زر سالانہ	: ۱۰۰ روپے
کتب خانوں سے	: ۱۲۵ روپے

مشرق وسطی اور امریکہ	: ۳۵ ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	: ۱۷ ڈالر
انگلستان	: ۱۵ پونڈ

ناشر: ادارۂ ادبیات اردو

پنجہ گٹہ روڈ، حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۸۲

کمپیوٹر کتابت: شارپ کمپیوٹرس

رمن راج سکسینہ، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے ایس۔ ایس گرافکس میں طبع کروا کے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

پہلی بات

ادارہ ادبیاتِ اُردو کے زیرِ اہتمام ہر سال یومِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب منائی جاتی ہیں۔ بانیٔ ادارہ ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ نے ۱۹۵۱ء میں ان تقاریب کی بنا ڈالی تھی۔ اس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ بانی شہر حیدرآباد کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے دکنی ادب اور دکنی کلچر کو فروغ دینے کے سلسلے میں اس کی خدمات کا اعتراف کیا جائے اور اس کے پیغام اخوت و مساوات کو عام کیا جائے۔ اس بار ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ء سے ان تقاریب کا آغاز کیا جارہا ہے۔ افتتاحی اجلاس حسبِ سابق باغ فیض اثر گنبدانِ قطب میں منعقد ہوگا۔ ان تقاریب کے سلسلے میں سلاطینِ گولکنڈہ اور ان کے کارناموں پر اردو اور تلگو میں سمینار منعقد کیے جائیں گے اور مشاعرے کا انعقاد بھی عمل میں آئے گا۔

اس سال قلعہ گولکنڈہ کی تعمیر کے پانسو سال مکمل ہورہے ہیں۔ اس لیے طے کیا گیا ہے کہ یومِ محمد قلی قطب شاہ کے ساتھ گولکنڈہ کی پانسو سالہ تقاریب بھی منائی جائیں۔ مجوزہ پروگرام کے مطابق رانی محل قلعہ گولکنڈہ میں ڈراما "محمد قلی" اسٹیج کیا جائے گا۔ گنبدانِ قطب شاہی میں "گولکنڈہ بازار" لگایا جائے گا۔ قلعہ گولکنڈہ کی تصویری نمائش ترتیب دی جائے گی۔ شامِ غزل اور مشاعرے کے علاوہ دیگر تہذیبی پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔

ہماری خواہش ہے کہ قلعہ گولکنڈہ کی پانسو سالہ تقاریب جن کا آغاز ادارہ ادبیاتِ اُردو کی جانب سے کیا جارہا ہے سال بھر تک جاری رکھی جائیں اور ہم توقع کرتے ہیں کہ حکومت آندھرا پردیش مختلف تہذیبی اداروں کے تعاون سے وسیع اور اعلیٰ پیمانے پر ان تقاریب کا اہتمام کرے گی۔

(ادارہ)

کتاب: مرزا غالب

مصنفہ: ڈاکٹر نتالیا پری گارینا
مترجم: اُسامہ فاروقی

باب ۱۴

دستنبو

اور وہ دیکھو، لوہے کے پالنے میں
نیا سال گھن گرج کے ساتھ جنم لے رہا ہے
وہ جنگ و خوں ریزی کے لیے بھیجا گیا ہے
اس کے ساتھ دو ہتھیار ہیں
ایک، کارزار کی شمشیرِ خوں آشام
دوسرا، جلّاد کا تبر۔

(تیوت چیف)

ہندوستان کی منقّش اور مطلّا کتابوں میں محفوظ، مغل حکم رانوں کی شبیہوں میں اکثر ان فرماں رواؤں کے ہاتھوں میں ہمیں تلوار، یا رنگین چرمی دستانے پر بیٹھا ہوا شکاری باز نہیں، بلکہ نہایت نفیس وضع کا ایک ظرف دکھائی دیتا ہے، مثال کے طور سے مخروطی گردن والی عطر کی شیشی یا جواہرات سے مزیّن، پھول یا مور کے پر کی شکل کا کسی اور قسم کا عطردان۔ خوش بو بکھیرنے والی ہر شے کو، چاہے وہ خوش بو دار تیل کی شیشی ہو، عطردان ہو یا پھر خوش بو دار لکڑی کا ٹکڑا ہو، فارسی میں "دستنبو" کہہ سکتے ہیں۔ اس لفظ کے اصل معنی دیکھے جائیں تو یہ ایک قسم کے بہت چھوٹے، گول اور خوش بو دار خربوزے کا نام ہے، اکثر عطردان اسی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔

"دستنبو" انیسویں صدی عیسوی کی فارسی میں بھی اتنا کم مستعمل تھا کہ غالب کے کتابچے میں عنوان کے طور سے استعمال ہونے والے اس لفظ کو، اس طرح کی طول طویل وضاحت سے بچنے کے لیے جو ہم نے اوپر دی ہے، عموماً غیر صحیح طور سے "گل دستے" کا ہم معنی بتایا جاتا ہے لیکن غالب کے اس کتابچے کے مشمولات کو گلدستے یا عطردان سے تشبیہہ دینا اگر ممکن ہو سکتا ہے تو صرف حد درجہ طنزیہ مفہوم میں۔

علمی کاوش "خطوط غالب" کے مولفین رالف رسل اور خورشید الاسلام، جن کا اپنی اس داستان میں ہم بارہا حوالہ دے چکے ہیں، بجا لکھتے ہیں کہ "دستنبو" عملاً غالب کی وہ واحد تصنیف ہے، جس میں ان کی شوخ ظرافت کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ شاید اتنا کہہ سکتے ہیں کہ 1857-1859ء کی بغاوت اور اس کی ناکامی کی اس داستان کو، جو اس زمانے کے واقعات کے روزنامچے کے پیرائے میں لکھی گئی ہے، "دستنبو" کا نام دے کر غالب نے بڑے کڑوے طنز سے کام لیا ہے۔

الم ناک واقعات کو بیان کرنے والی تصنیفات کو تلاش کرکے "نفیس" نام دینا بھی دراصل ایک مخصوص روایت کی
ں ہے۔ "کالے پانی" کی سزا یعنی جزائر انڈمان میں قید با مشقت کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے، معافی کے لاحاصل انتظار
مولوی فضل حق نے اس بغاوت کے بارے میں اپنی قلمی تصنیف کو "گلستان ہند" کا خوب صورت نام دیا تھا۔
بس ایک سید احمد خاں نے اپنے رسالے کو اس کے نفس مضمون کی مناسبت سے "اسباب بغاوت ہند" کا نام دیا۔
مورخ اس زمانے کے واقعات کو بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ غدر یا "سپاہیوں کی بغاوت" کے نام سے یاد کرتے ہیں
یاں موضوع زیر بحث دراصل اس فوج کی بغاوت ہے جس کا معتدبہ حصہ سپاہیوں، یعنی مقامی آبادی سے بھرتی کیے
، اور انگریز افسروں کی نگرانی میں تربیت پانے ہوئے لشکریوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے باوجود کہ بغاوت واقعی
یوں میں تعینات چند لشکروں سے شروع ہوئی، لیکن جلد ہی وہ ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں پھیل گئی اور
کے مختلف طبقات نے اس میں حصہ لیا۔

جیسا کہ عہد حاضر کے مورخین نے ثابت کر دیا ہے بغاوت خود بہ خود شروع ہو جانے والی کوئی شورش نہیں تھی، گو کہ
صحیح ہے کہ جلد ہی وہ ان طاقتوں کے قابو سے باہر ہو گئی جنھوں نے انگریزوں کی حکومت سے عوام کی ناراضگی کو کام
اتے ہوئے، مغلیہ سلطنت کے سابقہ اقتدار کی بحالی، قدیم جاگیر دارانہ نظام کے تحفظ اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان
یرونی غاصبوں کے دیس نکالے کے نعرے بلند کرتے ہوئے بغاوت کی رہ نمائی اپنے سر لی تھی۔ تاہم تمام واقعات
صحیح ادراک، بغاوت کے محرکات کی توضیح اور اس کی ماہیت کا تعین فوری ممکن نہیں تھا، اس کے لیے محققین کی کئی
ں کی متواتر کوششیں درکار تھیں، اس کے باوجود حالیہ زمانے تک اس کی بعض خصوصیات پر سیاسی نقطہ نظر سے بڑی
، کے ساتھ بحث جاری ہے۔ ہمارا اشارہ بغاوت کے دوران ہندوستان میں مختلف مذہبی فرقوں، خاص طور سے
وں اور ہندوؤں کے نمائندوں کے عمل باہمی کی طرف ہے۔ کیوں کہ بغاوت کی ناکامی کے بعد ہی ہندوستان کے انگریز
نوں نے ان دو اہم ترین مذہبی فرقوں کو ایک دوسرے کے مقابل میں رکھنے کی حکمت عملی کو، اپنے مفاد میں ملک پر
ت کرنے کے ایک بے حد موثر وسیلے کے طور سے اختیار کیا، اور اسی زمانے سے فرقہ وارانہ علاحدگی پسندی کے خیالات
رح پھیلنے شروع ہوئے جیسے پانی میں پتھر پھینکنے سے دائروں کی شکل میں لہریں پھیلتی ہیں۔

بغاوت نے ساری دنیا کی رائے عامہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہندوستان کے واقعات سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ
رقی پسند طاقتوں نے اسی وقت پیش آنے والے واقعات کے بارے میں صحیح رائے قائم کرلی تھی۔ کارل مارکس
ھا تھا: "پہلی ہی نظر سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی عوام کی اطاعت شعاری اس دیسی فوج کی وفاداری پر منحصر ہے
تشکیل دے کر ساتھ ہی ساتھ برطانوی حکام نے پہلی بار مزاحمت کے ایک ایسے مشترکہ مرکز کا بندوبست کیا ہے جو
ے قبل کبھی بھی ہندوستانی عوام کو میسر نہ تھا۔"

جمہوریت پسند روسی ناقدین غیر مہذب ہندوستان میں انگریزوں کے تہذیب پھیلانے کے مقدس فریضے کی اس
ا بے دردی سے پردہ فاش کر رہے تھے، جس کے بہانے وہ ہندوستان سے بے شمار مال و دولت بٹور کر اپنے ہاں لے
ہے تھے۔ "ہندوستانی عوام کی بغاوت روسی ہم عصروں کی نظر میں" کے عنوان سے لکھے گئے اپنے مضمون میں پورے
روسی جمہوریت پسند صحافت کا جائزہ لیتے ہیں اور خصوصاً بغاوت کے بارے میں دبرالیوبف کی رائے کا حوالہ دیتے ہیں۔
بف کے الفاظ میں اس دھماکے کی وجہ تھی "نظم و نسق کی بے ترتیبی، مقامی باشندوں پر ظلم ۔۔۔۔ اور وہ گھٹی ہوئی بے
ناراضگی، جس کا دیر سویر کھلا اظہار لازمی تھا، کیوں کہ انسان کے صبر کی بہر حال ایک حد ہوتی ہے۔" دبرالیوبف اپنے
ن "مشرقی ہندوستان کی تاریخ اور ہندوستان کی موجودہ حالت پر ایک نظر" میں نہ صرف جاگیرداروں یا فوج کے دیسی
ں بلکہ ہندوستانی سماج کے سبھی طبقوں کی ناراضگی کے پیش نظر بغاوت کے عوامی کردار پر زور دیتے ہیں۔ (یہ مضمون

دبرالیہ بف نے ترچی لف کے قلمی نام سے لکھا تھا۔

انگلستان میں، قدرتی بات ہے کہ بغاوت کے تعلق سے رویے پر طبقاتی کردار کی چھاپ نمایاں تھی، صاحب جائیداد مال دار طبقات کے نظریہ سازوں کی نظر میں یہ جاہل اور توہمات کے جال میں پھنسے ہوئے دیسی باشندوں کی، ان نعمتوں کے خلاف شورش اور بغاوت تھی جو برطانیہ کے، تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کے مبارک کام کی بہ دولت ان کو میسر ہو رہی تھیں۔ لیکن اس وقت بھی اس نوآبادیاتی پروپگنڈے کا جراءت کے ساتھ پردہ فاش کرنے والے لوگ موجود تھے۔ جیسا کہ برائن لکھتے ہیں اس واقعے کے بارے میں جمہوریت پسندانہ نقطہ نظر کا آئینہ دار، ممتاز پرولتاری شاعر اور صحافی ارنسٹ چارلس جونس کی ادارت میں شائع ہونے والا اخبار "پیپلز پیپر" تھا۔

فوج کے اسلحہ میں یا یوں کہنا چاہیے کہ کارتوسوں کی نوعیت میں تبدیلی بغاوت کے بہانے کے کام آئی۔ ان نئے قسم کے کارتوسوں پر سے کاغذی غلاف کو دانتوں سے کاٹ کر اتارنا پڑتا تھا۔ فوج میں برابر یہ افواہ پھیل رہی تھی کہ کارتوسوں پر لگائے جانے والے روغن میں سور اور گائے کی چربی کی آمیزش ہے۔ نتیجۃً مسلمان اور ہندو سپاہیوں کی بڑی تعداد نے نئی وضع کے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ 10 مئی 1857 ء کو دہلی سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع شہر میرٹھ کی چھاؤنی میں تعینات سپاہیوں کے رسالوں نے بغاوت کی۔ انھوں نے اپنے انگریز افسروں اور عہدہ داروں کو مار ڈالا اور دہلی کی طرف روانہ ہو کر 11 مئی کو یہ سپاہی کشمیری دروازے پر پہنچے۔ دہلی کی محافظ فوج کے سپاہیوں نے، جو اس دروازے کی پہرہ داری پر متعین تھے اور جن کو پہلے ہی سے میرٹھ سے آنے والے ایک ہرکارے کے ذریعے مطلع کیا جا چکا تھا، باغیوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ دہلی کی محافظ فوج کے انگریز افسر سب مارے گئے، نووارد سپاہیوں نے، جن کے ساتھ مقامی رسالے بھی شامل ہو گئے، شہر پر قبضہ کر لیا اور بہادر شاہ ظفر کی سارے ہندوستان کے بادشاہ کی حیثیت سے تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ بادشاہ کی عمر اس وقت بیاسی سال کی تھی۔ مغلیہ سلطنت کی سابقہ سرحدوں کی بحالی اور عموماً کسی طرح کے مخالف انگریز اقدام کے بارے میں شاید ہی کبھی انھوں نے سوچا ہو، تاہم قلعے اور محل کا میلان جنگ جویانہ تھا۔ بادشاہ کے کثیر التعداد وارث ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس فیصلے سے غصے میں بھرے ہوئے تھے کہ بہادر شاہ کے مرنے کے بعد مغلیہ شاہی خاندان کا وجود ختم ہو جائے گا، خانوادے اور اس کے نمائندوں کی کفالت کے لیے وظیفے کی اجرائی بند کر دی جائے گی اور بہادر شاہ کے اخلاف اور ان کی محرمات کو لال قلعے سے بے دخل کر دیا جائے گا۔

بہادر شاہ نے، انھیں پیش کیے جانے والے تخت شاہی اور اسی کی مناسبت سے اعزازات کو قبول کرتے ہوئے گویا کہ باغیوں کا ساتھ دیا لیکن دیکھا جائے تو ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ان کے لیے کسی طرح کا آزادانہ فیصلہ کرنا ممکن نہ تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بہادر شاہ ظفر، جن کا نہ تو کبھی اپنا کوئی سیاسی لایحہ عمل تھا اور نہ جنھوں نے اپنے کسی اقدام سے شہرت حاصل کی تھی، جنھوں نے کبھی ان حالات سے، جن میں ان کی زندگی کمپنی کے ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے بسر ہو رہی تھی، مطمئن نہ ہونے کا بھی اظہار نہیں کیا تھا، واقعات کے عین گرداب بلا میں کیسے آپڑے اور 11 مئی سے لے کر 19 ستمبر تک چار ماہ کے لیے ہندوستان کی قومی وحدت کی علامت کیسے بن گئے۔

یہ صحیح ہے کہ یہ بھولنا مناسب نہ ہو گا کہ بہادر شاہ نام ور مغلیہ خاندان کے نمائندے تھے اس کے باوجود کنور محمد اشرف کے خیال میں یہاں ایک طرح کے قول و قرار کے بغیر کام نہیں چلا تھا اور اسی کے مطابق " سارے شمالی ہندوستان میں بغاوت کے اہم مراکز نے اپنی طاقتوں کو بہادر شاہ کے گرد مجتمع کر دیا تھا۔ کنور محمد اشرف کے خیال میں اگر انگریزوں کے خلاف جد و جہد میں باشندگان ہند کے اتحاد کے پرچم کا کام دینے کے لیے بادشاہ سب سے زیادہ موزوں شخصیت ثابت ہوئے تو اس کی متعدد وجہیں تھیں۔ مذہبی اعتبار سے وہ " باغیوں کے وسیع حلقوں کے لیے قابل قبول تھے۔۔ ان کا بغاوت کی رہ نمائی قبول کرنا ہی انھیں وہابیت کی طرف میلان رکھنے والے فوجیوں کی نظروں میں مجاہد اسلام اور غازی کا رتبہ دینے کے

لیے کافی تھا۔ ان کا تشیع کی طرف جھکاؤ ان کے لیے اودھ کی ہم دردی کا ضامن تھا اور جہاں تک تصوف کا تعلق ہے تو یہاں انھیں "پیر و مرشد" کی حیثیت حاصل تھی، وہ بھی ایسے پیر و مرشد کی، جو چالیس دن کے روزے کی آزمائش سے گزر چکا تھا۔ ان کی شعر گوئی بھی کام آئی، بہ حیثیت شاعر وہ دانش وروں کے حلقوں میں کافی باوقار تھے۔ بالآخر ان کا انکسار، "انسانیت اور برتاؤ" آبادی کے مختلف طبقوں کے لیے کچھ کم اہم نہیں ثابت ہوئے۔

تاہم اس بار بھی بہادر شاہ کو آخری فیصلے کا اختیار کم ہی معاملات میں حاصل تھا۔ مختلف غیر فوجی امور ان کی خدمت میں توثیق کے لیے پیش کیے جاتے تھے، لیکن فوجی امور سے انھیں سروکار نہ تھا، گو کہ اپنے بیٹوں میں سے ایک کو انھوں نے سپہ سالار مقرر کر دیا تھا۔ لیکن شاہزادہ موصوف کا دائرہ اختیار بھی باغیوں کے حقیقی سپہ سالار جنرل بخت خاں کی دلی میں آمد کے ساتھ محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ غالب کے دوست مولوی فضل حق بغاوت کو بڑھاوا دینے والوں میں شامل تھے۔ اپنے نئے ٹھکانے الور سے دلی آکر وہ مستعدی کے ساتھ انتظامی سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ وہ باغیوں کی اس مجلس شوریٰ کے لیے منتخب کیے جانے والے چار غیر فوجی افراد میں سے ایک تھے، جس نے دراصل باغی ہندوستان کی حکومت کا کاروبار چلانے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔

تاہم فوراً ہی بغاوت طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہو گئی، جیسے دلی میں انگریزوں کی مزاحمت، متعدد بڑے جاگیر داروں کی دغا بازی، خود باغیوں کے لشکر میں بد نظمی اور لوٹ مار اور بالآخر بغاوت کے لیے مادی اعانت کے معاملے میں متمول طبقات کی طرف سے مزاحمت۔ شاہی محل میں بھی اتحاد و اتفاق کا فقدان تھا، کیوں کہ شاہزادے سب کے سب بہادر شاہ کے مقربین کے خلاف ہو گئے تھے، خصوصاً حکیم احسن اللہ خاں کے، جن پر انھوں نے انگریزوں کے ساتھ سازش کا الزام لگایا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ غیر فوجی انگریز باشندوں کے تعلق سے بے رحمی اور ظلم و تشدد کے مظاہرے بھی ہو رہے تھے۔ مثال کے طور پر سپہ سالار شاہزادہ مرزا مغل کے مطالبے پر ان انچاس انگریز عورتوں اور بچوں کو جو بہادر شاہ کی اجازت سے محل میں چھپے ہوئے تھے سپاہی وہاں سے باہر لے گئے اور سب کو گولی سے اڑا دیا۔

چار مہینے تک انگریزوں کے سبھی حملوں کو پسپا کرتے ہوئے سپاہیوں نے دلی پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ چوں کہ بہادر شاہ تخت شاہی پر پہلے کی طرح اب بھی متمکن تھے تو بادشاہ اور ان کے امرا کی زندگی کی وہ شکل جسے دربار کہتے ہیں، بغاوت کے ہنگامے میں گرفتار شہر کے لیے نامناسب ہونے کے باوجود، برقرار تھی۔ مزید برآں دربار میں شریک ہر فرد کے فرائض منصبی بھی برقرار تھے۔ غالب خود لکھتے ہیں کہ ان کو حسب معمول اصلاح شعر کی خدمت بجا لانی پڑتی تھی۔

لیکن اس کے باوجود غالب کی کوشش رہی کہ وہ دربار سے ذرا دور ہی رہیں۔ اپنے مکتوب مورخہ 14 جنوری 1858ء میں وہ نواب رام پور کو لکھتے ہیں: "اس ہنگامے میں اپنے کو میں نے دربار سے الگ ہی رکھا۔ لیکن اس اندیشے سے کہ اگر یک قلم ترک آمیزش کرتا ہوں تو کہیں میرا گھر تاراج نہ کر دیا جائے اور خود میری جان کو خطرہ لاحق نہ ہو جائے، میں باطن میں بے گانہ اور بہ ظاہر آشنا بنا رہا۔" اب وثوق کے ساتھ رائے قائم کرنا مشکل ہے کہ واقعی سب کچھ یوں ہی تھا یا صورت حال کچھ اور تھی، کیوں کہ نہ صرف مولوی فضل حق بلکہ غالب سے قریبی تعلق رکھنے والے افراد اور ان کے شاگردوں نے بھی بغاوت میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا، مثال کے طور پر انھیں سے کش نے، جن کے تخلص کی غالب نے اپنی ایک رباعی میں ہنسی اڑائی ہے۔ اسے واحد قرین قیاس روایت ماننا مشکل ہے کہ بغاوت کے آغاز ہی سے غالب اپنے گھر کی چہار دیواری میں گوشہ نشین ہو گئے اور ان کا بس ایک مشغلہ رہا اور وہ یہ کہ اپنا روزنامچہ "دستنبو" لکھتے رہیں، وہ بھی اس اہتمام کے ساتھ کہ انھوں نے واقعات کے بیان کے لیے قدیم فارسی کا جو اسلوب چنا تھا، اس میں عربی زبان کا ایک لفظ بھی مخل نہ ڈالے۔ خارج از امکان نہیں ہے کہ یہ روایت فوری مغرض وجود میں نہیں آئی، وقت آنے پر اس کی بڑے جتن سے ترویج بھی کی گئی۔ اس کے باوجود غالب کی زندگی کے اس دور کے بارے میں اگر ہم کو کوئی معلومات ملتی ہیں تو بس اسی روزنامچے "دستنبو" سے اور یا

پھر نسبتاً بعد کے زمانے میں تحریر شدہ خطوط میں بعض مقامات پر اس دور کے ذکر سے۔ انگریز محقق رالف رسل (؟)، جس نے غالب کی زندگی کے اس دور سے متعلق دستاویزات کا مطالعہ کیا ہے، لکھا ہے کہ اسے بغاوت سے متعلق، محافظ خانے اور انڈیا آفس کی لائبریری میں موجود دستاویزات میں تو کچھ بھی نہیں ملا۔ البتہ ناقابل اعتبار دستاویزی ثبوت کے ساتھ کچھ اطلاعات ملتی ہیں، مثلاً یہ کہ غالب کو دربار میں اس لیے طلب کیا گیا کہ باغی جو سکے ڈھلوا کر جاری کرنے والے تھے ان کی پشت پر کندہ کیے جانے کے لیے وہ ایک شعر لکھ کر دیں۔ غالب نے مبینہ طور پر انکار کیا، تاہم دربار کے دفتر میں محفوظ کاغذات سے اس کی نفی ہوتی ہے اور بغاوت کے فرو ہونے کے بعد انگریز انتظامیہ کے تحت غالب کے مورد عتاب ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اگر یہ سب امر واقعہ ہے، تو یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ درباری شاعر ہوتے ہوئے، دہشت اور زور و شور سے چلنے والی درباری سازشوں کے اس ماحول میں غالب اس سیدھی سادی تجویز کو، جو ان کے فرائض منصبی کے بالکل مطابق بھی تھی، رد کرنے کی ہمت کیسے کر سکتے تھے۔

اس اثناء میں شہزادوں اور بہادر شاہ کے مقربین کے درمیان اختلافات اس حد تک شدید ہو گئے کہ جب شہزادہ مرزا مغل نے تخریب کاری اور انگریزوں کے حق میں مخبری کے الزام میں حکیم احسن اللہ خاں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا، اور اس زمانے میں گرفتاری کسی مقدمے اور عدالتی تحقیقات کے بغیر موت کے معنی رکھتی تھی، تو عمر رسیدہ بادشاہ نے اپنے درباری معالج کو اپنے بدن کی آڑ میں لے لیا اور انھیں باغیوں کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تاہم حکیم احسن اللہ خاں کا گھر تاراج اور جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ بادشاہ کے اس مشیر کی شخصیت درباری حزب مخالف کے مسلسل حملوں کا نشانہ تھی جب کہ غالب کے اس شخص کے ساتھ قریبی تعلقات تھے اور ان کو اس سے ہم دردی تھی، کیوں کہ انھیں احسن اللہ خاں نے کسی زمانے میں کوشش کر کے غالب کو درباری مورخ کا عہدہ دلوایا تھا۔

غالب کے روزنامچے کی امتیازی خصوصیت بغاوت کے دو مرحلوں سے متعلق اندراجات کا نمایاں عدم تناسب ہے: پہلے چار مہینوں کو، جب دہلی میں باغیوں کا راج تھا، بہ درجہا کم جگہ دی گئی ہے بہ نسبت بعد کے مہینوں کے، جب کہ انگریز شہر میں داخل ہو کر باغیوں کے خلاف انتقامی کارروائی کر رہے تھے۔ چوں کہ، جیسا کہ خود غالب نے وضاحت کی ہے، یہ روزنامچہ سوچ سمجھ کر خاص طور سے قلم بند کی ہوئی تصنیف تھی، جس کو ان کا ارادہ بغاوت سے اپنی بے تعلقی کے ثبوت کے طور سے انگریز حکومت کی نذر کرنے کا تھا، اور یہ عزم انھوں نے 1858ء میں کیا تھا، تو روزنامچے کی بعض خصوصیات کی وضاحت اس صورت حال سے بھی کی جا سکتی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی تصنیف کے ڈھانچے کو بھی، جو ایک "چوکھٹے" سے، یعنی ملکہ وکٹوریہ کی شان میں ایک قصیدے، ایک نہایت پر تکلف انتساب وغیرہ وغیرہ سے مزین ہے، اس کی خصوصیات میں شمار کیا جا سکتا ہے اور قدرتی بات ہے کہ بہ حیثیت مجموعی تصنیف کے آہنگ یعنی "باغیوں" اور "شورہ پشتوں" کی مذمت، انگریزوں کی "شرافت نفس" اور ان کے مشن کی واجبیت کے اعتراف کی وضاحت بھی اسی صورت حال سے ہوتی ہے۔ اس تصور کے مطابق "دستنبو" (یعنی گل دستے یا عطردان) کا مقصد یہ تھا کہ فرماں رواؤں کے ہاتھوں میں پہنچ کر وہ ان کے مشام جاں کو معطر کرے اور بغاوت کے زمانے میں شاعر کی وفاداری کا ثبوت فراہم کرے، تاکہ وہ پنشن کی بحالی کی امید پھر سے باندھ سکے۔ غالب اس طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ نوآبادیاتی حکومت کی تیز رفتار گاڑی کے نیچے آکر کچلے جانے سے خود کو بچا لیں لیکن ان کے اس گل دستہ رنگ و بو سے خون اور جلا کر راکھ کر دی جانے والی بستیوں کی بو آتی ہے اور کھی ہوئی نثر کی عطر بیزیاں اس بو کو محض اور ناگوار بناتی ہیں۔

غالب کے تذکرہ نویسوں کے لیے، جو صداقت کے ترجمان، حقیقت اعلیٰ کے عارف اور جہان نو کے پیش بین شاعر کے پیکر کا برطانوی شہنشاہیت کے ایسے وفادار باشندے کے پیکر سے توافق کرتے ہیں جو اپنے ہم وطنوں پر عائد کی جانے والی نفرت انگیز تعزیرات کو بلا کسی تردد کے تسلیم کر لیتا ہے اور جسے فکر ہے تو بس اپنے نان و نمک کی، غالب کا روزنامچہ ایک لحاظ

ہے اب تک ایک معمے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس امر پر غور کرتے ہوئے کہ غالب نے کیسے لاجواب قصیدے ایسے ایسے افراد کی مدح میں لکھے ہیں، جو کسی طرح اس کے مستحق نہیں تھے زمانہ حال کے ایک فاضل محقق سوال کرتے ہیں: "یہ کیا ہے؟ کیا یہ قابل افسوس چاپلوسی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح شاعر کے لیے روزی کا انتظام ہوجائے؟ یا پھر یہ اس صنف سخن میں نام وری پانے والے پیش روؤں کے معیار تک پہنچنے کی محض ایک کوشش ہے؟"۔ اور پھر خود ہی جواب دیتے ہیں: "شاید یہ بھی اور وہ بھی۔"

معاملہ دراصل نہ یوں ہے نہ ووں! معاملہ یہاں دراصل ادب اور اس کی مختلف اصناف کے مقصد کے تعلق سے سرے ہی نقطہ نظر کا ہے، جس کو سمجھنے کی اس کتاب میں ہم نے جا بجا کوشش کی ہے وہ نقطہ نظر جو ادبی مشاغل کے ذریعے حاصل ہونے والی کمائی کے بارے میں ایک بالکل واضح رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ متآخر جاگیر دارانہ سماج کے تاریخی حالات میں اور اس سماجی نظام کے آدرشوں اور معیارات اور ادب کی نسبت سے روایت کے مطابق کیے جانے والے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھیں تو یہ نقطہ نظر بالکل فطری تھا۔ ادبی پیشے کی ایک نوع کے طور سے قصاید کے ذریعے رقم کا حصول روایت کے مطابق ایک قابل قبول امر سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ اس بنیاد پر تو بادشاہوں کے لیے تاج بنانے والے سناروں زر دوزی کے کام کے چوغے سینے والے درزیوں پر بھی، جن کی ان مصنوعات کو دیکھنے اب لوگ عجائب گھر جایا کرتے ہیں، نیاز مانہ سازی کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔

غالب کا روزنامچہ معمول سے ذرا ہٹی ہوئی تصنیف ہے۔ اس کی خصوصیت بہ حیثیت صنف ادب اس کا ضابطوں سے بے نیاز ہونا ہے، کیوں کہ ہر صنف کی غرض و غایت اور منصب کا تعین کرنے والی روایت میں وقائع اور روزنامچوں کو ادبیات میں کوئی اونچا مقام نہیں دیا گیا ہے۔ اسی لیے اگر مورخ اور سوانح نگار، شاعر پر قصیدوں سے زیادہ اپنے اس روزنامچے میں ریاکاری سے کام لینے کا الزام عاید کرتے ہیں تو اس کے لیے ان کے پاس ایک حد تک وجوہ بھی کافی ہیں۔ مختلف زمانوں کے تاریخی وقائع کا جائزہ لیتے ہوئے تاشقند کی محقق بلیا کووا وضاحت کرتی ہیں کہ عہد وسطی کے مشرق سے متعلق وقائع کے اسلوب بیان اور ان واقعات کے بارے میں رائے کا تعین ایک مخصوص معیار اور آداب کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اس صورت میں آداب سے مراد بیان کا وہ طریقہ ہے، جبکہ مصنف کو پہلے ہی سے معلوم رہتا ہے کہ مختلف ظاہریا اہم کردار ادا کرنے والے اشخاص کی، لفظوں میں تصویر کیسے کھینچنی چاہیے۔ سب سے اہم بات یہ کہ مثبت اور منفی مظاہر کو گویا کہ ان کی بنیادی شکل میں، بندھے ٹکے فارمولے کے مطابق روایتی توصیف، علامتی شبیہ نگاری، اندرون عمارت، وقع، محل اور مثال و علامت کے جھرمٹ میں پیش کرنا چاہیے۔ واقعہ، یوں کہیے کہ رزمیہ صداقت کے نقطہ نظر سے بیان کیا جاتا ہے، جس میں کرداروں کو نہ ہی پہلے سے برحق اور قصوروار میں تقسیم کیا جاتا ہے اور نہ ہی برحق سے اخلاقی فتح اور قصوروار سے اخلاقی شکست منسوب کی جاتی ہے۔ یہاں ضمناً یہ نشان دہی مناسب ہوگی کہ اسی میں رزمیہ تصور کائنات کی تاثیر کا راز بھی پنہاں ہے، جس کی زندہ مثال "شاہ نامہ فردوسی" ہے۔ ہمارا یہ ادعا کچھ بے جا نہیں تھا کہ اس رزمیہ نظم کا حریف قابل افراسیاب آسانی سے کسی دوسری رزمیہ نظم کا میر افسانہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور مرور زمانہ کے ساتھ اس نے یہ مقام حاصل کر بھی لیا!

اور اس مفہوم میں غالب کا یہ اعتذار نامہ رزمیہ نوعیت کا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کی کھینچی ہوئی تصویریں تاریخی اعتبار سے سچی ہیں اور رزمیہ غیر جانب داری ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اسی نقطہ نظر کی بہ دولت واقعات کے بارے میں رائے کی جگہ بسا اوقات اخلاقی نوعیت کا بندھا ٹکا فارمولا لے لیتا ہے: اگر اس صنف ادب کے نقطہ نظر سے کوئی امر لائق مذمت ہے تو اس کے تعلق سے تحقیر آمیز القاب استعمال کیے جاتے ہیں اور کوئی امر لائق تعریف ہے تو اس کو القاب تحسین ستائش سے متصف کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ غالب 11 مئی 1857ء یعنی اس دن کے واقعات

بیان کرتے ہیں جب کہ میر ٹھ کے سپاہیوں کے دستے شہر میں داخل ہونے تھے۔ "اس سال، جس کا حروف ابجد کے لحا ـــ مادہ تاریخ "رستخیز بے جا" ہے، بہ الفاظ دیگر 16 رمضان 1273 ہجری مطابق 11 مئی 1857 ء کو علی الصباح یکایک دلی ک شہر پناہ اور قلعے کے درو دیوار ہل گئے۔ لگتا تھا کہ آثار زلزلے کے ہیں، لیکن یہ دراصل بھونچال نہیں تھا۔ اس منحوس دا میر ٹھ چھاؤنی کے دغاباز، شورہ پشت سپاہیوں کے کچھ دستے، جن کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی، بھاگ کر د آنے۔ سب کے سب، شرم و لحاظ سے عاری، آقاؤں کے قتل پر آمادہ، بغاوت پر کمر بستہ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تـ شہر پناہ کے محافظوں نے، جو باغیوں کے ساتھ ہم پیشگی کی وجہ سے قدرتاً ہمدردی رکھتے تھے اور جو ممکن ہے، پہلے سے ا کے ساتھ عہد و پیمان بھی کر چکے ہوں، دروازے کھول دیے اور پاس نمک اور حفاظت شہر کو بالائے طاق رکھ کر ان ناخواندہ خواندہ مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ان برانگیختہ سبک عنان سواروں اور سنگ دل تیز رفتار پیادوں نے جب شہر کے دروازوں کو کھ ہوا اور دربانوں کو مہمان نواز پایا، تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ پڑے اور جہاں جہاں اعلیٰ رتبوں پر فائز اشخاص اور صاحبان عالی شا (یعنی انگریز افسروں) کو پایا قتل کیے بغیر نہ ہٹے اور ان کی کوٹھیوں میں آگ لگادی۔"

کنور محمد اشرف اس منظر اور اسی طرح کے ایک اور منظر کی (جس کا حوالہ آگے آنے گا) تشریح یوں کرتے ہیں: "غالب کے روزنامچے میں، جس میں وہ میر ٹھ چھاؤنی کے سپاہیوں کے دِلّی میں داخلے کا ذکر کرتے ہیں، ان اہل حرفہ اور سپاہیوا کے اتحاد عمل کی قابل قدر تصویر ہماری نظروں کے سامنے آتی ہے، جن دو گروہوں پر دراصل وہابیوں کی سماجی بنیاد مشتمل تھی: "سپاہیوں اور حرفت پیشہ لوگوں میں فوراً گہرا رشتۂ اخوت قائم ہوگیا۔ فضول باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر انھوں نـ اپنا کام شروع کر دیا۔" یہ تشریح فارسی عبارت کی غیر صحیح قراءت پر مبنی ہے، جس میں لفظ "ہم پیشگی" کے معنی "اہل حرا نہیں ہیں جیسا کہ کنور محمد اشرف نے ترجمہ کیا ہے۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کہ غالب کا بیان بھائی چارے کے اس جذبے کی واقعی معروضی انداز میں تصویر کشی کرتا ہے جو میر ٹھ اور دہلی کے سپاہیوں کے درمیان ان دو سپاہیوں کے مل جانے پر پیدا ہوا۔

اس کے بعد غالب "عزلت نشینی کی زندگی گزارنے والے اور انگریزوں کے نمک خوار اپنے جیسے غریبوں" کی حالت نقشہ کھینچتے ہیں جنھیں انگریزوں کی مہربانی سے گزر بسر کے لیے "نان و نمک" میسّر تھا، جو شہر کے مختلف مقامات بکھرے ہونے تھے، جن کا فن حرب سے کوئی تعلق نہ تھا، جو ہتھیار سے بے گانہ اور "تیر و تبر میں بھی امتیاز نہیں کر سکـ تھے۔" یہ دہلی کی امن پسند آبادی کے نمائندے تھے، جنھیں اندھیری رات میں شورہ پشتوں کے حملے کا ڈر لگا رہتا تھا اور "ز پوچھو تو یہ لوگ صرف اس مطلب کے تھے کہ گلی کوچوں کو آباد کریں۔ اس گوں کے ہرگز نہ تھے کہ جنگ و جدل کے واسطے کمر بستہ ہوں۔" یہ سمجھ کر کہ "سیل تندرو کو خاشاک" سے روکنا ممکن نہیں اور یہ دیکھ کر کہ وہ اس آفت ناگہانی کے آگے عاجز ا بے بس ہیں۔ غالب لکھتے ہیں کہ وہ "گھروں کے اندر غم اور ماتم میں بیٹھ رہے۔ بندہ بھی انھیں ماتم زدگان میں سے تـ گھر میں بیٹھا تھا کہ شور و غوغا بلند ہوا۔ قبل اس کے کہ سبب دریافت ہو، چشم زدن میں صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار ـ اندرون قلعہ مارے جانے کی خبر آئی۔ معلوم ہوا کہ سوار اور پیادے اور لوگوں کے جم غفیر ہر گلی کوچے میں گشت لگا رہـ ہیں۔ پھر تو کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو گل اندا موں کے خون سے ارغوانی نہ ہو اور کوئی ایسا گوشہ چمن نہ تھا جو اپنی تاراجی سـ گورستان بہار کی یاد تازہ نہ کرتا ہو۔ آہ وہ خوش اخلاق و نیک نام حکام جو عدل و انصاف میں ممتاز تھے اور جو اپنی دانش مندی سـ سب کو متاثر کرتے تھے! آہ وہ پری چہرہ، نازک اندام، ماہ طلعت، سرخ و سفید، سیم بدن خواتین! اور آہ وہ بچے، جنھوں نـ ابھی دنیا دیکھی بھی نہ تھی، جو اپنے شگفتہ چہروں کے ساتھ گل و لالہ کے درمیان کھلکھلاتے، چہلیں کیا کرتے تھے اور جو ا خوش خرامی سے تیتر، دراج اور ہرن کو شرمندہ کرتے تھے۔ آہ وہ بچے جو ناگہاں گرداب خون میں دھکیل دیے گئے! دہکتے انگاروں کو اپنے کاندھوں پر لیے ہونے اور بھڑکتے ہونے شعلوں کا تاج ناچتی ہوئی موت، جس کو دیکھ کر لوگ ناخنوں سـ

پنا منھ نوچ لیتے اور نیلا ماتمی لباس پہن لیتے ہیں، اگر خودان کشتگانِ ناحق کے سرہانے آہ وزاری کرنے لگے اور ان کے سوگ میں سیاہ لباس پہن لے، تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہ ہوگی اور اگر گنبدِ فلک خاک بن کر ہمارے سروں پر برس پڑے اور لرزمین سراسیمہ دھول کی طرح سے ہوا میں اڑ جائے، تو یہ بات خلاف توقع ہرگز نہ ہوگی۔

اے نو بہار چوں تن بسمل بخون بغلت	بسمل کی طرح خون میں گُل فصلِ نو بہار
اے روزگار چون شب بے ماہ تارشو	اے روزگار ! ہاں شب تیرہ سا تار ہو !
اے آفتاب روی بسیلی کبود کن	اے آفتاب ! چہرہ طمانچوں سے کر کبود
اے ماہتاب داغ دل روزگار شو	اے ماہ تاب ! داغِ دلِ روزگار ہو !

(ترجمہ: مضطر مجاز)

اس کے بعد خوں ریزی کا زور کم ہوا اور پھر تمام شہروں سے بغاوت کی خبریں ملنے لگیں اور جیسا کہ غالب لکھتے ہیں:
ہر جگہ سپاہیوں کے گروہ کسانوں کے ساتھ رشتہ اخوت قائم کررہے تھے اور فضول بات چیت میں وقت ضائع کیے بغیر، دور نزدیک، سب ایک ہی کام پر کمر بستہ تھے۔ یہ کام تھا دشمنوں کو نیست ونابود کرنا۔ باغیوں نے توپیں نکال کر نصب کردیں اور بندوقیں ذخیرہ کرلیں، وہی بندوقیں "جن کا استعمال انھوں نے انگریزوں سے سیکھا تھا۔ اور "نفرت کی آگ میں جلتے ہوئے، بندوق کا رخ اپنے ہی معلموں کی طرف کردیا۔

قید خانے کھول دیے گئے۔ اس ہنگامے کے زمانے میں بہت سے لوگ مالا مال ہوگئے۔ جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ جواہرات کس چیز کا نام ہے، اب ان کے پاس ہیرے جواہرات اتنے تھے، "جتنی کہ ندی میں ریت"۔ دوسروں کا دیوالہ نکل رہا تھا اور ان کے پاس پینے کے لیے چلو بھر پانی خریدنے کی بھی استطاعت نہیں رہ گئی تھی۔

غالب حکیم احسن اللہ خاں کی جان لینے کی کوشش کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دوسرے شہروں اور ریاستوں کے بغاوت میں شامل ہونے کا ذکر کرتے ہیں، لیکن یہ یقین دلاتے ہوئے کہ نواب رام پور کو بادشاہ کی وفاداری کا حلف اٹھانے پر مجبور کیا گیا تھا، وہ صریحًا رام پور کو انگریزوں کی نظر میں اوروں سے الگ دکھانے اور ذمہ داری سے بری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی غالب خاصے معروضی انداز میں واقعات کی رفتار کا جائزہ لیتے ہیں اور تاریخی حقیقت کو مسخ نہیں کرتے۔ جہاں تک واقعات کے بارے میں ان کی رائے کا تعلق ہے تو وہ اس کے اظہار سے گریز ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ تاہم روزنامچے کا دوسرا حصہ (روزنامچے کو باقاعدہ حصوں میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے، لیکن بعض تاریخوں کی نشان دہی کی گئی ہے، خصوصًا ستمبر کے مہینے کی، جب انگریز شہر میں داخل ہوئے) جس کا تعلق اس زمانے سے ہے جب انگریزوں نے باغیوں کے خلاف انتقامی کارروائی کی اور اپنا نظم ونسق بحال کیا، نسبتًا زیادہ ناگوار پہلے حصے کے مقابلے میں، غالب کے نقطۂ نظر کی کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ ترجمانی کرتا ہے۔

اس بغاوت کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر 1957ء میں شائع ہونے والے مجموعے میں شامل اپنے مضمون میں ہندوستانی پروفیسر مجمدار اس اندھیر کے بارے میں جو 1857ء میں انگریزوں نے دہلی میں مچایا تھا، لکھتے ہیں: "اس زمانے میں دونوں فریق انتہائی ظلم وتشدد کی کارروائیوں کے مرتکب ہوئے لیکن جب کہ انگلستان میں ہر اسکول کا لڑکا کان پور میں انگریز شہریوں کے بے رحمی کے ساتھ ہلاک کیے جانے کے بارے میں پڑھتا آیا ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریزوں میں بھی کم ہی اس امر سے واقف ہیں کہ ان کے ہم وطنوں نے کس سنگ دلی کے ساتھ ہندوستانی مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا تھا۔ ہندوستانی کشتگانِ ناحق کی تعداد کان پور میں قتل ہونے والے انگریزوں سے کئی سو گنا زیادہ ہے۔۔۔۔ اس کے باوجود کہ انگریزوں کی فوجوں کو عورتوں اور بچوں سے تعرض نہ کرنے کی ہدایت دی گئی تھی، عمومًا اس حکم کی خلاف ورزی کی

باقی تھی۔" بمبئی کرانیکل۔ کا انگریز نامہ نگار لکھتا ہے: "جب ہماری فوجیں شہر میں داخل ہوئیں، تو گھروں میں چھپے ہوئے سب باشندوں کو سنگینیں گھونپ کر وہیں ہلاک کر دیا گیا۔ ان کی تعداد کتنی زیادہ تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ مختلف گھروں میں چالیس چالیس اور پچاس پچاس افراد چھپے ہوئے تھے۔ وہ باغی نہیں، محض شہر کے عام باشندے تھے، جنھیں ہماری مشہور عام کشادہ دلی اور ہمارے رحم و کرم پر بھروسا تھا۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے بڑی مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ اس بار ان لوگوں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔"

لوگوں کے قصور کی چھان بین میں وقت گنوائے بغیر انھیں سزائے موت دی جاتی تھی: "شہر میں سب سے نمایاں مقام پر ایک بڑی چوکور پھانسی نصب کی گئی تھی اور روزانہ اس پر پانچ چھ مجرم قرار دیے جانے والے افراد کو لٹکا کر سزائے موت دی جاتی تھی۔ انگریز افسر یہاں بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے ان مظلوموں کے، حالت جاں کنی میں تڑپنے کے نظارے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔" خود انگلستان میں، ہندوستان میں روا رکھی جانے والی اس درندگی کے خلاف احتجاج کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جونس نے اپنے اخبار میں لکھا: "انگریزوں نے ہندوستان میں سزائے موت کا ایسا خوف ناک طریقہ ایجاد کیا ہے کہ ساری نوع انسانی دہل کر رہ گئی ہے۔ ان رقیق القلب عیسائیوں نے ایک بہت ہی نفیس ترکیب سوچ نکالی ہے: لوگوں کو توپ کے دہانے پر باندھ کر توپ داغتے ہیں اور اس طرح ان لوگوں کے پرخچے اڑا دیتے ہیں، دیکھنے والوں پر انسانی بدن اور انتڑیوں کے پرخچوں کی خونی بارش کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔" علاوہ اس کے کہ سزائے موت کے ان وحشیانہ طریقوں کے شکار بے قصور اور قصوروار دونوں تھے، ہندوؤں کے لیے اس طرح کی موت ذات کھو دینے کی بھی ہم معنی تھی۔ غالب، جن کا قیام کشمیری دروازے، دلی دروازے اور اجمیری دروازے کے عین درمیان تھا، دہلی میں جو کچھ بیت رہی تھی اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے۔ وہ لوگوں کے خوف و ہراس، قتل و خون، سزائے موت اور پھانسی، باشندوں کی شہر سے جلاوطنی اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے شہر سے بھاگنے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان میں خود شہر چھوڑنے کی سکت نہیں تھی اور جیسا کہ لکھتے ہیں، اپنی بے گناہی کے مد نظر انھوں نے طے کیا کہ گھر میں گوشہ نشین بیٹھے رہیں اور ہنگامے کے رفع دفع ہونے کا انتظار کریں۔ دہلی کے ان بقیۃ السیف باشندوں کے لیے جنھوں نے شہر نہیں چھوڑا تھا اب اذیت کے دن شروع ہوئے۔ معمول کی زندگی میں خلل آگیا تھا، فوراً وبا پھوٹ پڑی، لوگ بھوک کے مرنے لگے، دو دو تین تین دن بغیر پانی کے گزر کرنا پڑتا تھا۔ روزنامچے کے سب سے زیادہ ڈرامائی مقامات میں سے ایک وہ ہے جہاں غالب ان مصیبتوں کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے خاندان کو اس زمانے میں جھیلنی پڑیں۔ "چوں کہ گھر میں پس انداز کی ہوئی سبھی اشیاء خوردنی ختم ہو گئی تھیں اور اتنے جتن سے مہیا کیا ہوا پانی بھی، گویا کہ کنویں کو فقط ناخنوں سے کھودنا پڑا ہو، پینے کے کام آچکا اور گھڑے اور دوسرے برتن بالکل خالی ہو گئے، مرد، عورتیں اور بچے پیاس سے بے تاب تھے ... بھوک اور پیاس کی اس حالت میں دو دن اور دو راتیں گزریں۔" جس محلے میں غالب رہتے تھے وہاں انگریزوں کی طرف سے پہرا بٹھا دیا گیا تھا، لیکن پیاس سے بے قرار لوگ جان کی پروانہ کر کے پاس کے کھاری، ناقابل استعمال پانی والے کنویں کو جاتے اور اسی سے "اپنی پیاس کی آگ بجھاتے۔" خوش قسمتی سے کچھ ہی دنوں بعد بارش شروع ہوئی اور شہر کے باشندوں نے، جن میں غالب کے گھر والے بھی شامل تھے، مٹکوں کے منہ پر کپڑا تان کر تھوڑا بہت بارش کا پانی اکٹھا کر لیا۔

غالب بہ مشکل ہی اپنے پوتوں کو تھوڑا بہت کھلا پلا پاتے۔ ان کے لیے شاید یہ سب سے کڑی اخلاقی آزمائشوں میں سے ایک تھی۔

وہ لکھتے ہیں: "جن باتوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان سے دل پھٹا جاتا ہے اور جن باتوں کے ذکر سے گریز کیا ہے وہ میرے دل کے لیے اور بھی زیادہ اذیت کا باعث ہیں۔" شہر چھوڑنے والوں میں غالب کے فاتر العقل بھائی مرزا یوسف کے گھر والے بھی تھے۔ غالب کا قیام بھائی کے گھر سے بس اتنے فاصلے پر تھا کہ اسے آدھے گھنٹے میں پیدل طے کیا جا سکتا تھا،

لیکن حالات ایسے تھے کہ شہر میں آمدورفت ناممکن تھی۔ 30 ستمبر کو غالب تک یہ خبر پہنچی کہ بھائی کا گھر لوٹ لیا گیا۔ اکیلے پڑ جانے والے بھائی کی فکر مرزا کے لیے سوہان روح تھی، ان کو یہ وسوسے ستاتے رہتے کہ بھائی کو رات میں نیند آتی یا نہیں؟ دن میں تھوڑا بہت کچھ کھانے کو ملا؟ زندہ ہے یا آخر مالشوں کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا؟ 19 اکتوبر کو یوسف مرزا کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تجہیز و تکفین کا تذکرہ ان متعدد متاثر کن مناظر میں سے ایک ہے، جن سے روزنامچے کا یہ حصہ بھرا ہوا ہے۔

5 اکتوبر کو غالب پوچھ گچھ کے لیے کرنل براؤن کے ہاں طلب کیے گئے، لیکن سب کام خیریت سے انجام پا گیا۔ حالی اس تفتیش کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں: "سنا ہے کہ جب مرزا، کرنل براؤن کے روبرو گئے تو اس وقت کلاہ پپاخ ان کے سر پر تھی انھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا کہ "ول، تم مسلمان؟" مرزا نے کہا: "آدھا"۔ کرنل نے کہا: "اس کا کیا مطلب؟" مرزا نے کہا: "شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔" کرنل یہ سن کر ہنسنے لگا۔ پھر مرزا نے وزیر ہند کی چٹھی جو ملکہ معظمہ کے مدحیہ قصیدے کی رسید اور جواب میں آئی تھی، دکھائی۔ کرنل نے کہا: "تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟" مرزا نے کہا: "میں چار کہاروں کا افسر تھا، وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے، میں کیوں کر حاضر ہوتا؟" کرنل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور ان کے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔"

غالب کے روزنامچے کا اختتام سربرآوردہ لوگوں کے دہلی سے فرار اور ان کی جائیداد کی تباہی کے تذکرے پر ہوتا ہے اور اس اطلاع پر کہ بادشاہ پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔

غالب کی اس تصنیف کا، 1857-1859ء کے واقعات سے اس کے ربط کے پیش نظر تجزیہ کرتے ہوئے دیا کف لکھتے ہیں: "کیا ہم "دستنبو" کے مندرجات کی بنیاد پر بغاوت کے تعلق سے غالب کے رویے کے بارے میں رائے قائم کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں ہے بہ شرطے کہ اس واقعے کے بارے میں ہم ان کی دوسری تحریروں کو بھی پیش نظر رکھیں، ان خیالات کو بھی سامنے رکھیں جو انھوں نے نہ صرف اپنے خطوط بلکہ اشعار میں ظاہر کیے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی رائے قائم کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ غالب باغیوں کے خیالات سے متفق نہیں تھے ..... شاعر پرانے جاگیردارانہ نظام کے استحکام کا خواہش مند نہیں تھا، انگریزوں کی فوجی طاقت کا اسے بہ خوبی احساس تھا اور باغیوں کی کامیابی کو وہ مشکوک سمجھتا تھا۔" مزید برآں کنور محمد اشرف کی طرح دیا کف کا بھی خیال ہے کہ غالب نے اپنے روزنامچے کے اندراجات کا صرف اقتباس پیش کیا ہے یعنی ان میں کتر بیونت کی ہے، صرف ان اندراجات کا انتخاب کیا ہے جنھیں وہ انگریزوں کے ملاحظے میں پیش کر سکتے تھے۔ ہمارے خیال میں اس رائے سے اختلاف کی گنجائش کم ہی ہے۔

وہ قطعہ جو غالب نے بہ ظاہر 1858ء میں لکھا تھا کافی مشہور ہے۔ اس میں ہمیں واقعات پر ایک دوسری ہی وضع کا بے لاگ تبصرہ ملتا ہے:

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

ہرگوپال تفتہ کے نام اپنے خط مورخہ 6/ دسمبر 1857ء میں وہ اپنی زندگی کی بعض ایسی تصویروں کو حافظے کے نہاں خانوں سے باہر لاتے ہیں، جنھیں "دستنبو" میں جگہ نہیں ملی تھی۔ خاص طور پر وہ وضاحت کرتے ہیں کہ جب شہر انگریزی افواج کو غارت کے لیے حوالے کر دیا گیا تو وہ اپنی جان کیسے بچا پائے۔ اتفاق سے ان کا گھر اس محلے میں تھا جہاں چند ایسے انگریزوں کا ساتھ دینے والے مہاجنوں میں سے ایک کا بھی گھر تھا۔ انگریزوں سے اس محلے کی حفاظت کی اجازت لے لی گئی تھی اور غالب کا گھر بھی اس حکم کے دائرہ عمل میں تھا۔ غالب اس خط میں لکھتے ہیں: "ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ مبالغہ نہ جاننا، امیر و غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس، دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے اور ہنگامے میں شریک ہوئے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا۔ (اس مقام پر خطوط کی اشاعت میں ایک نوٹ کا اضافہ کیا گیا ہے: "کیا اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ غدر کے دوران بھی غالب کا اصلاح شعر کا کام جاری رہا؟"۔ مصنف کتاب)۔ اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔

میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چوں کہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیر دار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے، گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر 1857ء تک بہ دستور ہے۔

کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔"۔ اور وہ بڑی دل سوزی کے ساتھ ان سب کی موت پر ماتم کرتے ہیں جو باغیوں کے غصے یا انگریزوں کی نفرت کا شکار ہوئے۔ حکیم غلام نجف خاں کو اپنے خط مورخہ 27 دسمبر 1857ء میں وہ لکھتے ہیں: "انگریز کی قوم میں سے، جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا، اور کوئی میرا شفیق، اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اس کی زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا، تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔"

لیکن پھر بھی، جیسا کہ "دیوان غالب" کے مولف اور مقدمہ نگار امتیاز علی عرشی کا خیال ہے اس امر کی طرف بعض اشارے ملتے ہیں کہ غالب نے مولوی فضل حق کی امانت سے ملنے والے (اور شاید اسی وجہ سے غالب کی نظروں میں پوری طرح سے لائق اعتبار) اپنے نئے شاگرد نواب رام پور کے نام خطوط میں اپنے کچھ سیاسی خیالات، پسند اور ناپسند کا اظہار کیا تھا۔ غالب کے اصرار پر یہ خطوط تلف کر دیے گئے، جس کی بنا پر عرشی نے اندازہ لگایا کہ ان کے مندرجات کی نوعیت سیاسی تھی۔ معاملہ کچھ بھی رہا ہو، غالب مسلسل روبہ زوال مغلیہ دربار کے بارے میں، بہت پہلے ہی بڑی دانش مندی کے ساتھ رائے قائم کر چکے تھے اور یہ جانتے ہوئے کہ کلکتے میں ان کے مشاہدے میں آنے والی ایک اور طرح کی سرگرم اور فعال زندگی بھی ممکن ہے، وہ باغیوں کے خیالات سے بے شک ہمدردی رکھ بھی سکتے تھے اگر ان باغیوں کا جوش و ولولہ "تقویم پارینہ" کی بحالی کے بجائے آئینِ نو کے حق میں ہوتا۔ لیکن "جاگیر دارانہ وطن دوستی" کے خیالات سے جو کہ اولاً خود مولوی فضل حق کے

نقطۂ نظر کی امتیازی خصوصیت تھے، شاید ہی غالب کو ہم دردی ہو سکتی تھی۔ مسئلے کا دوسرا پہلو تھا مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے عناصر کی بے لگامی اور اس کے ساتھ ساتھ مروجہ طور طریقوں کا گویا کہ جواز فراہم کرتے ہوئے عوام کالانعام کے ادنیٰ ترین جبلی میلانات کو بڑھاوا دینے کی غرض سے جاگیرداروں کی طرف سے بلند کیے جانے والے نعرے۔ ان نعروں میں بلاشبہ غالب کو وہ سر بھی سنائی دیے ہوں گے، جن سے شخصی طور پر خود ان کو دکھ پہنچ چکا تھا اور جن کے خلاف وہ احتجاج کر چکے تھے

باغیوں نے ولیم فریزر کی قبر کو توڑ کر زمین کے برابر کر دیا یہاں تک کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ نواب شمس الدین کے کردار کو پہلے کی طرح آسمان پر چڑھایا گیا۔ ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ بغاوت کے زمانے میں لکھنؤ کی حکومت کی طرف سے اودھ کے باشندوں کے نام جاری کی جانے والی اپیلوں میں سے ایک میں اس واقعے کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اپیل میں اس محکم عقیدے کا اظہار کیا گیا ہے کہ پرانے زمانے سے چلے آ رہے دستور کی استواری میں فرق نہیں آنا چاہیے، ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی سماج کے مختلف طبقات کے درمیان تعلقات میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آنی چاہیے۔ انگریزوں پر گویا کہ طبقۂ امراء کے خاص حقوق کی پامالی اور رذیلوں کے طبقے کو کھلی چھوٹ دینے کا الزام لگایا گیا ہے۔ آگے اس اپیل میں اعلان کیا گیا کہ اب، جب کہ پرانے طور طریقے بحال کر دیے جائیں گے "نیچی ذات کا کوئی بھی آدمی، چمار، دھنک اور پاسی اپنے کو اونچی ذات والوں کے برابر نہیں سمجھے گا اور ان کے ساتھ بے ادبی سے پیش نہیں آئے گا۔ انگریزوں کی نگاہ میں شرفا اور نیچی ذاتوں کے آدمی برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ رذیلوں کی موجودگی میں شریفوں کو بے عزت کرتے ہیں۔ وہ عالی خاندان زمین داروں، نوابوں اور راجاؤں کو معمولی سے چمار کے کہنے پر گرفتار کرتے اور ان پر مقدمہ چلاتے ہیں۔"

ہو سکتا ہے کہ یہ الفاظ نواب فیروزپور کی سزائے موت کی آواز بازگشت ہوں، کیوں کہ ان پر بھی الزام کریم خاں کے، نیچی ذات سے تعلق رکھنے والے ایک معاون کی گواہی کی بنیاد پر عائد کیا گیا تھا۔ شاعر کی جھیلی ہوئی مصیبتیں، رشتہ داروں اور دوستوں کی موت، تباہی و بربادی، خون میں ڈوبی ہوئی بغاوت، ان سب سے غالب کی طبیعت میں ایک خاص میلان کا پیدا ہونا لازمی تھا، اور یہ میلان تھا افسردہ دلی اور قنوطیت کا۔

ان کے دوست ظلم و تشدد کا شکار ہوئے: تفتہ کش کو پھانسی دے دی گئی، آزردہ گرفتار ہوئے اور ان کی جائیداد قرق کر لی گئی، شیفتہ کو سات سال کی قید کی سزا دی گئی، مولوی فضل حق کو شروع میں معافی ملی، لیکن اس کے بعد انھیں انگریزوں کے خلاف جہاد، یعنی مقدس جنگ آزادی کا فتویٰ دینے کے الزام میں دوبارہ گرفتار کیا گیا اور جزائر انڈمان جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کے سبھی بہی خواہ احباب ان کی معافی کے لیے متواتر کوشش کرتے رہے، اور ان کی کوشش کامیاب بھی ہوئی لیکن معافی کا فرمان بعد از وقت ثابت ہوا۔ بیسویں صدی عیسوی کی تحریک آزادیِ وطن کے اس اولین نقیب، اس ذہین و طباع شخص کا "کالے پانی" کی سزا جھیلتے ہوئے پروانۂ آزادی کے پہنچنے کے ایک دن قبل انتقال ہو گیا۔

سمجھا جاتا ہے کہ فارسی غزلیات میں سے ایک، غالب نے اس بغاوت کے زمانے ہی میں لکھی ہے۔ غزل میں ایک ایسی عورت کی تصویر کھینچی گئی ہے جو کبھی عالی رتبہ اور تونگر تھی، اور اب اس کے افلاس کے دن آ گئے ہیں، اسے ناقابل یقین اذیتیں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ اس غزل میں واقعات کی طرف واضح اشارے تو شاید نہیں ملتے، لیکن اپنے مضمون کے اعتبار سے اسے غالب کی غزلوں میں کلیتہً استثنائی مقام حاصل ہے۔

در گریہ از بس نازکی رخ ماندہ بر خاکش نگر
واں سینہ سودن از تپش بر خاک نما کش نگر
[illegible]
شوخی کہ [illegible] نگر

باصد نزاکت اس کی اشک افشانیاں ہیں کس قدر
دیکھو تڑپنا اس کا یہ خاک پر [illegible]
[illegible]
[illegible]

آن کو بہ خلوت باخدا ہرگز نہ کردی التجا
نالان بہ پیش ہر کسے از جورِ افلاکش نگر
تا نامِ غم بودی زبان می گفت دریا درمیان
دریائے خون اکنون روان از چشمِ سفاکش نگر
آن سینہ کز چشمِ جہان مانند جان بودی نہان
اینک بہ پیراہن عیان از روزنِ چاکش نگر

جس نے کبھی تنہائی میں مانگا خدا سے کچھ نہ تھا
جورِ فلک کا شکوہ ہے ہر اک سے اب الحذر!
سنتے ہی غم کا نام وہ دریا کو لاتا بیچ میں
دریائے خوں اب آنکھ سے اس کی رواں دیکھا ادھر
وہ سینہ جو چشمِ جہاں سے مثلِ جاں رہتا نہاں
اب چاکِ پیراہن سے عریاں ہو رہا ہے، الحذر!
(ترجمہ: مضطر مجاز)

اور غزل کا اختتام ایک دل کو چھو لینے والے مقطع پر ہوتا ہے، جس میں مخصوص ظرافت یا طنز کی بجائے ہمیں ایک تھکے ہوئے انسان کا زیرِ لب، افسردہ تبسم دکھائی دیتا ہے:

خواند بہ اُمیدِ اثر اشعارِ غالبؔ ہر سحر
او نکتہ چینی درگزر فرہنگِ ادراکش نگر

کیا عقل و دانش کو ہوا، وہ نکتہ چینی کی جگہ
اشعارِ غالبؔ پڑھ رہا ہے اب بہ اُمیدِ اثر
(ترجمہ: مضطر مجاز)

***

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

مارماڈیوک پکتھال اور ریاست حیدرآباد

قرآن مجید کے شہرہ آفاق مترجم، کئی معیاری علمی، ادبی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف اور مشہور صحافی مارماڈیوک پکتھال ١٨٧٥ء میں
لستان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے انگلستان اور یورپ کے ممالک کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی۔ پکتھال نے مصر، ترکی، بیروت، شام
، بیت المقدس کی سیاحت کی جہاں کافی عرصے تک ان کا قیام رہا۔ ان ملکوں کی سیاحت اور قیام کے دوران پکتھال نے عربی زبان کی تحصیل
ل کی اور اسلام کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ انھوں نے اپنے گہرے اور وسیع مطالعے کی بنیاد پر ١٩١٣ء میں اسلام قبول کیا۔

محمد مارماڈیوک پکتھال ١٩٢٠ء میں بمبئی آئے۔ مشہور اخبار بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ١٩٢٤ء تک یہ ذمہ داری نبھاتے
ہ۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول کے پرنسپل کی خدمت کے لیے سابق ریاست حیدرآباد کی حکومت کی نظر انتخاب پکتھال پر پڑی۔ اس وقت ان کی
پچاس برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کی غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر اس رکاوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں
ں خدمت کے منظورہ گریڈ کی ابتدائی یافت ایک ہزار روپے کلدار کی پیش کش کی گئی۔ پکتھال نے اس پیشکش کو قبول کیا۔ وہ جنوری ١٩٢٥
ں حیدرآباد آکر چادر گھاٹ ہائی اسکول کے پرنسپل کی خدمت پر رجوع ہوئے۔ انھوں نے چادر گھاٹ ہائی اسکول کی ترقی کے لیے بڑی محنت
اور طلبا کی کردار سازی پر خصوصی توجہ دی اور اسے ایک مثالی درس گاہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ڈاکٹر احمد محی الدین جو پکتھال
، دور میں چادر گھاٹ ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ اپنے ایک مضمون مطبوعہ ماہنامہ سب رس، حیدرآباد ١٩٩٣ء میں لکھتے ہیں کہ پکتھال
، مراسم مصر، ترکی اور برطانیہ کے اعلیٰ عہدے داروں سے تھے۔ اس زمانے میں وہ سول سروس کے منتخب افراد کی تربیت بھی کرتے تھے اور
ب سے بڑھ کر یہ وہ ترجمہ، قرآن کے کام میں غرق تھے مگر حیرت ہے کہ اس مصروفیت کے باوجود وہ بلاناغہ سوائے جمعہ کی تعطیل کے دن بھر
رسے میں موجود رہتے۔ دوپہر کے وقفے میں نماز ظہر کی امامت بھی کرتے اور اسی گھنٹے میں اسکول کے صحن میں کچھ دیر کے لیے لڑکوں سے بے
ف گفتگو بھی کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں لطیف ظرافت جھلکتی رہتی تھی۔ طلبا ان کی مسکراہٹ کبھی نہیں بھول سکتے۔

حیدرآباد میں وہ محکمہ، نظامت اطلاعات عامہ اور سیول سروس ہاؤس کے نگران کار بھی مقرر کیے گئے تھے۔ حیدرآباد کا معروف
ریزی رسالہ اسلامک کلچر ١٩٢٧ء میں پکتھال کی ادارت میں جاری ہوا جسے پکتھال نے بلند پایہ علمی اور تحقیقی جریدہ بنانے کے لیے سخت
نت کی۔ حیدرآباد کے قیام تک وہی اس رسالے کے ایڈیٹر تھے۔

قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ پکتھال کا عظیم کارنامہ ہے۔ حیدرآباد کی ملازمت کے دوران ترجمے کے کام کو مکمل فرصت اور یکسوئی
، ساتھ انجام دینے کے لیے انھیں پوری تنخواہ کے ساتھ دو سال کی رخصت منظور کی گئی۔ پکتھال ترجمہ مکمل ہونے پر مصر گئے اور وہاں انھوں
نے جامعہ ازہر کے اساتذہ اور دیگر علماء سے اپنے ترجمے پر مشورہ اور قرآن مجید کے مشکل مقامات پر بحث و مباحثہ کیا جس کی روشنی میں
وں نے اپنے ترجمے پر کہیں کہیں نظر ثانی بھی کی۔ ان کا ترجمہ ١٩٣٠ء میں The Meaning of the Glorious
Kor کے نام سے بیک وقت لندن اور نیویارک سے شائع ہوا۔ گورنمنٹ سنٹرل پریس حیدرآباد سے بھی دو جلدوں میں اس کی اشاعت
ں میں آئی۔ اس ترجمے کے اب تک بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ محمد مارماڈیوک پکتھال کا انگریزی ترجمہ لازوال ہے۔
ں سے ہمیشہ استفادہ کیا جائے گا۔ ریاست حیدرآباد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ قرآن حکیم کے اس مترجم کو اس نے سر آنکھوں پر اٹھایا اور عظیم

ترین مترجم کے لیے ممکنہ سہولتیں فراہم کیں۔ یہی نہیں بلکہ اس ترجمے کی تکمیل کے بعد بھی اس مترجم قرآن کے ساتھ شایان شان سلو
روا رکھا۔

پکتھال کو صرف دس سالہ ملازمت پر ان کی اہم خدمات کے پیش نظر بطور خاص نصف تنخواہ کا وظیفہ پانچ سو روپے کلدار ماہانہ مـ کیا گیا اور ان کے انتقال پر ان کی بیوہ کو دو سو پونڈ سالانہ وظیفہ تاحیات مقرر کیا گیا۔

مارماڈیوک پکتھال کی حیات اور کارناموں پر اردو میں چند مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں حیدرآباد کی ملازمت کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ لیکن حیدرآباد میں ان کی دس سالہ ملازمت کے بارے میں حسب ذیل تفصیلی، مستند اور اہم مواد جو آرکائیوز کے ریکار میں ہے پہلی بار پیش کیا جارہا ہے۔

چادرگھاٹ ہائی اسکول کے پرنسپل کی جائداد کے انتظام کے متعلق سر راس مسعود ناظم تعلیمات نے اپنی ایک تحریک میں لکھ سررشتہ تعلیمات کی ترقی کے لیے یہ امر ہمیشہ پیش نظر رہا ہے کہ فرسٹ گریڈ ہائی اسکولوں میں کم از کم ایک ہائی اسکول کا پرنسپل قابل انگ رہا کرے۔ اسی اصول کے مد نظر چادرگھاٹ ہائی اسکول کی صدارت پر شاکراس اور ان کے تبادلے پر کرک پیاٹرک مامور کیے گئے۔ اب کرک پیاٹرک کا انتقال ہو چکا ہے۔ چناں چہ اس جائداد کے لیے مارماڈیوک پکتھال کا نام پیش کیا جاتا ہے۔ پکتھال آج کل کی علمی دنیا مشاہیر میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں تعلیم پائی ہے۔ انگریزی، جرمن، فرانسیسی، اطالوی ہسپانوی زبانوں سے واقف ہونے کے علاوہ وہ عربی میں بھی بہت اچھی استعداد رکھتے ہیں۔ وہ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنی زند کا بیش تر حصہ اسلامی ممالک میں عربوں، ترکوں اور مصریوں کی صحبت میں گزارا ہے۔ اسلامی ممالک کے بارے میں ان کی بہت سی تصان ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کے تمام معتبر اخبارات اور رسائل میں ان کتابوں کی تعریف و توصیف کے ساتھ اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ مـ ممالک کے حالات اور تمدن کو سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ لازمی ہے۔ یہ کتابیں اس قدر مقبول ہوئی ہیں کہ ان کا ترجمہ فرانسیسی، جرم ڈینش، ہنگرین اور روسی زبانوں کے علاوہ ایشیاء کی متعدد زبانوں میں بھی ہوا ہے۔ مارماڈیوک پکتھال کے خلوص اور ہمدردی کی بناء پر کی حکومت ان کو اپنے ایک صوبے کا گورنر مقرر کرنے کا ارادہ کر رہی تھی لیکن جنگ کا آغاز ہونے کی وجہ سے یہ تقرر عمل میں نہ لایا جاسکا۔ ان کے لیے جو عزت اور وقعت ترکوں کے دلوں میں تھی اس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ ترکی کی ایک اہم شاہراہ کو ان کے نام موسوم کرنے کی تجویز تھی۔ پکتھال ۱۹۲۰ء سے چند ماہ قبل تک بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر تھے۔ چوں کہ ان کے جیسے قابل اور مشہور یورپی خدمات سے مستفید ہونے کا ہندوستان میں شاذ و نادر ہی موقع ملتا ہے اس لیے سررشتہ تعلیمات کے لیے ان کی خدمات جلد سے جلد حاصل جائیں۔ چادرگھاٹ ہائی اسکول کے پرنسپل کی جائداد (۵۰۰ تا ۱۰۰۰ روپے) پر اس سے بہتر کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں مارماڈ پکتھال سے یہ استفسار کرنے کی اجازت دی جائے کہ آیا وہ اس خدمت کو دو سال تک اس کے انتہائی گریڈ ایک ہزار روپے ماہوار کے قبول کے لیے آمادہ ہیں یا نہیں۔ معتمد تعلیمات اور سررشتہ فینانس نے ناظم تعلیمات کی پیش کردہ اہم تحریک سے مکمل طور پر اتفاق کیا۔ سفارشات پر آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں نے اپنے فرمان مورخہ ۲۲ ڈسمبر ۱۹۲۴ء کے ذریعہ چادرگھاٹ ہائی اسکول کے پرنسپا جائداد پر دو سال کے لیے ایک ہزار روپے کلدار ماہوار پر مارماڈیوک پکتھال کے تقرر کے احکام صادر کرتے ہوئے لکھا کہ اس پیشکش کی نـ پکتھال جو کچھ جواب دیں اس کی اطلاع آصف سابع کو دی جائے۔ اس فرمان کی تعمیل میں پکتھال کو فوراً بذریعہ تار مطلع کیا گیا۔ انھو اطلاع دی کہ انھیں یہ پیشکش قبول ہے۔ اور انھوں نے ۱۵ جنوری ۱۹۲۵ء کو اپنی خدمت کا جائزہ بھی حاصل کر لیا۔

مارماڈیوک پکتھال کی منظورہ دو سالہ مدت جب ختم ہونے کو تھی ان کی خدمت کو مستقل قرار دینے کے بارے میں

یادداشت آصف سابع کے احکام کے لیے پیش کی گئی جس میں پکتھال کی اطمینان بخش کارگزاری کی بنا پر ان کی ملازمت کو مستقل قرار دینے کے لیے ناظم و معتمد تعلیمات اور سررشتہ فینانس کی سفارشات درج تھیں۔ ان سفارشات کو منظور کرتے ہوئے آصف سابع نے چادر گھاٹ اسکول کے پرنسپل کی جائداد پر پکتھال کو مستقل قرار دینے کے احکام صادر کیے۔ چوں کہ پکتھال انگریز تھے اور انگلستان کے باشندے تھے اس لیے ان کے استقلال سے متعلق رزیڈنسی سے بھی مشورہ کیا گیا تھا جس کا جواب تاخیر سے وصول ہوا یعنی پکتھال کو مستقل قرار دینے کا فرمان جاری ہونے کے بعد۔ رزیڈنسی کے مراسلے میں لکھا گیا تھا کہ ریزیڈنٹ کو شبہ ہے کہ آیا پکتھال کا مستقل تقرر مناسب رہے گا۔ پکتھال کو مزید دو سال کی توسیع دی جائے تو انھیں (رزیڈنٹ) کوئی اعتراض نہیں اور بعد ختم مدت مزید غور ہو سکتا ہے۔ رزیڈنسی سے اس مراسلے کی وصولی پر پکتھال کو مستقل قرار دینے کے احکام کو التوا میں رکھتے ہوئے ان کی مدت ملازمت میں دو سال کی توسیع کے لیے عرض داشت پیش کی گئی جس پر آصف سابع نے فرمان مورخہ ۷ فروری ۱۹۲۷ء کے ذریعے پکتھال کی مدت ملازمت میں دو سال کی توسیع منظور کی۔

پکتھال نے حیدرآباد کی ملازمت کے دوران قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ مکمل کرنے کا ارادہ کیا۔ چناں چہ انھوں نے اس سلسلے میں ایک درخواست بتوسط ناظم تعلیمات پیش کی جس میں انھوں نے لکھا کہ حکومت ریاست حیدرآباد کی ملازمت میں داخل ہونے سے قبل انھوں نے قرآن پاک کا ترجمہ شروع کر دیا تھا تاکہ اس کے محاسن، جوش اور دبدبہ کا کچھ اظہار ہو سکے جو موجودہ ترجموں میں مفقود ہے۔ یہاں آنے کے بعد انھیں اپنے گوناگوں فرائض میں اس قدر منہمک ہونا پڑا کہ ترجمے کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے فرصت نہیں ملی۔ وہ قرآن پاک کے ایک ثلث کا ترجمہ کر چکے ہیں جس میں آٹھ ماہ صرف ہوئے تھے۔ بقیہ کام کی تکمیل کے لیے کامل فرصت کے ساتھ دو سال کی مدت درکار ہوگی۔ اس مدت میں وہ ترجمے کو حواشی و مقدمے کے ساتھ مکمل کر لیں گے۔ انھیں علماء سے مشورہ اور کتب خانوں سے مدد لینے کے لیے یورپ، مصر اور الجیریا بھی جانا پڑے گا۔ اس لیے ان کی استدعا ہے کہ انھیں دو سال کی رخصت بطور خاص پوری تنخواہ کے ساتھ منظور کی جائے۔ پکتھال نے اپنی درخواست میں یہ بھی لکھا کہ قرآن پاک کے موجودہ ترجموں میں مولوی محمد علی کا ترجمہ محنت سے کیا گیا ہے مگر اس کی انگریزی ایسی ہے کہ کوئی انگریز اس کو روا نہیں رکھ سکتا۔ دوسرے تراجم ایسے لوگوں کے ہیں جو قرآن پاک کو مقدس نہیں سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے طرز عبارت میں کوئی احتیاط روا نہیں رکھی۔ پکتھال نے درخواست میں خود اپنے بارے میں لکھا کہ وہ عربی کے مختلف السنہ بخوبی جانتے ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت میں ذوق و شوق کے ساتھ انھوں نے اپنی عمر صرف کی ہے۔ انگریزی ان کی مادری زبان ہے اور بحیثیت مصنف انھیں کسی حد تک شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ ان کی تمنا ہے کہ لندن میں مسجد نظامیہ کی تعمیر ختم ہونے سے قبل قرآن پاک کا ترجمہ صاف اور موثر انگریزی میں شائع ہو جائے جو لندن کے ہر کتب فروش کی دکان پر مل سکے اور جس کو انگریز مسرت کے ساتھ پڑھ سکیں اور آسانی سے سمجھ سکیں۔ ناظم تعلیمات نے اس درخواست پر یہ رائے تحریر کی کہ قرآن پاک کے بہترین اور صحیح ترجمے کا موقع حاصل ہو رہا ہے۔ اگر آصف سابع پکتھال کی درخواست کو منظور فرمائیں تو تمام اسلامی دنیا پر احسان ہوگا۔ اس وقت دنیائے ادب میں پکتھال کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جو قرآن پاک کا ترجمہ اس خوبی سے کر سکے کہ اس کے حقیقی حسن میں فرق نہ آئے۔ لہٰذا وہ پر زور سفارش کرتے ہیں کہ اس خاص کام کے لیے حسب استدعا پکتھال کو دو سال کی رخصت پوری تنخواہ کے ساتھ منظور کی جائے۔ اور انھیں یورپ، مصر اور الجیریا جانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ وہاں کے علماء سے مشورہ اور کتب خانوں سے مدد لیں۔ ناظم تعلیمات کی رائے اور سفارشات سے معتمد و صدر المہام تعلیمات، سررشتہ فینانس اور مہاراجہ سرکشن پرشاد صدر اعظم نے کامل اتفاق کیا۔ آصف سابع نے ان سفارشات کی بنیاد پر فرمان ۱۶ جولائی ۱۹۲۸ء کے ذریعے قرآن شریف کے انگریزی زبان میں ترجمے کے لیے پکتھال کو پوری تنخواہ کے ساتھ دو سال کی رخصت منظور کی۔

ابتدا میں مارما ڈیوک پکتھال کا تقرر دو سال کے لیے ہوا تھا جس کے بعد انھیں دو سال کی توسیع دی گئی تھی۔ چار سال کی مدت پوری

ہونے پر ان کی مدت ملازمت میں دوبار تین، تین سال کی توسیع دی گئی۔ آخری تین سالہ مدت منظورہ جب قریب الختم تھی پکتھال نے انھیں ملازمت سے وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش کرنے کے لیے درخواست دی۔ پکتھال کی جانب سے وظیفے کے لیے دی گئی درخواست پر ناظم تعلیمات نے لکھا کہ تاریخ ابتدائی ملازمت سے توسیع کی مدت ختم ہونے تک پکتھال کی جملہ مدت ملازمت (۱۰) سال اور عمر (۶۰) سال ہوتی ہے۔ پکتھال نے زمانہ ملازمت میں نہ صرف پرنسپال کی خدمت قابل تحسین طریقے پر انجام دی ہے بلکہ اپنے مفوضہ فرائض کو انجام دیتے ہوئے نگران نظامت اطلاعات عامہ اور سیول سروس ہاؤس کی نگرانی کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ انھوں نے قرآن پاک وہ بے مثل ترجمہ انگریزی میں ہے کہ قرآن کریم کے جتنے ترجمے انگریزی زبان میں آج تک ہوئے ہیں ان سب میں پکتھال کا ترجمہ بہترین سمجھا جاتا ہے۔ ازروئے ضابطہ استحقاق سے زیادہ وظیفہ نہیں دیا جاسکتا لیکن پکتھال کا تقرر ان کی مستند قابلیت کی وجہ سے اور خاص حالات کے تحت عمل میں آیا تھا۔ ان کی خدمات قابل قدر اور قابل ستائش رہی ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر پکتھال کو ان کی دس سالہ ملازمت پر بطور خاص نصف تنخواہ کا وظیفہ ان کی خدمات کی قدردانی کے معاوضے میں منظور کیا جائے۔ ناظم تعلیمات کی رائے اور سفارشات سے معتمد و صدر المہام تعلیمات اور سررشتہ فینانس نے اتفاق کیا اور باب حکومت نے بھی ان سفارشات کو قبول کرتے ہوئے قرارداد منظور کی۔ آصف سابع نے ان سفارشات کو منظور کرتے ہوئے اپنے فرمان مورخہ ۲۶ اگسٹ ۱۹۳۴ء کے ذریعے احکام صادر کیے کہ مسٹر پکتھال کو ان کی خواہش کے مطابق جنوری ۱۹۳۵ء سے ریٹائر کرکے ان کے نام پانچ سو روپے کلدار وظیفہ بطور خاص جاری کیا جائے۔

پکتھال وظیفہ پر سبک دوش ہونے کے بعد لندن چلے گئے جہاں ان کا ۱۹ مئی ۱۹۳۶ء کو انتقال ہوا۔ پکتھال کے انتقال کی اطلاع ملنے پر آصف سابع نے ازخود تحریری طور پر استفسار کیا "مسٹر پکتھال نے اس ریاست میں مختلف خدمات عمدگی سے ایک عرصے تک انجام دیں۔ اس کے مدنظر ان کی بیوہ اس ریاست سے وظیفہ پانے کی مستحق ہے۔ کونسل کی رائے عرض کی جائے کہ بیوہ کے نام کس قدر وظیفہ جاری ہونا مناسب ہے۔" ان احکام کی تعمیل میں باب حکومت کی سفارشات پیش کی گئیں۔ اور آصف سابع نے بذریعہ فرمان مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۳۶ء مسز پکتھال کے نام دو سو پونڈ سالانہ وظیفہ رعایتی تاحیات جاری کرنے کے احکام جاری کیے۔

○ ○ ○

اعلان بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند

(فارم: ۴ رول نمبر: ۸)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر کا نام:	رمن راج سکسینہ
قومیت:	ہندوستانی
پتہ:	ادارۂ ادبیات اردو "ایوانِ اردو"
نام و پتہ مالک:	ادارۂ ادبیات اردو "ایوان اردو" پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۵۰۰۴۸۲

میں رمن راج سکسینہ تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔ دستخط

بتاریخ ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ء رمن راج سکسینہ

یوسف ناظم

چار دن مسقط میں

(ایک نیم سفرنامہ)

یہ سفرنامہ نیم اس لیے ہے کہ اس میں جھوٹ اتنی مقدار میں نہیں ہے جتنا کہ سفرناموں میں ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب سفر چند مخصوص قسم کے لوگوں کے نصیب میں ہوا کرتا تھا۔ چند سفر نیت پر منحصر ہوتے تھے اور نیت جتنی نیک ارادہ جتنا قوی اور عزم جتنا مستحکم ہوتا تھا۔ ہاتھ میں سفر کی لکیر ہو یا نہ ہو وہ سفر پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا تھا اور اس کا ذکر صرف اعمال نامے میں درج ہوتا تھا کسی پبلشنگ ہاؤز سے چھپنے اور نہ بکنے والی کتاب میں نہیں۔ دوسری قسم کے سفرنامے لوگ شوقیہ لکھتے تھے۔ جیب میں اپنے پاسپورٹ اور زرمبادلہ کے ساتھ ایک ڈائری ضرور رکھتے تھے جس میں سفر گاہ کی سڑکوں، عمارتوں، وہاں کے آثار قدیمہ اور ہوٹلوں کے علاوہ ان گھروں کا بھی ذکر بلکہ تذکرہ لکھا جاتا تھا جہاں انھیں کھانے یا چائے پر (مجبوراً) بلایا جاتا تھا۔ ان دعوتوں کا حال بیان کرتے ہوئے سفرنامہ نگار گھریلو خواتین کے سلیقے اور کچھ ان کی تعریف کرنے کے بہانے ان کے لباس کی تراش خراش، رنگ اور کانوں کے بندوں کا خاص طور پر ذکر کرتا تھا۔ بچوں کے نام بھی ترتیب وار لکھ دیے جاتے تھے۔ لوگ یہ سفرنامے بڑی دل چسپی سے پڑھتے تھے۔ کسی عزیز کے گھر میں یا کسی پڑوسی کو بچے یا بچی کے نام کی ضرورت پیش آتی تھی تو ایسی سفرنامے میں سے کوئی نام تجویز کر دیتے تھے اور یہ نام چوں کہ نہ عبرانی ہوتا تھا نہ تورانی ضرورت مند والدین اسے فوراً قبول کر لیتے تھے۔ خواتین البتہ دنگ رہ جاتی تھیں کہ یہ کیا نام ہوا مثلاً شیرانہ، جنیزہ، بونی، افقی وغیرہ وغیرہ

اب صورت حال بدل گئی ہے ملک کی نصف آبادی سفر کرنے لگی ہے اس لیے سفرناموں میں جھوٹ لکھنا خطرے کی بات ہے۔ یہ فوراً پکڑا جاتا تھا کٹی پتنگ کی طرح۔ زیب داستان باتوں کی اور خود کی تعریف کی گنجائش ضرور ہے لیکن قاری اب ان باتوں سے بھی بہلتے نہیں ہیں۔ (کچھ وار قاری پہلے بھی ہوا کرتے تھے لیکن وہ سب کے سب مروت کے عادی اور اخلاق و آداب کے مارے ہوئے تھے)۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے وہ دن قریب آ گئے ہیں جب سفرنامے فضولیات میں شمار ہونے لگیں گے۔

یہ سفرنامہ بھی جو آپ اس وقت پڑھ رہے ہیں زیادہ دیر تک نہیں پڑھ سکیں گے۔

سفرنامہ شروع ہوتا ہے: مسقط میں میں نے جو ۴ دن گزارے یہ وہ مشہور و معروف ۴ دن نہیں ہیں جن کا ذکر اردو کے ایک شعر میں آیا ہے اور جن کی تقسیم کسی جغرافیائی مقاصد یا کسی سیاسی مقاصد کی خاطر نہیں بلکہ انھیں نہایت شریفانہ انداز میں دو برابر برابر حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اس طرح کہ دو دن آرزو کے لیے اور دو دن انتظار کے لیے مقرر کر دیے گئے ہیں اور نہ یہ غالب کی تقویم کے مطابق ہر برس کے پچاس ہزار دنوں میں کے ۴ دن ہیں لیکن ہیں بہرحال میرے لیے اہم۔ "میرے لیے" کی تخصیص میں نے اس لیے کی کہ جب سے میں مسقط سے واپس آیا ہوں کئی لوگوں سے ذکر کر چکا ہوں کہ میں مسقط گیا تھا۔ کسی نے بھی اسے اہمیت نہیں دی بلکہ ایک لحاظ سے برا ہی مانا اس لیے کہ اب غیر ملکوں کی سمت میں سفر پر جانا اور خاص طور پر خلیجی ملکوں میں سے کسی علاقے کا سفر کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے گھر کی کھڑکی سے سامنے کے گھر میں جھانکنا اور پھر شعر کہنا۔ (اساتذہ اور ریختہ کے شاعروں کی بات اور ہے ورنہ ہمارے شعری سرمایے کا بیش تر حصہ اسی تاک جھانک کی دین ہے)۔

خلیجی ملکوں میں سے کسی ملک جانے کی ضرورت اس لیے بھی باقی نہیں رہی ہے کہ اب ہمارے یہاں خلیجیں ہی خلیجیں ہیں۔ ایک گھ

دوسرے گھر کے درمیان جو خلیج واقع ہے وہ بہت پرانا نہیں حال ہی کا واقعہ ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جب دو پڑوسی یا دو راہ گیر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو از راہ محبت فوراً منہ پھیر لیتے ہیں بلکہ ممکن ہے منہ ہی منہ میں کچھ کہتے بھی ہوں لیکن اب منہ ہی منہ میں کہنے کا تکلف ضروری نہیں رہا جو منہ میں آئے برملا کہا جاسکتا ہے۔ مجھے بہر حال اتفاق سے مسقط جو ایک خلیجی علاقہ ہے جانے کا موقع مل گیا۔ واپس آکر ے بھی ذکر کیا اس نے بھی کہا ارے آپ نے جانے سے پہلے بتایا نہیں میرے دو ہم زلف دراز اور ۳ بھتیجے وہاں رہتے ہیں۔ میں تو جس بھی ملا یہی معلوم ہوا کہ کسی کے عم زاد وہاں رہتے ہیں تو کسی کے ہم زاد۔ میرے ہم عمروں میں سے ایک نے اپنی بزرگی دکھانے اور میرا دکھانے کے لیے فرمایا: "وہاں تو ہمارے بچوں کے بچے جاتے ہیں آپ کہاں چلے گئے۔" ایسی باتیں سن کر میرا دل گو اب ٹوٹتا نہیں ہے لیکن تو اس میں پڑتے ہی رہتے ہیں۔ یہی بال میرا سرمایہ حیات ہیں ورنہ سر تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں لیکن سچ پوچھیے تو اس خلیجی ملک میں پہنچ کر اور دن گزار کر یہ محسوس ہوا کہ وہاں خلیج ہے کہاں۔ ہندوستان کے ہر علاقے کا باشندہ وہاں موجود ہے اور اس طرح موجود ہے کہ وہیں کا باشندہ معلوم ہوتا ہے۔ کیرالا، آندھرا، پنجاب، گجرات، بہار، اتر پردیش، اور مہاراشٹر، کس ریاست کی نمائندگی وہاں نہیں ہے۔ اچھی خاصی پارلیمنٹ ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہاں سیاست نہیں ہے اور محاذ نہیں ہیں۔ اور سب کے سب وہاں برسرکار ہیں (برسرپیکار نہیں)۔ یہاں کے لوگ وہاں کے لوگوں میں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہاں کے لوگ یہاں کے لوگوں میں اس طرح گھل مل گئے ہیں جیسے مسقط کوئی شہر نہ ہو کی زلف گرہ ہو اور حال یہ ہے کہ:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے   اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

شعر اس لیے لکھنا پڑا کہ مسقط میں شاعری بھی ہوتی ہے اور خوب ہوتی ہے

مسقط میں لوگوں کے لباس الگ الگ ہیں اور خود اہل مسقط بھی جو لباس پہنتے ہیں وہ دوسرے اہل مسقط کے لباس سے خاصا مختلف تا ہے خاص طور پر ٹوپی۔ یہ کپڑے کی بھی ہوتی ہے اور رسی کی بھی۔ سہل ممتنع بھی ہوتی ہے اور مرصع بھی۔ کسی کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی ہوتی ہے۔ جیسی کہ ہمارے والدین یعنی آباواجداد کے زمانے میں استادوں کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہاں یہ چھڑی "بید زنی" کے نہیں ہوتی صرف نمائش کے لیے ہوتی ہے۔ کسی باشندے کی کمر میں آپ کو خنجر بھی چھپاں دکھائی دے گا۔ پھر ادریس مشہدی نے بتایا کہ رنے کی ضرورت نہیں اس خنجر میں نوک نہیں ہوتی۔ چھڑیاں، خنجر اور رسی کی طرح کی ٹوپیاں سب مختلف قبیلوں کی نیم پلیٹ ہیں۔ ممکن ہے یہ لوگ الگ الگ زبانیں بھی بولتے ہوں۔ اور ان میں بھی چند مخصوص لوگ "اہل زبان" بھی ہوں لیکن جہاں تک میری سماعت نے کام یا ہر بول شریفانہ، ہر بات مہربانہ اور ہر سخن دل نواز۔ (وہاں کسی کی بھی زبان پر سیاست نہیں کھیلتی یقین ہے کہ دلوں کا بھی یہی حال ہوگا) سقط میں دھول نہیں اڑتی۔ ورنہ دنیا کا حال تو یہ ہے کہ اگر آج قدرت انسان کو حکم دے کہ ابلیس کو سجدہ نہیں کم سے کم سلام کرو تو ابلیس رد عمل کیا ہوگا یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہوا یہ کہ ایک دن فون کی گھنٹی بجی اور ایک اجنبی آواز آئی۔ میں ظفر زیدی بول رہا ہوں یوسف صاحب مسقط سے۔ اب یہ دونوں یں میرے ہوش و حواس کے اردگرد بھی نہیں تھیں یعنی نہ نام نہ مقام۔ میری یادداشت میں دور دور تک کوئی ظفر زیدی نہیں تھے حالاں اصولی اعتبار سے یہ کافی نغمہ ریز نام تھا۔ میں نے اپنے غائب دماغ پروفیسر ہونے کا اظہار کیا تو میری ذہنی پریشانی سے متاثر ہو کر ادھر سے آواز آئی میں، ہمایوں ظفر زیدی بول رہا ہوں۔ لیجیے دو نہ شد سہ شد۔ میں ظفر زیدی ہی سے پریشان تھا۔ اب انھوں نے ایک اور نام کا اضافہ کر دیا اور وہ بھی ایسا نام جو مغلیہ دور میں یہاں رائج ہوا تھا، بابر، ہمایوں اور اس قبیل کے نام اب بھی رکھے جاتے ہیں لیکن یہ بیرونی قتوں کی مدد سے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بات چوں کہ ایس ٹی ڈی پر ہو رہی تھی۔ اس لیے اس موضوع پر بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔

فون پر اس قسم کے سیمنار منعقد نہیں کیے جاسکتے۔ بہت مہنگے پڑتے ہیں۔ کسی ادبی نشست کی بات اور ہے جتنی دیر چاہو تبادلہ خیال کرتے رہو۔ پتہ چلا کہ مسقط میں ایک نثری مزاحیہ اجلاس ہوگا جس میں ایک آدھ مجھ جیسے شخص کی بھی شرکت کی گنجائش ہے اس لیے مجھے آنا ہوگا۔ ادھر سے فون منقطع ہوگیا لیکن اس قطع تعلق میں تعلق خاطر کا عنصر بلکہ جذبہ کارفرما تھا۔ چند دن بعد پھر فون پر پوچھا گیا کہ آیا میں سفر کے قابل ہوں یعنی جسمانی طور پر اس موقف میں ہوں کہ سفر کر سکوں۔ ہمایوں ظفر زیدی کو شاید کہیں سے یہ اطلاع ملی تھی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے سفر سے پرہیز کر رہا ہوں۔ جب انھیں اچھی طرح یقین دلادیا گیا کہ میں تو اس سفر پر روانہ ہونے کے لیے رخت سفر اور کمر دونوں باندھ چکا ہوں اور اب ان دونوں چیزوں میں سے کسی بھی چیز کا کھولا جانا ممکن نہیں ہے تو ساری تفصیلات کا "خلاصہ" ہوگیا اور اس بحث کے نتیجے میں میں ۱۹ دسمبر ۱۹۹۵ کی صبح مسقط کے ایرپورٹ پر بے یار و مددگار کھڑا تھا۔ ہر ملک کی ایک کرنسی ہوتی ہے جو میرے پاس نہیں تھی اور مجھے اس ہوائی جہاز میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی گئی جس سے مجھے بلایا گیا تھا۔ اس جہاز میں شاید صرف وہ لوگ سفر کر رہے تھے جو اپنی گرہ سے ٹکٹ خرید کر مسقط جا رہے تھے۔ بمبئی سے نکلتے وقت مجھے کسی نے ازراہ مہربانی ایک سکہ دے دیا تھا کہ مسقط پہنچ کر ضرورت پڑنے پر میں کسی کو فون کر سکوں لیکن بنی نوع انسان کے اس ہمدرد شخص کو اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ مسقط میں اب صندوق میں سکہ ڈال کر فون اور افسوس کرنے کا طریقہ مسدود ہو چکا ہے۔ اب فون کرنے کے لیے فقط ایک کارڈ بنوانا پڑتا ہے اور میری حیثیت ایسی نہیں تھی کہ میں کارڈ بنوا سکتا۔ "کار کرایے پر حاصل کیجیے" کے ایک ادارے کے نگران کار نے مجھے "غریب جان کر" میری مدد کی اور فون پر سے یہ اطلاع عطفہ پہ کہ میں بمبئی سے نہیں مسقط ایرپورٹ سے بول رہا ہوں میرے نامزد شدہ میزبان ادریس مشہدی چند ہی منٹ میں ایرپورٹ آگئے اور آتے ہی اعتراض کیا کہ آپ کو تو شام کی فلائٹ سے آنا چاہیے تھا ایسی بھی کیا عجلت تھی۔ ادریس مشہدی ہیں اورنگ آبادی میرے خورد بلکہ بہت زیادہ خورد۔ مسقط کی صحت عامہ کی وزارت میں ملیریا آفیسر ہیں (یہ عجیب و غریب نام ہے کام انٹی ملیریا اور نام موافق ملیریا)۔ ان کے مسقط میں اس خدمت پر مامور ہونے کی خبر سارے مہاراشٹرا میں مشہور تھی اب پایہ ثبوت کو پہنچی۔ ادریس مشہدی کا خاندان کم سے کم دو صدیوں سے تو خالص اورنگ آبادی ہے اور میں نے نہیں سنا کہ ان دو صدیوں میں ان کے خاندان کے کسی بزرگ کو مشہد جانے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ بس یہ خبر مشہور ہے کہ ان کے بزرگوں میں سے کوئی صاحب مشہد سے ہندوستان آئے تھے اور وہ اتفاق سے اورنگ آباد پہنچ تو وہاں شاہ بازار کا علاقہ انھیں بہت پسند آگیا اور وہیں انھوں نے سکونت اختیار کر لی۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ یہ لوگ دلی سے اس وقت اورنگ آباد آئے تھے جب محمد بن تغلق نے دلی کی راجدھانی دولت آباد منتقل کرنے کا فرمان جاری کیا گیا تھا لیکن ان کے افراد خاندان خود اس افواہ کی تردید کرتے رہے اور میرا بھی خیال ہے کہ محمد بن تغلق کے عہد سے اس خاندان کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا کیوں کہ ادریس مشہدی میں مجھے ایسی کوئی جھلک نظر نہیں آئی جس کی بنا پر محمد بن تغلق کی طرف ذہن جاتا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں اہل مشہد بھی اہل عرب کی طرح اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک کوئی مہمان نہ آجائے بلکہ وہ لوگ کھانے کے وقت اپنے گھر سے باہر نکل کر مہمان کی تلاش میں سرگرداں ادھر ادھر گھومتے تھے۔ یہ روایت اب خود مشہد میں برقرار نہیں رہی تو ہندوستان کے مشہدیوں میں کیسے رہ سکتی ہے اور ادریس مشہدی تو میرے قائم مقام میزبان تھے۔ قائم مقام اس طرح کہ جب مسقط میں اس مزاحیہ اجلاس کی تجویز زیر بحث آئی تو ہمایوں کی تقسیم کے بھی معاملے پر سنجیدگی سے غور کیا گیا اور مجھے ڈاکٹر عبدالحی کے مکان پر ٹھیرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پتہ نہیں جب یہ فیصلہ صادر کیا گیا اس وقت ڈاکٹر عبدالحی محفل میں موجود تھے یا نہیں لیکن مجھے بعد میں بتایا گیا کہ اس فیصلے کے فوراً بعد ڈاکٹر عبدالحی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ دن بہ دن ان کی طبیعت میں زوال آتا گیا۔ اپنے مریضوں کا علاج تو خیر وہ بہ حسن و خوبی کرتے رہے اور اللہ کا فضل مریضوں کے شامل حال رہا لیکن خود ڈاکٹر صاحب اس وقت تک نارمل نہیں ہوسکے جب تک

ان کے گھر میرے قیام کا فیصلہ بدلا نہیں گیا۔ یہ ساری باتیں رازکی ہیں اور ایسی باتیں سفرنامے میں زیب نہیں دیتیں لیکن یہ سفرنامہ ہے کہاں صرف مسقط نامہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی میرے ہم وطن ہیں اور وہ بھی بہت زیادہ ہم وطن۔ اس طرح کہ کوئی نصف صدی قبل ان کے والد ماجد میرے وطن جالنہ میں بحیثیت منصف عدالت مامور تھے اور ان کے اکثر عزیز و اقارب مرہٹواڑہ اور جہار اشٹرا میں اب بھی موجود ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غلط آبادیوں نے ان کا وطن وہی رکھا ہے جو خطے تھا۔ ڈاکٹر عبدالحی سے ملاقات ہوئی تو ان کے لب و لہجے نے بے حد متاثر کیا اور گو کہ مجھے یاد نہیں تھا کہ ان سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی لیکن آشنائی کی تجدید کے لیے راستے میں زماں و مکاں کے فاصلے حائل نہیں ہوا کرتے۔ انیس سو چالیس پچاس سال کا وہی خلوص یوں سمٹ آیا گویا کل کی بات ہو اور گو کہ میں ان کے یہاں مقیم نہیں تھا لیکن وہ اپنی مصروفیت کے باوجود میری حرکات و سکنات کی باضابطہ نگرانی اور فون پر اپنی حرمت سے مطلع کرتے رہے تھے۔ ان کے گھر جانے کا بھی اتفاق ہوا اور بار بار ہوا اور مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے گھر میں گنجائش کم تھی۔ وہ کافی وسیع "ولا" میں رہتے ہیں۔ لیکن جتنا فرنیچر میں نے مسقط کے دوچار گھروں میں دیکھا اس سے کہیں زیادہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے گھر میں نظر آیا۔ ان کے گھر میں جس یک نشستی صوفے پر مجھے بیٹھنے کا موقع ملا وہ اتنا کشادہ تھا کہ کم سے کم ۳ آدمی تو اس پر بیٹھ ہی سکتے تھے۔ میں تو اس صوفے پر بیٹھ کر خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا تھا۔ خود ڈاکٹر عبدالحی کی کشادہ دلی نے مجھے تقریباً مبہوت کر دیا تھا۔ دو مرتبہ تو انھوں نے مجھے مسقط سے واپس ہونے سے روکا اور ٹکٹ پر ٹکٹ تبدیل کرائے۔ اپنے مریضوں کو بلکتا یا کم سے کم بسورتا چھوڑ کر مجھ سے ملنے آتے رہے اور جب تک میں مسقط سے نکل نہیں گیا وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ اور لیس مشہدی سے ان کے مراسم بالکل کالج اٹنڈ سٹری کے سے ہیں یعنی خالص گھریلو اور اگر فاصلہ ہے تو صرف اتنا کہ گھر الگ الگ جگہوں پر ہیں۔ اور لیس مشہدی کے گھر ٹھہرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ڈاکٹر لطیف انصاری سے ملاقات ہو گئی۔ لطیف انصاری مسقط سے دور سلالہ میں رہتے ہیں جو کہا جاتا ہے مسقط سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ کیوں کہ یہ جگہ "سبزہ زار" میں آباد ہے اور شاید وہاں نہریں بھی بہتی ہیں۔ یہاں لوگ بیمار نہیں ہوتے۔ اور غالباً اسی لیے یہاں ایک ایسے ڈاکٹر کا تقرر کیا جاتا ہے جو خود اپنے دل سے مجبور ہو اور مریض ہو۔ دن میں گن کر ۳۰ سگریٹیں پیتا ہو اور دوسروں کو نصیحت کرتا ہو کہ انڈے کی زردی نہ کھایا کرو۔ صرف سفیدی پر اکتفا کرو بلکہ ہو سکے تو صرف انڈے کو دور سے دیکھ لیا کرو۔ یا تو انھیں اطلاع مل گئی تھی کہ میں مسقط آیا ہوں ورنہ وہ عادتاً بھی چھٹی کے دو دن گزارنے مسقط آتے ہی ہیں آتے تو اپنے چھوٹے بھائی لئیق سے ملنے کے لیے لیکن ٹھہرتے ادریس کے گھر میں ہیں۔ مجھ سے گلے ملے اور فوراً سگریٹ سلگالی۔ بمبئی میں ان کی اتنی اچھی پریکٹس تھی کہ انھیں کھانا کھانا تو ایک طرف رہا سگریٹ پینے تک کی مہلت نہیں ملتی تھی۔ اچھی پریکٹس اور اچھی صحبتیں چھوڑ کر مسقط چلے گئے۔ پانچ سال ہی میں جی بھر گیا۔ ورنہ جگہ تو ایسی ہے کہ آدمی چاہے تو پانچ پشتوں تک رہ سکتا ہے۔ شہر کو بلور کی طرح چمک دار اور شفاف رکھنے کی ترکیب وہاں سب جانتے ہیں۔ شہر ہر طرف سے کھلا ہوا ہے دلوں کی طرح لیکن حیرت ہے کہ دھول کہیں سے نہیں آتی۔ وہاں اخبار بھی چھپتے ہیں لیکن سب لوگ انھیں گھروں میں چھپ کر پوشیدہ طور پر پڑھتے ہیں سڑکوں کے بیچ کھڑے رہ کر نہیں پڑھتے۔ مسقط میں کھانے پینے کی چیزوں کی کمی نہیں۔ لوگوں کو اس کا ذوق بھی ہے اور شوق بھی لیکن مسقط کے اصلی باشندوں کے ساؤنڈ بکس شاید کم زور ہیں۔ یہ لوگ شور نہیں کر سکتے۔ بات کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے آپ سے بات کر رہے ہیں۔ میں نے تو سوچ لیا ہے کہ موقع ملا تو یہاں کے ارباب اقتدار کو دوچار جگہوں پر صرافہ (سٹہ بازار) قائم کرنے کا مشورہ دوں گا۔ شہر میں رونق رہتی ہے۔ روپیہ اور آدمی دونوں گردش میں رہتے ہیں۔

شہر ہے۔ یہاں مجھے تھوڑا سا بھٹکنے دیجیے۔ ماضی کے دھندلکوں میں لیکن زیادہ دور نہیں یہی کوئی ۳۰، ۳۵ سال پہلے کی یادوں کے نیم روشن اجالوں میں۔ مسقط سے تھوڑی دیر کے لیے بمبئی چلیے۔ سوچتا ہوں یہ ڈاکٹر لطیف انصاری میرے ہم وطن کیسے ہوگئے۔ مرحوم ریاست

رآباد کی ۱۹۵۶ء میں جب تقسیم کے لیے تشکیل جدید عمل میں آئی تو ریاست کے ۵ اپنی صد ملازمین سرکار ریاست کے پانچ ضلعوں کے ساتھ
رنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، بیڑ اور عثمان آباد) ریاست بمبئی (موجودہ مہاراشٹرا) منتقل ہوئے۔ پژمردہ افسردہ اور اداس۔ یہ سب کے سب
ے دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ ان میں سے کچھ ایک دوسرے سے واقف تھے لیکن صرف صورت شناسا۔ جب بمبئی پہنچے اور یکجا ہوئے تو
یہ ہم وطن ہونے کا احساس ہوا۔ ۱۹۶۰ء کے ارد گرد ان غریب الدیار لوگوں کے لیے باندرہ مشرقی میں ایک گورنمنٹ کالونی آباد ہوئی جس
حیدرآباد اور ودربھ (مدھیہ پردیش کا سابقہ علاقہ) کے جلاوطن لوگ آباد ہوئے۔ باضابطہ مکانوں میں۔ شروع شروع میں سب لوگ جب
موقع ملتا کسی نہ کسی عندلیب کو بلاتے اس سے کہتے تو ہائے گل پکار اور میں ہائے دل چلاتا ہوں لیکن رفتہ رفتہ یہ آہ وزاریاں، ولداریوں
تبدیل ہوئیں، (اگر یہ مبدل بہ آہ سرد ہوا) شہر بمبئی کی رونقیں بھاگئیں گھر بھی بس گئے۔ وقت حسب معمول پر لگا کر اڑنے لگا۔ ان میں سے
اں نے بمبئی کو اپنا وطن ثانی (شہر تو لاثانی تھا ہی) بنالیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے شوقین تھے۔ کچھ لوگ وظیفے پر سبک
ں ہو کر اپنے اپنے گھر بھی واپس ہوگئے۔ ڈاکٹر لطیف انصاری جن کی اس وقت شاید مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں یا زیادہ سے زیادہ سبزہ آغاز
اہوگا۔ پس بمبئی میں میڈیکل کالج کے طالب علم بنے اس وقت لوگ انھیں چشم حیرت سے دیکھتے تھے اور اب تو خود ان کے بچے ڈاکٹر ہونے
ں۔ بمبئی میں ایسی مثالیں اور بھی ہیں۔ ان سب کا ذکر یہاں اس لیے ضروری ہے کہ مسقط میں ڈاکٹر انصاری اور شفیق نے مجھے اپنا بزرگ مانا
، جوان بچوں کے باپ ہونے کے باوجود بچوں کی طرح ملے (ادریس تو خیر واقعی میرے ہم وطن تھے اور میں سچ مچ ان کا بزرگ ہوں)۔
رآباد کی پرانی تہذیب ان کی رگ و پے میں ہے کمال تو یہ ہے کہ ڈاکٹر انصاری، ادریس کے گھر مجھ سے ملنے آئے تو شفیق کے مکان پر رات
کھانے کا اہتمام کر کے آئے۔ میں نے بھی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے دعوت سے انکار کیا تو بولے دعوت بالکل نہیں ہے۔ صرف سادہ
ماہوگا۔ رات میں کھانا کھایا تو پتہ چلا کہ مسقط میں بھی یہ لوگ وہی حیدرآباد کی مروجہ لغت استعمال کرتے ہیں جس میں سادہ کھانے کے
ا ہوتے ہیں دعوت ولیمہ یا چوتھی کا کھانا۔ بہرحال خوشی ہوئی کہ اہل حیدرآباد نے اپنا روایتی دسترخوان برقرار رکھا ہے بس اس دسترخوان
ں تھی تو چھپے ہوئے اشعار کی کمی تھی۔ یہ مسقط میں رائج نہیں ہوسکے۔ اب فرش پر پاچوکیوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتا کون ہے۔ شفیق میرے
ے بیٹے ارشد کے جگری و گرودی دوست رہے ہیں۔ اپنے دوست کی امی کے لیے (جو رشتے میں میری بیوی ہوتی ہیں) کے لیے ایک خوب
رت ساڑی اور میرے لیے ایک سفری بیگ بھی دسترخوان پر لے آئے۔ سفری بیگ تو وہ اس لیے لائے کہ بتا سکیں کہ ان کا تعلق
لنگ اور ہوائی کاروبار سے ہے۔ شفیق سے مل کر اس لیے زیادہ خوشی ہوئی کہ وہ سگریٹیں نہیں پھونکتے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری تو مجھے اپنے
سلالہ لے جانا چاہتے تھے تاکہ میں سمنٹ پتھر کی عمارتوں کی بجائے ورڈز ورتھ کی طرح مناظر قدرت کا نظارہ کروں۔ تاہم احتیاطاً انھوں
زیادہ اصرار نہیں کیا کہ میں کہیں ہاں نہ کردوں سفری بیگ کی سہولت تو حاصل ہو ہی چکی تھی۔ احتیاط کی یہ دانش وری شہر بمبئی کی دین
۔ میں نے بھی اپنی سیر و تماشا کی خواہش کو ہوس تک نہیں پہنچنے دیا۔ یوں بھی ادریس نے مجھے مسقط میں گھمایا بہت۔ مسقط بہت بڑا شہر
بھی نہیں۔ قوی تازہ دم ہو اور اپنے ہوش و حواس میں ہو تو پیدل بھی گھوم سکتا ہے۔ (اس میں تھوڑا سا مبالغہ ہے جو عام طور پر سفرناموں
ہوا کرتا ہے) ۔یہاں مجھے سڑکوں پر صفائی کا عملہ بھی نظر آیا۔ یہ لوگ معلوم نہیں کیا کر رہے تھے۔ انھیں شاید گرد ڈھونڈنے کی تنخواہ دی
ا ہے۔ اتنی چمچماتے ہیں کہ ان میں اپنا عکس دیکھنا یہاں بہت آسان ہے۔ مطلع اتنا صاف رہتا ہے کہ ان کے پر کیا ان کی آنتیں تک گن لینا آسان ہے۔ (چڑیوں
حسن و توش میں آنتوں کی گنجائش تو ہونی ہی چاہیے ورنہ یہ اتنا چہچہاتیں کیسے)۔
مسقط میں سب سے سستی چیز پٹرول ہے۔ اس لیے ہر شخص ایک کار ضرور لیتا ہے۔ کار خریدنے سے پہلے دیکھ لیتا ہے کہ اس میں
ٹیرنگ کار کی بائیں طرف ہے یا نہیں اور اس میں کہیں ہارن تو نہیں لگا ہے۔ یہاں کاریں کھلونوں کی طرح استعمال کی جاتی ہیں۔ سڑکیں

ٹینس کورٹ کی طرح مسطح اور شفاف۔ اس کے باوجود کار میں اگلی نشست پر بیٹھنے والوں پر پابندی ہے کہ وہ بیلٹ ضرور لگائیں۔ یہ ضروری احتیاط ہے۔ مغربی ملکوں کی حد تک یہ پابندی ٹھیک ہے وہاں لوگ کاروں میں بھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ انھیں ان کی حد میں رکھنا ضروری ہے۔ گاڑی چلاتے وقت صرف گاڑی چلانا چاہیے۔ جب میں نے پٹرول کی قیمت سن کر تعجب کا اظہار کیا تو بتایا گیا یہ تو کچھ بھی نہیں، جدہ میں تو پٹرول اور بھی کم دام میں ملتا ہے۔ اب مجھ میں آیا کہ وہاں لوگ کیوں گاڑیوں میں دن بھر میلوں سفر کرتے رہتے ہیں۔ سڑکوں سے مجھے ہمیشہ دل چسپی رہی ہے۔ گو کہ صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق نہیں ہوئی ہے لیکن ہر سیدھی سڑک سے جس پر سنگ راہ نہ ہوں میری اکیڈیمک دل چسپی کا مرکز رہی ہے اور یہ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت دنیا کے جو ملک رسل و رسائل کے معاملے میں شہرت رکھتے ہیں ان میں عمان کا نام بھی شامل ہے۔ اور اپنی سڑکوں کو "بام شہرت" پر پہنچانے میں اہل عمان کو زیادہ نہیں صرف ٢٠ سال درکار ہوئے۔ جس ملک میں آج سے ٢٠ سال پہلے ١٠ کیلو میٹر کی بھی سمنٹ کی سڑک نہیں تھی اس وقت پانچ ہزار کیلو میٹر کی ایسڑ و ہر طرف سے آنکھیں ملانے والی سڑکیں اس طرح پھیلی ہوئی ہیں جیسے کسی نے ان پر سلیسلی بانات تان دی ہو۔ مسقط سے سعودی جانے والی شاہراہ اب ہمیشہ "لبریز" رہتی ہے اور جیسے ذرا سی بھی فرصت ہو اس سفر پر لبیک کہتا چل پڑتا ہے۔ اس ملک عمان کی سڑکوں کا ذکر میں اتنی محبت سے اس لیے بھی کر رہا ہوں کہ یہ سڑکیں پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔ انھیں دیکھ کر فرہاد کی یاد تو آتی ہی ہے شیر شاہ سوری کی بھی یاد آتی ہے۔ (اس شخص نے حالاں کہ بادشاہ تھا ہندوستان میں سب سے لمبی سڑک بنائی تھی جس کا نام شاید گرینڈ ٹرنک روڈ تھا) شیر شاہ سوری بے حد ذہین بھی تھا جس کا اقبال نے بھی اعتراف کیا ہے۔ "یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سوری نے: کہ امتیاز قبائل تمام تر خواری" یہ خبر سن کر حیرت ہوئی کہ ملک عمان میں سڑکیں تعمیر کرنے کا کام وزارت دفاع کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اس میں وزارت تعمیرات کی (جسے کہیں کہیں وزارت شہری ترقیات کا بھی نام دیا گیا) ذمہ داری کا پہلو ضرور نکلتا ہے۔ لیکن یہ صرف بد گمانی ہے۔ وزارت شہری ترقیات نے شہر بسائے ہیں اور معلوم ہوتا ہے جی لگا کر بسائے ہیں۔ مسقط کو عروس البلاد کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغے کی بات نہ ہوگی۔ حالاں کہ سفرناموں میں مبالغہ آمیز باتیں لکھنا منع نہیں ہے۔ مسقط کی سڑکوں پر خوب صورت کاریں تو دوڑتی ہی رہتی ہیں۔ اتفاق سے ایک لکژری کوچ بھی نظر آگئی۔ غالب نے کہا تھا بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں رہتی ہیں اور صرف شب کو (وہ بھی اگر ان کے جی میں آئے تو) نظر آتی ہیں۔ کاش غالب کے زمانے میں دلی میں ایسی کوئی لکژری کوچ ہوتی۔ میں تو اسے دیکھتا ہی رہ جاتا لیکن یہ ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گئی۔ میں نے سنا کہ یہ لکژری کوچ اتنے آرام دہ ہوتے ہیں کہ مسافروں کو ان میں سے زبردستی اتارنا پڑتا ہے (لکژری کوچ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ مونث بھی اور مذکر بھی۔ زیادہ تر مذکر کیوں کہ مسقط میں عورتیں لکژری کوچ میں ڈرائیور کی نشست پر نہیں بیٹھتیں)۔

میں خواہ مخواہ سڑکوں کے ذکر میں الجھ گیا۔ اصل میں سڑکوں کا ذکر میں اس لیے کرتا رہتا ہوں تاکہ خود کے پاؤں زمین پر ٹکے رہیں۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ جو لوگ خاص طور پر ادب فرش کو بھول جاتے ہیں ان کے پاؤں زمین پر ٹکتے نہیں ہیں۔ (مجھ پر خود بھی یہ کیفیت گزر چکی ہے اب ذرا محتاط ہو گیا ہوں)۔ عمان کی شہری ترقیوں کے ذکر میں میں اتنا کھو گیا کہ اپنے اصل میزبان ہمایوں ظفر زیدی کو بھول گیا۔ پہلا دن پورا گزر گیا اور اچھا ہی گزرا کیوں کہ میزبان محترم نے صرف شام کے وقت بتایا کہ رات میں ملاقات ہو سکے گی۔ ان کے اس ارشاد، سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ڈسپلن کے کتنے سخت پابند ہیں۔ انھوں نے مجھے بمبئی سے مسقط پہنچنے کے لیے رات ہی کا وقت دیا تھا۔ رات میں ان سے حسب وعدہ مسقط ایر پورٹ پر ملاقات ہوئی اور میں انھیں دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ موصوف فون پر میری سمجھ میں کیوں نہیں آرہے تھے۔ یہ تو وہی پرانے اور تقریباً آثار قدیمہ والے ظفر زیدی تھے جو بمبئی اور دلی دونوں جگہ اپنے طلسماتی اور "تجسساتی" (اس کا مصدر تجسس ہے) صنائع و بدائع کے ساتھ مجھ سے مل چکے تھے بلکہ ایک مرتبہ دلی کے ایک مزاحیہ سیمنار میں مجھے ٹوکا بھی کہ تھا کہ میں مزاح میں فلسفہ داخل کر

ـ انھیں دیکھتے ہی میرا سارا حافظہ عود کر آیا یادداشت لئے پاؤں لوٹ آئی۔ ہم دونوں شاید بغل گیر تو نہیں ہوئے کیوں کہ یہ طریقہ ت اب مصنوعی ہوتا جارہا ہے لیکن مسرور بے حد ہوئے (کم سے کم میں تو ہوا) ظفر زیدی نے ایک اور صاحب سے تعارف کرایا کہ یہ بھی ز میزبان ہیں عام بتایا واحظ الرحمان اور یہ کہا کہ اس اجتماع کے سب کچھ یہی ہیں۔ (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں ایسے کارگزار لوگوں کو طراکز وغیرہ قسم کے ثقیل القاب سے یاد کیا جاتا تھا۔) واحظ الرحمان صاحب مسقط میں حبیب بنک کے سربراہ ہیں (سربراہ کو کراچی میں کہا جاتا ہے۔ یہ ڈاکٹر کا فارسی ترجمہ ہے جب کہ ہندوستان میں مدیر اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے ادارت کے فرائض انجام دینا نہ آتا ہو)۔ ـ سے بالراست وابستہ ہونے کی وجہ سے مجھے واحظ الرحمان جن کی مسکراہٹ فکسڈ ڈپازٹ کا نمونہ نظر آئی جو رفتہ رفتہ ترقی کرتی ہے اور ، مقررہ پر پوری توانائی کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ ہم لوگ ایرپورٹ اس لیے آئے تھے کہ ۹ بجے کے پلین سے مجتبیٰ حسین اور دلیپ سنگھ ے مسقط پہنچ رہے تھے اور دیکھا جائے تو صحیح مہمان یہی دونوں تھے۔ کہنہ مشق لیکن تازہ کار۔ مزاح نگاری میں اصل میں جڑیں مضبوط ہوئی ں۔ اس صورت میں پھل پھول بہت آتے ہیں اور اہل طلب کی طرف گل اور ثمر دونوں بہ کثرت پھینکے جاسکتے ہیں۔ پلین وقت پر پہنچا اور ں مزاح نگار ہنستے ہوئے (صرف ہنستے، ورنہ عام طور پر ہنسنے کھیلنے کہا جاتا ہے) مجلس استقبالیہ سے گلے ملنے آگے بڑھے۔ دلیپ سنگھ کی ں کھلی جارہی تھیں جس کا باعث شاید میں ہوں گا۔ مجتبیٰ بھی مسکراہٹ میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مصافحوں، ؤں اور دیگر رسوم کی تکمیل کے بعد پورا قافلہ ہمایوں ظفر زیدی کے گھر کی طرف روانہ ہوا کیوں کہ مذکورہ دونوں مہمان، ان ہی کے ن تھے۔ (معلوم ہوا ان کا گھر ان دنوں خالی تھا۔ مرے ذہن میں فارسی کا ایک مصرع آیا لیکن میں نے اسے فوراً رخصت کردیا) ظفر زیدی کا مجھے بہت خوب صورت نظر آیا۔ مسقط میں طرز رہائش یہی ہے اور ہمایوں ظفر زیدی تو لکھنؤ کے ان اولین باشندوں کے رکن خاندان ہیں ی وضع نہیں بدل سکتے خواہ دوسرے اپنی خو کیوں نہ چھوڑ دیں۔ انھوں نے کھانے کی میز بھی سجائی تھی۔ لیکن سارے حاضرین خط ہی سے ا تحصیل ہو چکے تھے۔ (تحصیل کا تعلق اب صرف طعام سے رہ گیا ہے۔ خود آل احمد سرور نے شاید اپنے ایک شعر میں کہا ہے کہ کالج تو ـ علم کے کارخانے ہیں۔ خاک سار کی رائے یہ ہے کہ اس شعر میں علم کا لفظ زیادہ ہے) چائے سب نے پی جو بہت عمدہ تھی۔ میں نے ـ کی تو دلیپ سنگھ نے بھی کی۔ میں نے کہا بھی کہ چائے کی تعریف کوئی صدارت کی تحریک تو تھی نہیں جس کی تائید کرنا آپ کا فرض تھا۔ ـ آپ نے تعریف کی تو میرا بھی فرض بن جاتا ہے کہ میں بھی تعریف کروں۔ مجتبیٰ نے البتہ اس کی ضرورت نہیں سمجھی کیوں کہ وہ ہمیشہ ہی ـ ائے پینے کے عادی ہیں۔ انھیں اس میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ ہمایوں ظفر زیدی نے سنا ضرور لیکن یہ نہیں بولے کہ ایک اور لیجیے۔ وہ شاید اس فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ اپنے دونوں مہمانوں کو الگ الگ کمروں میں رکھوں یا دونوں ایک کمرے میں رہ لیں ۔۔۔ مجتبیٰ نے بتایا کہ وہ پاؤں کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا ظاہر ہے زیادہ گھر میں رہیں گے تو یہی ہوگا لیکن میں نے محسوس ـ مجتبیٰ اس مرض کی طرف رواں دواں ہیں جسے آرتھرائٹس کہا جاتا ہے۔ ادبی اور سماجی وزن کے ساتھ خود ان کے جسمانی وزن میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ جس کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ مجھ سے بولے کیا آپ پہلی مرتبہ کسی خلیجی ملک میں آئے ہیں؟ میں نے کہا۔۔۔ ہاں، پس ماندہ ہونے کے احساس پر چپ ہو رہا۔

رات مائل بہ شباب تھی اس لیے میری تحریک التوا پر ہمایوں ظفر زیدی نے بادل ناخواستہ دوسرے دن تک کے لیے اجلاس ملتوی ا ہم لوگوں کو واک آؤٹ کرنے کی اجازت دے دی۔ (یہ واک آؤٹ تقریباً واک آؤٹ کے برابر تھا)۔ اس طرح دن تمام ہوا۔ اختر الایمان م یاد آگئی لیکن یہ دن عام دنوں کی طرح کا دن نہیں تھا اس میں "ورائٹی" بہت تھی (اشارہ دلیپ سنگھ کی طرف نہیں ہے)

دوسرے دن صبح مجھے اس لیے طلب کیا گیا کہ ہم سب کو کراچی سے آئے ہوئے مہمان مظفر علی خاں سے ملنے جانا تھا۔ مظفر علی خاں میں،

مصنف، مزاح نگار اور شاعر ہونے کے علاوہ ایک اہم خوبی یہ ہے کہ وہ بھی حبیب بنک میں برسر کار ہیں۔ دن بھر تجوریوں سے گھرے رہتے ہیں۔ روپوں میں کھیلتے ہیں اور شہر کے ہر شخص کی مالی حالت سے واقف ہیں اور اسی حساب سے اپنے سلوک کو سلوک کی حد تک رکھتے ہیں اور چندے کے ساتھ حسن سلوک بھی انجام دیتے ہیں۔ ہم لوگوں کی بات اور ہے سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں انھیں ہمارا حال معلوم بھی نہیں ہے۔ واحد الرحمان صاحب ہی کے یہاں مقیم بلکہ فروکش تھے۔ ہم لوگ پہنچے تو باغ باغ ہوگئے۔ اپنی نئی تصنیف سے نہال بلکہ بینک کی زبان میں یوں کہنا چاہیے کہ مالا مال۔ فرداً فرداً سب کی خیریت پوچھی اور اس بات کا خیال رکھا کہ کہیں کوئی کمی بیشی نہ ہوجائے۔ (پھر بھی ہوہی گئی)۔ مظفر علی خاں آدمی بہت شریف ہیں۔ اتنے نرم گفتار ہیں کہ معلوم ہوتا ہے قصیدہ در صفت انبہ کی تلاوت کر رہے ہیں۔ (تلاوت سے مراد قرات)۔

ان دنوں مسقط میں چھٹیاں تھیں اس لیے صاحب خانہ بھی گھر ہی پر تھے۔ ہم لوگوں کی خبر لینے باہر آئے تو بے حد ہشاش بشاش تھے۔ جن ۲۰ دوستوں کو انھوں نے تقریب مزاح خوانی، کے لیے بلایا تھا چاروں موجود تھے اور پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون بول رہا ہے اور کون سن رہا ہے۔ پر تکلف چائے پی لیکن میں نے صرف اس لیے تعریف نہیں کی کہ کبھی تو کسی اور کو پہل کرنی چاہیے۔ طے یہ پایا کہ تفریحی سفر کی تقریب فوری طور پر منعقد کی جائے اور شاہی محل کو کہ دیکھنے کی چیز ہے ضرور دیکھا جائے۔ ہمایوں ظفر زیدی نے اپنی کیمرہ ساتھ رکھ لیا اور ہماری آنکھوں کے سامنے اس کے اندر فلم اس طرح بھری جیسے پستول میں گولیاں بھری جاتی ہیں۔ ان کی اس چابک دستی پر ہم لوگ عش عش کر اٹھے۔ یہ تفریح یادگار تفریح تھی۔ میں نے مسقط کو اتنی مفصل اور پھیلا ہوا نہیں سمجھا تھا۔ سمندر در بغل اور اطراف میں کوہ و جبل۔ ہوا میں طرفگی حالاں کہ دھوپ اچھی خاصی تھی لیکن موسم خوش گوار تھا۔ اس دن صبح صبح ایک نوجوان مجھ سے ملنے آگئے تھے۔ پرویز۔ یہ میرے بہت ہی عزیز دوست سالار لکھنوی (فرخندہ نواب) کے صاحب زادے ہیں۔ مسقط میں بسے ہوئے ہیں۔ میں نے فون پر بتایا کہ میں آیا ہوا ہوں تو دوڑے دوڑے آئے اور بولے میں آپ کو شہر گھمانا چاہتا ہوں۔ الغا میں نے انھیں گھمادیا۔ ظفر زیدی تو انھیں میرے ساتھ دیکھ کر چونک پڑے (چونک پڑنا شاید ان کی عادت ہے) یہ ان کے ملاقاتی نکلے اور ہم وطن تو تھے ہی۔ سالار لکھنوی ماچس لکھنوی کے بھتیجے ہیں اور شاید ان کے اندر مزاح گوئی کی شمع انھوں ہی نے سلگائی ہوگی۔ سالار لکھنوی جب بمبئی آئے تھے تو ٹاٹا الکٹریکل کمپنی نے انھیں پسند کرلیا تھا۔ برسوں اسی سے منسلک رہے اور پھر اچانک ٹاٹا کہہ کر پردیس چلے گئے۔ یہی عادت ان کے بچوں میں سرایت کر گئی۔ (پدر چو کار تو اند پسر تمام کند)۔ شاہی محل کے اندر تو ہم نہیں گئے لیکن اس کے نواحات، بھی کچھ کم دل نشیں نہیں ہیں۔ خاص طور پر سمندر کی صحبت ہتھیلی میں جنت شاید اسے ہی کہتے ہیں۔ حیرت ہوئی کہ یہاں سیکیوریٹی کا اژدہام کیوں نہیں ہے۔ غنیمت ہے کہ یہاں باہر سے آنے والوں کو بھی شرفا سمجھا جاتا ہے۔ سمندر کے کنارے سنگی حصار سے لگ کر خوب خوب تصویریں لی گئیں۔ ہر تصویر میں حاضرین جگہ اور انداز بدلتے رہے۔ اس کا مقصد ایک دوسرے سے قربت کا اظہار تھا جس میں شک و شبہ کی گنجائش تھی بھی کہاں۔ تاہم دستاویزی ثبوت کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ تصویر کار یعنی ظفر زیدی ایک البم تیار کر رہے ہیں جس کے نسخے چند لوگوں کو بذریعہ ڈاک بھیجے جانے کی افواہ گرم ہے۔ یہ افواہ خود انھوں ہی نے گرم کی ہے اور اگر یہ تصویریں کسی تک نہیں پہنچیں تو قصوروار محکمہ ڈاک کو ٹھہرایا جانا چاہیے خواہ یہ تصویریں سپرد ڈاک کی گئی ہوں یا نہ ہوں۔

یہ شاہی محل جس کا ہم نے سرسری مطالعہ کیا ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ ویسے خود عمان کا سارا علاقہ چٹانوں سے لدے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ (ان پہاڑوں کو یہاں الجبر کہا جاتا ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے قدرت نے اپنی صناعی اور رزاقی، کے سارے نمونے یہاں بکھیر دیے ہوں۔ رزاقی کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ لوگ کبھی کبھی شکایت کرتے ہیں کہ پیاسے کو سمندر سے صرف شبنم کا عطیہ ملا ہے۔ یہ سارا علاقہ ایسا معلوم ہوتا ہے قدرتی غالیچوں اور قالینوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ عمان میں پہاڑوں کی پیمائش بھی کی گئی ہے اور اس پیمائش

کے مطابق وہاں کا بلند ترین پہاڑ ہے جبل الاخضر کہ وہ سبز کا نام دیا گیا ہے جبکہ وہ سبز سے بھی بلند ہے سبز زیادہ بلند ہے۔ مسقط شہر سے ان پہاڑوں ہی کی گود میں آنکھ کھولی ہے اور خلیج کے آب شفاف میں نہاتے ہوئے اس خوب صورت شہر نے کیا نظارہ ہے۔ اس ماحول ساحلی محل سے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ اقبال نے سچ کہا تھا:

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں ۔۔۔ ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں ۔۔۔ زیر پر آگیا تو یہی آسماں زمیں

موصوف نے یعنی اقبال نے ہم سے یہ بھی کہا ہے کہ قدرت نے ہماری پیشانی کو کورے کاغذ کی طرح اس لیے چھوڑ رکھا ہے کہ:

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ ۔۔۔ خالی رکھی ہے خامہ حق نے تیری جبیں

معلوم نہیں یہ خیالات میرے ذہن میں کیسے آگئے ورنہ میرا ذہن تو ناقص خیالات کا مخزن رہا ہے۔ مناظر قدرت سے بہتر کوئی سری کتاب نہیں یہی ایک کتاب کھلی کتاب ہے ورنہ باقی ساری تصنیفات تو الماریوں میں اس لیے بند ہیں کہ وہ بند ہی رہیں۔

میں ذکر کر رہا تھا اس شاہی محل کا جو پہاڑ کے دامن میں نہیں بلکہ اس کے گریبان سے لگا ہوا ہے۔ اور اس محل کی ٹال میں ایک سڑک اس لیے بنی ہوئی ہے کہ جسے بھی بلندی پر جانا ہو اس کے لیے راستہ کھلا ہے۔ ہمارا بھی ارادہ تھا اور جی چاہ رہا تھا کہ کبھی تو بلندی بھی دیکھنی چاہیے۔ (پستی تو بہت دیکھ چکے) لیکن ہمایوں ظفر زیدی نے یہ اطلاع دی کہ ان کی کار کا مزاج ٹھیک نہیں ہے اور اس کی حالت صحت اس قابل نہیں ہے کہ وہ پانچ سواروں کے وزن کے ساتھ اوپر کی طرف روانہ ہو سکے۔ ظفر زیدی نے اپنے بیان میں مزید وزن پیدا کرنے کے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ انھیں یہ خدشہ بھی ہے کہ ان کی کار اس راہ پر خطر پر دم نہ توڑ دے ہو جائے۔ اس کم دل نوازی پر ہم سب نے متفقہ طور پر عش عش کیا اور صرف، بلند نگاہی، پر اکتفا کی۔ پہاڑ کی چوٹی کافی بلندی پر تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ چوٹی فلک بوس نے گود رکھی ہے۔۔۔۔ قدرت کے کرشمے بے حساب ہیں۔ خودرو پودوں نے اسے سبزپوش بنا رکھا تھا اور نیچے سے اس پر نظر ڈالنے سے محسوس ہو رہا تھا کہ سبز پوشے پر لب عرش نظری تا ید۔

واپسی پر ہمیں مسقط کے اس عالی شان بلکہ بہتر عالیشان ہوٹل میں بھی لے جایا گیا جس کی شہرت آفاق میں بھی گشت کر رہی ہے سب کا سب سے خوب صورت اور سب سے مہنگا ہوٹل ہے۔ نام تھا بوستان۔ اتنا وسیع اور فراخ کہ خود مسقط بھی اس میں ضم ہو جائے (اس میں تھوڑا مبالغہ ہے) میں نے احباب پر نظر ڈالی۔ سب دنگ تھے۔ مجھے اطمینان ہوا ورنہ میں سمجھ رہا تھا کہ تنہا میں دنگ ہوں۔ (اتنا اتفاق تو مزاح نگاروں میں ہونا ہی چاہیے)۔ ہوٹل میں ہر وہ چیز موجود تھی جو سورہ رحمان کی یاد دلاتی تھی۔ قدرت نے کیا کیا نعمتیں پیدا کی ہیں ان میں سب سے بڑی نعمت انسان کا دماغ ہے۔ یہ ہوٹل اسی سوجھ بوجھ اور سلیقے کی دین ہے۔ اس عمارت کی ہر چیز سے صرف امارت ہی نہیں ذہانت بھی ٹپک رہی تھی۔ (اچھا خاصا صاف ستھرا تھا) یہاں چائے پینے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ (بل ادا کرنے کے لیے کسی بینک پر ڈاکہ ڈالنا پڑتا سوائے حبیب بینک کے)۔ وہاں ایک نمائش بھی ہو رہی تھی۔ زیورات کی اور ایسا نہیں ہے کہ اس کے خریدار وہاں نہیں تھے، دنیا میں ہر قسم کے لوگ آباد ہیں۔ بیش قیمت سے بیش قیمت چیز کی قیمت سن کر بے جھجک خریدنے والے بھی کہ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز اور سالہا سال سن کر منہ سے سیٹی بجانے والے بھی۔ ہوٹل کی زیریں منزل پر (یہ بھی کافی بلندی پر تھی) سوئمنگ پول تھا۔ (میں ہوٹلوں میں سوئمنگ پول کو خاص طور پر دیکھنا پسند کرتا ہوں) اور گو وہاں پر کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ پھر دیکھ ہی لیا۔ البتہ ہمیں دیکھ کر متعجب ہوئے کہ یہ کپڑے پہنے ہوئے غیر مہذب لوگ کدھر چلے آ رہے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے چند نے ایسا ہو جو ہمیں صاف نظر نہیں آیا۔ اس لالہ زار میں بھی کیمرہ زیر استعمال لایا گیا لیکن اس کا رخ صرف پانی ہی کی طرف تھا

اسی میں تھی)۔ اس سفر میں بار بار سلالہ کا ذکر آتا رہا کہ قدرت کی فیاضی دیکھنی ہو تو سلالہ جانا چاہیے۔ رات میں ایک جگہ "محفل سخن" تھی اس میں بھی سلالہ کی تعریف میں نظمیں سنیں۔ مقامی حبیب بینک کے مینجر نذر حسن بھٹو صاحب کے گھر پر مشاعرے اور عشائیے کا اہتمام تھا۔ عشائیہ پہلے ہوا حالاں کہ عام طور پر دستور یہ رائج ہے کہ اول کلام بعد طعام ورنہ کلام کے موقعے پر ہال میں صرف منتظمین اور شاعر رہ جاتے ہیں اور کچھ مہمانان خصوصی۔ لیکن مسقط میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ مشاعرے کے دوران بھی سامعین جوق در جوق آتے رہے۔ کھانے کے بارے میں کچھ کہنا فضول ہے اس لیے کہ اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے تو کمال ہی ہو سکتا ہے۔ گرم کباب لینے کے لیے کھانوں کی شہ نشین سے ہٹ کر البتہ اس طرف جانا پڑتا تھا جہاں آگ روشن تھی۔ آگ نہ بھی ہوتی تو محفل میں گرم جوشی اتنی تھی کہ اگر معاملہ الٹا بھی ہوتا یعنی شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں تب بھی کباب گرم ہی رہتے۔ مشاعرہ واقعی مشاعرہ تھا۔ صدارت کے فرائض مظفر علی خاں کے ذمے تھے اور نظامت کے نوافل کسی اور صاحب کے ذمے۔ مسقط میں اتنے "خوش گو" شاعر ہوں گے میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ خواتین بھی تھیں اور خواتین ہی کی طرح کلام سنا رہی تھیں۔ شاعرات کی طرح نہیں (شاعرات اور خواتین دو الگ الگ اصناف سخن ہیں ان میں سے ایک صنف کو صرف دیکھا جا سکتا ہے: کہتے ہیں اکثر لوگوں کی بینائی اسی لیے متاثر ہوئی ہے)۔ اس مشاعرے میں نوجوان شاعروں کے علاوہ کئی بزرگ شاعر بھی شریک تھے۔ ہمایوں ظفر زیدی نے ایک نہایت ہی عمدہ غزل سنائی اور بے تحاشا داد حاصل کی۔ مشاعرے کے بعد جب میں نے انھیں از سرنو داد دی اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ شعر بھی کہتے ہیں۔ جواب میں انھوں نے بھی یہی بات کہی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ پاکستان کے معتبر اور وقیع رسالے افکار میں جن ظفر زیدی کے افکار شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ یہی ظفر زیدی ہی ہو سکتے ہیں۔ میں نے دوسری مرتبہ "از سرنو" داد دی۔ ظفر زیدی کے جوہر مجھ پر دن بہ دن کھلتے ہی جا رہے تھے۔ مشاعرے میں میں نے بھی اپنے آپ کو بطور شاعر پیش کیا۔ اور اب آپ سے کیا عرض کروں کہ صدر مشاعرہ مظفر علی خاں جب صدارتی کلمات، "اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے" کہہ کر ارشاد فرمائے تو میرا بڑی محبت سے ذکر کیا اور شرمندہ بھی کیا۔ اردو تہذیب کے مظاہرے کے ساتھ ساتھ میری آبرو بھی رہ گئی۔ (وگرنہ شعر میں خادم کی آبرو کیا تھی)۔ اس خوب صورت محفل میں واحد الرحمان صاحب نے اختتامی تقریر کی اور وہ تحفے جو میزبان مکرم نے مہمانوں اور شاعروں کے لیے کئی دن پہلے خرید کر رکھے تھے، اپنے ہاتھوں سے تقسیم کیے۔ مشاعرے کے بارے میں دلیپ سنگھ نے بھی اپنے تاثرات سے سامعین کو نوازا اور ہنسایا۔ انھوں نے شاید مشورہ بھی دیا کہ شاعری اچھی چیز نہیں ہے (لیکن سنتا کون ہے)۔ نہایت خوش گوار بلکہ لذیذ محفل تھی۔ کیوں کہ کام و دہن کی آزمائش تو پہلے ہی ہو چکی تھی (اسے لسوانی زبان میں منہ بھرائی کہتے ہیں)۔ واحد الرحمان صاحب، مظفر علی خاں اور بھٹو صاحبان کے "اتحاد ثلاثہ" نے مسقط میں دھوم مچادی۔ مظفر علی خاں تو ظاہر ہے واپس ہو چکے ہوں گے لیکن بنک کاری کے محاذ پر دو طاقتیں، بھی کافی ہوتی ہیں۔ مسقط میں بنک لاتعداد ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں "بیت بازی" کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کم سے کم حبیب بنک کا کوئی شعر اس شہر مسقط میں "القطع" نہیں قرار دیا گیا ہوگا۔ ادب پہلا قرینہ ہے تجارت کے قرینوں میں۔ (یہاں ادب سے مراد لٹریچر ہے)۔ میری مبارک باد۔

دوسرے دن (میرے لیے تو تیسرا دن ہوا) یعنی ۲۱ دسمبر ۱۹۹۵ء کو شام کے وقت مسقط کے ایک زہرہ صفت (پاش Posh) علاقے میں واقع ایک اسکول کے خوب صورت ہال میں مزاحیہ نثری اجلاس جس کی تیاریاں مہینوں سے ہو رہی ہوں گی، منعقد ہوا۔ ہال کو شادی کا پنڈال تو نہیں بنایا گیا تھا لیکن رونق ہی رونق تھی۔ ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور روشنی کی وہ بہتات تھی کہ مضمون سنانے والے آنکھ بند کر کے بھی مضمون پڑھ سکتے تھے اور کمال یہ ہے کہ وقت مقررہ سے پہلے ہی سامعین بصد شوق چلے آئے تھے۔ اردو کے جلسے میں سامعین اور مہمانوں کا وقت پر جمع ہو جانا عجیب عجیب معلوم ہوا۔ ہم لوگ اس کے عادی نہیں ہیں۔ سامعین نہایت منظم، مہذب، متمدن، چہروں پر بشاشت، آنکھوں میں مسرت اور انتظار کی چمک، بندی ماحول عطر بیز۔ مشروبات سے خاطر تواضع ہو رہی تھی۔ تعارفی ملاقاتوں کا سلسلہ

جاری تھا۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی پہ اصرار اور اس جملے کی بار بار تکرار۔ ہندوستان اور پاکستان کے سفارت خانوں سے بھی اہل ذوق نے بھی مہمانوں کو دیکھنا اور سننا پسند کیا تھا۔ دلیپ سنگھ تو ہندوستانی سفارت خانے کے عہدے داروں کی نگاہوں کا مرکز تھے۔ انھوں نے میرا بھی تعارف اپنے شناساؤں سے کرایا اور میری "بزرگی" کا لوہا منوانے کی جان توڑ کوشش کی اور شاید کامیاب بھی ہوئے۔ محفل میں جو صاحب میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھے تھے بے حد جامہ زیب شخص تھے۔ وجیہہ اور شکیل۔ معلوم ہوا کہ پاکستانی ایمبیسی میں ملٹری اتاشی ہیں۔ پاکستان میں تو "ظرافت" کے میدان میں فوجیوں ہی نے اپنے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں۔ وہی خوبو ان میں بھی نظر آئی۔ کوئی لطیفہ تو انھوں نے نہیں سنایا لیکن باتیں لطیف کیں۔ میں نے شہ نشین پر نظر ڈالی تو وہاں صرف ۴ کرسیاں نظر آئیں۔ منتظمین جلسہ نے بہ کمال ہوشیاری، صدر تقرر ہی نہیں کیا۔ بعض صورتوں میں تو یہ بالکل آرائشی ہوتا ہے (صدر کے لیے آسائشی)۔ خود ناظم جلسہ یعنی ظفر زیدی نے بھی شہ نشین پر بیٹھنے سے احتراز کیا لیکن کیا زبردست تعارفی تقریر کی تھی۔ ثابت کر دیا کہ انگریزی کے کہنہ مشق لکچرر ہیں۔ گلف ایرلائنس کی تیز رفتاری کے ساتھ بول رہے تھے۔ ظرافت کے بارے میں سرسری نہیں، بوطیقائی، باتیں کہیں۔ بعد میں میں نے ان سے ان کی فکر انگیز اور معلومات سے بریز تقریر کا ابتدائی حصہ (جسے اقتباس بھی کہا جاسکتا ہے) اس لیے حاصل کر لیا کہ کسی مناسب موقعے پر اس کا اردو ترجمہ اپنی تخلیق کے طور پر پیش کر سکوں۔ اپنی تقریر سے پہلے انھوں نے ہم لوگوں کو نام بنام صدا اور اسٹیج پر چڑھنے کی ہدایت دی سامعین کی پرجوش تالیوں میں ہم نے رسم "کرسی نشینی" کو پایہ، تکمیل تک پہنچایا۔ اس استقبال نے کہ ولولہ انگیز اور صحت بخش تھا ہال میں ایک فضا پیدا کر دی اور تعارف نے گرم کیک پر آئسنگ (Icing) کا کام کیا۔

نثری اجلاس کا آغاز مجتبے حسین کے مضمون سے ہوا اور سامعین ہمہ تن گوش ہوگئے۔ ہال کی دیواروں نے بھی ساتھ دیا کیوں کہ کان تو ان کے بھی ہوتے ہیں۔ اور داد و تحسین کی صدائے بازگشت بن کر اپنی موجودگی کا ثبوت دے سکتی ہیں۔ مجتبے کے بعد باری باری میں نے، مظفر علی خاں نے اور لیپ سنگھ نے مضامین پڑھے۔ سامعین کے جوش و خروش سے متاثر اور مغلوب ہو کر ہمایوں ظفر زیدی نے دوسرے دور کا اعلان کیا تو ہال پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس دور میں ترتیب بدل دی گئی اور جب دوسرے دور کے اختتام پر ظفر زیدی نے اعلان کیا کہ اجلاس کا خاتمہ بالخیر مجتبے کے مضمون پر ہوگا تو سامعین نے کہ اب میں خود بھی سامعین کی صف میں شریک ہو کر محظوظ ہو رہا تھا، دلیپ سنگھ کو بھی تیسری بار سننے کی فرمائش کر دی ــــ۔ حیدرآباد میں زندہ دلان حیدرآباد کے نثری اجلاسوں میں اب کوئی ایک درجن بلکہ اس سے بھی زیادہ مضامین پڑھے اور سنے جانے لگے ہیں۔ مسقط کے اس جلسے میں بھی تقریباً یہی ہوا۔ ۱۰ مضامین پڑھے گئے اور سامعین بالکل اور بجنل حالت میں پائے گئے۔ اہل مسقط کا "ظرافت" سے معاشقے کا یہ پہلا تجربہ تھا ورنہ یہاں صرف شعر و شاعری کی محفلیں سجتی تھیں۔ وہ شوق تو ظاہر ہے برقرار رہے گا ہی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے اب توجہ بٹ جائے گی۔ جاریہ (Current) اور سیونگس (بچت) دونوں کھاتے روانی میں رہیں گے۔ شیوخ کا قدم یوں بھی ہوگا اور یوں بھی۔

۲۲/ کو مجتبے کے ایک قریبی دوست مہدی علی خاں نے ایک دور دراز کے علاقے "نخل" میں ایک دعوت ترتیب دی (مجتبے کے دوست کہاں نہیں ہیں)۔ میں اس لیے محروم رہا کہ مجھے اسی دن واپس ہونا تھا اور طے تھا کہ میں دوپہری میں مسقط سے رخصت ہو جاؤں گا لیکن ڈاکٹر عبدالحئی نے مجھے روک لیا اس میں واصف الرحمان صاحب کی بھی شہہ تھی۔ اس رات ان کے گھر عشائیہ اور محفل سخن کا معاملہ درپیش تھا اور اہتمام ذرا زیادہ ہی تھا۔ ڈاکٹر عبدالحئی نے میرا ٹکٹ تبدیل کروا دیا اور رات کے ۳ بجے کا پکا (Confirmed) ٹکٹ پتہ نہیں کیسے حاصل کر لیا۔ ہوگا ان کا کوئی مریض ہوائی سروس میں۔ واصف الرحمان صاحب نے مجھے اپنے گھر پر دیکھا تو اس گرم جوشی کا اظہار کیا جس میں تعجب اور مسرت کے دونوں عناصر کار فرما تھے۔ اسے کہتے ہیں میزبانی۔ سارے مہمانوں کا استقبال وہ دروازے پر بدست خود کر رہے تھے۔ ان

[illegible] نے ہمیں مہمانوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ پاکستان کے سفیر آئے تو فرداً فرداً سب سے اس طرح ملے [illegible]۔ شرکت مسقط کی اطلاع انھیں شاید مل گئی تھی۔ دلیپ سنگھ سے خاص طور پر ملاقات رہا اور انھوں نے فرمایا [illegible] آج بھی ہوگی۔ سب لوگ گھل مل گئے۔ میرا جو مسئلہ تھا وہ صرف میرا تھا۔

[illegible] میٹنگ کے بعد شعر و سخن کی محفل کا آغاز ہوا۔ سفیر پاکستان جناب خاور محمود نے مسند صدارت سنبھالی اور ہم [illegible]۔ آج ہمایوں ظفر زیدی اور زیادہ پر بہار نظر آئے۔ سفید سلک کی شیروانی میں ملبوس جیسے ابھی ابھی راست لکھنو [illegible] (شیروانی بھی وردی کی سلی ہوئی تھی)۔ آج ان کی نظامت خالص اردو میں تھی۔ میر تقی میر کی اردو بول رہے تھے۔ محفل [illegible] تھا اور کل کے اجلاس کی شہرت نے مہمانوں کی تعداد کو غزل سے نظم تک نظم سے مثنوی تک اور مثنوی سے مجموعہ [illegible]۔ میزبان کے مکان اور دل میں کافی گنجائش تھی۔ مشاعرہ ایک تو تاخیر سے شروع ہوا اور اس کا نصف بہتر حصہ نثر کے لیے [illegible] شعرا صاحبان کو اختصار سے کام لینا پڑا۔ لیکن اختصار میں جامعیت زیادہ ہوتی ہے۔ خوب رنگ تھا۔ کچھ سیاسی نظمیں بھی [illegible] میں کراچی کے حال زار پر تبصرہ تھا۔ سفیر پاکستان نے نہایت نرمی سے ایسی شاعری سے گریز کرنے کے لیے کہا۔ شعرا تقریباً [illegible] دو دن پہلے کے مشاعرے میں شرکت کی تھی لیکن کلام سب کا تازہ تھا۔ میں نے ایک کاغذ پر شرکاء محفل کے نام لکھ بھی لیے [illegible]۔ لیکن یادوں کی بارات والا وہ کاغذ کہیں گم ہو گیا اور یوں بھی مشاعروں کی روداد لکھنا مشکل کام ہے تعارف اور تعریف میں کمی بیشی بہت [illegible] ہے اور شرکاء محفل کے صرف نام لکھ دیتا تو ٹیلیفون ڈائرکٹری مرتب کرنے کے مترادف ہے۔ شعری نشست کے آخر میں جب [illegible] اور شعر کے ساتھ نثر کی بھی فرمائش کی گئی تو میں نے نہایت ادب کے ساتھ معذرت چاہی کہ میری "رخصتی" کا وقت قریب آچکا ہے۔ [illegible] نظمیں سنائیں کہ شاعر کیسا ہی کیوں نہ ہو کلام سنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میری معذرت کو قبول کیا گیا اور سفیر پاکستان نے مجھے فی [illegible] ہندوستان واپس جانے کا ویزا دے دیا۔ تصویر کشی بھی ہوئی اور واحد الرحمان صاحب نے دوامی تحفہ بھی عنایت کیا۔ [illegible] ظفر زیدی حالاں کہ مصروف تھے دروازے تک مجھے چھوڑنے آئے کہ موقع ان کے لیے خوشی کا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق اور ادریس مشہدی [illegible] تک آئے اور جب تک انھوں نے میرے کاغذات کی جانچ نہیں کروالی ٹھہرے رہے جب میں نے کہا کہ اب آپ لوگ اس یقین [illegible] کہ میں جا رہا ہوں تب وہ لوگ خوشی خوشی واپس ہوئے۔

[illegible] کھجوروں کے اس شہر میں اگر میں ۲ دن اور ٹھہر جاتا تو عربی دانی کا دعوا بھی کر سکتا تھا کیوں کہ اب زبان بگاڑنے کو زبان دانی [illegible]۔ ہر سڑک پر سڑک کے ہر موڑ پر بڑے بڑے سائن بورڈ لگے ہیں جن میں عربی زبان میں ہدایات کے ساتھ ان کا انگریزی [illegible] درج کر دیا گیا ہے۔ مثلاً اسٹاپ، توقف کا ترجمہ ہے اب دو دو زبانوں میں آپ سے رکنے کے لیے کہا جائے تو ظاہر ہے آپ کو رکنا ہی [illegible]

[illegible] کی یہ بات یاد رہے گی کہ اس شہر نے زندگی کے ہر شعبے میں اتنی ترقی کی ہے کہ رشک آتا ہے۔ یہاں سب لوگ حب الوطنی کے [illegible] ہیں۔ نماز پڑھنے کے ڈھنگ الگ الگ ہیں لیکن سب ایک ساتھ، باجماعت، نماز پڑھتے ہیں۔ کچھ نمازی ہاتھ باندھتے ہیں کچھ نہیں باندھتے۔ اور کچھ تو ہاتھ باندھتے ہیں۔ سلام پھیرتے وقت البتہ صرف ایک سلام پر اکتفا کرتے ہیں۔ یعنی ایک ہی سلام پر دونوں طرف منہ پھیرتے ہیں لیکن جہاں تک حب الوطنی کا تعلق ہے ہر شخص اس بات کا معترف ہے کہ عمان کے حکمران شاہ قابوس بن سعد کی روشن خیالی نے اس ملک کو دنیا کے ترقی یافتہ اور خوب صورت ملکوں کی فہرست میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ اب تو یہاں سیاح، بھی اتنے آنے لگے ہیں کہ ان کے اعداد و شمار جمع کرنا اور اختر شماری دونوں ایک ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں مسقط کی کھجوروں میں مٹھاس بھی کچھ زیادہ ہی

ہے۔ یہ سب نیت کا طفیل اور عمل کا کھیل ہے۔

موسم بہت خوش گوار تھا اور ادریس مشہدی کے گھر میں تو باد نسیم کا انتظام ہے۔ توقف کے معنی سمجھتے ہوئے بھی اگر میں نہیں رکا انہ کہیں سے سیٹی ضرور بج جائے گی۔

۲۳ دسمبر ۱۹۹۵ کو جب میں صبح ۴ بجے سہار ایرپورٹ پہنچا تو انتہائی سرد ہوائیں چل رہی تھیں اور میرے چہرے پر ہوائیاں بن کر ں تھیں۔ گھر پہنچنے پہنچنے تک میرا پہلا کام یہ تھا کہ میں سخت زکام میں مبتلا ہو گیا اور جس سے بھی ملا یا فون پر بات ہوئی اس نے یہی پوچھا آپ مسقط گئے نہیں؟

ا پیراگراف

یہ تھی داستانِ مسقط۔ گو کہ اس سفرنامے کی نوعیت کسی کتاب یا کتابچے کی نہیں ہے لیکن ادب میں "انتساب" نام کی ایک چیز رائج س کی خاصی اہمیت ہے۔ انتساب اصل میں ایک کلغی ہے اور سرورق کے بعد ہی اسے صفحہ قرطاس میں نمودار ہونا چاہیے۔ کتاب کا آغاز ب ہی سے ہوتا ہے۔ اکثر قاریوں کو میں نے انتساب کے مطالعے کے بعد التہاب میں مبتلا ہوتے بھی دیکھا ہے۔ (کتاب کے مطالعے کے بعد ی طبیعت اور زیادہ مکدر ہو جاتی ہے) ۔ میں نے احتیاطاً انتساب کے عمل کو آخر تک ملتوی رکھا ہے اور اب میں بصد خلوص اس نیم امے کو شہر مسقط کے ان اہل ذوق کے نام معنون کرتا ہوں جنھوں نے مجھے ۴ دن ہنسی خوشی برداشت کیا۔ ایک عمومی انتساب کوئی ب نہیں ہوتا اس لیے میں اپنے ۴ دنوں کے قیام کو ۴ برابر برابر کے حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے (تقسیم کا عمل میں نے انگریزی اج سے سیکھا ہے)

(۱) ہمایوں ظفر زیدی (۲) جناب واحد الرحمان (۳) ڈاکٹر عبدالحئی اور (۴) ادریس مشہدی سے بطور خاص گزارش کر رہا ہوں کہ وہ انتساب کو اپنے نام منسوب سمجھیں (ادریس مشہدی کے گھر میں تو باد نسیم کا بھی انتظام ہے۔ وہ اس طرح کہ نسیم ان کی بیوی کا نام ہے جو ی بھتیجیوں کی فہرست کی صف اول میں اپنی جگہ بنائے ہوئے ہیں)۔

○ ○ ○

۴۰ سے آگے)

اس کتاب کو پڑھنے سے یورپ کی تاریخ کے تمام خم و پیچ واضح ہو جاتے ہیں۔ انقلاب فرانس، نپولین کا عروج، صنعتی انقلاب، روس، یا اور جرمنی کا عروج ایک طرح سے اس وقت کی سب سے طاقت ور سلطنت ترکی کے لیے چیلنج تھا۔ اس کش مکش میں ترکی سائنسی پس گی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا اور یورپ کی قومیں اس کی عظیم الشان سلطنت کو پارہ پارہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ یہ جدید ترین دور کی اتھی۔ قومیتوں کے احساس نے جس طرح عصبیت اور برتری کے جذبوں کو فروغ دیا اس کا نتیجہ اطالوی اور جرمن قومیت کی تاسیس اور گے چل کر ان کے فاشسٹ میلانات میں ظاہر ہوا۔ سید علی محسن نے جدید یورپ کے اس عہد تک بحث کی۔ تھوڑی سی تشنگی کا احساس ح میں ہوتا ہے جہاں انھوں نے عہد وسطیٰ کی تہذیب کے زوال اور اسلامی سلطنتوں کے انحطاط سے پوری طرح بحث نہیں کی۔ اس لیے ا چیزیں تھیں جو یورپ کے عہد جدید کا مطلع بنیں۔"

مجھے یقین ہے کہ اہل ادب اور ارباب تحقیق اس کتاب کی ویسی ہی قدر کریں گے جس کی یہ مستحق ہے۔ آج کل اردو میں ایسی ن کی اشاعت ایک کم یاب واقعہ ہے۔ میں اس کتاب کو صرف ایک کتاب نہیں ایک اہم علمی اور لسانی واقعہ سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر نسب حیدر

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

حکومت ایران کی طرف سے ایک دورہ بازآموزی استادان فارسی ہند دہلی میں تشکیل دیا گیا تھا جس میں ایران میں ہونے وا دورہ بازآموزی (Refresher Course) کے لیے ہندوستانی اساتذہ کا انتخاب عمل میں آیا اور ساتھ ہی اساتذہ کا ایک گروہ ایران بھیجا گیا جس میں پروفیسر عبدالحق انصاری اور وارث کرمانی جیسے سینیر اساتذہ بھی تھے اور کچھ ریسرچ اسکالرس بھی اساتذہ کے ساتھ شا تھے گویا کہ جدید و قدیم فکر کا ایک حسین امتزاج تھا۔ بہرحال یہ دورہ بازآموزی بہت ہی فائدہ مند رہا۔ ایک ماہ ہمیں ایران میں رہنے ا ایرانیوں کی تہذیب و تمدن کو دیکھنے اور اساتذہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ ہمیں وزارت ارشاد و آموزش عالی اور ادارہ آسیہ و اوقیانو کی طرف سے دعوت دی گئی تھی لہذا وہاں کے کارکن ایرپورٹ پر ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ایرپورٹ پر بینارس لگے ہوئے " استادان شبہ قارہ ہند را گرامی می داریم " " بلبلان ہند را در گلزار ایران گرامی می داریم " اور تہران میں بھی جگہ جگہ اسی طرح کے بینارس ہوئے تھے۔ کہیں لکھا تھا " طوطیان شکر شکند ہند را گرامی می داریم " اور حقیقت میں ان لوگوں نے ہماری پذیرائی بھی اسی طرح کی بہت آرام سے رکھا اور ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا گیا۔ ایرانی دراصل ہندوستانیوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ ہماری کلاسیں دانش گاہ تربیت مدرسین میں ہوتی تھی۔ جہاں پر کلاس میں خواتین اور حضرات دونوں ہوتے۔ یہاں پر Co-Education کا طریقہ رائج ہے۔ خواتین مکمل حجاب میں ایک طرف ہوتی ہیں اور مرد دوسری طرف۔ طالبات کلاس میں سوال کرتے ہوئے یا اساتذہ کے سوال کا جواب دیتے ہو جھجکتی نہیں۔ ہماری مسئول یعنی انچارج خانم گوہری تھیں جو مرد اساتذہ کے مسئول آقائی گیلان نژاد کی عدم موجودگی میں ان کا کام بھی انجام د تھیں اور بعض وقت مکالمے کی کلاس بھی لیتی تھیں۔ دانش گاہ تربیت مدرسین میں کچھ قدیم اساتذہ جیسے آقائی جعفر شہیدی، آقائی کاظم دزفولی آقائی سبزواری، آقائی ضیاء الدین سجادی کلاس لیتے تھے اور مثنوی مولانا روم، شاہنامہ فردوسی، تاریخ ادبیات قدیم ایران کا درس دیتے تھے بعض جدید اساتذہ آقائی غلام رضا ستودہ جو روش تحقیق پڑھاتے تھے آقائی اصغر فردی، آقائی علی محمد سجادی، آقائی بھبودیان، آقائی مرزبان وغیر شعر امروز اور فارسی امروز کا درس دیتے تھے۔ کلاس کا سلسلہ صبح آٹھ بجے سے دس بجے تک اور پھر سہ پہر تین بجے سے شام آٹھ بجے تک ہوتا کبھی کبھی انھیں اوقات کے درمیان کسی ادارے میں دعوت ہوتی تو چلے جاتے۔ استاد محمد تقی جعفری صاحب جو بہت ہی مسن ہیں اور دانش کدہ تربیت مدرسین میں تشریف نہیں لاسکتے تھے اپنے گھر پر ہی مثنوی کا درس دیتے اور ہمیں سب کی ضیافت بھی کی جاتی۔ ادارہ صدا و سی T.V.) کیبساں ہوائی۔ وزارت خارجہ۔ کتاب خانہ ملی۔ اور تقریباً ہر وزارت کی طرف سے ہماری دعوت کی گئی۔ اس طرح ایک بار طالب علم بننے کا موقع ملا اور بہت مزا آیا۔ کلاس میں سب بہت ہی جوش و خروش سے بیٹھتے تھے۔ اگر کوئی چھٹی کا دن درمیان میں آجاتا تو تفر کے لیے لے جایا جاتا۔ ایک روز کاخ سعد آباد گئے جو رضا شاہ پہلوی کا محل ہے بس یہاں پر یہی خیال آیا۔

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نگہہ کن ہاں ایوان مدائن را اندیشہ عبرت دان

سامان تو سب موجود تھا لیکن صاحب خانہ کا پتہ نہیں تھا۔ اس میں بہت ہی عمدہ اور خوب صورت ظروف، فرنیچر، قالین غرض ہر جوں کی توں رکھی ہے۔ رضا شاہ کے بھائی کے محل کو فوجی نمائش گاہ بنادیا گیا ہے یہاں پر ہتیار اور تمام فوجی لباس وغیرہ کی نمائش کی گئی ہے شاہ کی ماں کے محل کو بھی جوں کا توں ساز و سامان کے ساتھ آراستہ نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہاں کے پارک بھی خاص دیکھنے کی چیز ہیں پارک کے ساتھ مختلف کھانے پینے کی چیزیں بھی فروخت ہوتی ہیں خصوصاً آئس کریم جس کو بستنی کہتے ہیں ان کی مرغوب غذا ہے۔ چائے تو

۔ہر وقت موجود رہتی ہے جو دودھ اور شکر کے بغیر ہوتی ہے شکر کی ڈلی (Sugar Cube) یا کوئی مٹھائی منہ میں رکھ کر چائے پی جاتی ہے۔ پارک جمشید اور پارک ملی یہ دونوں پارک بہت ہی خوب صورت ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

شمشاد و صنوبر کے درخت سرو کے ساتھ بہت ہی خوب صورتی سے لگے ہوئے ہیں۔ پارک جمشید میں قدرتی آبشار ہے جو کوہ دماوند سے نے والے پانی سے بنا ہے اور ایک چھوٹا سا تالاب بھی کوہ دماوند کے دامن میں ہے جس میں کشتی رانی کی جاتی ہے۔ کوہ دماوند کی خوب صورتی یکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم جس وقت ایران پہنچے موسم بہار کا آغاز تھا۔ پہاڑیوں پر برف پگھل رہی تھی نیلی نیلی پہاڑیوں پر چاندی کی رح پگھلتی ہوئی برف۔ میں تو کوہ دماوند کی وادیوں کی خوب صورتی میں کھو سی گئی۔ ایرانی سیر و تفریح کے بہت شائق ہوتے ہیں۔ پارک میں پلتے ہوئے خوب صورت بچے بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پارک لالہ بھی ایسا پارک ہے جو بہت دل کش ہے یہاں پر تفریح کے ساتھ ساتھ ریداری کا بھی انتظام ہے۔ یہاں پر جو دکانیں ہیں وہ مغازہ ملی یعنی گورنمنٹ شاپس ہیں اور ہر چیز کنٹرول دام پر ملتی ہے۔ کھانے پینے کی یزیں، کاسمٹکس، ماکولز، کپڑے، بیگس غرض ضرورت کی سب چیزیں یہاں ملتی ہیں۔

ہمارا کاروان مشہد مقدس بھی گیا ہم وہاں چار دن رہے۔ مشہد یونیورسٹی بہت بڑی اور خوب صورت ہے۔ وہاں کا کتاب خانہ بہت اچھا ہے۔ لیکن وقت اتنا کم تھا کہ صرف زیارت ہی ہو سکی۔ اس کتاب خانے کی نایاب کتابوں سے استفادہ نہیں کیا جاسکا۔ مشہد میں رہ ۔ہم فردوسی کا مزار دیکھنے کے لیے طوس گئے۔ فردوسی کا مزار بہت ہی پر فضا مقام پر ہے۔ یہاں ایک اونچا چبوترہ بنا ہوا ہے اور نیچے فردوسی زار ہے۔ مزار کے اطراف شاہ نامہ کے مختلف مرقعے اتارے گئے ہیں۔ جس میں فریدوں کی ضحاک پر فتح، رستم و افراسیاب، رستم و سہراب ی لڑائی وغیرہ کی تصویریں پینٹ کی گئی ہیں اور اس کے ساتھ مثنوی شاہ نامہ کے اشعار خوش خط لکھے ہوئے ہیں جو مختلف قسم کے خط میں ہیں۔ سی عمارت میں ایک طرف پہلوی سامان کی نمائش کی گئی ہے جس میں ہتیار، ظروف، لباس، زیور اور تصاویر رکھی گئی ہیں۔ روضہ امام رضا لیہ السلام میں آستانہ قدس کے نام سے ایک نمائش ترتیب دی گئی ہے جس میں مختلف قرآن، خطاطی کے نمونے، قالین، ظروف، ہتیار وغیرہ کھے گئے ہیں ان میں حضرت علیؑ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن بھی موجود ہے۔ خود روضہ امام رضا علیہ السلام کی رونق اس کی آرائش و زیبائش طلع زری و پچی کاری اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں پر یہ خاص بات ہے کہ دن اور رات کے کسی بھی حصہ میں ہم حرم امام رضا علیہ السلام جائیں ہر قت زواروں اور شمع محمدی کے پروانوں کا ایک ہجوم نظر آتا ہے۔ کسی بھی وقت یہ ہجوم کم نہیں ہوتا۔ ضریح اقدس کے نزدیک پہنچنا ایک بت بڑا مرحلہ ہوتا ہے۔ مشہد پہنچنے کے دوسرے دن ہم نیشاپور گئے جہاں امام غزالی کا مزار ہے۔ یہ عمارت زندان مامون رشید کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مامون رشید یہاں پر سادات کو قید کرتا تھا اور ان کو یہیں پر قتل کر دیا جاتا۔ اب بھی بہت سی عورتیں روز آکر یہاں آتی ہیں اور منتیں مانگتی ہیں شمعیں جلاتی ہیں۔ لیکن اس عمارت کی وضع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کبھی مسجد تھی۔ اس کے بعد خیام کے مزار پر گئے فریدوں نیشاپوری نے ایک مفصل کتاب خیام کے بارے میں لکھی ہے۔ آج کل ایرانیوں کا خیال ہے کہ خیام نے کبھی شراب نہیں پی س کے کلام میں جو شراب کا ذکر ملتا ہے وہ شراب معرفت ہے اور آقائی فریدوں کا بھی یہی خیال ہے۔ خیام کی قبر پر ایک خیمہ نما عمارت بنائی ئی ہے جو اس کی خیمہ دوزی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک باغ ہے جس میں اخروٹ۔ زرد آلو، آلبالو۔ کے درخت لگے ہیں س کی روشیں بہت ہی زیبائی سے بنائی گئی ہیں۔ اسی جگہ امام زادہ ابراہیم موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام کا مزار ہے اور امام زادہ محروق کا مزار بھی ہے جنھیں زندہ جلا دیا گیا تھا۔ جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے صاحبزادے تھے اسی مقام پر کمال الملک کا مزار بھی ہے اور یہیں نیشاپور میں رید الدین عطار کا بھی مزار ہے جو بہت بڑے صوفی شاعر گذرے ہیں۔ جن کی مشہور مثنوی منطق الطیر ہے۔ فرید الدین عطار کی آرام گاہ ہی کے یک حصے میں چھوٹی سی نمائش کا انتظام کیا گیا ہے جہاں ظروف، خطاطی اور مصوری کے نمونے، زیور، ہتیار وغیرہ رکھے گئے ہیں۔

نیشاپور میں ایک تفریح گاہ ہے جو باغ رود نیشاپور کہلاتی ہے۔ یہ ایک طرح کی ترسری ہے اور یہاں پر مختلف میووں کے درخت

بھی لگے ہوئے ہیں۔ درمیان میں بہت ہی خوب صورتی کے ساتھ روشنیاں لگائی گئی ہیں اور ان کیاریوں کے بیچ میں سے پانی کے بہنے کا انتظام کیا گیا ہے جو دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ یہاں شہتوت، زرد آلود، خوبانی وغیرہ کے درخت بھی ہیں۔

ایران میں تھیٹر کا بھی رواج ہے جس میں ناٹک دکھائے جاتے ہیں جو اصلاحی اور انقلابی قسم کے ہوتے ہیں۔ اس میں عورت اور مرد دونوں کام کرتے ہیں اور ان کی اداکاری بہت ہی منجھی ہوئی ہوتی ہے۔

ایران میں باوجود حجاب کے لزوم کے عورتیں ہر دفتر اور ہر ادارے میں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں۔ تہران میں ایک ادارہ فرہنگستان فاطمۃ الزہرا ہے جو عورتوں کی بہبودی کے لیے کام کرتا ہے۔ یہاں ایک مدرسہ بھی ہے جس میں عورتوں کو دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس ادارے میں تمام دنیا کی عورتوں کے کام کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ ہر ملک اور شہر کے لیے باضابطہ علاحدہ علاحدہ فائیل موجود ہیں جن میں دنیا بھر کے اخباروں کے تراشے لگائے جاتے ہیں۔ اس طرح انھیں اخباروں کی اطلاع کی بنا پر علم رہتا ہے کہ دنیا کی عورتیں کیا کر رہی ہیں ان کے حالات کیسے ہیں؟ یہ ادارہ بہت ہی تن دہی سے کام کر رہا ہے اس کی شاخیں تہران کے علاوہ ایران کے دوسرے شہروں میں بھی ہیں۔

قم میں دینی تعلیم کی دو بڑی یونیورسٹیاں مدرسہ حجتیہ و مدرسہ فیضیہ ہیں جن کے تحت عورتوں کے لیے مدرسہ فاطمۃ الزہرا اور مدرسہ خواہران ہے جہاں عورتوں کو دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں مختلف ممالک سے طالب علم آتے ہیں انھیں ہر ماہ شہریہ (Scholar Ship) دیا جاتا ہے جو گیارہ سو تومان ہوتا ہے اور دن میں دوپہر کا کھانا دیا جاتا ہے۔ یہ غذا اتنی ہوتی ہے کہ کسی ہندوستانی یا پاکستانی طالب علم کے لیے دو وقت کفالت کر سکتی ہے۔ جو شہریہ ملتا ہے اس سے اکثر طالب علم کتابیں خرید لیتے ہیں۔ شہریہ (قم میں روضہ معصومہ قم امام رضا علیہ السلام کی بہن) کے اطراف بازار ہے جہاں پر زیور، کتابیں، مختلف قسم کے کپڑے خاص طور پر مقنع اور چادریں، لباس وغیرہ فروخت کیے جاتے ہیں۔ قم میں آیت اللہ مرعشی کا کتاب خانہ ہے جس میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں جو مختلف زبانوں میں دینی موضوعات پر لکھی گئی ہیں اس کتاب خانہ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کتابیں ایک آدمی نے کس طرح جمع کیں۔ ایران میں پڑھنے لکھنے والوں کے لیے بہت سہولتیں ہیں۔ ان کی حکومت مدد کرتی ہے۔ اور کتابیں بھی چھپنے کا کسی نہ کسی طرح انتظام ہو جاتا ہے۔ استادوں کو عید نوروز کے موقع پر بطور عیدی ایک کثیر رقم دی جاتی ہے اور ان کے لیے لازم ہے کہ اس سے کتابیں خریدیں، ہر استاد کے گھر میں ایک اچھا خاصا کتاب خانہ موجود ہے جس سے وہ گھر بیٹھے اپنے منابع و مراجع ڈھونڈھ نکالتے ہیں جس سے درس و تدریس اور تحقیق دونوں میں بہت مدد ملتی ہے۔

علی دوانی صاحب سے بھی مجھے ملنے کا اتفاق ہوا جو بہت بڑے ادیب ہیں۔ انھوں نے تاریخ، دین اور ادب میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ہم کاری کے لیے سکریٹری مقرر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی زوجہ محترمہ، دختر اور داماد آپ کے پڑھنے لکھنے کے کاموں میں مدد دیتے ہیں خود ان کے مکان پر ایک بڑا کتاب خانہ ہے انھیں حیدرآباد اور اہل حیدرآباد سے دل چسپی ہے انھوں نے دوسرے شہروں کے اساتذہ کے ساتھ خاص طور پر مجھے بلوایا تھا اور یہاں کی علمی، ادبی، مذہبی سرگرمیوں کے متعلق بڑی دیر تک استفسار کیا اور بہت محبت اور شفقت سے پیش آئے۔

ایران کا کتاب خانہ ملی یعنی National Library دیکھنے کا موقع ملا جس کے ڈائرکٹر آقائی خاتمی ہیں۔ یہاں اکیس ہزار کتابیں اسلام شناسی اور ایران شناسی سے متعلق جمع کی گئی ہیں جس میں تین ہزار روسی، نو ہزار انگریزی، دو ہزار جرمن، تین ہزار لاطینی اور ایک ہزار ترکی زبان کی کتابیں ہیں۔ ان میں بعض کتابیں نادر و نایاب ہیں ان کتابوں کی فہرستیں انڈکس بکس تیار کی گئی ہیں۔ جو کتابیں شوکیس میں نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں ان میں شاہ نامے کا ایک قدیم ترین مطلا و مذہب نسخہ ہے جو مرزا احمد تبریزی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ صحیفہ سجادیہ (امام زین العابدین علیہ السلام سے منسوب دعاؤں کا مجموعہ)، عبدالرحمن جامی کا خود نوشتہ کلیات ہے۔ جس کی کتابت ۸۵۰ھ میں ہوئی۔ شاہ نامے کا اور ایک مخطوطہ جو نویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، عہد صفوی کا لکھا ہوا ایک مطلا و مذہب دیسی کاغذ پر خط طومار میں لکھا ہوا قرآن مجید ہے ایک ترجمہ قرآن جو علی رضا ہندوستانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۱۰۸۲ھ کا ہے جو نایاب ہے۔ ایک خط بخط اہم سلمہ دختر فتح علی شاہ، بکاغذ ترمہ

پر لکھا ہوا ہے۔ اس کتاب خانے کا ایک حصہ قلمی مخطوطات پر مشتمل ہے اور دوسرا اسلام شناسی اور ایران شناسی پر۔

کتابوں کا مفصل کیٹلاگ مضمون وار بنایا گیا ہے جو مطبوعہ ہے۔ یہاں ایران اور دوسرے ممالک کے قدیم و جدید نقشے بھی موجود ہیں۔ یہاں کی نادر کتابوں میں ایک سفر نامہ شارو افرنسیسوی کا لکھا ہوا ہے ایک فنون اسلامی کا البم ہے جو بہت ہی نایاب اور جاذب نظر ہے۔

دانش گاہ تہران کا کتاب خانہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا اس کتاب خانے کے نو طبقے ہیں یہاں پر Audio- Visual کا بھی انتظام ہے زیراکس اور مائکرو فلم بھی تحقیق کرنے والوں کے لیے فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کتاب خانے میں دس ہزار مخطوطات ہیں۔ سات سو ہزار چھپی ہوئی کتابیں ہیں یہ کتاب خانہ پورے ایران کے لیے حوالے(Reference) کی کتابیں فراہم کرتا ہے۔ اس کتاب خانے میں سب سے قدیم قرآن شریف کا نسخہ موجود ہے۔ دارا شکوہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب "حسنات العارفین" بھی یہاں موجود ہے۔ لب التواریخ الہندیا تواریخ الکتاب خط نستعلیق میں ہے جو سید محمد کی مکتوبہ ہے اور نارائن کمیڈ سرکار کو لاس میں لکھی گئی تھی۔ یہاں مختلف ہال ہیں جنھیں تالار کہا جاتا ہے جس کے نام تالار علامہ اقبال لاہوری، تالار علامہ طباطبائی، تالار ابو ریحان بیرونی وغیرہ ہیں۔ اٹلس، ڈکشنریاں اور انسائیکلو پیڈیا کثیر تعداد میں ہیں جو امانت نہیں دیے جاتے اور ریفرینس کی کتابیں امانت نہیں دی جاتیں۔ وہیں بیٹھ کر پڑھنا ہوتا ہے۔ کتابوں کی داد و ستد کے لیے کمپیوٹر کا انتظام ہے۔ دانش گاہ کی عمارت بہت ہی خوب صورت ہے۔ یہاں باغ لگے ہیں جن میں طرح طرح کے گلاب صنوبر و شمشاد کے درخت دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

یہ تو ہوئے وہاں کے تعلیمی و ثقافتی حالات اب کچھ وہاں کی عورتوں کے بارے میں بھی بتلادوں ایران کی عورتیں بہت ہی محنتی ہوتی ہیں۔ ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ گھر کا کام کاج خود انجام دیتی ہیں۔ اور ایک مشرقی عورت کی طرح گرہستی کا انتظام کرتی ہیں۔ حجاب ان کے کسی کام میں مانع نہیں ہوتا۔ وہ خریداری کرتی ہیں، اپنی ملازمت کا کام انجام دیتی ہیں، دکانوں پر سیل گرل کا کام کرتی ہیں اور بہت شائستگی سے بات چیت کرتی ہیں۔ مشاعروں میں مرد شاعروں کے ساتھ حصہ لیتی ہیں۔ سیمناروں میں حصہ لیتی ہیں۔ بچوں کی پرورش و نگہداشت کرتی ہیں مجھے دو چار دن ایک خاندان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تو ان کے رہن سہن کا بھی اندازہ ہوا وہ گھر بہت صاف ستھرا رکھتی ہیں البتہ میں نے دیکھا کہ وہاں مرد بھی عورتوں کے ساتھ کام کاج میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ جس وقت بیوی کھانا پکاتی ہے شوہر بچوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ یہ لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔ جب بھی کسی سے ملاقات کے لیے جاتے ہیں تو کچھ نہ کچھ تحفہ ساتھ لے جاتے ہیں اور وہاں سے واپسی میں میزبان ضرور کچھ نہ کچھ تحفہ دیتے ہیں۔ یہ لوگ پھل کھانے کے بہت شائق ہیں اور قدرت بھی اس معاملے میں فیاض ہے کہ ایران میں انواع و اقسام کے لذیذ میوے پیدا ہوتے ہیں۔ مہمان داری بہت دل کھول کر کرتے ہیں اور جیسا کہ اردو میں محاورہ ہے یہ لوگ مہمان کے سامنے بچھ جاتے ہیں۔ مجھے ایران جانے کے بعد اس بات کا احساس ہوا کہ ہم جس تہذیب کو بھول رہے ہیں وہ یہاں موجود ہے۔ بڑے چھوٹوں کا لحاظ کرتے ہیں اور چھوٹے بڑوں کا ادب اور گھر میں رہنے سہنے کا انداز بھی بہت شائستہ ہوتا ہے۔ میاں بیوی دونوں بھی ایک دوسرے کا لحاظ کرتے ہیں کوئی کام کرنے سے پہلے ایک دوسرے سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ عیدین اور کسی خاص موقعہ پر سب لوگ بزرگ خاندان کے ساتھ جمع ہوتے ہیں اور دن گذارتے ہیں۔ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ ویسے انفرادی خاندان کا رواج ہے۔ شادی کے دن ہی دولہا دلھن الگ گھر میں چلے جاتے ہیں۔ شادیاں بہت ہی سادہ اور اکثر مہمان خانوں میں ہوتی ہیں۔ تہران میں مجھے تین چار شادیوں میں شرکت کا موقع ملا دلھن خود اپنی موٹر چلاتی ہوئی اپنے نئے گھر جاتی ہے، میں نے دوسرے لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ دوسرے شہروں میں یہ رواج نہیں ہے۔ رسومات بھی نہیں ہوتیں رخصتی کے وقت دف بجاکر برات کو رخصت کیا جاتا۔ دلھن کو سفید لباس پہنایا جاتا ہے۔ یہ لباس نہایت ہی حسین اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ کھانے کا انتظام سب براتیوں کے لیے ہوتا ہے یہاں تحفہ دینے کا رواج ہے۔ دولہا سوٹ میں ہوتا ہے۔ یہاں ایک بات جو مجھے بہت بھلی لگی وہ یہ ہے کہ دعوتوں میں محمود و ایاز کا فرق نہیں ہوتا منسٹر ہو کہ چپراسی سب ایک ہی میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ یہاں کے کھانوں میں مرچ اور ترشی کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن یہ غذائیں بہت لذیذ ہوتی ہیں، ہم کو تقریباً ہر روز ایران کی ایک روایتی غذا دی جاتی تھی

جس کو یہ لوگ غذائی سنتی کہتے ہیں جس میں چلو کباب، جوجہ کباب، کشمش پلاؤ، شلہ زرد، کلہ پاچہ شامل ہیں۔ ہر روز ایک قسم کی آش دی جاتی تھی۔ یہ لوگ آش طرح طرح سے بناتے ہیں۔ کبھی اس میں مرغ ڈالتے ہیں، کبھی قیمہ، کبھی میکرونی وغیرہ اسکو غذا سے پہلے Appetiser کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بعض قسم کی آش بہت لذیذ ہوتی ہے اور بعض بعض جو ہمارے ذائقے سے میل نہیں کھاتیں منہ کو نہیں لگتیں ہر کھانے کے ساتھ میوہ ضرور ہوتا ہے۔

یہاں کے مقدس مقامات میں روضہ امام رضا علیہ السلام ہے جو بہت ہی خوش نما ہے اور کاشی کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ شہر قم میں امام رضا علیہ السلام کی بہن معصومہ۔ قم کا مزار ہے یہ بھی مرجع خلائق ہے۔ رے میں شاہ عبد العظیم امام رضا علیہ السلام کے بھائی کا مزار ہے۔ اس سے متصل ایک اور مزار ہے جو سید محمد طاہر امام زین العابدین علیہ السلام کے صاحب زادے کا ہے اور دوسری طرف شہزادہ حمزہ کا مزار ہے۔ اس سے متصل ایک بازار ہے جہاں ضرورت کی تمام چیزیں بہت سستی ملتی ہیں۔ اس سے کچھ دور پر ایک پہاڑ کے اوپر حضرت شہر بانو زوجہ امام حسین علیہ السلام کا مزار ہے جو یزدگرد سوم کی صاحب زادی تھیں۔ اس سال مجھے وہاں پر محرم کا پہلا عشرہ بھی کرنے کا موقع ملا۔ یہاں پر عزاداری پہلی محرم سے شروع ہوتی ہے۔ مختلف دفاتر اور اداروں میں کسی بڑے ہال میں ایک عزاخانے سے دوسرے عزاخانے ماتم کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ وہاں ذاکر ذکر کرتا ہے تبرک تقسیم ہوتا ہے اور پھر اسی طرح دیر گئے رات تک عزاداری ہوتی ہے۔ عزاخانے کو تکیہ کہا جاتا ہے۔ اس کو طغروں اور پرچموں سے سجایا جاتا ہے۔ یہاں پر تبرک بھی تقسیم کرتے ہیں۔ ماتمی دستوں کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔ سب سے آگے اس عزاخانے کا پرچم ہوتا ہے۔ جس عزاخانے سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کے بعد قندیلوں کی ایک ٹُلی ہوتی ہے اور اسکے پیچھے علم مبارک کی ٹُلی ہوتی ہے۔ پیچھے ماتم دار ہوتے ہیں جو بینڈ کی دھن پر بہت منظم طریقے پر ماتم کرتے ہیں۔ میں نے بینڈ رکھنے کی وجہ پوچھی تو کہا گیا کہ یہ طبل جنگ کی نشانی ہے۔ شب عاشور ہر گلی میں عزاخانوں کے سامنے اس ذبح عظیم کی یاد میں بکروں کو ذبح کیا جاتا ہے اور وہیں پر قصابی کا بیانہ لگا ہوتا ہے جہاں گوشت صاف کرکے یا تو بطور تبرک تقسیم کر دیتے ہیں یا صاحب استطاعت لوگ اس گوشت کے ساتھ تمام پکوان کا انتظام کرکے عزاداروں کی تواضع کرتے ہیں۔ عاشور کو تہران، قم، مشہد جیسے بڑے شہروں میں واقعات کربلا کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور لوگ دہاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔ مجھے تو یہ منظر کچھ عجیب سا لگا۔ تہران میں خیابان آذر بائیجان پر سب دستے اکٹھا ہوتے ہیں اور واقعات کربلا کو ڈرامے کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا کہ لوگ قاتلوں کا رول کس دل سے ادا کرتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ لوگ اداکار ہیں ان کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا یہ حسین کا کردار ادا کریں یا یزید کا۔ ایک بہت ہی معمر شخص نے حبیب ابن مظاہر کا کردار ادا کیا جو واقعی دل کو چھو لینے والی چیز تھی۔ ان کی اداکاری کا جو انداز تھا وہ بہت ہی قابل تعریف تھا۔

مجھ سے ایک سوال پوچھا گیا تھا کہ کیا ایران میں اردو زبان پڑھانے کا انتظام ہے۔ یہاں پر شعبہ اردو یونیورسٹی میں قائم ہے جہاں پاکستانی اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ بعض ایرانی اساتذہ اردو زبان سیکھنے کے بہت شائق ہیں۔ یونیورسٹی لائبریری میں بھی اردو زبان کی کتابیں موجود ہیں اور تبلیغات دین کے لیے بھی جو کتابیں چھپتی ہیں ان میں اردو زبان میں بھی کتابیں شائع ہوتی ہیں اور فروخت کی جاتی ہیں۔

غرض جو کچھ میں نے دیکھا ایک حسین خواب تھا جس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔

○ ○ ○

پروفیسر وحید اختر

تاریخ یورپ (۱۵۰۰ء تا ۱۸۷۱ء)

مصنفہ: سید علی محسن

یاد س بخیر ایک زمانہ تھا جب حیدر آباد میں ہر موضوع پر اردو زبان میں رواں دواں اور سلیس نثر میں کتابیں لکھنے والے اور ترجمہ کرنے والے بلامبالغہ سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے۔ یہ دور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس سے قبل اور اس کے بعد کا ہے۔ میں اس زمانے کو حیدر آباد کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا نشاۃ ثانیہ کا دور سمجھتا ہوں۔ عام طور سے اردو کی نشاۃ ثانیہ کی ابتدا اور پھیلاؤ کو علی گڑھ تحریک سے وابستہ کیا جاتا ہے لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ سر سید سے بہت قبل شمس الامرا نے حیدر آباد میں دارالترجمہ قائم کرکے ریاضیات اور مختلف سائنسی علوم کی بیسیوں کتابوں کے ترجمے کیے اور کروائے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے ہزاروں کتابیں ہر موضوع پر چھپیں حتیٰ کہ سائنس اور عمرانی علوم پر جدید ترین کتابوں کے تراجم تدریس کے مقصد سے کیے گئے۔ یہ سارا سرمایہ نذر آتش اور نذر طاق نسیاں ہو گیا۔ بغداد، قرطبہ، دہلی اور دوسرے علمی مراکز کے سرمائے کو تاتاریوں اور دوسری وحشی قوموں نے تباہ کیا جس کا ہم آج تک ماتم کرتے ہیں لیکن عثمانیہ کے سرمائے کی تباہی کے بڑی حد تک خود ہم ذمہ دار ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو یہ سرمایہ غیروں کی آتشِ غضب و حسد سے بچ سکتا تھا۔ یہ صرف اردو کا قومی نقصان نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی علمی زندگی کا بڑا سانحہ تھا۔ جامعہ عثمانیہ نے پہلی بار ایک مقامی اور قومی زبان کو اعلیٰ سائنسی اور تکنیکی تعلیم کا وسیلہ بنا کر آزاد ہندوستان کے تدریسی نظام کے لیے ایک شاندار مثال قائم کی تھی۔ آج جب کہ ہم مختلف علاقائی زبانوں اور ہندی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے تجربے کر رہے ہیں اگر اردو کی مثال زندہ ہوتی تو بہت آسانی ہوتی اور ہمیں اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے نہ پڑتے۔ اردو کی بدحالی اور کس مپرسی کا یہ حال ہے کہ ترقی اردو بورڈ اور ساہتیہ اکاڈمی کو دوسری زبانوں خصوصاً علوم کی کتابوں سے ترجمہ کرنے والے بھی دستیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ اس قحط الرجال میں اگر کوئی اعلیٰ درجہ کا علمی کارنامہ اردو زبان میں نظر آئے تو مسرت کے ساتھ لکھنے والے کی ہمت پر حیرت ہوتی ہے۔

اس وقت جو کتاب میری زیر نظر ہے وہ سید علی محسن کی تصنیف تاریخ یورپ عہد جدید ہے۔ سید علی محسن جامعہ عثمانیہ کے زائدہ اور پروردہ تھے۔ وہ تیس سال سے زائد جامعہ عثمانیہ کے مختلف کالجوں میں تاریخ کی درس و تدریس کرتے رہے۔ مجھے بھی ان کی شاگردی کا شرف انٹر کی طالب علمی کے زمانے میں حاصل ہوا۔ میں اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج میں سائنس کا طالب علم تھا جہاں سید علی محسن اور عاقل علی خاں صاحب تاریخ تمدن عالم جو ایک لازمی مضمون تھا وہاں پڑھاتے تھے۔ آج بھی ان کی نرم آواز، متین لہجہ اور پرانے عالموں کی طرح لیے دیے رہنے کا انداز اچھی طرح یاد ہے۔ ان کی زندگی میں ان کی جو تصانیف شائع ہوئیں ان میں خصوصیت سے تاریخ دستور انگلستان اور زوالِ دولت قطب شاہیہ قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں تحقیقی کارنامے ہیں۔ ان کے دستور انگلستان کی عہد بہ عہد ترمیموں اور تبدیلیوں کی تاریخ مرتب کرنا بجائے خود جان جوکھوں کا کام ہے لیکن سید علی محسن اس تحقیقی فریضے سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے۔ ان کا دوسرا تحقیقی مقالہ

مطالعہ قطب شاہیوں کے زوال پر ہے۔ قدیم حیدرآباد کی تہذیب و ثقافت اور عروج کے المیہ کی یہ تحقیق بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

انھوں نے اپنی زندگی میں تاریخ دستور انگلستان کے تکملے کے طور پر یورپ کے عہد جدید کی تاریخ لکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ کام اتنا وسیع تحقیقی مطالعہ چاہتا تھا کہ دستور انگلستان کی تاریخ اس کے ایک ضمیمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی حالاں کہ انھوں نے اسے نظر ثانی کے ساتھ مرتب کر دیا تھا۔ حال ہی میں ان کے بیٹے ڈاکٹر سید جعفر حسن (مقیم امریکہ) کی سعی بلیغ اور قدیر زماں کے پر خلوص انصرام و اہتمام نے اس فراموش شدہ کارنامے کو کتاب کی شکل دے کر کتابت و طباعت سے آراستہ کر کے اہل نظر کو دعوت مطالعہ دی ہے۔ اردو کی اس ناپرسی کے دور میں اردو والوں سے یہ توقع تو کم ہے کہ وہ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور قرار واقعی اس کی قدر کریں گے۔ اس وقت اچھی اور معیاری اردو پڑھنے والوں کا قحط ہے پھر کسی علمی موضوع پر ایک اچھی کتاب کا مطالعہ بڑی وقت نظر چاہتا ہے۔ ہمارے مطالعہ کرنے والوں کا دائرہ شاعری، افسانہ اور ناول تک محدود ہو گیا ہے حالاں کہ کوئی زبان جب تک علمی نثر کو فروغ نہ ہو، ادب کا مکمل ابلاغ کا حق بھی ادا نہیں کر سکتی۔ ہم اس نکتہ سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ خدا کرے کہ اردو دانوں کو سید علی محسن کی اس تحقیقی کتاب کے مطالعے کا شوق اور اس کی قدر کا حوصلہ عطا ہو۔ کتاب کی ایک بڑی خوبی اس کی سلیس اور رواں دواں زبان ہے جس میں ادبیت کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ صرف تاریخ کی ایک تحقیقی کتاب نہیں ایک ادبی کارنامہ بھی ہے۔ عالمی تاریخ کا دور وسطیٰ مسلمانوں کے عظیم الشان سیاسی، تہذیبی اور علمی کارناموں کا دور تھا۔ جس وقت یورپ عہد ظلمت میں بربریت کا شکار تھا مسلمانوں نے یورپ میں علم کی شمعیں جلائیں اور تہذیب کی شان دار عمارتیں کھڑی کیں۔ اسپین اور پورے جنوبی یورپ پر اسلامی تہذیب کا اثر اتنا نمایاں ہے کہ اس سے انکار صرف کم نظری اور بددیانتی کی دلیل ہے۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا محرک اسلامی علوم سے واقفیت اور مسلمانوں کی تہذیب سے آگاہی تھی۔ سید علی محسن نے اپنی کتاب کا آغاز اسی زمانے سے کیا ہے۔ ابتدائی ابواب اسپین کے عروج سے متعلق ہیں جہاں مسلمانوں کا کئی صدیوں تک نہ صرف سیاسی بلکہ علمی اور تہذیبی تسلط بھی رہا۔ اسلامی دور میں اگرچہ کلیسا کا سا کوئی ادارہ نہ تھا لیکن مسلمانوں نے شعوری طور پر سیکولر علم کی تشکیل اور ترقی میں ضروری کوشش نہیں کی تھی۔ یورپ میں جب کلیسا اور اسٹیٹ کی باہمی رقابت اور کشمکش شروع ہوئی تو مختلف علوم بھی چرچ کی گرفت سے آزاد ہوئے۔ اس سلسلے میں لوتھر، زونگلی اور کالوں اور دیگر مصلحین مذہب نے کلیسا کے خلاف بغاوت کر کے نہ صرف مذہبی بیداری پھیلائی بلکہ مختلف قومیتوں کی تشکیل و عروج میں بھی موثر رول ادا کیا۔ انگلستان کی تحریک اصلاح اور اینگلیکن چرچ اسی سلسلے کی شاخیں ہیں۔ ان اصلاحی تحریکات سے سید علی محسن نے ایک باب میں مفصل بحث کی ہے۔ دوسرے ابواب میں یورپ کے مختلف ملکوں کی باہمی رقابتوں اور کشمکشوں کی تفصیل ہے۔ کالونیلزم کے دور میں یورپ کا ہر ملک جنگی، معاشی اور تجارتی برتری کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ یہیں سے مشرق کا زوال شروع ہوتا ہے۔ اہل مشرق ان میدانوں میں اس لیے پیچھے رہ گئے کہ انھوں نے تجربیاتی اور اطلاقی سائنسوں (Applied Sciences) پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ برٹرنڈ رسل نے صحیح کہا ہے کہ ہر دور میں سائنس کی ترقی کے دو اہم عوامل رہے ہیں۔ جنگ اور تجارت۔ یورپ میں ان ہی دو پر توجہ مرکوز تھی۔ آہستہ آہستہ یورپ نے مشرق کو اپنے اثر اور بعد میں چل کر تسلط میں لے لیا۔ اس سلسلے میں اس کتاب کا باب "مسئلہ مشرق" آج کے حالات سے کافی مناسبت رکھتا ہے۔ روسیا اور چیچنیا کا جو مسئلہ آج ہے سید علی محسن نے کئی سال پہلے اس کی پیش قیاسی کر لی تھی۔

(آگے ص ۳۰۳ پر)

کے۔ ایس۔ شفیق

مطالعہ
(تلخیص و تبصرہ)

زندہ رود.... حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور
(جسٹس جاوید اقبال کے تاثرات قلبی)

شاعرِ مشرق کے فرزند جسٹس جاوید اقبال نے زندہ رود کے عنوان پر اپنے بین الاقوامی شہرت یافتہ والد محترم شاعر و مفکر حضرت علامہ اقبالؒ کے حالات زندگی، علمی ادبی و شاعرانہ کمالات، معاشرتی و سیاسی احساسات و اقدامات پر چار جلدوں میں مستند و مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ جلد اول حیات اقبال کے تشکیلی دور کا جائزہ لیتی ہے۔ کتاب کا عنوان "زندہ رود" خود ایک دلچسپ پس منظر رکھتا ہے۔ مصنف جاوید اقبال فرماتے ہیں کہ زندہ رود، نام اقبال اپنے لیے خود جاوید نامہ کر رکھا ہے۔ زندہ رود کے معنی ہیں مسلسل بہتی ہوئی حیات آفرین ندی۔ یہ نام اس لیے منتخب کیا گیا کہ اقبال کی حیات دراصل ان کی فکری زندگی کا ارتقا ہے جو ایک مستقل حال میں رواں دواں ہے اور جسے موت نہیں چھو سکی۔

زندہ رود نام بھی اقبال نے غالباً آنحضورؐ کے تتبع میں اپنے لیے چنا۔ اقبال جرمن شاعر گوئٹے کے بڑے مداح تھے اور خود گوئٹے قرآنی تعلیمات اور حیات طیبہ سے بے حد متاثر تھا گوئٹے نبوت کی تشریح کے سلسلے میں آنحضورؐ کے لیے حیات آفریں جوئے آب کی تشریح استعمال کرتا ہے جس کا کام بہت سے ندی نالوں کو اپنے آغوش میں لے کر سمندر یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانا ہے۔ اقبال چوں کہ آنحضورؐ کو انسان کامل سمجھتے تھے اس لیے ان کے نزدیک ہر مسلمان کے لیے آنحضورؐ کے نقش قدم پر چلنا فرض تھا اور اسی جذبے کے تحت انھوں نے جاوید نامہ کے روحانی سفر کے لیے نام زندہ رود منتخب کیا۔

زندہ رود کی تصنیف انشا پردازی، سوانح نویسی یا شاعر مشرق کے افکار کی عکاسی یا گزرے ہوئے واقعات اور حالات کا مصنف کی طرف سے محض اظہار یا تبصرہ نہیں بلکہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت اقبال کے انتقال کے تقریباً چالیس سال بعد جب کتاب ضبط تحریر میں لائی جارہی تھی تب عالم رویا میں مصنف کو شخصیت زیر بحث (علامہ اقبال) نے چند باتوں سے روکا۔ چند ہدایات دیں اور وعدہ کیا کہ آئندہ بھی اس خصوص میں ہدایات دیے جائیں گے۔ مصنف جاوید اقبال اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ "میں مطالعے کی خاطر مواد اکٹھا کرنے لگا۔ اس تحقیق کے دوران ایک دن میں نے اپنی بیوی سے ازراہ مذاق کہا کہ دیکھو کشمیری پنڈتوں (جواہر لعل نہرو وغیرہ) نے ہندوستان کو سیاسی آزادی دلوائی اور آزاد مسلم ریاست یعنی پاکستان کے قیام کا ابتدائی تصور بھی کشمیری پنڈت (علامہ اقبال) ہی نے دیا۔ سو ان دو پنڈتوں کا آپس میں جھگڑا معلوم ہوتا ہے۔ علامہ اقبال ان مفکرین و سیاست دانوں میں تھے جنھوں نے سب سے پہلے مسلم اکثریتی علاقوں میں مسلمان ریاست پاکستان کے قیام کی پیش بینی اور توقعات ظاہر کی تھیں۔ اقبال کا کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے جد اعلیٰ تقریباً ڈھائی سو سال قبل مشرف بہ اسلام ہوئے تھے گوت (یعنی قبیلہ) ان کی سپرو (Sapru) تھی۔" جسٹس جاوید اقبال اس بات میں مزید لکھتے ہیں کہ "میں خوابوں یا ان کی تعبیر کا زیادہ قائل نہیں البتہ میری بیوی ان باتوں کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ میں نے اقبالؒ کو کبھی خواب میں دیکھا ہے مگر اس رات انھیں خواب میں دیکھا۔ دیکھتا ہوں کہ میں جاوید منزل کی چھت پر بیٹھا ہوں ساتھ ہی منڈیر پر سفید

کاغذوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ اقبال بنیان اور تہمد میں ملبوس ایک طرف سے ظاہر ہوتے ہیں اور حسب عادت خراماں خراماں چلتے ہوئے میرے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے چہرے پر خفگی کے آثار ہیں۔ مجھ سے انگریزی میں پوچھتے ہیں کہ تم کیا لکھتے رہتے ہو؟ میں جواب دیتا ہوں کہ اپنی طرف سے تو ہمیشہ میری یہی کوشش رہی ہے کہ آپ کے افکار صحیح طور پر لوگوں تک پہنچائے جائیں۔ فرماتے ہیں خیر اس بارے میں میرے تاثرات تمھیں کل معلوم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد یک لخت خواب کا منظر تبدیل ہو جاتا ہے اور میں کسی گھنے درخت پر چڑھا اس کی شاخوں میں لگے ہوئے بہت سے کاغذ کے پرزے اکٹھے کر رہا ہوں۔ میری مدد کے لیے کوئی اور شخص بھی وہاں موجود ہے لیکن میں اسے شناخت نہیں کر سکا۔ البتہ اس سے شکایتاً کہہ رہا ہوں کہ عجیب بات ہے میں ان کے افکار کی تعبیر کے لیے اتنی محنت کر رہا ہوں لیکن ان کی تسلی نہیں ہوتی۔"

"اس اثنا میں میری آنکھ کھل گئی۔ رات کے ساڑھے تین بجے تھے خواب میرے ذہن میں تازہ تھا اس خیال سے کہ مبادا صبح تک بھول جاؤں خواب قلم بند کرنا چاہا۔ میری بیوی بیدار ہو گئیں میں نے انھیں خواب سنایا ان کا خیال تھا" کہ کاغذ کے پرزے سمیٹنے کی تعبیر تو یہی ہے کہ آپ آج کل ان کے شجرہ نسب کے متعلق تحقیق میں مصروف ہیں البتہ آپ کی کسی بات پر وہ ناخوش ہیں۔" اگلا سارا دن میں نے کسی اشارے کے انتظار میں گزارا لیکن کوئی پیغام یا اشارہ نہ ملا۔ میں نے پڑھنے کے لیے الماری میں سے کوئی کتاب لینی چاہی اور میرے ہاتھ "روزگار فقیر" جلد دوم لگی اور میں نے غیر ارادی طور پر اسے کھولا۔ اچانک میری نگاہیں کتاب کے صفحے ۱۲۱ پر جم گئیں میرے سامنے اقبال کا ایک قطعہ تھا جس میں ارشاد ہوا ہے:

بت پرستی کو میرے پیشِ نظر لاتی ہے — یاد ایام گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبال — کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے"

اس طرح علامہ اقبال نے اپنے مصنف صاحب زادے تک اپنے تاثرات پہنچا دیے تھے کہ انھیں کشمیری پنڈت کہلانا کتنا ناگوار تھا ابتدائی زندگی میں تو انھیں وطنیت اور قومیت سے بہت لگاؤ تھا لیکن انگلستان اور جرمنی میں قیام کے زمانہ تعلیم میں ان کے خیالات نے پلٹا کھایا اور سمجھ میں آیا کہ قوم، نسل، رنگ، زبان اور جغرافیائی حد بندیوں سے ماورا صرف مذہب ایمان و عقیدہ کا اشتراک ہے اور اس اشتراک میں مختلف قومیں اور ذاتیں سما سکتی ہیں۔ اسلام میں اشتراک ایمان کی بنیاد پر اتحاد انسانی کا تصور جس طرح نسل رنگ یا زبان کی عصبیتوں کو مٹاتا ہے اسی طرح علاقے یا وطن کی قید سے آزاد ہے۔ حیات طیبہ سے ظاہر ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے آبائی وطن مکہ سے اپنے ایمان کے تحفظ کی خاطر ہجرت کی اور مدینے پہنچ کر مہاجرین و انصار کو ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک دوسرے کو اخوت کے رشتے میں منسلک کیا گویا مدینے میں قائم کردہ ملت اسلامیہ کا انحصار اتحاد وطن اور وطنیت پر نہیں بلکہ اشتراک ایمان کے اصول پر تھا اور ہر وہ سرزمین اس کا وطن قرار پائی جس میں مسلمان اشتراک ایمان پر متحد ہو کر اسلامی معاشرہ قائم کریں۔

اقبال کے طرز فکر اور زاویہ نگاہ کی اس غیر معمولی تبدیلی کا مظاہرہ ان کی انگلستان اور یورپ کی روانگی سفر اور واپسی سفر کے دوران تاثرات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جاتے وقت وہ وطنی قومیت کے نشے میں سرشار تھے اور جب ان کا جہاز اٹلی کے ساحل کے قریب سے گزرا تو انھوں نے تعظیماً ارشاد کیا:

ہرے رہو وطن مازنی کے میدانو — جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں

مگر برخلاف اس کے انگلستان میں ابھی دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ رفتہ رفتہ ان کے سامنے وطنی قومیت کے انسان دشمن اور تاریک پہلو نمایاں ہونے لگے اور احساس ہوا کہ انسان کا کسی مخصوص علاقے میں پیدا ہو کر کسی مخصوص نسل رنگ یا زبان سے تعلق رکھنا

محض ایک امرِ اتفاقی ہے جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ اسی اتفاق پر اس کا تکبر کرنا ایک مخصوص انسانی گروہ یا خطہ زمین سے محبت کرنا اور دنیا بھر کے دوسرے انسانوں سے نفرت کرنا اور ان کا استحصال کرنا، ان کو مغلوب کرنا کسی بھی اعتبار سے خواہ مذہبی، اخلاقی اور روحانی ہو جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ یوروپی قوموں کے گروہ عسکری طاقت کے بل بوتے پر نہ صرف ایشیائی اور افریقی قوموں کا استحصال کر رہے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے خلاف بھی صف آرا ہو گئے ہیں۔ ہندوستان پر انگریزوں کا، بلجیم جیسے چھوٹے ملک کا، کانگو جیسے وسیع و عریض ملک پر قبضہ، گوا پر پرتگال کا قبضہ، مشرقِ وسطیٰ پر فرانس کی جارحیت اور استحصال نے ان کے نظریات میں تبدیلی لائی اور ان کے دل میں مغربی استعماریت سے نفرت پیدا ہو گئی۔ ملوکیت یا وطنیت کے مغربی تصور کے خلاف ردِ عمل کا یوں برملا اظہار ہوا:

یار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

ساری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ں کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

ابتدا میں علامہ اقبال صرف اردو ہی میں شعر کہتے تھے ان کی فارسی شاعری کی ابتدا بقول سر عبدالقادر یوں ہوئی کہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی۔ انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ سوائے ایک آدھ شعر کے فارسی میں شعر گوئی کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے وہ فارسی اشعار ہی موزوں کرتے رہے اور فارسی میں دو غزلیں تیار ہو گئیں جو انھوں نے مجھے (جاوید اقبال) سنائیں۔ اس کے بعد طبیعت کا رخ فارسی شعر گوئی کی طرف ہو گیا۔ "انگریزی ادب سے شناسائی کے سبب سے اقبال شیکسپیر کے علاوہ۔ ملٹن، ورڈز ورتھ، شیلی، بائرن، براؤننگ، ٹینی سن، ایمرسن، رابرٹ اور لانگ فیلو وغیرہ سے متاثر ہوئے تھے۔ فرانسیسی ادب کے شہ پارے بھی ان کی نظر سے گزرے لیکن جرمن زبان سے دلچسپی کے باعث وہ جرمن ادب سے زیادہ متاثر ہوئے اور ہائیڈل برگ میں قیام کے دوران جرمن ادب کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا۔ اقبال کے ملاقاتیوں میں سر عبدالقادر، غلام بھیک نیرنگ، جسٹس شاہ دین، میاں شاہ نواز، فضل حسین، میر محمد شفیع، خواجہ حسن نظامی، مولانا آزاد، مولانا حالی اور عطیہ فیضی قابلِ ذکر ہیں ان سبھوں سے اقبال کے گہرے مراسم تھے۔

حضرت اقبال کے استادوں میں شمس العلما میر حسن، حضرت داغ دہلوی اور پروفیسر آرنلڈ قابلِ ذکر ہیں۔ جب اقبال کو سر کا خطاب دیا جانے والا تھا تو ان کے ایما اور اصرار پر ان کے استاد محترم میر حسن صاحب کو بھی شمس العلما کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ پروفیسر آرنلڈ نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ میں بھی ان کے استاد اور ہمدرد۔ ان دونوں کے مابین خلوص کے باوجود اقبال آرنلڈ کی بہ حیثیت انگریز تعریف نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ان کا مطمحِ نظر اور رویہ مشرق بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ ہی تھا۔ انگریز دوسری یوروپین قوموں کی طرح مشرقی ممالک کو پسماندہ رکھ کر ان کے استحصال کیے جانے کو جائز و حق بجانب سمجھتے تھے اور انسانی ہمدردی کا شائبہ تک نہ رکھتے تھے۔

علامہ اقبال کو احساس تھا کہ انگریز ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کر رہے ہیں اور اس وجہ سے مسلمان معاشی و معاشرتی ابتری کا شکار ہیں۔ شاعرِ مشرق اپنے کلام و پیام کے ذریعے باشندگانِ ملک کی ہمہ جہتی بہتری و برتری کے خواہاں و کوشاں رہتے۔

o o o

ڈاکٹر بیگ احساس

مطالعہ

آخری داستان گو

(مصنف: مظہر الزماں خاں)

آخری داستان گو مظہر الزماں خاں کی تازہ تخلیق ہے۔ یہ نئی الف لیلیٰ ہے۔ دراصل یہ مظہر الزماں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں مختلف کہانیاں ہیں جنھیں مظہر نے جوڑ دیا ہے۔ ان کہانیوں کے عنوانات بھی ہیں۔ سانپ ڈسا آدمی، سگریٹ والا، شہرزاد ایسے کردار ہیں جو ان کہانیوں میں ربط پیدا کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ہی کہانی ہے جس کے مختلف عنوانات دیے گئے ہیں۔ جب سے مظہر نے قلم پکڑا ہے وہ ایک ہی کہانی لکھ رہا ہے انسان اور کائنات کے اسرار کی کہانی ۔۔۔۔ جو ازل سے ابد تک زنجیر کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے

"دراصل نئی کہانی ازل کی شکل کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے کائنات اور انسان کے اسرار کی تلاش اور پہچان کی صورت کا ایک منظر ہے۔"

یہ کہانیاں اپنا ایک الگ سا وجود بھی رکھتی ہیں اور سب مل کر ایک کہانی بھی بن جاتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کا اسلوب ایک ہے۔ یہ اسلوب مظہر کی کہانیوں کا شناخت نامہ ہے۔ کوئی دوسرا فن کار شاید ایسا نہ کرسکے کیوں کہ ایک ہی اسلوب میں اتنی ساری کہانیاں لکھنا ممکن نہیں۔ مظہر نے اپنی کہانیوں کا موضوع زمین کو بنایا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"ہماری پیدائش خود زمین کا ایک بیہودہ ہے اور ہم سب خواب میں جاگتے ہوئے کردار ہیں لہٰذا بیدار ہو جاؤ اور میری سچہ دار کہانی کو غور سے سنو کہ اس کے تمام کردار الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔" (ص ۸۰۰)

"آخری داستان گو" کا بنیادی استعارہ بیداری ہے اور ساری کہانی بیداری اور نیند کی کشمکش ہے۔ سانپ ڈسے ہوئے آدمی پر غنودگی طاری ہے اسے بیدار رکھنے کے لیے کہانیاں سنائی جاتی ہیں کیوں کہ بیداری ہی میں وجود کی سلامتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اتنا سو چکے ہیں کہ ازل سے آج تک کوئی مخلوق اتنا نہیں سوئی۔ اس لیے ہم خالی ہو کر رہ گئے ہیں اور اس قدر خالی ہوگئے ہیں کہ ہمارے اندر اب کچھ باقی نہیں رہا حتیٰ کہ ہمارے اطراف کی وہ ساری چیزیں بھی غائب ہو گئی ہیں جو ہم نے سونے سے پہلے رکھ کر چھوڑی تھیں۔ اس لیے بیدار ہو جاؤ کہ بیداری ہی ہمارے وجود کی سلامتی ہے۔" (ص ۔ ۲۲)

یہ نیند کیا چیز ہے اور بیداری کسے کہتے ہیں خود مظہر الزماں کے لفظوں میں:

"نیند کیا چیز ہے اور بیداری کسے کہتے ہیں؟ ہمارے دانش ور آج تک نہیں سمجھ سکے لیکن اس خاکسار کا خیال ہے کہ نیند ایک ایسا خواب ہے جس میں زندگی کانچ کے رنگین ٹکڑوں پر رقص کرتی ہے اور بیداری ایک ایسی ٹھوکر ہے جو غلط پاؤں پر لگ جائے تو سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔" (ص ۔ ۱۱۶)

وہ سوئے ہوئے ذہنوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے اور بیدار کرنے کے لیے وہ کہانی سناتا ہے۔ دستکیں اس کی ہتھیلیوں میں چھپی ہوتی ہیں۔ مظہر کی یہ کہانی ایسی ہی دستک ہے جو وہ اونگھتی ہوئی صدی کو بیدار کرنے لگا رہا ہے کہانی پہلی لاش، پہلا قتل، پہلی چیخ اور پہلے ماتم والے کندھے اور پہلی زمین پر دوڑنے کے عمل سے شروع ہوتی ہے۔ یہ قابیل کی کہانی ہے جس کے کندھوں پر اپنے بھائی کی لاش رکھی ہے۔ یہ

لاش زمین کا پہلا نوالہ ہے۔ پھر منظر تیزی سے بدلتے ہیں۔ کالا ہوا مرغ اس کار ستا ہوا زخم ہے۔ کیوں کہ درد کا احساس ہی زندگی ہے اور ہی اس کی زندگی کا جواز اور اس کہانی کا سفر ہے۔ ہتھیلیوں سے خون بہتا ہے، نوح کی کشتی، اور پھر زندگی کی تلاش۔ کہانی "تحسین" شروع ہوتا ہے۔

"پھر کیا کیا جائے کہ ہم گھر کے اندر دیکھے بغیر رہ بھی نہیں سکتے کیوں کہ تلاش ہمارے خمیر میں ڈال دی گئی ہے اور خواہشیں اپنی ں مضبوط کر چکی ہیں" تلاش اور خواہشات قتل تک لے جاتی ہیں اور منڈیر پر کوے کی دی ہوئی کدالیں لٹکنے لگتی ہیں۔

کہانی بڑھتی ہے تو ہابیل قابیل سے نوح تک، یاجوج ماجوج سے ابابیلوں تک سفر طے کرتی ہے۔ اور "زمین پر ٹھہری ہوئی رات" ۔ آتے آتے اپنی سالمیت اور بقا کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے زمین کے ٹکڑے کی کہانی ہے جہاں مخصوص گروہ کی شناخت ختم کی جا رہی ۔ ان کے چہرے پیڑ کی چھال پر پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنا چہرہ تلاش کرتا ہے جو جلد ہی مل جاتا ہے لیکن انگلی شہادت سے انکار کر دیتی ہے اور ، کر زمین پر گر جاتی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا وجود غائب ہو چکا ہے اور اس کی مٹی زمین پر پڑی ہے۔

"دھند اور بستی" میں ان عورتوں کی کہانی بیان کی گئی ہے جنھوں نے دہلیز چھوڑ دی تھی ادھر ادھر بھٹک کر جب وہ بچہ گود میں لیے ں آتی ہیں تو اپنا گھر بھول جاتی ہیں۔ وہ سب پچھتاتی ہیں کہ ہم سبھوں نے اپنی اپنی دہلیزیں چھوڑ کر بڑی بھول کی۔

"اگلے موسم کا انتظار" زمین چھوڑنے والوں کی کہانی ہے۔ "پنبہ ابر میں شمر کی آنکھ" آسمان، زمین اور تخم ریزی کے رشتے کی کہانی ۔

بار بار انسان آسمان سے اپنے ازلی رشتے کو بھول جاتا ہے۔ وہ مفاد پرست ہو جاتا ہے۔ "دھوپ کے پرندے" کا وہ خود ہی تعارف اتا ہے کہ یہ اس دیس کی کہانی ہے جہاں ٹھٹھری ہوئی قوم سردی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مسلسل جد و جہد کر رہی ہے لیکن چند مٹھی لوگ اپنی سرخ مٹھیوں میں سنہری دھوپ چھپائے بیٹھے ہیں" اشارے واضح ہیں وضاحت کی ضرورت نہیں۔ زوال آمادہ (آمدہ) زمین پر ی دستک "منحوس زمین کی کہانی ہے جو ختم ہونے والی ہے۔ وہ اس زمین کو چھوڑ دینے کا مشورہ دیتا ہے۔ "جس زمین پر بچے نیند میں چونکتے ، ڈرتے، روتے اور خواب میں آپ ہی آپ باتیں کرنے لگتے ہیں، ان کے بستر ان زمینوں سے اٹھا کر دوسری پر سکون زمینوں پر بچھا دینا ہے۔"

"بھوکا" اور "پتھر میں بیج" سے وہ ماضی سے حال میں آجاتے ہیں۔ "پتھر میں بیج" ٹسٹ ٹیوب بے بی کی کہانی ہے۔ یہ ایک مجرد عورت ہانی ہے جو اپنے اندر بیج جمع کرتی جاتی ہے۔ ہر بیج کی ایک الگ کائنات ہے اور کائنات و فطرت کو اس نے شیشیوں کے مرتبانوں میں بند یا تھا۔ جب وہ درد سے بے چین ہو جاتی ہے اور اس کے پیٹ کا ایکس رے کیا جاتا ہے تو اس کے اندر پورا ایک جنگل اگا ہوا تھا۔ مظہر کہتا ، "جب کوئی فطرت سے ہٹ کر چلتا ہے تو اندر سے خالی ہو جاتا ہے۔"

"چھوڑا ہوا گھر" اور "داغ مین" مسلسل کہانیاں ہیں۔ یہ انسان کی بے حسی کی تصویر ہے۔ بچوں سے، افزائش نسل سے بے حسی -- "عجائب خانے" میں سب ننگے ہیں ----- اور ایک قطار میں کھڑے ہیں۔ "دنیا" ان انسانوں کی کہانی ہے جن کے پیر ہمیشہ چادر سے باہر جاتے ہیں۔

"چوتھی دنیا" خوب صورت کہانی ہے۔ اس میں کھرا ہونے لگتا ہے۔ مظہر کی جزئیات نگاری اس کہانی میں نقطۂ عروج پر ہے۔ "لونگھو" ں کی پیدائش سے موت تک کے واقعات کو بیان کرتی ہے۔ کئی کہانیوں کو سموئے ہوئے یہ کہانی ابھی جاری ہے اس کا اختتام اس جگہ ہوا ، جہاں ابھی آخری زمین کی کہانی بیان کرنا باقی ہے ---- کردار گھڑی دیکھتا ہے تو گھڑی کے کانٹے غائب ہیں۔

مظہر کی یہ کہانی (کہانیاں) زماں اور مکاں میں مقید ہیں۔ وہ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل میں سفر کرتا جاتا ہے۔ اس کے پاس

وقت ایک زمانے کی رو ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات ہے۔۔۔۔ وہ وقت کو ہماری سانسوں کی آمد و رفت کا سلسلہ سمجھتا ہے۔ وہ وقت کو خدائے لم یزل کی سانسوں کی آواز سمجھتا ہے۔

مظہر کی کہانیوں سے اقتباسات اس لیے بھی پیش کرنا ضروری ہے کہ اس کی کہانیاں انھیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں چھپی ہیں۔ اس کی کہانیوں سے مجموعی تاثر اخذ کرنا مشکل ہے۔ یہی جملے لطف دیتے ہیں۔ یہ ٹکڑے جگنوؤں کی طرح چمکتے ہیں پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ان جگنوؤں کی روشنی میں آپ جتنا بھی راستہ طے کر سکیں کر لیں۔۔۔۔ مظہر کا فن خوب صورت تصویر بنا کر ٹکڑے ٹکڑے کرکے بکھیر دینے کا فن ہے۔ اب اگر ان ٹکڑوں کو جوڑ کر تصویر بنا سکیں تو آپ کہانی تک پہنچ جاتے ہیں۔۔۔۔ ورنہ پھر ٹکڑے جوڑتے جوڑتے الجھ کر رہ جائیں گے۔

مظہر کی کہانیاں سانپ سیڑھی کا کھیل ہیں۔ کبھی اچانک آپ بہت اونچائی پر منزل سے قریب پہنچ جاتے ہیں اور کبھی اچانک کہانی آپ کو ڈس لیتی ہے اور آپ اسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔

مظہر کے یہاں سب کچھ مذہبی حیثیت ہے اور اس فکر کی اساس اسلام ہے۔۔۔۔ وہ ابابیل، سونے کے بچھڑے، نیل پھٹ کر تقسیم ہونے کی بات کرتا ہے۔۔۔۔ اس کی کہانیوں کی بنیاد قصص القرآن پر ہے۔۔۔۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخ شہر کوفہ، مصر اور فرات کا بھی وہ ذکر کرتا ہے۔۔۔۔ وہ قیامت پر اور دوبارہ جی اٹھنے پر یقین رکھتا ہے۔ اس کی معلومات کا ماخذ بھی قرآن ہے۔۔۔۔ پھر کشف المحجوب کے اقتباسات اور جنید بغدادی کے خطوط سے بھی وہ کام لیتا ہے۔

مظہر کہیں شفاف اور کہیں کھردری زبان کا استعمال کرتا ہے۔

مظہر کی کہانیاں علائم کا جنگل ہیں۔ بعض علامتیں خود اس نے اختراع کی ہیں۔۔۔۔ لیکن وہ خود ہی کہتا ہے۔

"اور تم علائم سے گھبراؤ نہیں شہزادو کہ خواب بھی مبہم اور علامتی ہوتے ہیں اور انھیں سمجھانے کے لیے معبر ہوتے ہیں اور ہر دور میں معبر بھی مٹھی بھری پیدا ہوتے ہیں۔ چناں چہ علائم زمین سے لے کر آسمان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کیا گندم، سانپ، مور، انجیر اور دس ہاتھ، چار چہرے، تین آنکھیں دس سر یہ سب اشارے اور علائم نہیں ہیں؟"

وہ جانتا ہے کہ اس کی کہانیاں مخصوص قاریوں کے لیے ہیں۔ وہ قاری جو اس کی علامتوں کی تعبیر کرنا جانتے ہیں۔

مظہر کی قوت متخیلہ بہت طاقتور ہے۔۔۔۔ وہ دنیا میں بکھرے جان دار اور بے جان چیزوں سے ایک الگ دنیا تخلیق کرتا ہے۔۔۔۔ جو ہماری دنیا ہوتے ہوئے بھی ایک الگ دنیا ہے۔ جو کبھی ہمیں اپنی اور کبھی اجنبی زمین لگتی ہے۔

مظہر الزماں خاں کی کتاب کھولتے ہی یہ بیان مل جاتا ہے کہ ہابیل بھی مظہر الزماں خاں ہے اور قابیل بھی مظہر الزماں خاں ہے سانپ ڈسا ہوا آدمی بھی مظہر الزماں خاں ہے اور آخری داستان گو بھی مظہر الزماں خاں ہے۔

اس بیان کو میں یہاں تک بڑھاتا ہوں کہ صور اسرافیل سن کر سب سے پہلے دم توڑنے والا بھی مظہر الزماں خاں ہوگا۔ اور سن کر دوبارہ سب سے پہلے جی اٹھنے والا بھی مظہر الزماں خاں ہوگا خدا کے پاس سب سے پہلے حساب دینے والا بھی مظہر الزماں خاں ہوگا۔۔۔۔ سیدھے ہاتھ میں جس کے اعمال نامہ ہوگا وہ بھی مظہر الزماں خاں ہوگا۔ بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ رکھنے والا بھی مظہر الزماں خاں ہوگا۔ جنت میں پہلا قدم رکھنے والا بھی مظہر الزماں خاں ہوگا اور دوزخ میں جلنے والا بھی مظہر الزماں خاں ہوگا۔ زمین کے ختم ہونے کے بعد بھی وہ کہانیاں لکھتا رہے گا کیوں کہ مظہر الزماں خاں آدمی کی علامت ہے۔۔۔۔

ازل سے ابد تک اور ابد کی حدوں سے پرے زنجیر کا یہ سلسلہ دراز ہوتا رہے گا۔

•••••••••••••••••••

شہزاد احمد

اترے مری خاک پر ستارہ

اترے مری خاک پر ستارہ
جو دور فلک پہ مسکرا کر
اپنی جانب بلا رہا ہے
تصویرِ ابد دکھا رہا ہے
ہم روزِ ازل سے پابہ گِل ہیں
تھک ہار چکے ہیں، مضمحل ہیں
پہچان بھی اپنی کھو چکے ہیں
ہم کتنے عجیب ہو چکے ہیں
اے دور سے دیکھتے ستارے!
کیسے لگتے ہیں گھر ہمارے
کیا تو ہمیں دیکھتا نہیں ہے
کیا تو ہمیں جانتا نہیں ہے
کیا ہم تری آنکھ سے نہاں ہیں
کیوں اتنی طویل دوریاں ہیں
اے مالکِ کائنات! تو نے
یہ کیسا جہاں بنا دیا ہے
کیوں فاصلے رکھ دیے ہیں
ہر شے کو مٹا مٹا دیا ہے
ذرے نظر آتے ہیں ستارے
بادل بھی نہیں فلک ہمارے
سوچیں تو خیال بھی نہیں ہم
گردِ مہ و سال بھی نہیں ہم
اس پر بھی کمال چاہتے ہیں
ہم اس سے وصال چاہتے ہیں
موجود بھی جو نہیں ہے شاید
نابود بھی جو نہیں ہے شاید
تارا بھی نہیں کہ دیکھ لیں ہم
اس کے دامن میں جا چھپیں ہم
شاید یہ فلک کہیں نہیں ہے
آنکھوں ہی میں کوئی سرزمیں ہے
ہم ایک ہی خواب دیکھتے ہیں
عالم کو خراب دیکھتے ہیں
ہر چیز جہاں کی جل رہی ہے
یہ آگ ہے یا کہ آگہی ہے

○ ○ ○

زہرا نگاہ

سنا ہے

سنا ہے، جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائے تو وہ حملہ نہیں کرتا
سنا ہے، جب کسی ندی کے پانی میں
بئے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے
تو ندی کی روپہلی مچھلیاں اس کو پڑوسی مان لیتی ہیں
ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے گھر کو بھول کر، کوے کے انڈوں کو پروں سے تھام لیتی ہے
سنا ہے گھونسلے سے کوئی بچہ گر پڑے تو سارا جنگل جاگ جاتا ہے
ندی میں باڑھ آجائے
کوئی پل ٹوٹ جائے تو
کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری، سانپ، چیتا اور بکری ساتھ ہوتے ہیں
سنا ہے، جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
خداوندا! جلیل و معتبر! داناو بینا! منصف و اکبر!
ہمارے شہر میں اب جنگلوں ہی کا کوئی دستور نافذ کر

○ ○ ○

راشد آذر

سایہ

دن بھر کے مصروف قدم
جب لوٹ کے گھر کو آتے ہیں
تو
اپنے ساتھ تھکے شانوں پر
شل ہاتھوں کا بار اٹھائے
بوجھل آنکھوں کی مدھم بینائی لے کر
آواز سننے کی ایک ہلکی سی امید لیے
گھر کی دہلیز پر رک جاتے ہیں

اور براما دروازہ
جب کھلتا ہے تو
سب مانوس دریچے بانہیں پھیلا کر
ان قدموں کی آہٹ پر
آنے والے اس پیکر کو
شام کی خاموشی میں اشارے کرتے ہیں

کمرے کی کرسی کے سکوں پرور ہیں دستے
بستر کی اجلی چادر ہے دوست نواز
تکیے کی نرمی میں ہمدردی کی گرمی
کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے
چاروں اور مرے کمرے میں
خوشبو سی ہے
جیسے تمہارا
اک سایہ سا
میرے ساتھ رہا کرتا ہے

○ ○ ○

راشد آزر

زخم ـــ آنکھیں

سکون کیا ہے
کہاں ہے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں سب
لیکن
جو تھک کر بیٹھ جاتے ہیں
تو اندر سے کوئی کہتا ہے ـــ "یارو
زخم ـــ آنکھیں
درد ـــ جلتی آنچ
بے چینی ـــ بدلنا کروٹیں کانٹوں کے بستر پر"

اکیلے پن کی پرتیں
صرف تنہائی میں کھلتی ہیں

ہجوم احباب کا کیا ہے
فقط مہروں کا گھر ہے
کہ یک سمتی ہی جیسے
سب کی خصلت ہے
سبھی سر کو جھکائے
سچ چھپائے
جھوٹ کی تاویل میں
اک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں

جو دو اک دوست مل جائیں
تو کھلتی ہے زباں
دل سچ اگلتا ہے
اور آئینے میں اپنی
اصل صورت
طنز کرتی
مسکراتی ہے

دائرہ

کل کی فکر میں آج کو کھو کر
جینا بھی کیا جینا ہے

ہم تو ہمیشہ
اپنے کل کو کیسے سنواریں
سوچتے سوچتے سو جاتے ہیں
اپنے آج کو جی نہیں پاتے
آخر کو جب کل آتا ہے
وہ بھی ہمارا آج ہی بن کر
گھر کے کسی
کونے میں پڑا رہ جاتا ہے
اور ہم
پھر سے
کل کی فکر میں
کھو جاتے ہیں
سوچتے سوچتے
سو جاتے ہیں

○ ○ ○

کاوش عباسی

التماس

اے کسی خاک کے کوئی ذرّو
تہِ آب کے کوئی قطرو
کسی آگ کے کوئی شعلو

میری روح جب موت کے وار سہہ کر
مرا جسم چھوڑے
گلوں میں سجائی کرنوں میں نہائی
مری لاش کو
میرے احباب یا میرے دشمن
محبت سے یا ٹھوکروں سے
تمہارے حوالے کریں
تو تم اس جاں پیارے
ہر آفت سہارے
مرے جسم کو
امن و نرمی سے
اپنی پناہوں میں رکھنا

شکیل اعظمی

انتظار

وقت،
تمہاری طرح تیز رفتار تھا
کب کا جا چکا
مگر میں
دیوار پر لگے کیلنڈر کی طرح
تمہاری تصویر کی فریم میں
اب تک چپ چاپ کھڑا ہوا
شاید اس امید پر
کہ آنے والے موسم کا
کوئی سرد لمحہ
تمہارے ہونٹوں پر ٹھہر جائے
اور میں متحرک ہو جاؤں

ooo

ابرار احمد

آنکھیں ترے ڈھونڈیں گی تماشا نہیں ہوگا
وہ دیکھیں گے ہم، جو کبھی دیکھا نہیں ہوگا

اک خواب درو بام سے گھر بکھر گئے سارے
اب کوئی یہاں چاند کا مارا نہیں ہوگا

دل ہوگا، نہیں ہوگا کسی یاد کا مسکن
سو بام طلب پر کوئی چہرا نہیں ہوگا

ہم ہوں گے، نہیں ہوں گے ترے شام و سحر میں
لیکن تجھے اس بات کا دھڑکا نہیں ہوگا

یہ سحر، کہ بھرا ہوگا فراوانیٔ شب سے
پھر تا بہ ابد، دل میں اجالا نہیں ہوگا

یہ خواب سا منظر ہے بس اک عمر کا مہمان
پھر حشر تلک اس کا نظارا نہیں ہوگا

پھر کس لیے ہم دعوتِ امید اٹھائیں
اس شہر میں جب کوئی بھی تجھ سا نہیں ہوگا

بھر جائیں گے اک روز کبھی گھاؤ ہمارے
اے دردِ محبت ترا چارہ نہیں ہوگا

○ ○ ○

انور شعور

وفا کا کوئی صلہ نہیں ہے
یہ واقعہ ہے گلہ نہیں ہے

یہ میری فضائیں یہ میری صبحیں
سحر نہیں ہے صبا نہیں ہے

یہ رزم و عزم و عمل کی دنیا
مراقبے کی جگہ نہیں ہے

بدلتی رہتی ہے رنگ فطرت
جو ہے نہ ہوگا جو تھا نہیں ہے

کسے تمہارے سوا پکاروں
کوئی تمہارے سوا نہیں ہے

پڑا ہوں زندانِ زندگی میں
فرار کا راستہ نہیں ہے

تمام لوگ آ چکے ہیں لیکن
شعور کا کچھ پتہ نہیں ہے

○ ○ ○

رفعت سروش

اٹھ کھوٹ کپٹ کو تیاگ
سونے کی لنکا سے بھاگ

ایٹم بم پر بیٹھی دنیا
چھیڑ رہی ہے دیپک راگ

عورت کی مجبوری کا
ایک سہانا نام سہاگ

یاس کے زنداں سے نکلو
ڈس لیں گے غفلت کے ناگ

لفظوں میں شعلوں کی لپک
دل میں بھری ہے کیسی آگ

میں تیرا ہی سایہ ہوں
مجھ سے ڈر کر دور نہ بھاگ

ساون بھی آجائے گا
عشق جو چھیڑے دیپک راگ

سوچ سمجھ کر کہنا شعر
گھات میں ہیں تنقید کے گھاگ

بجھتے بجھتے بجھے گی سروش
ممکن نہیں ہے دل کی آگ

○ ○ ○

اے تنہائی کچھ تو بول
چپ کیوں ہے ، اپنے لب کھول

پھول نہیں تو خار سہی
خالی ہے میرا کشکول

باقی سب کی قیمت ہے
لیکن سانس ہر اک انمول

اڑ جائیں گے ہواؤں میں
اپنے دل کے راز نہ کھول

سیدھی سیدھی باتیں کر
سچائی میں زہر نہ گھول

کچھ کہنے سے پہلے سوچ
اپنے ہر اک لفظ کو تول

ہے یہ اردو کی پہچان
خوش آہنگ ، رسیلے بول

رفعت تیرا میرا ساتھ
تھوڑی دیر سہی ، ہنس بول

آج گہر افشاں ہے سروش
رول سکے تو موتی رول

○ ○ ○

بانو طاہرہ سعید

○

مجھ پہ اتنی مہربانی کس لیے ؟
یہ بلائے آسمانی کس لیے ؟

غم کا عادی ہو چکا مدت سے دل
اب پیامِ شادمانی کس لیے !

وہ تو واقف ہی نہ تھا کیا شئے ہے پیار
یک بہ یک فرہادِ ثانی کس لیے ؟

تلخ لہجہ ــــ بے رُخی پہچان تھی
کیا ہوا ــــ شیریں زبانی کس لیے ؟

طاہرہ ہم میں نہ تھی خوبی کوئی
اُن لبوں پر مدح خوانی کس لیے ؟

ooo

اقبال ملک

○

جینا کیسا صبح و شام کا رونا ہے
اپنا ہونا بھی کیا کوئی ہونا ہے

جام، کتابیں، مذہب اور کچھ شوقِ فضول
پاس سبھی کے ایک نہ ایک کھلونا ہے

کل بھی اس کو پھینک آئے تھے ظلمت میں
آج کے دن پھر آج کا سورج بونا ہے

اس کے لب و رخسار، آنکھیں، زلفیں، قامت
ایسا لگتا ہے اک جادو ٹونا ہے

باتوں باتوں میں دل اس کو دے بیٹھے
اب اس سے کیا پانا اور کیا کھونا ہے

ooo

محسن زیدی

○

وہی پھر چال اُس کی شاطرانہ
وہی ہر بار میرا مات کھانا
جواب اپنا وہی تُرکی بہ تُرکی
سوالوں کا وہی رُخ جارحانہ
ہوئیں مسدود جتنی بھی تھیں راہیں
کہیں باہر نہ اب آنا نہ جانا
وہی ہے روز و شب محنت، مشقت
وہی ہے زندگی کا کارخانہ
یہاں تو کھیتیاں سوکھی پڑی ہیں
کہاں لے آیا مجھ کو آب و دانہ
وہ اپنا میرے خوابوں میں اس کا
نظر لیکن کسی صورت نہ آنا
وہی شام و سحر اک کھیل محسنؔ
چراغوں کا جلانا اور بجھانا

●●○○●●

سحر سعیدی

○

شاید لگی ہے شاخ پہ تازہ خراش
ہونے لگا ہے پتوں میں اک ارتعاش
رستوں پہ اب وہ شور نہ گلیوں میں رونق
گزرا ہے کوئی حادثہ اک دل خراش
اب کے فساد شہر کو مقتل
پچھلی گلی سے آئی ہے اک تازہ لاش
ہم احترامِ دیر و حرم بھول گئے
اک سانحے نے راز کیا ہم پہ فاش
بارش بغیر کھیت سبھی سوکھنے
کھانے لگی ہے بستی کو فکرِ معاش
دل جوڑنے میں ہم کو زمانے گزر
ٹوٹے تو ایک دن میں ہوئے پاش پاش
پھر آمدِ بہار کا چرچا ہے شاخ
بکھرے پڑے ہیں دشت میں پتوں کے تاش
خود سے بچھڑ کے خود کو نہ پھر پاسکے
آؤ کہ خود کو خود میں کریں ہم تلاش

●●●

تابعدار

کئی فٹ پڑی ہوئی برف پر شلوار سوٹ میں ملبوس، اسنو شوز کے ساتھ، ڈھیروں گرم کپڑے لئے جب وہ سیئرز کے شاپنگ مال میں داخل ہوئی تب اسے کراچی کا طارق روڈ ٹوٹ کر یاد آیا۔ جہاں کی سردیوں میں ایک شال ایک ہی کندھے پر ڈال لینے سے سردی جانے کہاں غائب ہو جاتی تھی اور وہ مزے سے گھنٹوں دنیا جہان کی خریداری کیا کرتی تھی۔ یہاں تو یہ فکر لاحق ہو جاتی کہ واپسی تک ٹھنڈ مزید بڑھ جائے گی اور اتنے سامان کے ساتھ، اس حالت میں بسوں کی تبدیلی ------ وہ تو شکر ہے کہ ٹی ٹی سی (ٹورانٹو ٹرانزٹ کارپوریشن) کا انتظام اتنا عمدہ ہے کہ سفر کے دوران ان دقتوں اور آفتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو وہاں کی منی بسوں کا خاصہ ہے۔

سیئرز سے سردیوں کے تمام کپڑے معہ لوازمات پھر فوڈ سٹی سے ماہانہ بنس کی مکمل خریداری کے بعد اسے یوں محسوس ہوا کہ اگر اب یہ تمام بوجھ اٹھا کر اور بسیں بدل کر گھر گئی تو ------ دوسری دنیا میں وقت سے پہلے ہی آ ٹپکے گا۔ لہٰذا اس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ کرایہ آٹھ ڈالر سے کم نہیں بنے گا ٹیکسی روکی اور تمام سامان اس میں لاد دیا۔ سیٹ پر ڈھیر ہوتے ہی وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی "ہونہہ! آٹھ ڈالر کیا میری جان سے بڑھ کر ہیں؟"

ڈرائیور کو کرایہ ادا کرتے ہوئے اور Have A Nice Day کہتے ہوئے اس کی نگاہ اچانک آصف پر پڑی جو تالا کھول کر گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے اسے پکارا۔ وہ مڑا، آنکھیں سکیڑ کر اسے اور گروسری کو دیکھا۔ "یار! میں تو بہت تھکا ہوا ہوں۔"

"میں تم سے زیادہ تھک چکی ہوں پلیز!" اس نے ملتجیانہ کہا۔ جواباً وہ تھکے اور بھاری قدموں سے سامان کی جانب آنے لگا۔ وہ مطمئن ہو کر اندر چلی گئی۔

گرم کوٹ اور دیگر لوازمات کے ساتھ بھاری اسنو شوز اتارتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پتنگ کی مانند ہلکی پھلکی ہو گئی ہو۔ کاش یہ پتنگ بند گھروں سے باہر اڑ سکتی۔ اس نے تمنا کی اسی وقت آصف کو سامان کے ساتھ لدا پھندا آتے دیکھ کر اس نے تعاون بھرے لہجے میں کہا۔ "بس بس ------ تم سب چیزیں وہیں ہال وے میں رکھ دو ------ میں تھوڑی دیر میں سب کچھ جگہ پر رکھ دوں گی۔"

اور ------ آصف نے فوراً اس کا کہا مان لیا۔

وہ تمام سامان مقررہ جگہوں پر رکھ کر، کافی بنا کر، دونوں پیالیاں ہاتھوں میں تھامے Living Room میں آئی تو وہ قالین پر لیٹا پڑا چھت کو تک رہا تھا ------ پیالی اس کے پہلو میں رکھ کر وہ اس کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔ پھر اس کی خلا میں گھورتی نگاہیں دیکھ کر بولی "کیا بات ہے؟"

"بات کیا ہوگی یار! اس ریسیشن نے تو زندگی بالکل عذاب بنا دی ہے۔" وہ تھک کر اٹھا اور صوفے سے پشت لگا کر بیٹھ گیا "پھر ... مگر تم ------

[illegible]

"[illegible]"

"تھکی نہیں ہوں تم آگئی ہوں۔" آصف کا یہ جملہ اسے بہت برا لگا۔ مگر کڑوے گھونٹ کے ساتھ ہی وہ اسے بھی حلق سے نیچے اتار گئی اور ۔۔۔۔ پھر دھیمی ہو کر بولی۔ "جب میں کہتی ہوں تم مجھے بھی جاب کرنے دو تو تم ۔۔۔۔"

"جاب ہے کہاں یہاں بڑے بڑوں کو جاب نہیں مل رہی تو تمہیں کون دے گا اور پھر تم ۔۔۔۔ کیا کر سکتی ہو اس حالت میں؟"

"کیوں یہاں کی عورتیں تو Pragnancy میں بھی جاب کرتی ہیں۔ پھر میں کیوں نہیں کر سکتی۔"

"اتنا سامان تک تو اٹھا نہیں سکتی ہو تم۔"

"سامان اٹھانے سے جاب کا کیا تعلق؟"

"یہ پاکستان نہیں ہے عنیزہ! یہاں افسر جو کام بھی کہے گا تمہیں کرنا ہوگا۔ تم اس سے یہ عذر نہیں کر سکتیں کہ کام میرے بس کا نہیں ۔۔۔۔ منہ توڑ ڈالر دیتے ہیں یہ تو واقعی خون پسینے کے دیتے ہیں ۔۔۔۔ ہر ایک کو آفس ورک تھوڑی مل جاتا ہے یہاں۔" آصف نے کہا تو عنیزہ نے عجیب نگاہوں سے اسے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ پھر چند ساعت کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر بعد وہ منمنائی۔ "کیسا شوق تھا یہاں آنے کا؟"

"دیکھو!!" اس نے انگلی اٹھائی۔ "اس موضوع کو اس وقت نہ چھیڑنا ورنہ بہت برا ہوگا۔"

عنیزہ نے دیکھا، اس کا چہرہ سرخ ہو کر رنگ آلود ہونے لگا تھا ۔۔۔۔ وہ وہاں سے اٹھ گئی پھر کچن میں جا کر کھانا بنانے لگی۔

سچی بات تو یہ تھی کہ وہ دونوں ہی کنیڈا جیسے ملک میں خوش نہ تھے۔ مگر اب ان کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کشتیاں وہ جلا آئے تھے اور ۔۔۔۔ تیرنا انھیں آتا نہ تھا ۔۔۔۔ آصف کو آٹھ برس قبل بڑی شادی شدہ بہن نے اسپانسر کیا تھا ۔۔۔۔ پھر تعلیم کی تکمیل کے ساتھ ہی اسے شہریت بھی حاصل ہو گئی۔ ساتھ ہی گھر گھر Pizza پہنچانے کی جاب بھی مل گئی۔ مگر بے حد کوششوں کے بعد بھی جب کوئی اچھی ملازمت نہ مل سکی تب اس نے وطن واپسی کا فیصلہ کر لیا اور پھر اس پر فوری عمل بھی کر ڈالا۔

غیر ملک میں مقیم ہر لڑکے کی طرح اس کی مانگ بھی وطن میں بہت بڑھ گئی تھی۔ بلکہ لوگ تو لڑکیوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دینے کو تیار تھے ۔۔۔۔ مگر سب باتیں طے ہو جانے کے بعد جب لڑکی والے یہ سنتے کہ وہ واپس نہیں جائے گا تو ان کے منہ لٹک جاتے۔ لڑکیوں کو باہر جانے کا ہوکا جو ہو گیا تھا۔

خوب کھنگالنے کے بعد اسے عنیزہ پسند آ گئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی آنکھیں۔ نیلم کی بنی ہوئی کٹوریاں ۔۔۔۔ آخر سب کچھ طے ہو گیا اور جوں ہی تمام باتیں طے ہوئیں، اسی وقت عنیزہ کی ماما نے صاف کہہ دیا۔ "عنیزہ کو تو بچپن سے ہی، امریکہ، لندن کنیڈا، فرانس جیسے ملکوں میں رہنے کا شوق ہے۔"

"مگر آصف تو اب یہیں رہے گا۔" باپ نے کہا۔

"تمہیں واپس وہیں جانا ہوگا بیٹے۔" وہ باپ کے بجائے براہ راست آصف سے بولی۔

"لیکن ہمارا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ ہم اس کے بغیر کیسے رہیں گے؟" اب ماں نے کہا۔

"یہ مسئلہ آپ لوگوں کا ہے ۔۔۔۔ اس کا حل بھی آپ ہی جانیں۔" اس جملے میں انکار صاف جھلک رہا تھا ۔۔۔۔ ماں ابھی کچھ کہتی ہی کہ آصف نے ماں کو مزید کچھ نہ بولنے کا اشارہ کیا ۔۔۔۔ (وہ نیلم کی بنی ان دو ننھی منی کٹوریوں میں قید جو ہو چکا تھا) اور رشتہ پکا ہو گیا۔

عنیزہ کو تو باہر جانے کا شوق تھا ہی مگر اس کی ماں کو جنون تھا جس نے ایک اوسط سے بھی کم گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ پھر بیاہ کر کے بھی ایسے ہی گھر اور ماحول میں گئی۔ اس کی تمام زندگی مشقت کرتے اور تنگ ہاتھوں کے ساتھ گزری تھی۔۔۔۔ان چیزوں نے اسے خواب دکھانے شروع کر دیے تھے اور اب اپنے خوابوں کی تعبیر وہ عنیزہ کی شکل میں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عنیزہ بھی زندگی کو اسی طرح ادھر ادھر گزار دے جیسے اپنے تئیں اس نے گزار دی تھی۔ پھر اس کے بعد اس نے بچپن سے ہی عنیزہ کے ذہن میں یہ بات پکے رنگوں کی طرح منعکس کر دی تھی کہ خوابوں کی تعبیر وہیں ملتی ہے۔ "میں نے زندگی میں کوئی عیش نہ کیا، مگر تم ضرور کرو گی۔" ماں کہتی تو عنیزہ کی خوب صورت آنکھیں جگمگا اٹھتیں۔۔۔۔ آخر جیت لڑکی والوں کی ہی ہوئی۔ "ہم نے تو یہ عرصہ کسی نہ کسی طرح تنہا رہ کر اس امید پہ گزار لیا تھا کہ جب تم کسی قابل ہو جاؤ گے تب۔۔۔۔مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ہمیں اب بھی تنہا ہی رہنا ہے بہرحال۔۔۔۔" باپ نے بات ادھوری چھوڑ کر آصف کو عینک کے شیشوں پیچھے سے جھانکا۔ جس کی واپسی میں اب چند روز ہی باقی رہ گئے تھے۔

"اب کیا کیا جائے ابا! لڑکی مجھے پسند آگئی تھی۔" آصف نے کہا پھر اس کے لہجے میں برہمی عود کر آئی۔ "بڑھیا بھی بڑی چالاک ہے جب سب طے ہو گیا تب یہ شرط لگا دی۔"

عنیزہ میکے گئی ہوئی تھی جبھی گفتگو کا یہ رنگ تھا۔

"بہرحال میں آپ لوگوں کو جلد اسپانسر کر دوں گا۔"

"پہلے تو بیوی کو بلاؤ گے؟" ماں کے لہجے میں طنز کڑی دھوپ کی مانند نمایاں تھا۔۔۔۔نہ جانے بیٹے کے نکاح میں آتے ہی ماؤں کو اس چہرے میں دھبہ کیوں نظر آنے لگتا ہے جو چند روز قبل ہی چاند کا ٹکڑا ہوا کرتا تھا۔ آصف نے ماں کے طنز کو نظر انداز کرنے میں ہی عافیت جانی اور بولا "عنیزہ کا تو تقریباً سب کام مکمل ہی ہے وہ تو چند ماہ بعد آ ہی جائے گی۔ بس پھر اس کے بعد آپ لوگ۔۔۔۔"

"مگر ہم وہاں کب آنا چاہتے ہیں؟" باپ نے بات کاٹ دی۔

"پھر اس مسئلے کا کوئی حل آپ ہی بتا دیجیے۔"

آصف کی بات کا جواب اب کے ماں نے دیا۔ "تم ان کی ماں سے صاف صاف کہہ دو کہ میں واپس نہیں جانا چاہتا۔"

"مگر امی! تو وعدہ خلافی ہوئی۔۔۔۔اگر کہنا تھا تو اسی وقت کہتے۔"

"اس وقت کیسے کہتے؟ اس وقت تو تم اس کی آنکھوں کے سحر میں گرفتار تھے۔" ماں نے ناگواری سے کہا۔ پھر بولی "دوسرے انھوں نے کون سا ایمان داری سے کام لیا ہے۔۔۔۔جب سب کچھ طے ہو گیا تھا، اٹھا کے شرط لگا دی۔۔۔۔شروع میں ہی کہتیں تو زبان سے ایسے الفاظ نکلتے ہی ہم انکار کر دیتے۔" ماں اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ "ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے اس میں، بہت پڑی ہیں اس سے لاکھ درجے اچھی اور دیتے بھی سر آنکھوں پر، وہ بھی ہماری ہی تمام شرطیں مان کر۔"

"امی ان سب باتوں سے اب کیا حاصل؟"

"ہے۔۔۔۔کیوں نہیں۔۔۔۔کہہ جو رہی ہوں۔۔۔۔ان کی بات ماننے سے انکار کر دو۔"

"ایسا تو میں اب نہیں کر سکتا۔"

"اچھا ---- تو ہوگئے چار دن میں ہی جورو کے غلام؟"

"ٹھیک ہے ---- طلاق دے دیتا ہوں پھر ----"

"کیا بیکار باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو تم!" اب ابا نے دخل دیا۔ "ٹھیک تو کہہ رہا ہے ---- جو ہو گیا ---- یہ سب باتیں تو پہلے سوچنے کی تھیں ---- اب جانے دو ---- ہمارا کیا ہے ---- اوپر والا سب سے بڑا ہے ---- گزار لیں گے جیسی بھی ----"

شکستہ لہجے میں کہہ گئے ان الفاظ میں پوشیدہ طنز کو آصف نے بہر طور محسوس کر لیا ---- پھر بھی وہ رسان سے بولا۔ "میں کہہ جو رہا ہوں کہ آپ لوگوں کو جلد وہیں بلا لوں گا ---- آپ لوگوں کی سمجھ میں پتہ نہیں کیوں میری بات نہیں آ رہی۔"

"ٹھیک ہے ---- تم جیسا مناسب سمجھو کرو ---- تمھاری ماں تو یوں ہی جذباتی ہو جایا کرتی ہیں ----" باپ نے گویا موضوع ہی ختم کر دیا۔ مگر ---- ماں کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"جب ہم آنا ہی نہیں چاہتے تو کیوں کہے جا رہے ہو، بلا لوگے؟"

اب کے آصف سمجھانے والے انداز میں بولا "آپ لوگوں کے پاس خاصا وقت ہے ---- ابھی تو اسپانسر کروں گا ---- پھر سال ڈیڑھ سال اس کے مکمل ہونے میں لگے گا ---- اس دوران آپ لوگ خوب سوچ لیجیے گا ---- اگر نہیں آنا چاہیں تو ---- منع کر دیجیے گا۔" اس نے بات ختم کی اور کسی اگلے سوال کی آمد سے قبل ہی کمرے سے نکل گیا۔

اچانک ہی، کھٹاک کی آواز اسے ماضی کی تنگ گلیوں سے کھینچ کر حال کی کشادہ سڑک پر لے آئی ---- وہ اٹھ کر کچن میں گیا ---- جہاں عنیزہ کھلے فرج کا کواڑ پکڑے ٹوٹے ہوئے انڈوں کو دیکھ رہی تھی ---- وہ اسے بازو سے پکڑ کر قریبی کرسی پہ بٹھاتے ہوئے بولا۔ "کمال کرتی ہو تم بھی! ہر کام ایک ہی وقت میں نمٹانے کی پڑی رہتی ہے تمھیں!"

"پھر کون کرے گا؟"

"مجھے آواز دے لیتیں میں Help کر دیتا۔"

"تمھیں اپنی ذات سے فرصت ملے تو کسی اور کے بارے میں سوچو۔" عنیزہ کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

"سو بار منع کیا ہے طنز نہ کیا کرو ---- اور بہت پڑے ہیں طنز کرنے والے، تم تو پیار سے بول لیا کرو۔" یہ کہہ کر وہ پیپر ٹاول سے زمین پر گری انڈوں کی زردیاں سمیٹنے لگا۔

"مجھ پیار سے بولا کروں ---- باورچن، دھوبن، ماسی جمعدارنی حتیٰ کہ گھسیارن تک تو بن کر رہ گئی ہوں ---- یہاں آنے کے بعد ---- اتنی مصروفیات کے درمیان پیار کی گنجائش ہی کہاں نکلتی ہے۔ اکیلے کام کر کر کے میرا تو برا حال ہے ----" وہ اٹھ کر بڑبڑاتی ہوئی خواب گاہ میں چلی گئی۔

آصف باقی چیزیں مقررہ جگہوں پر رکھتے ہوئے بہت دور ماضی میں ایک بار پھر جا پہنچا ---- وہاں، گزرے وقت کے ان لمحوں میں، جب والدین اس کے اصرار پر یہاں آ گئے تھے اور عنیزہ نے اس کی ماں کے ساتھ نوکروں سے بھی بدتر سلوک کیا تھا ---- جب کہ ماں نے آتے ہی پوری گھرداری سنبھال لی تھی اور باپ بھی برف ہٹانے سے لے کر گھاس کاٹنے تک میں اس کی مدد کرتا تھا۔ مگر ---- پھر بھی عنیزہ کی

تنوریوں کے بل کم نہ ہوتے تھے۔۔۔۔اچانک اس کے پیٹ میں بھوک کا گولہ اٹھا۔۔۔۔وہ جلد از جلد کام سمیٹ کر Pizza کا آرڈر کر کے رے میں آگیا۔ اس وقت وہ کچھ یاد نہ کرنا چاہتا تھا۔

وہ اس کے برابر لیٹ کر بولا۔ "میں نے Pizza آرڈر کر دیا ہے۔"

"اب کون کر رہا ہے خرچہ؟"

"پھر کیا کرتا؟"

"تم کم از کم آملیٹ تو بنا سکتے تھے۔"

"میں اس وقت صرف اپنے بھیجے کا آملیٹ بنا سکتا ہوں۔۔۔۔سمجھیں!"

اسے اس قدر جھنجلایا ہوا اور بے زار دیکھ کر اب اس نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی اور خود بھی Pizza کا انتظار کرنے لگی۔

اطلاعی گھنٹی بجی۔ آصف نے دروازہ کھولا، نہ جانے کس ماں کا لال، تیرہ چودہ برس کی ہتھیلیوں پر پیزا کا ڈبہ دھرے کھڑا مسکراہٹ بکھیر رہا تھا۔۔۔۔خالص کاروباری مسکراہٹ، آصف نے بھی رسمی طور پر مسکرا کر پیسے ادا کیے، ساتھ ٹپ بھی، پھر دروازہ بند کرتے ہوئے حول کو ٹھیک کرنے کی نیت سے خوش گوار موڈ میں پکارا "عنیزہ! آجاؤ Pizza آگیا ہے۔"

یوں بھی ماحول ہمیشہ وہی ٹھیک کیا کرتا تھا۔

دو ہی روز قبل کی تو بات تھی، عنیزہ اپنی پڑوسن کے ساتھ بیرونی گیلری میں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ یہ ایک سکھ فیملی تھی۔ سامنے ہی سائڈ واک پر سکھنی کے ساس سسر ٹہل رہے تھے۔ عنیزہ نے ایک نگاہ ان پر ڈالی پھر پڑوسن سے منہ بنا کر بولی۔ "ان لوگوں کے یہاں ساتھ رہنے سے کام کتنا بڑھ جاتا ہے اور خرچے کا تو حساب ہی نہ پوچھو۔"

"نہیں بہن جی۔۔۔۔ہمارے گھر تو الٹا ہو رہا ہے۔"

"اچھا۔۔۔۔وہ کیسے؟" عنیزہ نے بے یقینی سے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ جب یہ لوگ آئے تو میری ساس نے آتے ہی گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ اس کی وجہ سے جاب سے آنے کے بعد پکا پکایا کھانا ملتا تھا۔ اور یہ مزے ابھی تک ہیں۔" اس نے بتایا تو عنیزہ کا ذہن ماضی کی جانب چلا گیا۔ جب آصف کی ماں نے بھی اسے گھر کے کاموں سے آزاد کر دیا تھا اور وہ سارا سارا دن وی سی آر پر فلمیں یا پھر ٹی وی دیکھا کرتی تھی۔

"مگر دو سے چار ہو جائیں تو خرچہ۔۔۔۔"

"خرچہ بڑھنے کی بھی بات نہیں ہے۔۔۔۔حکومت ہر مہینے دونوں کے چیک بھیجتی ہے۔۔۔۔اچھی خاصی رقم ہوتی ہے وہ" پھر اس کی آواز مدھم ہو گئی "اری بہن ان کا خرچہ ہی کیا ہے۔۔۔۔کھانے کا ہی ہے۔۔۔۔باقی تو سب ہم لوگوں کے ہی کام آتا ہے۔۔۔۔اچھا خاصا دیتی ہے سرکار ان بڈھوں کو۔۔۔۔اور ہم تو بس۔۔۔۔" وہ حسب عادت اپنی گفتگو میں خود ہی محو تھی ادھر عنیزہ جانے کس سوچ میں گم تھی۔

"گھر میں کتنا سناٹا رہتا ہے۔" کوک کا گھونٹ لیتے ہوئے عنیزہ نے کہا۔

"وہ تو ہے۔۔۔۔مگر بس کچھ مہینوں کی بات ہے۔ پھر۔۔۔۔" آصف مسکرایا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ پھر فضا میں گھونٹ لینے اور کھانا کھانے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔

کچھ دیر بعد عنیزہ نے آصف کی دیکھا پھر معمول کے لہجے میں بولی "امی ابا کو بلالو نا"

"کس؟؟" وہ چونک اٹھا۔ اسے عنیزہ اور اس کا تعلق دونوں ہی بے حد اجنبی لگے۔

"ہاں" وہ پھر مسکرائی مگر وہ۔۔۔۔ ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکنے لگا تھا۔

جب وہ دونوں یہاں تھے ۔۔۔۔ اور عنیزہ کو یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ آصف ماں باپ کو پیار سے دیکھے، ان کا خیال کرے، ان کی محبت میں کچھ خرید لائے ۔۔۔۔ ایسا کچھ بھی وقوع پذیر ہوتے ہی اس کا موڈ آف ہو جاتا جیسے وہ کبھی سر درد کبھی تھکن کا غلاف چڑھا کر بستر پر پڑ جاتی۔ پتھر پر پانی کا ریلا گرے تو وہ پتھر کا کچھ نہیں بگاڑتا ۔۔۔۔ تیزی سے بہہ کر آگے گزر جاتا ہے مگر ۔۔۔۔ قطرہ قطرہ ۔۔۔۔ اس میں سوراخ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ سو وہ بھی پوری مشاقی سے قطرے گرا رہی تھی۔ وہ نامعلوم طریقوں سے غیر محسوس انداز سے آصف کو باور کراتی رہتی کہ ان دونوں کے آجانے سے گھر میں سوائے اخراجات بڑھ جانے کے اور کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے ۔۔۔۔ پریشانیاں اور مسائل گھٹے نہیں ہیں ۔۔۔۔ بڑھ گئے ہیں ۔۔۔۔ اس کا شمار عورتوں کے اس قبیلے سے تھا جو دشمن کو میٹھی چھری سے قتل کرتی ہیں تاکہ مقتول زندگی کے آخری لمحے میں بھی اپنے لبوں پر موت کی تلخی سے زیادہ زندگی کی شیرینی کو محسوس کرے۔

آخر ساڑھے تین سال کا طویل عرصہ گزار کر وہ دونوں مقتول اپنے وطن لوٹ جانے کا فیصلہ کر کے آخری بات چیت کے ارادے سے آصف کے پاس پہنچے۔ "اب ہم یہاں سے واپس جانا چاہتے ہیں۔"

کتاب کے پیچھے چھپا آصف کا چہرہ سنولا کر دھواں دھواں ہو گیا۔۔۔۔ "کیوں؟" اس نے خود پر قابو پاکر کتاب ہاتھ میں تھام لی۔

"بس۔۔۔۔ اب ہمارا دل یہاں نہیں لگ رہا۔"

ماں بھی عورت ہی تھی۔ عنیزہ کے چلے ہوئے ہر مہرے کو وہ اپنی ماہرانہ چال سے مات دے سکتی تھی مگر ۔۔۔۔ مائیں بچوں کی زندگیوں میں امرت گھولتی ہیں ۔۔۔۔ زہر نہیں لہٰذا وہ بولی "تمہارا ہی اصرار تھا کہ قومیت لیے بغیر نہ جائیں سو وہ بھی مل گئی بس ۔۔۔۔ اب اور رہ کر کیا کرنا ہے۔"

آصف نے پہلے باپ کی جانب دیکھا وہ سر جھکائے لکڑی کے فرش کو یوں تک رہا تھا گویا اندر جانے کا راستہ تلاش کر رہا ہو ۔۔۔۔ پھر عنیزہ کی جانب نگاہ اٹھائی، جو اپنے چہرے کے سارے تاثرات نہایت خوبی سے چھپا کر صرف متعجب سی نظر آنے کی کامیاب کوشش کر رہی تھی۔

"تو آپ لوگ یہاں صرف اسی لیے آئے تھے؟" آصف صرف یہی کہہ سکا۔

"ہم لوگ تو صرف اسی لیے نہیں آئے تھے۔ ہم نے تو آنے کے دوسرے مہینے ہی جانے کی بات کی تھی تم ہی نے اصرار کیا تھا کہ شہریت کے لیے رک جائیں۔ کیا یاد نہیں تمہیں؟" باپ نے نے بڑا تفصیلی جواب دیتے ہوئے آخر میں پوچھا۔

"جی" اب کے پھر وہ اسی قدر کہہ سکا اور دوبارہ عنیزہ کو دیکھا ۔۔۔۔ مگر ۔۔۔۔ وہ تو صم بکم کی تصویر بنی بیٹھی تھی ۔۔۔۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ عنیزہ بچوں کی طرح ضد کر کے اس کے والدین کو روک لے ۔۔۔۔ پر ۔۔۔۔ وہ ۔۔۔۔ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ سمجھنا نہ چاہتی تھی۔ پھر ہلکی سی بحث کے بعد یہی فیصلہ ہوا کہ وہ لوگ واپس چلے جائیں۔ والدین جان گئے تھے کہ اب ان کا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ وہ کچھ نہ بول سکا کہ ۔۔۔۔ اب وہ بھی سب کچھ جان چکا تھا۔

اور آج ۔۔۔۔ وہی عنیزہ کہہ رہی تھی کہ انھیں بلالو ۔۔۔۔ آصف نے بہ غور اسے دیکھا ۔۔۔۔ وہی تھی نا جس نے ان کی واپسی کا سن کر

بچے کا لو کھا دیا تھا۔۔۔۔اس نے یقین کرنے کے لیے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"ہاں آصف! ۔۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ۔۔۔۔ تم ایک ہی تو اولاد ہو ان کی ۔۔۔۔ وہ بھی اتنی دور ۔۔۔۔ اور پھر اب تو وہ دادا
دادی بھی بننے والے ہیں۔"

آصف کو اس کا لہجہ اجنبی لگا۔۔۔۔ مگر چہرے پر خلوص کی پرچھائیاں تھیں اور نیلم سے بنی آنکھوں میں پیار کی چمک ۔۔۔۔ وہ ایک دم
خوش ہو گیا۔ "تم ۔۔۔۔ کتنی اچھی ہو عنیزہ!"

"ہوں ۔۔۔۔ کتنا خوش ہوں گے وہ جوڑی کو بانہوں میں لے کر۔"

"ہاں ۔۔۔۔ ہم دونوں انھیں بلانے کی کوشش کریں گے۔"

"گھر میں بزرگوں کی موجودگی سے الگ ہی رونق ہوتی ہے ۔۔۔۔ یہی کتنا اچھا لگے گا آپ کو بھی اور مجھے بھی ان کے آجانے سے۔"

"ہاں یہی!"

پھر کئی روز کی کوششوں کے بعد ان دونوں نے بڑی محنت سے خط کا مضمون تیار کیا۔

محترمی ابا اور امی جان۔ ہم دونوں کی جانب سے سلام قبول کریں۔ آپ لوگ کیسے ہیں؟ ہم دونوں آپ لوگوں کو بہت یاد کرتے ہیں
آپ کے جانے کے بعد گھر میں بے حد سناٹا ہو گیا ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ ذہن آپ لوگوں سے ہٹ کر دوسری جانب لگ جائے مگر
اب نہ ہو سکے۔ اب تو یہ حال ہے کہ ہم سے ایک پل بھی آپ دونوں کے بغیر گزارا نہیں جا رہا ہے۔
پچھلی بار ہم میں سے کسی سے بھی اگر کوئی کوتاہی، گستاخی یا غلطی ہوئی ہے تو اسے ہماری نادانی سمجھ کر معاف کر دیجیے اور ہمیشہ کے
لیے ہمارے پاس آجائیے۔ ہمارے دل اور آنکھیں آپ کی آمد کے یوں منتظر ہیں جیسے ہم ننھے منے بچے ہوں اور ۔۔۔۔ آپ کے بغیر جینے کا تصور
نہ کر سکتے ہوں۔ پلیز آپ لوگ جلد از جلد آنے کی حامی بھریں۔ آخر میں بہت سے مؤدبانہ سلاموں کے ساتھ ایک خوش خبری ۔۔۔۔ آپ
بہت جلد دادا اور دادی بننے والے ہیں ۔۔۔۔! ہمیں یقین ہے اب آپ لوگ ایک لمحہ بھی وہاں نہ رک سکیں گے ۔۔۔۔ ہے نا اب
اجازت دیجیے خدا حافظ!

آپ کی آمد کے شدت سے منتظر آپ کے تابعدار
عنیزہ اور آصف

○ ○ ○

نشاط فاطمہ

یہ دنیا کیسی ہے ؟

یہ کہانی مائی زینب کی ہرگز نہیں، یہ تو ماڈل ٹاؤن کے بھائی زبیر کی کہانی ہے۔ مگر اس کے ذکر کے بغیر بات بھی نہیں بنتی اور رہنے! کیسے۔ وہ ستر برس کی مائی بڑی باہمت اور ایک خاص مزاج کی عورت تھی۔ وہ سلطانہ، بھائی بیر اور بانو کے یہاں پارٹ ٹائم ملازمہ تھی، تینوں کے یہاں ایک ہی کام انجام دیتی کپڑے اور برتن دھوتی۔ لیکن بھائی زبیر کے ساتھ وہ خصوصیت برتا کرتی یعنی کچھ کام اپنی مرضی سے زا کر دیتی تھی۔ مثلاً وقت بے وقت ان کے لیے چائے بنا دی، جھٹ پٹ سل پر مصالحہ رگڑ دیا یا کبھی ہانڈی بھون دی۔ بانو اس سے اس معا میں جھگڑتی تھی۔

"کمال کرتی ہو بانو بی بی، زبیر میاں تو مسکین آدمی ہے میں تو اس خیال سے کر دیتی ہوں ورنہ مجھ سے تو لاٹ صاحب بھی نہ کروا سکے۔"

وہ برا مان جاتی۔ مائی زینب کی اپنی دانش تھی۔ گاہے گاہے پیشن گوئیاں بھی کرتی جن میں سے ایک خصوصی پیشن گوئی بھائی زبیر حق میں اکثر دہرایا کرتی۔

"بی بی میرا دل کہتا ہے زبیر میاں کسی وقت ٹھوکریں کھائے گا۔" وہ افسوس سے سر ہلا کر کہتی۔

"اے ہے وہ کیوں خدا نہ کرے مائی کیسی باتیں کرتی ہو۔" سلطانہ اسے جھڑکتی۔

سلطانہ کو تو برا لگنا ہی ہوا یوں کہ بھائی زبیر اس سے تمام سلوک سگے بھائیوں سا رکھتے تھے۔

"بی بی میں تو اس کے لیے اچھی اچھی دعائیں کرتی ہوں اور خدا نہ کرے ایسا ہو پر میرا دل مجھ سے یہی کہتا رہتا ہے۔" وہ وثوق سے کہا مائی زینب اس طریقے سے بات کرتی جیسے وہ غیب دان ہو۔۔۔۔چہرے پر دانش وروں اور پہنچے ہوئے بزرگوں کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔

"مائی تم ایسی باتیں مت کیا کرو۔ خبردار جو آئندہ بھائی زبیر کے لیے اس قسم کی پیشن گوئیاں کیں۔"

سلطانہ مائی کو جھاڑ دیتی۔

لیکن بانو ان کے متعلق اس قسم کی باتیں سن کر قہقہے لگاتی ویسے بھی وہ بھائی زبیر کے برے حشر کا سن کر بہت خوش ہوتی۔ حالاں وہ ان کی چاہت میں گرفتار تھی اور بڑا ارمان تھا اسے ان سے شادی کرنے کا۔ اور سلطانہ کہتی تھی کہ ایک دن خود بھائی زبیر کے منہ سے بات اس کے سامنے نکل گئی تھی۔ پھر وہ اداس بھی ہوئے تھے اور سلطانہ نے کشور سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کوئی اس طرح اداس ہو جائے تو سمجھ لو کہ اسے محبت ہو گئی۔ مگر کشور نے کہا تھا کہ وہ اس کی بات نہیں سمجھی تھی اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ محبت میں اداسی ہوتی کہ مسرت۔۔ بہرحال ہر شخص کا اپنا انداز ہوتا ہے، محبت کرنے کا۔ اور مائی زینب بھی بات کی تہہ تک اتر چکی تھی۔ اور خصوصیت سے زبیر کی باتیں بانو کے سامنے کرتی تھی اور اسے دیکھتی بھی جاتی تھی اور جب بانو ان کی حالت پر ہنستی تو مائی ہاتھ اس کی طرف جھٹک کر کہتی بی تو تو چپ ہی رہے۔"

مگر عین وقت پر بھائی نے اپنے چھوٹے چچا یعنی طلعت کے والد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے والد کا بارے میں بڑا اسٹریل سا خط آیا تھا جب چچا نے اس بات کی شکایت لکھ کر بھیجی تھی کہ:

"زبیر میاں، ہماری طلو سے شادی پر رضامند نہیں ہیں۔"

"اے بدبخت تو کیا چاہتا ہے، وہ کون سی بات ہے جو اس نیک کام میں مانع ہے۔ ہم تینوں بھائیوں میں کبھی کسی بات پر نہ تکرار ہوئی اور نہ کسی معاملے پر بحث ہوئی۔ ہم تو ایک ازلی مثلث کی ہیئت اختیار کیے رہے۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ شعیب میاں پاکستان سدھاریں اور ہم میں جدائی در پیش آئے۔ مگر بڑے بھائی اور ہم خدا کے فضل و کرم سے اسی طرح شیر و شکر ہو کر رہ رہے ہیں۔ یہ بھائی صاحب کا اور میرا حکم ہے کہ تم فوراً طلعت سلمہا سے بیاہ کے لیے حامی بھر لو۔

چناں چہ انھوں نے خط پڑھتے ہی حامی بھر لی تھی۔ طلعت بھابی بہت خوب صورت پڑھی لکھی تیز طرار خاتون تھیں۔ وہ کالج میں پڑھاتی تھیں اور اب انھیں پڑھانے لگیں۔ وہ معمولی سی بات بھی ایسے کرتیں جیسے جماعت میں لیکچر دے رہی ہوں۔ انھوں نے بھائی زبیر کو اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے گھر میں کوئی لاوارث چھوکرا ملازم ہو۔ سلطانہ کا دل ان کے لیے بہت کڑھتا تھا مگر بانو کا کہنا تھا کہ وہ اسی بدسلوکی کے مستحق تھے۔ اس پر سلطانہ اس سے لڑنے لگتی اور کشور کو جو سلطانہ کی زیادہ اور بانو کی کم دوست تھی دونوں کو سمجھانا پڑتا مگر کشور کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ اس سارے معاملے کے سلسلے میں بہت کنفیوز تھی۔ بھائی زبیر ہرگز روکھے پھیکے نہ تھے مگر اس بھری دنیا میں انھیں کسی چیز کی تمنا نہ تھی ان کے دل میں کبھی کسی شے کی خواہش سر اٹھاتے نہ دیکھی گئی۔

بھائی زبیر دراصل ایک مرنجاں مرنج صلح جو آدمی تھے۔ اور اس زمانے میں اس قسم کے لوگ قطعی فضول سمجھے جاتے تھے، اب ان کی سلطانہ سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی مگر وہ اس سے مثل سگے بھائیوں کے پیش آتے کیوں کہ وہ ان کے سامنے پلی بڑھی تھی۔ جب وہ سلطانہ کو عید پر عیدی دیتے اور طلعت بھابی قہر سے انھیں آنکھیں دکھاتیں تو وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتے "طلو یہ بھی تو سوچو اس کے کوئی سگا بھائی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں نمی آجاتی۔ ان کی اس جذباتیت پر طلعت بھابی دانت پیستی، لوگ ہاک ہنستے مگر وہ اپنی افتاد طبع سے مجبور تھے۔

"یہ ابھی اٹھارویں صدی ہی میں رہ رہے ہیں حالاں کہ انیسویں صدی کی پیداوار ہیں۔" طلعت کہتی۔

آج پھر مائی پر کشف طاری تھا اور وہ اپنے اقوال دہرا رہی تھی اور خصوصیت سے بھائی زبیر کے بارے میں پیشن گوئیاں کر رہی تھی۔ سلطانہ نے اسے ڈانٹا۔

"بی بی زبیر میاں کو سمجھاؤ۔ مجھے کیا ڈانٹتی ہو، میں تو جو کہتی ہوں اس کی محبت میں۔ یہ جو ہر کسی سے اتنی ہمدردی کرتا ہے اور ہم جیسے لوگوں کے لیے جان کھپاتا پھرتا ہے، ان باتوں سے آگے چل کر آدمی تکلیف اٹھاتا ہے۔ جیسی اس کی بے طلب طبیعت ہے ایسی تو فقیروں کو ہی راس آتی ہے۔ فقیر بھی وہ جو گھر بار چھوڑ کر جنگل بسائے۔"

کشور اس کی باتوں سے کنفیوز ہو جاتی۔ معلوم نہیں وہ دیوتا تھے یا چھپے ہوئے راکشس۔

مائی بھی پکی تھی اب آج کل ایسا کون ہوتا ہے۔ بارہا دیکھا گیا وہی میلی کچیلی اندھی دھندی مائی، جوتیاں گھسیٹتی، چلتی دو پہریا سوں سوں کرتی سرما کی بخ بستہ صبح سڑک پر مل جاتی تو وہ اسے اس کے گھر پہنچا آتے اب چاہے ان کا راستہ کہیں جا رہا ہو۔

طلعت بھابی کی برداشت کی بھی حد تھی، وہ ان کی پستی اور بے حسی پر تلملاتی اور کلکلاتی تھیں۔ مگر ان کا تو یہ تھا کہ کم تر سے کم تر لوگوں سے رسم و راہ رکھتے۔ "شید اکیا ہوا میرے بیٹے کو" وہ شیدا مائی کو تین برس کا بچہ کندھے سے لگائے جاتا دیکھ کر پوچھتے۔

"کئی دن سے اس کے کان میں درد ہے ڈسپنسری لے جا رہا ہوں۔" وہ آنکھیں نچا کر کہتا۔

"چل میرے ساتھ" وہ اسے اور اس کے بچے کو شہر اپنی کھڑکھڑاتی پرانی فوکس ویگن میں بٹھا کر ڈاکٹر کو دکھانے چل دیتے۔ طلعت بھابی غصہ کرتیں تو ان کے پاس اس کا یہ جواب ہوتا "طلو یہ بھی سوچو اگر شیدا کے بچے کا کان خراب ہو جاتا اور یہی اگر ہمارے بچے کے ساتھ ہوتا تو ہمیں کیسا محسوس ہوتا۔"

"تم سارے زمانے کے ٹھیکے دار بنتے ہو۔ اپنے گھر کی خبر بھی ہے؟" وہ فیصلہ کن انداز میں کہتیں۔

یہ ماڈل ٹاؤن ایک زمانے میں عجیب و غریب جگہ تھی۔ حد نظر تک پرانی خستہ حال سفید اور پیلی ہندوؤں کی متروکہ کوٹھیاں اپنے وسیع کمروں اونچی چھتوں اور کشادہ باغوں سمیت بکھری ہوئی تھیں۔ ایک ایسی ہی پرانی سی مختصر کوٹھی میں زبیر ۱۹۵۲ء سے مقیم تھے، یہ کوٹھی ان کے دوست ملک حبیب اللہ نے انھیں مناسب داموں خرید دی تھی۔ ان کے دونوں بچے عابد اور حلیہ اسی میں پیدا ہوئے پلے بڑھے۔ بھائی زبیر کو اپنی اس کوٹھی سے والہانہ لگاؤ تھا۔ "ایک تو سلطانہ بی اس میں صحن ہے اور صحن میں ہمارے الہ آباد کے گھر کی طرح نیم کا درخت لگا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہ صحن اتنا بڑا تھا کہ اس میں دو نیم اور ایک بیل کے درخت تھے۔"

وہ سلطانہ کو جذباتی ہو کر بتاتے۔ اس کے علاوہ شہروں میں ایک شہر تھا وہ ان کے نزدیک لاہور تھا جس نے ان کے لیے ۱۹۴۸ء میں اپنی آغوش واکر دی تھی آج بھی انھیں یہ خوبی یاد تھا کہ وہ اور ان کے بھا حیران پریشان لاہور کے اسٹیشن پر بیٹھے سوچ رہے تھے کہاں جائیں اور کس کے یہاں جائیں۔

ملک حبیب اللہ جہلم سے لاہور واپس آیا تھا۔ اور وہ اس کے لیے بالکل اجنبی لوگ تھے مگر وہ خود آگے بڑھا اور انھیں سمیٹ کر ماڈل ٹاؤن اپنے والدین کے گھر لے آیا۔ جب سے اب تک وہ ان کے دکھ سکھ کا ساتھی سنگی تھا اور وہ واحد شخص تھا جس کو ان کی کسی بات پر اعتراض نہ تھا بلکہ اس کے برخلاف اکثر طلعت بھابی کو ان کے رویے پر سمجھانے کی کوشش کرتا۔

طلعت بھابی کس طرح سمجھتیں جب کہ خود ان کی چھوٹی بہن عفت کی شادی سی۔ ایس۔ پی آفیسر سے ہوئی تھی۔ لاہور میں اس کی کوٹھی کرائے پر تھی اور شیخوپورہ میں اس کے میاں کی تعیناتی تھی جہاں اس کے گھر میں بھینسوں اور قالینوں کی فراوانی تھی۔ اور وہ چھوٹی بہن کی خوش حالی پر کوستیں اور آہیں بھرتیں۔

دراصل بھائی زبیر اس طبقے کے فرد تھے جو اب معدوم ہو رہا تھا۔ وہ کبھی ترنگ میں آکر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تو طلعت بھابی انھیں گھور کر خاموش رہنے کی تلقین کرتیں۔ ہر معاملے میں ان کا اپنا یہ نظریہ تھا وہ ایک ترقی پسند ذہن کی خاتون تھیں۔

ماڈل ٹاؤن میں ان دنوں چوری ڈاکے کی واردات عام تھی۔ لوگوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ بندوق یا پستول کا لائسنس حاصل کرلیں۔

"جب ہم ہتھیار استعمال کریں گے تو ہم میں اور چور ڈاکوؤں میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔" وہ راضی نہ ہوئے۔ لاچار طلعت بھابی نے پستول کا لائسنس اپنے بہنوئی کے ذریعے حاصل کرلیا۔

بارش ہو رہی تھی اور پرانے درخت دھلے دھلائے جھوم رہے تھے۔ کوئل کی آواز کی تکرار پر وہ رنجیدہ ہوگئے۔ "میں سوچ رہا ہوں طلو کہ جب میری چھوٹی بہن عشرت نے مجھے بنگلور سے خط لکھا تو میں نے اسے جواب کیوں نہیں دیا۔ اب مجھے ہر دم اس کا خیال آتا ہے پتہ نہیں

کیا سوچتی ہوگی۔"

"آپ وہاں یا یہاں کسی رشتے دار سے معلوم کریں شاید کسی کو ان کا پتہ معلوم ہو۔" سلطانہ نے اداسی سے کہا۔ اس نے سوچا اگر ان کا ملنا ممکن ہوگیا تو شاید ہنو اور سلطانہ بی کے الفاظ اپنی مٹھاس کھو دیں۔

"نہیں سلطانہ بی اب ایسا ممکن نہیں۔ میں تو اب بس پچھتاتا اور سوچتا رہتا ہوں کہ عشرت کیسی ہوگی اور کہاں ہوگی۔"

ملک حبیب اللہ کی موٹر پورچ میں رکی، ہارن بجا وہ اٹھ کر گئے وہ انھیں اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔ ایک گھنٹے بعد واپس آئے تب بھی اداس تھے۔ "مجھے آج عشرت بہت یاد آرہی ہے، میں اس کا پتہ اپنی نوٹ بک میں درج کرنا بھول گیا تھا اور ۔۔۔۔"

انھوں نے خود کلامی کی۔

"اب بس کرو صبح سے آج تمھیں بھی رٹ لگی ہے۔ انس، لگاوٹ، محبت یہ سب رجعت پسندی کی علامات ہیں۔ یہ وہ زنجیریں ہیں جن ہم نے خود کو جکڑ رکھا ہے۔ ہمیں ان کا پابند ہونا چاہیے۔" طلعت بھابی نے لیکچر دیا۔

سلطانہ جا چکی تھی۔

"مائی پچکو اڑے سے کپڑے اندر لے آئی اور بغیر فرمائش کے اس نے چائے بنائی، پھر اپنا مگ اس نے سامنے کیا۔ "اس میں میرے لیے بھی چائے ڈال دیں اس نے طلعت بھابی سے کہا۔ اندر سے پیڑھی لائی اور اس پر بیٹھ کر گھونٹ بھرنے لگی۔

بھائی زبیر نے ادھر ادھر دیکھا، طلعت بھابی اندر کمرے میں جا چکی تھیں انھوں نے جیب سے پانچ سو کے نوٹ نکالے "مائی یہ راستے میں قمر صاحب کو دے دینا۔ انھیں سانس کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ کئی دن سے دفتر بھی نہیں آئے اور ان سے کہنا میں شام کو انھیں دیکھنے آؤں گا۔"

مائی نے نوٹ دوپٹے کے پلو میں باندھ لیے۔ زبیر بھائی باغ میں اتر گئے اور پائپ سے گھاس میں پانی ڈالنے لگے۔

مگر طلعت بھابی چیل کی نظر رکھتی تھیں۔ انھوں نے کھڑکی میں سے دیکھ لیا تھا۔ مائی جا چکی تھی اور تقریر کر رہی تھیں بلکہ نصیحتیں کر رہی تھیں۔ جب وہ سن سن کے تھک گئے تو بیزاری سے کہنے لگے "تمام عمر میں تمھاری زبان نہ سمجھ سکا۔ دیکھو میں نہ مشین بن سکتا ہوں اور وقت کے ساتھ بدل سکتا ہوں اس لیے کہ وقت بہت تیز گام ہے۔"

"مگر وقت بڑی قوت رکھتا ہے اس کے ساتھ چلنا تو پڑتا ہے۔" طلعت بھابی نے کہا۔

"مگر وقت ہے کیا گردش مہ و سال۔"

طلعت بھابی اس قسم کی عورت تھیں جو ہر لحظہ اپنا معیار بلند کرنا چاہتی ہے اور وہ اپنے حال میں رک کے کڑھتے تھے۔ لیکن طلعت بھابی سے زیادہ بچے اب ان کے رویے پر تنقید کرتے تھے۔

ایک روز عطیہ بولی "ابو آپ خواہ مخواہ شہر کے اندیشے میں دبلے ہو رہے ہیں۔ دودھ والا کہہ رہا تھا کہ اللہ بھلا کرے صاحب کا انھوں نے مجھے سو روپے دیے تو میں نے چھت ٹھیک کروائی۔"

کوئی بات نہیں میں دودھ میں پیسے کاٹ لوں گی اور ایسا سوچتے وقت طلعت بھابی کا چہرہ پکا ہوگیا تھا اور آنکھیں قہر بار۔ عطیہ ڈر کے مارے اندر چلی گئی۔

"دیکھو طلو نہ تم خود اتنی چھوٹی بنو اور نہ مجھے بناؤ۔ سوچو میرے دونوں چچا اور میرے والد کس قدر لوگوں کا خیال رکھتے تھے۔ اور کسی

کی جرأت نہ تھی کہ ان سے پوچھے کہ کس کو دیا اور کیا دیا۔"

انھوں نے بہت افسوس سے کہا۔ فضا بہت مکدر ہو گئی تھی۔ حالاں کہ موسم بہت خوش گوار تھا۔ زبیر بھائی کو واقعی آج غصہ آگیا تھا حالاں کہ انھوں نے بہت ضبط سے کام لیا تھا۔ کتاب اٹھائی پکڑ کر پڑھنے بیٹھ گئے۔ گھر میں ان کی کوئی بات نہیں سمجھتا تھا۔ جیسے وہ کوئی مجرم ہوں۔ یہ سب سوچتے ہوئے انھوں نے جھنجھلا کر کتاب رکھی اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر باہر ٹہلنے چلے گئے۔

ٹھیک تو کہتی ہے حلیمہ شہر کے اندیشے میں دبلے ہو رہے ہیں۔ بزرگوں کی مثال دینے کھڑے ہو گئے۔ چراغ تلے اندھیرا یہ مثل انھیں پر صادق ہے۔ دودھ والے کی چھت ٹپک رہی ہے تو گھلے جا رہے ہیں۔ مائی زینب کی ڈھائی مرے زمین کی آخری قسط انھوں نے ادا کی۔ اپنا فرنیچر پرانا ہو گیا تو کچھ نہیں۔" وہ اکیلی بیٹھی بڑبڑ کرتی رہیں۔ وہ ان کا غصہ فرو ہونے تک باہر ٹہلتے رہے۔

مگر کچھ عرصے سے مسائل بہت بڑھ گئے تھے۔ جب کہ وہ اس قسم کے آدمی تھے کہ ایک بار ان کا تبادلہ ڈھاکہ ہوا تو وہ دو برس لاہور کے گلی کوچے اور اپنا گھر اور ماڈل ٹاؤن کے چھوٹے چھوٹے کھوکھے اور ان میں بیٹھے ہوئے عنایت اور تحسین ہی کو یاد کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ کمپنی کی طرف سے ترقی پر دے کر بھیجے جا رہے تھے مگر ایک بار وہ غلطی کر بیٹھے تھے اس دفعہ انھوں نے جانے سے انکار کر دیا تھا اور جس نے نہ جانے کی وجہ پوچھی انھوں نے یہی کہا "لاہور جانے نہیں دیتا"۔

سب ہی نے مذاق اڑایا سوائے حبیب اللہ کے۔ وہ اور حبیب اللہ اپنی روش پر قائم تھے۔ اور دونوں کی بیویاں سر پیٹتی تھیں۔ "شکر کرو نوین کہ حبیب بھائی کی ساہیوال میں زمینیں ہیں اور ہمارے ابا بھی آتے ہی دو مرتبہ زمین میرے اور طلعت کے نام سے لے کر ڈال لی تھی ورنہ یہ دونوں ہمیں فاقوں کرا دیتے۔"

مگر وہ دونوں بڑی بے نیازی سے باغ میں بیٹھے لیمو کے شربت کے گلاس پیتے اور مہلک ہتھیار، آلودگی اور چین کی ترقی جیسے فضول موضوعات پر گفتگو میں منہمک رہتے۔

"مادی ترقی مقصدِ حیات نہیں ہے۔" زبیر بھائی کی پرسکون آواز فضا کی آلودگی میں اس طرح حلول ہو گئی جیسے کبھی ترائی کی سرسبز اور مصفا فضا میں مہاتما بدھ کی آواز نے سفر کیا تھا۔ مگر یہ وقت اور فضا نہ جانے ایسی کتنی آوازوں کو نگل چکی تھی۔

"اونہہ" طلعت بھابی نے غصے سے ایک لمبی اونہہ کی۔

سنا زبیر کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔۔ انھوں نے ملک حبیب اللہ کی بنس مکھ بیوی نوین کو فون کیا اور دونوں کی گفتگو من و عن دہرا دی۔

"تم میرے یہاں آجاؤ۔" وہ ہنسیں۔

"بات یہ ہے حبیب آدمی تیزی سے تخریب کی طرف مائل ہو رہا ہے، اپنی ذات اور آسائش کے سوا وہ ہر شئے کو بھول گیا ہے۔"

"بالکل بالکل۔"

"ملک حبیب اللہ نے ایسے تڑپ کے ہاں میں ہاں ملائی جیسے، گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔"

لیکن دنیا کا چکر تیزی سے چلتا رہا۔ بیل نے سینگ بھی بدل لیا۔

حلیمہ اور عابد کالج کے زمانے میں مصر رہے کہ نئی گاڑی ضرور لیں اور گھر کو از سر نو ٹھیک کروا لیں۔

اس بار ان کو بھائی زبیر کا یہی جواب ملتا۔

"بیٹا انہ میرے پاس، سونے کی کان ہے اور یہ اللہ دین کا چراغ۔"

لیکن صلیہ اور عابد اب بڑے ہو گئے تھے۔ عابد انجینئر اور صلیہ وکیل دونوں فارغ التحصیل ہو چکے تھے اب وہ دونوں باہر جا کر پڑھنا چاہتے تھے۔ زبیر نے اس سلسلے میں بڑی تاویلیں اور دلائل پیش کیے۔ اپنے مخصوص نظریات دہرائے۔

"اگر آپ نے دودھ والے کی چھتوں کی مرمت، مائی زینب کی زمین کی قسطوں کی ادائیگی اور شیدا کے بچوں کی بیماری پر خرچ کر دیا تو اس میں ہمارا کیا قصور۔"

پھر دونوں نے ایک آسان ترکیب بتائی کہ وہ یہ گھر اور گاڑی فروخت کر دیں کیوں کہ اب ماڈل ٹاؤن کے گھروں کی قیمت لاکھوں روڑوں میں جا رہی تھی۔

"آپ کا گزر اوقات؟" سلطانہ نے پیالی طشتری میں رکھی۔

"کس قدر بے دھڑک سوال کرنے لگی ہو۔ ہمارے لڑکپن میں چھوٹی بہنیں اپنے بڑوں سے اس قسم کے سوال نہیں کیا کرتی تھیں۔ بہر حال تم نے مجھ پر جواب واجب کر دیا ہے تو سن لو مجھے ٹیوشنوں سے پندرہ سو مل جاتے ہیں۔ آرام سے رہتا ہوں۔ تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو، میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔ ورنہ تم مجھ پر رحم کھانے لگو گی۔" وہ مسکرائے۔

چاروں طرف اس نے نظریں دوڑائیں، یہ چھوٹا سا گھر صاف ستھرا سلیقے کا تھا یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ بھائی زبیر گھر کا انتظام خود چلا رہے تھے۔ ورنہ پہلے تو ایسا لگتا تھا کہ چار دن کو بھی طلعت بھابی کہیں گئیں تو گھر کا گھر آوا ہو جائے گا۔ اب معلوم ہوا کہ ان میں اس قسم کی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ مگر پھر اس نے سوال کیا "آپ طلعت بھابی کے ساتھ امریکہ کیوں نہیں گئے۔ کیا بچوں نے آپ کو نہیں بلایا۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے وہ نالائق نہیں ہیں۔ دراصل میں نے ہی اپنی دھرتی کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ دھرتی ماں سمان ہوتی ہے۔ ہم اس کے ممنون و مقروض ہیں۔ وہ جانے والوں کے لیے آنسو بہاتی ہے۔ ہمارا شمار زمین کے بوڑھے درختوں میں ہے۔ نئی زمین پر پرانا درخت جمتا نہیں۔" انھوں نے اسٹیشن بدلا۔

سلطانہ کو مائی زینب یاد آ گئی۔ اور بھائی زبیر کے بارے میں اس کی پیشن گوئیاں مگر اس نے محسوس کیا وہ اپنی زمین پر خوش اور مطمئن تھے۔

"تمہیں کشور کا دھیان ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں معلوم نہیں کہاں ہے۔" سلطانہ نے کہا۔

"وہ یہیں ہے، دو سال ہوئے اس کے میاں کا انتقال ہو گیا۔ لڑکی امریکہ پڑھنے گئی وہیں رہ پڑی۔ کبھی دس پندرہ دن کے لیے آ جاتی تھی مگر اب عرصے سے نہیں آئی۔ کشور اکثر مجھ سے ملنے آتی ہے کبھی میں بھی چلا جاتا ہوں۔"

سلطانہ کا ذہن سوچتے سوچتے تھم گیا تھا۔ وقت پانی کی باڑھ کی طرح چڑھتا ہے اور سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔ آدمی تنکوں کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ کہاں سے آتے ہیں کہاں چلے جاتے ہیں۔ پھر ہم کا ہے کو اتنا اتراتے ہیں۔

"یہ دنیا کیسی ہے۔" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ مگر پھر اندر بھرتی ہی سے ایک ہنسی کی آواز آئی اور اس کے تمام وجود پر چھا گئی۔

کیا اندر والے نے باہر والے کا مذاق اڑایا تھا؟
باہر والے نے بہ تکرار پوچھا "یہ دنیا کیسی ہے۔" مگر جواب پھر بھی نہیں آیا۔ شاید اندر والا باہر والے سے خائف تھا۔ بس وہی کھسیانی سی ہنسی کی آواز!
پھر اس نے کشور کا سہارا لیا اور چلنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اب کی بار اس نے زبیر بھائی سے پوچھ ہی لیا۔ "بھائی یہ دنیا کیسی ہے؟"
"کیسی بھی نہیں۔ ہم خود ہی تو دنیا ہیں"

* * * * *

ادارے کی خبریں

متحانات ادارہ ادبیات اردو:

شعبہ امتحانات ادارہ ادبیات اردو سنہ ۱۹۴۸ء سے کارکردہا ہے اور سال میں دو بار ادارے کے امتحانات اردو دانی، اردو زبان
نی، اردو انشاء کے ساتھ ساتھ اردو ماہر، اردو عالم اور اردو فاضل منعقد ہوتے رہے ہیں۔

جون ۱۹۹۴ء سے ادارے کے ابتدائی امتحانات عابد علی خاں ایجو کیشنل ٹرسٹ کے تعاون سے وسیع پیمانے پر اردو خواندگی کی مواتی
ریک کے طور پر ہر گھر کی دہلیز تک پہنچ چکے ہیں۔ جون ۱۹۹۴ء میں اردو دانی کا امتحان اور اس سے متعلق نصابی کتابیں عابد علی خاں ایجو کیشنل
.سٹ کی طرف سے وسیع پیمانے پر مفت تقسیم کی گئیں اور درکار میٹریل کاپی اور پنسل نیز بستے بھی فراہم کیے گئے۔ پہلے امتحان میں ۳۹۸۲
بہ و طالبات نے شرکت کی۔

جنوری ۱۹۹۵ء میں اردو دانی کے ساتھ اردو زبان دانی کا امتحان بھی منعقد ہوا، جس میں ۷۰۸۲ طلبہ و طالبات شریک ہوئے اور
۱۶۳۶ امیدوار کامیاب ہوئے۔

جون ۱۹۹۵ء میں اضلاع اور شہر کے ۱۴۶ مراکز پر ۸۵۴۵ امیدواروں نے امتحان دیا اور ۷۱۱۲ امیدواروں نے کامیابی حاصل کی، جن
ں تلگو اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے طلبہ و طالبات اور بالغ افراد کی خاطر خواہ تعداد بھی شامل تھی۔

۷/ جنوری ۱۹۹۶ء کو ادارے کے تین امتحانات اردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو انشاء، حیدرآباد اور سکندرآباد کے علاوہ اضلاع
ںگانہ اور آندھرا پردیش کے (۲۳۸) مراکز پر منعقد ہوئے۔ جملہ (۱۶۵۰۰) امیدواروں نے فارمس داخل کیے لیکن شب برات کی وجہ سے
رف (۱۳۳۹۷) امیدوار ہی شریک امتحان رہے۔ ان میں سے (۱۲۵۱۷) امیدواروں نے کامیابی حاصل کی۔

حائنہ ادارہ ادبیات اردو:

ماہ جنوری ۹۶ء میں حیدرآباد شہر کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں اور بیرونی ممالک سے پروفیسروں، اسکالروں، ادیبوں،
:عروں، اور دانش وروں نے ادارہ ادبیات اردو کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا اور اپنی قیمتی آرا، مشوروں اور تاثرات سے نوازا۔

؛کٹر جمال ملک (بون۔ جرمنی)

I was very impressed by the work of this institution which is striving for the preservatio and development of Urdu language. Especially the Idara and manuscript section i worth consulting. Would like to wish the its secretary Prof. Mughni Tabassum all th best for the future.

ںجاب منظور غوری صاحب: (کیلی فورنیا۔ امریکہ)

میری خوش قسمتی ہے کہ آج ادارہ ادبیات کو مختصراً دیکھنے کا موقع ملا اور محترم مغنی تبسم صاحب نے ادارے کا تعارف کروایا۔ جس
بت اور لگن سے یہ کام ہو رہا ہے اس سے پوری امید ہے کہ اللہ رب العزت اس ادارے کو ترقی عطا کریں گے اور دنیا کے ہر شہر میں اردو
ںنے اور اردو سے محبت رکھنے والوں کو اس کی کتابیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔ (۹/ جنوری ۱۹۹۶ء)

ںاب بلراج کومل صاحب: (دہلی)

آج کم و بیش تین برس کے وقفے کے بعد مجھے ادارہ ادبیات اردو میں آنے کا موقع ملا۔ اس وقفے میں ادارے میں جو خوش گوار تبدیلیاں آئی ہیں ان سے میں متاثر ہوا ہوں۔ ادارے کی عمارت، مشرقی انتظامی امور، ادارے کے مخطوطات کی ترتیب میں اراکین اور جناب مغنی تبسم سکریٹری کی توجہ، لگن اور محنت سے ایک جمالیاتی وقار پیدا ہو گیا ہے۔ (۱۰/ جنوری ۔ ۹، ۱۰ء)

جناب گیان سنگھ شاطر صاحب: (حیدرآباد)

میں تینتیس برس سے حیدرآباد میں مقیم ہوں لیکن ادارہ ادبیات اردو کو دیکھنے کا حسین اتفاق آج بطرز کو مل کے ساتھ ہوا۔ یہاں جس خوش اسلوبی سے کتابوں کو محفوظ رکھا گیا ہے اسے دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ یہ جان کر مزید مسرت ہوئی کہ ملک اور باہر کے ملکوں سے ادیب اور اسکالر آتے ہیں اور کتابوں کے ذخیرے سے مستفید ہوتے ہیں۔ مغنی تبسم صاحب اپنے قیمتی وقت کو جس طرح ادارے پر صرف کر رہے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ مجھے اردو خطاطی کے طالب علموں کا کام خاص طور پر پسند آیا۔ (۱۰/ جنوری ۱۹۹۶ء)

جناب وارث علوی صاحب: (احمدآباد)

آج ادارہ ادبیات اردو کا معائنہ کیا اور اس کی ثقافتی ثروت مندی کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ دیواریں دکن کے حکمرانوں اور مجاہدین کی خوب صورت تصویروں سے مزین تھیں۔ تصاویر کے اس گراں مایہ ذخیرے کو اگر ایک تاریخی البم کی صورت میں پیش کیا جائے تو ایسا البم ایک یادگار تہذیبی کارنامہ ہوگا۔ حکومت اور دوسرے اداروں کو چاہیے کہ ایسے کاموں کے لیے وہ ادارے کی متوقع مالی اعانت کریں۔

اسی طرح ادارے کے مخطوطات کا سکشن نوادرات سے مالامال ہے اور مخطوطات کی حفاظت نہایت سائنسی طریقوں سے کی گئی ہے۔ ان مخطوطات پر طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی یہ احساس قوی ہو گیا کہ ابھی تحقیق کا کتنا کام باقی ہے۔ تاریخ کے بعض نادر مخطوطات دیکھ کر جی چاہا کہ اگر ان کے تراجم یا تلخیصات فراہم کی جائیں تو ہمارے علم تاریخ کے شعبے میں کتنا زبردست اضافہ ہوگا۔

خطاطی کی کلاسیں بڑی خوش اسلوبی سے جاری ہیں اور بہت سے طلبا ان سے فیض اٹھاتے ہیں۔ خطاطی کے حیرت ناک اور دل نواز نمونے بھی نظر سے گزرے۔ اس ادارے کی ترقی کا خواہش مند ہوں۔ (۱۶/ جنوری ۱۹۹۶ء)

پروفیسر ابوالکلام قاسمی (شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

آج ۱۸/ جنوری ۱۹۹۶ء کو ادارہ ادبیات اردو میں آنے کی سعادت نصیب ہوئی اور اندازہ ہوا کہ اس ادارے کو ایک اہم اور وقیع ذخیرے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں محفوظ کتابیں، مخطوطات اور فرامین کو دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ یہاں کے ذخیرے کو جمع کرنے میں محی الدین قادری زور صاحب نے جو اردو ادب و تہذیب کی خدمت انجام دی ہے وہ حیدرآباد والوں پر ہی نہیں پوری اردو زبان اور اس زبان سے وابستہ تہذیب کے لیے باعث فخر ہے۔ اس زمانے میں پروفیسر مغنی تبسم نے جس طرح ہر طرح کے آثار کو نئی زندگی دینے کی کوشش کی ہے اور جس طرح وہ توجہ، لگن اور عقیدت کے ساتھ یہ خدمت انجام دے رہے ہیں وہ بلاشبہ بے لوث اور مخلصانہ ہے۔ ہماری دعا اور تمنا ہے کہ خدائے تعالیٰ اس ادارے میں محفوظ آثار کو مستقبل کے لیے مزید محفوظ رکھنے کے تمام وسائل فراہم کرے۔ (۱۸/ جنوری ۱۹۹۶ء)

ڈاکٹر خورشید احمد (ریڈر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

آج ادارہ ادبیات اردو کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ زندگی میں میں نے اتنے قدیم مخطوطات پہلی بار دیکھے۔ جی چاہتا ہے کہ مزید استفادے کے لیے پھر حاضر ہوں۔ امید ہے کہ جب دوسری بار حاضر ہوں گا اس میں اور زیادہ نکھار آئے گا۔ ایسی نادر چیزیں دیکھ کر اپنے قدیم ورثے پر فخر کا احساس شدید ہو گیا۔ محققین اور طلبا کے لیے ادارہ بہت وقیع اور اہمیت کا حامل ہے۔ (۱۸/ جنوری ۱۹۹۶ء)

محترمہ صدیقہ شبنم صاحبہ (کینٹ۔انگلستان)

آج چند سال بعد دوبارہ ادارہ ادبیات اردو کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ گذشتہ چند سالوں میں بہت سی خوش گوار تبدیلیاں عمل میں آئیں ہیں۔ نادر مخطوطات، فرامین اور کتابوں کو محفوظ کرنے کے لیے Fumigation chambers بنائے گئے ہیں۔ پروفیسر جعفر نظام، ڈاکٹر مغنی تبسم اور تمام معاونین کی کاوشیں قابل قدر ہیں لیکن اس ادارے کو حکومت کی طرف سے بھی مالی تعاون کی ضرورت ہے تاکہ اردو کے نایاب سرمائے کو محفوظ کیا جاسکے۔ مجھے اس بات سے بھی دلی خوشی ہوئی ہے کہ ادارے کی جانب سے اردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو انشا کے امتحانات ہورہے ہیں اور اس سال تقریباً سولہ ہزار طلبہ اور طالبات نے ان امتحانوں میں شرکت کی۔ میں ادارے کو اس کارنامے پر مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ (۱۹ جنوری ۱۹۹۶ء)

اکبر حیدرآبادی (برسٹل۔انگلستان)

عجب بات ہے کہ حیدرآباد نژاد ہونے کے باوجود مجھے ادارہ ادبیات اردو کے اس نایاب خزانے کی آج سے پہلے زیارت نصیب نہیں ہوئی اور یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں یہاں زیادہ وقت نہ گزار سکا جب کہ یہ حیدرآباد کی تہذیبی اور سیاسی زندگی کا ایسا میوزیم ہے جس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ میں اس عظیم الشان Collection کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا بلکہ حیدرآبادی ہونے کے تعلق سے مجھے دلی بلکہ روحانی مسرت حاصل ہوئی۔ (۳۰ جنوری ۱۹۹۶ء)

جناب سردار الہام صاحب (حیدرآباد)

ادارہ ادبیات اردو سے یوں تو پچھلی نصف صدی سے واقف تھا مگر آج اتفاق سے تفصیلی طور پر نوادرات، کتب خانہ اور مختلف تاریخی شواہد و آثار دیکھنے کا شرف حاصل ہوا اور ڈاکٹر زور، نواب عنایت جنگ و مہدی نواز جنگ وغیرہ کے ذوق، لگن اور اور تجسس کے ساتھ ان قدیم آثار کی فراہمی اور ان کا تحفظ جس جاں فشانی سے کیا گیا اس سے ان بزرگوں کی عظمت اور رفعت میرے دل میں افزوں ہو گئی۔ (۳۰ جنوری ۱۹۹۶ء)

****

سید جلیل الدین

اشاریہ ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد جنوری تا دسمبر ۱۹۹۵

مقالے

اثر، محمد علی، ڈاکٹر	۱۔ جناب محمد اکبرالدین صدیقی	جنوری تا مارچ
	۲۔ ادارہ ادبیات اردو میں "دیوان ولی" کا ایک نادر مخطوطہ	اکتوبر و نومبر
احتشام احمد ندوی، سید، ڈاکٹر	ادب عام کا ارتقاء	جولائی تا ستمبر
اکبر علی بیگ، مرزا۔ پروفیسر	نواب سراج الدین احمد صاحب کی یاد میں	اکتوبر و نومبر
الطاف جاوید، ڈاکٹر	یکانگی	اکتوبر و نومبر
انورالدین، محمد۔ ڈاکٹر	حیدرآباد دکن میں بچوں کے رسائل	جولائی تا ستمبر
آثم راہدیری	اردو کے چند ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات اور ان کے آٹوگراف	اپریل تا جون
خلیل الدین صدیقی، محمد	آہ پھوپا حضرت	جنوری تا مارچ
داؤد اشرف، سید۔ ڈاکٹر	۱۔ شمس العلماء عزیز جنگ ولا کی قدر افزائی	اپریل تا جون
	۲۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، لندن یونیورسٹی	اکتوبر و نومبر
راشد آزر	کیفی اعظمی کا شعری آہنگ	جنوری تا مارچ
رفیع الدین قادری، سید	نواب سراج الدین احمد صاحب مرحوم	اکتوبر و نومبر
سلیمان اطہر جاوید	دکنی مثنویوں کے اہم کردار	اکتوبر و نومبر
عبدالقیوم، محمد	چارمینار کی چالیس نشانیاں	اپریل تا جون
عزیز بانو	عہد بہمنیہ کا فارسی شاعر۔ عصامی	جنوری تا مارچ
غیاث اقبال۔ ڈاکٹر	اردو شاعری کا مسی فس۔ فانی بدایونی	جولائی تا ستمبر
گیان چند، پروفیسر	بہ یاد حیدرآباد	جولائی تا ستمبر
معین الدین جینا بڑے، ڈاکٹر	دکن کی بول چال	دسمبر
مغنی تبسم	کیفی اعظمی کا شعری سفر	جنوری تا مارچ
نورالدین خاں، محمد	بھولی بسری باتیں	اپریل تا جون
ہاشم علی اختر، سید	جناب سراج الدین احمد صاحب	اکتوبر و نومبر
وقار خلیل	محمد اکبرالدین صدیقی کی یاد میں	جنوری تا مارچ
یوسف سرمست، پروفیسر	"ایسی بلندی ایسی پستی" اور حیدرآبادی تہذیب	دسمبر

[illegible]

[illegible]

کتاب

کتاب: مرد ناقص [illegible]

۱- اوراق پارینہ (باب ۹)
۲- [illegible] (باب ۸)
۳- [illegible] (باب ۹)
۴- [illegible] (باب ۱۰)
۵- [illegible] (باب ۱۱)

افسانے

[illegible]

جنوری تا مارچ
اپریل تا جون
جولائی تا ستمبر
اکتوبر تا دسمبر
ایضاً

	نظمیں		
اسلم عمادی	بکھری سمتوں میں	جنوری تا مارچ	۸۰
اشرف رفیع، پروفیسر	تین نظمیں	اکتوبر و نومبر	۷۴
افتخار نسیم	سلام عقیدت	اکتوبر و نومبر	۷۴
اکبر حیدرآبادی	۱۔ سوال بے جواب، ۲۔ ناممکن	اپریل تا جون	۶۷
بانو طاہرہ سعید	نظمیں	جولائی تا ستمبر	۴۷
چندر شیکھر۔ ایس، پروفیسر	۱۔ اشک ندامت، ۲۔ شاعری	جنوری تا مارچ	۸۴
ترجمہ: ڈاکٹر مقبول فاروقی		//	
حامد بن شبیر	فرق نظر	جنوری تا مارچ	۸۴
رشید آذر	۱۔ بہتے جل کا درپن، ۲۔ قحط الرجال	جولائی تا ستمبر	۴۵ تا ۴۶
//	۱۔ درون پردہ، ۲۔ یہ کون ہے، ۳۔ اندھیرا	دسمبر	۳۸ تا ۴۰
//	۴۔ کمپیوٹر بگ	//	
صفیہ اریب	نظم	جنوری تا مارچ	۸۱
	نظمیں	اپریل تا جون	۶۴
ماہر موسوی	۱۔ بے گھرا، ۲۔ منتخب اشعار	دسمبر	۳۶ تا ۳۷
فاطمہ تاج	دریا دل کا	جنوری تا مارچ	۸۴
قاضی سلیم	۱۔ مسافت، ۲۔ وعید، ۳۔ بدلتے منظر	جولائی تا ستمبر	۴۰ تا ۴۴
قمر ساحری	محمد قلی قطب شاہ	اپریل تا جون	۶۴
کشور ناہید	۸/ مارچ (بین الاقوامی یوم خواتین)	اپریل تا جون	۶۱
کیفی اعظمی	۱۔ ملاقات، ۲۔ اندیشے، ۳۔ عورت، ۴۔ بہروپنی	جنوری تا مارچ	۳۷ تا ۴۶
//	۵۔ گربھ ونتی، ۶۔ مکان، ۷۔ دائرہ، ۸۔ دوپہر	//	
مصحف اقبال توصیفی	میں یہ چاہتا ہوں	جنوری تا مارچ	۸۰
وزیر آغا	یہی اپنا ٹھکانہ ہے	جولائی تا ستمبر	۳۹
وقار خلیل	وابستگی	جنوری تا مارچ	۸۴
//	غزلیں	//	
اسلم عمادی	سازش ہے اہل فتنہ کی اسلم تمام تر	اکتوبر و نومبر	۸۴
افتخار نسیم	۱۔ گھر بسا کر چھوڑ دینا کتنا مشکل ہو گیا	اکتوبر و نومبر	۸۰
//	۲۔ بہار میں یہ زمین کس سے پوچھ کر کھلے	//	
//	۳۔ تو نے دے دی ہے مجھے درد کی دولت کیسی	//	
//	۴۔ ہے جستجو اگر اس کو ادھر بھی آئے گا	اکتوبر و نومبر	۸۱

[illegible]	۱۔ مرزا غالب کی مادری بولی [illegible]	[illegible]	۵۰
	۲۔ فکر و نظر تھی خلش [illegible]	"	۰
	۳۔ کب اس سے شکوہ کرے [illegible]	دسمبر	۳۱
	۴۔ اپنی بات کی لطف تول	"	۰
	۵۔ میری [illegible] شام میں تھی [illegible]	دسمبر	۳۲
	۶۔ وہ یادوں میں رہتا ہے اور نظر [illegible]	"	۰
	۷۔ وہ دھوپ سی عمر بسر کرتا ہے	"	۰
	۸۔ خواب میں تھا میں کہ [illegible]	دسمبر	۳۳
ظفر مجید (مترجم)	۱۔ تمہیں میرے لیے یادوں [illegible]	اکتوبر و نومبر	۷۵
مرزا غالب کی فارسی	۲۔ سرجھکا۔ خون دل سے زباں تک ہے [illegible]	اکتوبر و نومبر	۷۶
غزلوں کا منظوم ترجمہ	۳۔ زاہد کون ہے؟ مسجد کیا ہے؟ اور محراب کہاں ہے؟	اکتوبر و نومبر	۷۷
	۴۔ ہوئی اک عمر میری ضائع عشق [illegible] میں	اکتوبر و نومبر	۷۸
	۵۔ [illegible] میں بس میری تو حیرت ہی رقم ہے	اکتوبر و نومبر	۷۹
ظفر عبدالرحیم	لہجہ کانوں میں [illegible]	جنوری تا مارچ	۸۷
	رباعیات	"	۰
قضا ابن فیضی	۱۔ حلقہ گرداب، ۲۔ ابھی زندہ ہے، ۳۔ [illegible]	جولائی تا ستمبر	۴۸
	یادیں	"	۰
اقبال حسین	۱۔ باتیں ہماریاں	جنوری تا مارچ	۴۷
	۲۔ باتیں ہماریاں	دسمبر	۲۳
مصطفیٰ [illegible] (بحر السنت)	بڑے صاحب۔ کچھ پرانی یادیں	اکتوبر و نومبر	۱۳
	اشاریہ	"	۰
خلیل الدین، سید	اشاریہ ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد جنوری تا دسمبر ۱۹۹۳ء	جولائی تا ستمبر	۹۰
	اداریے	"	۰
ادارہ	پہلی بات	اکتوبر و نومبر	۳
[illegible]	۱۔ پہلی بات	اپریل تا جون	۳
	۲۔ پہلی بات	جولائی تا ستمبر	۳
	مطالعہ		
[illegible]	اردو لسانیات سے آگے	اکتوبر و نومبر	۵۲
[illegible]	"دستور [illegible]" پر ایک نظر	جولائی تا ستمبر	۴۹
[illegible]	[illegible] ڈاکٹر [illegible]	جولائی تا ستمبر	۴۷

تبصرے

[illegible] علی	[illegible]	اپریل تا جون	[illegible]
[illegible] احساس، ڈاکٹر	۱۔ [illegible]	اپریل تا جون	[illegible]
	۲۔ [illegible] (ڈاکٹر [illegible])	اکتوبر تا دسمبر	[illegible]
	۳۔ [illegible]	اکتوبر تا دسمبر	[illegible]
[illegible]	سبزہ [illegible] (انشا ابن قیصر)	دسمبر	[illegible]
[illegible]، پروفیسر	[illegible]	اپریل تا جون	[illegible]
سلیمان اطہر جاوید	اردو شعری [illegible] (ڈاکٹر فہمیدہ بیگم)	جولائی تا ستمبر	[illegible]
[illegible]، ڈاکٹر	[illegible]	جولائی تا ستمبر	[illegible]
[illegible]	[illegible]	اپریل تا جون	[illegible]
[illegible]، ڈاکٹر	اردو شعری [illegible] (ڈاکٹر فہمیدہ بیگم)	اپریل تا جون	[illegible]
[illegible]، پروفیسر	رقص تنہائی (علی [illegible])	اپریل تا جون	[illegible]
[illegible]	۱۔ ذروں سے ستاروں تک (اکبر حیدرآبادی)	اپریل تا جون	[illegible]
	Faiz Ahmed Faiz - Selected Poems-۲ (ترجمہ پروفیسر [illegible])	جولائی تا ستمبر	[illegible]
	۳۔ [illegible] (سردار [illegible])	جولائی تا ستمبر	[illegible]
	۴۔ [illegible]	اکتوبر تا دسمبر	[illegible]
[illegible]	۵۔ نقوش حیات (ریاست علی [illegible])	اپریل تا جون	[illegible]
[illegible]	مضراب ([illegible])	جولائی تا ستمبر	[illegible]
[illegible]، محمد	ڈاک گھر (مرتب: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم)	دسمبر	[illegible]

وفیات

[illegible]	۱۔ [illegible] ۲۔ [illegible] علی خان [illegible] ۳۔ ساغر حیدرآبادی ۴۔ [illegible] ۵۔ [illegible] محمد [illegible] ۶۔ [illegible] ۷۔ [illegible] ۸۔ محمد [illegible] ۹۔ [illegible] ۱۰۔ [illegible] ۱۱۔ [illegible] ۱۲۔ [illegible]	جولائی تا ستمبر	[illegible]

[illegible]

وقار خلیل

وفیات

سیفی پریمی:

ڈاکٹر خلیل الرحمن سیفی پریمی (۲۰/ جنوری ۱۹۱۳ء - ۲۹/ نومبر ۱۹۹۵ء) اردو شعر و ادب کے معروف فرد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے لکچرار۔ سیفی پریمی، بدایون کے مردم خیز قصبہ گنور میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے، ایم۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پہلے خورجہ سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۳ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں لکچرار رہے۔ آٹھ سال قبل ایک حادثے میں زخمی ہوجانے کی وجہ سے معذور ہوگئے تھے اس کے باوجود قلم کے ذریعے آخری سانسوں تک اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ شاعر، ادیب، محقق، اسکالر اور صحافی کی حیثیت میں سیفی پریمی نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۲ء میں شعری مجموعہ "خلش" شائع ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں مالک رام کے ساتھ "جگر بریلوی شخصیت اور فن" کتاب ترتیب دی۔ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ "حیات اسماعیل میرٹھی" شائع کیا۔ دو ناول "آدھی گھڑی" اور "سوالیہ بہار کی" بھی شائع ہوئے۔

سیفی مرحوم صاف گو، بے باک اور خوددار انسان تھے۔ پسماندگان میں بیوہ اور ایک بیٹی ہیں۔

بدرالدین طیب جی:

ممتاز دانش ور جناب بدرالدین طیب جی کا ۲۸/ دسمبر ۱۹۹۵ء کی صبح دہلی میں ۸۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ طیب جی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شیخ الجامعہ ہونے سے قبل انڈونیشیا، بلجیم، بون (جرمنی)، تہران اور جاپان میں ہندوستان کے سفیر کی حیثیت میں کارگزار رہے۔ پروفیسر بدرالدین طیب جی حیدرآباد میں بھی مقیم رہے۔ موصوف نے ادارہ ادبیات اردو کی مختلف تقاریب میں شرکت کی تھی اور مفید مشوروں سے نوازا تھا۔ بہ حیثیت دانش ور اور ماہر تعلیم ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ ایک جدید ساز شخصیت تھے۔ ملک کی خارجہ پالیسی وضع کرنے میں اپنے سیکولر نظریات کے تناظر میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ بدرالدین فیض الحسن طیب جی کی تدفین جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پرانے قبرستان میں ان کی بیگم ثریا مرحومہ کے پہلو میں عمل میں آئی۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی:

اردو کے نامور محقق، ادیب، نقاد اور صاحب طرز قلم کار پروفیسر خواجہ احمد فاروقی سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی طویل علالت کے بعد ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۵ء کو رحلت کرگئے۔ فاروقی صاحب ۳۰/ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو ٹکراؤں ضلع مرادآباد (یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ فارسی اور اردو میں امتیازی درجوں کے ساتھ ایم۔ اے کیا تھا۔ دہلی یونیورسٹی سے مکتوب نگاری کے فن پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

۱۹۴۷ء کے بعد دلی میں یونیورسٹی کی سطح پر اردو تعلیم و تدریس و تحقیق کو فروغ دینے کا سہرا پروفیسر فاروقی کے سر جاتا ہے۔ مرحوم نے دہلی یونیورسٹی میں اعلیٰ سطح تک اردو تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا تھا۔ خواجہ صاحب کے زمانے میں اردو، فارسی اور عربی کے علاحدہ علاحدہ شعبوں کا قیام عمل میں آیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریر کے مطابق "وہ فقط اردو کے استاد ہیں جو اردو کے سفیر بن کر ہندوستان سے باہر مختلف یونیورسٹیوں میں توسیعی لکچرز کے سلسلہ میں مدعو کیے جاتے رہے۔ آج دنیا کی مختلف جامعات میں اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ اس انتظام کے بنیا

گروہوں میں خواجہ صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی تصانیف میں "میر تقی میر حیات اور شاعری"، "یادیارِ مہرباں"، "مرزا شوق لکھنوی"، "ذوق و جستجو" (مجموعہ مضامین)، "کربل کتھا"، غالب کے فارسی رقعات، "دستنبو" کا اردو اور انگریزی ترجمہ قابلِ ذکر ہیں۔ مکتبہ جامعہ دہلی نے خواجہ صاحب کی شخصیت اور فکر و فن پر "کتاب نما" کا ایک خاص نمبر مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم بھی شائع کیا تھا جسے کتابی صورت میں دیدہ زیب طباعت سے آراستہ کیا گیا ہے۔

اوپندر ناتھ اشک: (۱۴/دسمبر ۱۹۱۰ء۔۔ ۱۹/جنوری ۱۹۹۶ء)

اردو کے نامور ادیب، تاریخ ساز افسانہ نویس، ناول نگار اور محقق اوپندر ناتھ اشک نے تقریباً ستر سال اردو ادب کی بے لوث خدمت انجام دی۔

اشک نے جالندھر کے برہمن خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ ۱۹۳۱ء میں ڈی۔اے۔وی کالج جالندھر سے بی۔اے کی ڈگری لی اور پھر ایک سال بعد قانون کا امتحان پاس کیا اور اسی کالج میں وہ انگریزی اور تاریخ کے لیکچرر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد وہ لاہور چلے گئے اور صحافت سے منسلک ہوئے۔ اردو کے مختلف اخبارات میں نامہ نگاری شروع کی۔ کہانیوں اور ڈراموں کے ذریعے اپنی شناخت بنائی۔ ماہنامہ "پریت لڑی" (ہندی، اردو) کے ایڈیٹر بھی رہے۔ پھر دہلی چلے آئے اور آل انڈیا ریڈیو میں ہندی کے مشیر کار کی ذمہ داریاں سنبھالیں جہاں صفِ اول کے افسانہ نویس ادیبوں اور شاعروں جیسے منٹو، ن۔م راشد اور کرشن چندر سے ان کے مراسم استوار ہوئے۔ فوجی اخبار "سینک سماچار" ہندی کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے اور پھر منٹو کی خواہش پر وہ بمبئی چلے آئے۔ اور "فلمستان اسٹوڈیو" سے وابستہ ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد اشک نے الہ آباد میں اپنے اشاعتی ادارے کے ذریعے تخلیقی اور اشاعتی منصوبوں کو آگے بڑھایا۔

اوپندر ناتھ اشک نے شاعر کی حیثیت سے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا، افسانہ اور ڈرامہ سے ان کی دل چسپی اور پریم چند شناسی کے سبب اشک نے اپنے متاثر کن اسلوب کو بروئے کار لاتے ہوئے شاہ کار ناول اور ڈرامے لکھے اور چھپوائے۔ "ستارے"، "بڑی بڑی آنکھیں" اشک کے وہ ناول ہیں جنھیں علمی و ادبی حلقوں میں اہم قرار دیا گیا۔ اشک نے ماحول، معاشرے اور زندگی کے واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کر کے سماج کی تاریخ اور عہد کے عکس کو آئینہ دکھایا ہے۔ اشک کی تخلیقات بلاشبہ اردو ادب میں خوش گوار اضافہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ انھوں نے اپنی تصانیف کے ہندی ایڈیشن بھی شائع کیے۔ سنگیت ناٹک اکیڈمی حکومت ہند نے ۱۹۶۵ء میں بہترین ڈرامہ نگار کا ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں سوویت لینڈ کا نہرو ایوارڈ بھی دیا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں وہ حکومت ہند کے ریڈیو، ٹی وی کے اعزازی مشیر اور پروڈیوسر بھی رہے۔ ۱۹۸۹ء میں اوپندر ناتھ اشک کو وکرم شیلا گاندھی ودیا پیٹھ بہار کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا گیا اور اسی سال انجمن ترقی اردو ہندوستان نے اشک کی پچاس سالہ اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اعزاز سے نوازا۔ وزارت تعلیم حکومت ہند نے ان کے ناول "گرتی دیواریں" کی تکمیل کے لیے تین سال کا فیلوشپ منظور کیا۔ اس کے علاوہ اشک کی ۸۰ویں سال گرہ کے موقع پر دوردرشن جالندھر نے ان کی شخصیت اور فکر و فن پر دستاویزی فلم تیار کی۔

اشک اردو ادب کے روشن عہد کی ایک معتبر علامت تھے جو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، اور عصمت چغتائی جیسے عہد ساز افسانہ نگاروں سے عبارت تھی۔

پروفیسر نعیم احمد

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو کے چیئرمین اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر نعیم احمد کا ۲۲/جنوری کو انتقال ہو

تحریریں

ادارے کی تحریریں

ادارے کی تحریریں

رپورٹ

یوم محمد قلی قطب شاہ ... ب — اپریل ...

نتائج امتحانات

نتائج امتحانات ادارہ ادبیات اردو منعقدہ اکتوبر ۱۹۵ — دسمبر ...

اردو ماہر، اردو عالم، اردو فاضل

فون 310469

بیادگار سید محی الدین قادری زور

سن اجراء ۱۹۳۸

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۵۸

شمارہ: ۴

اپریل ۱۹۹۶ء

دکنی کلچر نمبر

فی پرچہ	: ۱۰ روپے
زرسالانہ	: ۱۰۰ روپے
کتب خانوں سے	: ۱۲۵ روپے

مشرق وسطی اور امریکہ	: ۲۵ ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	: ۱۰ ڈالر
انگلستان	: ۱۵ پونڈ

ناشر: ادارہ ادبیات اردو

پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۸۲

کمپیوٹر کتابت: شارپ کمپیوٹرس

رحمن راج سکسینہ، ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے ایس۔ ایس گرافکس میں طبع کرا کے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا

اس شمارے میں

پہلی بات

دکنی کلچر نمبر پیش خدمت ہے۔ دکنی کلچر ایک وسیع موضوع ہے۔ اردو میں اس موضوع پر اب تک دو ایک کتابیں اور چند مضامین ہی لکھے گئے ہیں۔ کلچر کا تعلق زبان سے بھی ہوتا ہے۔ جب ہم دکنی کلچر کہتے ہیں تو اس سے مراد وہ کلچر ہے جو دکن میں اردو (دکنی) زبان کے ساتھ پروان چڑھتا گیا۔ جس طرح شمال سے لائی گئی اس بول چال کی زبان کو ادبی اور علمی معیار پر پہنچانے اور ترقی دینے میں دکن (گجرات، مہاراشٹر، آندھرا، کرناٹک) کی مختلف زبانوں نے حصہ لیا اسی طرح دکنی کلچر کی صورت گری میں ان علاقوں کی قدیم ثقافتوں کا حصہ رہا ہے۔ دکنی کلچر کے مطالعے کے لیے ان قدیم ثقافتوں سے آگہی بھی ضروری ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں دو سال قبل "دکنی کلچر کے چند پہلو" کے عنوان سے ایک سمینار منعقد کیا گیا تھا۔ بعض فاضل مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے نظر ثانی کے بعد اشاعت کے لیے دینے کا وعدہ کیا تھا جو تاحال پورا نہیں ہوا۔ جو مقالے وصول ہوئے تھے ان میں سے چند سب رس کی گذشتہ اشاعتوں میں شائع کیے گئے۔ جو مقالے بچ رہے تھے وہ اس نمبر کی زینت ہیں ان کے علاوہ چند اور مقالے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دکنی کلچر کے مطالعے کا یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے۔

(ادارہ)

ڈاکٹر معین الدین عقیل

دکن اور ایران

(سلطنت بہمنیہ اور ایران کے علمی و تمدنی روابط)

دکن پر مسلمانوں کے حملے:

ہندستان کی تاریخ تہذیب و تمدن میں مجموعی حیثیت سے دکن نے بڑا نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہندستان کی تاریخ کے تمام بڑے رجحانات اس میں موجزن رہے ہیں۔ یہ خطہ تمام برعظیم میں اپنی جغرافیائی، تہذیبی اور ادبی دل فریبیوں کا بہت بڑا مخزن ہے۔ معاشرتی، تہذیبی اور ادبی اعتبار سے برعظیم کے عہد وسطیٰ کا کوئی حصہ دکن کے مقابلے میں تمدنی میراث اور ثقافتی ترکہ سے مالا مال نہیں۔ یہ اپنی امتیازی خصوصیات، جغرافیائی محل وقوع اور دوسرے قدرتی عوامل، زبان، نسل اور مذہب کے تنوع کے اعتبار سے عجوبہ روزگار رہا ہے۔ مسلمان پہلے پہل یہاں تبلیغ اسلام کے لیے آئے تھے۔ اس کے بعد شمال کی جانب سے ان کے حملے ہوتے رہے۔ جن کے نتیجے میں دکن مسلمانوں کی سلطنت میں آگیا۔ علاء الدین خلجی پہلا حملہ آور تھا جس نے ۱۲۹۴ء میں دکن کا رخ کیا اور دیوگری پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا۔ پھر اس کے کچھ حصہ کو علاء الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے ۱۳۱۰ء میں فتح کرکے راس کماری تک پہنچادیا۔ قطب الدین مبارک شاہ نے دیوگری میں اپنے وزیر، صوبے دار اور دوسرے عہدے دار مقرر کیے۔ اور امرا کو دکن میں جاگیریں دیں۔ خلجیوں کے خاتمے کے بعد محمد تغلق نے بھی مبارک شاہ کا الحاقی مسلک برقرار رکھا۔ اس نے بیدر اور ورنگل کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ محمد تغلق کے پیش نظر دکن میں مسلمانوں کی آباد کاری کا ایک بہت بڑا منصوبہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک اس امر میں اہتمام نہ کیا جائے شمالی ہند کے مسلمان یہاں آباد نہیں رہ سکتے اور دکن اور جنوب ہند کے دور دراز علاقوں پر حکومت ممکن نہیں۔ اس نے اس بنا پر دیوگری کو دولت آباد کے نام سے اپنا ایک جنوبی پائے تخت بنانے کی کوشش کی تھی مگر اس کے بہت سے منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی ناکام ہوا۔ ان منصوبوں کی ناکامی اور اس کی حکمت عملی کی بدنظمی نے حکومت کو یہ بڑا نقصان پہنچایا کہ مرکز گریز فضا پیدا کردی۔ تلنگانہ اور کرناٹک میں ہندو طاقتوں نے سر اٹھایا۔ مدورا کا صوبے دار جلال الدین احسن شاہ خود مختار ہوگیا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد مالوہ اور گجرات کے "امیرانِ صدہ" میں ہلچل شروع ہوگئی۔ دکن کے "امیرانِ صدہ" بھی بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام:

محمد تغلق کے لیے دکن کی بغاوت زیادہ روح فرسا ثابت ہوئی۔ دکن سے اس کو دلی تعلق تھا۔ اس نے بغاوت کو دبانے کی کوشش کی۔ لیکن ایسی صورت حال پیدا ہوگئی تھی کہ اسے شکست کھانا پڑی اور دکن دہلی سے علاحدہ ہوگیا۔ "امیرانِ صدہ" ترک افسر تھے جو خلجیوں کے زمانے سے جنوبی خطوں کی دیکھ بھال کے لیے مامور تھے۔ تغلقوں کے زمانے میں ان میں اور اضافہ ہوا اور بے شمار ترک خاندان دکن کے طول و عرض میں آباد ہوگئے۔ یہی "امیرانِ صدہ" دکن کے عہد وسطیٰ کے تاریخ ساز بنے۔ انھوں نے دکن کی سیاسی اور تمدنی خدمت بھی کی اور

اپنے سیاسی اور تہذیبی شعور سے سلطنت دکن کی تعمیر بھی کی۔

محمد تغلق سے بغاوتوں کے زمانے میں اہلِ دکن کی رہبری اسماعیل مخ کرتا رہا۔ ان باغیانہ سرگرمیوں میں ظفر خاں، جس کا نام حسن تھا، زیادہ سرگرم تھا۔ یہ ایک سربرآوردہ "امیرِ صدہ" تھا۔ بہت جری اور باحوصلہ سمجھا جاتا تھا۔ اسماعیل مخ کے بڑھاپے کو دیکھتے ہوئے سب امیروں کی نظریں اس پر پڑنے لگی تھیں۔ خود اسماعیل مخ بھی ظفر خاں کا قائل تھا اور اسے اپنا نائب سمجھتا تھا۔ چناں چہ دکن کی نئی سلطنت پر ۱۳۴۷ء میں ظفر خاں کو "علاء الدین حسن بہمن شاہ" کے لقب سے براجمان کیا گیا۔ یہ آزاد سلطنت اپنے قیام کے دو سال بعد "سلطنت بہمنی" کہلانے لگی۔ بہمن شاہ نے دولت آباد کے بجائے گلبرگہ کو حسن آباد کے نام سے سلطنت کا پایہ تخت بنایا۔ اس کے تقریباً اسی برس کے بعد اس کا سیاسی و تمدنی مرکز بیدر منتقل ہوا۔ اس کے لائق جانشینوں کے عہد میں یہ بہت بڑی سلطنت بن گئی، جو پاکیزہ نظم و نسق، بین الاقوامی دور اندیشی، ذہنی و اخلاقی تعمیری منصوبوں سے آراستہ تھی۔

بہمن شاہ (۱۳۴۷ء - ۱۳۵۸ء) کے بعد اس سلطنت کے سلاطین میں سے محمد شاہ اول (۱۳۵۸ء - ۱۳۷۵ء)، محمد شاہ دوم (۱۳۷۸ء - ۱۳۹۷ء)، فیروز شاہ (۱۳۹۷ء - ۱۴۲۲ء)، احمد شاہ ولی (۱۴۲۲ء - ۱۴۳۴ء) ایسے جلیل القدر، لائق اور باصلاحیت حکم راں تھے جو مشاہیرِ عالم کی صف میں شمار ہو سکتے ہیں۔ بہمن شاہ کے انتقال کے وقت سلطنت کی حدود شمال میں ماندا سے شروع ہو کر جنوب میں دریائے تنگبھدرا تک اور مشرق میں مونگیر تک اور مغرب میں گوا تک پھیل گئی تھیں، اور محمد شاہ لشکری کے عہد میں، جو ۱۴۶۳ء میں تخت پر بیٹھا تھا، سلطنت گوا سے مسولی پٹنم تک پھیل گئی تھی اور تمام سطحِ مرتفع پر بہمنی پرچم لہرا رہا تھا۔ اندرونی نظم و نسق کے لیے سلطنت کے چار صوبے بنائے گئے جو "طرف" کہلاتے تھے۔ اس پر چار "طرف دار" مقرر ہوئے۔ ملک سیف الدین غوری، جو اس سلطنت کا وزیرِ اعظم تھا، اس نئے انتظام اور نظم و نسق کا روحِ رواں تھا۔ محمد شاہ اول نے مرکزی اور مقامی حکومتوں کو مرتب کیا اور ان میں بڑا سلیقہ پیدا کیا۔ مرکزی حکومت میں آٹھ وزرا مقرر کیے اور دربارِ شاہی کی شان و شوکت میں بڑا اہتمام کیا۔

محمد شاہ ثانی کے عہد میں سلطنت خوش حال تھی۔ فیروز شاہ کا دور سلطنت کی تاریخ میں مثالی ہے۔ اس نے ملک کے نظم و نسق کے لیے لائق اربابِ سیاست مقرر کیے۔ اس عہد کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں زبردست علمی سرگرمیاں ہوئیں۔ قابل علماء جمع کیے گئے علم کی اس قدر حوصلہ افزائی تھی کہ گلبرگہ اس وقت کا بڑا علمی مرکز بن گیا تھا۔ احمد شاہ ولی نے گلبرگہ کے بجائے بیدر کو پایہ تخت بنایا۔ اس کے دور میں سلطنت میں غیر ممالک سے آنے والوں کا عمل دخل زیادہ بڑھ گیا تھا، جس سے عوام میں عصبیت کے جذبات نمایاں ہونے لگے۔ علاء الدین ثانی کے عہد میں یہ کش مکش زیادہ سخت ہو گئی۔ جب محمد شاہ لشکری نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اسے بڑی کامیابیاں ہوئیں۔ یہ اچھا سپاہی اور مدبر تھا۔ اس کے عہد میں سلطنت بھی وسیع ہو گئی۔ محمود گاواں اس کے دربار کا مشہور وزیر، عالم اور دانش ور تھا، جس نے نظم و نسق کے ساتھ ملک کی علمی خدمت بھی کی۔ لیکن اس دور میں دکنیوں اور غیر دکنیوں کی کش مکش بھی شدت اختیار کر گئی۔ محمود گاواں کے بعد جو اس کش مکش میں قتل کر دیا گیا تھا۔ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

بہمنی سلاطین کی علم دوستی:

سلاطینِ بہمنیہ کا دور بیش تر کشور کشائی، تسخیرِ ملک اور قیامِ امن میں گزرا۔ اس کے باوجود انھوں نے علوم و فنون اور ادب و شاعری

سرپرستی کی۔ انھوں نے شمال کے خلجی اور تغلق سلاطین کی علمی و ادبی روایات کو آگے بڑھایا۔ ان کے دربار میں ادیب، شاعر، فلسفی، مورخ، صوفی اور ارباب کمال موجود رہتے تھے۔ ان کی حکم رانی کے دور میں سرزمین دکن عالموں، فاضلوں، ادیبوں اور شاعروں کا گہوارہ بن گئی تھی۔ جنھوں نے علوم و فنون کو ترقی دی۔ ان کے علمی اور روحانی فیضان نے نہ صرف اہل ملک کو متاثر کیا بلکہ سلاطین بھی ان کی دانش مندی اور روحانی فیضان سے مستفید ہوتے رہے۔ رعایا کی تعلیم اور فن تعمیر کی طرف بھی سلاطین کی خاص توجہ تھی ان کے دور سلطنت کا امتیازی وصف تھا۔ تمام اہم علمی مراکز میں کتب خانے قائم تھے۔ مکاتب اور مدارس کے قیام میں بڑی دل چسپی لی تعلیمی اخراجات کے لیے سلاطین کی طرف سے جاگیریں وقف تھیں۔ اس لیے ان کی فوجی اور سیاسی ضرورتوں سے علمی اور تعلیمی ترقی کے امور میں رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی۔ ان سلاطین نے بحیثیت مجموعی اپنی بیدار مغزی، روشن خیالی اور علم پروری سے ہندوستان کو بیش قیمت علمی، ادبی اور تہذیبی ورثہ عطا کیا، خصوصاً دکن کی علمی سطح کو بلند کیا اور ایک خاص علمی اور تمدنی مزاج پیدا کر دیا۔

ان سلاطین میں بعض شخصیات کو اسلامی تاریخ میں مثالی حیثیت حاصل رہے گی۔ خود بانی سلطنت ایک بلند خیال اور قابل حکم ران تھا۔ اس میں بڑی مستعدی، کارکردگی اور جولانی تھی اور قدیم شاہ ایران بہمن بن اسفندیار کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے ایک بڑے پرشکوہ خاندانی پس منظر کے ساتھ تخت پر متمکن ہوا تھا۔ اسے علماء سے بڑا لگاؤ تھا۔ صاحب اقتدار ہونے سے قبل وہ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد سب سے پہلے حکم دیا تھا کہ پانچ من سونا اور دس من چاندی حضرت نظام الدین اولیا کی روح کو ایصال ثواب کے لیے شیخ برہان الدین غریبؒ کے ذریعے فقرا اور مساکین میں تقسیم کر دیا جائے۔ وہ فارسی جانتا تھا اور اس نے اپنے بیٹوں کی تعلیم کا معقول انتظام کیا تھا۔ "بوستان سعدی" شہزادوں کے نصاب میں شامل تھی۔ خود عالم نہ تھا لیکن اچھا علم دوست تھا۔ اس کے دربار میں کئی عالم ور شاعر اور عالم موجود تھے۔ محمد شاہ اول اور مجاہد شاہ بھی اچھے علم دوست حکم ران تھے۔ مجاہد شاہ ترکی زبان میں روانی کے ساتھ گفتگو کرنے کی قابلیت کے لیے مشہور تھا۔ محمد شاہ ثانی کو اس کی رعایا "ارسطو" کے نام سے پکارتی تھی۔ یہ بڑا عالم اور علم دوست انسان تھا اور علماء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس نے شریعت کو اپنے نظم حکومت کا مدار بنایا تھا۔ گذشتہ سلاطین کے مقابلے میں زیادہ علمی کمالات رکھتا تھا۔ فارسی اور عربی میں اسے اعلیٰ دست رس حاصل تھی اور دونوں زبانوں میں روانی کے ساتھ گفتگو کر سکتا تھا۔ علم و ادب کا بڑا سرپرست ثابت ہوا۔ اس نے تعلیم کے فروغ کے لیے اپنی سلطنت کے کئی شہروں گلبرگہ، بیدر، قندھار، ایلچ پور، دولت آباد، جول، دابیل وغیرہ میں مدارس تعمیر کیے اور ان کے اخراجات کے لیے اوقاف قائم کیے۔ محمد شاہ ثانی کے بعد فیروز شاہ ایک غیر معمولی شخصیت کا حامل بادشاہ تھا۔ محمد شاہ ثانی نے اس کی بڑی اچھی تربیت کی تھی۔ یہ علامہ فضل اللہ انجو جیسے عالم کا شاگرد تھا۔ اور ان سے زمانے کے تمام علوم متداول کی تحصیل کی تھی۔ مختلف علوم کے ساتھ ساتھ دنیا کی کئی زبانوں سے واقف تھا۔ مشرقی زبانوں کے علاوہ یورپی زبانوں میں بھی گفتگو کر سکتا تھا۔ خود شاعر بھی تھا۔ اور دیوان بھی رکھتا تھا۔ پہلے عروجی تخلص تھا جسے تخت نشینی کے بعد تبدیل کر کے نام کی مناسبت سے فیروزی کر دیا۔ نہ صرف علماء کی صحبت میں رہتا تھا بلکہ خود بھی علوم تفسیر، اصول حکمت، طبیعی و نظری میں مہارت رکھتا تھا اور ہفتہ میں تین دن پیر، بدھ، اور سنیچر کو مختلف مضامین کے درس دیتا۔ ریاضی میں "زاہدی" اور "شرح تذکرہ"، علم کلام میں "شرح مقاصد"، ہندسہ میں "تحریر اقلیدس" اور علوم معانی و بیان میں "مطول ملا سعید الدین" وغیرہ۔ ہر چوتھے دن سرکاری فرائض کی ادائیگی سے قبل قرآن حکیم کے سولہ صفحات کی نقل

کیا کرتا تھا۔ سید محمد گیسو دراز کا بڑا عقیدت مند تھا جو ان دنوں گلبرگہ میں تھے۔ جب وہ دکن پہنچے تھے تو فیروز شاہ نے علماء و مشائخ اور عسکر شاہی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا تھا۔

احمد شاہ ولی بھی فیروز شاہ کے اوصاف رکھتا تھا۔ ایک لائق سلطان اور بڑا عالم تھا۔ اس کے دربار میں علماء و ارباب کمال جمع رہتے۔ حضرت گیسو دراز کا بڑا معتقد تھا۔ مواضعات اور کثیر اراضی گلبرگہ کے قرب و جوار میں مستقلاً انھیں عطا کر دی اور ان کے لیے ایک بڑی درس گاہ تعمیر کرائی۔ اکثر ان سے مشورے بھی لیتا رہتا تھا۔ شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی سے خاص عقیدت تھی۔ اس کے نام میں "ولی" کا اضافہ اسی عقیدت کی مثال ہے۔ ان کے خانوادے کے دکن منتقل ہونے پر بڑی آؤ بھگت کی۔ سلطان علاء الدین بھی علم و فضل سے شغف رکھتا تھا۔ فارسی میں بڑی مہارت تھی۔ اور دوسرے علوم بھی خوب جانتا تھا۔ کبھی کبھی جمعہ اور عیدین میں جامع مسجد میں خطبہ پڑھتا تھا۔ ہمایوں شاہ اپنے ظلم و جور کے سبب سلطنت کا بدنام بادشاہ ہے۔ مگر اس کے زمانے میں بھی علم کی ترقی جاری رہی۔ محمد شاہ ثانی بھی فیروز شاہ کے بعد سلطنت کا علم دوست، ذی علم اور شائستہ بادشاہ تھا۔ اس عہد کا قابلِ ذکر واقعہ محمود گاواں کی علمیت اور علم پروری ہے۔ اس کے تدبر اور فراست کے سبب سلطنت کو استحکام اور وسعت حاصل ہوئی۔ وہ خانہ جنگیوں اور درباری سازشوں کی وجہ سے اپنی پوری قابلیت نہ دکھا سکا اور آخر کار قتل کی سازش کا شکار ہوا۔ وہ خود ایک بڑا عالم، ادیب اور شاعر تھا۔ "مناظر الانشاء" اور "ریاض الانشاء" اس کی نثری تصانیف ہیں۔ اول الذکر میں فنِ انشاء سے بحث کی گئی ہے اور آخر الذکر خطوط کا مجموعہ ہے جو عموماً عزیزوں، دوستوں اور حکم رانوں کے نام ہیں۔ وہ ہر سال متعدد تحائف غیر ممالک کے علماء کو بھیجتا رہتا تھا۔ جن کے صلے میں ان ممالک کے بادشاہ اسے اعزازات سے نوازتے تھے۔ علما کے ساتھ محمود گاواں کا سلوک نہایت عقیدت مندانہ تھا۔ اہلِ علم پر اس کی فیاضیاں اتنی عام تھیں کہ بہ مشکل کوئی شہر یا قصبہ ایسا ہوگا جہاں کے علماء اس کی فیاضی سے محروم ہوں گے۔ رفاہِ عام کے لیے اس نے دکن میں کئی عمارتیں تعمیر کرائیں، اپنے صرف خاص سے بیدر میں ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ اس مدرسے کے کتب خانے میں پینتیس ہزار کتابیں تھیں جن سے طلبہ فائدہ اٹھاتے تھے۔

محمود گاواں نے بہمنی سلطنت کو آخری ایام میں سنبھالے رکھا۔ اس کے قتل کے بعد سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس سلطنت نے اپنی تقریباً دو صدی کی مدت میں غیر ممالک سے آنے والے عالموں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ آنے والوں کی زیادہ تر تعداد ایران اور ماوراء النہر سے تعلق رکھتی تھی۔ ان میں سے بہت سے مغلوں کے خوں آشام حملوں کے سبب دکن کے پرامن ماحول میں آکر پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے اور کچھ علمی سرپرستی کی تلاش میں اور کچھ بہمنی سلاطین کی دعوت پر دکن میں آکر مقیم ہوگئے۔ یہ اپنے ساتھ فارسی زبان و ادب اور ایران کی تہذیبی و تمدنی روایات کو لے کر آئے تھے۔ یہاں کے سلاطین بھی فارسی زبان و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ چناں چہ کچھ ہی عرصے کے بعد دکن کے عہدِ وسطیٰ کی زندگی، ایرانی تہذیب و تمدن میں رچی بسی نظر آتی ہے۔

سلطنت بہمنیہ اور ایران کے سیاسی روابط:

ایران اور دکن کے سیاسی تعلقات علمی اور تمدنی روابط کے لیے بڑے ممد رہے۔ سلاطین کا جھکاؤ ایران کی جانب فطری امر نظر آتا ہے، اس لیے کہ خود بانیٔ سلطنت حسن بہمن شاہ ایرانی النسل تھا اور افغانستان کے راستے ہندستان میں آیا تھا۔ وہ ہزبر الدین علائی کا بھتیجا تھا جو ترکی کی سرحد پر قتل ہوا تھا۔ اس وقت حسن کی عمر چھ برس تھی۔ مؤرخین نے حسن بہمن شاہ کو بہمن بن اسفندیار کی اولاد سے منسوب کیا

۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اپنا یہ نام اختیار کیا تھا:

"سکندر ثانی یمین الخلافت ناصر امیر المومنین السلطان الاعظم علاء الدنیا والدین ابو المظفر بہمن شاہ السلطان۔"

اور عرف عام میں اسے "ظفر خاں علاء الدین حسن گنگو بہمن شاہ" کہا گیا۔ ایک عام خیال کے مطابق حسن بہمن شاہ جب تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے نام کے ساتھ "گنگو بہمن" اس عقیدت کے طور اختیار کیا تھا جو اسے "گنگو برہمن" نجومی سے تھی جس کے ساتھ اس نے اپنی نوجوانی کا کافی وقت گزارا تھا۔ بعض مورخین نے "گنگو" کی اصل "کیکویہ" قرار دی ہے۔ اور بعض نے اس لفظ کی یہ تعبیر کی ہے کہ یہ "کاؤس" کی تبدیل شدہ شکل ہے جو حسن کے والد کا نام ہو سکتا ہے۔ بعض نے "گنگو" کو کنگو" ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال یہ امر قرین قیاس ہے کہ لفظ "کیکویہ" حسن کو کیکویہ خاندان سے متعلق کرتا ہے، جو اصفہان اور ہمدان پر حکومت کرتا رہا۔ اس طرح اسے ورثہ میں اس عظیم الشان سلطنت کی روایات ملی تھیں جو بہمن اور اسفندیار اور ان کے تعلق سے بہمن گور کے ماتحت تھی۔ چناں چہ حسن نے جس نام کو اختیار کیا تھا وہ ایران سے اس کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔

قیام سلطنت کے بعد اس نئی سلطنت کا موثر طبقہ بھی ملک سیف الدین غوری اور امیر جدیدہ جیسے افراد پر مشتمل تھا جو ایران اور ماوراء النہر اور افغانستان سے آئے تھے اور اس طرح سلطنت دہلی کے مقابلے میں سلطنت بہمنیہ کا حاوی رجحان ایرانی اثر و رسوخ سے متاثر رہا۔ نوواردین کا یہ طبقہ جو سیاحوں، فوجیوں، تاجروں اور عالموں پر مشتمل تھا اور جو ایران، افغانستان، وسط ایشیا، عرب اور ترکی سے آرہے تھے، سلطنت کی کل تاریخ میں روز افزوں بااثر اور مضبوط ہو گیا۔ اس کے علاوہ دیگر ممالک سے اس سلطنت کے روابط کا ایک بڑا سبب اس کی کھلی بندرگاہیں تھیں۔ جن سے بڑے پیمانے پر جنگی گھوڑوں اور جواہرات کی تجارت ہوتی رہتی تھی۔ سلطنت بہمنیہ کو اپنے ابتدائی زمانے میں فوجی استحکام کی شدید ضرورت تھی۔ جنگی گھوڑوں کی افزائش نسل کے لیے وہاں کی آب و ہوا مناسب نہیں تھی۔ چناں چہ ایران اور عرب سے درآمد کرنے پڑتے تھے۔ حسن بہمن شاہ کو اپنی سلطنت کی آزادی اور اس کے استحکام کے لیے ایک وفادار فوج کی بھی ضرورت تھی جو سلطنت دہلی سے کوئی قلبی وابستگی نہ رکھتی ہو۔ چناں چہ اس نے فوجی اور سیاسی حکمت عملی کے تحت ایران اور وسط ایشیا کے افراد کو زیادہ سے زیادہ فوج اور سرکاری ملازمت میں جگہ دی۔ اسماعیل مخ کو امیر الامرا منتخب کیا گیا۔ ملک سیف الدین غوری وزیر اعظم بنایا گیا۔ حسام الدین، سکندر خاں بار بک اور رضی الدین جگاجوت معتمد بنے۔ سید احمد غزنوی منطقی اور صدر الشریف سمرقندی اپنا خاص اثر رکھتے تھے۔ سیف الدین غوری کا ایک کارنامہ سلطنت کی دستور سازی ہے۔ بہمنی سلطنت کے نظم و نسق پر اس کی ایک کتاب "نصائح الملوک" بھی ہے۔

حسن بہمن شاہ کے وارثوں نے ایران سے تعلقات کی یہ نسبت برقرار رکھی۔ محمد شاہ ثانی نے مولانا محمد بن ابو محمد مشہدی کو جو نامور فاضل تھے، وکیل مالیات مقرر کیا تھا۔ ایرانیوں سے بحیثیت مجموعی اس کے بڑے قریبی روابط رہے۔ ملک سیف الدین غوری اس کا بھی وزیر اعظم تھا۔ ملک غوری کو دوسرے سلاطین کے زمانے میں بھی خاص اہم سیاسی مرتبہ حاصل رہا۔ سلطنت بہمنیہ کے پانچ حکم رانوں کا مقرب تھا اور سلطنت کو مستحکم کرنے میں سرگرم حصہ لیا۔ محمد شاہ اول نے اس کی لڑکی سے شادی کر لی تھی جس کے بطن سے علاء الدین مجاہد پیدا ہوا۔ محمد شاہ ثانی نے علامہ فضل اللہ انجو کو سلطنت کا صدر جہاں بنایا تھا۔ غیاث الدین بہمنی نے اپنی مختصر مدت حکومت میں ترک افسران کو نکال کر ان کی جگہ ایرانیوں کو شامل کیا تھا۔ اس نے ملک غوری کی جگہ مولانا احمد بن ابو احمد قزوینی کو، جو اسی عہد میں دکن پہنچے تھے،

وکالت مطلقہ پر فائز کیا تھا۔ امیر غیاث الدین شیرازی اسی کے حکم سے مفتی مقرر ہوئے۔ جو فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں بھی برقرار رہے۔ مولانا لطف الدین سبزواری بھی فیروز شاہ کے دور میں گلبرگہ میں نائب السلطنت تھے۔ فیروز شاہ نے گلبرگہ ہی میں مولانا تقی الدین شیرازی کو وزیر مالیات مقرر کیا تھا۔ یہی طرز حکومت احمد شاہ ولی کا بھی رہا۔ اس نے عراق، ترکی عرب، خراسان اور ایران سے تین ہزار افراد کو سرکاری امور کے لیے بلایا تھا۔ ان میں خواجہ حسن اردستانی بھی تھے جنھیں اس نے شہزادوں کی تربیت کے لیے مقرر کیا تھا۔ وجے نگر کے خلاف ایک محاذ میں احمد شاہ کو سید حسن بدخشانی، میر فضل اللہ، میر علی سیستانی اور عبداللہ کرد کا تعاون حاصل تھا۔ اس کے دور میں مولانا احمد بن ابو احمد قزوینی وکالت مطلق پر فائز رہے۔ ہمایوں شاہ نے خواجہ نجم الدین محمود گیلانی کو، جو ایک ممتاز قانون دان اور دانش ور تھے، اپنا وزیر اعلیٰ بنایا تھا۔ محمود گاواں، علاء الدین بہمنی کے دور میں بیدر پہنچا تھا۔ اس نے واپسی کا ارادہ ترک کر کے حکومت کے امور میں شرکت اختیار کر لی۔ پہلے ہزاری کا منصب عطا ہوا پھر تلنگانہ کی بغاوت فرو کرنے پر مامور ہوا۔ جیسے جیسے مواقع ملتے رہے، محمود گاواں نے بہت سے علاقے فتح کیے۔ کچھ عرصے کے لیے وہ بیجاپور کی "طرف" کا "طرف دار" بھی مقرر ہوا۔ اور پھر خواجہ جہاں، وزیر کل، صدر جہاں بھی بن گیا۔ اپنے تدبر اور فراست سے اس نے جو کام کیے وہ سلطنت بہمنیہ کے لیے ایک یادگار ہیں۔

ایران کے علاوہ ترکی، مصر اور عراق میں بھی ان سلاطین کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ آپس میں سفارتوں کا تبادلہ بھی عمل میں آتا رہتا تھا۔ حسن بہمن شاہ کی اولادوں حسن اور حسین بن منصور بن بالقرہ سے مراسلت تھی۔ جب امیر تیمور گورگاں کے ہندستان پر حملہ کرنے کی خبر مشہور ہوئی تو فیروز شاہ بہمنی نے لطف اللہ سبزواری کو، جو گلبرگہ میں نائب السلطنت تھے، تیمور کے پاس سفارت دے کر بھیجا تھا۔ سفارت میں ان کے ساتھ وزیر مالیات گلبرگہ مولانا محمد تقی الدین شیرازی بھی تھے۔ وہ چھ ماہ تک تیمور کے پاس رہے اور سفارت میں کامیاب ہو کر واپس لوٹے۔ تیمور نے فیروز شاہ کو "فرزند خیر خواہ" کے خطاب سے موسوم کیا تھا۔ اور اس سے خوش ہو کر گجرات، دکن اور مالوہ کی "سلطنت عطا کی" اور ایک فرمان فیروز شاہ کے لیے بھیجا۔ ہندستان کی تاریخ میں یہ سفارت بھیجنے کا پہلا موقع تھا۔ پہلے پہل بہمنیوں ہی نے عثمانیوں کے پاس بھی سفارت بھیجی تھی۔ محمد شاہ سوم نے عثمانی خلیفہ دوم کو ایک سفارت بھیجی تھی۔ بعد میں محمود شاہ نے بھی ایک سفیر بایزید دوم کے پاس بھیجا تھا۔ محمود گاواں کے دور میں سلطنت کے سفارتی تعلقات ایران کے علاوہ مصر اور ترکی سے بھی ہو گئے تھے۔ سلطان ابو سعید گورگاں اور سلطان محمد مراد بیگ سے محمود گاواں کی راست مراسلت تھی اور قاصد اور پیام آتے جاتے رہتے تھے۔ محمود گاواں کی یہ حیثیت وزیر بہمن سلاطین کی جانب سے مختلف ممالک کے سلاطین کو مراسلے بھیجتا تھا۔

دیگر ممالک خصوصاً ایران سے سلاطین کے مذکورہ تعلقات قریبی اور مستقل رہے۔ غیر ملکیوں بالخصوص فوجیوں، عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی نے دور دور کے ملکوں سے انھیں دکن آنے کی ترغیب دی۔ ان آنے والوں کی اپنی تہذیب اور روایات تھیں۔ انھوں نے یہاں آکر اثر اندازی اور اثر پذیری کے عمل کو ایک نئی شکل دی۔ ایران اور دکن کے سیاسی روابط نے ان دونوں ملکوں کے درمیان علمی اور تمدنی تعلقات کا ایک نیا باب شروع کر دیا۔

علمی روابط:

حسن بہمن شاہ کے زمانے ہی میں ایران سے علمی روابط شروع ہو چکے تھے خود اس کے دربار میں کئی علماء اور شعراء موجود تھے۔ جن میں

سے بیش تر ایران سے آئے تھے۔ مولانا لطف اللہ، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیر الدین شیرازی، مولانا شریف سمرقندی، رضی الدین چگاجوت، شیخ زین الدین بغدادی جیسے علما، ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ برہان الدین غریب حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ تھے جو ان کے وصال کے بعد بہمن شاہ کے زمانے میں اپنے سات سو مریدوں کے ہم راہ دولت آباد منتقل ہو گئے تھے۔ ان میں حضرت امیر حسن سجزی، شیخ کمال خجندی، شیخ ہمام اور شیخ فخرالدین وغیرہ بھی تھے۔ حضرت کاکاسعد بخت شیرازی، مفتی سید احمد بن ابو احمد غزنوی، حضرت رکن الدین کاشانی اور حماد کاشانی بھی اسی وقت ایران سے پہنچے تھے۔ بہمن شاہ نے شیخ برہان الدین غریب کے خلیفہ شیخ زین الدین کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی جو شیراز سے دکن آئے تھے اور پھر دکن میں مقیم ہو گئے تھے۔ بہمن شاہ حضرت شیخ سراج الدین جنیدی کا بھی معتقد تھا۔ حسن کو شیخ جنیدی ہی نے سلطان قطب الدین کی مسجد میں تخت نشین کیا تھا۔ شیخ عین الدین گنج العلم بھی اس دور میں دولت آباد میں مقیم تھے۔ وہ شیخ جنیدی کے برادر نسبتی و نیز برادر طریقت بھی تھے۔ نسباً حضرت جنید بغدادیؒ کی اولاد سے تھے۔ ان کے اجداد افغانستان میں فرشور سے آئے تھے۔ گنج العلم دہلی میں پیدا ہوئے اور حصول تعلیم کے بعد محمد تغلق کے زمانے میں دولت آباد آئے۔ انھوں نے ابتدائی پانچ سلاطین بہمنیہ کا زمانہ دیکھا۔ "فتوح السلاطین" کا شاعر مورخ عصامی بھی سلطان محمد تغلق سے ناراض ہو کر بہمنی دربار میں آگیا تھا۔ اس نے حسن شاہ کی سرپرستی میں ایک مبسوط تاریخ نظم میں "فتوح السلاطین" شاہنامہ فردوسی کے طرز پر لکھی۔ یہ تاریخ محمود غزنوی سے شروع ہو کر بہمن شاہ پر ختم ہوتی ہے۔

محمد شاہ ثانی علم دوست مشہور ہے۔ عراب اور ایران کے بہت سے شعرا اور علما، اس کے دربار میں اس کی فیاضیوں سے بہرہ مند ہوتے رہے۔ عربی، فارسی روانی سے بولتا تھا۔ خوش نویس تھا اور شاعری سے بھی شغف رکھتا تھا۔ شیخ زین الدین شیرازی کے ہاتھ پر اپنے اعمال قبیحہ سے توبہ کر لی تھی۔ علما، کا بڑا قدردان تھا۔ شیخ سراج الدین جنیدی کی دعائیں پڑھتا رہتا تھا۔ اس کے عہد میں مولانا احمد بن ابو احمد قزوینی اور مولانا محمد بن ابو محمد مشہدی مشہور اکابرین میں تھے۔ علامہ فضل اللہ انجو جیسے صاحب علم اور نام ور عالم، جو سعد الدین تفتازانی کے شاگرد تھے محمد شاہ ثانی ہی کے عہد میں شیراز سے دکن آئے۔ ان کے علم و فضل کی بادشاہ نے بڑی قدر کی۔ انھوں نے محمد شاہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کے انعام میں ان کو ایک ہزار اشرفیاں دی گئیں۔ ان کی شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے انھیں دیگر انعامات بھی ملتے رہے اور خلعتوں سے نوازا گیا۔ جب وہ اپنے وطن واپس گئے تو ان کے پاس کثیر سرمایہ اور تحائف تھے۔ علامہ فضل اللہ انجو کی وجہ سے کئی اور علما، دکن میں جمع ہو گئے تھے۔ شعرا کی خوب قدردانی ہونے لگی۔ میر فضل اللہ انجو اور مولانا محمد ابو مشہدی کے ذریعے حافظ شیرازی کو دکن آنے کی دعوت دی گئی۔ حافظ کی شخصیت بہ حیثیت شاعر ہندستان میں بہت مقبول تھی۔ سلطنت بہمنیہ میں فارسی کے فروغ نے انھیں زیادہ مشہور کر دیا تھا۔ لوگ ان کے کلام کے اس قدر دیوانے ہوئے کہ محض ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے فارسی سیکھنے لگے۔ خواجہ زین العابدین ہمدانی اور خواجہ محمود گازرونی، جو خود بھی دکن آنے کا ارادہ رکھتے تھے، خواجہ حافظ کے مصارف راہ کے کفیل ہوئے۔ لیکن حافظ سمندر کے سفر سے خائف ہوئے اور دکن آنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ محمد شاہ اور فضل اللہ انجو کی دعوت اور عطیات کے شکریے میں ایک غزل ارسال کر دی۔ جس کا مطلع یہ ہے:

دمے باغم بسر بردن ، جہان یک سر نمی ارزد
بہ می بفروش دلق ما ، کزین بہتر نمی ارزد

اس غزل کے عطیے پر محمد شاہ نے ملاقاسم مشہدی کے ذریعے متعدد جنیش بہا تحائف حافظ کی خدمت میں بھیجے۔

فیروز شاہ بہمنی میر فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا۔ حضرت شیخ زین الدین شیرازی اسے پند و نصائح کرتے تھے۔ یہ اعلیٰ قابلیت پر کھتا تھا۔ فارسی کا زبردست عالم اور شاعر تھا۔ اس کی علم و فن کی سرپرستی کی وجہ سے ایران اور عرب سے ارباب کمال اس کے دربار میں آتے رہتے تھے۔ یہ اس کا بے مثال علمی ذوق تھا کہ اس کے جہاز گوا اور چول کی بندرگاہوں سے مختلف ممالک بھیجے جاتے تھے تاکہ علماء اور فضلاء کو لاسکیں۔ ایران سے مولانا لطف الدین سبزواری، حکیم حسن گیلانی اور سید محمود گازرونی کو بلایا تھا۔ اس کی نظر میں امیر غیاث الدین شیرازی اور مولانا تقی الدین شیرازی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ یہ علماء مختلف سرکاری امور کی انجام دہی پر مامور ہوئے۔ اس نے حکیم حسن گیلانی اور سید محمود گازرونی کو حکم دیا تھا کہ دولت آباد کے قریب ایک درے کی چوٹی پر ایک رصد گاہ تعمیر کریں۔ یہ علماء اس علم میں امتیاز رکھتے تھے لیکن بعض اسباب کی وجہ سے جن میں حکیم حسن گیلانی کی وفات بھی شامل ہے، یہ رصد گاہ مکمل نہ ہو سکی۔

احمد شاہ ولی غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تھا۔ علامہ فضل اللہ انجو سے مستفیض اور حضرت گیسو دراز کا بڑا معتقد تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے نام ور علماء جمع تھے۔ مولانا احمد بن ابو احمد قزوینی وکالت عظمیٰ پر حسب سابق برقرار رہے۔ شیخ ابو القاسم جرجانی اسی عہد میں ہندستان آئے تھے۔ انھوں نے دکن کو اپنا وطن ثانی بنالیا تھا اور امرا میں انھیں اچھا اثر و رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ مولانا شمس الدین کرمانی نے بھی اسی عہد میں بیدر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس کے عہد میں شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی کے کشف و کرامات کا بڑا شہرہ تھا۔ احمد شاہ نے اس شہرت کو سن کر ان کی خدمت میں شیخ حبیب اللہ جنیدی کو، جو ان کے خاندان کے مریدوں میں تھے میر شمس الدین قمی کے ہم راہ وکیل بنا کر روانہ کیا اور ان کے ذریعے سے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شاہ صاحب نے ملا قطب الدین کرمانی کو، جو ان کے مرید تھے، اپنے مکتوب کے ساتھ احمد شاہ کے پاس بھیجا۔ جس میں احمد شاہ کو ۔ ۔ ۔ ۔ "اعظم الشہاں شہاب الدین احمد شاہ ولی" مخاطب کیا۔ اس وقت سے احمد شاہ نے اپنے نام کے ساتھ "ولی" کا اضافہ کیا اور حکم دیا کہ آئندہ سے خطبوں اور فرامین میں یہی نام استعمال کیا جائے۔ پھر خواجہ جمال الدین سمنانی اور مولانا سیف اللہ حسن آبادی کو شاہ صاحب کے پاس بھیج کر درخواست کی کہ اپنی اولاد میں سے کسی کو دکن روانہ فرمائیں اور عوام کو فیض روحانی بخشیں۔ شاہ صاحب کے صرف ایک فرزند شاہ خلیل اللہ تھے جن کی جدائی انھوں نے گوارا نہ کی اور اپنے پوتے شاہ نور اللہ کو روانہ کیا۔ جب وہ احمد آباد۔ بیدر کے قریب پہنچے تو احمد شاہ نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور جس جگہ ملاقات ہوئی تھی، قریہ اور مسجد تعمیر کر کے اس جگہ کا نام نعمت آباد رکھا۔ شاہ نور اللہ کو ملک المشائخ کا خطاب دے کر اپنی لڑکی ان سے بیاہ دی۔ انھیں حضرت گیسو دراز اور ان کی اولاد پر فوقیت دی۔ جب شاہ نعمت اللہ کا انتقال ہو گیا تو ان کے بیٹے شاہ خلیل بھی اپنے دو فرزندوں، شاہ حبیب اللہ اور شاہ محب اللہ کے ساتھ بیدر منتقل ہو گئے۔ احمد شاہ نے شاہ نعمت اللہ کا مزار، جو بہت شان دار بنا ہوا ہے، زر کثیر صرف کر کے تعمیر کرایا تھا۔ شاہ حبیب اللہ اور شاہ محبوب اللہ بھی احمد شاہ ولی اور اس کے بیٹے شہزادہ علاء الدین بہمنی کی لڑکیوں سے بیاہے گئے۔ شاہ خلیل اللہ کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے وطن واپس چلے گئے تھے، دوسری یہ کہ وہ دکن ہی میں فوت ہوئے۔ آخری روایت درست ہے۔ ان کے انتقال ۱۴۶۰ء کے بعد ان کے مقبرے کو مغیث شیرازی نے اپنی خطاطی سے منقش کیا تھا۔ اس کے قریب "تخت کرمانی" کے نام سے ایک خوب صورت اور دل کش عمارت بھی تعمیر ہوئی تھی۔ مرزا شاہ رخ سلطان کا ملک الشعرا شیخ نور الدین آذری اسفرائنی، جو شاہ نعمت اللہ ولی سے مستفیض بھی تھا، احمد

شاہ ولی ہی کے زمانے میں دکن پہنچا اور اس کے دربار میں باریاب ہوا۔ احمد شاہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور ملک الشعرا کا خطاب بھی دیا۔ اسی کے حکم سے آذری نے "بہمن نامہ" نظم کرنا شروع کیا تھا۔ احمد شاہ کے دور تک، کہ جب تک وہ یہاں رہا، اس نے "بہمن نامہ" نظم کر اور پھر ایران جاکر باقی نظم لکھ کر بھیجتا رہا۔ "بہمن نامہ" ہمایوں بہمنی تک آذری کی تصنیف ہے، باقی ملا نظیری اور سامعی وغیرہ نے مکمل کی شیخ بدر الدین ابن الدمامینی بھی اسی دور میں گلبرگہ وارد ہوئے تھے اور انھوں نے یہیں انتقال کیا۔ نحو، لغت، فقہ اور حدیث کے ائمہ میں سے تھے۔ انھوں نے عربی قواعد پر اپنی ایک کتاب "المنهل الصافی" احمد شاہ بہمنی کے نام معنون کی تھی۔ ان کے ساتھ انھیں کے مکتب فکر کے ایک اور محدث یحییٰ بن عبد الرحمن بھی گلبرگہ میں مقیم ہوگئے تھے۔ ملا عبد الغنی اور مفتی نجم بھی اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔

علاء الدین بہمنی کی حکومت کے زمانے میں شاہ حبیب اللہ کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے سجادہ نشینی کا کام اپنے چھوٹے بھائی شاہ محب اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ طاہر استرآبادی نے شاہ حبیب اللہ کے انتقال کی تاریخ کہی تھی۔ جب سلطان علاء الدین کا لڑکا ہمایوں شاہ تخت نشین ہوا اس نے شاہ محب اللہ کو ایک مخالفت کی بنیاد پر قید کر دیا، لیکن وہ قید سے فرار ہوگئے اور آخر کار قتل ہوئے۔ علاء الدین بہمنی کے دور میں غیر ملکی نووارد ین نے بہت زیادہ اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا اور ان میں رسے بعض نے شاہی محل سے تعلقات استوار کر کے اہمیت بھی حاصل کر لی تھی۔ علاالدین شراب کا بڑا رسیا تھا۔ چناں چہ آذری اسفرائنی نے، جو ابھی تک زندہ تھا، ۸۵۵ھ میں ایک طویل نصیحت نامہ لکھا تھا اس سے متاثر ہو کر علاء الدین نے شراب سے توبہ کر لی تھی۔

ہمایوں شاہ نے خواجہ نجم الدین محمود گیلانی کو، جو ایک قانون داں اور ممتاز دانش ور تھے، اپنا وزیر اعلیٰ بنایا تھا۔ ملا نظیری مشہدی نے ہمایوں شاہ کے انتقال پر تاریخ کہی تھی۔ ملا نظیری اور طاہر بیدری دونوں ہم طرح رہے ہیں۔ طاہر بیدری، شاہ حبیب اللہ کرمانی کے مصاحب بھی تھے اور ان کے انتقال پر تاریخ بھی کہی تھی۔ شاہ خلیل اللہ اور شاہ حبیب اللہ کے خلیفہ اور بیدر کے مشہور بزرگ خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں ایک اردو کا شاعر مشتاق تھا۔ اس نے شاہ خلیل اللہ کی مدح میں ایک اردو قصیدہ لکھا تھا۔ لطفی بھی مشتاق کا ہم عصر تھا۔ اس نے مشتاق کی طرح شاہ محمد کی مدح کی ہے جو خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں سے تھے۔ اس نے خواجوئے کرمانی کے ایک مشہور فارسی قصیدے کی زمین میں بھی ایک قصیدہ لکھا تھا۔ شیخ نور سمنانی کے اثر سے، جو اس عہد میں بہمنی دربار میں موجود تھے، خواجوئے کرمانی کا کلام مقبول تھا۔ کیوں کہ خواجوئے کرمانی حضرت رکن سمنانی کا مرید خاص تھا۔

خواجہ محمود گاواں سلطنت بہمنیہ کے مدبرین میں بہت ممتاز ہے۔ وہ علم و فضل کا بڑا سرپرست تھا۔ بلکہ خود دانش ور، عالم اور انشا پرداز کی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتا ہے۔ گیلان کے قریہ قاوان میں پیدا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے عرف عام میں گاواں کے لقب سے مشہور ہو اس کے اجداد شاہان گیلان کے وزرا میں شامل تھے اور ان میں سے ایک شخص نے اپنی ذاتی کوششوں سے رشت کی بادشاہت حاصل کر لی تھی اور یہ خود مختار حکومت اس کے خاندان میں شاہ طہماسپ صفوی والی ایران کے زمانے تک، جس نے اس کا خاتمہ کیا، قائم رہی۔ محمود گاواں نے تحصیل علم کے لیے مختلف اسلامی ممالک کا سفر کیا تھا۔ اس لیے اپنے ہم عصر علماء سے یا تو ذاتی واقفیت تھی یا رسل و رسائل کے ذریعے سے محبت و یگانگت پیدا کر لی تھی۔

محمود گاواں ایک تاجر کی حیثیت میں شاہ محب اللہ نبیرۂ شاہ نعمت اللہ کرمانی کی زیارت کے شوق میں بیدر پہنچا تھا۔ علاء الدین بہمنی

نے اس کی بہت قدر کی۔ اس نے وطن واپسی کا ارادہ ترک کر کے حکومت کے امور میں شرکت اختیار کر لی تھی۔ اپنی منصبی ذمے داریوں کے ساتھ تجارت کا کام بھی سرانجام دیتا رہا۔ اس کی فیاضی، علم و فضل اور تدبر کی سب مورخین کی تعریف کی ہے۔ اس کی خوبیوں نے اسے اقصائے عالم میں مشہور کر دیا تھا۔ شہرت کی وجہ خاندانی اعزاز اور بہمنی وزارت کا جلیل القدر عہدہ تھا۔ قاضی شرف الدین طوستری اس کے اتالیق تھے جو بعد میں صدر جہاں کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پہلے یہ محمد شاہ کے بھی اتالیق رہ چکے تھے۔ محمود گاواں سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔

اپنے مدرسے کے لیے، جسے اس نے اپنے صرفِ خاص سے بیدر میں تعمیر کرایا تھا، ممالک مختلفہ سے علماء کو تدریس کے لیے دکن بلایا تھا۔ ان میں خصوصیت سے جلال الدین دوانی، ابو بکر طہرانی اور شیخ صدر الدین رواسی شامل تھے۔ مولانا عبدالرحمن جامی کو تو دکن آنے کی کئی مرتبہ دعوت دی ہے۔ جامی سے اس کی بے تکلفی کا اندازہ "ریاض الانشا" میں شامل اس کے مکتوبات سے بخوبی ہوتا ہے۔ "انشائے جامی" میں بھی کئی مکتوبات خواجہ کے نام موجود ہیں۔ جامی نے اعتراف کیا ہے کہ خواجہ نے ہندستان کو "رشک روم" یا "مثل روم" بنادیا ہے۔ اس کی شاعری اور انشا پردازی کی بھی اس نے اپنے ایک قطعہ میں بڑی تعریف کی ہے۔ سفر کی مشکلات کے سبب وہ ہندستان آنے سے معذرت کرتا رہا۔ جب اس نے "فصوص الحکم" کی شرح لکھی تو اس کا ایک نسخہ ہدیتہً خواجہ کے لیے بھیجا۔ اسی طرح جلال الدین دوانی نے، جو "اخلاق جلالی" کے مترجم کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں، شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف "ہیاکل النور" کی شرح "شواکل الحور" لکھی تو اسے محمود گاواں کے نام سے معنون کیا۔ ملا عبدالکریم ہمدانی نے خواجہ کی سوانح لکھی۔ اس کا خلاصہ محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں محمد شاہ بہمنی کے حالات کے آخر میں دیا ہے۔ ملا عبدالکریم ہمدانی، محمود گاواں سے ایک عرصے تک وابستہ رہا۔ اس کا والد علاء الدین کی مہم قلعہ مدکل میں شریک تھا۔ نامور شاعر سامعی، محمود کے مصاحبوں میں شامل تھا۔ محمود نے جب بیدر میں مدرسہ تعمیر کیا تو سامعی نے تاریخی قطعہ کہا تھا۔ ملا نظیری مشہدی کو محمود ہی نے ملک الشعرا کا خطاب دلوایا تھا۔ مشہور علماء سلامت اللہ اوحدی اور شمس الدین ساعی اس کے ندیمان خاص تھے۔ اس کے عہد آخر میں عبدالعزیز بن محمود طوسی دکن آئے تھے۔ جنھیں محمود گاواں نے اپنے داماد کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ خواجہ کے قتل پر عبدالکریم ہمدانی نے مشہور تاریخی قطعہ کہا تھا۔ محمود شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر عبدالکریم ہمدانی دربار میں موجود تھا۔ اس نے "تاریخ محمود شاہی" بھی تصنیف کی ہے۔ جن علماء اور شعرا سے محمود گاواں کی مراسلت تھی ان میں خواجہ عبید اللہ الاحرار، شیخ بایزید خلخالی، صدر الدین رواسی، شرف الدین علی ایذدی، مولانا ابو سعید، سید مہدی تبریزی، جلال الدین دوانی، عبدالرحمن جامی، کمال الدین رومی، ابو بکر طہرانی وغیرہ جیسے اکابر کے نام ہیں سیاسی نامور ان میں شاہ گیلان، وزرائے گیلان اور دیگر عمائدین گیلان، ابو سعید گورگان، سلطان محمد مراد بیک، محمود شاہ رومی وغیرہ سے محمود گاواں کی خط و کتابت تھی۔

فارسی میں شاعر بھی تھا اور انشا پرداز بھی۔ نثر میں مکتوبات کے مجموعے "ریاض الانشا" کے علاوہ "مناظر الانشا" بھی ہے۔ جس میں فن انشا سے بحث کی ہے۔ شاعری میں قابل ذکر اس کے قصیدے ہیں، جن میں سے دو قصیدے محمد شاہ بہمنی کی مدح میں انوری اور بدیع الزماں ہمدانی کے قصیدوں کے طرز میں نظم کیے تھے اور ایک قصیدہ کمال الدین اصفہانی کے قصیدے کے جواب میں نظم کیا تھا اور اس پر اپنا تفوق جتایا تھا۔

لسانی روابط:

اپنے دور امن و امان میں اس سلطنت نے ایران سے تہذیب و تمدن اور علم و ادب میں نمایاں اور دیرپا اثرات قبول کیے تھے جو واضح طور پر اس دور کی علمی و تمدنی تاریخ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ خصوصاً فارسی زبان کا دور دورہ ہوگیا۔ دکن میں عربوں کے بعد ایرانی افغانی اور ترکی آئے۔ ان کی زبان عربی، فارسی اور ترکی تھی۔ دکن میں مسلمانوں کی جو نسلیں دکن فتح ہونے کے بعد پیدا ہوئیں ان کی زبان عموماً فارسی تھی۔ اس لیے عربی کے بعد فارسی کا زیادہ سے زیادہ رواج ہوگیا۔ چوں کہ ایران اور ماوراالنہر سے نسبتاً زیادہ تعداد میں اصحاب علم و فن دکن آئے اور بعد میں ایران کی صفوی حکومت کا دکن کے فرماں رواؤں سے زیادہ تعلق رہا۔ اس لیے بھی دکن میں فارسی کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ کئی نام ور شاعر، ادیب اور علما، دکن کی سرزمین میں فارسی کا دور دورہ ایک عرصہ دراز تک رہا۔ بہمنیہ سلطنت کے زمانے میں خصوصاً فارسی کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ کئی نام ور شاعر، ادیب اور علما، دکن کی سرزمین میں فارسی کو رواج دیتے رہے۔ خود سلاطین نے بھی اس کی خوب سرپرستی کی۔ انھوں نے اپنی سلطنت کی زبان فارسی قرار دی۔ یہ اہم سبب تھا کہ دکن میں اس زبان کو زیادہ فروغ اور رواج حاصل ہوتا رہا۔

سلاطین کی حوصلہ افزائی کے سبب ابتدائے قیام سلطنت ہی سے ایران اور سمندر پار ملکوں سے اصحاب علم و فضل کی آمد نے سلطنت بہمنیہ کے دربار کو ایرانی دربار کا نمونہ بنادیا تھا۔ ان نوواردین نے دکن کو اپنا وطن ثانی بنالیا اور ان کے قیام نے دکن کو ایران کوچک بنادیا۔ ان کے اثر سے دکن میں زبان و ادب کو ہمہ جہتی فروغ حاصل ہوا، اور فارسی ادب کی جملہ اصناف، تاریخ، انشا، شاعری اور مذہبی و صوفیانہ ادب کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ بیش تر ایرانی شاعروں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی گئی۔ ان کی قدر و منزلت ہر دور میں عام رہی۔ ایران سے آنے والے شاعروں کے علاوہ خود دکن میں فارسی کے کئی شاعر موجود تھے۔ عصامی کی "فتوح السلاطین"، حاجی محمد قندھاری اور آذری اسفرائنی کے "بہمن نامے" بہیں تصنیف ہوئے۔ محمود گاواں کی تصانیف "مناظر الانشا" اور "ریاض الانشا" فارسی ادب کی تاریخ میں لازمی ذکر کے قابل ہیں۔ علاوہ ازیں مذہب، تصوف میں دیگر متعدد تصانیف اس دور کی یادگار ہیں۔

بہمنی سلطنت میں ایران سے تہذیبی اختلاط اور تمدنی روابط کا اظہار لسانی اعتبار سے اردو کی صورت میں بھی ہوا۔ فارسی کے زیر اثر اس نئی زبان "دکھنی" نے جو شمال سے آئی تھی، اپنی ترقی کا ایک اور زینہ طے کیا۔ مسلمان عرب، ترک اور ایرانی اس وقت تک برعظیم کے شمال مغربی علاقوں میں پانچ سو سال سے زیادہ بسر کرچکے تھے۔ اس اثنا میں عربی، فارسی، ترکی، زبانوں کے اثرات اور خصوصیت سے اسلامی تعلیم اور اس سے متعلقہ وظائف، اصطلاحات اور جملہ الفاظ مقامی زبانوں میں اس طرح داخل ہو چکے تھے کہ ایک مخلوط زبان کا پیدا ہوجانا لازمی اور فطری امر تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہی زبان شمال مغربی علاقوں سے نقل مکانی کرکے وسط ہند میں داخل ہوئی اور وہاں کی برج اور شورسینی بولیوں سے مل کر قدیم اردو کی شکل میں نمودار ہوئی۔

یہی زبان دکن میں کچھ تو علاء الدین خلجی کے زمانے میں دکنی فتوحات کی وجہ سے اور بیش تر محمد تغلق کے زمانے میں دہلی کی آبادی کے دولت آباد منتقل ہونے کے سبب پہنچ چکی تھی۔ اور دکن میں وہاں کی مقامی بولیوں کے اثرات قبول کررہی تھی۔ جب بہمنی سلطنت آزادانہ طور پر قائم ہوگئی اور دکن کا سلطنت دہلی سے سیاسی تعلق منقطع ہوگیا تو دکنی اردو دہلوی اردو سے بڑی حد تک بے نیاز و لاتعلق

ہو گئی۔ اس کی یہ لاتعلق تقریباً تین صدیوں تک برقرار رہی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دکنی اردو متعدد پہلوؤں میں، جو نہ صرف صوتیات، الفاظ، محاورے اور روزمرہ سے بلکہ صرف و نحو سے تعلق رکھتے ہیں، دہلوی اردو سے مختلف ہو گئی۔ اب تک اس میں عربی اور ترکی زبانوں کے اثرات موجود تھے۔ دکن میں فارسی کے رواج کے زیر اثر اس میں فارسی کے بکثرت الفاظ داخل ہوگئے اور فارسی قواعد کا بھی خاصہ اثر شامل ہوا۔ جیسے یائے نسبتی، اضافت، جمع بنانے کے قاعدے، بیانیہ کے مرکبات بنانے کے طریقے وغیرہ۔ اس میں فارسی کی تشبیہیں، استعارے، تلمیحیں اور ترکیبیں بھی استعمال ہونے لگیں۔ بلکہ اس نے فارسی ہی کے اوزان و بحور اور اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی، مخمس وغیرہ اختیار کر لیے اور نثر میں بھی فارسی کی طرح نثر عاری، نثر مرجز اور نثر مسجع کو اپنالیا۔ یہ زبان جب بول چال کے علاوہ تحریر میں بھی استعمال ہونے لگی اور ادبی زبان کا درجہ حاصل کرنے لگی تو فارسی سے متاثر ہونے کے سبب قدرتاً فارسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی۔ سلاطین بہمنیہ نے فارسی کی طرح اس کی بھی خوب سرپرستی کی اور اس کو بالآخر سلطنت کی سرکاری زبان کا درجہ بھی دے دیا۔

اردو کے شاعر بھی بہمنی دربار سے متعلق رہتے تھے۔ اس کی ایک مثال نظامی ہے۔ جس نے "کدم راؤ پدم راؤ" تصنیف کی۔ یہ احمد شاہ ولی بہمنی اور علاء الدین بہمنی کے دربار سے منسلک تھا۔ فیروز شاہ بہمنی کے قوم پرور اور روشن دور حکومت میں دوسری تمدنی ترقیوں کے ساتھ اس زبان کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ خود بادشاہ کی مقامی زبانوں سے دل چسپی نے اس نوزائیدہ زبان کے مستقبل کو تابناک بنادیا۔ خود فارسی کا شاعر تھا لیکن اردو میں بھی اس کی طبع آزمائی ثابت ہے۔ عین الدین گنج العلم، حضرت گیسو دراز، سید محمد اکبر حسینی، عبداللہ حسینی، سعدی دکنی، نظامی، مشتاق، لطفی وغیرہ عہد سلطنت بہمنیہ کے مشہور شاعر اور نثر نگار ہیں۔ حضرت گیسو دراز کی "معراج العاشقین" نثر میں اور نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" نظم میں اس دور کے کارنامے ہیں۔ عصامی کی "فتوح السلاطین" فارسی میں عہد بہمنیہ کا اولین ادبی اور تاریخی شاہکار ہے۔ یہ مقامی زبانوں کے الفاظ کے استعمال سے، جو اس میں موجود ہیں، لسانی و تمدنی اختلاط کی نشان دہی کرتی ہے۔ اسی قسم کی مثالیں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی فارسی تصانیف میں بھی ملتی ہیں۔

تمدنی روابط:

سلاطین بہمنیہ نے اپنی خاص رغبت اور خوش ذوقی اپنے عہد کی تعمیرات میں بھی ظاہر کی ہے۔ دل کش فنِ تعمیر اس سلطنت کا ایک خاص امتیاز ہے۔ گلبرگہ اور بیدر کی عمارتیں فنِ تعمیر میں سلاطین کے ذوقِ تعمیر کی نمایاں مثال ہیں۔ ان کے ذوق اور فن کی تشکیل میں ایرانی اثرات نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ذوق سے ایک خاص طرز تعمیر کو تشکیل دیا، جو ہندستان، ترکی، مصری اور ایرانی طرز تعمیر کے امتزاج کا نمونہ تھا۔ ایرانی اور دکنی طرز تعمیر کا امتزاج شعوری اور فطری تقاضوں کے زیر اثر وجود میں آیا تھا۔ مسلمان اپنے ساتھ بالخصوص ایرانی طرز تعمیر لے کر آئے تھے۔ اس کے اثرات سلطنت بہمنیہ کی تعمیرات میں ابتدائی دور ہی سے نمایاں ہونے لگے تھے۔ جس کا ثبوت اس دور کی مذہبی اور غیر مذہبی عمارتوں سے ملتا ہے۔ دولت آباد میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں ان کا تعلق براہ راست ایران سے تھا۔ اور دوسرے مقامات پر جو مضبوط قلعے بنائے گئے تھے وہ فوجی فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ یہ بات طے ہے کہ بانیِ سلطنت نے ایرانی افراد کو سیاسی مصلحت کے تحت فوج میں شامل کیا تھا۔ بعد میں دیگر سلاطین نے اس روایت کو برقرار رکھا اور دوسری اہم ذمہ داریاں بھی ایرانی نوواردین کے سپرد رہیں۔ چناں چہ فوجی نوعیت سے تعمیر ہونے والے قلعوں کا ایرانی اثرات کا حامل ہونا فطری تھا۔

محمد شاہ بہمنی کے عہد میں جتنی تعمیرات ہوئیں ان سب میں ایرانی اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے دور کا "معمار اول" شکر اللہ قزوین کا باشندہ تھا۔ محمد شاہ بہمنی نے گلبرگہ میں ایک مثالی "جامع مسجد" تعمیر کرائی۔ اس کا معمار رفیع بن شمس بن منصور قزوینی تھا جس نے اسے ۷۶۹ھ میں مکمل کیا تھا۔ یہ جنوبی ہند کی سب سے پر کشش مسجد تھی۔ اور تمام عالم میں اپنی نوعیت کی واحد مسجد ہے۔ اس پر بے شمار گنبد ہیں اور مسجد کا کوئی صحن نہیں۔ تمام گنبد مقرنسوں اور قطری کمانوں پر قائم ہیں۔ شکر اللہ قزوینی نے احمد شاہ بہمنی کا مقبرہ تعمیر کیا تھا۔ مقبرہ کو سرسری طور پر بھی دیکھا جائے تو سمرقند میں امیر تیمور کے روضے اور اس میں گہری مماثلت نظر آئے گی۔ جو فن کار ایران سے یہاں آئے ان میں ایک کاتب کا نام "مطالعہ خاں" تھا۔ یہ ایران سے آیا تھا۔ اس نے احمد شاہ بہمنی کے گنبد کے اندر قبور پر کتبات لکھے تھے۔ غیاث الدین بہمنی نے جو "ہفت گنبد" تعمیر کرایا تھا، ان گنبدوں کی تعمیر میں ایرانی اثرات زیادہ نمایاں تھے۔ مجاہد اول سے شمس الدین تک سب اسی گنبد میں دفن ہوئے۔ تعمیرات میں ایرانی اثرات فیروز شاہ کے زمانے میں اپنی معراج پر تھے۔ "فیروز گنبد" جو اس نے تعمیر کرایا تھا ایرانی اثرات کی نمایاں مثال ہے۔ گلبرگہ میں اس کا تعمیر کرایا ہوا قلعہ بھی اس کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ یہ بھی ایرانی اثرات کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ خصوصاً مشرق اور شمالی سمتوں میں، دونوں جانب فصیر کے مجسمے ایرانی طرز فکر پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ قلعے کی شاندار مسجد، جو اسی کے دور میں تعمیر ہوئی تھی۔ ہندوستان میں اسلامی فن تعمیر کا پہلا مثالی نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ بعد میں جب سلطنت کا پایہ تخت بیدر قرار پایا تو وہاں بھی نئی نئی عالی شان عمارتیں تعمیر کر کے سلطنت کی تعمیری سرگرمیوں میں اضافہ کیا گیا۔ ان میں خصوصیت سے قابل ذکر احمد شاہ اول کے گنبد اور اس کے اندر کے نقش و نگار اور کتبات ہیں۔ یہ کتبات رسم الخط کے اعتبار سے نسخ، کوفی اور ثلث ہیں۔ اس قسم کی نقاشی مصر اور عرب اور اس کے بعد سمرقند کی عمارتوں میں تھی۔ ہندوستان میں یہ اس کا واحد نمونہ ہے۔ فیروز کے مقبرے میں مغیث شیرازی خوش نویس نے متعدد مقامات پر حضرت محمد مصطفیٰ اور حضرت علیؓ کے نام نقش کیے تھے۔ احمد شاہ ولی کا محل بھی ایرانی طرز تعمیر کا شہکار ہے۔ شاہ خلیل اللہ کرمانی کے وصال کے بعد ان کے مقبرے کو بھی مغیث شیرازی نے خطاطی سے منقش کیا تھا۔ اس کے قریب شاہ نعمت اللہ کرمانی کی یادگار کے طور "تخت کرمانی" کے نام سے ایک خوب صورت عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ ملا شرف الدین مازندرانی نے جو مشہور زمانہ خوش نویس اور شاہ نعمت اللہ ولی کے مرید تھے شیخ آذری کے دو بیت قصر دار الامارۃ بیدر کے صدر دروازے پر کندہ کیے تھے۔ دولت آباد کے قلعے سے ملحق "چاند مینار" بھی خالص ایرانی فن تعمیر کا شہکار تھا۔ محمود گاواں کا مدرسہ کئی حیثیتوں سے مشہور ہے۔ یہ ۱۴۷۲ء میں مکمل ہوا تھا۔ اس کا طرز تعمیر سمرقند کے قدیم مدارس اور اصفہان کی مساجد کا سا ہے۔ اس کی دیواروں کی کاشی کاری اس کے حسن کو مزید دوبالا کرتی ہے۔ اس کی عمارتوں کے کتبات کا رسم الخط طاہلا نسخ اور نستعلیق ہے، اسے ہندوستانی کتبات میں فارسی رسم الخط کی ابتدا قرار دیا جاسکتا ہے۔ پیشانی پر سر بسر قرآن کی آیات نہایت اعلیٰ خط ثلث میں سفید زمین پر نیلے حروف میں مرقوم ہیں۔ کاتب نے اپنا نام "کتبہ العبد علی الصوفی" لکھا ہے۔ اس کاتب کو محمود گاواں نے خاص طور پر شیراز سے مدعو کیا تھا۔ بیدر میں ہمایوں شاہ بہمنی کا مقبرہ اور چوکھنڈی کی عمارتیں بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں ایران کا براہ راست اثر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔

مذہبی روابط:

سلطنت بہمنیہ میں ایران سے روابط کی مثالیں رسم و رواج اور مذہب میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ہر سال جشن نوروز کی روایت

تھی۔ اس وقت ایران میں شیعہ مذہب اپنے عروج پر تھا۔ جب کہ شاہانِ دہلی کا مذہب آخر تک اہل سنت والجماعت رہا۔ ایران اور دیگر ممالک سے آنے والے نو وارد ین میں زیادہ و تعداد شیعہ مذہب کے حامل افراد کی تھی۔ سلاطین میں سے اکثر شیعہ نہیں تھے بلکہ بعد میں کچھ سلاطین نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ان کے مذہب کی اس تبدیلی میں بلاشبہ ایرانی روابط و اثرات اور ان کا تہذیبی و سیاسی ماحول کار فرما تھا۔ ان سلاطین کے علاوہ ایرانی اثرات کی وجہ سے کئی سنی تفصیلی خیالات سے متاثر ہوئے۔ یوسف عادل شاہ نے جو دربار بہمنیہ کا ترک امیر تھا، بغاوت کر کے بیجاپور میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو اس نے شیعہ طریقہ سے خطبہ پڑھانا شروع کیا، جو دکن تو کیا برعظیم کے لیے ایک نئی بات تھی۔ اب تک ہندستان کے کسی خطے میں شیعہ مذہب کو سرکاری سرپرستی حاصل نہ تھی۔ بہمنی سلطنت میں متعدد شیعہ افراد نے، جو ایران سے آنے کے بعد بااثر ہو گئے تھے۔ اپنے اثرات میں خاصا اضافہ کر لیا تھا۔ یہ اثرات زیادہ تر فوج میں اور سرکاری شعبوں میں موجزن رہے۔ عوام میں یہی کام ان عالموں، ادیبوں، شاعروں نے کیا جو ایران سے آکر بس گئے تھے۔

○ ○ ○

پروفیسر عبدالمجید صدیقی

گولکنڈہ کا تمدن

قطب شاہ تمدن کے بہت بڑے شمع بردار تھے۔ تلنگانے کی سرزمین میں جہاں ان لوگوں نے راج کیا ایک ایسا پاکیزہ تمدن پیدا کیا تھ جس کے نقوش اب تک موجود ہیں۔ اس تمدن میں جس کو قطب شاہی تمدن کہنا چاہیے۔ مختلف عناصر کا امتزاج تھا۔ پہلے تو یہ لوگ ایران و ترکستان سے بھی جو ان کا جنم بھوم تھا کچھ تمدنی عناصر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ سلطان قلی قطب شاہ جو ہمدان سے آیا تھا ترکستان کے ایک بڑے شاہی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ یہ سمجھنا کچھ خلاف قیاس نہیں ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ترکستانی سیاست اور معاشرت کے کچھ نہ کچھ تاثرات ضرور ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قطب شاہوں کا تمدنی سرمایہ زیادہ تر گلبرگہ اور بیدر کے تمدنی ذخائر سے ماخوذ تھ کیوں کہ قطب شاہ اس سلطنت بہمنی کے براہ راست حلقہ بگوش خوشہ چیں تھے جس نے چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں دکن کی پرزور سیاسی اور معاشرتی رہنمائی کی تھی۔ دکنی ملت کا صحیح تخیل اور اس کی انوکھی سیاست و معاشرت جسے دکن کے مخصوص جغرافیہ کا عکس سمجھنا چاہیے۔ بہمنی سلطنت کی پیداوار تھی۔ اسی سلطنت نے دکن کے لیے بہترین نظام حکومت بنایا۔ معاشرت کے زرین اصول سکھائے او نئی وضع قطع پیدا کی۔ اہل دکن کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا اچھا سامان جمع کیا۔ جو اس کے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دکن کے تمام طول و عرض میں جہاں اس سلطنت کا پرچم لہراتا تھا۔ بہمنیوں کے گہرے نقوش موجود تھے اور یہ آج بھی ہیں۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اس ماحول میں جو جدید نظام حکومت و معاشرت قائم ہوتا وہ کبھی ان تاثرات سے کیسے خالی ہو سکتا ہے۔ سلطان قلی نے برسوں بہمنی فضا میں سانس لی تھ اور جب وہ تلنگانے کا صوبہ دار ہوا تو اس کے سامنے سوائے بہمنی آئین کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی آئین کی اس نے پیروی کی یہ اور اس کے تما جانشین بہمنی معاشرت میں ڈوبے ہوئے تھے اور وہ اس سے کبھی الگ نہیں ہو سکے اس طریقے سے تلنگانے میں جو قطب شاہی تمدن ابھاگر اس کی بنیاد اور سراپا سب بہمنی تھا۔ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت پر جو کچھ عصر نہیں ہے بلکہ اس کی تمام ہم عصر سلطنتیں جو بہمنی سلطنت کے کھنڈروں پر قائم ہوئی تھیں وہ سب بہمنی معاشرت اور سیاست کی خوشہ چین تھیں ان کا نظام حکومت بہمنی تھا اور جس قدر معاشرت تھ اس پر بہمنی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس سے اور آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں نے جو اپنی راجدھانیاں قائم کی تھیں ان میں بھی بہمنی عناصر پائے جاتے تھے اور آج بھی دکن اسی تمدن کا رہین منت ہے۔

لیکن یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ قطب شاہوں نے اپنے تمدن کو تلنگانے کے نئے ماحول میں مقامی عناصر کے ساتھ کچھ ا طرح مرکب کیا تھا کہ وہ دکھنی پیداوار معلوم ہوتی تھی۔ قطب شاہ اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ ان کی سلطنت تلنگانے میں ٹھیٹ ترکستا اور بہمنی نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں مقامی عناصر بھی ایسے جذب ہونے چاہییں کہ اس میں تلنگانے کا پورا عکس دکھائی دے۔ یہ قطب شا سلطنت کا سرمایہ افتخار ہے کہ اس نے اپنے آپ کو تلنگانے کی قومی اور جغرافیائی خصوصیات کے ساتھ کچھ اس طرح پیوست کر دیا کہ نصف صدی کے بعد یہ ایک آندھرا راجدھانی معلوم ہونے لگی اور شاہان قطبیہ آندھرا راجگان معلوم ہوتے تھے۔ کیوں کہ تلنگانے کو ان لوگوں نے اپنا گھر بنالیا، تلنگی عورتوں سے شادیاں کیں اور ترکستانی وضع قطع چھوڑ کر مقامی لباس اور طور و طریق اختیار کیے اور تلنگی زبان سیکھی اور ا

ں شاعری کی، ملک کے ہر طبقے کو مذہب کی پوری آزادی حاصل تھی اس ہم آہنگی کا نتیجہ یہ تھا کہ قطب شاہوں نے نہایت آسانی کے ساتھ نگانے کی قومی اور جغرافیائی خصوصیات کی صحیح پیمائش کر کے بہت جلد ایک تعمیری خاکہ تیار کر لیا اور اس ملک کی ہر طرح سے تعمیر کی۔ آندھرا م کو اپنی رعایا سمجھ کر آگے بڑھایا، تلنگی زبان کی سرپرستی کی اور تمدنی ترقی کے تمام راستے کھول دیے اور غالباً یہ تاریخ آندھرا کا سنہری زمانہ ما۔ تمام قطب شاہی سلاطین بڑے ذی علم، شائستہ انسان تھے اور حکم رانی میں اپنی پوری ذمہ داری محسوس کرتے تھے۔ اکثر واقعات سے پتہ لتا ہے کہ یہ لوگ اپنے وزرا سے مشورہ کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے اور خاص معاملات میں علماء عصر سے بھی مشورہ کیا کرتے تھے۔ ناں چہ عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۴۶ھ میں علما سے مشورہ کر کے شاہ جہاں کی شرطیں تسلیم کی تھیں۔ ان میں رواداری اور رعایا پروری بے حد ی اور عدل گستری ان کا خاص شعار تھا۔ ان لوگوں نے اپنی تلنگی رعایا کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔ یہاں ں کہ بادشاہوں نے ہندو طبقے کے مذہبی جذبات کا لحاظ کر کے منگل کو تعطیل عام قرار دی تھی اور تاناشاہ نے بھدراچلم اور بھرمارامیشور والی نامی مندروں کو جو گوداوری اور کرشنا پر واقع ہیں زرخیز جاگیریں عطا کی تھیں جس سے اس بادشاہ کی کشادہ خیالی اور مذہبی رواداری علوم ہوتی ہے۔ اس لیے اہل تلنگانہ قطب شاہی سلطنت کو اپنی سلطنت سمجھتے تھے چناں چہ سلطان قلی قطب شاہ کو تلنگانے میں آئے ہوئے ھی بہت روز نہیں ہوئے تھے کہ تلنگی رعایا اس کو "بڑے ملک" کے ہر دل عزیز لقب سے یاد کرنے لگی۔ اس کے جانشینوں کے ساتھ بھی یہی نبت تھی اور بلکہ اکثر "ماں صاحب" کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔

خارجی مسلک:

قطب شاہوں کا خارجی مسلک وسعت نظر، راست بازی اور دور اندیشی پر مبنی تھا۔ سارے ملک میں اپنی سلطنت کی فلاح کے ساتھ پورے دکن کی سالمیہ پیش نظر تھی۔ اسی اصول کی روشنی میں جنگ و صلح کے فیصلے بین المملکتی معاہدے ہوئے۔ گولکنڈے کے ساتھ جتنی زائیاں ہوئیں اور معاہدے ہوئے ان میں بھی بین المملکتی بھائی چارہ پنہاں تھا۔ جب کسی مملکت کا پلہ بھاری ہوتا اور طاقت ور مملکت کم زور مملکت پر دست درازی کرتی تو قطب شاہی سلطنت موقع پر کم زور کی دست گیری کرتی چناں چہ بیجاپور کے مقابلے میں گولکنڈے نے ہمیشہ احمد نگر کا ساتھ دیا تاکہ توازن قوت قائم رہے اور جب کبھی پورے دکن کی سالمیت خطرے میں پڑتی تھی تو قطب شاہی مملکت بڑے اتحاد میں شریک ہوتی تھی اور آئے ہوئے خطرے کو روکتی تھی۔ چناں چہ جنگ تالیکوٹ اور دوسری لڑائیاں اس برادرانہ جذبے کی روشن مثالیں ہیں۔ چاند بی بی اور ملک عنبر کی تائید میں بھی یہی جذبہ کار فرما تھا۔ سترھویں صدی کے اوائل میں وسط ایشیاء کی ایک اور سیاسی رو اس خارجی مسلک میں شامل ہو گئی۔ محمد قلی قطب نے کچھ تو مغلوں کے خطرے سے ڈر کر اور کچھ مذہبی یگانگت سے ایران کے صفوی سلاطین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور اس دوستی میں صفوی حکم رانوں کا بھی فائدہ تھا کیوں کہ وہ ایک طرف عثمانی ترک اور دوسری طرف ہندستان کی مغل طاقت سے خائف تھے اور گولکنڈہ اور بیجاپور کی تائید سے اپنی طاقت بڑھانا چاہتے تھے چناں چہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں سب سے پہلے ایک ہزار بارہ ہجری میں سفیر ایران گولکنڈہ آیا اور قطب شاہی دربار سے قنبر علی اور جبذی قلی سفیر بن کر گئے اور رسم بازدید ادا کی اس کے بعد ۱۰۲۳ھ میں ایران سے حسین بیگ قبچاچی گولکنڈہ آیا اور اس نے محمد قلی کی وفات پر تعزیت کی اور سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی پر رسم تہنیت ادا کی اور اس کے ایک سال بعد گولکنڈے سے ایک ہزار چوبیس ہجری میں شیخ محمد بن خاتون ایران

بھیجا گیا اور اس نے صفوی دربار میں پیام دوستی اور اتحاد پہنچایا لیکن شیخ سلطان محمد کے انتقال کے بعد ۱۰۳۵ھ میں واپس آیا۔ اور شیخ کے ساتھ سفیر ایران قاسم بیگ آیا تھا اور اس نے عبداللہ قطب شاہ کو جلوس شاہی کی مبارک باد دی۔ لیکن بد قسمتی سے یہ سفیر حیدرآباد میں مر گیا اور اس کا بیٹا محمد قلی بیگ دو سال کے بعد واپس ہوا تو اس کے ساتھ گولکنڈے سے خیرات خاں روانہ کیا گیا۔ اور یہ ایران وہ گولکنڈے کی آخری سفارتیں تھیں اس کے بعد ایران کے ساتھ سفارتی تعلق باقی نہیں رہا۔ کیوں کہ اس اثنا میں دکن میں مغلوں کا غلبہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی بیرونی طاقت کا رسوخ نا ممکن ہو گیا۔ ۱۰۴۵ھ م ۱۶۳۵ء میں نظام شاہی سلطنت ہمیشہ کے لیے مغل سیلاب میں بہہ گئی اور ایک سال کے بعد ۱۰۴۶ھ ۱۶۳۶ء میں بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتیں مغل شہنشاہیت کی باج گذار ہو گئیں اب مغل شہنشاہ ایران کا بیرونی تعلق کیسے گوارہ کر سکتے چناں چہ ۱۰۴۶، ۱۶۳۶ھ والے معاہدہ میں یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ ایران سے اپنا رشتہ۔ اتحاد منقطع کرنے اس کے بعد ایرانی سفرا کی جگہ مغل حاجب آنے لگے اور قطب شاہی سیاست میں دخیل ہو گئے جس کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ کی سیاست بدمزا ہو گئی۔

گولکنڈے کی معاشرت:

گولکنڈے کی معاشرت بہت بلند اور پاکیزہ تھی چوں کہ قطب شاہ خود بہت پاکیزہ معاشرت کے دلدادہ تھے اس کا اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا بادشاہوں کی خانگی اور درباری زندگی اس قدر شان دار تھی کہ دوسرے ہم عصر شاہی خاندان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ان کے عظیم الشان دربار، شان دار جلوس، فلک بوس محل اور پر لطف علمی سماجی محفلیں ان کی عظمت کا ثبوت دیتی تھیں ان کے طریقۂ بود و باش کا اندازہ کسی قدر ان کی عمارتوں سے ہوتا ہے۔ بعض عمارتیں اس وقت موجود ہیں اور بعض کی صفحات تاریخ پر تعریف رہ گئی ہے شاہی بارگاہ تو کجا ان کے رہنے کے قصر بھی اس قدر بلند تھے کہ ان کی مشکل سے مثال ملتی ہے۔ اندر بہترین قالینوں کا فرش اور چینی و بلوریں آلات کی سجاوٹ اور باہر سے عمارتوں کی رفعت و باغ بانی بڑی کیفیت پیدا کرتی تھیں۔ ایک مغل شہزادے نے جو شاہ جہانی محلات کا رہنے والا تھا لکھا تھا کہ ان محلات میں رہنا تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے۔ شاہی درباروں کا حال ہم اوپر پڑھ آئے ہیں شاہی جلوس بھی اسی قدر شان دار ہوتے تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر باہر نکلتے تھے اور ان کے ساتھ بڑا ہجوم ہوتا تھا امرا اور وزرا گھوڑوں اور پالکیوں میں جلوس کے ساتھ رہتے تھے اور ایک بڑا لشکر ہم راہ ہوتا تھا بادشاہوں کے مقبرے بھی بڑے شان دار بنائے جاتے تھے جو اب تک موجود ہیں۔ قبروں پر زردوز غلاف پہنائے جاتے تھے اور قبروں کے ارد گرد قیمتی قالین بچھائے جاتے تھے اور سونے چاندی کی شمعیں روشن کی جاتی تھیں اور ہر روز غربا کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ امرا کی زندگی بھی کچھ کم شان دار نہ تھی یہ بڑی بڑی حویلیوں میں رہتے تھے جو کئی منزل بلند ہوتیں۔ ان کا جلوس بھی ایسا ہی شان دار ہوتا تھا گویا خود بادشاہوں کا جلوس تھا۔ جب یہ باہر نکلتے تھے تو ان کے ہم راہ بھی ہاتھی اور اونٹوں کی قطاریں ہوتی تھیں اور بڑا لشکر ہم راہ ہوتا تھا۔ اور سب کے پیچھے ان کا ہاتھی یا پالکی ہوتی تھی۔ ٹیورنیر اس جلوس کی بڑی تفصیل پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جلوس ہاتھیوں سے شروع ہوتا ہے پہلے اس میں بارہ ہاتھی ہوتے ہیں اور یہ تعداد امیر کے مرتبہ امارت کے مطابق معین ہوتی ہے۔ ان پر ہودے اور عماریاں کسی ہوتی ہیں اور ایک ہاتھی پر جھنڈا ہوتا ہے۔ ہاتھیوں کے پیچھے اونٹوں کی قطار ہوتی ہے اور ان کے پیچھے گاڑیاں آتی ہیں جن کے ساتھ پیدل ملازم چلتے ہیں، پھر ان کے پیچھے صاحب جلوس کی سواری ہوتی ہے اور ان کے پیچھے سوار پیدل ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ بھی

بہت پاکیزہ اور پر تکلف زندگی بسر کرتا تھا۔ شہر حیدرآباد میں دو لاکھ مکانوں کی گنتی کی گئی تھی اور ہر مکان کے رہنے والے اوسط پانچ آدمی قرار دیے جائیں تو شہر کی دس لاکھ آبادی ہونی چاہیے۔ اس لحاظ سے یہ قرون وسطیٰ کا بہت بڑا شہر تھا اس کی آبادی اور بلند عمارتوں کو دیکھ کر ایک مغل مورخ نے "آبادی وسیع تر از احاطہ ٔ خیال" اور "عمارت رفیع تر از پایہ ٔ اندیشہ" کہا تھا جو قطب شاہی تمدن کی بہت بڑی دلیل ہے۔ غالباً شمال کے شہنشاہی شہر بھی اتنے آباد نہیں تھے اور آبادی میں ہر طرح کے لوگ تھے، تاجر، عہدے دار، قانون داں، مہاجن، صناع اور جوہری لیکن اس میں باہر کے لوگ، یعنے مغل، ایرانی، ترک زیادہ تھے جو حیدرآبادی تھے۔ ان کی معاشرت بے حد پر تکلف تھی۔ اول تو ان کے رہنے بسنے کے مکانات نہایت شان دار اور بلند ہوتے تھے اور ان کے درو دیوار سے بڑی شان و شوکت جھلکتی تھی سونے اور چاندی کی اشیاء کے علاوہ چینی کے ظروف روشنی کے جھاڑ استعمال ہوتے تھے جن کو مورخ چینی آلات کہتے ہیں شیشے اور بلوریں ظروف ممالک غیر سے جہازوں میں لد کر آتے تھے اور مسولی پٹنم و حیدرآباد کے بازاروں میں فروخت ہوتے تھے۔ چناں چہ جب ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۷ء میں حیدرآباد کی لوٹ ہوئی تو ہزارہا قسم کی چیزیں ظروف اور کپڑے باہر نکلے اور قالین اور دریوں کے بہترین فرش راستوں پر نظر آتے تھے جن کو دیکھ کر خود مغلوں کو حیرت ہوئی اور ان اشیاء تمدن سے گھر اتنے بھرے ہوئے تھے کہ لوٹ مار کے باوجود خالی نہ ہوئے۔ حالاں کہ چار پانچ کروڑ کی لوٹ ہو چکی تھی۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈے کا متوسط طبقہ بھی کچھ کم متمدن نہ تھا۔

اخلاقی حالت: اگر چہ اس زمانے کی اخلاقی حالت کا اندازہ لگانا مشکل ہے، لیکن قرائن یہ ہیں کہ قطب شاہی رعایا میں عام طور پر اخلاقی حالت خراب نہ تھی اور متوسط طبقے میں علمی سرگرمی بھی پائی جاتی تھی کیوں کہ حیدرآباد کی جب لوٹ ہوئی تو اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ ہر گھر سے بہتیری کتابیں برآمد ہوئی تھیں، صوم صلوٰۃ کا بھی عام شوق تھا، کیوں کہ شہر اور اس کے نواح میں مساجد اس قدر کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ شمار میں نہیں آتیں اور یہ سب قطب شاہی دور کی بنی ہوئی ہیں، تاہم یہ بات بھی ماننی پڑتی ہے کہ شہر حیدرآباد کی ترقی کے ساتھ اہل شہر میں تعیشات کی بھی فراوانی ہو گئی تھی اور ہر جگہ عیش و عشرت کا سامان مہیا تھا جو شہری زندگی کا خاصہ ہے چوں کہ قطب شاہی سلطنت میں امراء کی کثرت تھی اور ملک میں خوش حالی تھی اس لیے ان کی بے کاری اور فارغ البالی کی وجہ سے ملک میں عیش و عشرت کا سامان ہونا ضروری تھا۔ اس میں خود بادشاہوں کی زندگی بھی اثر انداز تھی۔ یہ کچھ خلاف قیاس نہیں ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں شہری تعیشات میں بہت اضافہ ہوا، کیوں کہ بادشاہ خود عیش پرست تھا یہ صحیح ہے کہ اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے عیش و عشرت کی رفتار بہت دنوں تک سست ہو گئی، کیوں کہ سلطان محمد نے پاکیزہ زندگی پائی تھی اور دن رات مذہبی فرائض میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کا اخلاقی اثر رعایا پر بھی پڑتا تھی لیکن عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں [illegible] باقی نہیں رہی بلکہ اس عہد میں پھر عیش و عشرت کے دروازے کھل گئے۔ عبداللہ کو رقص و سرور کا بہت شوق تھا، چناں چہ ملا [illegible] سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ لاہور، آگرہ اور برہان پور سے عیش و عشرت کا سامان جمع کیا جاتا تھا۔ شاہی زندگی کا اثر عوام پر بھی پڑا تھا چناں چہ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں ہر قص و سرور کی محفلیں عام ہونے لگیں اور عیش و عشرت کی گرم بازاری ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو، مسلمانوں کی کوئی تقریب خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، بغیر طوائف اور رقص و سرور کے نہیں ہوتی۔ یہ طرز زندگی ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں بھی جاری رہی غالباً انھیں حالات کو دیکھ کر لوگ ابوالحسن اور اس کے عہد سے متعلق غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔

معاشی حالت: دکن کی دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت زیادہ مال دار اور خوش حال تھی کیوں کہ اس سلطنت کو آمدنی کے جو قدرتی اور انتظامی ذرائع حاصل تھے وہ دوسری سلطنتوں کو میسر نہ تھے۔ اول تو یہ سلطنت بہت وسیع تھی۔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے جوں جوں کرناٹک کے اضلاع سلطنت میں ضم ہوتے گئے تو یہ سلطنت بہت پھیلتی گئی ان فتوحات کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یہ ساحل کارومنڈل کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو گئی۔ چناں چہ زمینوں کی نوعیت کے اعتبار سے اس سلطنت کے دو حصے کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو ساحل کارومنڈل کا مستطیل حصہ جو سمندر کے متوازی چلا گیا تھا، اسی میں دریائے کرشنا اور گوداوری کی سیراب زمینیں بھی شامل تھیں اور اس کے بعد ملک کا اندرونی حصہ تھا جس میں مشرقی گھاٹ اور دکن کی سطح مرتفع داخل تھی۔ یہ دونوں خطے زرخیز اور بہت سیر حاصل تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح تھا کہ قطب شاہی سلطنت میں "یک قطعہ زمین بے مزروعہ نیست"۔ (۱) نیز باہر کے سیاح بھی اس سلطنت کی زرخیزی کے بہت مداح سرا ہیں۔ میورنیر کہتا ہے کہ گولکنڈے کی سلطنت بہت زرخیز ہے۔ (۲) اگرچہ طریقہ مال گزاری کی خرابی سے رعیت کو نقصان پہنچتا تھا۔ تاہم آخری زمانے میں اس کی بہت کچھ اصلاح ہو چکی تھی۔ ویران دیہات آباد ہوئے اور نئے تالاب اور باؤلیاں کھدوائی گئی تھیں۔ اس سلطنت میں ہر قسم کا غلہ پیدا ہوتا تھا۔ گیہوں، چاول، جوار، باجرا، مونگ، چنا، مسور، تور، تل کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کپاس، تمباکو اور ارنڈی کی بہت پیداوار تھی۔ تمباکو اور تاڑی سے محصول وصول ہوتا تھا۔ پھلوں میں آم، موز، لیمو، انار، انناس بہت پیدا ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ سنگترے اور امرود بھی پیدا ہوتے تھے۔ (۳) مزروعہ زمینوں کے علاوہ اس سلطنت میں جنگلات بھی بہت تھے جس کی لکڑی اور جانوروں سے بڑی آمدنی ہوتی تھی جنگلات میں شیر، ہاتھی، ریچھ، چیتے، بندر، ہرن اور چیتل پائے جاتے تھے جو اب بھی ہیں اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کو اپنے چھ صوبوں کی زرعی پیداوار سے جن میں (۳۷) سرکار اور (۵۱۷) پرگنے تھے کافی محاصل ہوتے تھے۔

مزروعہ و غیر مزروعہ زمینات کے علاوہ قطب شاہی سلطنت کو معدنیات سے بھی غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی اس سلطنت میں ہیرے کی بے شمار کانیں تھیں، گولکنڈہ اپنے ہیرے کی کانوں کی وجہ سے نہ صرف دنیا میں مشہور تھا بلکہ بہت مال دار تھا۔ اور دکن کی کوئی سلطنت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی ہیروں کی بہتات کی وجہ سے جو اس سلطنت میں پیدا ہوتے تھے اس کو بالعموم "ہیروں کا ملک" کہتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سلطنت کے حدود میں ہیروں کی کانیں کب دریافت ہوئی تھیں اور کس زمانے سے ہیرے زمین سے کھودے جانے لگے۔ ایک روایت یہ ہے کہ سولھویں صدی کے اوائل میں ایک اتفاق سے یہاں کا پتا چل گیا۔ انگریز کمپنی کا ملازم ولیم میتھولڈ جو ۱۶۱۵ء میں ہندوستان آیا تھا لکھتا ہے کہ ایک روز اتفاق سے ایک چرواہے کا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا اس نے پتھر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت چمک دار ہے، وہ اصل میں ہیرا تھا مگر اس نے معمولی داموں میں اس کو فروخت کر دیا۔ یہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا عہد تھا۔ غالباً اسی عہد میں یہ معدن دریافت ہوئے تھے اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اس دریافت میں ترقی ہو گئی اور ایک کان سے دوسری کان تک پتہ چل گیا اور حکومت نے ان کی نگرانی شروع کر دی۔ پھر تلنگانے سے آگے بڑھ کر کرناٹک میں یہ معدن دریافت ہوگئے۔ کھودنے والوں کو اتنی مشق اور مہارت ہو گئی تھی کہ ٹیلے کی نوعیت، بو اور زمین کے رنگ سے ان کا پتہ چلا لیتے تھے۔

میورنیر کے بیان کے مطابق قطب شاہی سلطنت میں (۲۳) کانیں پائی جاتی تھیں۔ ہیروں کے علاوہ معدنیات میں لوہا، فولاد اور سیسہ

بھی ملتا تھا اور باہر بھیجا جاتا تھا۔ گولکنڈے کا لوہا اور فولاد تو ہر جگہ مشہور تھا۔ سیاح کہتے ہیں کہ گولکنڈے میں لوہا بے حد پیدا ہوتا تھا اور اس کے فولاد کی دور تک شہرت تھی اور یہ پنجاب، لاہور اور ایران جایا کرتا تھا، اسی کی تلواریں بنتی تھیں جو دمشقی تلواریں کہلاتی تھیں۔

علمی سرپرستی: بیجاپور کے ساتھ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت بھی علم و فن کی بڑی پرستار تھی اس سلطنت نے علم و فن کی بہت بڑی خدمت کی اور ایک ایسا علمی سرمایہ چھوڑا جو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ گویا یہ ایک حقیقت ہے کہ دکن کی تمام علمی سرگرمیاں بہمنیوں کی یادگار تھیں۔ جنھوں نے اپنے بلند پایہ علمی ذوق سے دکن جگمگا دیا تھا اور یہ کہنا صحیح ہے کہ گولکنڈے کا علمی شغف بہمنی سلطنت سے ورثے میں ملا چناں چہ سلطان قلی قطب شاہ اور اس کے جانشین گلبرگہ اور بیدر کے علمی خزانوں کے ریزہ چیں تھے، تاہم اس خاندان کے بانی بھی ترکستان کے ایک ذی علم و شائستہ خاندان کے سپوت تھے اور اپنے ساتھ ایک اچھا علمی ذوق لے کر آئے تھے۔ چناں چہ جب گولکنڈے کی سلطنت قائم ہوئی تو ان قطب شاہوں کی بدولت تلنگانے میں بھی علم کی بساط بچھ گئی اور حیدرآباد بھی علم کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ اس سلطنت کے تمام فرماں رواسب کے سب تعلیم یافتہ اور علم و حکمت کے دل دادہ تھے جس طرح ان لوگوں نے بے لوث جہاں بانی کو اپنا فرض منصب سمجھا تھا اسی طرح علم و حکمت کی سرپرستی کو بھی اپنا فریضہ ٔ حیات بنایا تھا۔ ان حکم رانوں نے نہ صرف علما و شعرا کی حوصلہ افزائی کی بلکہ خود شاعری کی اور بڑی کتابیں لکھیں اور ذاتی دل چسپیوں کے علاوہ اپنی رعایا کی ذہنی تربیت کا انتظام کیا کہ وہ اس نعمت سے محروم نہ ہوں ملک میں جگہ جگہ مدرسے بنائے اور بیش قرار معلم مقرر کیے اور مقامی زبان تلنگی کی اس طرح سرپرستی کی کہ گویا یہ خود ان کی زبان تھی تاکہ ملک کا ہر طبقہ دولت علم سے مالا مال ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قطب شاہوں کی اس علم دوستی کی وجہ سے تمام تلنگانے میں علم کی لہریں دوڑ گئیں اور اکتساب علم کا عام شوق پیدا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو پشتوں کے بعد ہی تمام ملک میں ایک علمی چہل پہل پیدا ہو گئی تھی، مسلمان تو تمام تعلیم پاتے تھے اور کتب خانے جمع کرتے تھے۔ کیوں کہ شاہی کتب خانوں کے علاوہ جن میں ہزار ہا کتابیں تھیں عام لوگوں کے بھی بے شمار کتب خانے تھے لیکن ہندو رعایا بھی اس شوق سے خالی نہ تھی۔ ہندو طبقوں میں لکھنے پڑھنے اور حساب دانی کا خاطر خواہ مشغلہ تھا۔ سرکاری محکموں میں ان سے کام لیا جاتا۔ مقامی زبان کے علاوہ ہندو فارسی بھی پڑھتے تھے جو سرکاری زبان تھی۔ چناں چہ مادنا کا تمام خاندان فارسی جانتا تھا۔ یہ شاہی فرامین لکھنے اور پڑھنے کے قابل تھا۔ قرائن یہ ہیں کہ ملک میں ایسے متعدد خاندان ہوں گے جو اپنے کو ملک اور حکومت کی ضروریات کے لیے تیار کرتے تھے۔ تلنگی زبان کی ترقی اس کے علاوہ تھی کیوں کہ حکومت اس کی بھی بڑی سرپرست تھی۔

اردو کی سرپرستی: اردو زبان کی سرپرستی قطب شاہی خاندان کا بہت بڑا طغراءِ امتیاز ہے۔ دوسرے دکنی درباروں کی طرف قطب شاہوں نے بھی اردو یا دکنی کو سنوارنے میں پورا حصہ لیا ہے۔ ان بادشاہوں نے دکنی زبان اور اس کے شاعروں کو وہ درجہ دیا جو مغل شہنشاہ فارسی شاعروں کو دیتے تھے مغل دربار میں فیضی اور ابو طالب کلیم ملک الشعرا تھے تو دکنی درباروں میں وجہی غواصی جیسے دکنی شاعروں کو ملک الشعرا ہونے کی عزت حاصل تھی بلکہ بادشاہوں نے اسی زبان میں شاعری کر کے دکنی زبان کو ایسا ابھار کر دیا کہ وہ قومی اور شاہی زبان ہو گئی اور لوگ اس کو اپنی زبان کہتے ہوئے فخر کرنے لگے ورنہ عادل شاہی اور قطب شاہی سرپرستی سے پہلے دکنی کو کون پوچھتا تھا۔

سلطان قلی قطب شاہ اور جمشید قطب شاہ کے عہد میں تو دکنی زبان کو کوئی فروغ نہیں ہوا، مگر ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں جب کہ قطب شاہی سلطنت مستحکم ہو گئی تو دکنی کا شوق پیدا ہو گیا۔ چناں چہ اس عہد میں فیروز و محمود اور ملا خیالی تین دکنی شاعروں کے نام آتے ہیں۔

یہ دکھنی کے اولین شعرا ہیں۔ فیروز نے توصیف نامہ لکھا تھا اس کو متاخر شعرا وجہی اور غواصی اپنا استاد مانتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا شاعر تھا۔ دوسروں کا کلام دست یاب نہیں ہوتا اور ان شاعروں کے حالات بھی معلوم نہیں ہوتے تاہم ان کے وجود سے معلوم ہوتا کہ ابراہیم کے عہد میں اردو ادب کی خدمت کا پایا پڑ گیا تھا جب اس کے جانشین بر سر حکومت ہوئے تو ان کو ترقی کرنے کا کافی موقع ملا چوں کہ محمد قلی اور سلطان محمد کے عہد میں سلطنت چاروں طرف سے پرامن ہو گئی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنے تیس سالہ عہد حکومت میں دکنی کی اتنی خدمت کی کہ وہ اوج کمال پر پہنچ گئی اور ایک شائستہ زبان ہو گئی یہ خود بھی ایک بڑا قادر الکلام شاعر تھا اور اردو میں معانی تخلص کرتا تھا۔ اس کے کلام کا ضخیم مجموعہ موجود ہے۔ جس میں قصیدے، غزلیں، مرثیے اور قطعات جیسے کئی اصناف سخن پائے جاتے ہیں۔ سیاسی، معاشرتی، اور سماجی ہر مضمون پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ محمد قلی کے کلام میں ادبی روانی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی ذہنی کدوکاش میں اپنے زمانے سے بہت آگے تھا غالباً گولکنڈے کے بادشاہوں میں انتا پر گو شاعر جس کی زندگی کے ہر پہلو سے مس ہو، نہیں پیدا ہوا۔ اس وقت صرف دو شاعروں کا حال معلوم ہوتا ہے، ایک وجہی اور دوسرے احمد، وجہی ایک بلند پایہ شاعر تھا جو غالباً ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا، لیکن اس کا شاعرانہ کمال سب محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ظاہر ہوا اور اس کی بڑی شہرت ہوئی اس نے نظم میں قطب مشتری اور نثر میں "سب رس" کے نام سے کتاب لکھی تھی۔ یہ دونوں قصے ہیں جو بڑے لطیف اور استادانہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ یہ ادبی تاریخ کا بہت بڑا اضافہ ہے۔ احمد نے بادشاہ کے حکم سے لیلی مجنوں لکھی تھی، لیکن اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کا عہد دکھنی زبان کی سرگرمیوں سے خالی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد حکومت میں جو پچاس سال طویل ہے دکھنی نے انتہائی ترقی کر لی، اس کے اردو ادب کو سنہری زمانہ کہنا چاہیے۔ اول تو خود بادشاہ نے جو بڑا عالم و شاعر تھا، دکنی ادب میں دل چسپی لی۔ ایک دیوان لکھا۔ اس کا طرز بیان سلطان محمد سے زیادہ صاف اور سلیس سمجھا جاتا ہے، گو اس کے کلام میں اتنی روانی اور لوچ نہیں ہے جیسے اس کے دادا محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ یہ عبداللہ تخلص کرتا تھا۔ اس کی ہر پرستی میں دکھنی کے بڑے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی اور بڑا ادبی سرمایہ چھوڑا غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عبداللہ کے عہد میں دکنی ایک مستند زبان ہو گئی اس عہد میں غواصی اور ابن نشاطی دو بڑے شاعر گزرے ہیں۔ غواصی نے سیف الملوک بدیع الجمال اور طوطی نامہ کی مشہور مثنویاں لکھی ہیں۔ یہ دونوں قصے ہیں اور دکھنی زبان کے شہکار سمجھے جاتے ہیں۔ ابن نشاطی کی تصنیف "پھول بن" خاص شہرت رکھتی ہے، یہ بھی ایک قصہ ہے جو کسی فارسی قصے کا ترجمہ ہے۔ لیکن اپنے اسلوب بیان قصے کی ترتیب کے لحاظ سے یہ قطب شاہی دور کی بڑی پیداوار ہے۔ ان مشہور شاعروں کے علاوہ طبعی اور امین بھی قابل ذکر ہیں اول الذکر نے "بہرام وگل اندام" کے نام سے ایک دل چسپ قصہ لکھا تھا جو زبان اور طرز بیان کا لحاظ کرتے بہت دل کش ہے۔ عبداللہ کے انتقال کے بعد ادبی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں بلکہ برابر جاری رہیں۔ چناں چہ ابوالحسن قطب شاہ جو بہت تعلیم یافتہ صاحب ذوق آدمی تھا۔ دکھنی کا بڑا مربی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شاعری کی تھی اور قید میں بھی شعر و سخن کے مشغلے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اس وقت دو ایک غزلوں کے سوا اس کا کوئی کلام دست یاب نہیں ہوتا۔

(۱) یہ اورنگ زیب کا فقرہ ہے جو اس نے بہ حیثیت ناظم دکن لکھا تھا۔ (واقعات عالمگیری)

سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۔ ۱۲۱، گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۸

) گولکنڈے کے تعلقات ص ۔ ۸۵

○ ○ ○

(سلسلہ ص ۴۴)

مزی کی شکلیں اور پھول پتیوں کے نقش و نگار بنائے جاتے ہیں ۔ ان میں مربع، مستطیل، ہشت پہلو، نقطے، عمودی اور افقی لکیریں اور
لف زاویے والے نقوش استعمال کیے جاتے ہیں ۔

بیدری اشیا میں جو خاص چیزیں تیار کی جاتی ہیں ان میں حقے کا نچلا حصہ، پاندان، خاص دان، اگال دان، گل دان، شمع دان، عطردان،
لف ڈبیاں، سرمہ دانی، سلفچی، آفتابہ، پلنگ کے پائے، کشتیاں، رکابیاں، کٹورے، صراحیاں، صابن دان، بیسن دان وغیرہ شامل ہیں ۔
بیدری مصنوعات کی قیمتی اور مشہور نوادرات سالار جنگ میوزیم، اسٹیٹ میوزیم، حیدرآباد، رتن ٹاٹا کا کلکشن (جو پرنس آف
یز میوزیم بمبئی میں ہے) اسٹیٹ میوزیم، لکھنو اور نیشنل میوزیم دہلی میں ہیں ۔

اس فن کے احیا کی کوشش کی جارہی ہے ۔ یہ کوشش بار آور بھی ہورہی ہے ۔ ملک اور بیرون ملک میں اسے امتیازی مقام حاصل ہورہا
ہے ۔ حکومت بھی اس صنعت کو آگے بڑھانے میں خاص دل چسپی لے رہی ہے ۔ چناں چہ ایک کوآپریٹیو ورک شاپ حیدرآباد میں قائم کیا گیا
ہے جو کاٹیج انڈسٹری ایمپوریم کے تحت کام کر رہا ہے ۔ بیدری مصنوعات کی فروخت کو بھی بڑھاوا دیا جارہا ہے ۔ توقع ہے کہ یہ روایتی فن جدید
ٹکنالوجی سے مزین ہوکر اور ترقی کرے گا اور اپنی روایتی آن بان کے ساتھ قائم رہے گا ۔

○ ○ ○

(سلسلہ ص ۱۴)

محرم کی یہ رسمیں آج بھی انسانی سطح پر محبت کا پیغام دے رہی ہیں ۔ مانا کہ ان کی آواز تنگ نظری کی بے ہنگم صداؤں میں کمزور سی
ہو گئی ہے لیکن ذہن و فکر کو تھوڑی سی وسعت دے کر ان مراسم کی آوازوں کو سنیں تو وہی پیغام محبت ملے گا جو آسودہ زندگی کا ضامن ہے ۔
امام حسین علیہ السلام کی قربانی انسانیت کا پیغام دیتی ہے ۔ امام من ناصر کی آواز آج بھی گونج رہی ہے ۔ اس آواز پر لبیک کہو اور آواز کے ساتھ ہو
جاؤ کیوں کہ:

"اس کی درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے ۔"

(یہ مقالہ ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام منعقد کردہ سیمینار "دکنی کلچر کے چند پہلو" ۲۱، ۲۲ مارچ ۱۹۹۵ء میں پڑھا گیا)

○ ○ ○

پروفیسر سید محمد

قطب شاہی عہد کے چند بزرگانِ دین

شہر حیدرآباد کی خاک میں صدہا بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ آسودہ ہیں۔ اس شہر کو آباد ہوئے پورے چار سو برس سے زیادہ نہیں گزرے۔ لیکن اس عرصے میں یہاں مختلف اوقات اور مختلف حکومتوں کے دوران میں عرب اور عجم کے علاقوں سے سینکڑوں ہی اولیاء اللہ آئے اور اپنے پاکیزہ کردار اور ریاضت و عبادت سے دینِ اسلام کی خاموش تبلیغ کی۔ صوفیاء کرام کے کم و بیش تمام سلسلوں کے بزرگ اس سرزمین پر رونق افروز ہوئے اور اپنے طریقہ رشد و ہدایت کو جاری کیا۔ آج ان مختلف خانوادوں کے ماننے والے اور ان کے طریقوں کے سالک اس شہر میں موجود ہیں۔

یہی بزرگانِ دین ہندستان کے اس بڑے شہر میں اسلامی تعلیم کے پھیلانے والے اور توحید و رسالت کا پیام پہنچانے والے تھے۔ آج بھی حیدرآباد کی اسلامی روایات ان ہی کے نام لیواؤں کے ذریعے زندہ ہیں۔

اس سرزمین کو سب سے پہلے جس بابرکت ہستی کے مبارک قدموں کا شرف حاصل ہوا وہ باباشرف الدین صاحب قبلہؒ کی ہے۔ آپ یہاں اس وقت تشریف لائے جب کہ یہاں کسی قسم کے اسلامی آثار نہیں پائے جاتے تھے۔ سرزمین دکن پر تلنگانہ کے راجا حکمراں تھے۔ نہ بہمنی سلطنت قائم ہوئی تھی نہ قطب شاہی سلطنت کے قیام کا کوئی تصور تھا۔ حیدرآباد کے شہر کے بسنے کا تصور تو کسی کے دماغ میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ ہمارا یہ وسیع شہر آج جس قطعہ اراضی پر آباد ہے، وہ ایک بڑا جنگل اور چند چھوٹے چھوٹے زرعی مواضعات سے زیادہ نہ تھا۔

حضرت باباشرف الدین صاحب قبلہؒ کے حالات جہاں تک معتبر تاریخی کتابوں سے معلوم ہوئے ہیں، یہ ہیں کہ آپ ۵۸۵ ہجری میں عراق عرب میں پیدا ہوئے۔ شہر بغداد میں آپ نے تعلیم و تربیت پائی۔ علوم شرعی میں دستار فضیلت حاصل کرنے کے بعد آپ نے شیخ وقت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے ہاتھ پر جو آپ کے استاد بھی تھے بیعت کی پھر اپنے مرشد کے حکم سے آپ نے ترک وطن کا ارادہ فرمایا اور ان کی ہدایت کے مطابق ۱۲۳۱ء ۶۲۹ھ میں ہندوستان تشریف لائے اور نو برس تک ہندستان کے مختلف شہروں اور بستیوں کی سیاحت کرتے ہوئے ۶۴۰ھ م ۱۲۴۲ء میں اپنے قدوم میمنت لزوم سے دکن کی سرزمین کو افتخار بخشا۔ آپ نے اپنے قیام کے لیے ایک بلند پہاڑی کو منتخب فرمایا۔ جو آج آپ ہی کے نام سے موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے ساتھ ستر اہل اللہ اور فقراء تھے۔ جو آپ کے خاص مرید تھے۔ آپ کے ساتھ آپ کے کئی بھائی بھی تھے جن میں سے ایک حضرت باباشہاب الدینؒ ہیں جن کا مزار شمس آباد کے قریب ایک مرتفع پہاڑی پر واقع ہے اور یہ پہاڑی آج آپ ہی کے نام سے موسوم ہے اور وہاں آپ کی درگاہ زیارت خاص و عام ہے۔ آپ کے ایک اور بھائی حضرت بابا فخر الدینؒ بیان کیے جاتے ہیں۔ آپ کا مزار حیدرآباد کی دوسری سمت میں محلہ درگاہ حضرت حسین شاہ ولیؒ سے کچھ فاصلہ پر ایک بلند پہاڑی پر ہے۔ اگرچہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں۔ راستہ نہایت دشوار گزار ہے پھر بھی آپ کا مزار اطراف و جوانب کے عقیدت مندوں کی بڑی زیارت گاہ ہے اور خاص طور پر سال میں ایک بار عرس کے موقع پر خاصی تعداد میں لوگ زیارت کے لیے آتے ہیں۔ غرض یہ کہ جو وسیع علاقہ شہر حیدرآباد کے لیے کئی صدیوں کے بعد منتخب ہونے والا تھا۔ اس کے اطراف کی پہاڑیوں پر ان اہل اللہ نے سکونت اختیار کرکے اپنے رشد و ہدایات کی

کرنیں اس سرزمین پر پھیلائیں۔ ان کے پاکیزہ کردار، ان کی خاموش عبادت و ریاضت، ان کی روحانی کمالات اور خلق خدا کے ساتھ ان کے بے پناہ ہمدردیوں نے انھیں مرجع خلائق بنا دیا۔

حضرت بابا شرف الدین صاحب قبلہؒ نے (۳۷) برس تک اپنی روحانی تعلیم سے اس سرزمین کے رہنے والوں کو فیض یاب فرما کر ۲۰، شعبان ۶۸۷ھ کو انتقال فرمایا اور اس پہاڑی پر آسودہ ہوئے جہاں آپ کا عرس ہر سال شعبان کی ۲۰ تاریخ کو منایا جاتا ہے اور حیدرآباد اور اس کے اطراف کے دیہات و قصبات کے ہزاروں باشندے کیا ہندو کیا مسلمان سب یکساں عقیدت سے آپ کے مزار پر انوار پر حاضری دیتے ہیں سات سو سال کے طویل عرصے سے آپ کا دریائے فیض برابر جاری ہے۔

آپ کے وصال کے چار سال بعد آپ کے بھائی حضرت بابا شہاب الدین صاحب قبلہؒ نے بھی ۶۹۱ھ میں وصال فرمایا اور آپ کا مزار مبارک بھی اسی طرح اس پہاڑی پر بنا جہاں آپ فروکش تھے۔ ان مبارک ہستیوں نے اس سرزمین پر جو شمع ہدایت روشن کی تھی وہ نہ صرف برابر جلتی رہی بلکہ باد مخالف کے تند اور تیز جھونکوں کے باوجود بھی اس کی روشنی میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور ان سے ہزاروں نورانی شمعیں روشن ہوتی گئیں۔

حضرت بابا صاحب قبلہؒ اور آپ کے رفقا کے بعد تاریخ میں جن بزرگ ہستی کا ذکر ملتا ہے وہ حضرت شاہ چراغ کا ہے آپ کا زمانہ، سلطنت قطب شاہی کے قیام کا ابتدائی زمانہ ہے۔ ابھی شہر حیدرآباد کے بسنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا تھا کہ آپ نجف اشرف سے یہاں تشریف لائے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو حضرت علیؑ نے عالم رویا میں دکن کی طرف جانے کا حکم دیا۔ آپ نے یہاں آنے کے بعد اس مقام پر قیام فرمایا جہاں اس وقت دائرہ میر مومنؒ واقع ہے۔ یہاں ایک گاؤں آباد تھا جو چلچلم کے نام سے موسوم تھا اور یہاں زیادہ تر برہمن رہتے تھے۔ اطراف میں جھاڑیاں اور جنگل تھا، آپ نے جس جگہ قیام فرمایا وہ اس سڑک کے کنارے تھا جو سیاکول اور راجمندری وغیرہ کو جاتی تھی۔ اس وقت تک مسلمانوں کا اس طرف گزر نہیں ہوا تھا۔ برہمنوں نے شاہ صاحب کی متوکلانہ زندگی اور آپ کے تصرفات کو دیکھ کر نہ صرف یہ کہ آپ کے رہنے کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ رفتہ رفتہ آپ کے معتقد ہوتے گئے اور آپ کی قیام گاہ سرراہ ایک تکیہ بن گئی جہاں دیورکنڈہ، نلگنڈہ، راجمندری وغیرہ آنے جانے والے مسافر دم لینے لگے اور خاص طور پر مسلمان مسافروں کے لیے ایک منزل گاہ کا کام دینے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد چند مسلمان مستقل طور پر شاہ صاحب کے یہاں رہنے لگے۔ اور ایک چھوٹی سی مسلمان بستی سی بن گئی۔ جب آپ کے وصال کا وقت آیا تو آپ نے اپنے ایک خاص مرید کو وصیت فرمائی کہ میری وفات پر میری تجہیز و تکفین جلدی نہ کرنا۔ بلکہ ایک سوداگر کا انتظار کرنا۔ اور وہ تمام ضروری اسباب لے کر آئے گا۔ اور میری تجہیز و تکفین کر دے گا۔ کیوں کہ جناب امیر المومنین علیؑ نے مجھے اس کی بشارت دے دی ہے۔ چنانچہ جب آپ کا وصال ہو گیا تو لوگوں نے وصیت کے مطابق انتظار کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شترسوار تجہیز و تکفین کا سامان لیے ہوئے نمودار ہوا اور آپ کی تدفین کے بعد دوسرے روز علی الصباح چلا گیا۔ شاہ صاحب کو ان کی وصیت کے مطابق اس جگہ دفن کیا گیا جہاں آپ تشریف رکھتے تھے۔ آپ کا مزار چند ہی دنوں میں مسلمانوں کے لیے زیارت گاہ بن گیا اور یہاں مسلمانوں کی آبادی بڑھنے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک اور بزرگ جن کا نام نامی سید نور الہدیٰ تھا چند سادات کے ساتھ آکر یہیں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ کی آمد سے یہ مقام پہلے سے زیادہ آباد ہو گیا۔ ایک تو مسافروں کی گزرگاہ اور دوسرے اہل اللہ کا تکیہ۔ اس مقام کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور یہ مقام آئندہ بسنے والے شہر

حیدرآباد کا قلعہ۔ آغاز بن گیا۔ حضرت سید نورالہدیٰ نے اپنے وصال سے قبل اپنے مریدوں کو یہ وصیت فرمائی کہ مجھے غسل دے کر اور کفن پہنا کر منتظر رہیں۔ یہاں تک کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے بجلی کی سرعت سے آئے گا اور مجھے دفن کر جائے گا۔ کوئی اس سے کچھ نہ پوچھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ایک سوار آیا۔ اور زمین پر ہاتھ رکھ کر ایک بنی بنائی قبر برآمد کی۔ اور اس میں حضرت نورالہدیٰ کی نعش کو اتار کر فاتحہ پڑھی اور روانہ ہو گیا۔

جب محمد قلی قطب شاہ کے مبارک دور میں شہر حیدرآباد آباد ہوا تو پیشوائے سلطنت حضرت میر مومن صاحبؒ نے اسی مقام کو اس نئے شہر کے قبرستان کے لیے انتخاب فرمایا۔ کربلائے معلیٰ سے مٹی منگوا کر یہاں بکھیر دی اور خود اپنے اور اپنے خاندان کے لیے ایک مقبرہ یہیں تعمیر کیا۔ آپ نہ صرف ایک بڑے امیر سلطنت کے مشیر اور پیشوا تھے بلکہ بڑے صاحب دل اور باکرامت بزرگ تھے۔ آپ کی درگاہ بھی مرجع خلائق ہے۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب آپ کے معتقد ہیں ہر سال ۲۶/ شعبان کو آپ کا عرس بہت اہتمام سے ہوتا ہے۔ شاہان قطب شاہیہ اور شاہان آصفیہ کو آپ سے اس قدر عقیدت تھی کہ ان کی جانب سے روزانہ درگاہ میں چراغ روشن کرنے کے لیے گھی اور تیل کا معمول مقرر تھا۔ عود اور گل کے لیے ایک بڑی جاگیر وقف تھی۔ آپ کا انتقال ۱۰۳۵ھ میں ہوا اور آپ اس مقبرہ کے بالائی گوشہ میں دفن کیے گئے جو آپ نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا۔ مقبرہ کے بیچوں بیچ آپ کے صاحب زادے حضرت میر مجدالدین کی قبر ہے۔ آپ اپنے والد کی زندگی ہی میں فوت ہوئے تھے۔ شفقت پدری نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے لیے جو جگہ رکھی تھی وہیں بیٹے کو دفن کر دیا۔ اس دور کے دوسرے بڑے بزرگ حضرت سید حسین شاہ ولی صاحب قبلہؒ ہیں۔ آپ حضرت خواجہ بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں۔ آپ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں وارد گولکنڈہ ہوئے۔ بادشاہ نے آپ کی تشریف آوری کی خبر سنتے ہی اپنے وزیروں اور امیروں کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا۔ وہ نہایت اعزاز و اکرام سے آپ کو بادشاہ کے دربار میں لے آئے بادشاہ عقیدت کے ساتھ آپ سے ملا اور آپ کو دس ہزار فوج کا سپاہ سالار اور ریاست کے صیغہ تعمیرات کا معتمد مقرر کیا۔ نیز اپنی دختر نیک اختر کو آپ کے نکاح میں دیا۔

آپ ہی کی نگرانی میں حسین ساگر تعمیر ہوا جس کا اصلی نام ابراہیم ساگر تھا۔ مگر وہ آپ کے نام پر حسین ساگر مشہور ہو گیا۔ بادشاہ کی ایک لڑکی خیریت النساء بیگم کے نام پر خیریت آباد کی مسجد اور اس کا گنبد بھی آپ ہی کی نگرانی میں تعمیر ہوا۔ آپ نے ابراہیم قطب شاہ کے بعد اس کے بیٹے محمد قلی اور پوتے محمد قطب شاہ کے زمانے میں بھی ریاست کی خدمت انجام دی۔ آپ کا وصال ۱۰۳۰ھ میں ہوا۔ آپ کا مزار شہر حیدرآباد سے پانچ میل اور قلعہ گولکنڈے سے دو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں واقع ہے جو موضع درگاہ حضرت حسین شاہ ولی کہلاتا ہے مزار مبارک پر ایک عالی شان گنبد بنا ہوا ہے۔ آپ کا مزار بھی مرجع خلائق ہے اور ہر سال جمادی الثانی کی تیرہ تاریخ کو آپ کا عرس بہت اہتمام سے ہوتا ہے۔ ہزاروں زائرین اطراف و جوانب سے زیارت کے لیے آتے ہیں۔ کم و بیش اسی زمانے میں ایک بڑے صاحب دل بزرگ ایران سے حیدرآباد تشریف لائے اور دروازہ علی آباد کے باہر قیام فرمایا۔ آپ کا نام بھی میر مومن تھا۔ آپ کے ساتھ چالیس یا ساٹھ مرید تھے۔ آپ بڑے صاحب باطن درویش اور بلند پایہ فقیر تھے۔ ہمیشہ یاد الٰہیٰ میں مشغول رہتے تھے کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے اس وجہ سے حضرت "مومن چپ صاحب" کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ چشتیہ طریق کے سالک تھے۔ آپ نے ۱۰۲۵ھ میں انتقال فرمایا۔ اور اس جگہ مدفون ہوئے جہاں آپ فروکش تھے۔ آپ کا مزار جو بیرون بلدہ محلہ علی آباد میں ہے۔ زیارت گاہ خاص و عام ہے اور ہر سال آپ کا عرس ہوتا ہے۔

محمد قلی کے عہد حکومت میں حضرت پیر غوث الاعظمؒ کی اولاد میں ایک بزرگ جن کا نام سید میراں حسین الحموی عرف شاہ ابدال ہے۔ گولکنڈہ تشریف لائے اور قلعہ کے قریب ایک مسجد میں فروکش ہوئے۔ آپ کے ہم راہ ایک سو فقیر تھے۔ تین روز تک فقرا کو کوئی چیز میسر نہیں ہوئی فقر و فاقے کی حالت میں رہے۔ چوتھے روز محمد قلی نے اپنے ایک ملازم استقلال خاں کے ہم راہ پچاس خوان کھانے کے بھیجے۔ آپ نے کھانا فقرا میں تقسیم کر دیا اور خوان واپس کر دیے۔ جب خوانوں کو کھول کر دیکھا گیا تو کھانا جوں کا توں تھا۔ استقلال خاں آپ کی یہ کرامت دیکھ کر آپ کا معتقد ہو گیا۔ بادشاہ نے بھی بڑی عقیدت کا اظہار کیا۔ آپ نے معہ اپنے فقیروں کے ملکاپور (ملکہ پور) کے گاؤں میں سکونت اختیار فرمائی۔ ہر وقت ذکر و شغل میں معروف رہتے تھے۔ دنیا و مافیہا سے بہت کم تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے ۱۰۴۹ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار گولکنڈے کے قریب لنگر حوض کے کنارے پر واقع ہے۔ آپ سلسلۂ قادریہ کے پیر طریقت تھے۔

محلہ کاروان کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جو شاہ شبلی کی پہاڑی کہلاتی ہے۔ اس پہاڑی پر قطب شاہی عہد میں ایک بزرگ حضرت شاہ زین الدین شبلی جو حضرت خواجہ ابو بکر عبداللہ شبلیؒ کی اولاد میں تھے۔ تشریف فرما ہوئے۔ آپ بغداد سے تشریف لائے تھے۔ بڑے صاحب جلال بزرگ تھے۔

آپ کی بیعت کا سلسلہ بھی حضرت غوث الاعظمؒ سے ملتا ہے۔ آپ ایک عرصے تک اسی پہاڑی پر فروکش رہے۔ وہیں آپ نے انتقال فرمایا اور وہیں آپ کا مزار مبارک آج بھی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ آپ کا سن وفات ۱۰۵۰ھ ہے۔ ہر سال صفر کی تیسری تاریخ کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

حضرت بوڑھے شاہ صاحبؒ جن کا مزار بیرون شہر پناہ محلہ عثمان پورہ میں واقع ہے۔ قطب شاہی عہد کے ایک بڑے صاحب کرامت بزرگ ہیں آپ کا نام اصل میں سید بہبود علی شاہ تھا جو عوام کی زبان پر بگڑ کر بوڑھے شاہ ہو گیا۔ آپ اصل میں بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد گھوڑوں کے سوداگر تھے۔ باپ کی وفات کے بعد سارا مال و اسباب راہِ خدا میں خیرات کر کے حضرت سید شاہ امین الدین اعلیٰ رحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک مدت تک چلہ کشی کی اور فقر و ریاضت میں درجۂ کمال حاصل کیا۔ آپ اکثر جذب کی حالت میں رہتے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں آپ حیدرآباد تشریف لائے اور شہر پناہ کے باہر ایک گزر گاہ پر بیٹھ گئے۔ شہر کا چھوٹا دروازہ جو آپ کے قیام گاہ کے قریب تھا۔ آپ ہی کے نام پر "بوڑھے شاہ کی کھڑکی" مشہور ہو گیا۔ ایک مرتبہ عبداللہ قطب شاہ کا ہاتھی مست ہو کر لوگوں کو روندتا ہوا نکل گیا اور وہاں پہنچا جہاں آپ تشریف رکھتے تھے۔ لوگ یہ دیکھ کر بہت خائف ہوئے اور حضرت کو وہاں سے اٹھ جانے کے لیے بہت کچھ کہا مگر آپ اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ جب ہاتھی آپ کے پاس آیا تو بجائے مستی کے بالکل خاموش ہو کر اپنی سونڈ آپ کے پاؤں پر ملنے لگا۔ حضرت نے اس کی سونڈ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔ بس اپنے ٹھکانے چلا جا مستی نہ کر۔ اسی وقت وہ ہاتھی چپ چاپ اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت کے فقر و کرامت سے لوگ بے حد متاثر ہوئے اور بڑی عقیدت ظاہر کرنے لگے۔ آپ نے ۱۰۶۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار اسی مقام پر ہے جہاں آپ تشریف رکھتے تھے۔ مٹی کی ایک بہت بڑی قبر ہے جس پر صرف چونکھنڈی بنی ہوئی ہے۔ قریب میں ایک پختہ مگر مختصر مکان ہے۔ ہر سال آپ کا عرس ربیع الثانی کے مہینے میں ہوتا ہے۔ آپ کے مزار کے اطراف ایک بڑا قبرستان بن گیا ہے جس میں کئی بزرگانِ دین آسودہ ہیں۔

شہر حیدرآباد سے چار میل کے فاصلے پر ایک گاؤں "پیرلا گوڑہ" کے نام سے آباد ہے جہاں ایک بزرگ کا مزار پر انوار ہے۔ عبداللہ

ملکاپوری اپنی تاریخ اولیائے دکن میں لکھتے ہیں کہ یہ مزار حضرت شاہ عبدالرزاق ثانی کا ہے۔ آپ بارہ برس کی عمر میں علوم ظاہری و باطنی میں بہرہ کامل حاصل کر کے بغداد سے حیدرآباد تشریف لائے۔ اور موضع پیرلاگوڑہ میں ایک غار میں بارہ برس تک گوشہ نشین رہے۔ پھر بغداد گئے اور وہاں اپنے چچا کی لڑکی سے عقد کیا پھر حیدرآباد آئے۔ یہاں قطب شاہی خاندان کی ایک شہزادی سے بھی عقد کیا۔ شہزادی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ البتہ پہلی بیوی سے ایک فرزند جن کا اسم گرامی شاہ عبدالقادر ثانی ہے آپ کی یادگار ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالرزاق کی وفات ۱۱۰۱ھ میں بیان کی جاتی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں حضرت صوفی سرمدؒ کے ایک مرید خلیفہ دلّی سے حیدرآباد آئے اور اپنے کشف و کرامات کے لیے وہ شہرت حاصل کی کہ نہ صرف قطب شاہی بلکہ آصف جاہی خاندان کے بادشاہ اور امراء بھی ہمیشہ کے لیے آپ کے معتقد ہوگئے۔ یہ حضرت برہنہ شاہ صاحب ہیں۔ آپ کا اصلی نام سید حسن شاہ تھا۔ اور وطن آپ کا عراق و عجم ہے۔ وہاں سے دلی آئے اور حضرت صوفی کے دست مبارک پر بیعت کی۔ فوراً جذب کامل آپ کے اندر پیدا ہوا اور آپ نے لباس ظاہری ترک کر دیا اور برہنہ ہوگئے۔ حیدرآباد میں آپ پھسل بنڈہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ وہاں صرف چند جھونپڑیاں تھیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے ایک امیر مالک پرست خاں نے آپ کی کرامات دیکھ کر آپ سے بڑی عقیدت ظاہر کی۔ بادشاہ بھی اولاد نرینہ کے لیے آپ سے رجوع ہوا۔ مگر اس کی قسمت میں نہیں لکھی تھی۔ وہ محروم رہا۔ آپ مجذوب کامل اور بڑے صاحب کرامتؒ بزرگ تھے۔ ۱۶/جمادی الثانی ۱۰۶۴ھ کو آپ نے وصال فرمایا اس جگہ دفن ہوئے جہاں آپ تشریف رکھتے تھے۔ مالک پرست خاں نے ایک خوب صورت مقبرے تعمیر کروادیا۔ اس کا خاندان بھی آپ ہی کے پائنتی دفن ہے آپ کے مقبرہ کے اطراف آصف جاہی خاندان کے مرشد زادوں اور صاحب زادوں کی قبریں خاصی تعداد میں ہیں۔ امرا پائیگاہ کی قبریں بھی اس علاقہ میں ہیں۔ کیوں کہ وہ بھی آپ سے کمال عقیدت رکھتے تھے۔ ہر سال آپ کا عرس تزک و احتشام سے ہوتا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک سید صحیح النسب حضرت سید شاہ میرانؒ سواروں کے جمعدار تھے۔ سرکاری کاموں میں آپ کی دیانت و امانت بہت مشہور تھی۔ بادشاہ نے آپ کی لیاقت اور دیانت کے مدنظر آپ کو اپنا معتمد علیہ بنایا اور ایک اہم موقع پر اپنا سفیر بنا کر عادل شاہ کے دربار میں بیجاپور روانہ کیا۔ چند روز وہاں رہ کر سرکاری کام خوش اسلوبی سے انجام دیا اور عادل شاہ سے اجازت لے کر حیدرآباد آنے والے تھے کہ معلوم ہوا کہ حضرت سید شاہ امین الدین اعلیٰ چلہ کشی کے حجرہ سے برآمد ہوئے ہیں۔ اور خلائق کثرت سے آپ کی زیارت کے لیے جا رہی ہے۔ یہ بھی حضرت کے دیدار سے مشرف ہونے کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت کی نظر کیمیا اثر نے آپ کو چشم زدن میں اعلیٰ مدارج روحانی پر فائز کر دیا۔ حضرت امین الدین اعلیٰ آپ کا ہاتھ پکڑ کر حجرے میں لے گئے اور چند گھنٹوں کے بعد دونوں جب برآمد ہوئے تو حضرت نے فرمایا جو امین الدین تھا وہ میراں ہوا اور جو میراں تھا وہ امین الدین ہوا۔ حضرت شاہ میراں کو میراں جی خدا نما کا خطاب عطا ہوا۔ چند روز مرشد کی خدمت میں رہے پھر خرقہ، خلافت عطا فرمایا اور حیدرآباد جانے کا حکم دیا گیا۔ حیدرآباد آکر میراں جی نے سرکاری ملازمت سے علاحدگی اختیار کی اور یاد الٰہی میں مشغول ہوگئے۔

لوگ کثرت سے آپ سے فیض یاب ہونے لگے۔ آپ کی روحانی تعلیم کے دور دور تک چرچے ہونے لگے آپ نے مریدوں اور عقیدت مندوں کے فائدے کے لیے دکنی زبان میں کئی صوفیانہ رسالے تصنیف فرمائے ہیں۔ جن میں سے رسالہ "وجودیہ" رسالہ "قربیہ" بہت مشہور

ں۔ آپ نے ۱۰۸۰ھ ۱۰ جمادی الاول کو وصال فرمایا۔ آپ کا مزار مبارک محلہ مستعد پورہ کے قریب واقع ہے۔ اس مقام کا ایک زمانے میں بد اللہ پور نام تھا۔ لیکن اب یہ نام بالکل گمنام ہے۔ آپ کا بھی عرس ہر سال ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز کی اولاد میں حضرت سید حسین شاہ کے بعد دو اور بزرگ حیدرآباد میں اپنے فیض روحانی اور کشف و کرامت کے اعتبار سے بہت مشہور ہوئے اور ان دونوں کا تعلق بھی قطب شاہی عہد سے ہے۔ ایک حضرت سید اکبر حسینیؒ ہیں جن کا گنبد بیرون شہر ازی بندہ کے دروازہ کے قریب ہے۔ آپ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں گزرے ہیں۔ تمام عمر گوشہ قناعت میں بسر کی۔ کبھی بادشاہ یا امرا کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہمیشہ یاد الٰہی میں مستغرق رہے۔ آپ کے سجادہ اور جانشین آپ کے بھتیجے حضرت سید شاہ راجو ہیں جن کا مزار بیرون فتح روازہ واقع ہے اور جن کا عالی شان اور بہت ہی بلند گنبد سارے حیدرآباد میں اپنی رفعت اور عظمت کے لیے مشہور ہے۔

حضرت سید شاہ راجو بیجاپور میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد حیدرآباد اپنے چچا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ظاہری اور روحانی تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کیے۔ پھر آپ سے خلافت حاصل کی اور آپ ہی کے خانقاہ میں مقیم ہوئے۔ چچا کے وصال کے بعد آپ اس مقام منتقل ہوگئے جہاں اس وقت آپ کا گنبد ہے۔ آپ کی قیام گاہ پر فقرا کی بڑی تعداد ہر وقت مصروف ریاضت رہتی تھی۔ ابوالحسن تاناشاہ آخری فرماں روائے گولکنڈہ آپ کا مرید خاص تھا۔ اس کی شادی عبداللہ قطب شاہ کی تیسری بیٹی سے محض حضرت شاہ راجو کی کرامت کا نتیجہ ں۔ اس شہزادی کی شادی سید سلطان نامی نوجوان سے قرار پاچکی تھی اور شادی کی تمام ابتدائی رسمیں مکمل ہوچکی تھیں کہ ناگہاں بادشاہ کا بڑا داماد اور بڑی بیٹی جن کی تحریک سے یہ نسبت ٹھہری تھی اس کے مخالف ہوگئے اور بادشاہ کو مجبور کردیا کہ شہزادی کی شادی کسی طرح سید سلطان سے نہ ہونے پائے۔ ابوالحسن جو شاہی خاندان سے قرابت قریبہ رکھتا تھا۔ فقیرانہ زندگی اختیار کیے ہوئے حضرت شاہ راجو کی خانقاہ میں رہتا تھا۔ بہ لحاظ رشتہ داری اس کی دلی تمنا تھی کہ شہزادی اس سے بیاہی جائے۔ حضرت شاہ راجو نے اس کی شادی کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی۔ نیز آپ نے اپنی خانقاہ میں ابوالحسن کی شادی کی تمام ابتدائی رسمیں بھی یک طرفہ طور پر اس طرح ادا کرائیں جیسے کہ ابوالحسن کی سچ شادی ہو رہی ہے۔ ادھر بادشاہ نے اپنی بیٹی اور داماد کے اصرار پر سلطان کے ساتھ نکاح کردینے کا ارادہ تاریخ عقد سے عین ایک روز پہلے بدل دیا اور ابوالحسن کے ساتھ شادی کردینے کا تصفیہ کیا۔ اس کی تلاش کرواکر اسے خانقاہ سے محل لے جایا گیا جہاں دوسرے روز اس کی شادی نہایت تزک و احتشام سے ہوگئی۔ ابوالحسن تاناشاہ نے اپنے زمانہ حکومت میں آپ کی خانقاہ کے مصارف کے لیے بیش مواجب علاقے دیے۔ آپ کے فرزندوں سے اپنی لڑکیوں کی نسبت بھی کی۔ آپ نے ۱۰۹۲ھ میں انتقال فرمایا۔ ابوالحسن نے آپ کے مزار پر وہ عالی شان گنبد تعمیر کروایا جو دیکھنے کے لائق ہے۔ گنبد کی تعمیر مکمل ہوچکی مگر اندر کی استرکاری باقی تھی کہ سلطنت قطب شاہیہ کو زوال آگیا اور یہ کمی آج تک رہ گئی۔ حضرت شاہ راجو کی درگاہ مرجع خلائق ہے۔ ہر روز زائرین کثیر تعداد میں حاضر ہوتے ہیں۔ آصف جاہی خاندان کے بادشاہوں کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ چناں چہ گنبد پر جو طلائی کلس ہے یہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ نے نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں لگایا اس طرح گنبد کے اندر لکڑی کی خوب صورت بارہ دری ناصر الدولہ نے بنواکر لگائی۔ حضرت شاہ راجو کے علاوہ حضرت سید اکبر حسینی کے سجادہ اور خلیفہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔

یہ حضرت شاہ زندہ حسینی ہیں جو عام طور پر شاہ خاموش کے لقب سے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ خانہ کعبہ کے جاروب کش تھے۔

اتفاق زمانہ آپ اور آپ کے چھوٹے بھائی دریائی سفر کر رہے تھے کہ جہاز غرقاب ہو گیا۔ آپ کے سارے ساتھی ڈوب گئے آپ ایک تختے کی مد سے اپنی جان بچا کر خشکی پر پہنچے اور برسوں جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومتے گھماتے حیدرآباد آئے۔ اس وقت عبداللہ قطب شاہ مسند پر متمکن تھا۔ یہاں آپ نے حضرت سید اکبر حسینی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی اور فقر و ریاضت کی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ ایک جھاڑو ہر وقت آپ کی بغل میں رہتی تھی۔ جہاں کوئی مسجد دیکھتے اس میں جھاڑو دیتے۔ خس و خاشاک سے اس کو صاف کر دیتے تھے۔ آپ بھی بڑے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے اور بہت سے لوگ آپ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ آپ نے ۱۰۸۰ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار پنج محلہ کے سامنے شاہ علی بنڈہ جانے والی سڑک پر واقع ہے جہاں بڑ کا ایک بڑا درخت سایہ کیے ہوئے ہے۔

ابوالحسن تاناشاہ کے معاصر بزرگوں میں ایک نامور شخصیت حضرت شاہ میر محمود صاحب قبلہؒ کی بھی ہے۔ جن کا مزار مبارک تالاب میر عالم کے کنارے بڑی بلندی اور نہایت پر فضا مقام پر واقع ہے آپ رضوی سلسلے کے سید ہیں۔ آپ کا وطن اصل نجف اشرف ہے جہاں آپ کے بزرگوں کو بڑا اعزاز و اکرام حاصل تھا۔ آب و دانہ کی کشش اور سیر و سیاحت کے ذوق نے آپ کو ہندوستان میں پہنچایا۔ ہندوستان۔ مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے آپ بیدر پہنچے۔ یہاں آپ نے حضرت شاہ خلیل اللہ بت شکن نعمت اللہ کے سجادہ حضرت شمس الدین حسینی کے ہاتھ پر بیعت کی اور تین سال تک مرشد کی خدمت میں حاضر رہے۔ پھر نعمت اللہی سلسلے میں خرقہ، خلافت پایا اور وہاں سے عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانے میں حیدرآباد آکر اس پہاڑ کی چوٹی پر قیام فرمایا جہاں اس وقت آپ کا مزار ہے جو اس وقت آپ ہی کے نام پر محمود صاحب کی پہاڑی کہلاتی ہے۔ آپ نے یہاں ایک خانقاہ اور گنبد تعمیر کروایا اور آخر وقت تک وہیں قیام فرما رہے۔ ۱۱۰۰ھ میں آپ وصال ہوا۔ آپ کے فرزند حضرت شمس اولیاء عرف شمس مولا جو اپنے عہد کے بڑے بزرگ تھے آپ کے جانشین ہوئے۔ آپ کی درگاہ مرجع خلائق ہے اور ہر جمعرات کو کثرت سے لوگ زیارت کے لیے آتے ہیں۔

اس عہد کی آخری شخصیت حضرت میر اسد اللہ شہیدؒ کی ہے۔ آپ کے والد شاہ جہاں کے ملازم تھے۔ والد کی وفات کے بعد آپ اور آپ کے بھائی اورنگ زیب کی سلطنت میں ممتاز خدمات پر معمور ہوئے۔ جب اورنگ زیب نے گولکنڈے پر فوج کشی کی تو آپ بھی لشکر ساتھ حیدرآباد آئے۔ گولکنڈے کے محاصرے نے طول کھینچا۔ اورنگ زیب کو اپنی کامیابی کی مشکل نظر آنے لگی۔ آپ کی ریاضت اور کرامات سے بہت کم لوگ باخبر تھے۔ بعض اہل لشکر کو اس کا علم تھا۔ اورنگ زیب پریشان ہو کر اولیاء اللہ کی مدد کا طالب ہوا اور اپنے اہل دربار سے کہ اس وقت کسی بزرگ سے استعانت کی ضرورت ہے۔ بغیر اولیاء اللہ کی دعا کے یہ مہم سر ہوتی نظر نہیں آتی۔ کسی درباری نے بادشاہ آپ کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے فوراً اپنے معتمد کو بھیج کر آپ کے حال کی تصدیق کرائی اور اس کے بعد خود آکر دعا کا خواستگار ہوا۔ آپ نے دعا فرمائی اور خود بھی محاصرے کے کام میں شریک ہوئے۔ آپ کی دعا سے قلعہ فتح ہو گیا۔ مگر آپ اس کش مکش میں گولے کی زد میں آکر شہید ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۰۹۸ھ کا ہے۔ قلعے کے قریب ٹیک مام پورہ میں آپ کو دفن کیا گیا ہے۔

○ ○ ○

پریل ۱۹۹۴ء

سب رس حیدرآباد
(دکن کلچر نمبر)

ڈاکٹر صادق نقوی

حیدرآبادی تہذیب کے مذہبی اقدار

ہندوستان کی تاریخ دور قدیم سے دور وسطیٰ کے اختتام تک اخلاقی اقدار کو مذہبی رسومات کے توسط سے ابھاگر کرنے اور انھیں ندوستانیوں کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بنانے سے عبارت ہے۔ ان دونوں ادوار میں مذاہب کی اہمیت کو حکومتوں نے نہ صرف تسلیم کیا تھا بلکہ ن ہی کی اساس پر اپنے اقتدار اور تہذیبی اقدار کی بنیاد بھی رکھی تھی۔

تاریخ ہند کا یہ سفر جب سترہویں صدی کے ابتدائی دور تک آیا تو مذاہب کی اہمیت اور تہذیبی اقدار میں ان کی مرکزیت بہت نمایاں وگئی۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں یگانگت اور مذاہبی رواداری کے اقدار کو ابھاگر کر کے انھیں متحد کرنے کی کوشش شمالی اور جنوبی ند کے حکمرانوں کا مرکزی مسئلہ بن گئیں۔ تاریخ ہند کا یہ دلچسپ اتفاق ہے کہ مغلیہ دور کے عظیم حکمران اکبر اعظم قطب شاہی خاندان کے محمد ی قطب شاہ اور عادل شاہی سلسلے کے ابراہیم عادل شاہ ہم عصر تھے۔ ان تینوں حکمرانوں کے ادوار کا ایک سرسری سا مطالعہ بھی اس حقیقت سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ تینوں حکمرانوں نے اپنی مذہبی پالیسی کو بڑی اہمیت دی اور تینوں کی مذہبی پالیسی کا مقصد بھی ایک ہی تھا۔ اہب کو افتراق کا ذریعہ بننے سے روکنا اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اتحاد کے ذریعے سماج کو ایک اکائی کی صورت میں تشکیل دینا۔ نوں حکمرانوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے بھرپور کوشش کی لیکن ان کے عمل کے راستے جداگانہ تھے۔ اکبر اعظم نے مذہب اسلام کے نون میں دوسرے مذاہب کے قوانین کی آمیزش سے ایک نیا مذہب "دین الہیٰ" تشکیل دیا تو ابراہیم عادل شاہ نے رواداری کے اظہار کے یے مذہب کے حدود کی بھی پروانہ کی۔ نتیجہ تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہے۔ اکبر کا مذہب خود معرض بحث میں آگیا اور اب تک بھی مورخین فیصلہ نہیں کر سکے کہ اکبر مسلمان باقی رہا تھا یا نہیں۔ کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار ابراہیم عادل شاہ کے متعلق بھی ملتا ہے۔ لیکن اس استے پر قطب شاہوں کا سفر یقیناً انھیں اس عہد کے حکمرانوں میں ممتاز کرنے کا باعث بنا ہے۔ قطب شاہوں نے مذاہب کے قانون میں نئی تجربہ کیا نہ انھیں بدلنے کی کوشش کی بلکہ انھوں نے مذہبی رواداری اور بھائی چارے کے حصول کے لیے تہذیب و تمدن کا سہارا لیا۔ طب شاہوں کی دین وہ تہذیب ہے جسے دور جدید میں حیدرآبادی تہذیب کا نام دیا گیا ہے۔ یہی تہذیبی اقدار ہیں جن کی اساس انسانیت کی بنیادوں پر رکھی گئی ہے۔ حیدرآبادی تہذیب بھی اس دور کی دوسری تہذیبوں کی طرح مذہب کے مرکز پر کھینچے ہوئے مختلف المحیط دائروں پر مشتمل ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس تہذیب میں ہر مذہب کے ماننے والے کو اپنی مذہبی روایات کی پاس داری کا پورا حق دیا گیا ہے۔ قطب شاہوں نے اور خاص طور سے محمد قلی قطب شاہ نے اپنے دور میں اس مقصد کے حصول کی خاطر بہت سارے رسوم کو شاہی سرپرستی عطا کی۔ خود بھی ان میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی رعایا کو بھی ان میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ ان رسوم کا بڑا حصہ عاشور خانوں سے مربوط ہے۔ جو سوال آج مورخین کے ذہنوں میں کھلبلی مچاتے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ عاشور خانوں کو دی گئی یہ اہمیت کیا اس بنا پر تھی کہ قطب شاہی بادشاہ مذہب اثنا عشری کے ماننے والے تھے یا عاشور خانوں کو دی گئی اہمیت ان کی مذہبی پالیسی کے لیے ایک اہم ذریعے کی حیثیت رکھتی تھی۔

میرے خیال میں یہ دونوں سوالوں کے جواب ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ قطب شاہی بادشاہ اثنا عشری تھے اس لیے ان کے نزدیک عاشور خانوں کی اہمیت مسلم تھی۔ عزاداری حسین ابن علیؑ علیہ السلام ان کے مذہب کی اہم اساس تھی اس لیے انھوں نے کھل کر عزاداری میں حصہ لیا۔ لیکن عاشور خانوں اور عزاداری کو قطب شاہی دور میں دی گئی اہمیت بھیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا مطالعہ قطب شاہوں کی مذہبی پالیسی کے پس منظر میں کرنا بھی ضروری ہے۔ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے قریب لانے اور ایک دوسرے کے رسومات میں حصہ لینے کی ترغیب دینے کے لیے عاشور خانہ ہی واحد ذریعہ تھا۔ نہ کسی مسجد میں غیر مسلم مذہبی فرائض میں شامل ہو سکتا ہے نہ کسی مندر کے مذہبی رسومات میں کوئی مسلم غیر مسلموں کے ساتھ شریک عبادت ہو سکتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے قطب شاہوں نے عاشور خانوں کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ یہ بات اس دور کے عزاداری کے تذکروں سے اجاگر ہے کہ علم کا جو تصور مسلمانوں کے پاس ہے وہ غیر مسلموں کے پاس نہ تھا۔ علم مسلمانوں کے لیے عزاداری اور شہدا۔ کربلا کی یاد منانے کے لیے ایک نسبت اور نشان ہے لیکن قطب شاہوں نے علم کے تصور کو Universalise کیا۔ علم، حق و صداقت، تقدس، ظلم کے خلاف اظہار بیزارگی اور حق پسندوں کے ساتھ اپنی یگانگت کا نشان بن گیا۔ ظاہر ہے کسی بھی مذہب، ذات یا فرقے میں حق پسندی سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے ہر مذہب و ملت کے افراد نے اسے اپنالیا۔ اس نظریے کو ثبوت کی منزل تک لانے کے لیے اس دور کے وہ لوک گیت معاون ثابت ہوتے ہیں جنھیں غیر مسلموں نے تلگو زبان میں لکھے تھے۔ یہ گیت اب بھی مختلف اضلاع میں محرم کے دوران گائے جاتے ہیں۔

رائے درگ تعلقے کے گاؤں شولاپور کے تلگو شاعر رامنا کے گیت کے پہلے دو مصرعے یوں ہیں:

پدالا پنڈوگا راوے
پیرالا پنڈوگا راوے

(عظیم انسانوں کی تقریب آ ، پیروں کی تقریب آ)

آندھرا پردیش کے رائل سیما علاقے میں جو گیت محرم کے دوران گایا جاتا ہے وہ یوں ہے:

اے عظیم تجھے سلام
اے خدا تجھے سلام
اے پروردگار تجھے سلام
آسمانوں کے شہر میں
ایک خوب صورت قلعہ ہے
اس خوب صورت قلعہ میں ایک شیشے کا محل ہے
جس میں دو بلند بیٹھنے کے مقام ہیں
جن پر دو خوب صورت تخت رکھے ہیں
ان تختوں پر کون بیٹھا ہے
یہ حسنؑ اور حسینؑ ہیں - دو بھائی
دربار میں بادشاہ . اور تخت پر فرماں روا

جن کی حکومت ساتوں آسمانوں پر قائم ہے

قطب شاہوں نے عزاداری کے لیے کھلی آزادی دے رکھی تھی۔ عاشور خانوں کے صحن عزاداری کے مرکز بن گئے تھے۔ ہر مذہب کا ماننے والا اپنے انداز میں حسینؑ کی خدمت میں اپنا نذرانہ۔ عقیدت اپنے انداز میں اور اپنی روایات کے پس منظر میں پیش کرتا تھا۔ عاشور خانوں میں ناریل، پلی ہار اور پھولوں کا نذرانہ خاص طور سے دیہاتوں کے عزاخانوں میں معمول بن گیا ہے۔

عزاداری کے سلسلے میں جو رسوم قطب شاہی دور سے آصف جاہی دور کے چھٹے فرماں روا تک جاری رہے وہ عموماً مقامی رسومات کی بدلی ہوئی شکل تھے۔ "تاریخ جنوبی ہند" میں بلگرامی نے لکھا ہے کہ رنگ کی رسم جس میں عقیدت مند اپنے جسم پر مختلف رنگ مل کر شیر یا کسی جانور کا روپ دھارے عزاخانے میں آتے تھے، مرہٹواڑہ سے لی گئی تھی۔ اسی طرح کے کئی اور رسوم تھے جن کا سلسلہ قطب شاہی دور سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ مثلاً کلائی پر لال ناڑا باندھنا، فقیر بننا، وغیرہ۔ ان رسوم کی چاہے کوئی مذہبی اہمیت ہو یا نہ ہو اتنا ضرور ہے کہ ان سے وہ انسانی اقدار اجاگر ہوتی ہیں جو انسان کو انسان کے قریب لانے کا باعث بنتے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب "حیات میر مومن" میں اسی کو یوں لکھا ہے کہ ساری آبادی وہ مسلم ہو کہ غیر مسلم عاشور خانوں میں نذرانہ۔ عقیدت پیش کرتی تھی اور اس کے دوران حاکم اور محکوم، مذاہب، ذات پات کے تفرقے بھلا دیے جاتے تھے۔

مرزا نظام الدین احمد نے اپنی کتاب حدیقۃ السلاطین میں . . . ب شاہی میں عزاداری کی تفصیلات دی ہیں۔ قطب شاہوں کی عزاداری کا مرکز بادشاہی عاشور خانہ تھا جہاں سلطان اپنے امرا اور اہل خاندان کے ساتھ روز عزاداری میں حصہ لیتا تھا۔ سواری سے کمان فیض المیاں پر پہنچ کر اتر جاتا اور وہاں سے پاپیادہ، سیاہ پوش اپنے امرا اور اہل خاندان کے ہمراہ عاشور خانے کی عمارت میں داخل ہوتا۔ مجلس کا آغاز ہوتا۔ مرثیہ خواں مرثیے پڑھتے پھر سلطان عاشور خانے میں ہر روز ایک ہزار چراغ روشن کرتا اور فاتحہ خوانی کرتا۔ سلطان کے رخصت ہوتے ہی عاشور خانے میں جمع عزاداروں کی کندوری اور شربت سے تواضع کی جاتی۔ مرزا نظام الدین احمد نے اپنی کتاب میں ۷/ محرم سے ۹/ محرم تک کی ہر شب میں عزاداری اور جلوسوں کی تفصیل بھی دی ہے ان تفصیلات میں گئے بغیر مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ قطب شاہی بادشاہوں کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے اپنی خوشی اور غم دونوں میں اپنی عوام کو شریک ہونے کا مکمل موقع دیا۔ وہ عیدوں کی خوشیاں ہوں کہ محرم کی عزاداری، بادشاہ اور عوام، غریب و امیر، مسلم و غیر مسلم، شہری اور دیہاتی سب اس میں برابر شریک ہوتے تھے۔ یہ رسوم جن کی ابتدا دور قطب شاہی میں ہوئی آج بھی باقی ہیں۔ عاشور خانوں سے علم کی سواری اب بھی مقررہ تاریخ کو برآمد ہوتی ہے۔ ۷/ محرم کو عاشور خانے حضرت قاسم ابن حسنؑ سے علم برآمد ہوتا ہے جو ماتم داروں اور عوام کی کثیر تعداد کے ہمراہ گشت کرتا ہے۔ ۹/ محرم کی شب عاشور خانہ نعل مبارک سے علم برآمد ہوتا ہے۔ غلام حسین خاں نے تاریخ گلزار آصفی میں نعل مبارک کے جلوس کی تفصیلات دی ہیں۔ اب بھی اس علم کی سواری اسی تزک و احترام سے اور ان ہی راستوں سے گزرتی ہے۔ اس جلوس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عوام بلا لحاظ مذہب و ملت بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں اور سواری کے راستے پر مختلف مقامات پر علم پر پھول اور دھٹی کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ جلوس کے ہمراہ عموماً غیر مسلم ہاتھوں میں مشعلیں اور عود دان لیے چلتے ہیں۔ عود دانوں میں عقیدت مند عود ڈالتے رہتے ہیں اور اس کی خوشبو سے فضا معطر رہتی ہے۔ ۹/ محرم کی صبح اور دس محرم کی صبح بارگاہ ابو الفضل العباس سے علم کی سواری برآمد ہوتی ہے ان دونوں جلوسوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ان جلوسوں میں ماتم دار بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں عزاداری کے یہ جلوس بڑے متبرک تسلیم کیے جاتے ہیں جن سے وابستگی حیدرآبادی تہذیب کا جز بن گئی ہے۔

عزاخانوں اور عاشور خانوں کا حصہ حیدرآباد کی Intellectual History میں بھی خاصا نمایاں ہے اور اس میں بھی مذہب، فرقے یا ذات پات کا فرق نہیں ہے۔ دور قطب شاہی میں عاشور خانوں کی عزاداری نے اردو ادب کو دو اصناف سخن سے متعارف کیا مرثیہ اور نوحہ۔ قطب شاہی دور کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے مرثیے لکھے۔ خود محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے مرثیے ادب میں قابل قدر مقام رکھتے ہیں۔ چراغ علی کے مطابق دور قطب شاہی میں کل ۱۲ شعرا کے مرثیے دستیاب ہیں۔ لیکن چراغ علی نے مرثیہ نگاروں کی فہرست میں شاہ راجو کو شامل نہیں کیا ہے۔ مجھے ادارہ ادبیات اردو کی لائبریری میں ایک مخطوطہ "بیاض مرثیہ" دستیاب ہوا اس بیاض میں جو بہت خستہ ہے قطب شاہی دور کے دوسرے شعرا کے ساتھ شاہ راجو کے دو مرثیے بھی ہیں۔

پہلے مرثیہ کا مطلع ہے:

حسینا کے ماتم سوال محرم پہ
ہوا ہے قیامت سو یارب سراسر

اور اسی مرثیہ کا مقطع ہے:

رحم شاہ راجو حسینی پہ اپنا
کرے چھاؤں میں رکھ شہنشاہ سرور

دوسرا مرثیہ جسے نوحہ بھی کہا جاسکتا ہے اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

غم زدہ ہو کن یو نکلا شور ماتم کا اٹھا

شاہ راجو چشتیہ سلسلے کے مایہ ناز صوفی بزرگ تھے جو ابوالحسن آخری فرماں روائے گولکنڈہ کے پیر و مرشد بھی تھے۔

عاشور خانوں کے مراکز سے علم و ادب کی ترقی دور قطب شاہی سے دور آصف جاہی تک اور دور آصف جاہی سے آج تک جاری ہے۔ عزاداری نے اردو شعر و ادب کو کئی نئے اصناف سخن سے نوازا ہے۔ عاشور خانوں اور عزاداری کا دانش وری کی ترقی میں حصہ صرف شاعری ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں کئی ایسی کتابیں بھی آئی ہیں جو دنیائے ادب میں قابل قدر مقام رکھتی ہیں۔ علم و ادب کی اس ترقی میں کسی ایک خاص فرقے، مذہب یا ذات کا تعین نہیں ہے۔ وہ شاعری کی اصناف سخن ہوں یا نثر کے شہ پارے سب ہی فرقوں کے اہل علم و ادب کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

حیدرآباد کی مذہبی روایات انسانی اقدار کے یہ پہلو حیدرآبادی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں جن کی از سرنو دریافت خاص طور سے اس دور کے لیے اہم بھی ہے اور بیش قیمت بھی۔

(ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار "دکنی کلچر کے چند پہلو" ۲۱، ۲۲ مارچ ۱۹۹۴ء میں پڑھا گیا)

○ ○ ○

راحت عزمی

حیدرآباد میں محرم کی رسومات

بادشاہوں کی تاریخ میں قطب شاہوں سے ہٹ کر شاید ہی کوئی ایسا خانوادہ گزرا ہو جس کے سارے بادشاہ ایک ہی مزاج اور یکساں فکر رکھتے ہوں۔ قلی قطب الملک سے لے کر ابوالحسن تاناشاہ تک سب کے سب انسان دوست، رعایا پرور، ظالم گریز، مظلوم آشنا، بلند مرتبہ سماج کار، رحم دل اور اپنی وضع کے پابند تھے۔ انھوں نے اپنی رعایا کو اولاد کی طرح اپنے کلیجے سے لگایا۔ ان کے آرام و آسائش کا ہر عنوان اور ہر زاویے سے خیال رکھا۔ ان انسانیت نواز بادشاہوں نے اپنے اپنے عہد حکومت میں یہی کوشش کی کہ ان کی رعایا کے درمیان انسانی رشتے مستحکم سے مستحکم تر ہوں۔ اس جذبے کا نمایاں ثبوت یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ بانی شہر حیدرآباد نے اپنے دور حکومت میں کسی کو موت کی سزا نہیں دی۔

قطب شاہی خاندان کے پہلے تاج دار قلی قطب الملک کا اپنی رعایا سے پیار اس بلندی پر تھا کہ خود رعایا اس کو اپنی محبت کے اظہار کے طور پر "بڑے ملک" کے نام سے پکارا کرتی اور ملکہ کو "ماں صاحب" کہا کرتی تھی۔ ابراہیم قلی کی رعایا پروری اس حد تک محبت میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ایک تلگو شاعر نے اس کی موت پر خدا سے شکوہ کیا کہ تو نے ابراہیم کو ہم سے کیوں چھین لیا اس کے بجائے دنیا میں اور بہت سے بادشاہ تھے جن میں سے کسی کو بلا سکتا تھا۔

قطب شاہی سلسلے کا پانچواں تاج دار محمد قلی قطب شاہ سماج کاری اور رعایا پروری کے میدان میں سب سے آگے نکل گیا۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے درست لکھا ہے کہ:

> "سلطان محمد قلی قطب شاہ کو خدا نے قلب و دماغ کی اعلیٰ قوتیں ودیعت کی تھیں۔ وہ نہ صرف ایک بہت بڑا بادشاہ تھا بلکہ ایک بلند مرتبہ مصلح قوم، مجتہد وقت، وضع دار، رعایا پرور اور فیاض و رحم دل بھی تھا ۔۔۔۔ اس میں خدا نے ایسی ایسی عجیب و غریب اور متضاد و مختلف خصوصیتیں یک جا کر دی تھیں کہ تاریخ میں ایسی مجمع الصفات شخصیت بہت کم نظر سے گزری ہے۔"

محمد قلی قطب شاہ کا سماجی شعور بہت اونچا اور ہمہ گیر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رسوم و رواج تہذیب و تمدن، ثقافت اور کلچر کی جان بھی ہوا کرتے ہیں اور پہچان بھی ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے دور حکومت میں سماج کاری کے اس رخ پر خاص توجہ دی اور ایسی رسمیں رائج کیں جن میں اعلیٰ انسانی قدروں کو گوندھا گیا تھا تاکہ ان کے رواج پا جانے سے دیرپا امن و آشتی کا گلستان سدا بہار رہے۔ اس نے بقول ڈاکٹر محی الدین قادری زور جن چار بین قومی تقریبوں کو عام کیا ان میں سے ایک محرم ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے محرم کی رسموں پر خاص طور پر توجہ دی۔ محرم کے مراسم کو عام کرنے کا سبب صرف یہ نہیں تھا کہ وہ شیعہ تھا بلکہ اس نے ایک پر خلوص تجربہ کار سماجی خدمت گار کی حیثیت سے ان

مراسم محرم میں زندگی کی اعلیٰ ترین قدر "غم" کو آمیز کر کے ان سے اپنی رعایا کو آشنا کیا تاکہ ان میں گداز قلب اتنا شدید ہو جائے کہ وہ مظلوم سے محبت اور ظالم سے نفرت کرنے اور ہر ظلم و زیادتی سے دور رہنے کو صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی کی شرط اول سمجھنے لگیں۔ محرم کے رسوم میں شروع سے آخر تک یہی روح کار فرما ہے۔

زندگی کی اعلیٰ قدروں سے "غم" کا چناؤ بھی گہری فکر کا حامل ہے۔ قلی قطب شاہ جیسا انسان دوست بادشاہ اسی قدر کا انتخاب کر سکتا تھا کیوں کہ یہی قدر ایک ایسی آفاقی قدر ہے جس میں دوسرے سارے اعلیٰ اقدار کی تجلیاں جمع ہو گئی ہیں۔ قلی قطب شاہ جتنا وسیع النظر تھا اتنا ہی باریک بیں بھی تھا۔ اس نے اس قدر کا انتخاب کر کے اپنی بلند نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔

قلی قطب شاہ کی انتہائی آرزو یہی تھی کہ وہ اپنی رعایا کے درمیان انسانی رشتوں کو مستحکم کرے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ غم کربلا کو عام کر کے ہی اپنے مقصد کو حاصل کر سکتا ہے اور اسی غم کی مدد سے عوام کی فکر کی صحیح خطوط پر تربیت کر کے اس کو صحت مند اور توانا بنا سکتا ہے نیز ایک پاکیزہ تہذیب کی مستحکم بنیادوں پر داغ بیل ڈال کر اس کو طویل عمر عطا کر سکتا ہے۔ چناں چہ یہ رسوم آج بھی دکنی تہذیب کی شناخت بنے ہوئے ہیں۔ دکنی تہذیب، قطب شاہی تہذیب کا دوسرا نام ہے اس کے آثار کو برقرار رکھنے میں آصف جاہی سلاطین بھی قطب شاہوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں ان سلاطین نے دکنی تہذیب کو قبول کیا اور اس کو آگے بڑھایا۔

محرم کا چاند نظر آتے ہی سارا شہر سیاہ پوش ہو جاتا تھا۔ عشرہ اول کے اختتام تک عیش و عشرت کی ساری سرگرمیاں سرکاری سطح پر بند کر دی جاتی تھیں۔ ہر طرف تعزیہ داری ہوتی تھی۔ گھر گھر مجلسیں ہوتیں جن میں واقعات کربلا تفصیل سے سنائے جاتے تھے۔ عاشور خانوں میں علم ایستادہ کیے جاتے۔ اس دور میں کیا شیعہ کیا سنی کیا ہندو سب ہی علم بٹھاتے تھے۔ یہ بات آج بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ آج بھی کئی عاشور خانے موجود ہیں جن کے متولی سنت الجماعت اور ہندو ہیں۔

عاشور خانوں کی بڑی لمبی فہرست ہندو اوقاف میں ہے۔ مختلف رسومات محرم چاند رات ہی سے شروع ہو جاتی ہیں۔ خاص طور پر شیعہ خواتین زیور اتار دیتیں۔ یہاں تک کہ اپنے سہاگ کی علامت چوڑیاں اور کالی پوت کا لچھا بھی اتار دیتیں۔ محرم کے علاوہ سال کے دوسرے مہینوں میں ان کا اتارنا بد شگونی سمجھا جاتا ہے۔ عام مسلم خواتین بھی محرم کے زمانے میں زرق برق لباس نہیں پہنتی تھیں۔ اس موسم عزا میں شادی بیاہ یا دوسری خوشی کی تقریبیں منعقد نہیں ہوتی تھیں۔ محرم میں "چاند چھپائی" کی ایک خاص رسم تھی جو مسلم گھرانوں میں عام تھی۔ شادی کے پہلے سال محرم آتا تو دلہن سسرال سے اپنے میکے چلی جاتی اور ۱۲ / محرم یعنی شہدائے کربلا کی زیارت تک اپنے دولھا سے نہیں ملتی تھی۔ یہ رسم شیعہ گھرانوں میں آج بھی موجود ہے۔ چوں کہ واقعات کربلا غم واندوہ سے مملو ہیں اس لیے ہر رسم میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس غم کو یاد رکھا جائے تاکہ قلب کا گداز شدید سے شدید تر ہو جو انسانیت کی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔

لنگر محرم کی پانچ تاریخ کو حیدرآباد میں لنگر کی رسم ادا ہوتی تھی۔ یہ رسم قطب شاہی عہد کے ایک تاریخی وقوع کی یادگار ہے۔ آصف جاہی دور میں لنگر کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ محفوظ علی نے اپنے مضمون "حیدرآباد کا لنگر" میں اس کی پوری تفصیل دی ہے۔ عوام و خواص بھی اس رسم کو ادا کرتے تھے۔ اب سرکاری لنگر ختم ہو گیا ہے۔ بعض گھروں میں اب بھی یہ رسم ادا ہوتی ہے۔

دھمیل کرجا شیعوں میں دھمیل کرنے کی ایک رسم ادا کی جاتی تھی۔ آج بھی یہ ادا کی جاتی ہے۔ حضرت عباسؑ جو کربلا میں امام حسینؑ کے

سلر کے علم دار تھے اور جو امام علیہ السلام کے بھائی تھے ان کی یادگار میں بزرگ خاندان گھر کے ہر فرد کو ان کی ضمانت میں دیتا ہے بلکہ ان کے سپرد کر دیتا ہے اس عمل کو "دخیل کرنا" کہتے ہیں اور یہ رسم دخیل کرنے کی رسم کہلاتی ہے۔

فقیری ۷/ محرم حیدرآباد کی عزاداری کا خاص دن ہے۔ اس دن فقیری کے مراسم انجام دیئے جاتے ہیں۔ یہ رسوم بھی بلا لحاظ مذہب و ملت ادا کیے جاتے ہیں۔ آج سے چند برس پہلے تک یہ مراسم بڑی عقیدت سے ادا کیے جاتے تھے لیکن اب وہ شدت باقی نہیں رہی ہے۔ اس دن حیدرآبادیوں کی کثیر تعداد جن میں لڑکے، لڑکیاں، بچے، جوان سب امام حسین کے فقیر بنتے تھے۔ اس رسم کی ادائی کا طریقہ یہ تھا کہ ایک سبز کپڑے میں کچھ نقل اور "اجالے" کی اٹھنی رکھ کر اس کی "چھوٹی پوٹلی" بنالی جاتی۔ اسے آنٹی (سبز یا سرخ) باندھ کر جھولی کی شکل دی جاتی۔ اس کو فقیر بننے والوں کے گلے میں ڈال دیا جاتا۔ فقیر کو اس دن سبز کپڑے پہنائے جاتے۔ سرپرست فقیر کرنے کے لیے بچوں کو کسی عاشور خانے میں لے جاتے! علموں کے سامنے امام مظلوم کی فاتحہ ہوتی اس کے بعد یہ جھولی بچے یا بچی کے گلے میں ڈال دی جاتی۔ "فقیر کرنے" کا مطلب یہ ہوتا کہ سرپرست نے اپنے بچے کو امام مظلوم کے حوالے کر دیا اور ان کے آستانے کا فقیر بنا دیا ہے اب اس فقیر کو جو مانگنا ہو وہ امام علیہ السلام سے مانگے۔ سارے شہر میں ۷/ محرم کو حضرت قاسم کے علم اٹھائے جاتے ہیں۔

سبیلیں عشرہ اول میں جگہ جگہ لگائے ہوئے عارضی آبدار خانوں کو "سبیل نذر حسینؑ" کہا جاتا ہے۔ عوام میں سبیل مشہور ہے۔ یہ سبیلیں کربلا کے پیاسوں کی یاد میں لگائی جاتی ہیں۔ سبیلوں کا بڑا اہتمام ہوتا ہے۔ کورے گھڑوں میں پانی بھر کر سلیقے سے تختوں میں جمایا جاتا ہے۔ مٹی کی کلیاں رکھ دی جاتی ہیں۔ گرما کے موسم میں برف کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ عوام و خواص یہاں پیاس بجھاتے ہیں۔ سبیل کا اہتمام کرنے والوں میں ہر فرقے اور مذہب کے لوگ ہوتے ہیں۔ سبیلیں بھی کربلا کے مظلوموں کی پیاس کی شدت کو یاد دلاتی ہیں۔ یہ سبیلیں ہر انسان میں مظلوم سے ہمدردی اور ظالم سے نفرت پیدا کرتی ہیں۔ یہی بات سارے قطب شاہ چاہتے تھے۔

شربت کھچڑی یہ رسم بھی ساتویں محرم کو ادا کی جاتی ہے۔ اس پر شہدائے کربلا کی فاتحہ ہوتی ہے۔ یہ شربت کھچڑی بھی مظلومان کربلا کی بھوک اور پیاس کی یاد دلاتے ہیں۔ حیدرآباد میں ۷/ محرم کو شربت کھچڑی کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ اس رسم کو سنی شیعہ یکساں طور پر ادا کرتے تھے۔ شربت کھچڑی دراصل تبرک ہوتا۔ اس تبرک کے حصے گھر گھر بھیجے جاتے تھے۔ ۷/ محرم کو جگہ جگہ رنگ برنگی ٹھلیاں فروخت کے لیے رکھی رہتیں۔

حصہ بھیجنے کا طریقہ خوان میں ایک بڑی رکابی کھچڑی یا قبولی ہوتی اس کے قریب دو ٹھلیاں ہوتیں۔ ان میں سے ایک میں دودھ کا شربت اور دوسری میں پانی کا شربت ہوتا۔ ہر ٹھلیا پر ایک سینک ہوتی جس پر چھوٹی سی کلیا رکھی جاتی۔ ٹھلیا کے منہ کو سبز یا سرخ کپڑے سے ڈھانک کر باندھ دیا جاتا۔ اس دن سڑکوں پر بے حساب حصے جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اس دن حضرت قاسم سے منسوب علم اٹھائے جاتے ہیں۔ شیعہ گھرانوں میں مہندی کی ایک رسم ادا ہوتی۔ کربلا کے واقعات میں ایک واقعہ یہ بھی ملتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے اپنی شہزادی جناب کبریٰ کا عقد اپنے بڑے بھائی امام حسن علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت قاسم سے کیا تھا۔ یہ عمل بڑے بھائی کی وصیت کی تعمیل تھا۔ چوں کہ شادی میں مہندی کی رسم ہوتی ہے۔ یہ اسی شادی کی یادگار رسم ہے۔ مہندی اٹھاتے وقت بڑے پرسوز نوحے پڑھے

جاتے جن کو سن کر ہر آنکھ پر نم ہو جاتی ہے۔

سقا بنانا یہ بھی ایک رسم ہے۔ کربلا میں امام حسینؓ کے بھائی حضرت عباسؓ علم دار لشکر تھے۔ تین دن کی بھوک اور پیاس میں بچے بے چین ہو نا دیکھا نہ گیا۔ آپ کی چہیتی بھتیجی شہزادی سکینہ بنت الحسینؓ نے آپ سے پانی لانے کی خواہش کی۔ حضرت عباس دریائے فرات سے پانی لے کر جب لوٹ رہے تھے حرملہ کے تیر سے مشک چھد گئی پانی بہہ گیا اور آپ شہید کر دیے گئے۔ اس وقت سے آپ کا لقب سقائے اور سقائے حرم ہو گیا۔ سقا بنانے کی رسم اسی واقعہ کی یادگار ہے۔ یہ رسم ۸ / محرم کو ادا ہوتی ہے۔ اس دن ہر سن و سال کے لوگ سقا دودھ اور پانی پانی کے شربت لوگوں کو پلاتے ہیں۔ یہ رسم بھی قومی یک جہتی کو عام کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔

۹ / محرم کو ساتویں محرم کی طرح شربت کھچڑی پر شہداء کربلا کی فاتحہ ہوتی ہے۔ بڑے گھرانوں میں کھچڑی کی جگہ "قبولی" پکائی جا اس روز اور شب عاشور رات دیر گئے تک صاحبان خیر ایک طرح کے لنگر کا انتظام کرتے ہیں۔ مختلف مقاموں پر غریبوں کو کھانا کھلا ہے۔ خواص بھی تبرک کے طور پر اس لنگر کو چکھتے ہیں۔ شب عاشور شہر کے تمام عاشور خانوں کے علم اٹھائے جاتے ہیں اور علم کی سوا قدیم روایات کے مطابق گشت کرکے اپنے اپنے الاؤں کو واپس ہوتے ہیں۔

۱۰ / محرم کو روز عاشورہ کہا جاتا ہے۔ اسی دن امام حسین علیہ السلام اور ان کے سب انصار شہید کر دیے گئے تھے۔ اس دن عالم بلا لحاظ فرقہ یوم غم مناتا ہے۔ شیعہ فرقہ اس دن سر و پا برہنہ رہتا ہے۔ سارا دن نوحہ و بکا میں گذرتا ہے۔ یہ رسم بہت قدیم بھی ہے اور عا ہے۔

فاقہ شکنی جس طرح میت کے گھر میں دفن کے بعد حاضری آتی اور میت کے شرکا اسے کھاتے ہیں اسی طرح دسویں محرم کو عصر کے بعد فاقہ شکنی کا انتظام ہوتا ہے۔ شیعہ فرقہ اس دن صبح سے مغرب کے وقت تک فاقہ کرتا ہے۔ فاقہ شکنی کا انتظام مختلف مقامات ہے۔ دسترخوان پر کہیں ثابت مونگ کی دال کے ساتھ خشکہ ہوتا ہے اور کہیں ثابت مونگ کی کھچڑی اور کھٹا ہوتا ہے۔ بعض جگہ چپاتی مونگ کی دال، مولی ہری پیاز اور پنیر سے فاقہ شکنی کا دسترخوان چنا جاتا ہے۔ لوگ ان مقامات میں سے کہیں بھی فاقہ توڑ کر اپنے گھر جاتے ہیں۔

چراغاں میت کے گھر میں جہاں میت تھی وہاں چراغ روشن کرتے ہیں۔ شب یازدہم "شام غریباں" کی مجلس کے بعد بعض میں گیہوں کے آٹے کے چراغ روشن کیے جاتے ہیں۔ یہ چراغ رات بھر روشن رہتے ہیں ۱۱ / محرم کی صبح کو چراغوں کے آٹے کی روٹیاں جاتی ہیں اور ان کے ساتھ کوئی ایک سالن ہوتا ہے۔ عام طور پر اس آٹے کی روغنی روٹیاں بنائی جاتی ہیں۔

۱۲ / محرم کو شہداکی زیارت کی فاتحہ ہوتی ہے۔ فاتحہ میں جس طرح عام گھروں میں سوگ بڑھانے کا اہتمام ہوتا ہے وہی اہتمام ۱۲ میں بھی ہوتا ہے یہاں تک کہ فاتحہ میں پان چھالیہ وغیرہ بھی رکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد سہاگنیں چاند رات کو اتاری ہوئی سہاگ کی چوڑ اور چوڑیاں دامن لیتی ہیں۔ نئی دلہن جو "چاند چھپائی" کے لیے اپنے میکے آئی تھیں اپنی سسرال چلی جاتی ہیں۔

ان مذکورہ رسوم کے علاوہ بے شمار خاندانی منتیں بھی رسوم کی طرح ادا کی جاتی ہیں جیسے روٹ بنانا، طوق بیڑی پہننا، شیر بننا،

سامنے مشعل جلانا، ان پر سختی سے عمل ہوتا ہے۔ خدانہ خواستہ کوئی رسم ترک ہوجانے تو اس سے خراب شگون لیا جاتا ہے۔

ان رسموں کی ادائیگی کا ایک معاشی پہلو بھی ہے۔ ان رسموں کے رائج کرنے والے سماج کاری بادشاہوں نے سماجی معشیت کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان رسموں کی ادائیگی میں استعمال ہونے والی اشیا کی تجارت اس حد تک ہوتی تھی کہ تاجر و صناع تقریباً ایک سال کا روزگار فراہم کرلیتے تھے۔ راقم الحروف نے سک مک کے ایک ضعیف العمر بیوپاری سے بادشاہی عاشور خانے میں ملاقات کی۔ یہ بیوپاری کوئی پچاس ساٹھ سال سے عشرہ اول میں اس عاشور خانے میں سک مک فروخت کرتے آرہے ہیں۔ انھوں نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اب تو یہ بیوپار تقریباً ختم ہوگیا ہے۔ لیکن ہم ان دنوں میں سک مک بیچ کر آٹھ نو مہینوں کا گھر کا خرچ نکال لیا کرتے تھے۔ دھنیوں، جھاڑوں، عود لوبان، موم بتیوں کی صنعت اور تجارت کے علاوہ لال شکر، کھوپرے کی بنیاں (گود بھرجانے کے لیے یہ بنیاں کثرت سے آج بھی فروخت ہوتی ہیں) پھول وغیرہ کی گرم بازاری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح کالا اور سبز کپڑا کثرت سے فروخت ہوتا تھا یہ عود تو صرف عاشورے کے دن ہزاروں روپے کا فروخت ہوتا تھا۔ ایک طبقے کے لوگ مستقل طور پر "کوڑی والا عود" پکارتے ہوئے عود دان لے کر نکلتے ہیں اور بلالحاظ مذہب و ملت و فرقہ عوام شہدائے کربلا کے نام پر عود جلاتے ہیں۔ ان دس دنوں میں ہزاروں کو ایسا روزگار مہیا ہوجاتا ہے جس سے وہ سال کے بڑے حصے کا خرچ آسانی سے نکال لیتے ہیں۔ محرم کی تمام رسموں میں اہم ترین رسم مجلس برپا کرنا ہے۔ یہ رسم محرم کی سب سے نمایاں شناخت کا فرض انجام دیتی ہے۔ شہدائے کربلا کے ذکر کا اہتمام جہاں ہوتا ہے اس کے لیے مجلس کی اصطلاح مخصوص ہے۔ اس پر زیادہ گفتگو ضروری نہیں کیوں کہ اس عام اصطلاح سے عوام و خواص سب واقف ہیں۔

محرم کی ان رسموں میں اب بھی اپنے اندر زندگی کی اعلیٰ قدروں اور قومی یک جہتی کی روح موجود ہے۔ کیوں کہ ان کی بنیاد میں کوئی سیاسی نظریہ نہیں ہے بلکہ خالص انسانی محبت ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے بیدار دماغ نے ان رسموں کو عام کرنے میں جو بنیادی بات رکھی ہے وہ یہ ہے کہ ان رسموں میں کسی عقیدے یا مذہب سے تصادم نہیں بلکہ اس کی اصل انسانیت ہے۔ انسانیت کا فطری تقاضا یہی ہوتا ہے کہ مظلوم کو سینے سے لگالو اور ظالم کو حقارت سے دور کردو۔ محمد قلی کا منصوبہ یہی تھا کہ بہتر سماج کی تشکیل کے لیے اس غم سے استفادہ کیا جائے۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ اس کی رعایا اپنے عقیدوں پر قائم رہتے ہوئے امام حسین علیہ السلام کی عظیم قربانی سے انسانیت کی حفاظت کا درس حاصل کرے اور اس غم سے قریب ہو کر ہر فرد محبت کی مسبود دوری میں تجی ہوجائے تاکہ سارے قطب دیس کے رہنے والے باہم شیر و شکر ہوکر سکون کی زندگی بسر کریں۔

محمد قلی قطب شاہ کی رائج کردہ ان رسموں کو آصف جاہوں نے نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انھیں اور مستحکم کیا۔ آصف جاہوں نے قطب شاہوں کے فکر و مزاج کو سمجھ لیا تھا۔ قطب شاہی کلچر میں جو انسان دوستی کی مہک ہے اس کو محسوس کرلیا۔ قطب شاہوں کے طرز حکومت کو اچھی طرح پہچان لیا۔ وہ جانتے تھے اچھا بادشاہ وہی ہے جس کے سائے میں رعایا آسودہ رہے۔ قطب شاہی حکومت کی واضح علامت یہی تھی کہ رعایا آسودہ تھی۔ ہر شخص آرام سے پیٹ بھر کھاتا اور چین کی نیند سوتا تھا۔ آصف جاہوں نے بھی اسی راستے کو بہتر سمجھا۔ ہر دور میں سماجی سطح پر ہر حیدرآبادی سکون کی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔

(باقی ص ۲۵ پر)

انوپما نگم
ترجمہ۔ ڈاکٹر بیگ احساس

حیدرآباد کی بیدری مصنوعات

بیدری کام کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی شروعات کب اور کیسے ہوئی۔ زبانی روایتوں پر یقین رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ فن بہمنی سلطنت میں ایران سے آیا۔ یہ باور کیا جاتا ہے کہ عراق، اجمیر اور بیجاپور کی راہ سے پندرھویں صدی میں یہ فن بیدر پہنچا۔ بیدری کام اور مصنوعات کا نام شہر بیدر پر رکھا گیا۔ بیدر کو بہمنی خاندان کے بادشاہ احمد شاہ (۱۴۳۶ - ۵۷ء) نے دارالسلطنت بنایا تھا۔

کسی ادبی یا آثار قدیمہ کی تائیدی روایت سے یہ ثبوت نہیں ملتا کہ یہ فن مشرق وسطی سے ہندستان آیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندستان کے علاوہ کسی اور ملک میں اس فن کو برتا ہی نہیں جاتا۔ یہ کام آج بھی صرف ہندستان میں ہوتا ہے۔ اس بات کا حوالہ بھی کہیں نہیں ملتا کہ مختلف عجائب خانوں میں بکھری ہوئی اور خانگی طور جمع کی گئی بیدری اشیا سترھویں صدی یا اس کے بعد کے دور کی ہیں۔

ہندستانی تاریخ پر مبنی فارسی رسالے "چہار گلشن" میں یہ پہلا تحریری حوالہ ملتا ہے کہ بیدری کام کا اصل مرکز شہر بیدر ہے۔ یہ رسالہ چھترمن کانتھ نے ۱۷۵۹ء میں مرتب کیا تھا۔ جادو ناتھ سرکار کے بیان کے مطابق چہار گلشن میں شائع شدہ اس حوالے کا ماخذ ۱۷۲۰ء کی ایک مدونہ کتاب ہے جو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ بیدری کام کے سلسلے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں اس کی بناوٹ سے بھی اس کے دور کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس لیے اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ جگدیش اور کملا متل میوزیم حیدرآباد کی نوادرات میں حقے کا ایک نچلا حصہ ہے جو ممکن ہے ۱۶۳۴ - ۳۵ء کا ہو۔ اس پر جو عبارت کندہ ہے وہ اس طرح ہے "ربیع ۱۰۴۴ھ م/ ۱۶۳۵ء کو نجف قلی نے یہ کام مکمل کیا۔" آج تک کی دریافت کا یہ سب سے قدیم نمونہ ہے۔ سالار جنگ میوزیم میں ایک بڑی پلیٹ ہے جس پر کوئی عبارت کندہ نہیں لیکن اس کی ساخت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بہمنی عہد کے ابتدائی دور کی ہوگی۔ پلیٹ کے اندرونی حصے پر چاندی کی لکیریں بنی ہوئی ہیں۔ لہروں جیسی ان لکیروں میں آبی مخلوق جیسے کچھوا، مچھلی اور مگرمچھ نقش ہیں۔ اس طرح کے نمونے چھٹی صدی عیسوی کی خمسہ مصوری میں پائے جاتے تھے۔

بیدری کام دھات کی اشیا بنانے کا باکمال فن ہے۔ یہ عہد وسطی کے ہندستان کی ایک انوکھی ایجاد ہے۔ یہ ہندستان کی ہمہ جہتی دھاتی دست کاری کو دکن کی سب سے بڑی دین ہے۔

بیدری کام اپنے نقش، بدیسی پر کشش انداز، چاندی کی چمک، سیاہ پس منظر اور سیاہ پس منظر میں روپہلی تزئین کے تضاد کی وجہ سے نہ صرف جمالیاتی ذوق کو تسکین پہنچاتے ہیں بلکہ اسے ہندستانی فنون میں انفرادیت بخشتے ہیں۔

بیدری کام بیدر کے علاوہ لکھنو (یو۔پی) مرشد آباد (مغربی بنگال) پورنیہ (بہار) میں بھی کیا جاتا ہے۔ آصف جاہی دور میں یہ کام بیدر سے حیدرآباد پہنچا اور اب حیدرآباد میں بھی یہ صنعت قائم ہو گئی ہے۔

بیدری کام میں تانبے اور جست کی بیچ دھات کا تناسب (۱:۱۶) پایا جاتا ہے۔ یہ تناسب مختلف صورتوں میں زمانے اور مقام کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

اس کام میں استعمال ہونے والی دوسری اشیا کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ سرخ مٹی
۲۔ رال (گوند یا چکنائی)
۳۔ ارنڈی کا تیل
۴۔ سنگ زیرہ
۵۔ کوئلہ
۶۔ موم (شہد کی مکھی کا)
۷۔ کاپر سلفیٹ
۸۔ چاندی
۹۔ سونا
۱۰۔ ریگ مال (کاغذ)
۱۱۔ پرانے قلعے کی نمک زدہ مٹی
۱۲۔ جست
۱۳۔ سال ایمونیا
۱۴۔ ٹین
۱۵۔ مٹی کا تیل
۱۶۔ لکڑی کا کوئلہ

اوزار اور سامان: بیدری کام کے لیے بے حد سادہ اوزار استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک لیتھ مشین کو چھوڑ کر سارے اوزار ہاتھ سے استعمال کیے جاتے ہیں اس کے لیے بجلی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اوزار وہی ہیں جو پیتل کے زیورات بنانے والے، نقاش، جڑاؤ کام کرنے والے، سنار اور چاندی کا کام کرنے والے استعمال کرتے ہیں۔ اوزار کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ سوہن گول اور مسطح (مسطح کرنے والا اوزار) (Files Round and Flat)
۲۔ دستی برما (سوراخ کرنے والا)
۳۔ دھاتی ٹکڑے (Scrappers)
۴۔ ہتوڑا
۵۔ پھونکنی
۶۔ ہتوڑی
۷۔ چھوٹے اوزار
۸۔ پسوائی مشین / چکی (Grinder)
۹۔ آرا
۱۰۔ قینچی
۱۱۔ برش
۱۲۔ چھینی

اس صدی کی ابتدا تک بیدری سامان روایتی طریقے پر موم کے سانچوں (Lost wax Process) میں ڈھالا جاتا تھا لیکن پھر مٹی کے سانچے استعمال کیے جانے لگے۔ یہ سانچے سستے بھی ہوتے ہیں، کام تیزی سے ہوتا ہے اور محنت بھی کم لگتی ہے۔ بیدری کام کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے سیاہ پس منظر کی وجہ سے سب سے منفرد اور الگ لگتا ہے۔ بیدری اشیا کو دو مختلف مراحل میں سیاہ تاب دیا جاتا ہے۔ ابتدائی مرحلے پر اسے کاپر سلفیٹ کے محلول سے سیاہ کیا جاتا ہے تاکہ فن کار اپنے مطلوبہ ڈیزائین کندہ کر سکیں یہ سیاہ پن عارضی ہوتا ہے۔ مستقل سیاہ تاب اس وقت دیا جاتا ہے جب مطلوبہ ڈیزائین میں تار یا دھاتی پتر بھر دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس پر مٹی

کا لیپ کیا جاتا ہے۔ یہ مٹی بیدر کے قلعے کی دیواروں کی بنیاد سے کھود کر جمع کی جاتی ہے۔ اس میں نمک Salt petere (KNO3) ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ الکلی نائٹریٹ (Alkali Nitrate) بھی ہوتا ہے۔ پھر اس میں بیدر کا پانی ملایا جاتا ہے جس میں Salt Ammonia امونیا کلورائڈ (NH4cl) ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ صرف بیدر کی مٹی میں ہی یہ خاصیت ہوتی ہے لیکن اب ثابت ہو چکا ہے کہ کسی بھی پرانے قلعے کی مٹی میں یہ تاثیر ہوتی ہے۔

بیدری اشیا کو چھ مقبول تکنیکی طریقوں سے سنوارا جاتا ہے:

۱۔ تار کشی

۲۔ تان نشان

۳۔ زرنشاں

۴۔ زر بلند (اوپری نقش کاری)

۵۔ آفتابی

۶۔ مہتابی (سیاہ پس منظر پر روپہلی کام)

مردم شماری کی رپورٹ نے ہماری توجہ ایک تزئین و آرائش کی تیکنک کی طرف مبذول کروائی ہے۔ اس کو "منبت کاری" کہتے ہیں۔ اس میں نقش و نگار ابھرا ہوا ہوتا ہے۔ زیر تیاری شئے پر پہلے جست کا لیپ چڑھایا جاتا ہے پھر ابھرے ہوئے نقوش پر چاندی تار کشی کی جاتی ہے۔ چاندی کی تار کشی یا تان نشان کے طریقے پر چڑھائی جاتی ہے۔ اس کام کے لیے مہارت اور نفاست کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر خرچ بھی بہت آتا ہے اس لیے منبت کاری کے نمونے کم ہی ملتے ہیں۔

بیدری کام کرنے والوں سب سے پسندیدہ ڈیزائین پھولوں کے مختلف نقش اور جیومٹری کی شکلیں ہیں جسے انھوں نے ایران اور وسط ایشیا کے آرٹ سے براست متاثر ہو کر اختیار کیا۔ کبھی کبھار وہ جانور اور پرندوں کے نقش بھی بناتے ہیں کبھی خطاطی کے نمونے بنائے جاتے ہیں۔ ہندو دیو مالائی علامتیں بھی اس کام میں استعمال کی جاتی ہیں۔

پھول اور پتے فن کاروں کو بہت پسند ہیں۔ وہ انھیں کئی طریقوں سے بناتے ہیں۔ دیواروں، کپڑوں، دھاتوں، لکڑی، ہاتھی دانت پر یہ نقوش خوب صورت لگتے ہیں اور جمالیاتی ذوق کی سیرابی بھی کرتے ہیں۔ ان میں پھولوں کے ہار، بیلیں، پتے، پنکھڑیاں، کلیاں، پودے بیدری کام میں زیادہ تر استعمال ہوتے ہیں کبھی پتے اور پھولوں کے گچھے اور پھل بھی بنائے جاتے ہیں۔

سب سے پرانا اور خوب صورت نمونہ جو بیدری کام میں بہ کثرت استعمال ہوتا ہے وہ سرجارج واٹ کا خشخاش کا پودا ہے۔ اشرفی کی بوٹی اور تین پتی بوٹی بھی روایتی ڈیزائین ہیں۔ پھلجھڑی بھی قدیم ڈیزائین ہے۔ انگور کی بیل کبھی عمودی اور کبھی افقی سمتوں میں منقش کی جاتی ہے۔ عموماً دو متوازی خطوط میں اسے نقش کیا جاتا ہے۔ ایک خاص انداز کا کنول اور گلاب بھی بنائے جاتے ہیں۔ جیومٹری ڈیزائینوں بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اسلام میں انسانی شکل و صورت بنانا ممنوع ہے اور بیدری اشیا زیادہ تر مسلمانوں میں مقبول ہیں اس لیے

(باقی ص ۲۵ پر)

سمترا پارتھا سارتھی
ترجمہ: اسامہ فاروقی

آندھرا میں رقص کی اشکال

آنگکی کم بھونم بسیہ
واچکم سر وا وانگ ے ہم
اہاریم چندرا تردی
تم وندے ست و کم شیوم۔
(نندی کیشورا کا ابھی نے درپن)

"میں فیض رساں شیو دیوتا کی پرستش کرتا ہوں جس کی جنبش دست و پا کائنات کی جنبش ہے۔ جس کی گویائی ساری دنیا کی ادبی ذخیرہ شیں ہیں اور جس کے اسباب آرائش چاند اور ستارے ہیں۔" "ابھی نے درپن" میں محولہ نندی کیشورا کا یہ اشلوک ہندوستانی رقص کی روح کا الفاظ میں نقشہ کھینچتا ہے۔ یہ مشتمل ہوتا ہے جنبش دست و پا پر، نغمہ یا اشعار ادب کی صورت گری کرتے ہیں، چاند اور ستارے رقاص یا رقاصہ کے اسباب آرائش ہیں اور طرز کے لحاظ سے یہ رقص "ستی وی کا" یا فیض رساں قسم کا ہوتا ہے۔

رقص ہندوستان کے قدیم ترین فنون میں سے ایک ہے۔ "رگ وید" میں طلوع صبح کی دیوی کو ایک رقاصہ کی مانند پوشاک پہنے ہوئے بتایا گیا ہے۔ "کوسی تاکی براہمنا" میں رقص، نغمے اور ساز کی موسیقی کا ذکر ہے۔ موہن جوداڑو کے آثار قدیمہ کی کھدائیوں کے دوران ایک برہنہ رقاصہ لڑکی کا کانسے کا مجسمہ برآمد ہوا تھا۔ بدھ مت والی جاتکا کہانیوں میں رقص سے متعلق بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ کوٹلیا کے ارتھ شاستر کے مطابق سماج میں ناچنے والوں کا رتبہ گانے والوں کے مقابلے میں اونچا نہیں تھا، لیکن بہرحال اس پیشے کو ایک باضابطہ حیثیت دی گئی تھی۔ واتسائن اپنی کتاب کام سوترا میں رقص کو چونسٹھ فنونِ لطیفہ میں سے ایک گردانتا ہے اور لکھتا ہے کہ ایک راج کماری یا عالی خاندان عہدے دار کی لڑکی جب تک ان چونسٹھ فنون لطیفہ کی مشق کرتی رہے گی اپنے شوہر کی منظور نظر رہے گی۔

اسی طرح سے وال میکی کی رامائن اور مہابھارت وغیرہ میں بھی رقص کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ پاننی کے اشٹ ادھیائے میں سلالی اور کری سوا کے مرتب کیے ہوئے ناٹیہ سوتروں کا ذکر ملتا ہے گو کہ بھرت کا نہیں ملتا۔ لیکن خود بھرت نے اپنی تصنیف کے اس باب میں جس میں خطوط پر گفتگو کی ہے پاننی کا حوالہ دیا ہے۔ کشمیر کے ابھی نے گپت آچاریہ نے، جن کا زمانہ حیات گیارھویں صدی عیسوی ہے، بھارت ناٹیہ شاستر کی شرح مرتب کی تھی۔

ناٹیہ شاستر ایک عظیم تصنیف ہے۔ جس میں ڈراما، موسیقی، جمالیات اور دیگر موضوعات پر چھتیس ابواب میں بحث کی گئی ہے۔ پہلے باب میں رقص کی ابتدا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اندرا نے خالق کائنات برہما سے چار قدیم ویدوں کے علاوہ مزید ایک وید تصنیف کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ لوگ جن کو چار ویدوں کے مطالعے کی ممانعت تھی اس کا مطالعہ کر سکیں۔ اس طرح سے پانچواں وید مقدس جسے

لوگ ناٹیہ وید کے نام سے جانتے ہیں معرض وجود میں آیا اور بھرت کو انسانوں کے درمیان اس فن کو رواج دینے اور اندر ادھوج کے جشن کے موقعے پر رقص کا پہلا پروگرام منعقد کرنے کا کام سونپا گیا۔ جب بھرت کی نگرانی میں پروگرام شروع ہوا تو آسوروں کی کرنی سے سبھی ناچنے والوں کی قوت گویائی سلب ہو گئی اور وہ بے حرکت ہو گئے۔ تب اندرا نے مداخلت کی اور اس نے دھوج (جھنڈے) کو ان پر پھینک کر آسوروں پر فتح پائی۔ اسی لیے اسٹیج پر ادا کی جانے والی ابتدائی رسوم کو جرجرایا اندر دھوج کہتے ہیں۔

برہما رقص کی اہمیت کی توضیح ان الفاظ میں کرتے ہیں: رقص کے لیے ضروری ہے کہ دیوتاؤں اور دیووں دونوں کے امتیازی عناصر کا آئینہ دار ہو۔ اسے ترلوک یعنی تینوں جہانوں کی روح کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ اسے یوں پیش کرنا چاہیے جیسے وہ دنیا کی حرکات کا اتباع کر رہا ہو" چاہے وہ کام میں ہو یا کھیل میں، منافع، امن، خواہش نفسانی میں ہو یا کشت و خون میں، اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرنے والوں کو ان کی راست بازی کا پھل ملتے ہوئے دکھانا چاہیے تو یہ بھی دکھانا چاہیے کہ خواہشاتِ نفسانی کا راستہ اپنانے والے کس طرح عیش پرستی میں لگے ہوئے ہیں، اسے قاعدے قانون کا احترام نہ کرنے والوں کے لیے روک اور بندش کا کام دینا چاہیے تو قاعدہ قانون کی پابندی کرنے والوں کے لیے ذہنی اور اخلاقی تربیت کا، بے بس میں دم خم پیدا کرنا چاہیے تو سپاہیوں میں حوصلہ۔ جاہل کو دانش مندی عطا کرنی چاہیے تو اہل علم کو معلومات، بادشاہوں کے لیے تفریح فراہم کرنی چاہیے تو غم زدوں کو تحمل، اپنے مفاد کے طلب گاروں کو منافع مہیا کرنا چاہیے تو ہمت ہار جانے والوں کی ہمت بڑھانی چاہیے۔ اسے مزاج کی گوناگوں کیفیتوں سے معمور ہونا چاہیے اور روح کے متنوع جذبات کا آئینہ دار۔ اس کا ساری نسل انسان کے اعمال سے ربط ہونا چاہیے، تاکہ لوگ اس سے عمدہ مشورہ حاصل کر سکیں، یہ ان کے لیے تفریح کا سامان، بہبود کا وسیلہ غرض کہ سبھی کچھ ہے۔"

ناٹیہ شاستر کا مصنف بھرت آگے یوں رقم طراز ہے: "کوئی ایسی دانش مندی، فن، ہنر، تدبیر یا حرکت ایسی نہیں ہے جو ناٹیہ (رقص) میں نہ پائی جاتی ہو۔"

بھرت کے مطابق نرتّا قدیم ترین فن ہے جس کی شروعات شیو مہاراج سے ہوتی ہے جب کہ ناٹیہ برہما کی تخلیق ہے۔ برہما کے خلق کیے ہوئے اور بھارت کے رواج دیے ہوئے ناٹیہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد شیو مہاراج نے نرتّا اور ناٹیہ کو یکجا کرنے اور ناٹیہ کے جزو "ابھی نے" کو نرتّا میں شامل کرنے کا ارادہ کیا، تاکہ ساتھ میں گائے جانے والے نغمے کی معنی خیزی میں اضافہ ہو۔ چناں چہ رشی تانڈو نے رشی بھرت کو نرتّا کی تعلیم دی۔ ناٹیہ اور نرتّا کی آمیزش سے ایک نئی قسم کا فن معرض وجود میں آیا جو نرتیہ کے نام سے معروف ہے۔

رقص کی دیسی اشکال جن کی قدیم تصانیف میں وضاحت کی گئی ہے حسب ذیل ہیں:

دکن میں رقص کا ارتقا مختلف اشکال میں ہوا تھا۔ اجمالی طور سے اس کی درجہ بندی کلاسیکل اور غیر کلاسیکل میں کی جا سکتی ہے۔ فنِ رقص کی زبان میں اس تقسیم کو مارگی اور دیسی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ غیر کلاسیکل کا مطلب یہ نہیں کہ رقص باقاعدہ یا روایتی طرز میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ شکل ہے جس کا ارتقا بھرت یا نندی کیشورا کی مجوزہ اشکال سے جداگانہ نہج پر ہوا ہے۔

رقص کی مارگی شکل کا انحصار بھاؤ پر ہوتا ہے اور اس کو رشیوں نے بڑی جاں فشانی سے ترتیب دیا ہے اور اوشا اور بانا جیسی عظیم الشان ہستیوں نے رواج دیا ہے۔

دیسی رقص کی وہ قسم ہے جو بے لوچ قاعدوں کی بندش سے آزاد تھی لزوم تھا تو بس نغمے اور آلاتِ موسیقی کے سُروں کی ترتیب کے ساتھ ہم آہنگی کا۔

کاکتیہ راجاؤں کے سپہ سالار جیاپا نے رقص کے بارے میں اپنے رسالے میں غیر کلاسیکل رقص کی مختلف اشکال کا ذکر کیا ہے مثلاً گوندلی، پرے رینی، پرین کھنا، راسکا، چرچری، ناٹیہ راسکا، ڈنڈا راسکا، کنڈوکا، بھنڈیکا، چارنا، بہورو پا اور کولاتا وغیرہ۔

گوندلی غالباً ایک قبائلی ناچ ہے جو "پاتری" کے موقع پر ناچا جاتا تھا۔ عقیدہ یہ تھا کہ اس رقص کے نتیجے میں بارش بر وقت اور کافی مقدار میں ہوگی اور نتیجتہً فصل بہ افراط ہوگی۔ ایسا لگتا ہے کہ چالوکیہ راجہ سومیشور نے اس رقص کا اس وقت مشاہدہ کیا جب بھیل قبیلے کی ایک خوب صورت لڑکی یہ ناچ ناچ رہی تھی اور اس طرح سے رقص کی اس شکل کی ایجاد چالوکیہ سومیشور سے منسوب ہوئی۔

"پرے رینی" پانچ قدموں پر مشتمل ہوتا ہے اور غالباً سپاہیوں میں شجاعت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ناچا جاتا تھا۔

راسکا ناچ میں سولہ، بارہ یا آٹھ نائکائیں یا گوپیاں ہوتی تھیں جو کرشن مہاراج کے گرد حلقہ بنا کر ناچتی تھیں۔

شیو پریا ناچ شیو مہاراج کی ستائش میں ناچا جاتا ہے۔

کوڈوکا، رقص کی نہایت ہردل عزیز اشکال میں سے ایک ہے جسے خواتین سونے، چاندی اور کانسے کی گگریوں کے ساتھ ناچتی تھیں۔ بعض اوقات ان گگریوں کے اندر لوہے کی گگریاں ہوتی تھیں نتیجتہ ان میں سے جھنجھنوں جیسی آواز نکلتی تھی۔

بھاودیکا ناچ جانوروں اور چڑیوں کی آوازیں نکالتے ہوئے مسخرے ناچتے تھے۔

دیسی طرز کا ایک اور عام پسند ناچ کولاتا تھا۔ اس میں لڑکیاں چھوٹی چھوٹی ڈنڈیاں تھامے رہتی تھیں۔ اس کی صورت گری اکثر مختلف ادوار کے مندروں میں پائی جانے والی مورتوں میں کی گئی ہے۔ مختصراً یہ رقص کی عوامی یا دیسی اشکال ہیں۔

مہابھارت کے ویرتا پروا میں، جس کا تلگو میں ترجمہ عظیم شاعر تکنا نے کیا ہے، ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس میں ارجن ان الفاظ میں راجہ ویرتا سے اپنا تعارف کرواتے ہیں۔

> "کوئی اور اہم کام میرے ذمے نہ ہونے کی وجہ سے بچپن ہی سے میں ڈنڈالاسکا گنڈالینی اور پریک کنا پے راجو ناچنے کی مشق کرتا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے مختلف آلاتِ موسیقی کو خوش آہنگی کے ساتھ ان کا سُر ملا کر بجانا اور طرح طرح کے گیت گانا بھی سیکھا ہے۔ میں مختلف رس اور ان کے لیے مخصوص بھاؤ بھی جانتا ہوں۔ جن خصوصیات اور عوامل کا اوپر ذکر ہوا ہے ان پر مشتمل ناچ پر بھی میں قدرت رکھتا ہوں۔"

اب ہم کلاسیکل رقص کے ارتقا پر روشنی ڈالیں گے۔ قدیم زمانے سے ہی ہندو مندر ہر طرح کے فنونِ لطیفہ کا مرکز رہا ہے۔ ان میں سے رقص کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ یہ بھگوان کی رضامندی حاصل کرنے میں معاون سولہ اپچاروں میں سے ایک ہے۔ مندر سے مخصوص رقص کے دو زمرے ہیں۔ ایک بھگوان کے لیے مخصوص ہے اور دوسرا عامتہ الناس کے لیے ہے۔ دونوں طرح کے ناچ دیوداسیاں ناچتی ہیں۔ صرف مندر کی دیوداسیوں کو بالی پیتھا پر ناچنے کا حق حاصل تھا۔ سبھا یا مندر کے کلیان منڈپ دیوداسیاں جو ناچ ناچتی ہیں "کے لیکا" کہلاتا ہے۔ بالعموم دیوداسیوں کا ناچ نتوامیلا طرز کا ہوتا ہے۔

عہدِ وسطیٰ میں مختلف سماجی عوامل کی وجہ سے ناچنے والوں کا مرتبہ ایک طبقے کی حیثیت سے پست ہو گیا۔ تب ناچنے والے تاج داروں، امیروں اور صاحبانِ اختیار کی خدمت بجالانے پر مجبور ہو گئے اور فن کا مقصد بس ان کی خوشنودی رہ گئی۔ چالوکیہ اور کاکتیہ ادوار میں کوشش کی گئی کہ اس فن میں نظم و ترتیب پیدا کی جائے اور اسے شاہی درباروں میں پیش کشی کے قابل بنایا جائے۔ اس صورتِ حال میں بعض برہمن فن رقص کے رتبے اور منصب کو اونچا اٹھانے کے لیے آگے بڑھے۔ سدھیندر یوگی جس کا زمانہ، حیات پی۔ ایس۔ آر۔ اپاراؤ کی تحقیق کے مطابق چودھویں صدی عیسوی ہے، اس اصلاحی تحریک کے رہ نماؤں میں سے ایک تھا۔ کُچی پُڈی کے برہمنوں نے دو طرح کے، یعنی سماجی اور اساطیری موضوعات چن لیے۔ یہ برہمن گاؤں گاؤں گشت لگاتے ہیں اور پگاتی ویشم یعنی دن کے وقت اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں، یا تو گھروں میں یا چوراستوں پر۔ دن کے وقت دکھائے جانے والے ان تماشوں میں شامل ڈراموں وغیرہ کی فہرست بہت طویل ہے اور ان کا ہدف بالعموم سماجی برائیاں ہوتی تھیں۔ ان تماشوں کی تیس سے زیادہ اقسام تھیں مثلاً بیراگی، پٹھان، فقیر، سومایاجولو یا سومی دیوی، برہمن ودھوا، معلّم، کومٹی وغیرہ۔ ان میں سے بعض تماشوں میں ہمیں بے بنیاد عقاید اور سماجی برائیوں پر کڑی تنقید ملتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کُچی پوڈی بھاگو دیومالائی موضوعات کا بھی احاطہ کرتے تھے جنھیں فوری مقبولیت حاصل ہوئی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ، بعض فرقوں کے خلاف سخت تنقید کی وجہ سے سماجی موضوعات کی مقبولیت میں کمی واقع ہوئی۔

اصلاحی تحریک کے رہ نما سدھیندر یوگی نے پہلے ایک ناچ ڈراما "پری جھاتپاہرنم" ترتیب دیا جسے بعد میں بھاما کلپم کے نام سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس موسیقی ریز ڈرامے کے اہم کردار کرشن مہاراج اور ان کی منظورِ نظر رانی ستیہ بھاما ہیں۔ کلپم کا مفہوم تلگو میں "مکالمہ" ہوتا ہے چناں چہ بھاما کلپم میں، ہم کو ستیہ بھاما اور ان کی داسی مادھوی کے مابین طویل مکالمے ملتے ہیں۔

بعد میں بھاگو اتلو نے کسی غنائی نظم کے اطراف گوناگوں سُروں سے مزین موسیقی ریز ڈرامے دکھانے شروع کیے، مثلاً شبدم، نارائن تیرتھلو واری ترنگم، پدم وغیرہ۔ پہلے یہ سبھی شبدم خدا کی حمد میں ہوتے تھے۔ لیکن جب راجاؤں اور زمین داروں نے ان فن کاروں کی سرپرستی شروع کی تو رقص کا موضوع بھی بدل گیا۔ اب ان میں سرپرستوں کا گُن گان شروع ہو گیا۔

گولا کلپم کو بھی بھاما کلپم کی طرح مقبولیت ملی ہے۔ اس میں ایک گوالن برہمنوں کی جہالت کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتی ہے اور پرانوں اور دیگر مقدس کتابوں کے مختلف متنوں (عبارتوں) کا مطلب سمجھاتی ہے۔ اس کلپم کا مقصد بعض روایت پسند برہمنوں کے مقابلے میں گوالوں کی لیاقت کو نمایاں کرنا ہے۔

اس طرح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سماج میں دیوداسیوں کو حاصل رتبے کے مقابلے میں رقص کی سماجی حیثیت کو بلند کرنے میں کُچی پُڈی بھاگو اتلوں کی خدمات اور ایک طرف تو اسے سماجی برائیوں کے سدِباب میں ایک ہتھیار کے طور سے استعمال کرنے اور دوسری طرف اسے بھگتی کے پرچار کے کام لانے کے لیے ان کی کوششیں غالباً اپنی جگہ بے نظیر ہیں۔ اس میں تعجب کی بات نہیں کہ رقص کی اس علاقائی شکل نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی جگہ بنائی ہے۔

○ ○ ○

این-آر-وی-پرشاد(ایم-اے)
ترجمہ: غلام جیلانی

نولمبا(Nolamba) مورتیاں جدید تحقیق کی روشنی میں

(یہ مورتیاں ضلع کرنول، آندھرا پردیش کے شیوا مندر میں پائی گئیں)

نولمبا حکمراں اپنا سلسلہ نسب پالواؤں(Pallavas) (۱) سے جوڑتے ہیں۔ انھوں نے نولمباوازی پر حکومت کی جس میں کرناٹک کے اضلاع کولار اور چترادرگ اور آندھرا پردیش کے اضلاع چتوراور اننت پور اور کرنول ضلع کے کچھ حصوں کے علاوہ تامل ناڈو کے دھرم پوری ضلع کا ایک حصہ بھی شامل تھا۔ ان کا پائے تخت ہیماوتی تھا جو آندھرا پردیش کے ضلع اننت پور کے جنوب مغرب میں تعلقہ مڈاکاسیرا میں واقع ہے۔ (۲) ان کا دور حکومت پہلے راجا منگلا نومبازی سے شروع ہوتا ہے جس نے ۷۳۵ء سے ۷۸۵ء تک حکومت کی اور آخری راجا ترلوکیا ملا نئی نولمبا دوم پالوا پرمانڈی (۱۰۴۴ء۔ ۱۰۵۴ء) پر ختم ہوتا ہے۔ نولمبا راجاؤں کے ایک مکمل شجرے کا ذکر ہیماوتی (۳)، نیلا پلی (۴)، اور مراگیری (۵) کتبوں میں ملتا ہے۔ ان کے بموجب منگلا نومبازی راجا کے جانشینوں کے نام حسب ذیل ہیں:

سمہا پوتا، چرو پنیرا، پولال چوڑا، مہندر ا اول، نئی گائی رپادیوا اول، بی را نولمبا نی گا، اری دا نولمبا اول، دلیپا، نئی نولمبا اول، پولال چوڑا دیوا دوم، دیرا مہندرا دوم، اری دا نولمبا دوم، گھانے ینکارا، جگدے کملا، امادی نولمبا اور ترلوکیا ملا نولمبا دوم، پالا وا پرمانڈی۔ (۶) ان راجاؤں کے علاوہ کچھ اور نام بھی دوسرے کتبوں میں ملتے ہیں۔ (۷) مگر ان کا ذکر زیادہ تر شاہی خاندان سے منسلک اراکین کی حیثیت سے ہے۔ ان کے زیر حکومت جو علاقہ تھا یعنی نولمباوازی، اس کی سرحدیں مغربی گنگا اور پالواؤں، راشٹر کوٹاؤں، چولاؤں اور کلیانی چالوکیاؤں سے جاملتی تھیں۔ نتیجتہً نولمبا آرٹ اور فن تعمیر پر مذکورہ بالا پڑوس کے اسلوب اثر انداز ہوئے۔ اور بنیادی طور پر نولمبا آرٹ میں ان سب روشوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے علاقے میں بہت سے مندر تعمیر کیے جن میں ایک نمایاں اور خصوصی طرز تعمیر نظر آتا ہے۔ یہ طرز زیادہ تر شیونی اثر سے جڑی ہوئی ہے۔ جیسا کہ گوانیشورا، مہندریشورا، نارائنیشورا، شدیلیشورا۔ کنٹیشورا اور رامیشورا مندروں کے کتبوں میں درج ہے۔ (۸) لگتا ہے کہ راجا مہندرا اول نے اپنا محل ایک شیوائی مندر میں تبدیل کر دیا تھا۔ (۹) نولمبا مملکت میں واقع ہیماوتی اور دوسرے مقامات پر کئی شیوائی مورتیاں محلوں میں پائی گئی ہیں۔ خاص طور پر نولمبا مندروں کے گربھا گری ہاس کے دروازوں کا ذکر ضروری ہے، جو بہت زیادہ مزین ہیں۔ اور جن میں دوار پالوں (چوکی داروں) کی شبیہوں کے سروں پر مخروطی ٹوپیاں ہیں۔ جن میں چار چار ہاتھ ہیں۔ ہیماوتی کے دوڈیشورا مندر میں ان کو دیکھا جاسکتا ہے۔ (۱۰) بالعموم دوار پال کی مورتیوں کو مندروں کے دروازوں کی چوکھٹوں سے جوڑ کر تراشا جاتا ہے۔ مگر کرنول کے دوار پالوں کو علاحدہ تراش کر دروازوں کے دونوں بازو ایستادہ کیا گیا ہے۔ ان کا تفصیلی ذکر اگلی سطروں میں کیا گیا ہے۔

راشٹر کوٹا پالوا کے فنی روایتی اثرات کے باوجود نولمبا آرٹ نے ایک نفیس اور ترقی یافتہ آرٹ کی شکل میں اپنا نمایاں اور مخصوص مقام حاصل کیا۔ اس کی مورتیوں کی سجاوٹ میں اضافہ ہوا، جیسا کہ یہاں برنگی اور سرنگی کے مجسموں میں دکھائی دیتا ہے۔ فن سنگ تراشی کے ماہرین اس فن کی خوبیوں، نزاکتوں، اور کاریگری کی مہارت کا اندازہ مورتیوں کے خدوخال، قدوقامت اور لباس کی ترتیب سے لگالیتے

ہیں۔ نولمبا آرٹ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مورتیوں کو مدور یا سہ ابعادی وضع میں تراشا گیا ہے۔ مورتیاں کاری گری کی خوبیوں اور سجاوٹ سے مالا مال ہیں۔ جس میں سر کا ہیں ناقابل ذکر ہے۔

روراوتارا گما (Raura vottara gama) میں شیوئی دوار پالوں کو نندی، مہاکالا، مہاچنڈ اور مہامنڈا کے نام دیے گئے ہیں جب کہ دیپ تاگا، یوگا جاگما، روروا گما، ویرا گما اور سپرا بھیدا گما میں ان کو وجئے اور برنگی سا کہا گیا ہے۔(۱۱) برنگی سنگ تراشی میں نٹ راج کو محض ایک قالب کے روپ میں دکھایا گیا ہے، جو بیٹھا ہوا ہے یا ناچ رہا ہے۔ اور شیوا کے ناچ کا لطف لے رہا ہے۔ برنگی کو بھی جیسے تی ریک ملّا کمیروا بھی کہا جاتا ہے، ایک قالب (ڈھانچ) کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے، جو نٹ راج کے پیروں کے پاس ناچ رہا ہے۔ ہالے بی ڈو (Halebidu) میں بھی دکھایا گیا ہے۔ (تیرھویں صدی عیسوی) (۱۳)۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ شیوا نے اسے ایک زائد پاؤں سے بھی نوازا ہے۔ (۱۲) یہ تصویر ناچتے ہوئے شیوا کی تصویروں کے ایک بڑے اور مستطیلی سلسلے میں دکھائی دیتی ہے؛ جو ایٹا منور، (Ettamanore) کیرالا میں ہے اور سولھویں صدی عیسوی پرانی ہے (۱۴) اسی طرح کی ایک برنگی تصویر لیپاکشی منڈپا کی چھت میں بھی بنائی گئی ہے۔ وہ بھی سولھویں صدی کی ہے۔ (۱۵)

سرنگی اور برنگی کے دو عمدہ مجسمے، جو نویں اور دسویں صدی عیسوی کے ہیں، کرنول شہر کے عین وسط میں ویر بھدرا مندر کے ایک حصے شیوالیا میں موجود ہیں۔ اور گربھا گرہا کے داخلی دروازے کے دونوں جانب ہیں۔ ان دو مورتیوں کے صحیح ماخذ کا ٹھیک سے علم نہیں ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں قریب سے ہی دست یاب ہوئی ہیں۔ ان مورتیوں کی دریافت بڑی معنی خیز ہے کیوں کہ اس سے نولمباؤں مملکت کی وسعت کے بارے میں سارے شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔ ان راجاؤں کی راج دھانی ہیماوتی ضلع اننت پور میں تھی جس میں کرنول ضلعے کا بھی کچھ حصہ شامل تھا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ نولمباؤں کی حکومت ضلع کرنول میں ویلدرتی تک پھیل گئی تھی۔ جس کا ثبوت نولمبا طرز تعمیر پر بنا ہوا مندر ہے۔ سنگ تراشی کے ان نمونوں کی دریافت اس طرح فنی اور سیاسی دونوں اہمیتوں کی حامل ہو جاتی ہے۔

ذیل میں ان دو مورتیوں کا حال تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ **سرنگی:** سرنگی کا مجسمہ سنگ سیاہ میں ہے۔ سات (۷) فیٹ اونچا یہ مجسمہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کھڑا ہوا ہے۔ سر پر ایک اونچا جڑاؤ کیرتا مکٹ ہے جس کے بالائی سرے پر منی جڑی ہے۔ مکٹ کے نیچے سر کے بال جوالا کیس اسٹائل میں سجے ہیں۔ کانوں کی لوؤں سے رتن کنڈل لٹک رہے ہیں۔ گلے میں جڑاوی نیکلس ہے جس میں ہلکا ہاراوں کے درمیان مستطیلی خالی جگہیں چھٹی ہوئی ہیں۔ اور وسط میں ہیرے جڑے ہیں۔ یہ وسیع نیکلس پورے سینے پر دمک رہا ہے۔ سادہ ڈوری میں موتیوں کو پاس پاس پرو کر کنٹھی بنائی گئی ہے۔ اور اس کی چودہ (۱۴) لڑوں سے کنٹھا بھرا بنایا گیا ہے۔ شانے بھی زیوروں سے آراستہ ہیں۔ موتیوں کی بل کھاتی ہوئی لڑوں کی قطاریں کاندھوں پر جھولتی ہوئی دل فریب نظارا پیش کرتی ہیں۔ "کیورا" یا شیر کے سر والے "انگداس" اور چوڑی پٹی والے "اوحارا بندھا" جو یکے بعد دیگرے بالائی اور عمودی ٹکڑوں سے سجائے گئے ہیں، آج بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی طرح رسی کے ڈیزائن میں ایک دبیز اور مرغولے دار سنہری ڈوری ہے، ایک بکسوئے کے ساتھ اپاوتھالیمن میں شانے پر پڑی ہے۔ بکسوئے سے موتیوں کی دو لڑیاں لٹک رہی ہیں۔ کمر کی سجاوٹ کے لیے ایک چوڑی

کر بندا (میکھالا) ہے۔ چاروں ہاتھوں پر بازو بند۔ "پراکوسٹھاوالیا" ہیں جن میں موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ ٹخنوں اور انگوٹھوں پر پائل اور چھلے بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔

محرابی بھنویں، چوڑی پیشانی، گداز ہونٹ، نکیلی ٹھوڑی، پرسکون بیضوی چہرے پر شانت مسکراہٹ یہ ہے مجسمے کا چہرہ مہرہ۔ درمیانی دھڑ سے ایک دراز قد والے سرشار آدمی کا تصور ابھرتا ہے۔ بھرے بھرے جسم کے باوجود کر ایک نازک خم اس پورے دیو قامت مجسمے کو نفاست کا پیکر بنادیتا ہے۔ نچلا بایاں ہاتھ ایک گرز پر ٹکا ہوا ہے۔ جس کی سطح پر ایک رینگتی ہوئی چھپکلی بڑی عمدگی سے بنائی گئی ہے۔ نچلا دایاں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا ہوا ہے۔ اوپر کا بایاں ہاتھ ترشول تھامے ہوئے ہے۔ اور اوپر کا دایاں ہاتھ "وسمیا ہستا" پوزیشن میں اٹھا ہوا ہے۔ دایاں پاؤں مضبوطی کے ساتھ سیدھا رکھا ہوا ہے۔ مگر بایاں پاؤں "میٹا" کی وضع میں خمیدہ ہے۔ بڑی مہارت سے بنایا ہوا ایک کربند، جس میں "وستر گرنتھی" اور خوش وضع پھندنے کرپٹے سے لٹکتے دکھائے گئے ہیں، مردانہ وجاہت اور سجاوٹ میں اضافہ کرتا ہے۔

ب۔ برنگی: جہاں تک جسمانی ساخت اور خدوخال اور پوشاک و سجاوٹ کا تعلق ہے، یہ مجسمہ سرنگی کے مجسمے سے عین مطابقت رکھتا ہے سوائے ایک چیز کے۔ یہاں مجسمے کا اوپری بایاں ہاتھ "پراسو" تھامے ہوئے ہے اور نچلا بایاں بازو بریدہ ہے۔ نچلا دایاں ہاتھ گرز پر رکھا ہوا ہے جب کہ سرنگی کا نچلا بایاں ہاتھ گرز پر دکھایا گیا ہے۔

نولمباواڑی آرٹ میں مورتیوں کو ایک امتیازی طرز اور شاہانہ انداز کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ ان کے زیور پھولوں سے آراستہ تراشے گئے ہیں۔ اکثر شبیہوں کے جسم قوی اور لمبوترے ہیں۔ چہرے بالعموم چوکور یا بیضوی وضع کے ہیں۔ جن کی کشادہ پیشانی ایک مستقل خصوصیت ہے۔ دوسری خصوصیات میں محراب دار بھنویں، نوک دار ٹھوڑی اور ستواں ناک شامل ہیں۔ اسی طرح ستونی وضع کی پوشاک اور جھکے ہوئے کاندھے بھی ان اشکال کی خصوصیات ہیں۔ گولائی لیے ہوئے اعضا، جو کسی اندرونی کھنچاؤ سے بل کھائے ہوئے ہیں، اس آرٹ کی ایک اور خصوصیت ہے۔ نولمباواڑی طرز فن میں خلوص، تازگی اور نوخیزی کی کشش ملتی ہے۔ یہ اچھوتی خصوصیت اسے دوسری روشوں سے ممتاز کردیتی ہے۔

آثار قدیمہ کے ان نمونوں کی اہمیت اور حفاظت کے مدنظر یہ ضروری ہے کہ ان کو قریب ہی کرنول کے سرکاری میوزیم میں منتقل کردیا جائے۔

حوالے:

1. Epigraphia Carnatica, Vol.XII, Si.28 (Hereafter E.C.)
2. Krishna Murthy, M.S., The Nolambas, A Political and Cultural Study, Mysore, 1980, P.136.
3. E.C. Vol. XII. Si.28.
4. South Indian Inscriptions, Vol.IX, Ptl.1. No.41 (Hereafter S.I.I).
5. Ibid. No.101.
6. Krishna Murthy, M.S., Op.cit., 1980, PP.67.
7. E.C. XI, CL.33, 34; E.C. X, P.54; S. I.I. IX, Pt.1, No.23; E.C. XII, Si.24, 38, Mi, 52; and Ibid. IX, Db.9

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

بیگ احساس

وفیات

اخترالایمان:

اردو کے ممتاز شاعر اور ادیب جناب اخترالایمان صاحب کا ۹/ مارچ ۱۹۹۶ء کو بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۸۰ برس تھی۔ چار سال سے گردوں کا نظام بگڑ جانے کے باعث انھیں ہفتے میں دو بار ناناوتی ہسپتال بمبئی میں ڈائیلیسس پر رکھا جاتا تھا۔ اخترالایمان ۱۲/ نومبر ۱۹۱۵ء کو اتر پردیش کے قصبے نجیب آباد کے ایک ادبی اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پائی پھر فلم سے وابستہ ہوئے۔ فلموں میں بھی ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ وہ ایک عرصے تک بی۔ آر فلمز کے اسٹوری ڈپارٹمنٹ سے وابستہ رہے اور قانون، وقت، گمراہ اور آدمی اور انسان جیسی فلموں کے مکالمے لکھے۔ انھیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، اقبال سمان اور فلم فیر ایوارڈ مل چکے ہیں۔ مہاراشٹرا اردو اکیڈمی اور دوسری ریاستوں کی اردو اکیڈیمیوں نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ایوارڈ دیے تھے۔ اخترالایمان موجودہ عہد کے ایک اہم شاعر تھے۔ اردو کے مشہور ادبی رسالے "سوغات" میں وہ اپنی سوانح حیات لکھ رہے تھے۔

صہبا اختر:

پاکستان سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر صہبا اختر کا انتقال ۱۹/ فروری کو کراچی میں دورہ قلب کے سبب ہوا۔ صہبا اختر ۲۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے چار مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ سرکشید، اقرا (نعتوں کا مجموعہ) سمندر اور مشعل۔ صہبا اختر کی شہرت ان کی طویل نظموں کی وجہ سے ہے۔ صہبا اختر کے انتقال کی خبر ہندستان بہت تاخیر سے پہنچی۔

نعیم زبیری:

اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب نعیم زبیری کا ۷/ مارچ ۱۹۹۶ء کو نظام انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسس حیدرآباد میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر ۸۰ برس تھی۔ نعیم زبیری نہایت خوش مزاج اور مرنجان مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ وہ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا میں ڈپٹی منیجر کے عہدے پر فائز تھے وہاں ملازمین کی انجمن کے سربراہ بھی تھے۔ ۱۹۹۲ء میں وہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد وہ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے ترجمان ماہنامہ "قومی زبان" کے جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ لیکن اکیڈمی نے ان کی خدمت سے زیادہ دن تک استفادہ نہیں کیا جس کا انھیں سخت افسوس تھا۔ نعیم زبیری کے افسانوں کے دو مجموعے "گونگے دریچے" اور "زرد زرد دھوپ" شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ریڈیائی ڈرامے، انشائیے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور خاکے بھی لکھے۔

دلیپ بادل:

اردو کے مشہور شاعر، ادیب اور تبصرہ نگار دلیپ بادل کا انتقال ۱۳/ مارچ ۱۹۹۶ء کو نئی دہلی میں ہوا۔ مرحوم کی عمر ۶۳ برس تھی۔ دلیپ بادل یکم نومبر ۱۹۳۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ گورنمنٹ بوائز سینیر سکینڈری اسکول شاہ پور جٹ، نئی دہلی میں بحیثیت معلم کام کرتے رہے اور وہیں سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ دلیپ بادل کی کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی لیکن وہ بہت اچھے شاعر

(آگے ص ۱۷ پر)

نثر نگار تھے۔ "ہماری زبان" میں وہ مختلف کتابوں پر تبصرہ لکھا کرتے تھے۔

رضا وصفی:

اردو کے ممتاز شاعر رضا وصفی کا انتقال ۱۲ / مارچ ۱۹۹۶ء کو حیدرآباد میں قلب پر شدید حملے کے باعث ہوا۔ رضا وصفی جدید لب ولہجے کے صاحب طرز شاعر اور خوش وضع و خوش بیان انسان تھے۔ ان کا شمار حیدرآباد کے منفرد شعرا میں ہوتا تھا۔ ان کا شعری مجموعہ "بوند بھر دریا" اشاعت کے آخری مراحل میں ہے۔

ادارۂ سب رس ان تمام مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

8. Krishna Murthy, M.S., Op.cit., 1980, P.162.
9. Ibid. 1980, P.136.
10. Ibid, 1980, P.167.
11. Bhatt, N.R., Rauravottaragama, Pondichery, 1983, PP. XVIII XIX.
12. Siva Rama Murthy, C., Nataraja in Indian Art Thought and Literature, National Museum, New Delhi, 1980, Ps.176, 184.
13. Ibid, 1980, P.268.
14. Ibid, 1980, P.293.
15. Kamesvara Rao, V., Lepakshi Temple, Tirupati 1982. P.16.

انجمن خواتین کی اپیل

اہلِ خیر حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ زکواۃ، خیرات، صدقات کا انجمن کو عطیہ دے کر مدد کریں۔
انجمن نادار لڑکیوں کی شادی، دینی تعلیم، ٹیلرنگ سنٹر کے کاموں میں اہلِ خیر حضرات کے تعاون سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ انجمن غیر مقیم افرادِ ملت سے جو خلیجی ریاستوں، امریکہ، کناڈا وغیرہ میں مقیم ہیں خصوصیت کے ساتھ اس کارِ خیر میں حصہ ادا کرنے کی درخواست کرتی ہے۔

عطیہ دہندگان حسبِ ذیل پتے پر عطیات جمع کرواکر رسید حاصل کر سکتے ہیں۔

شاہدہ محمد : صدر انجمن خواتین آندھرا پردیش

روبرو ضلع پریشد آفس 5.3.577 خیریت آباد حیدرآباد انڈیا

نوٹ : انجمن کی جانب سے مدرسہ چلایا جاتا ہے جس میں اردو، عربی کے علاوہ ٹیلرنگ کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

سنہ آغاز ۱۹۳۸ء — بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ — فون: 310469

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۵۸ — **خصوصی اشاعت سوونیر** — شمارہ: ۵-۶

مئی، جون ۱۹۹۶ء

اس شمارے کی قیمت: ۲۵ روپیے

فی پرچہ	۱۰ روپے	مشرق وسطیٰ اور امریکہ	۲۵ ڈالر
زر سالانہ	۱۰۰ روپے	پاکستان، برما، سری لنکا، بنگلہ دیش	۱۴ ڈالر
کتب خانوں سے	۷۵ روپے	انگلستان	۱۵ پونڈ

ناشر: ادارۂ ادبیات اردو — پنجہ گٹہ روڈ — حیدرآباد ۸۲

رحمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لئے ایس۔ ایس پرنٹرس میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا (کمپیوٹر کتابت: شارپ کمپیوٹرس)

مقالے

یومِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب

پیغامات



محمد قطب شاہ (۱۶۱۲–۱۶۲۶)



عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۶–۱۶۷۲)



ابوالحسن تاناشاہ (۱۶۷۲–۱۶۸۷)



سلطان قلی قطب الملک (۱۵۱۸ـ۱۵۴۳)



جمشید قلی قطب شاہ (۱۵۴۳ـ۱۵۵۰)



ابراہیم قلی قطب شاہ (۱۵۵۰ـ۱۵۸۰)



محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ـ۱۶۱۲)

اداریہ

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس عاملہ کے سرپرست جناب بہادر ... صاحب ۱۸ اپریل ۱۹۹۹ء کو انتقال کر گئے۔ وہ ادارہ ادبیات اردو کی بہت ... میں بھی تھے۔ انھوں نے ادارے کی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اردو زبان و ادب سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ ادارہ ان کے غم میں سوگوار ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ ان کی روح کو سکون بخشے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

دکنی کلچر کے بعد ایک اور خصوصی اشاعت "قطب شاہی سلاطین اور ان کے کارنامے" پیش ہے۔ دکنی تہذیب کو قطب شاہوں نے پروان چڑھایا۔ اس تہذیب کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ تلنگانے کی سرزمین پر ان لوگوں نے ایک پاکیزہ تمدن کو جنم دیا۔ قطب شاہوں کا تعلق ایران اور ترکستان سے تھا۔ سلطان قلی قطب شاہ ہمدان سے آیا تھا اس کا تعلق ترکستان کے ایک بڑے شاہی خاندان سے تھا۔ قطب شاہوں نے سلاطین بہمنیہ کے تمدنی ورثے میں بہت کچھ اضافہ کیا اور اس کو تلنگانے کے مقامی عناصر کے ساتھ اس طرح جذب کر دیا تھا کہ ایک بالکل نئی تہذیب ابھر کر آئی۔ انھوں نے تلنگانے کو اپنا گھر بنایا۔ یہاں کی عورتوں سے شادیاں کیں، اپنا لباس چھوڑ کر مقامی لباس اور طور طریقے اختیار کیے، مقامی زبان تلگی سیکھی۔ اس میں شاعری کی کوشش کی۔ ان کے تہوار منائے۔ انھیں پوری طرح مذہبی آزادی دی۔ یہ کچھ ایسے پہلو ہیں جن کے بارے میں جاننا شاید سے زیادہ ضروری ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو ہر سال قلی قطب شاہ تقاریب کا اہتمام کرتا ہے۔ ان تقاریب کے سلسلے میں اردو، تلگو، انگریزی سمینار بھی ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں سمینار میں پڑھے گئے مضامین کے ساتھ ساتھ کچھ مضامین قند مکرر کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ قطب شاہی دور کے مختلف پہلو سامنے آجائیں۔ اس دور کی تہذیب، تمدن، اس عہد کے حکمران، دین، اس عہد کا فن تعمیر، دکن اور ایران کے روابط، قطب شاہوں کے مالیات و اطوار ان کا انتظام عدل، اس دور کے علما، امرا

اور وزرا، اس عہد کی فارسی و تلگو شاعری کے علاوہ بادشاہوں کی علمی و ادبی خدمات و کارناموں پر مشتمل مضامین شامل کیے جارہے ہیں۔ یہ شمارہ بڑی حد تک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ یوم قلی قطب شاہ تقاریب کی رپورٹ اور اہم تقاریر بھی شائع کی جارہی ہیں۔ ماضی میں بھی سب رس کے "قلی قطب شاہ نمبر" شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس نمبر کے ذریعہ اس روایت کو برقرار رکھا جائے اور نئی نسل کو اپنے تہذیبی ورثے سے واقف کروایا جائے۔

ہم ادارۂ ادبیات اردو اور یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کمیٹی کی جانب سے تقاریب کی مختلف ذیلی کمیٹیوں کے معتمدین و اراکین اور ان تمام اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کے تعاون سے تمام پروگرام کامیابی کے ساتھ منعقد کیے جاسکے۔

ہم ادبی ٹرسٹ حیدرآباد، قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھاریٹی، اے پی - ای - اے - دی نظامس اردو ٹرسٹ، روزنامہ سیاست حیدرآباد، نواب شاہ عالم خاں صاحب، جناب خان لطیف خاں صاحب جناب آغم راندیری صاحب کے ممنون ہیں جنھوں نے ان تقاریب کے لیے مالی اعانت کی۔

ہم مشتہرین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی اعانت سے اس خصوصی اشاعت اور سووینیر کا اہتمام ممکن ہوسکا۔

(ادارہ)

سید عابد حسین خاں

قطب الملک سلطان قلی قطب شاہ

سلطان قلی قطب شاہ بانیِ سلطنت گولکنڈہ، ہمدان کے شاہی خاندان کا چشم و چراغ تھا اور اس کا تعلق "ماوراء النہر" کے قاراقونیلو قبیلے سے تھا جس کا نشان کالا بکرا تھا۔ اس خاندان کا نسلی سلسلہ اغزخاں بن خاراخاں سے چلا جو یافث بن حضرت نوح علیہ السلام سے ملتا ہے۔ اغزخاں اپنے دورِ حکومت میں ترکستان کے ایک بڑے حصے کو اپنے قبضے میں لایا اور ستر برس حکومت کی۔ یہ قبیلہ نام ور اشخاص قارا یوسف، سکندر شاہ ثانی، جہان شاہ جیسے حکم رانوں کا مرہونِ منت ہے جنھوں نے ایران و ترکستان کی سلطنت کو ایک عظیم الشان درجے تک پہنچایا تھا۔ ان لوگوں نے وسط ایشیا کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا اور ان کے مقام کو ثانی تیمور کہا جاسکتا ہے۔ اغزخان کا جانشین اس کا بیٹا تورا بیگ ہوا اور اسی کے عہد میں چنگیز خاں کے حملے شروع ہوئے اور بالآخر یہ قبیلہ ایران کے مغربی حصے میں منتقل ہوا اور ہمدان کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ اسی قبیلے نے چنگیز خاں کے حملوں کا مقابلہ کیا اور اپنی حکومت کے شیرازے کو ابوسعید مرزا کے عہد تک بکھرنے نہ دیا۔

قارا یوسف تیمور کا ہم عصر تھا اور فنونِ جنگ کا ماہر بھی جس کی وجہ سے تیمور کے بڑھتے ہوئے قدموں کو تھامے ہوئے تھا۔

سلطان قلی کے والد کا نام اویس قلی اور والدہ کا نام مریم خاتون تھا جو ملک صالح ہمدان کے امیر کی دختر تھیں۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان قلی کا تعلق بہریلو قبیلے سے ہے اور سلسلہ میر علی شا ئیبر سے ملتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے جس کا ثبوت سلطان محمد قطب شاہ (سلطنتِ قطب شاہیہ کا چھٹا بادشاہ) کا تحریر کردہ شجرہ ہے جو "کنز اللغات" میں درج ہے۔ جس کا مخطوطہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے اس نے اس طرح قلم بند کیا ہے۔

> محمد قطب شاہ بن مرزا محمد امین بن ابراہیم قطب شاہ بن سلطان قلی قطب بن اویس قلی بن پیر قلی بن الوند بیگ بن مرزا اسکندر بن قارا یوسف بن قارا محمد ترکمان۔"

اس قبیلے کو زبردست نقصان عق قونیلو قبیلے سے پہنچا جس کا نشان سفید بکرا تھا اور اس کا سردار حسن بیگ المخاطب عزن حسن تھا۔ عزن حسن نے جہاں شاہ کو قتل کرنے کے بعد اس کے دو لڑکوں یوسف اور محمد کو قید کیا اور قاراقونیلو قبیلے کے تقریباً تمام افراد کو قتل کردیا۔ پیر قلی کی جان، ہمدان کے امرا کی وجہ سے بچ گئی اور اس طرح یہ خاندان، ہمدان میں ہی زندگی بسر کرنے لگا۔

امیر یعقوب نبیرۂ عزن حسن، سلطان قلی کو اعلیٰ عہدے اور انعام و اکرام سے نوازنے کے عہد و پیمان کرنے لگا لیکن در حقیقت وہ سلطان قلی کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ اویس قلی نے امراءِ ہمدان کے مشورے سے اپنے لختِ جگر سلطان قلی کو اپنے بھائی اللہ قلی کے ہم راہ ہندستان روانہ کیا۔ بعض مؤرخین نے سلطان قلی کا نام علی قلی بتایا ہے۔

دورانِ سفر بہ مقام یزد ان دونوں کی شاہ نور الدین نعمت اللہ ثانی سے (جو ایک پائے کے بزرگ تھے اور جن کی سلطان قلی کی رفیقہ حیات سے قریبی رشتے داری بھی تھی) ملاقات ہوئی۔ انھوں نے سلطان قلی کو دعا دی اور کہا جاتا ہے کہ اپنے مصلے کے نیچے سے دو اشرفیاں نکال کر دیں اور پیشن گوئی کی کہ ایک دن سلطان قلی جنوبی ہندستان کے حصے میں بادشاہت کرے گا۔

اللہ قلی اور سلطان قلی ممکن ہے کہ شمالی ہند سے وارد ملک ہندستان ہوئے ہوں۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ یہ دونوں گھوڑوں کے سوداگر تھے لیکن یہ خیال مقامی تاریخوں میں درج نہیں۔ اللہ قلی اور سلطان قلی باعزت حکمران خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی سیاحت کی وجہ صرف سلطان قلی کی جان کی حفاظت تھی۔ ہوسکتا ہے کہ گھوڑے تحائف کے لیے اپنے ساتھ لائے ہوں۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان قلی اور اللہ قلی دو مرتبہ ہندستان آئے۔ پہلی مرتبہ سلطان قلی بیدر کے اخلاق و تمدن سے بے حد متاثر ہوا اور یہیں مقیم ہونا چاہتا تھا۔

بہمنی دربار میں محمد شاہ کے دور سے عرب، ترکی، ایرانی اور ماوراءالنہر کے اشخاص کی عزت افزائی ہوتی تھی۔ لہٰذا بیدر بہت جلد عالم میں مشہور ہوگیا۔ لیکن یہ حال شمالی ہند کا نہیں تھا جو آئے دن سادات اور لودھی خاندانوں اور تیمور کی یورشوں کی وجہ سے تزلزل کا شکار رہتا تھا۔

عبدالمجید صدیقی نے بہ حوالہ "تاریخ قطب شاہی" "تذکرۃالملوک خافی"، "ظفرہ" اور "تاریخ قطبیہ" سلطان قلی کی بیدر سے آمد کی تاریخ ۸۹۲ھ م ۱۴۸۶ء بتائی ہے۔ فرشتہ نے سلطان قلی کی آمد کو محمد شاہ ثانی کا عہد بتایا ہے اور لکھتا ہے کہ "محمد شاہ لشکری کو ترکی غلاموں کا بہت شوق تھا اور سلطان قلی ان میں سے ایک تھا۔"

تذکرۃالملوک خافی میں لکھا ہے کہ دوسری بار سلطان قلی اور اللہ قلی ۸۹۲ھ م ۱۴۸۶ء میں وارد دکن بہ مقام بیدر ہوئے اور، جب کہ محمد شاہ لشکری کی وفات ۸۸۷ھ م ۱۴۸۲ء میں ہوئی لہذا فرشتہ کا بیان غلط ثابت ہوتا ہے۔ اگر حکومت ہاتھ سے نکل بھی گئی تو سرمایہ اور شان و شوکت اور املاک ہمدان میں تھی اور ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ تقریباً گولکنڈے کی تمام تواریخ بتاتی ہیں کہ سلطان قلی بہمنی دربار میں ایک باعزت پناہ گزیں تھا اور پہلی مرتبہ جب آیا تھا اس کو انعام و اکرام سے نوازا گیا تھا۔ سید علی اصغر بلگرامی کے قول کے مطابق سلطان قلی کو درباریوں میں شامل کیا گیا تھا۔

دوسری بار اللہ قلی اور سلطان قلی بیدر آئے تو یہاں امیر یعقوب کے انتقال کی خبر پہنچی، ان دونوں نے ایران جانا چاہا کیوں کہ یہ ایک سنہرا موقع تھا اپنی کھوئی ہوئی ریاست کو حاصل کرنے کا، لیکن محمود شاہ نے بڑی مشکل سے اللہ قلی کو اجازت دی اور انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

سلطان قلی کے اخلاق سے محمود شاہ بے حد متاثر ہوا اور اپنے پسندیدہ مصاحبوں میں شامل کیا۔ ایک مرتبہ محمود شاہ اور دیگر ارکان دولت شکار کھیلنے گئے اور کسی کے ہاتھ کوئی جانور نہیں آیا سوائے سلطان قلی کے۔ محمود شاہ نے خوش ہو کر ۲۵۰ عرب و عراقی اسپ اور مقام "کورنگل" ان کی جاگیر میں دیا اور خواص خاں کے خطاب سے نوازا۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ جو مقام سلطان قلی نے پایا وہ اس کی علمی قابلیت اور مہارت فنون جنگ کی بدولت تھا۔ سلطان قلی حساب و خطاطی میں ماہر تھا لہٰذا بادشاہ نے محاسب شاہی محلات کا عہدہ عطا کیا۔ سلطان قلی کی ایمان داری اور سچی لگن کی وجہ سے محلات کی عورتیں اس کی بہت عزت کرتی تھیں۔ سلطان قلی کی تقدیر کا ستارہ اس وقت چمکا جب تلنگانے کے صوبے میں غدر برپا ہوا اور بادشاہ اس کو فرو کرنے کے لیے تین یا چار ہزار سوار روانہ کرنا چاہتا تھا اور افسر کے تقرر کی سوچ میں تھا کہ سلطان قلی نے اس مہم کی ذمے داری اٹھانے کی درخواست کی اور بہ حکم شاہی چند لوگوں کے ساتھ اس بغاوت کو بغیر کسی لشکر کشی کے فرو کر دیا۔ اس کامیابی کی وجہ سے سلطان قلی کا نام تمام ریاست میں

ہور ہو گیا۔ بادشاہ سلطان قلی کو اپنے فرامین میں "صاحب السیف والقلم" کے القاب سے یاد کرتا تھا۔

ایک عجیب و غریب واقعہ ۱۲ ذی قعدہ ۸۹۲ھ م ۸ / دسمبر ۱۴۸۶ کو پیش آیا جس کی وجہ سے سلطان قلی کی زندگی میں چار چاند لگ
ے۔ حبشی و دکھنی رعایا محمود شاہ کو قتل کرنے کے قصد سے قلعے میں اچانک حملہ آور ہوئے۔ سلطان قلی، حسن علی سبزواری اور سید میرزائی
شہدی نے بادشاہ کو اپنے گھیرے میں لے کر اس کی جان کی حفاظت کی تا آں کہ رسد آئی اور یہ کوشش ناکام ہوئی۔ اس خدمت کے صلے میں
سلطان قلی اعزاز و اکرام سے نوازا گیا اور "غازی الملک" کے خطاب سے بہرہ یاب ہوا اور جاگیر میں گولکنڈہ اور اطراف کے مقامات عطا ہوئے۔
۸۹۱ھ میں سلطان قلی نے اپنی لیاقت اور زیرکی سے محمود شاہ کو قاسم برید کے شکنجے سے نکالا۔

۸۹۹ھ م ۱۴۹۳ء میں مغربی ساحلی حصے میں جو گوا اور اردگرد کے علاقوں تک تھا وہاں کے تھانے دار بہادر جیلانی نے بغاوت کی اور
یاست گجرات کے تجارتی جہازوں کی لوٹ مار کی جس کی وجہ سے گجرات کے راجا نے محمود شاہ کو توجہ دلائی۔ محمود شاہ اپنی کمان میں قاسم برید،
لک احمد بحری، یوسف عادل خاں اور عماد الملک کی ملی جلی افواج کے ساتھ بہادر جیلانی پر حملہ آور ہوا۔ پہلا نشانہ قلعہ جمکھنڈی تھا اور یہ ذمے
اری قطب الملک دکھنی کے سپرد تھی، دوران کارروائی قطب الملک دکھنی نے اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا۔

سلطان قلی کو قطب الملک کا خطاب عطا کر کے ان کی زیرِ کمان کامیابی حاصل کی اور بہ مقام پنہالی بتاریخ ۵ / صفر المظفر ۹۰۰ھ م ۵
مبر ۱۴۹۴ء بالآخر بہادر جیلانی مارا گیا۔ اس کے بعد منگلیر اور میرج کی چڑھائیاں ہوئیں۔ قلعہ میرج کا قلعہ دار ایک مرہٹہ پوماتا ایک تھا۔
سلطان قلی نے مبارزت یکیکی میں اس کو شکست دی۔ محمود شاہ نے اس فتح کے صلے میں سارا مالِ غنیمت سلطان قلی کو دیا۔ ۹۰۱ھ م ۱۴۹۵ء میں
رنگل اور دیگر قصبات جاگیر میں عطا کیں۔ ۹۰۱ھ / ۱۴۹۶ء میں وہ تلنگانے کی صوبے داری پر معمور ہوا اور امیر الامرا کا خطاب پایا۔ فرشتہ کے
طابق سلطان قلی نے اپنی خود مختاری کا اعلان اپنی تقرریِ طرف داری (صوبے داری) تلنگانہ کے بعد ہی کیا اور خطاب قطب شاہ اپنایا۔ اس
لط بیانی نے کئی انگریزی و فارسی تاریخ دانوں کو گم راہ کیا ہے جب کہ سلطان قلی نے کبھی بھی بہمنی سلطنت کے کسی بھی حصے کو غصب نہیں
یا بلکہ وہ علاقے حکومت بہمنیہ میں شامل کیے جو پہلے نہیں تھے۔ سلطان قلی کی وفاداری کا ثبوت ہمیں مسجدِ صفا کے کتبے سے ملتا ہے جو ۹۲۴ھ م
۱۵۱۸ء میں قلعہ گولکنڈہ میں تعمیر کروائی گئی تھی اور یہ اس علاقے کی پہلی مسجد ہے۔ اس کتبے کی عبارت عربی میں خطِ طغریٰ میں سنگِ سیاہ پر
ذیل کندہ ہے:

بناء هذا المسجد الجامع فی زمان السلطان الاعظم المتوکل علی الله الغنی ابی المغازی محمود شاه بن محمد شاه البهمنی خلد الله ملکه وسلطنة و بانیه المبهل الی الله مالک الله مالک سلطان قلی المخاطب بقطب الملک فی سنه اربع و عشرون و تسمایة

اس کتبے کے اوپر نام خطاط عبد الکریم ایرانی اناامل میں منقوش ہے۔ اس کتبے کی تاریخ ۹۲۷ھ / ۱۵۲۰ء ہے۔ تذکرۃ الملوک خافی میں
لکھا ہے کہ سلطان قلی اپنی ساری زندگی بادشاہ کا وفادار رہا۔

کرشنا تنگ بھدرا دوآبے کی وجہ سے محمود شاہ اور وجیہ نگریوں کے مابین جنگ ہوئی محمود شاہ شدید زخمی ہوا اور ۲۴ / ذی الحجہ ۹۲۴ھ /

۷ ۱۲ ستمبر ۱۵۱۸ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

سلطان قلی نے محمود شاہ کی وفات کے بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کیا جب کہ امیر برید سلطنت بہمنیہ کا کلیہ طور پر مختار ہو گیا تو گولکنڈے کی تمام تاریخیں یک رائے ہیں کہ سلطان قلی نے محمود شاہ کے بعد ہی خود مختاری کا اعلان کیا جو احمد نگر، بیجاپور کے خود مختاری بیس یا چھبیس برس بعد عمل میں آئی۔ سلطان قلی نے ایرانی طرزِ عمل پر خطبے میں اپنا نام قطب شاہ اپنایا اور ۵ مرتبہ دن میں نوبت و نقارہ بجانے کا حکم دیا۔

قطب شاہی اسناد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سلطان قلی جب عہدہ طرف داری پر معمور کیا گیا تو گولکنڈے سے کچھ دوری پر جہاں پہاڑیاں ہیں، مقیم تھا۔ اب جہاں قلعہ گولکنڈہ ہے یہاں قلعہ کہنہ کے آثار جو مٹی سے بنا ہوا تھا پائی گئیں جس کو دیو رائے کے آباو اجداد نے بنایا تھا بعد میں یہ راجگان ورنگل کے قبضے میں آیا۔ راجگانِ ورنگل کاکتیہ خاندان سے تھے جو چالوکیہ دور کے امرا تھے۔ غالباً یہ مقام دیو رائے راجا دورِ حکومت میں مشرقی صوبہ تھا۔ جب بہمنی حکومت نے اپنے سرحدی حدود ورنگل تک پھیلا لیے تو راجا کنھیا نائک نے بہ ذریعہ سند اس مقام کو محمود شاہ اول ۷۶۰ھ / ۱۳۵۸ء تا ۷۷۶ھ / ۱۳۷۵ء کے حوالے کر دیا۔ یہ مقام بہمنی دور میں مشرقی سرحدی صدر مقام رہا اور بہمنی قلعوں میں اس کو اہمیت حاصل رہی۔ یہ جگہ اولاً "منگل" یا "منگلاورم" کہلاتی تھی۔ یہ نام نواب نیک نام خان کے کتبے پر ملتا ہے۔

گولکنڈے کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک فرانسیسی سیاح تھیونو (De Thevenot) جو یہاں ۱۶۶۶ء میں موجود تھا علاوہ روایت کو لکھتا ہے کہ سلطان قلی کو ایک چرواہا جنگل کی راہ سے اس مقام پر لایا۔ تلگو زبان میں چرواہے کو "گولا" کہتے ہیں۔ اس بارے جناب آئی۔ کے۔ شرما (ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم) نے بتایا کہ یہ چرواہے "جگد مبا دیوی" کو پوجتے ہیں اور اس کا مندر جو کاکتیہ دور موجود بارہ دری کے متصل ہے آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے سلطان قلی نے قلعہ اور شہر کی تعمیر کی۔ قلعے کو بے حد مضبوط بنایا گیا۔ فصیل کی تعمیر پتھر سے کی گئی اور ۵۰ فیٹ چوڑی خندق بنائی گئی۔ قلعہ گولکنڈہ کی اونچائی چار سو فیٹ اور احاطہ چار میل کا ہے جس میں ستیاسی ۸۷ نصف گول برج پچاس تا ساٹھ فیٹ پائے جاتے ہیں۔ سلطان محمد کے انتقال کے بعد سلطان قلی نے "گولکنڈہ" کا نام "محمد نگر" رکھا اور اپنا دار الخلافہ معین کیا۔ محلات، سرائے، مکانات، مساجد اور دو غسل خانے شاہی مردوں کے لیے۔ قلعے میں زنانی بیتوں کے واسطے اور احاطہ۔ گنبدانِ شاہی میں مردوں کے لیے تعمیر کیے گئے۔ حمام ترکی اور ایرانی طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس میں گرم اور ٹھنڈے پانی کی نالیاں اور حوض بنائے گئے۔ چمن بندی، باغ ارم نمونہ پیش کرتے اور آج بھی نگینہ باغ قلعے میں موجود ہے اور دیگر باغات وقت کے ہاتھوں برباد ہو گئے۔

سلطان قلی کو تعمیر سے خصوصی دل چسپی تھی اس نے ایک نیا طرزِ تعمیر اختراع کیا جو آگے چل کر "قطب شاہی طرزِ تعمیر کے نام" مقبول ہوا۔ یہ بہمنی، ایرانی اور مصری فنِ تعمیر کا شبہ کار ہے۔ دولت خانہ عالی کی دیواریں اعلیٰ درجے کے روغنی پتھر سے بنائی گئیں جس کالے پتھر کے نقشی بارڈر آج بھی کھنڈروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ محلاتِ شاہی میں بڑے بڑے ایوان اور کمانیں ہیں جس میں ہر نمونے رواق اور طاقچے ہیں نقش کرے۔ پشت پہلو ہیں۔ "زنانہ محل یا" رانی محل" کے کھنڈر میں اس دورِ عظیم کی جھلکیاں آج بھی دکھائی دیتی ہیں۔

سلطان قلی نے درباری زبان فارسی کو برقرار رکھا۔ اس دو ‍ میں علما، مشائخ اور سادات بیرونی ممالک سے گولکنڈہ آئے۔ ادب

شاعر دربار میں ہوں گے کیوں کہ جمشید فارسی زبان کا بہترین شاعر تھا گو تاریخی کتب میں سلطان قلی کے دربار میں کسی شاعر کا ذکر نہیں ملتا۔
سلطان قلی نے اپنے طویل دورِ حکومت میں کئی جنگیں لڑیں جس کی وجہ سے سلطنت کا رقبہ ورنگل سے لے کر ساحلِ مچھلی بندر تک پھیل گیا۔

عبدالمجید صدیقی کے بموجب آخری جمادی الاول ۹۵۰ھ اور سید علی اصغر بلگرامی کے مطابق ۲/ جمادی الثانی ۹۵۰ھ میں اس کے تیسرے بیٹے یار قلی جمشید کی سازش سے میر محمود ہمدانی قلعہ دار نے ۴ ستمبر ۱۵۴۳ء کو سلطان قلی قطب شاہ کو مسجد صفا میں قتل کر دیا جب وہ سجدے کی حالت میں تھا۔ تاریخ ظفرہ کے مطابق قلعہ دار نے ۲۳ زخم لگائے جب سلطان قلی نمازِ عصر ادا کر رہا تھا۔ سلطان قلی کو اس کے بنائے ہوئے مقبرے بہ مقام "لنگر فیض اثر" میں دفن کیا گیا۔ انتقال کے وقت سلطان کی عمر ۹۹ برس تھی لہٰذا سنہ پیدائش ۸۴۹ھ / ۱۴۴۵ء نکلتا ہے۔

مقبرے کی عمارت بہت ہی سادہ ہے، قبر سنگِ سیاہ سے بنائی گئی اور سہ منزلہ ہے۔ پہلے دو حصوں پر قرآن کے دوسرے پارے کی آیتیں نمبر ۲۵۶ تا ۲۵۹ خطِ نقش میں کندہ ہیں۔ آیت کے آخر میں یہ کلمات منقوش ہیں:

"صدق الله العظيم وصدق رسوله النبی الکریم ونحن علی ذالک من الشاہدین والحمدلله رب العالمین ۝

تیسری منزل میں دورد اثنا عشری کندہ ہے۔ جو نقل کیا جاتا ہے:

اللهم صل علی المصطفیٰ محمد والمرتضیٰ علی والبتول فاطمه والسبطین الحسن والحسین وصل علی زین العباد علی والباقر محمد والصادق جعفر والکاظم موسی والرضا علی والتقی محمد والتقی علی والذکی العسکری الحسن وصل علی الحجة القایم الخلف الصالح الامام الهمام المنتظر المظفر محمد المهدی صاحب الزمان وخلیفة الرحمن ومظهر الایمان وسید الانس والسبحان صلوات الله وسلامه علیه وعلیهم اجمعین فی سنه ۹۵۰ ۝

جنوبی سمت میں (Southern Side) قبر کے آخری حصے میں مرحوم بادشاہ کی تاریخ وفات و خطابات اس طرح کندہ ہیں:

(۱) انتقل صاحب هذه الروضة الرضية وهو الملک المغفور

(۲) السعید الشهید الغازی لوجه الله المجاهد فی سبیل الله الملک سلطان قلی

(۳) المخاطب بقطب الملک المشهور به بر ملک انار الله برهانه الی جوار رحمته الله فی یوم الاثنین ثانی شهر جمادی الثانیه فی سنه ۹۵۰۔

اس کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان قلی کو عوام "بڑے ملک" پکارتی تھی۔ جس کا ذکر "تاریخ محمد قطب شاہی" اور "ظفرہ" میں ہے۔ سلطان قلی کا قطعہ تاریخ "فیاض ہند" ہے اور تاریخ وفات اس شعر سے بھی نکلتی ہے:

(آگے ص ۱۹ پر)

محمد عبدالقیوم

قلعہ گولکنڈہ ۵۰۰ سال مکمل

سلطنت قطب شاہیہ کی ابتداء اور خاتمہ بالا حصار پر ہوا

گولکنڈہ ایک زمانے میں اپنے ہیروں کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور تھا۔ زمانہ قدیم میں کچی مٹی کی دیواروں سے محصور ایک معم قلعہ تھا۔ جس کو ورنگل کے راجاؤں نے مقام کی بلندی سے فائدہ اٹھاکر بنایا تھا۔ بہمنی دور حکومت میں جب سلطان قلی قطب الملک کو ا سے پانچ سو ۵۰۰ برس قبل ۹۰۱ھ م ۱۴۹۶ء میں تلنگانہ کا صوبے دار بنایا گیا تو اس نے اپنی صوبے داری میں اس قلعہ کو مستحکم کیا اور جب قط شاہی خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو گولکنڈہ کے اقبال کا دور شروع ہوا۔ شاہان قطب شاہیہ نے اس کو ہیروں کے لیے ہی مشہور عالم نہیں بلکہ ان کی تہذیب و تمدن، ادب نوازی اور تعمیرات نے اس کو سارے ہندوستان میں ممتاز کر دیا۔ آج قطب شاہی سلطنت کو ختم ہوئے ز از تین صدیاں گزر گئیں مگر آج بھی اس کے در و دیوار، شکستہ آثار اس کی عظمت کے گواہ ہیں اور ان میں وہ مقناطیسی کشش باقی ہے جس دکن کے اس کوہسار کو مختلف اقطاع عالم کے سیاحوں اور صاحب کمالوں کا مرکز اور گہوارہ بنادیا تھا۔ اب بھی اس کا ماحول اور خوش گوار فا اہل ذوق کو دور دور سے اس کی زیارت کے لیے کھینچ لاتی ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ قلعہ گولکنڈہ کی طرف سیر و سیاحت کے لیے ہز شائقین بڑھتے دکھائی نہ دیتے ہوں۔

گولکنڈہ کا بالا حصار بجائے خود ایک قلعہ ہے۔ دراصل اسی بلندی و استحکام سے متاثر ہو کر سلطان قلی قطب الملک بانی سلطنت اس کو اپنا پائے تخت قرار دیا تھا۔ لیکن اس کی آبادی اس سرعت کے ساتھ بڑھتی گئی کہ اس کے اطراف ایک نیا شہر آباد کرنا پڑا اور اصل ا کو صرف شاہی محلات اور کارخانوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ جس کا نام بالا حصار مشہور ہوگیا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے سینکڑوں پختہ وسیع سیڑھیوں کی چڑھائی کرنی پڑتی ہے۔ سابق میں گھوڑے سوار بھی اسی سیڑھیوں سے جاتے تھے۔ اسی راستے پر باؤلیوں، مسجدوں مندروں کا سلسلہ ہے۔ جو ظاہر کرتا ہے کہ قطب شاہوں کو اپنی ہر مذہب و ملت کی رعایا اور ملازمین کے آرام و آسائش اور پاس داری کا خیال تھا۔ خاص بادشاہی احاطے میں محلات و شاہی نشست گاہ کے قریب مندر کا پایا جانا بے نظیر مذہبی رواداری کا بہترین ثبوت ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بہمنیوں کی مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہوگئی کہ اس کے تمام صوبے بیجاپور، احمد نگر برار اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ چناں چہ ۱۴۸۹ء میں احمد نگر، بیجاپور اور برار کے بانیوں نے بالاتفاق سلطان محمود شاہ بہمنی کا نام خطبے خارج کر کے اپنا نام داخل کر دیا اور پانچ نوبت بجوائے اور یہ اعلان خود مختاری تھا۔ بہ قول تاریخ فرشتہ سکے اور خطبے کے ساتھ پانچ نوبت با شاہی خود مختاری کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔

اسی طرح سلطان قلی کو بھی تلنگانہ میں جہاں وہ صوبہ دار تھا اپنی خود مختار سلطنت قائم کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ سلطان قلی ا "قرا یوسف" ترکمانوں کے خاندان سے تھے۔ ان کی پیدائش سعد آباد ہمدان میں ہوئی تھی۔ جب یہ ایران سے دکن آئے تو سلطان محمد شاہ بہ کے دربار میں ان کی خاطر خواہ قدر ہوئی۔ بہادری اور شاہی وفاداری کے صلہ میں محمد شاہ بہمنی نے ان کو قطب الملک کا خطاب دے کر تلا

کاصوبے دار مقرر کیا۔ خود مختاری کے اعلان کے بعد سلطان قلی کے حدود مملکت شمال میں رود گوداوری تک، مشرق میں اڑیسہ اور ساحل سمندر تک اور جنوب میں رود کرشنا تک تھے۔ اپنی دانائی اور اولالعزی سے درجہ بادشاہت پر پہنچا۔ اور یہ بادشاہ ۱۵۴۳ء میں قلعہ گولکنڈہ کی جامع مسجد میں بحالت سجدہ شہید ہوا۔

احمد نگر، بیجاپور اور برار کے شمالی علاقوں کے مقابلے میں تلنگانے کا جنوب مشرقی صوبہ اپنے [redacted] اور جغرافیائی خصوصیات کی بناء پر ایک جداگانہ سلطنت بننے کے قابل تھا۔ سلطان قلی قطب الملک ۱۴۹۶ء میں تلنگانہ کا صوبے دار بنایا گیا تھا۔ صوبے دار ہونے کے بعد بھی اس نے فوراً اعلان خود مختاری نہیں کیا۔ تلنگانہ میں اس کے صوبے دار ہونے کے بعد اس نے کافی طاقت فراہم کرلی تھی۔ لیکن اس کے باوجود سلطان قلی کا جذبہ وفاداری اور حق پرستی اس کو اعلان خود مختاری کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ حالاں کہ مرکزی حکومت اس قدر کم زور تھی کہ اس کو کسی مزاحمت کا اندیشہ نہیں تھا۔ شمال کے تمام صوبے دار خود مختار ہو چکے تھے اور سلطان قلی کو اس سے خاطر خواہ ترغیب ہوتی رہتی۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شمال کے سلاطین احمد نگر و بیجاپور نے اس کو خود مختاری کے لیے بہت ابھارا لیکن سلطان قلی اپنے جذبہ وفاداری سے مجبور تھا اور فرض شناسی کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جب سلطان محمد شاہ بہمنی پر بریدیوں کی خود غرضی کی وجہ سے اس قدر عرصہ روزگار تنگ ہوگیا کہ اس کی روزمرہ کی ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں تو سلطان قلی قطب الملک اس کو خفیہ طور پر گولکنڈے سے پانچ ہزار ہون بھیجا کرتا تھا۔ اور جب تک سلطان محمود زندہ رہا غالباً یہ ہون ہر مہینے برابر بھیجے گئے۔

اگرچہ ۹۰۱ھ مطابق ۱۴۹۶ء سے جب کہ سلطان قلی قطب الملک تلنگانہ کا صوبے دار بنایا گیا تھا اس نے تلنگانے میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ جب رعایا نے سرکشی کی تو اس کو ختم کرنے کے لیے سلطان قلی کو روانہ کیا گیا تلنگانہ کی اس مہم کو اس نے نہایت بہادری اور دیگر تدابیر سے سر کیا اور وہاں سے بہ فتح مظفر واپس ہوا تو خطاب کے ساتھ اس کے صلے میں گولکنڈہ اور اس کے مضافات کا پیش کش وصول کرنے کے لیے اس کو مقرر کیا۔ ان فرائض کو بھی نہایت وفاداری اور نیک نیتی سے انجام دیا تو ازراہ شفقت بادشاہ نے تلنگانہ کا صوبے دار مقرر کردیا۔

گولکنڈہ کے اس نام کی بابت قدیم روایت ہے کہ سلطان قلی تلنگانہ کا صوبے دار مقرر ہونے کے بعد اپنے صدر مقام کے لیے موزوں مقام کی تلاش کررہا تھا۔ ایک دھنگر نے موسیٰ ندی کے قریب اس پہاڑی پر جو کچی مٹی کی دیواروں سے محصور تھی اور گھنے جنگل میں گھری ہوئی تھی نشان دہی کی اور قلعہ بنانے کے لیے موزوں قرار دیا۔ سلطان قلی نے اس دھنگر کے مشورے کو قبول کیا اور مضبوط پتھروں سے نئے سرے سے اسی پہاڑی پر نئے قلعہ کی بنیاد ڈالی اور فصیلیں بنوائیں۔ اس قلعے کا نام اسی دھنگر کے نام سے گولہ کنڈہ رکھا۔ (تلگو الفاظ میں گولہ بہ معنی دھنگر اور کنڈہ بہ معنی پہاڑ کے ہیں) ۔ رفتہ رفتہ اس کا نام گولکنڈہ ہوگیا۔

گولکنڈہ اور اس کے قلعے کا وجود پہلے سے پایا جاتا ہے۔ اس کو قدیم زمانے میں "مانگل" کہتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ قدیم سلطنت چالوکیہ کا ایک صوبہ رہا ہو۔ جب سلطان چالوکیہ کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی جگہ دکن میں منتشر راجدھانیاں قائم ہوئیں تو گولکنڈہ یا مانگل میں بھی ایک راجدھانی قائم ہوئی۔ چناں چہ تمام تاریخوں میں یہاں کے ایک راجا کا نام دیوارائے بتایا جاتا ہے۔ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ گولکنڈہ سلطنت ورنگل کا مشرقی صوبہ رہا تھا اور دیوارائے اصل میں ورنگل کا راجا ہے جس کے بزرگوں نے گولکنڈہ کا قلعہ بنوایا تھا لیکن اس وقت اس کی اریں مٹی کی تھیں۔ بہمنی سلطنت کی توسیع کے ساتھ جب ورنگل تک قبضہ ہوگیا تو گولکنڈہ اس میں ضم ہوگیا۔ محمد شاہ بہمنی اول کے عہد

(۱۳۵۸ تا ۱۳۷۵ء) میں ورنگل کے راجانے گولکنڈہ کا قلعہ بہمنی سلطنت کے سپرد کر دیا۔ اس زمانے سے یہ سلطنت بہمنی کا بہت اہم قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس قلعے کے ذریعے سے تمام مشرقی حدود کی حفاظت اور مشرق میں فوجی نقل و حرکت ہوتی تھی۔ ۱۵۱۸ء میں سلطان محمود بہمنی کا انتقال ہوا اور اسی سال سلطان قلی نے گولکنڈہ کو "محمد نگر" سے موسوم کر کے اپنا پائے تخت قرار دیا اور اس کو آباد اور مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ ضروری عمارتیں بنائیں گئیں۔ کچھ محل تعمیر کیے گئے اس کے ساتھ مساجد جس میں جامع مسجد بھی ہے جو اپنے تمام اور دیگر ضروریات سے مزین تھی۔ مسافروں کے لیے مسافر خانوں کا انتظام تھا۔ لنگر خانے کھولے گئے۔ چناں چہ آج بھی ایک مسجد کو "لنگر خانہ کی مسجد" کہا جاتا ہے۔ ان تعمیرات سے شہر کی رونق اس قدر بڑھ گئی تھی کہ یہاں باہر سے ہزاروں آدمی آکر بسنے لگے۔ فن تعمیر میں یہ اس طرز کے موجد تھے۔ جس کو "قطب شاہی طرز تعمیر" کہا جاتا ہے۔ جو ایرانی ہندو اور پٹھان طرز تعمیر کا مجموعہ ہے۔

۱۴۹۶ سے ۱۵۱۸ء تک سلطان قلی قطب الملک نے بحیثیت بہمنی صوبے دار گولکنڈہ مستقر برقرار رکھا اور حکومت کی ۱۵۱۸ء تا ۱۵۴۳ء تک خود مختار بادشاہ کی طرح دکن میں حکومت کی اور جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا۔ یہاں کی منتشر اکائیوں کو ایک رشتے میں منسلک کر کے اس ملک کی خاطر خواہ شیرازہ بندی کر دی تھی جو تمدنی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔

محمد قلی قطب شاہ بانی شہر حیدرآباد کے ابتدائی دس بارہ سال تک سلطنت قطب شاہیہ کا مستقر صرف گولکنڈہ ہی تھا جہاں مرکزی حکومت تھی حصار کے اندر عام آبادی تھی۔ اگرچہ اس کی بنیاد سلطان قلی قطب الملک نے رکھی تھی لیکن اس کی تمام تر تعمیر اور استحکام ابراہیم قطب شاہ (۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء) نے کیا۔ اور سلطنت کی ترقی کے ساتھ یہ بھی ایک بہت بڑا شہر ہو گیا تھا۔ اس میں تمام شہری ضرورتیں بہم پہنچائی گئی تھیں۔ ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں جب کہ دکن میں طوائف الملوکی اور خانہ جنگیوں کا دور دورہ تھا تو خان اعظم مصطفےٰ خاں نے بادشاہ کو توجہ دلائی کہ قلعے کے اطراف و جوانب سے اس کی تباہی کا اندیشہ ہے اس لیے اس کو مضبوط اور مستحکم کرنا چاہیے۔

چناں چہ گولکنڈہ کا باحصار یعنی دو منزلہ بارہ دری تیار ہوئی اور بے شمار محل قلعے میں بنائے گئے۔ اس کے عہد میں ایک اور ایوان شاہی بنایا گیا جو دولت خانہ عالی کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کے علاوہ باغ اور دوسری عمارتیں بنوائیں ایک عجیب حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تمام شاہی عمارتوں میں آب رسانی کا عجیب انتظام تھا۔ تمام محلوں میں مٹی کے نلوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بلند دیواروں اور چھتوں پر پانی پہنچایا گیا۔ قلعہ گولکنڈہ میں اس وقت جو عمارتیں موجود ہیں ان میں نلوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔ قلعہ گولکنڈہ کی شاہی عمارتیں بہت بلند اور مضبوط ہیں ان سے قطب شاہوں کی بلند خیالی ظاہر ہوتی ہے۔ ابراہیم قطب شاہ نے قلعہ کا بیرونی حصار تعمیر کروایا جن میں حسب ذیل دروازے ہیں۔

(۱) فتح دروازہ (۲) مکہ دروازہ (۳) پٹنچرو دروازہ (۴) بنجارہ دروازہ (۵) جمالی دروازہ (۶) موتی دروازہ (۷) بہمنی دروازہ (۸) نئے قلعہ کا دروازہ۔

قلعے کی بلندی چار سو فیٹ ہے۔ اور قلعے کا حصار طول چار میل ہے۔ جس پر (۸۷) نصف دائرہ نما برج پچاس سے ساٹھ فیٹ تک مرتفع بنے ہیں۔ دیوار حصار کے بعض پتھر ایک ایک ٹن وزنی ہیں۔ فصیل قلعہ کے باہر ۵۰ فیٹ عریض ایک گہری خندق ہے۔ قلعے میں شاہی محلات، بارود اور اجناس کے کوٹھے اصلاح خانہ، عاشور خانے، رام داس کا قید خانہ، بازار، مساجد، مندر، باغات اور بڑے بڑے حوض ہیں۔ قلعہ کے اطراف میں چاروں طرف قدرتی پہاڑ اور موسیٰ ندی ہے۔ اس کے اہم برجوں میں سیولا برج، پیٹلہ برج، موسیٰ برج، کاغذی برج،

نورتگی برج ہیں۔

قلعہ گولکنڈہ کی مساجد میں ہیرا مسجد، جامع مسجد، مسجد صفا، لنگر خانہ کی مسجد، چینی مسجد، اشرفی مسجد، بریدی مسجد، مسجد کلاں، مسجد گنڈہ شاہ صاحب، کٹورہ حوض کی مسجد، مسجد لاخیالی (نیا قلعہ) اور مسجد مصطفےٰ خاں (نیا قلعہ) یہ تمام قطب شاہی دور میں تعمیر کردہ ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری اور تاریخی مسجدیں ہیں۔ قلعے کی سیڑھیوں کے قریب چھوٹی سی مسجد ابراہیم قطب شاہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اندرون قلعہ تاراشی کی مسجد اور مسجد یک خانہ بھی ہے۔

مکہ دروازہ قلعہ گولکنڈہ کے آٹھ دروازوں میں سے ایک ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کا رخ مکہ معظمہ کی جانب ہے۔ یہ دروازہ نہایت بلند اور مستحکم ہے۔ مضبوط ساگوان کے تختوں پر خاردار فولادی کیلیں ہاتھیوں کے حملے سے حفاظت کی غرض سے نصب ہیں۔

قلعے کی فصیل کے مشرقی سمت میں فتح دروازہ ہے جہاں سے ۱۶۸۷ء میں مغل فوجیں داخل ہوئی تھیں۔ بنجاری دروازے کو جاتے ہوئے راستے میں ایک بہت بڑا حوض ملتا ہے جو اب شکستہ ہونے کی وجہ سے خالی پڑا ہے۔ یہ زمانہ جنگ میں فوج اور اندرونی آبادی کے لیے ذخیرہ آب تھا۔ اس قلعے میں اتنی وسعت ہے کہ خطرے کے زمانے میں بلدہ کی آبادی کا غالب حصہ اسی کے اندر قیام پذیر ہوتا تھا۔

انگریز سیاح گولکنڈہ کی خوش گوار ہوا، پانی کی سہولتیں، زمین کی زرخیزی کو ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بہتر بتاتے ہیں۔ حیدرآباد اور گولکنڈہ ہی وہ مقام ہے جو ان سلاطین کی وجہ سے اپنے بیش قیمت ہیروں کے لیے تمام عالم میں مشہور تھا۔ کوہ نور ہیرا جو اس وقت تاج برطانیہ میں ہے وہ بھی گولکنڈہ کے بادشاہوں کا بیان کیا جاتا ہے اس کے سوا نایاب موتی اور دوسرے ہیرے جواہرات جہاں کے خزانے میں تھے جو اس زمانے میں دنیا کے کسی بادشاہ کے پاس نہ تھے۔

قطب شاہی دور میں گولکنڈہ سے حیدرآباد پائے تخت تبدیل ہونے کے باوجود قلعہ کی فوجی اہمیت برقرار رہی۔ قطب شاہان اس میں قیام پذیر رہے۔ ضروری تعمیرات اور ترمیم کا قلعے کے برجوں میں ہمیشہ خیال رکھا گیا۔ ایک عجیب تاریخی اتفاق ہے کہ قطب شاہی سلطنت کی ابتدا بانیِ خاندان قطب شاہیہ سلطان قلی نے گولکنڈہ کی اسی تاریخی پہاڑی سے کی اور سلطنت کا خاتمہ بھی اسی پر شکوہ کوہسار پر ہوا جب کہ ابوالحسن تاناشاہ کو ۱۶۸۷ء میں ۹ ماہ کے طویل محاصرے کے بعد مغل سرداروں نے اسی پہاڑی کے بالا حصار میں گرفتار کیا۔

شہزادہ اورنگ زیب نے فبروری ۱۶۵۶ء میں گولکنڈہ قلعہ کا پہلا محاصرہ کیا۔ ۳۰/ مارچ ۱۶۵۶ء کو صلح ہوئی۔ اس صلح میں عبداللہ قطب شاہ نے قلعہ رام گیر مغلوں کے حوالے کیا اور محاصرہ قلعہ اٹھالیا گیا۔ صلح کے بعد عبداللہ قطب شاہ نے اس پہاڑی کے چاروں طرف فصیل اور برج بنوائے یہ حصہ نیا قلعہ کہلاتا ہے۔ موسیٰ برج بھی اسی پہلے محاصرے کے بعد تیار ہوا۔

ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں شہنشاہ اورنگ زیب نے ۲۸/ جنوری ۱۶۸۷ء گولکنڈہ کا از سر نو محاصرہ کیا اس محاصرے میں مغلیہ فوج میں ۱۰۶ بڑی توپیں تھیں اور ساتھ میں ۱۹۰۰ برق انداز، ۱۴۰۰۰ احشام، صف شکن خاں میر آتش، غازی الدین خاں فیروز جنگ (پدر نظام الملک آصف جاہ اول) اور شاہ عالم کمان دار تھے۔ طویل محاصرے کے بعد قلعہ فتح نہ ہوسکا۔ لیکن قطب شاہی فوج کے ایک افسر عبداللہ خاں ہی نے اورنگ زیب سے سازش کرلی۔ اور اس کے اشارے سے ۲۱/ ستمبر ۱۶۸۷ء کو رات کے تین بجے فتح دروازہ کی کھڑکی سے مغلیہ فوجیں داخل ہوگئیں۔ اور قلعہ گولکنڈہ پر مغلیہ افواج کا قبضہ ہوگیا۔ تسخیر گولکنڈہ کے بعد ابوالحسن تاناشاہ کو اورنگ زیب نے قلعہ دولت آباد کے چینی محل میں قید کردیا۔

فتح گولکنڈہ کے بعد عالمگیر نے روح اللہ خاں کو پہلا گورنر مقرر کیا۔ اس کے بعد سید بہادر دل خاں، المخاطب جان سپار خاں صوبے دا مقرر ہوئے۔ ۱۷۲۴ء میں شکر کھیڑہ واقع برار کی جنگ کے بعد نواب نظام الملک بہادر آصف جاہ اول کا دکن پر قبضہ ہوا اس کے بعد سے قلعہ گولکنڈہ شاہان آصفیہ کے زیر حکومت رہا۔ مغلوں نے اپنی تاریخ میں اسے "گل کندہ" لکھا ہے۔

دور آصفیہ میں یہ قلعہ جائے امن سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے خاندان پائے گاہ، خاندان سالار جنگ و پیش کار اور دوسرے امرا کے اجدا نے اس میں مکانات تیار کروائے۔

نواب سر آسمان جاہ بہادر نے اس قلعے کی اصلاح کی جانب خاص طور سے توجہ مبذول فرمائی اور اس میں شال بافی کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد ایک ورک شاپ شہر سے قلعہ منتقل کیا گیا جس میں فوجی ضروریات کی بہت سی چیزیں تیا ہوتی تھیں۔ نواب افسر الملک بہادر کی کمان داری میں اس قلعہ کی عمارتوں کی درستی میں خاصی کوششیں کی گئیں۔ اس کے لیے ایک علاحدہ عملہ مقرر ہوا۔ اور "گولکنڈہ بریگیڈ" کے نام سے حسب منظوری نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصف جاہ سادس رسالے پلٹن اور توپ خا قائم کیا گیا۔ فوجی معاملات سے دل چسپی رکھنے والے عموماً اور یورپین سیاح خصوصاً اس قلعے کو نہایت دل چسپی اور غور سے دیکھا کرتے۔

پہلے قلعہ پر جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ مگر نواب افسر الملک بہادر نے اس قاعدے کو توڑ دیا اور ہر شخص کو قلعہ دیکھنے کی اجازت دے دی۔ البتہ بالاحصار، موتی محل اور خاص خاص مکانات میں جانے کے لیے اجازت درکار تھی۔

محکمہ آثار قدیمہ کے ۱۹۱۴ء میں قیام کے بعد قلعہ گولکنڈہ کی درستگی عمل میں آئی اور اب یہ مرکزی محکمہ آثار قدیمہ کے تحت ہے۔

قلعہ گولکنڈہ کی تعلیمی وقعت اس کے خط و خال اور نقش و نگار کی خوب صورتی اس کی بلند دیواروں اور فصیلوں، اس کے ستون او ایوانوں، اس کے سربہ فلک بالاحصار کے میناروں یعنی بلند دیواروں یعنی بہ حیثیت مجموعی اس "قومی میراث" کے بقاء و استحکام اور ان کے احتیاط و صیانت میں آج کے دور میں، ہماری ذمے داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔

گولکنڈہ کے تاریخی آثار کی حالت کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے یوں لکھا ہے۔

"بالاحصار قلعہ محمد نگر اور نیا قلعہ میں سینکڑوں دل چسپیاں اور یادگاریں تاریخی آثار ہیں۔ اور ان سے زیادہ یہ چیزیں قلعہ کی فصیلوں کے باہر دور تک پھیلی ہوئی ہیں لیکن کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہیں۔ مہذب ممالک میں اسلاف کی اس قسم کی بیش بہا یادگاروں کی حفاظت اور ان سے استفادہ کے لیے طرح طرح تدبیریں کی جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں ان امور کی طرف ابھی ابھی توجہ شروع ہوئی ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ گولکنڈہ کے آثار اگر یوروپی ممالک کے قدیم آثار نہیں تو کم از کم برطانوی ہند کے آثار کی طرح محفوظ ہو جائیں گے اور ماہرین فن اور تاریخ دان ان کے متعلق ابنائے وطن کو تفصیلی معلومات سے آگاہ کرتے رہیں گے۔"

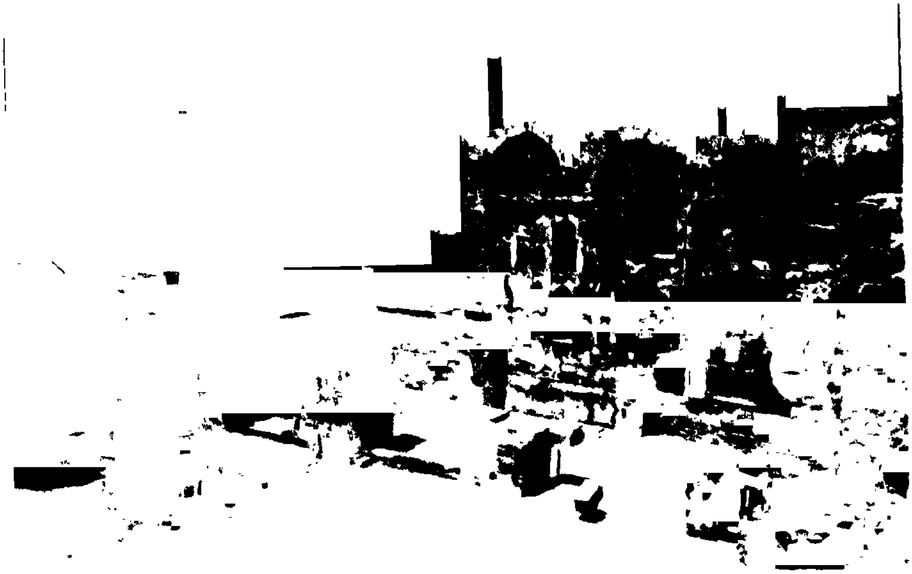
=O=O=O=O=



قلعہ گولکنڈہ کا ایک منظر



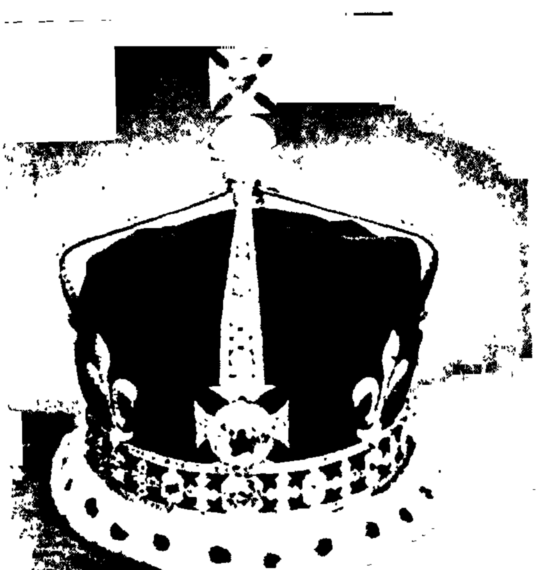
ابراہیم قلی قطب شاہ کا محل



رانی محل کے کھنڈر



قلعہ گولکنڈہ کا باب الداخلہ



کوہ نور ہیرا جو تاج برطانیہ کی زینت ہے (وزن ۱۰۶ قیراط)

موہن پرشاد

قلعہ گولکنڈہ اور گولکنڈے کے ہیرے

قلعہ گولکنڈہ اپنی زندگی کے (۵۰۰) سال مکمل کر رہا ہے یہ شہر حیدر آباد کے جانب مغرب ۱۰ کیلو میٹر پر واقع ہے قلعہ گولکنڈے کا قدیم نام "منگل" ہے جو کاکتیہ حکومت ورنگل کے حدود میں تھا۔ محمد شاہ بہمنی (۱۳۵۸ تا ۱۳۷۵ء) کے دور میں راجہ کرشنا دیو رایا سلطنت کاکتیہ ورنگل نے ۱۳۶۳ء میں ایک معاہدے کے ذریعے یہ قلعہ محمد شاہ بہمنی کے حوالے کر دیا۔ محمد شاہ بہمنی نے اس قلعہ کا نام محمد نگر رکھا۔ جب بہمنی سلطنت کم زور ہو گئی تو سلطنت بہمنی کے ۵ صوبہ دار (گورنر) آزاد ہو گئے اور اپنی اپنی علاحدہ حکومتیں قائم کیں۔ جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ قطب شاہی گولکنڈہ

۲۔ برید شاہی بیدر

۳۔ نظام شاہی احمد نگر

۴۔ عادل شاہی بیجاپور

۵۔ عماد شاہی برار

۱۵۱۸ء میں سلطان قلی صوبہ دار تلنگانہ نے قطب الملک کے لقب سے سلطنت گولکنڈے کی بنیاد ڈالی۔ پہلے گوڑنگل (موجودہ تعلقہ ضلع محبوب نگر) مستقر تھا۔ بعد میں گولکنڈہ دار السلطنت مقرر ہوا۔ قطب الملک کی قائم کردہ سلطنت قطب شاہی نے (۱۷۰) سال (۱۵۱۸ تا ۱۶۸۷ء) حکومت کی اور قلعہ گولکنڈہ میں کئی تعمیری اضافے اور نئے نئے محلات تعمیر کروائے۔ قلعے کی اندرونی دیوار کا محیط ۷ کیلو میٹر ہے۔ سطح زمین سے قلعہ بالاحصار کی اونچائی (۴۰۰) فیٹ ہے۔ قلعے کی بیرونی دیوار کی موٹائی ۱۷ فیٹ سے ۳۴ فیٹ ہے۔ قلعے کے اطراف نیم دائرہ برج جملہ ۸۷ ہیں جن کی اونچائی ۵۰ تا ۶۰ فیٹ ہے جو مختلف قطب شاہی بادشاہوں کے دور میں تعمیر ہوئے۔ قلعے کے ۸ دروازے ہیں جن کے نام فتح دروازہ، بہمنی دروازہ، پٹن چرو دروازہ، بنجارہ دروازہ، جمالی دروازہ، نئے قلعے کا دروازہ اور موتی دروازہ شامل ہیں۔ مغلوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے عبد اللہ قطب شاہ نے قلعے کے شمال مشرق کی جانب نیا قلعہ اور برج بنوایا جو آج بھی محلہ ٹولی چوکی سے نظر آتا ہے۔ اس نئے قلعے میں شہرہ آفاق درخت "ہتھیان کا درخت" موجود ہے اس درخت کے اندر ایک بڑے کمرے کی گنجائش کا حصہ خالی ہے جس کو دیکھنے کے لیے درخت پر چڑھ کر اس حصہ میں اترنا پڑتا ہے اس درخت کے متصل ایک قدیم مسجد آج بھی ہے۔ نئے قلعے میں ۴ بڑے برج ہیں جن کے نام مونالا برج، بہمنی برج، خیرات خانی برج اور نیا برج ہے۔ نیا قلعہ اور قلعہ گولکنڈہ کے راستے میں ایک موتی محل تھا جس میں بعد میں نظام الملک اول اور میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دور میں اضافہ کیا گیا۔ اس میں آصف جاہی بادشاہ قیام بھی کر چکے ہیں بعد میں میر نظام علی خاں ثانی نے محلہ آصف نگر میں ایک محل اور باغ تعمیر کروایا جس کا نام گوہر حسن کا باغ تھا اب یہ آصف نگر کا محل باقی نہ رہا اور آج کل ایک رہائشی کالونی بہ نام زیبا باغ کالونی بن گئی ہے۔ موتی محل کو ۱۹۵۷ء میں منہدم کر دیا گیا جو صرفِ خاص مبارک کی تحویل میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موتی محل میں آزادی ہند سے قبل دیسی ہتھیار بنتے تھے۔

سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں شہرہ آفاق فرانسیسی سیاح ٹیوریر جوہری تاجر ایشیا گزرا ہے جس کا قریب قریب تمام یورپ کی زبانوں کی ان تاریخوں میں ذکر ہوتا ہے جو ایشیا اور ہندستان کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ اس نے اپنی عمر میں ساٹھ ہزار میل کا سفر طے کیا ہے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار میں اس کی رسائی ہوئی اس کے سفرنامے کے ترجمے کے وہ اقتباسات جن کا تعلق سلطنت گولکنڈہ سے ہے اس کا ترجمہ پیش ہے۔

میں ۱۹/ جنوری ۱۶۴۵ء کو براہ مسولی پٹنم (موجودہ ضلع کرشنا) گولکنڈہ گیا ویسے میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ گولکنڈہ جاچکا تھا۔ گولکنڈہ اپنی عام حالات کے لحاظ سے ایک سیراب و شاداب خطہ ہے جہاں قسم قسم کا غلہ، چاول، بھینس، گائے، بیل بھیڑ، بکری اور طرح طرح کے پرندے اور بہت سی اجناس و کرانہ جو عام زندگی کے لیے ضروری ہیں، پیدا ہوتی ہیں۔ چوں کہ تالاب بہ کثرت ہیں اس لیے وہاں مچھلی بھی بافراط ہوتی ہے۔ قلعہ گولکنڈہ کے جانب شمال مغرب ایک بہت ہی قدیم تالاب دورا کا تالاب ہے (یہ دورا کا تالاب آج بھی موجود ہے اور آج کل اس میں سنگاڑے کی کاشت ہوتی ہے۔ مہدی پٹنم سے پٹن چرو روڈ پر جانب شمال موجودہ لیدر ٹکنالوجی (Lidcap) فیکٹری کے متصل سے دورا کا تالاب کا راستہ ہے۔ اسی تالاب سے قلعہ گولکنڈے کے محلات کو مٹی کے بڑے بڑے پائپ سے پانی سربراہ ہوتا تھا۔ آب رسانی کا یہ سسٹم سائفن سسٹم سے مربوط تھا۔ آب رسانی کا انتظام قلعے کے رانی محل میں آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ رانی محل قلعہ گولکنڈہ میں آج کل محکمہ سیاحت حکومت آندھرا پردیش کا ہر روز روشنی اور آواز (Light & Sound) شو ہوتا ہے اور پیر کو یہ شو بند رہتا ہے۔ یہ شو عوام اور خاص کر بیرونی سیاحوں میں کافی مقبول ہورہا ہے۔ قطب شاہی مقبروں کی تعمیر میں اسی تالاب سے پانی لیا جاتا تھا۔ تالاب کے کٹے پر ایک قدیم ترین قطب شاہی مسجد ہے جو شاہ راہ سے نظر آتی ہے)۔

اس حکومت کا صدر مقام بھاگ نگر (موجودہ شہر حیدرآباد) ہے جو موسیٰ ندی کے شمال میں ایک بڑی بستی ہے اس میں تمام تاجر اور ہیروں کے ساہوکار و اہل حرفہ وغیرہ لوگ بستے ہیں (موجودہ بیگم بازار) ہم ہیروں کی خاطر یہاں کے میر جملہ سے ملے تمام جواہرات میں ہیرا سب سے قیمتی جوہر ہے۔ کاروان تو ہیروں کی کی تھوک فروش منڈی ہے جہاں پر ہیرے تول کر فروخت کیے جاتے ہیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ ان کانوں کو دیکھوں جہاں سے یہ ہیرے نکلتے ہیں۔ ہم گولکنڈے کے جنوب میں کرمالک کی طرف چلے۔ ہیروں کی کانیں ان مقامات پر تھیں بلاری، رائے ورگ اور کولار، یہاں کی کانوں سے ہیرے نکال کر میر جملہ کی نگرانی میں گولکنڈہ لائے جاتے تھے۔ جہاں ہیرے پائے جاتے ہیں وہاں کی زمین ریتیلی ہوتی ہے۔ ان چٹانوں میں شگاف ہوتے ہیں۔ ان کانوں کے مزدور ان میں برما لگاتے ہیں اور لوہے کی سلاخوں سے ان میں ہیرے ڈھونڈتے ہیں۔ اس کے بعد ہیروں کو تراشتے ہیں۔ کان کھودنے والے اور ہیروں کو تراشنے والے مزدوروں کی تنخواہ سالانہ صرف تین پگوڈہ (موجودہ ۲۰ روپے)۔ جو سوداگر کان پر جواہرات کی خریدی کو جاتے ہیں وہاں جاکر مکانوں میں قیام کرتے ہیں۔ اور صبح کو ۱۰ بجے سے ۲ بجے تک مکانوں کے مالک اپنے ہیرے ان کو دکھاتے ہیں اور ہیروں کو تول کر فروخت کیا جاتا ہے۔

فرانسیسی سیاح و تاجر ٹیوریر لکھتا ہے کہ ہیروں کو تراشنا اور ان کو پالش کرنے کی صنعت اس نے سب سے پہلے موضع کاروان جو قلعہ گولکنڈہ کے مشرق میں ۳ میل کے فاصلے پر ہے (موجودہ محلہ کارواں ساہو)۔ اس نے دیکھا کہ ساٹھ ہزار (Skilled) فنی مزدور موضع کولار دریائے کرشنا کے کنارے پر کام کرتے تھے۔ شہرہ آفاق بین الاقوامی شہرت یافتہ ہیرا کوہ نور موضع کولار جو سلطنت قطب شاہی کے حدود

میں تھا۔ ۱۶۵۶ء میں یہ جوہری سلطان عبداللہ قطب شاہ میں نکالا گیا۔ میر جملہ وزیر نے کوہ نور ہیرے کو جو اس وقت تک تراشا نہیں گیا تھا، شہنشاہ شاہ جہاں کو تحفتاً پیش کیا اس وقت کوہ نور کا وزن (۷۸۷) کیرٹ تھا۔ دس سال بعد ۱۶۶۵ء میں تیور نیر نے یہ ہیرا اورنگ زیب عالم گیر کے خزانے میں دیکھا۔(بحوالہ Travel in India by Tavernier Page 343)

۱۷۳۹ء میں محمود شاہ دہلی نے نادر شاہ کو نذر کیا تو نادر شاہ اس کوہ نور کو ایران اپنے ساتھ لے گیا۔ نادر شاہ کے انتقال کے بعد ۱۷۴۷ء میں یہ ہیرا اس کے پوتے شاہ رخ کے ہاتھ لگا اور شاہ رخ نے یہ ہیرا احمد شاہ والی کابل کو نذر کیا پھر یہ ہیرا اس کے بڑے لڑکے شاہ زماں کو ملا اس کے بعد اس کے بھائی شاہ شجاع کے ہاتھ لگا۔ ۱۸۱۲ء میں زماں اور شجاع لاہور آکر مہاراجہ سردار رنجیت سنگھ جو پنجاب کا آخری مہاراجہ تھا اس کو پیش کیا۔ ۱۸۳۹ء میں راجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا اس وقت اس کی قیمت ایک ملین اسٹرلنگ تھی۔ ۱۸۴۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب پنجاب پر قبضہ کیا تو کوہ نور لارڈ لارنس کے قبضے میں آیا اور اس نے اس ہیرے کو ملکہ وکٹوریہ انگلستان کو پیش کیا۔ اس وقت کوہ نور کا وزن ۱۰۶ کیرٹ تھا بالآخر یہ حکومت برطانیہ کی ملکیت ہو گئی۔ اور آج یہ موجودہ ملکہ الزبتھ کے تاج کی زینت ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ علم نجوم و ہیئت کے لحاظ سے ہر ہیرا ہر فرد کو راس نہیں آتا کوہ نور ہیرا کسی مرد بادشاہ کو راس نہیں آیا بلکہ خاتون ملکہ کو راس آیا۔ جس مرد بادشاہ یا راجہ نے یہ کوہ نور ہیرا اپنے خزانے میں رکھا اس کی سلطنت نیست و نابود ہو گئی مثلاً عبداللہ قطب شاہ کی سلطنت قطب شاہی کا خاتمہ ہوا۔ جب یہ کوہ نور ہیرا مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے خزانے میں تھا تو مغل سلطنت کو زوال ہوا۔ نادر شاہ کے بعد جب مہاراجہ رنجیت سنگھ والیِ پنجاب کے پاس تھا تو اس کی حکومت پنجاب پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہوا اور اگر کوہ نور کسی خاتون ملکہ کے سر کے تاج کی زینت بنا تو وہ حکومت ہمیشہ شاداب رہی آج کل کوہ نور ملکہ ایلزبتھ انگلستان کے تاج کی زینت ہے جس کی مملکت میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا۔ اس کے علاوہ سلطنت گولکنڈہ کے حدود میں بہ مقام پاک نیل ۱۷۰۱ء میں ایک ہیرا Pitt or Regent نکالا گیا جس کو تراشنے کے بعد اس کا وزن گھٹ کر (۱۳۷) کیرٹ ہوا۔ آج کل یہ ہیرا Apollo Gallary of Louvre The French Museum میں ہے۔ واحد ڈائمنڈ جس کا وزن (۴۴۰) کیرٹ تھا تراشنے کے بعد (۲۷۷) کیرٹ ہوا اور اس کا کوئی ثانی ہیرا آج تک نہ دیکھا گیا۔ ہیرا دائرہ نور جس کا وزن (   ) کیرٹ ہے گولکنڈے کے حدود سے نکلا اور آج کل Pérsia کی ملکیت ہے۔ Hope Diamond یہ ہیرا بلیو ڈائمنڈ کی شکل کا ہے جو ایک قطرہ کے مانند ہے۔ جس کو فرانسیسی سیاح تاجر تیور نیر نے حاصل کیا اور فرانس کے بادشاہ لوئیس XIV کو ۱۶۴۲ء میں فروخت کیا اس کا وزن (۶۷) کیرٹ تھا۔

****

آغا حیدر حسن مرزا دہلوی

قطب شاہی تہذیب و تمدن

قطب شاہی خاندان دو کم ڈیڑھ سو برس کلدار اور جن کو حالی کا حساب یاد ہے ان کے حساب سے دو او پر ڈیڑھ سو برس ہوتے ہیں۔ ۹۲۴ھ میں بانی خاندان سلطان قلی قطب شاہ جو تلنگانہ کا طرف دار تھا گولکنڈے میں خود مختار بن بیٹھا اور چھبیس برس حکومت کر کے محمود ہمدانی کے ہاتھوں نماز پڑھتے ہوئے شہید ہوا۔ اس کے بعد یار قلی جمشید قطب شاہ مسند نشین ہوا۔ اس کا نام باپ ہتیا کے کارن بد نام ہے۔ لگ بھگ سات برس اس نے بھی حکومت کی اس کے بعد اس کا بیٹا سبحان قلی قطب شاہ سات برس کی عمر میں حاکم ہوا اور کچھ دنوں بعد اللہ کو پیارا ہوا۔ جمشید قطب شاہ کا سلسلہ ختم ہوا اس کی نسل میں حکومت نہ چلی۔ "اے سکندر نہ ہی تیری بھی عالمگیری کتنے دن آپ جیا جس لیے دارا مارا۔ ریاست سلطانی قلی قطب شاہ بانی قطب شاہی کے بیٹے ابراہیم قطب شاہ کو ملی۔ بیس برس کی عمر میں مسند سنبھالی۔ اور اکتیس برس حکومت کر کے اکیاون برس کی عمر میں جنت کو سدھارا۔ ابراہیم قطب شاہ کے ۷ بیٹے اور ۱۳ بیٹیاں تھیں۔ اس کی ایک بیٹی ملکہ جہاں اس کے ہم نام ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور سے بیاہی گئی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کی ایک حرم بھاگ رتی تھی۔ اس کے بطن سے محمد قلی قطب شاہ پیدا ہوا۔ سترہ برس کی عمر میں ریاست گولکنڈے کا مالک ہوا۔ اور بتیس برس حکومت کی۔ یہ بادشاہ عشق بازی اور عیش دوستی میں مشہور ہے۔ اس کی چودہ برس کے سن میں بھاگ متی سے عشق عاشقی شروع ہو چکی تھی اور اس کے مبارک نتیجے میں رعایا کو پرانے پل جیسی چیز آمد و رفت کی سہولت کے لیے مل گئی۔ بھاگ متی تو مشتری بن کے چمکی تھی۔ اور پھر حیدر محل خطاب پا کر بھاگ نگر کو حیدر شہر اور حیدر آباد کا نام دیا۔ لیکن ننھی سانولی، کنولی، پیاری، گوری، چھبیلی، لالہ، لالن، موہن، بلقیس زمانی، حاتم، بہمنی ہندو، پدمنی، سندر، سجن، رنگیلی اور جانے کتنی ہوں گی۔ جو سماندھی کا درخت ننھا سا تا سا جائے۔ تو اس کی کیا ان کے آگے چل کر حالت ہو گی۔ تصویر دیکھو تو دبلا پتلا، دھان پان، مخنی سا، مگر دل و دماغ غضب کا پایا تھا۔ فارسی، اردو، تلنگی میں اتنے شعر کہے تھے کہ شاید ہی دنیا کے کسی بادشاہ نے بہادر شاہ ظفر کو چھوڑ کر، اس کے برابر کہے ہیں۔ وہ بادشاہ نہ بھی ہوتا تو اس کا نام اپنے کلام کی بدولت رہتی دنیا تک رہتا۔ بیٹا اس کا کوئی نہ تھا۔ صرف ایک بیٹی حیات بخش بیگم تھی جو حیدر آباد میں ماں صاحب کے نام سے نیک نام ہے۔ اور آج تک اس کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ اس کی شادی محمدؐ قلی قطب شاہ نے اپنے بھائی محمد امین کے فرزند محمد قطب شاہ سے کر دی۔ اور یہی محمد قطب شاہ جو چار سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ بیس برس کی عمر میں گولکنڈے کا مالک ہوا اور پندرہ برس حکومت کر کے راہی فردوس بریں ہوا۔ اس کی ایک بیوی ابراہیم عادل شاہ ثانی کی دختر نیک اختر تھی۔ جس کے بطن سے ابراہیم مرزا پیدا ہوا۔ ایک حرم پیماوتی تھی جو دو بیٹوں علی مرزا اور مرزا کمال کی ماں بنی۔ مرزا عبداللہ حیات بخش بیگم ماں صاحب کے بطن سے تھا اور محمد قطب شاہ کے بعد بارہ برس کی عمر میں حکومت ملی۔ سب سے زیادہ اسی نے قطب شاہی خاندان میں حکومت کی اور ساٹھ برس کی عمر میں دو کم پچاس برس حکومت کر کے وفات پائی۔ اس کی جگہ بھی اس کے داماد ابوالحسن تاناشاہ کو ملی جو اپنی نازک دماغی کے لیے دوست دشمن، دور نزدیک مشہور ہے۔ یہ اٹھائیس برس کی عمر میں خسرو کی گدی کا مالک بنا اور پندرہ برس حکومت کر کے معزول ہوا اور تیرہ برس قید رہا۔ اور حضرت عالمگیر کی وفات سے سات برس پہلے ۱۱۱۱ھ میں خلد کو سدھارا۔ عوام میں مشہور ہے کہ چودہ برس کھیل کود

میں گزارے اور چودہ برس اپنے پیر حضرت شاہ راجو قتال کی خدمت گزاری اور حصول علم میں صرف کیے۔ چودہ برس حکومت کی اور چودہ
برس قید میں کٹے۔ موت کا باعث بھی ایک گھوس کا پاس سے گزر رہا ہے کہ دودھ دہی کی بو کی تاب نہ لاکر اس داغ نے عزیز جان جان آفریں
کے سپرد کی۔ حکومت کا رقبہ موجودہ آندھرا پردیش سے دگنے سے زیادہ ہوگا۔ اڑیسہ، کچھ حصہ مدارس کا اور کچھ کرناٹک اور مرہٹواری کا ان
کے زیر نگیں تھا۔ ملک آباد، رعایا خوش حال، مسافروں اور قافلوں کے لیے ساری حکومت میں سڑکیں بنی۔ جگہ جگہ سرائیں اور ان کے ساتھ
باؤلیاں، باغ اور عبادت خانے۔ انتظام ایسا عمدہ کہ سونا اچھالتے چلے جاؤ اور کوئی یہ نہ پوچھے تمھارے منھ کتنے دانت ہیں۔ اس زمانے کا
ولکنڈہ اور حیدرآباد۔ دنیا کے بڑے اور رونق دار شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ ملک کی حفاظت کے لیے جگہ جگہ موقع سے مضبوط آسمان سے
باتیں کرنے والے قلعے بنے ہوئے۔ عمارت کے فن میں قطب شاہیوں کا ایک الگ انداز ہے۔ ان کی عمارتیں اتنی رفیع الشان ہیں جو ان کی
نعت خیالی پہ دال ہیں۔ ان کی محرابیں بڑے تناسب سے بنی ہیں۔ گنبدوں کی گولائی اور ان کے استوار پنے ایک خاص وضع کی ہے۔ ان کی
یادہ تر عمارتیں سنگ خارا کی ہیں۔ ان پر استرکاری کر کے سنگ پٹھانی کے چونے کی قلعی ہے اور ایسی گھوٹائی کر کے جلا دی گئی ہے کہ سنگ
مرمر کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کے محلوں کی منڈیریں جو ہیں جو ان میں گچ کاری کے کنگورے ایسے بنے ہیں کہ قیتون کا کام ان کے سامنے شرمائے۔
ن کاشی گری کو بھی ان کے سائے میں بڑی ترقی ہوئی۔ ان کے گنبدوں اور شاہی عاشور خانے میں اس کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ سبز، زرد،
ردزی، نیلا اور سفید یہ رنگ کاشی گری میں زیادہ نمایاں۔ افسوس کہ یہ صنعت اب ناپید ہو گئی اور اب کوئی کاشی گر یا کس گر اس ریاست
ں باقی نہیں۔ محلوں میں چھتیں اتنی اونچی ہیں کہ دیکھو تو پگڑی سر سے گر پڑے، دالان در دالان، صحنچیاں، درے، سردریاں، حجرے بڑے
ش قطع۔ پانی محلوں میں جگہ جگہ مٹی کے نلوں سے دوڑتا۔ حوض ہیں، فوارے ہیں، آبشار، جھرنے اور چادریں ہیں۔ آج بجلی کی قوت سے بھی
نے اونچے پر ہم پانی نہیں پہنچا سکتے۔ جہاں انھوں نے بغیر بجلی کے پانی دوڑایا ہے۔ صحت خانے ان کے خود صفا ہیں۔ اس خلش پر ہم نازنہ
یں۔ قطب شاہی اس سے آگاہ تھے۔ حمام موجود ہیں۔ اب سے چار سو برس پہلے کا تصور کیجیے کہ یہ کیا ہوں گے اور کیسی چہل پہل رونق اور
اگرمی ہوگی۔ باغ میں ان کی تختہ بندی، کیاریاں، حوض، نہریں، نشیمن، بارہ دریاں، پھر پھول پھل، زعفران اور نرگس، لالہ، کوکنار،
ب، گل چینی، گل جعفری، گل داؤدی، موتیا، چنبیلی، جوئی، سوسن، چنپا، گل فیرو، گل بنفشہ، گل چاندنی، میووں میں اکروٹ، پستہ بادام،
یل، سیب، ناشپاتی، انگور، انجیر، میووں اور پھولوں کے نام گنائے جائیں جو ان کے زمانے کی مثنویوں میں ملتے ہیں تو ایک دفتر تیار
ائے۔ رعایا کی صحت کے شفاخانے، تعلیم کے لیے عبادت خانے، کثرت جسمانی کے تعلیم خانے، کشادہ سڑکیں، دو طرفہ دکانیں، بازار کا کیا
نا، بادشاہ کو جو شوق ہوتا ہے رعایا اسی پر جان دیتی ہے۔ تقریباً سب ہی بادشاہ سبحان قلی کی ننھی سی جان ہی چل بسی۔ اور وہاں سلطان قلی
ب شاہ شعر کہتے یا ریاست قائم کرتے ان دو کو چھوڑ سب کے سب شاعر تھے ابوالحسن تاناشاہ کے نام سے ایک شعر منسوب کر دیا گیا ہے۔
ں کن کہوں جاؤں کہاں۔ مجھو دل بلکل بکھراٹ ہے۔ ایک باٹ گئے ہوں گے سجن۔ یاں دل ہی بارہ باٹ ہے۔ "کہتے ہیں جہانگیر کے زمانے
شاعر افضل جھنجھانے کا تھا۔ اس کا یہ شعر ہے مگر مشہور تاناشاہ کے نام سے ہی ہے۔ بارہ باٹ ہونا پراگندہ خاطر ہونا۔ اس کے علاوہ میری
ے کسی دکنی نظم میں نہیں گزرا۔ گانے بجانے کا شوق عام تھا۔ جہاں بھاگ متی، تارامتی۔ پیما متی جیسی گائنیں اور رقاصائیں گزری ہوں
ے تو جھاڑ پہاڑ تھرکتے ہوں گے۔ اور دریا سر بھرتے اور تانیں لیتے ہوں گے۔ فنون لطیفہ نے ان کے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ خطاطی،

جیسے گنتی میں دلی، آگرہ، ایران، راجستھان سے گولکنڈہ پیچھے نہیں رہا۔ جو مصورہ قلمی کتابیں قطب شاہیوں کی مل جاتی ہیں ان میں ان کی تصویریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کھیل، چوگان، کھنڈی، پھکڑی اور سینکڑوں اندر و باہر علاوہ کھیل کھیلے جاتے تھے۔ نئے نئے میلے، تیج تہوار کہ معاشرے کی جان ہوتے ہیں۔ جتنا معاشرہ بیدار ہو گا اتنی ہی رونق اور چہل پہل۔ شان و شوکت تہواروں میں ہو گی۔ دربار تو روز کے ہی تھے۔ ہندو مسلمانوں کو دروی کی عید، انبار کی عید، سکھ پیاس عید کے تہوار بھی بڑے اہتمام سے منائے جاتے۔ عید سعدی، عید میلاد النبی، عید میلاد علی، عید منقبت نبی، عید غدیر، شب برات، عید رمضان، بقر عید، نوروز، بسنت سال گرہ، شب معراج، مولاداری، محرم، لنگر، بی بی کا علم، عرس کوہ شریف۔ قطب شاہی علم صنعت کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ آج تک لنگر، بی بی کا علم۔ مولا علی اور لنگم پلی کا میلہ قطب شاہیوں کی یادگار باقی ہے۔ مردوں کا لباس، ازار، نیمہ، جامہ، سر پر گوش پیچ کی دستار، یہ لباس محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے شروع ہوا۔ اس۔ خطے کے حاکم ولایتی لباس، خفتان، قبا، عمامہ، کلاہ، تاج پہنتے۔ اکبر کے زمانے میں میرا خیال ہے کہ دکن سے یہ لباس شمالی ہند کے درباروں میں گیا اور حضرت بہادر شاہ ظفر تک بھی رہا۔ ورنہ خطے چغے اور لٹ پٹی دستار کا رواج تھا۔ جمشید قطب شاہ کا لباس جو عام طور پر تصویروں میں دکھایا گیا ہے۔ وہ تصویریں اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی ہیں۔ جامے کے اوپر چادرا، شال، دوشالہ بھی اوڑھا جاتا تھا اور فرجی اور نیمہ آستین کا بھی رواج تھا۔ دستاروں میں کلغی ہوتی۔ گلے میں کنٹھے۔ بازوؤں پر بازو بند، جوشن، ہاتھوں میں سمرن، انگلیوں میں انگوٹھیاں، پاؤں میں کفش، ہاتھوں میں ڈھونگ یا فرنگ، کمر میں پٹکا جس میں جمدھر یا کٹار اڑسی ہوئی۔ عورتیں عطر تیل پھلیل میں بسی طرح طرح کے بال بنے، چوٹیاں، گندھی، یا جوڑے بندھے، زلفیں چھٹیں، مانگ میں موتیوں کی لڑ، ماتھے پر جڑاؤ ٹیکا، سر پر لیس پھول، چاند سورج، لیس جال، چوٹیوں پر جڑاؤ چوٹی، ہندو فرقوں کے قشقہ لگا۔ کانوں میں بالے، بالیاں، جھمکے، جھلے، کرن پھول آویزے، در، گلے میں کلی، ہنگی، گلوبند، طرح طرح کے کھنٹے، ہار، نو سرہار، موہن مالا، حمائل، بدھی، تعویذ ناد علی۔ انگلیوں میں انگشتریاں، چھلے، گھول، ہاتھوں میں چوڑیاں، کنگن، کڑے، پہنچیاں، دست بند، سمرن، بازوؤں پر نورتن، بازو بند، بل ڈنڈ، بیج بند، جوشن اک رنگے، کمر میں سونے کا یا جڑاؤ پٹکا، پاؤں میں کڑے، خلخال، پازیب، گھنگرو۔ پاؤں کی انگلیوں میں چٹکی، چھلے بہت سے گہنے تلنگانے کے ہیں۔ اور ان کے نام بھی تلنگی میں کفش۔ زربفت، کم خواب، مشروع، اطلس کے چست سیدھی موری کے پاجامے، پاجامے پر بغیر کری کا پشواز، ململ یا آب رواں کی۔ جامدانی کی موسم کے رنگوں میں رنگی۔ پشواز چالیس پچاس پاٹ سے لے کر اسی پاٹ تک کی ہوتی۔ اور کرتوئی میں چنٹ دے کر پاٹوں کو کرسی لی جاتی۔ کری ماپ کے برابر کرتوئی ہوتی۔ جس کے دونوں سروں پر مضبوط ریشم کی ڈوریاں، ساری کبھی زر آمیز تکی ہوتیں اس پاجامے کے نیفے پر باندھ کر اوپر ریشمی یا کارچوبی۔ یا جو ابر لگا پٹکا باندھ لیا جاتا۔ پٹکا بارہ گز سے لے کر چھ گز تک ہوتا اور آدھ گز سے کچھ زیادہ عرض ہوتا۔ اس کے دو پلو برابر گز گز بھر لمبے لٹکتے چھوڑ دیے جاتے۔ اور باقی کمر میں چاروں طرف سے کس کر لپیٹ لیا جاتا۔ جسم میں چوا ہوتی۔ جس کی پشت کا پارچہ ثابوت ہوتا۔ اور مونڈھے ہوتے آدھے بازو تک چست آستین اور جہاں ہندوستانی محرم کی چڑیا ہوتی۔ وہاں گر دے کر چولی کے پارچے باندھ لیے جاتے۔ دوپٹہ سر پر اوڑھ لیا جاتا۔ یہ چار ساڑھے چار گز لمبا ہوتا۔ کبھی اس کا ایک پلو نیفے میں اڑس کر ا کاتی مار کر اوڑھ لیا جاتا۔ جاڑوں میں سمور، سنجاب، قاقم کا بھی رواج تھا۔ عبداللہ قلی قطب شاہ کی چھ ہزار سہیلیاں تھیں۔ یوں کہو۔ یہ ماما ئیں

ں خود مختیں، دارو غنیں، جوتیاں، مٹھائیاں تنبول خانے والیاں، عطر خانے والیاں، آب دار خانے والیاں، حمام کروانے والیاں، توشک
ے والیاں، خاصے والیاں، نعمت خانے والیاں، پوشاک پہنانے والیاں، سواری اٹھانے والیاں ہوں گی۔ ہر صنعت کے کاری گر موجود تھے۔
یہ، پیتل، سونے، چاندی، جلت جوش اور پتھر کے برتن بنتے۔ سونے چاندی کے اور جڑاؤ زیور بنتے تھے۔ سینے کا کام اچھا ہوتا تھا۔ علاقہ سے
رے اور جڑیں ڈالنے میں کمال دکھاتے تھے۔ کاغذ چین اور ایران سے آتا اور یہاں بھی بنتا۔ روشنائیاں یہاں تیار ہوتیں۔ ہتھیار بھی یہاں
ت عمدہ فولاد کے تیار ہوتے توپوں میں یہاں بہت اضافہ ہوئی۔ اور ان کی طاقت میں ترقی ہوئی۔ پھٹنے والے گولے تیار ہوئے اور مشین گنوں
، ملی جلتی توپیں بنیں۔ زراعت اور باغبانی کے لیے تالابیں بنائے گئے۔ رسل و رسائل کا بھی اچھا انتظام تھا کہ بیویاں اپنے جنگجو شوہروں
لڑائی کے میدانوں میں خط بھیج کر دشمن سے لڑنے کا اور ملک کی حفاظت کرنے کا جوش دلاتیں۔ فن پارچہ بافی اور طباعی، نے بھی خوب
ی کی۔ آداب محفل سے سب واقف تھے۔ آئین دربار سب پر عیاں تھا۔ غرض یورپ سے اس زمانے کی یہ دکنی ریاستیں، تہذیب و شائستگی
بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ امریکہ تو اس وقت کسی شمار قطار میں نہ تھا۔

○ ○ ○

پروفیسر احمد اللہ خان

قطب شاہی نظام عدل

کسی بھی دور حکومت کے حسن و قبح کے جائزے کے لیے درکار مختلف عوامل و علامات میں نظام عدل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ نظام عدل کا تعلق صرف انصاف رسانی سے ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد امن و امان کا انصرام بھی ہوتا ہے۔ جس کے بغیر کوئی بھی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ سرزمین دکن پر شہر حیدرآباد کی بنیاد قائم کرنے والے سلاطین قطب شاہی کے دور حکومت سے متعلق معلومات کا بیش بہا خزانہ اہل حیدرآباد کے لیے ایک سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عہد سے متعلق کئی اہم امور پر لائق محققین کی کاوشیں بے شمار کتابوں کا عنوان بن گئیں۔ قطب شاہی دور کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے قاری کو اس دور سے متعلق سیاسی حالات، طرز حکومت، فوجی انتظامات، عوام کا حال فن تعمیر، فنون لطیفہ، مصوری، داستان عشق و محبت، محلات، باغات، لباس، سکہ، رقص و موسیقی، شعر و شاعری اور مختلف زبانوں کی ترقی وغیرہ جیسے عنوانات پر کماحقہ معلومات حاصل ہو جاتے ہیں اور دا!!! بات یہ ہے کہ کئی اہم عنوانات پر مضامین اور کتابیں، سیاحوں کے سفرناموں، شاہی فرمانوں، مخطوطات، حتیٰ کہ مختلف نظموں اور مثنویوں سے ماخوذ معلومات پر مبنی ہیں۔ لیکن قطب شاہی دور سے متعلق اس عظیم سرمایہ۔ تاریخ و ادب میں نظام عدل کو یا تو سرے سے بیان ہی نہیں کیا گیا یا پھر سرسری بیان کیا گیا ہے جو زیادہ سے زیادہ ایک دو اوراق ہی میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ بلکہ بعض محققین نے تو اس عنوان پر سیر حاصل معلومات آسانی سے دست یاب نہ ہونے کا شکوہ بھی کیا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بات اندھیرے میں امید کی کرن ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ کسی عنوان پر معلومات کی عدم دست یابی اس بات کا اشارہ بھی ہے کہ اس میدان میں ابھی تحقیق کی گنجائش موجود ہے۔

پس منظر

قطب شاہی نظام عدل کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے پس منظر پر نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سلطان قلی قطب شاہ جو ہمدان سے آیا تھا ترکستان کے ایک بڑے شاہی خاندان کی یادگار تھا۔ یہ سمجھنا خلاف قیاس نہیں کہ اس کے دل و دماغ پر ترکستانی سیاست اور معاشرت کے کچھ نہ کچھ تاثرات ضرور رہے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دکن کے تمام طول و عرض میں جہاں اس سلطنت کا پرچم لہراتا تھا بہمنیوں کے گہرے نقوش موجود تھے اور آج بھی ہیں۔ سلطان قلی نے برسوں بہمنی معاشرت اور سیاست میں سانس لی تھی اور جب وہ تلنگانہ کا صوبے دار ہوا تو اس کے سامنے سوائے بہمنی آئین کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی آئین کی اس نے پابندی کی۔ (۱)

دستور العمل

مرزا ابراہیم زبیری کی بساطین السلاطین میں رموز حکومت سے متعلق ایک دستور العمل کا حوالہ بھی ملتا ہے جو تیرہ صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں بیجاپور کے محمد عادل شاہ کے دور سے متعلق حالات درج ہیں۔ محمد عادل شاہ دراصل عبداللہ قطب شاہ کا ہم عصر تھا اس لیے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ان دونوں ہم عصر بادشاہوں کے ہم سر حکومتوں کا دستور العمل ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دستور العمل دراصل بادشاہ وقت کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ بادشاہ عدل و انصاف کو ایک حرف راہ نما کی طرح اپنائے کیوں کہ عوام کا اطمینان ہی دراصل حکومت کو طاقت ور اور شاہی خزانے کو معمور کر دینے کا باعث بنتا ہے۔ (۲) اس دستور العمل میں یہ بھی صراحت کر دی گئی کہ واضح مقدمات کا فیصلہ عدالتوں میں فوراً کر دیا جانا چاہیے اور جو فریق دروغ گوئی سے کام لے اسے سزا دی جائے۔ قاضی، مفتی اور چیف جسٹس کو ان کے حسب شان مشاہرہ دیا جائے۔ ایک جرس عدل بنوائی جائے۔ جس کی زنجیر فریادیوں تک پہنچے اور جرس کی گھنٹی کی آواز بادشاہ کے کانوں تک۔

لیکن اس جرس عدل کے استعمال سے پہلے باضابطہ درخواست متعلقہ دائرہ اختیار کی حامل عدالت میں پیش کی جائے۔

مرکزی نظام عدل

قطب شاہی طرز حکومت میں بھی بادشاہ ہی انتظامیہ اور عدلیہ دونوں شعبوں کا سربراہ ہوا کرتا تھا۔ تاہم ان دونوں شعبہ جات کو علاحدہ علاحدہ وزیروں کے تحت رکھا گیا تھا۔(۳) عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں ایک دلچسپ اضافہ یہ ہوا کہ ایک "مجلس دیوان داری یا پریوی کونسل تشکیل دی گئی تھی جس کی صدارت خود بادشاہ وقت کیا کرتے۔(۴) اور بادشاہی منبع قانون اور اعلیٰ نگران کار انصاف رسائی ہوتے۔

دبیرالملک

گوکہ اس زمانے میں کوئی علاحدہ محکمہ مقننہ یا جدید اصطلاح میں قانون ساز ادارہ تو نہ تھا لیکن پھر بھی سلاطین قطب شاہی نے اپنا یک باضابطہ محکمہ عدل تشکیل دیا تھا۔ بادشاہ ہی منبع قانون ہوا کرتے اور ان کا فرمایا ہوا ہی مستند قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ چناں چہ قطب شاہی دور کے قوانین، قدیم رسم و رواج اور شاہی فرمان پر مشتمل تھے۔ چناں چہ شاہی فرمان کو ضبط تحریر میں لاکر محفوظ کرلینے کی ذمہ داری اس ہدے دار کے تفویض کی گئی جس کو دبیرالملک کہا جاتا تھا۔ دبیرالملک جس کو جدید اصطلاح میں سکریٹری کہا جاتا ہے، شاہی فرمان کو نہ صرف لھ لیا کرتے بلکہ اس کا اعلان اور تشہیر و اشاعت بھی کرتے۔ لیکن یہ تحریر شدہ فرمان اسی وقت قانونی حیثیت اختیار کرتے جب ان پر باضابطہ ماہی مہر ثبت کردی جاتی۔

یوان انشاء

دبیرالملک کا دفتر دیوان انشاء کہلاتا تھا۔ دبیرالملک رعایا کی درخواستیں وصول کرتے تھے اور ان کو سلطان کی خدمت میں پیش دیتے تھے۔ خواجہ مظفر علی اور مولانا اویس علی الترتیب سلطان محمد اور عبداللہ قطب شاہ کے دور میں اس خدمت پر مامور تھے۔

رمان ہندوی

شاہی فرمان دولسانی ہوا کرتے اور مسلم و ہندو رعایا کی سہولت کا خاطران فرمانوں کو فارسی کے ساتھ ساتھ تلگو زبان میں بھی شائع کیا تا تھا۔ چناں چہ اعتماد راؤ ایک ایسے ہی قابل تلگو داں تھے جو شاہی فرمان کو تلگو زبان میں قلم بند کرتے تھے۔ ایسے تلگو فرمانوں کو "فرمان دی" کہا جاتا تھا۔ دبیرالملک کے مددگار کی حیثیت سے "شروح نویس" کا تقرر بھی عمل میں لایا گیا تھا۔(۵) اس کے علاوہ ایک اور عہدے "ناظر" کہلاتا تھا۔

ر

جو عوامی اخلاق پر نظر رکھا کرتا اور قانون کی خلاف ورزی اور نقض امن سے متعلق معاملات کی تحقیق اس کی ذمہ داری تھی۔ غالب اور میر قاسم مشہور ناظر گزرے ہیں جو علی الترتیب محمد قلی اور عبداللہ قطب شاہ کے دور میں یہ کام انجام دیا کرتے تھے۔

ال

کوتوال کا عہدہ نظام عدل گستری میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ویسے تو کوتوال شہر کی حفاظت اور امن و امان کی برقراری کا راست دار سمجھا جاتا تھا لیکن اس عہدے سے متعلق مشہور فرانسیسی سیاح موسیو تھیونو یوں رقم طراز ہے کہ "بھاگیہ نگر میں کئی پولیس آفیسر اور ئی عہدے دار تھے مگر سب سے اہم کوتوال ہے۔ یہ نہ صرف شہر کا حاکم ہے بلکہ چیف کمشنر، ماسٹر آف دی منٹ، اور بعض دیوانی و فوج معاملات میں شہر کا سپریم جج بھی ہے۔(۶)

کوتوال کو بحیثیت جج بیان کیے جانے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قطب شاہی نظام عدل گستری کی ذمہ داری بعض دیوانی اور فوج

داری معاملات میں کوتوال کو بھی سونپی گئی تھی۔ موسیو تھیونو کی طرح ایک دوسرا فرانسیسی سیاح موسیو برنیئر نے بھی محکمہ پولیس کی بابت اپنے
میں تعریف بیان کی ہے۔(۷)

ضلعی سطح پر نظام عدل

قطب شاہی دور میں ساری ریاست کئی ضلعوں میں تقسیم کی گئی تھی اور ہر ضلع کے لیے ایک "طرف دار" مقرر کیا گیا تھا۔ طرف د
کی اصطلاح بھی ہم معنی اصطلاح ہے۔ مقامی سطح پر مقرر کردہ عہدے دار "فوج دار" کہلائے جاتے تھے۔ اور امن و امان کی برقراری میں اس فو
دار کی مدد حوال دار کیا کرتے تھے۔ ضلعی سطح پر حکومت کے قوانین یا شاہی فرمان کی تشہیر کے لیے "خطیب" مقرر کیے جاتے تھے۔ دکن
سلاطین عموماً مقامی انتظامیہ میں دخل اندازی نہیں کیا کرتے تھے۔ اور ضلعی سطح پر انصاف رسانی کا کام مقامی پنچایت کے سپرد تھا۔

پنچایت

یہ پنچایت مقامی افراد میں سے منتخب شدہ افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔ اگر کوئی تنازعہ ہندو رعایا کے مذہبی معاملات سے ہوتا تو ا
تنازعات کو سرکاری عہدے دار "برہما سبھا" یا "جاتی سبھا" سے رجوع کر دیتے تھے۔ برہما سبھا ایسے قابل برہمنوں پر مشتمل ہوتی جو مذ
معلومات کے ماہر ہوتے اور اگر کوئی تنازعہ کسی خاص فرقہ یا Castel سے متعلق ہوتا تو اس کو "جاتی سبھا" سے رجوع کر دیا جاتا جو اسی ذا
یا فرقے کے لوگوں پر مشتمل ہوتی جس سے تنازعہ کا تعلق ہوتا۔(۸)

پرسنل لا کا نفاذ

سلاطین قطب شاہی کا اہم فرض شریعت کا تحفظ اور ریاست میں اس شریعت کا نفاذ تھا۔ تحفظ شریعت کے معنی شریعت سے متعل
معلومات کی تشہیر بھی تھا اور یہی مشترکہ فرائض کی عمل آوری نے عدلیہ اور مذہبی امور سے متعلق محکموں کو ایک ہی عہدے دار کے دا
اختیار کے تحت کر دیا تھا۔ اور یہ عہدے دار صدر الصدور کہلائے گئے۔ صدر الصدور کا یہ فرض تھا کہ وہ شریعت کا گہرا علم رکھنے والے قابل ا
دیانت دار قاضیوں کا ریاست بھر میں تقرر کرے اور ان کے ذریعے عدل رسانی کو یقینی بنائے۔(۹)

ہندو پرسنل لا کا نفاذ

لیکن اس کے باوجود قطب شاہی نظام عدل کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ سلاطین قطب شاہی نے کبھی بھی اپنی غیر مسلم رعایا
اسلامی قانون کو مسلط نہیں کیا اور خاص طور پر اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ ہندو رعایا کے شادی بیاہ اور وراثت سے متعلق یا دیگر مذ
تنازعات کا فیصلہ ان ہی کے ہندو پرسنل لا کے تحت کیا جائے۔ اور اس غرض سے ریاست بھر میں پنڈتوں کا تقرر کیا گیا تھا۔(۱۰) جیسا کہ
بھی بیان کیا جا چکا ہے، اگر ضلعی سطح پر ایسے مقدمات پیش ہوتے جن کا تعلق ہندو پرسنل لا سے ہوتا تو ایسے مقدمات کو "برہما سبھا" یا "
سبھا" سے رجوع کر دیا جاتا تاکہ وہ اپنے اپنے پرسنل لا اور رسم و رواج کے مطابق فیصلہ کریں۔(۱۱)

قانون سازی

قطب شاہی نظام عدل سے متعلق یہ اہم بات ذہن نشین رکھنے کی ضرورت ہے کہ چوں کہ اس زمانے میں شریعت کا نفاذ ہوا کرتا
اس لیے شرعی معاملات کے لیے کسی علاحدہ قانون سازی کی ضرورت لاحق نہیں تھی کیوں کہ شرعی قوانین دوسری صدی ہجری سے ہی اپنی مکم
شکل و صورت میں موجود تھے۔ اگر کوئی ذیلی مسئلہ درپیش ہو جاتا تو اس کے حل کے لیے اس کو مفتی سے رجوع کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہن
پرسنل لا سے متعلق تنازعات متعلقہ پنڈت حل کر دیا کرتے تھے۔ اس لیے قطب شاہی دور میں بڑے پیمانے پر کسی قانون سازی کی ضرور
ہی محسوس نہیں کی گئی۔ البتہ دیگر معاملات میں شاہی فرمان ہی کو قانون کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔

داد محل

قطب شاہی نظام عدل کا بیان مکمل رہ جائے گا اگر خصوصیت کے ساتھ داد محل کا تفصیلی ذکر نہ کیا جائے۔ سلاطین قطب شاہی اپنی انصاف پسندی کے لیے بہت مشہور تھے۔ چناں چہ محمد قلی نے انصاف رسانی کے واحد مقصد سے ایک عالی شان محل تعمیر کروایا۔ جس کا نام داد محل رکھا گیا تھا۔ اور جس میں رعایا کی داد رسی ہوا کرتی تھی۔ "داد محل شاہی محلات کی پشت پر مغرب اور جنوب کی طرف بنایا گیا تھا اور قلعہ گولکنڈہ سے جو سڑک چار مینار کو آتی ہے اس کی طرف اس کا رخ رکھا گیا تھا۔ حیدرآباد کے موجودہ محلے چوک و شاہ گنج و محبوب گنج ہی جگہ قطب شاہی دور میں ایک وسیع میدان تھا جس کے درمیان ایک عالی شان حوض ۸۰ / فٹ طویل اور ۱۲۰ فٹ عریض بنایا گیا تھا۔ داد محل کا رخ اسی میدان اور بازاروں کی طرف رکھا گیا۔ چناں چہ اس کے وسیع ایوانوں کے دروازے اسی طرف کھلتے تھے تاکہ مظلوموں اور آفت رسیدوں کو بلا روک ٹوک بادشاہ کی نظروں کے سامنے پہنچنے میں سہولت ہو اور وہ اعیان و اکابرین و درباریان شاہی کے توسط کے بغیر راست محمد قلی کی بارگاہ میں پہنچ کر اپنا دکھڑا بیان کر سکیں۔ اور بادشاہ اکثر اس بیرونی جھروکے میں بیٹھا رہتا تھا۔ داد محل چار منزلہ تھا اور اس طرح بنایا گیا تھا کہ سامنے سے چار جدا جدا محل نظر آتے تھے۔" (۱۲) لیکن جب بارش اور بجلی گرنے کی وجہ سے یہ محل تباہ ہو گیا تو محمد قلی کے جانشین سلطان محمد نے نہ صرف اس کی مرمت کروائی بلکہ ایک اور محل "امان محل" کے نام سے تعمیر کروایا جو انصاف کی پناہ گاہ بھی جاتی تھی۔

عدل گستری کا آنکھوں دیکھا حال

داد محل میں عدل گستری کے انتظام کا آنکھوں دیکھا حال مشہور فرانسیسی سیاح ٹیورنیر اس طرح بیان کرتا ہے کہ "محل کے جھروکے میں بادشاہ جلوہ افروز ہوتا اور رعایا کو کھلے میدان میں جمع ہونے کی اجازت رہتی تھی۔ ان لوگوں کو ایسی راہ داریوں میں کھڑا کیا جاتا جو میدان میں نصب کردہ کھمبوں سے رسی کو باندھ کر بنائے جاتے تھے۔ سارا میدان تین راہ داریوں میں تقسیم کیا جاتا تھا جن میں عدل و انصاف کے طلب گار عوام اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے۔ کسی کو بھی رسی پھاند کر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ راہ داریاں محل کے جھروکے کے سامنے کھلی چھوڑ دی گئیں تھیں۔ لیکن عوام کو بادشاہ کے سامنے پیش ہونے کے لیے ایک اور رسی سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ جیسے ہی فریادی آگے آتے، وہاں پر متعین ملازم رسی کو ڈھیلا کر دیتے تھے۔ محل کے جھروکے کے نیچے ایک وزیر کھڑا رہتا اور جب پانچ یا چھ عرضیاں جمع ہو جاتیں تو وہ وزیر ان عرضیوں کو ایک ایسی تھیلی میں رکھ دیتا تھا جس کو اوپر سے نیچے چھوڑا جاتا تھا۔ بادشاہ کے قریب ایک خواجہ سرا کھڑا رہتا جو ان عرضیوں کو جمع کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔" (۱۳) اور اس طرح مصیبت زدہ رعایا راست بادشاہ سے انصاف حاصل کیا کرتے تھے۔

نظام عدل سے متعلق ایک فرمان

قطب شاہی نظام عدل سے متعلق کئی فرمان اور وقائع نویس کے روزنامچے موجود ہیں لیکن ان میں سے ایک بہ طور نمونہ پیش خدمت ہے جس کے مطالعے سے اس دور کے نظام عدل کی سرعت عمل واضح ہو جاتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ فرمان مورخہ ۵ / نومبر ۱۵۹۳ء ایک تنازعہ کے فیصلے سے متعلق ہے:

> "عبدالکریم مرحوم کے فرزندوں نے محمد قلی قطب شاہ کی خدمت میں اس مضمون کا شکایتی معروضہ پیش کیا کہ موضع کاچریڈ پلی پرگنہ ٹیلچور میں ان کے والد کی ایک چاور انعامی زمین اور زرخیز باؤلیاں موجود ہیں۔ باؤلیوں کی خریدی سے متعلق ان کے پاس دستاویز ہے جس پر شریعت پناہ قاضی جمال الدین کی مہر ثبت ہے۔ اب یہ موضع کارکنان مقاسا کے حوالے ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ اس انعامی زمین اور زرخرید باؤلیوں پر مزاحمت کر رہے ہیں۔ ان واقعات کے اظہار کے ساتھ استدعا کی گئی کہ کاری گران مقاسا کی اس بے جا مداخلت کا انسداد فرمایا جائے۔

اس معروضے پر پرگنہ ملیچ رلوور دیسائیوں (دیسپانڈی کی جمع) کے نام حکم عالی صادر ہوا کہ وہ کاری گران علاقہ کو تاکید کریں کہ وہ عبد الکریم مرحوم کی اضافی زمین اور زر خرید باؤلیوں پر بے جا مزاحمت سے باز آئیں اور احکام کی تعمیل کریں۔" زیر بحث فرمان سنٹرل ریکارڈ آفس میں محفوظ ہے۔(۱۴)

نظام عدل سے متعلق ایک روزنامچہ اور چند واقعات

اورنگ زیب کے متعین کردہ وقائع نویس جو گولکنڈہ کے حالات اور صحیح واقعات سے اورنگ زیب کو مطلع کیا کرتے تھے ان کے روزنامچوں سے بھی قطب شاہی نظام عدل کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ایسا ہی ایک روزنامچہ بطور نمونہ پیش خدمت ہے:

" روزنامچہ وقائع بلدہ حیدرآباد مورخہ ۲۱/ اپریل ۱۶۶۲ء کے ذریعے وقائع نویس نے اس واقعے کی اطلاع اورنگ زیب کو دی کہ ہمن ریڈی سمنولو ملازم سلطان عبد اللہ قطب شاہ نے رپورٹ کی کہ میر احمد کے نوکر نارائن نے اس سے ۲۴ ہزار ہون بہ طور رشوت لیے ہیں۔ جس پر بادشاہ نے اس سے رقم واپس حاصل کرنے کے اور اس کو خدمت سے برطرف کرنے احکام صادر فرمائے۔ نارائن کے مالک میر احمد نے اس سے بیس ہزار ہون حاصل کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ جس پر بادشاہ نے نارائن کا قصور معاف کر دیا اور ساتھ ہی ملازمت بحال کر دی۔" (۱۵)

یہ خبر اسی دن کے اخبار میں بھی شائع ہوئی تھی جس کا حوالہ اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد کی شائع کردہ کتاب کی " News Paper Reports of Deccan " میں موجود ہے۔

قطب شاہی نظام عدل سے متعلق آنکھوں دیکھا حال فرانسیسی سیاح تھیوو نیر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

" چودہ تاریخ کو ہم نائب کے پاس واپسی کی اجازت لینے گئے۔ لیکن اس نے ہم کو کہا کہ وہ چند ملزمین کے مقدمے کی سماعت میں مصروف ہے جن کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ کیوں کہ یہ اس ملک کا دستور تھا کہ ملزم کو کبھی جیل میں نہیں ڈالتے تھے بلکہ جیسے ہی مجرم کو گرفتار کیا جاتا اس کے مقدمے کی سماعت کی جاتی اور جرم کے مطابق اس کو سزا دی جاتی جس کا نفاذ فوراً کر دیا جاتا۔ اگر ملزم بے گناہ ثابت ہو جائے تو اس کو فوراً رہا کر دیا جاتا۔ تنازعہ خواہ کسی قسم کا ہو اس کا فیصلہ فوراً کر دیا جاتا۔(۱۶) تھیوو نیر نے اس مقدمے کی سماعت کا طریقہ کار یہ بتایا ہے کہ ملزم کی پیشی پر ملزم کو اچھی طرح پرکھا گیا اور ایک گھنٹے تک نائب نے متعلقہ کاغذوں کا مطالعہ کیا۔ پھر دبیروں سے گفتگو کی گئی اس کے بعد سزا کا اطلاق کیا گیا۔"

فرانسیسی سیاح موسیو تھیونو عبد اللہ قطب شاہ کی انصاف پسندی کی تعریف یوں بیان کرتا ہے کہ: "عبد اللہ ایک منصف مزاج بادشاہ تھے جن کو اپنی عدالتی ذمہ داریوں کا بہت خیال رہتا تھا۔" ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے تھیونو لکھتا ہے کہ ایک امیر نے ایک ساہو کار سے جبر و استبداد کے ذریعے پانچ ہزار ہون حاصل کر لیے۔ جب اس کی اطلاع بادشاہ کو ہوئی تو اس نے اس امیر کو انصاف کے لیے طلب کیا اور مجبور کیا کہ وہ ساہو کار کی رقم واپس کر دے۔(۱۷) صدیقی ایک اور واقعہ ایلچی بیگ سے متعلق بیان کرتے ہیں کہ " ایلچی بیگ نے ایک تاجر سے قرض لی ہوئی رقم نہیں لوٹائی۔ جب تاجر نے اپنی عرضی بادشاہ کی خدمت میں پیش کی تو بادشاہ نے تیس تا چالیس ہزار ہون ایلچی بیگ سے ضبط کیے اور باقی رقم کی ادائی شاہی خزانے سے کی۔" (۱۸)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب کلیات محمد قلی قطب شاہ میں ایک مختصر بیان ایسا بھی ملتا ہے جو قطب شاہی نظام عدل کے ا[illegible] گوشوں کو آشکار کرتا ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ " ایک خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ محمد قلی نے اپنی تمام زندگی میں کسی کو قتل کا حکم

نہیں دیا جاتا اور اگر کبھی ایسا مقدمہ پیش بھی ہوا تو اس کو دارالقضاء کے سپرد کر دیا گیا تاکہ احکام شرع کے مطابق وہاں سے تصفیہ کرو یا جائے۔

اس اہم اندراج سے تین نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ محمد قلی نے کبھی سنگین مقدمات کا تصفیہ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا اور قانون کی بالاتری کا احترام کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ محمد قلی ایسے مقدمات کا تصفیہ احکام شرع کے مطابق کرواتا تھا یعنی شریعت کا نفاذ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس اندراج سے دارالقضاء کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے۔

کسی بھی نظام عدل کا تنقیدی جائزہ کئی عناصر و عوامل پر منحصر ہوتا ہے۔ ان ہی عوامل میں ایک انوکھا مقیاس یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نظام عدل کے اثرات و نتائج کا مطالعہ کیا جائے۔ یعنی نظام عدل کے انصرام کا مقصد ملک میں امن و امان کی برقراری، رعایا کے حقوق کی حفاظت اور ظلم و ناانصافی کا تدارک ہوتا ہے تاکہ ملک میں نراج اور افراتفری پیدا نہ ہو۔ یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ کسی ملک کی ترقی و خوش حالی بہت بڑی حد تک ان عوامل پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لیے نظام عدل کے جو مطلوبہ نتائج و اثرات ہو سکتے ہیں ان نتائج اور اثرات کے مطالعے ہی ایک مقیاس کی طرح استعمال کر کے نظام عدل کے حسن و قبح کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قطب شاہی نظام عدل کو اگر اس معیار پر بھی پرکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام عدل مکمل اور موثر تھا۔ ورنہ قطب شاہی دور میں حیات انسانی کے مختلف گوشوں میں جو کارہائے نمایاں انجام پائے وہ ممکن نہ ہوتے۔ قطب شاہی دور کے کارناموں کی جھلکیاں آج بھی دست یاب ہیں۔ خصوصاً سلاطین قطب شاہی نے مذہبی رواداری، غیر مسلموں کے پرسنل لا کا تحفظ اور خود ان کے پنڈتوں کے ذریعے اس کا نفاذ اور ریاست کے دو طبقات کے درمیان مکمل ہم آہنگی و یک جہتی اور امن و محبت کی مثالیں قائم کیں جس کا اعتراف کئی غیر مسلم محققین اور مصنفین نے بھی کیا ہے۔ جو اس بات کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ قطب شاہی سلاطین نے اپنی رعایا کے سروں پر نہیں بلکہ دلوں پر حکومت کی ہے اور ہر طرح سے مطمئن و خوش حال رعایا کا وجود ہی سلاطین دکن کی انصاف پسندی کی دلیل ہے۔

اختتاماً یہی کہا جاسکتا ہے کہ سرزمین گولکنڈہ صرف کوہ نور ہیرے کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ قطب شاہی نظام عدل کی وجہ سے بھی ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کیوں کہ کوہ نور ہیرے کی چوری تو کی جاسکتی ہے لیکن نظام عدل کے آثار و قرائن سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

عبدالمجید صدیقی، تاریخ گولکنڈہ - ص ۲۵۴

Sherwani, H.K. History of the Qutub Shahi Dynasty pp 191 - 195 -

حسینی، ڈاکٹر ایس - اے - کیو، بہمن شاہ - ص ۱۴۳

Sherwani, H.K. History of Medieval Deccan P. 191 -

تاریخ گولکنڈہ - ص ص ۳۲۲-۳۲۵

Indian Travels of Thenevot and Careri - نیشنل آرکائیوز آف انڈیا - ص ۱۳۵

ٹیورنیر کا سفرنامہ - جلد اول - ص ۱۲۵

History of the Qutub Shahi Dynasty - ص ص ۱۹۱ تا ۱۹۵

بہمن شاہ - ص ۱۴۳

Relations of Golconda - ص ۸۲

ہارون خاں شیروانی سے دیکھو حوالہ ، سلسلہ نشان ۸

زور، ڈاکٹر سید محی الدین قادری، کلیات محمد قلی قطب شاہ - ص ۱۱۲

ٹیورنیر - جلد اول - ص ص ۱۲۵ تا ۱۲۶

سراج الدین علی خاں امیر "محمد قلی قطب شاہ کا ایک غیر مطبوعہ فرمان" نذر محمد قلی قطب شاہ (مرتبہ ڈاکٹر زور) - ص ۱۹۳

Sate Archives of Hyderabad, Firmans and Sanads of the Deccan Sultan (1408-16

Selected Waqai of the Deccan PP. 1660 - 1671 & P 13

Taverniers-Travels in India, Calcutta 1905 PP 223 - 225

ٹیورنیر جلد سوم - ص ۹۴ ۱۸- Abdul Majeed Siddiqui, History of Golconda P. 326 ۱۹- کلیات محمد قلی قطب شاہ - ص ۲۲۴

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

قطب شاہی حکمران اور ان کے فرامین

عہدِ وسطیٰ کے دکن کے نامور مدبر و سیاس اور بہمنی سلطنت کے جلیل القدر وزیر اعظم خواجہ محمود گاواں کا قتل بہمنی سلطنت کے زوال اور انتشار کا نقطہ آغاز تھا۔ خواجہ محمود گاواں کے قتل کے پورے ایک سال بعد بہمنی حکمران محمد شاہ لشکری کے انتقال پر جب اس کے کمسن لڑکے محمود شاہ بہمنی کو حکمران بنایا گیا تو انتشار اور افراتفری میں اضافہ ہوا اور سلطنت بکھرنے لگی۔ چناں چہ بہمنی سلطنت کے مختلف صوبے دار جو اس وقت طرف دار کہلاتے تھے ۱۴۹۰ء میں خود مختار ہوگئے اور اس طرح نظام شاہی، عادل شاہی اور عماد شاہی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ اس وقت تک سلطان قلی کو صوبہ داری کی خدمت تفویض نہیں کی گئی تھی۔ چند سال بعد ۱۴۹۶ء میں اس کی قابل قدر خدمات کے پیشِ نظر محمود شاہ بہمنی نے اسے تلنگانے کا صوبے دار مقرر کیا۔ بہمنی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی جارہی تھی اور حکمران کو بالکل بے دست و پا کر دیا گیا تھا لیکن سلطان قلی آخری وقت تک اپنے مربی اور سرپرست کا وفادار رہا اور اس نے محمود شاہ بہمنی کے مرنے کے بعد ہی ۱۵۱۸ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ سلطان قلی کو جس بہمنی صوبہ تلنگانے کا صوبے دار مقرر کیا گیا تھا وہ صوبہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کے حدود مغرب میں گولکنڈے کے قرب و جوار سے ورنگل تک تھے لیکن سلطان قلی نے اپنے ہی عہد میں قطب شاہی سلطنت کے حدود ورنگل کی سرحد سے مچھلی پٹنم کی بندرگاہ تک پہنچا دیے تھے۔ سلطان قلی کے جانشینوں کے دور میں فتوحات اور سلطنت کی توسیع کا سلسلہ جاری رہا چناں چہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں قطب شاہی سلطنت کے وہی حدود تھے جو آج موجودہ ریاست آندھرا پردیش کے ہیں۔ اس کے علاوہ قطب شاہی سلطنت میں مرہٹی بولنے والوں کا علاقہ بستر اور ریاست ٹامل ناڈو کا تھوڑا سا علاقہ بھی شامل تھا جب کہ تلنگی بولنے والوں کا ضلع کرنول عادل شاہی سلطنت میں شامل تھا۔ اس خاندان کے آٹھ حکمرانوں نے تقریباً پونے دو سو سال تک حکمرانی کی۔ بہمنی سلطنت کے زوال پر دکن میں جو پانچ چھوٹی خود مختار سلطنتیں قائم ہوئی تھیں ان میں قطب شاہی سلطنت کو سب سے آخر میں زوال ہوا جب کہ ۱۶۸۷ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے آخری قطب شاہی حکمران ابوالحسن تاناشاہ کو شکست دے کر قطب شاہی سلطنت کے علاقے کو مغل سلطنت میں ضم کر لیا اور اسے ایک نئے اور علاحدہ مغل صوبے کی حیثیت دی گئی۔

قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی ہمدان سے دکن آیا تھا مگر اس نے اور اس کے جانشینوں نے خود کو یہاں پر اجنبی نہیں سمجھا۔ وہ تلنگانے کی سرزمین کو اپنا وطن اور اسی آب و گل کو اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے تمدن کے ساتھ سرزمین تلنگانے کے مقامی عناصر اور رنگ و مزاج کو باہم ملا کر ایسا تہذیبی امتزاج پیش کیا جو خوب صورت، پائیدار، حقیقی اور موثر تھا اور جس کی روشن جھلکیاں آج بھی جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔

قطب شاہی حکمرانوں نے اپنی سلطنت میں رواداری اور یک جہتی کی اعلیٰ روایات قائم کیں اور تہذیب و تمدن کے بلند پایہ نقوش چھوڑے۔ وہ مذہبی، تہذیبی اور لسانی رواداری کے علم بردار تھے وہ تمام مذاہب اور رنگ و نسل کے لوگوں سے یک ساں برتاؤ کرتے تھے۔ انھوں نے علاقائی اور مقامی لباس، رہن سہن، اور طور طریقوں کو اپنایا۔ قطب شاہی سلطنت میں فارسی سرکاری اور دربار کی زبان تھی جب

کہ دکنی اور تلنگی عوام کی زبانیں تھیں۔ قطب شاہی حکم رانوں نے فارسی زبان کے علاوہ دکنی اور تلنگی زبانوں کی بھی سرپرستی کی۔ اس خاندان کے پانچویں حکم راں محمد قلی قطب شاہ نے جو ایک عظیم مشترکہ تہذیب کا بانی تھا چار سو سال قبل شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی تھی۔ شہر حیدرآباد کا بانی اپنے کھلے ذہن، بے تعصبی اور وسیع المشربی کی وجہ سے ملک کی تاریخ میں ایک روشن مثال ہے۔

قطب شاہی سلطنت تقریباً پونے دو سو سال قائم رہی۔ اس طویل عرصے میں یقیناً سرکاری ریکارڈ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ وجود میں آیا ہوگا۔ حکومت کے نظم و نسق سے متعلق ریکارڈ کے اس ذخیرے کو ایک سرکاری محافظ خانے میں محفوظ رکھا گیا ہوگا لیکن آج قطب شاہی نظم و نسق سے متعلق سرکاری ریکارڈز بالکل دست یاب نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغل حملوں میں اور ۱۶۸۷ء میں مغلوں سے آخری جنگ کے دوران یہ سارے ریکارڈز ضائع ہوگئے۔ اس وقت قطب شاہی عہد کے جو بھی کاغذات دست یاب ہیں وہ تعداد میں بہت کم ہیں۔ قطب شاہی عہد کے کاغذات کے برخلاف قطب شاہی دور کے فارسی مخطوطات کی ایک بڑی تعداد حیدرآباد کی لائبریریوں اور علمی اداروں میں محفوظ ہے۔ قطب شاہی عہد کے کاغذات آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ اور ادارۂ ادبیات اردو میں دست یاب ہیں اس کے علاوہ بعض قطب شاہی عہد کے کاغذات کی نقلیں اس دور کی قلمی کتابوں میں بھی محفوظ ہیں۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ قطب شاہی دور کے جملہ کاغذات کی تعداد لگ بھگ ستر (۷۰) ہے جن میں فرامین کی تعداد ۴۳ ہے۔ ان میں سے بیش تر فرامین آندھرا پردیش آرکائیوز کے فیملی اور پرائیویٹ کلکشنز Collections میں موجود ہیں اور چند فرامین وہ ہیں جو محکمہ مال کے کاغذات کے ساتھ آرکائیوز کو منتقل کیے گئے تھے۔ ان فرامین کو محکمہ مال میں انعامی اتفاقی کارروائیوں کی تحقیقات کے سلسلے میں داخل کیا گیا تھا۔ دراصل یہ فرامین کی وہ کاپیاں ہیں جو متعلقہ افراد کو جاری کی گئی تھیں اور جو ان کے خاندانوں میں محفوظ رہ گئی تھیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ فرامین قطب شاہی عہد کے سرکاری آرکائیوز کا حصہ نہیں ہیں۔

حکم رانِ وقت کی جانب سے صادر کردہ حکم کو فرمان کہا جاتا ہے۔ عہدِ وسطیٰ کے ہندستانی حکم رانوں کی جانب سے صادر کردہ فرامین بنیادی طور پر ایک جیسے ہوتے تھے لیکن طرزِ تحریر، سائز، وضع قطع اور چند دیگر باتوں کی وجہ سے ان میں جزوی اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ بہمنی، عادل شاہی، مغل اور قطب شاہی حکم رانوں کے فرامین کا بغور مطالعہ کرنے سے ان کے مابین پائے جانے والے چند واضح اختلافات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آرکائیوز میں محفوظ قطب شاہی فرامین اپنی صوری اور ظاہری وضع قطع میں مغل فرامین کی طرح دیدہ زیب اور خوب صورت نہیں ہیں اور یہ فرامین مختلف سائز پر مشتمل ہیں۔

آندھرا پردیش آرکائیوز میں محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ کے فرامین موجود ہیں۔ یہ سارے فرامین فارسی زبان میں ہیں اس کے علاوہ ابوالحسن تاناشاہ کے چند فارسی فرامین کے علاحدہ تلنگی تراجم بھی دست یاب ہیں ان فارسی فرامین کا رسم خط یا تو نستعلیق ہے یا شکستہ۔ ان فرامین کے بالکل اوپر (پیشانی پر) ہوالسلطان، یا محمدؐ یا علی مدد وغیرہ درج ہیں۔ اس کے نیچے حکم رانِ وقت کی مہر ثبت ہے۔ بعض فرامین پر حکم رانِ وقت کی مہر کی بجائے اس کے دست خط ثبت ہیں۔ بعض فرامین پر شاہی مہر کے علاوہ عہدے داروں کی مہریں بھی ثبت ہیں۔ ان فرامین پر ثبت کی گئیں شاہی مہریں واضح اور صاف نہیں ہیں جس کی وجہ سے اندرونی عبارت یا سجع کو پڑھنا ممکن نہیں ہے۔ دو تین فرامین میں شاہی مہروں کا اوپری حصہ صاف اور واضح ہے اور اس اوپری حصے میں اللہ، محمدؐ اور علی

ملتا ہے۔ شاہی مہر اور حکم رانوں کے دست خط کے سلسلے میں اگر قطب شاہی فرامین سے مغل فرامین کا تقابل کیا جائے تو دو تین باتوں میں اختلاف نظر آئے گا۔ سب سے واضح فرق یہ ہے کہ مغل حکم رانوں نے فرامین میں کبھی اپنے دست خط نہیں کیے اور مغل فرمان پر شاہی مہر کے ساتھ ہی ساتھ طغرا بھی ثبت کیا گیا ہے۔ قطب شاہی فرمان کے اوپری حصے پر یا محمدؐ یا علی، یا علی مدد وغیرہ جیسے معتقداتی مذہبی الفاظ لکھے جاتے تھے جب کہ مغل فرمان پر ان کے بجائے اللہ اکبر تحریر کیا جاتا تھا۔ آرکائیوز کے کسی بھی قطب شاہی فرمان میں ضمن موجود نہیں ہے۔ کارروائی کی جو تمام تفصیلات پچھلے صفحے پر درج کی جاتی تھیں اسے ضمن کہا جاتا ہے۔ مغل فرامین اور دیگر اہم مغل کاغذات میں ضمن کا ہونا لازمی ہے۔

قطب شاہی فرمان کے متن کی ابتدا لفظ فرمان سے ہوتی ہے۔ لفظ فرمان اور پیشانی پر تحریر کردہ الفاظ ہو السلطان، یا محمدؐ یا علی، یا علی مدد وغیرہ سرخ یا سنہرے رنگ میں ہیں جب کہ فرمان کا تمام متن سیاہ روشنائی میں۔ ان فرامین کی زبان غیر مرصع اور سادہ ہے۔ عام طور پر قطب شاہی فرامین کے اصل متن کی ابتدائی عبارت اس طرح ہے:

"فرمان جہاں مطاع آفتاب ارتفاع از دیوان ہمایوں خلافت مشحون بجانب کارکنان و دیسایاں قریات پنطور چناں شرف اصدار یافت"

جس عہدے دار کی پروانگی میں فرمان جاری کیا جاتا تھا اس عہدے دار کا نام فرمان کے نچلے حصے میں دائیں جانب لکھا جاتا تھا جیسے پروانگی عزت و فضیلت پناہ علامی شیخ محمدؐ خاتون میر جملہ شاہی۔

فرمان کے متن کا اختتام عام طور پر اس طرح کے جملے پر ہوتا ہے:

"بموجب آن عمل نمایند بر حکم فرمان عالی روند۔" متن کے خاتمے پر تاریخ ہجری متن میں درج کی گئی ہے۔ آرکائیوز کے قطب شاہی فرامین میں سے بیش تر فرامین عطیات Grants سے متعلق ہیں۔

آندھرا پردیش آرکائیوز کے قطب شاہی فرامین میں سے تین فرامین کے خلاصے پیش ہیں۔ پہلا فرمان محمد قلی قطب شاہ کا ہے اس فرمان کی تاریخ ۲/ ذی قعدہ ۹۹۱ھ م ۷/ نومبر ۱۵۸۳ء ہے۔ یہ فرمان قطب شاہی سلطنت کے کارکنان کے نام صادر کیا گیا تھا اس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ حسین شاہ نے محمود مشہدی کے ذریعے ۵ گھوڑے فروخت کی غرض سے بھیجے ہیں۔ اس سلسلے میں حکم دیا گیا کہ زکوٰۃ یا کسی اور وجہ کی بنا پر اس سلسلے میں رکاوٹ نہ پیدا کی جائے۔

دوسرا فرمان بھی محمد قلی قطب شاہ کا ہے اور اس کی تاریخ ۶/ ذی الحجہ ۱۰۰۲ھ م ۱۳/ اگست ۱۵۹۴ء ہے یہ فرمان پرگنہ ترری کے کارکنوں کے نام جاری ہوا تھا جس میں انھیں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ موضع پنکر اور مزرع کچن پلی شاہ حسین کو بطور انعام تفویض کیے گئے ہیں جنھیں تمام نوعیت کے محاصل سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ کارکنوں کو حکم دیا گیا کہ وہ آئندہ فرمان کی تجدید کا مطالبہ نہ کریں، تعلیق تیار کر لیں اصل فرمان واپس کر دیں اور فرمان میں جو احکام صادر کیے گئے ہیں ان کی تعمیل کریں۔

تیسرا فرمان مورخہ یکم رمضان ۱۰۷۰ھ م ۱۸/ مئی ۱۶۶۰ء محمد عبداللہ قطب شاہ کا ہے۔ یہ فرمان کیشو رام دیہات کے گمگرنیوں اور قلعہ بھونگیر کے عاملوں کے نام جاری کیا گیا تھا جس کے ذریعے انھیں اطلاع دی گئی تھی کہ سید ولد حسن حوالدار کو کیشو رام دیہات تنخواہ خواصخیل میں دیا گیا ہے۔ اسے محصول کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے مگر ہدایت کی گئی ہے کہ وہ محصول کی رقم اس مسجد کی تعمیر میں صرف

(آگے ص ۲۴۸ پر)

فیاض الدین نظامی

قطب شاہوں کے عہد میں تشکیل شہری اور فن تعمیر

قبل اس کے کہ میں قطب شاہی عالی شان عمارتوں کے دل کش نوک و پلک اور خوبیوں کو بیان کروں اس کی شہری منصوبہ بندی کے خد و خال پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی شکلی یا ٹاؤن پلاننگ قطب شاہوں کے پاکیزہ ذوق سلیم، بے حوصلگی اور دور اندیشی کا ایک زرین کارنامہ ہے۔ دراصل یہ شہر قروں و سطیٰ کی زبردست یادگار ہے۔ جو مدتوں قطب شاہوں کے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ آج بھی ماشاءاللہ یہ خوب صورت اور مبارک شہر آندھراپردیش کی ناک ہے اور اس کی سماجی اور تمدنی تہذیب ایک عظیم گہوارہ ہے۔ اب اس ترقی یافتہ دور میں بھی اس شان و شوکت کا شہر بنانے کی نہ ہمت ہے نہ حوصلہ۔ اگر اس کی خوب صورتی بحال رکھا جائے تو یہی موجودہ زمانے کی بڑی کارگزاری ہوگی۔ چناں چہ آج کل جو (Clean City) کی مہم شروع کی گئی ہے وہ واقعی بڑی ہمت افزا اور قابل ستائش ہے۔ اس موقع پر مجھے وہ یونان حلف یاد آتا ہے جو انھوں نے شہر اتھنز کے متعلق اٹھایا تھا کہ "ہم شہریان اتھنز اپنے بزرگوں کے عطا کیے ہوئے خوب صورت شہر کو ہرگز نہیں بگاڑیں گے۔ بلکہ اس کو بہتر سے بہتر بنائیں گے تاکہ ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو معلوم ہو کہ ہم اپنے بڑوں کے اچھے جانشین تھے۔"

زمانہ قدیم سے گولکنڈہ کو بہ حیثیت دارالسلطنت جو اہمیت حاصل تھی وہ محتاج بیان نہیں البتہ شہر کی منتقلی اور توسیع کے بتدریج مراحل کے متعلق تاریخ بتلاتی ہے کہ قطب شاہ کے عہد میں سلطنت کی راجدھانی صرف گولکنڈہ ہی میں تھی جہاں شہر کے عوام کی آبادی بھی حصار کے اندر تھی۔ لیکن اس میں کشادہ راستوں کے ساتھ حکومت کی عمارتیں، رفاہ عام کی عمارتیں اور بازارات کافی تعداد میں موجود تھے اور عوام کے لیے باغ بغیچے بھی سیر و تفریح کے لیے فراہم کیے گئے تھے۔ لیکن جوں جوں سلطنت کے سیاسی اغراض اور بڑھتی ہوئی سماجی اور بلدی ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا۔ گولکنڈے کی قدیم آبادی اس قدر گنجان ہو چکی تھی کہ حفظانِ صحت کے اعتبار سے شہر تقریباً ناقابل رہائش ہو گیا تھا۔ مزید برآں پڑوسی ریاستوں کے انقلاب اور سیاسی قدر چھوڑنے مہاجرین کو اس امن والے شہر کی طرف متوجہ کیا۔ خصوصاً احمد نگر کی تباہی کے بعد سینکڑوں خاندانوں کا یہاں آکر بس جانا شہر کو اور بھی متاثر کرنے کا باعث ہوا۔ بہ ایں وجہ اطراف و اکناف کے باغات اور کھلے میدان اس کی زد میں آگئے اور من مانے مکانات اور بازارات خود رو طریقے پر قلعہ کے باہر بننے لگے۔ یہاں تک کہ اس کا پھیلاؤ ٹولی چوکی اور کاروان سرائے تک پہنچ گیا اس نازک صورت حال کا اندازہ کرتے ہوئے محمد قلی قطب شاہ جو قدرتی طور پر ایک بیدار مغز، سلیقہ مند اور دور اندیش حکم راں تھا۔ اپنے مدبر اور وزیر اعلیٰ حضرت میر محمد مومن کے زرین مشورے سے موسیٰ کے قریب و جوار میں ایک ایسا پر فضا خوش منظر اور وسیع رقبے کا انتخاب کیا جو نہ صرف صورت حال کے لیے بلکہ آئندہ کی صدیوں میں آنے والی ضروریات کو پورا کر سکے۔

فی الحقیقت تشکیل شہری کے اعتبار سے یہ انتخاب نہایت موزوں ثابت ہوا جس کا فائدہ ہم آج تک اٹھا رہے ہیں۔ موسیٰ ندی کے علاوہ تالابوں، پہاڑوں اور دل کش وادیوں اور سبزہ زاروں سے بھرپور ہونے کی وجہ سے یہاں ایک خوب صورت شہر کے آباد ہونے کے قدرتی وسائل مکمل طور پر موجود تھے۔ یہ عجیب خوش قسمتی کی بات ہے کہ حضرت میر مومن جیسے بلند حوصلہ اور ذوق سلیم رکھنے والے

پایۂ سلطنت موجود تھے۔ جن کا شمار مملکت ایران کے صف اول کے سیاست دانوں اور دانش وروں میں کیا جاتا تھا اور خصوصاً جن کا اعلیٰ ذوقِ تعمیر شاہ عباس کی حکومت میں شہر اصفہان کی تعمیر میں جو ایران کا دار الخلافہ تھا پورا اترا تھا۔ چناں چہ ان کے سب دیرینہ تجربے اس شہر کی داغ بیل کے نکھارنے میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔ بقول، نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول۔ حضرت میر مومن کی دلی آرزو تھی کہ یہ قطب شاہی شہر بھی ایران کے عظیم الشان شہروں کی فکر کا بن جائے۔ قدرت نے اس کو پورا کر دیا۔

تاریخ کی بموجب محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے تقریباً بارہ برس بعد ۱۵۹۰ء م ۹۹۹ھ کی مبارک ساعتوں میں اس کی بنیاد ڈالی گئی اس کا صدر خاکہ قرونِ وسطیٰ کے شہروں کی طرح اس ڈھنگ سے تیار کیا گیا، شہر کے بیچوں بیچ ایک عالی شان یادگاری عمارت ہو اور اس کے چاروں سمت کشادہ راستے ترتیب دیے جائیں اور پھر شاہی محلوں اور امراء کے مکانوں کے علاوہ عوام کے لیے منظقہ واری بستیاں جس میں مدارس، شفاخانے، بازارات، مہمان خانے اور کارخانے نہایت کشادہ راستوں کے ساتھ مربوط کیے جائیں اور سایہ دار درختوں سے آراستہ ہوں۔ اور ہر منطقے کے لیے باغیچے اور تفریح گاہیں بھی فراہم ہوں۔ چناں چہ اس وضع اور قطع سے اس عالی شان شہر کی تعمیر و تشکیل عمل میں آئی۔ جن کی ابتدا چار مینار جیسی لاجواب عمارت سے ہوئی۔ اور خانہ خدا کے لیے اسی کے قرب و جوار میں اونچے مقام پر جگہ فراہم کی گئی۔ جہاں مکہ مسجد جیسی شان دار مسجد تعمیر کی گئی۔ چار مینار کے جانبِ شمال و مغرب عالی شان دولت خانہ عالی بنایا گیا۔ جس کے جلوخانہ میں چاروں سمت چار بلند کمانیں کھڑی کی گئیں اور وسط جلوخانہ میں ایک ہشت پہلو حوض جس کو "سوکا حوض" کہتے ہیں اور جس کی رفتار زمانہ نے سوکھا حوض اور بعد میں "گلزار حوض" کے نام سے شہرت دی، تعمیر کیا گیا۔ دراصل اس حوض کو "سوکا حوض" اس لیے کہا گیا کہ اس میں شہر کی داغ بیل کے صحیح سمت مقرر کرنے کے لیے Bench in ark قائم کیا گیا۔ جو آج بھی اس حوض میں چوکور سیاہ پتھر کی شکل میں چاروں سمت کے نشانوں کے ساتھ موجود ہے۔ دولت خانہ عالی سے گزرنے کے بعد شمال کی جانب لشکریوں۔ حوالداروں اور سلح داروں کے بڑے بڑے ایوان بنائے گئے تھے۔ اور ان سے گزرنے کے بعد متعدد عالی شان محلوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جن میں قابل ذکر چندن محل، گگن محل، نجم محل، ندی محل، حیدر محل، حنا محل، داد محل، خداداد محل اور محل کوہ طور جو اکثر و بیشتر ندی کے کنارے اور اس کے قرب و جوار کے اونچے مقاموں پر تقریباً چھ سات مربع میل کے رقبہ پر ترتیب دیے گئے تھے جن کے نام و نشان باقی نہیں۔ ان کی بلندی اور عالی شان ہونے کا ثبوت شہنشاہ عالم گیر کے اس جملے سے ملتا ہے جب گولکنڈہ کے ختم ہونے کے بعد ان کی نظر "داد محل" پر پڑی تو دریافت فرمایا "این بلند بلند چیست" جب نعمت خان عالی نے عرض کیا کہ "این داد محل است" تو طنزاً فرمایا "آرے شداد محل است" اور غالباً یہ اس کے بعد ہی ختم کر دیا گیا۔ شہر و عمارات کی اس خوش اسلوبی اور عظمت کے مدنظر متعدد نامور مورخین، سیاح اور شعرا جن میں ٹیورنیر (Tavernier) و متھولڈ (Metbold) فرشتہ اور شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد کے مشہور مورخ خافی خاں اور محمد ساقی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ شہر آب و ہوا اور گل و گلزار کی بدولت قدرت کا عجیب و غریب نمونہ ہے کوئی اس کو زمین پر بہشت کا ایک ٹکڑا کہتا ہے۔ بقول سکندر علی وجد:

فضا جاں فضا ذرہ ذرہ حسین ہے ‏ ‏ ‏ ‏ حقیقت میں ملک دکن گل زمیں ہے
بہت خوش نما شہر دیکھے ہیں میں نے ‏ ‏ ‏ ‏ مگر تیرا جادو کہیں بھی نہیں ہے

حضرت میر مومن نے بھی اپنے قصیدہ، جنیت میں فرمایا ہے:

چو صفا ہانا ز نوشد از شاہجہاں عباس شاہ   حیدرآباد از نوشد شہا سلطان قو ...

تشکیل شہر کی اس مختصر داستان کے بعد اب میں قطب شاہی فن کی تعمیری خصوصیات عرض کروں گا۔ جو اپنی جسامت، بلندی اور مضبوطی کے ساتھ ساتھ اپنی خوب صورتی اور لطافت میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان عمارتوں میں، میناروں، کمانوں اور گنبدوں کو نمایاں اور خصوصی حیثیت حاصل ہے اس لیے کہ ان کو شاہی محلوں، رفاہ عام کی عمارتوں، مسجدوں، عاشور خانوں اور شاہی مقبروں میں بہ کثرت استعمال کیا گیا ہے۔ چار مینار کو لیجیے۔ اس کے دو اہم اجزا عمارت ایک سو نوے فٹ بلند فلک بوس مینار اور خوب صورت بلند و بالا ۸۰ فٹ اونچے کمان ہیں ان دونوں میں جو نہایت نپا تلا تناسب اور امتزاج پایا جاتا ہے وہ قطب شاہی فن تعمیر کا ایک حسین کرشمہ ہے اور ساتھ ہی ان کا مناسب نقش و نگار اس کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ اس کے چاروں مینار جن میں اوپر پہنچنے کی سیڑھیاں بھی ہیں جہاں سے شہر کا پورا منظر سامنے آجاتا ہے۔ ہندسی معماری کمال الدین شیرازی نے ان بلند میناروں کو چار حصوں میں نہایت مناسبت سے بانٹ کر تین خوب صورت کنگنوں کو ردکوں اور شہ نشینوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھیلی کمانوں سے مرصع کیا ہے۔ جو بتدریج اونچائی کی مناسبت سے کلس تک پہنچ کر مینار کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ اسی طرح سامنے کے چاروں رخ والی زبردست اسی فٹ اونچی کمانوں پر خوب صورت بالا خانوں اور برآمدوں کی زیبائش نے چاروں رخ کی زینت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

اوپر کی منزل پر پانی کا خزانہ، خوب صورت مسجد اور عاشور خانہ بنایا گیا ہے جس کی بدولت زبردست معرکوں میں بھی یہ عمارت محفوظ رہ سکی۔ کیوں نہ ہو اس فلک بوس عمارت کی تاریخ بھی "یا حافظ" سے نکلتی ہے تعجب ہے کہ یہ جسیم عمارت جو صرف چونے، پتھر اور اینٹ سے تعمیر کی گئی ہے تقریباً چار سو برس سے بغیر کسی نقص کے اپنی جگہ پر تزک و احتشام سے قائم ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس عالی شان عمارت کی نگہہ داشت خاطر خواہ نہیں کی گئی اور نہ ہی اس کے ماحول کو جاذب نظر بنایا گیا۔ بلکہ گذشتہ بیس پچیس برس کے عرصے میں گندی عمارتیں گرد و پیش بنا دی گئیں۔ علاوہ ازیں چاروں مرکزی راستوں پر دکانوں کا بڑھ بڑھ کر آگے ہو جانا نہ صرف راستوں کو تنگ بنا دیا بلکہ چار مینار اور چار کمان کے منظر کو بھی کافی متاثر کیا۔

قطب شاہی عمارتوں کا دوسرا شاہکار مکہ مسجد ہے جس کا شمار اس کی وسعت اور شان کے اعتبار سے ہندوستان کی چند بڑی مساجد میں ہوتا ہے۔ لیکن اس مسجد کی بعض تعمیری خصوصیات ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایشیا کی بڑی بڑی مسجدوں سے بھی نایاب ہیں۔ خصوصاً اس کے اونچے اونچے زبردست کمانوں کی تعمیر میں بڑے بڑے پتھروں کو جو تقریباً چالیس فٹ اونچے ہیں خمیدہ تراشے گئے ہیں تاکہ دو خمیدہ پتھروں سے مل کر کمان تعمیر ہو جائے۔ یہ انوکھی طرز تعمیر ہندوستان اور بیرون ہند میں بھی عنقا ہے۔ مسجد کی مکمل تعمیر صرف گرانائیٹ پتھر سے کی گئی ہے۔ جو نہایت سخت مانا گیا ہے۔ اسی پتھر میں براکٹ، جالیاں اور دیگر نقوش تراشے گئے ہیں۔ لیکن اس شاندار مسجد کے میناروں کو شہنشاہ عالمگیر کے حکم "ہر چہ گیرید مختصر گیرد" کی بناء پر پست کر دیا گیا۔ جس سے مسجد کی شان و شوکت بے حد متاثر ہوئی۔ ورنہ عمارت کی وسعت اور بلندی کی مناسبت سے ان میناروں کی اونچائی چار مینار سے کم نہیں ہوتی۔ بہر صورت اب بھی ہر اعتبار سے یہ نہ صرف قطب شاہی دور کی بلکہ ہندوستان کی ایک منفرد عمارت ہے۔ یہاں بھی مجھے عرض کرنا ہے کہ مکہ مسجد کے ماحول کو کافی

(آگے ص ۱۴۸ پر)



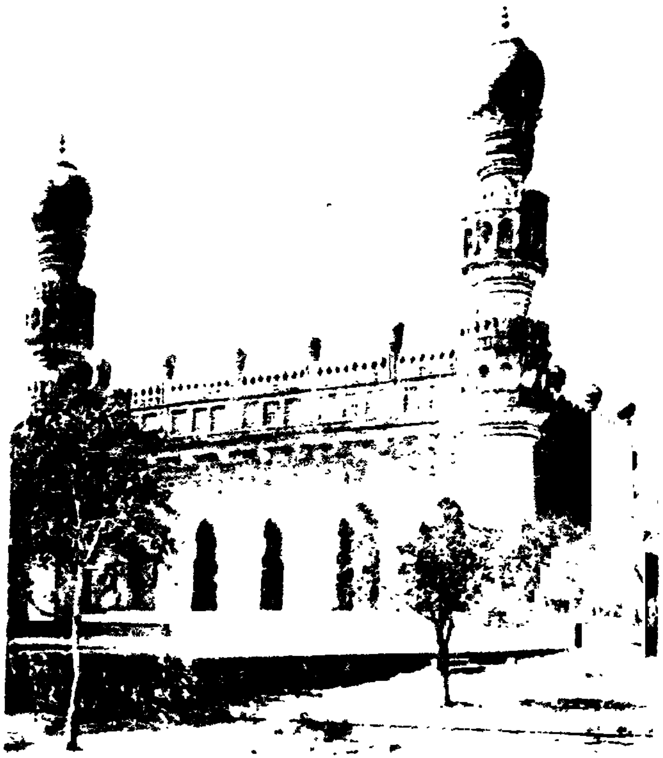
مسجد یک خانہ نگینہ باغ



مسجد تارامتی



مسجد ملا خیالی ۔ نیا قلعہ گولکنڈہ



مسجد کلاں ۔ مقابر شاہان گولکنڈہ

محمد عبدالقیوم

گولکنڈہ کی قطب شاہی مسجدیں

قطب شاہی خاندان کی حکومت اس سرزمین پر قریب دو سو سال یعنی ۹۰۱ھ ۱۴۹۶ء سے ۱۰۹۸ھ م ۱۶۸۷ء تک رہی۔ اس عرصے میں ان حکم رانوں نے یہاں تہذیب و تمدن، تمول و ثروت، علم و فضل اور شعر و سخن کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس پر دکن کی تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ان بادشاہوں نے شیعہ سنی اور مسلمان، ہندو غرض ہر مذہب و ملت کے باشندوں میں ایک مشترکہ کلچر کے پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔

یوں تو قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی کا تعلق اس سرزمین سے ۸۹۸ھ میں پیدا ہو چکا تھا۔ جب وہ تلنگانے کا صوبے دار بنایا گیا تھا۔ لیکن ۹۰۱ھ م ۱۴۹۶ء میں گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف کا علاقہ اس کو بہ طور جاگیر دے دیا گیا تو اس کا نام "محمد نگر" رکھا اور قدیم قلعے کو مستحکم کر کے اس میں متعدد محلات تعمیر کیے۔ اس کے بعد وسیع کرنا شروع کیا۔ چناں چہ بیس بائیس سال کے عرصے میں پانگل، گھن پورہ، کوئل کنڈہ اور ریگندل وغیرہ اس کے قبضے میں آگئے۔ ۹۲۴ھ م ۱۵۱۸ء اس نے قلعے میں بالاحصار کے دامن میں مشہور "جامع مسجد" بنائی۔

سلطان قلی کو فنِ تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ اس نے قلعے کے اطراف ایک عالی شان شہر بنایا۔ دراصل وہی اس طرز کا بانی ہے جو قطب شاہی طرز کہلاتا ہے اور ایرانی، ہندو اور پٹھان طرزِ تعمیر کے امتزاج سے بنایا گیا ہے۔

قطب شاہوں نے اپنے پیچھے، باعظمت، پروقار اور شان دار عمارتوں کا سلسلہ چھوڑا ہے جن کی خوب صورتی عدیم المثال ہے۔ اس زمانے کی فنِ تعمیر کو تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ فوجی فنِ تعمیر مثلاً قلعے کی فصیل، باب الداخلہ، برج وغیرہ

۲۔ شہری فنِ تعمیر جیسے شاہی محلات، امراء کے مکانات، آب رسانی کا انتظام وغیرہ

۳۔ مذہبی فنِ تعمیر جیسے مساجد، منادر، عاشور خانے، درگاہیں، خانقاہیں وغیرہ

میں نے آخری درجہ بندی مذہبی فنِ تعمیر میں قلعہ گولکنڈہ میں تعمیر کردہ قطب شاہی دور کے مساجد کو اپنے مضمون کے لیے انتخاب کیا ہے۔ ان مساجد کے معائنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر عمارت دوسری عمارت سے رقبہ، منصوبہ اور طرزِ تعمیر میں جدا ہے اور اپنے معمار کے مذاق کی آئینہ دار ہے۔

اسلامی فنِ تعمیر میں مسجد ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس کی ابتدا مسجدِ نبوی مدینہ منورہ سے ہوئی۔ ہر قوم نے اپنے عبادت خانوں کے شان و شکوہ اور آرائش میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں عبادت گاہیں اپنے وقت کی دوسری عمارتوں سے زیادہ خوب صورت اور شان دار ہوتی تھیں۔ دکن میں قطب شاہی دور کی ابتدائی عمارتوں میں بہمنی اثر غالب رہا۔ لیکن یہ صورت بہت دنوں نہیں رہی۔ بعد میں مساجد کی تعمیر میں اس علاقہ تلنگانے کی فنِ تعمیر کے اجزا بھی آرائشِ مسجد میں شامل کیے گئے۔ ہندو قدیم زمانے سے مندروں

کی تعمیر میں مشاق تھے۔ خصوصاً سنگ تراشی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ مسلمان دکن میں آئے تو اپنے ساتھ نئی نئی چیزیں لائے۔ اس طرح فنِ تعمیر میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔

۱ سلطان قلی قطب الملک (قطب شاہ اول) کے دور میں تعمیر کردہ مسجدیں:

(۱) مسجد صفا۔ پٹن چرو دروازہ: پٹن چرو دروازہ قلعہ گولکنڈہ کی بیرونی فصیل میں شمال مغربی سمت میں ہے۔ اس کے عقب میں ایک خوب صورت مسجد ابتدائی قطب شاہی طرز کی ہے جس کے صدر دروازے پر قبہ ہے اور اس کا طرزِ تعمیر سلطان قلی قطب الملک کی تعمیر کردہ "جامع مسجد" کے مماثل ہے۔ مسجد کے صحن میں سنگِ خارا کا فرش ہے۔ مسجد کے سامنے کے رخ پر تین کمانیں ہیں۔ قبلہ کی دیوار میں تینوں کمانوں کے وسطی حصے میں خوب صورت کتبے سنگ سیاہ میں ہیں اور ہر کمان میں ایک ایک نہایت خوب صورت محراب سنگ سیاہ میں بنا ہوا ہے۔ مہندس کی یہ فنی مہارت ہے کہ اتنے بڑے طول میں صرف تین تین کمانیں بنائی ہیں اور ان میں ذرا بھی بھدا پن آنے نہیں دیا۔ مسجد کے گوشوں میں مینار نہیں ہیں۔ کمانیں بہمنی طرز کی لگتی ہیں۔

(۲) مسجد یک خانہ۔ نگینہ باغ: یہ مسجد قلعے کے بالا حصار دروازے کے سیدھی جانب نگینہ باغ میں مغربی سمت واقع ہے۔ غالباً اس کی تعمیر سلطان قلی قطب الملک کے ابتدائی دور (بہمنی دورِ حکومت) میں ہوئی۔ اس مسجد میں داخل ہونے کے لیے صرف ایک ہی کمان بنائی گئی ہے۔ کمان پر مخصوص قطب شاہی پھول کی کلی ہے۔ چھت پر چھوٹی سی منڈیر ہے۔ مسجد کے صحن میں مربع نما حوض ہے۔ یہ عمارت بغیر میناروں والی ہے۔

(۳) شاہی محلات کے مغربی سمت واقع مسجد: یہ مسجد گولکنڈے میں جنوب مشرقی سمت میں تعمیر کردہ شاہی محلات کے احاطے کے مغربی سمت میں واقع ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہی محلات میں رہنے والی مستورات کے لیے یہ مخصوص تھی۔ اس مسجد کی تین کمانیں ہیں اور مسجد کے جنوبی سمت میں تین کمان والا ایک دالان بنایا گیا ہے۔ اور یہ مسجد چاروں طرف سے بلند کمانی دار دیوار سے محصور ہے۔ مشرقی سمت کی دیوار میں کمانی دار باب الداخلہ ہے۔

(۴) اسلحہ خانے کے شمال مغرب میں واقع مسجد: یہ مسجد اسلحہ کی سہ منزلہ ایرانی طرزِ تعمیر کی عمارت کے شمال مغربی سمت واقع ہے اس میں بھی تین کمانیں ہیں اور یہ بھی سلطان قلی کے دور کی معلوم ہوتی ہے۔

(۵) لنگر خانے کی مسجد: سلطان قلی نے قلعے کی تعمیر کروانے کے بعد محلات شاہی تعمیر کروائے اور حصار کے باہر پہاڑی کے دامن میں بازارات، مدرسے، لنگر خانے، سرائے وغیرہ تعمیر کروائے اور اس شہر کا نام "محمد نگر" رکھا۔ اسی کے اطراف امرا اور ارکینِ سلطنت نے اپنی سکونت کے لیے عالی شان مکانات بنانا شروع کیے۔

لنگر خانے کے ساتھ جو مسجد تعمیر کرائی گئی تھی وہ آج بھی موجود ہے اور اسے قلعے میں لنگر خانے کی مسجد کہا جاتا ہے اور یہ بالا حصار دروازے سے فتح دروازہ جانے والی سڑک پر واقع ہے۔

اس مسجد کا طرزِ تعمیر ابتدائی دور کا ہے اور تین کمانوں والی مسجد ہے۔ اس مسجد کے گوشوں پر کوئی مینار نہیں ہیں۔

(۶) جامع مسجد قلعہ گولکنڈہ: جامع مسجد، قلعہ گولکنڈہ کے بالا حصار دروازے کے قریب ہے۔ اس مسجد کا نمونہ بہمنی قبہ والی مسجد کے

ونے پر ہے۔ جامع مسجد کے دروازے پر سنگ سیاہ کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے سلطان قلی قطب الملک نے محمود شاہ بہمنی کے دور میں تعمیر کروایا تھا۔ اس مسجد کو مشرقی سمت کے صدر باب الداخلے پر بنایا گیا ہے جو گلبرگہ کی شاہ بازار کی مسجد سے چھوٹا ہے۔ ایک وسیع صحن کے بعد چبوترہ بنایا گیا ہے۔ اس چبوترے سے کچھ اونچا اصل مسجد کا ہال ہے۔ جس میں داخل ہونے کے لیے پانچ کمانیں ہیں۔ مسجد کی چھت پر چھوٹی چھوٹی کمانوں والی (Intersecting Arches) کی منڈیر ہے۔ جن کے شمالی اور جنوبی سمت گوشوں میں چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔ جو بعد میں تعمیر ہونے والی قطب شاہی مساجد میں ہیں۔ یہی چھوٹے مینار/Miniature Minarette مسجدوں کے بلند اور خوب صورت مینار بن گئے ہیں۔

مسجد کے قبلے کی دیوار میں خوب صورت محراب تقریباً دس فیٹ بلند ہے۔ محراب کی اندرونی دیوار میں گلاب کے پھولوں سے نقش و نگار کیا گیا ہے اور وسط میں زنجیر سے لٹکتا ہوا آویزہ ہے جو بہمنی طرز تعمیر کی نقل ہے۔ اسے گلبرگہ اور بیدر کے شاہی مقابر اور مساجد میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی چھت محرابی نما ہے۔ چھت کی مرکزی کمان میں آٹھ پہلو والا تارا اور نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔

جامع مسجد کے شمالی سمت میں سلطان قلی قطب الملک کا تعمیر کردہ عاشور خانہ ہے جہاں آج بھی محرم کے مہینے میں علم ایستادہ کیے جاتے ہیں۔

II ابراہیم قطب شاہ کے دور کی مسجدیں:

۱) اشرفی مسجد: اشرفی مسجد فتح دروازہ اور بالاحصار دروازے کے درمیان سڑک کے کنارے پر واقع ہے جس کے ایک جانب قطب شاہی دور کی خزانہ عامرہ کی عمارت اور دوسری جانب قطب شاہی دور کا "شمشیر کوٹھا" ہے۔ یہ مسجد ابراہیم قطب شاہ کے دور میں تعمیر ہوئی۔

اشرفی مسجد کا صحن مشرق سے مغرب تک (۸۲) فیٹ ہے اور شمال سے جنوب (۷۸) فیٹ ہے۔ مسجد کا دروازہ شمالی جانب ہے۔ مسجد کا ہال ۳۵ فیٹ شمال سے جنوب تک اور بارہ فیٹ مشرق سے مغرب تک ہے۔ اس ہال کے مشرقی سمت تین کمانیں ہیں اور اندرون ہال دندانے دار کمانیں بنائی گئی ہیں۔ روکار کی کمانیں ۱۳ فیٹ بلند ہیں اور دس فیٹ عریض ہیں۔ محراب مسجد میں کتبے ہیں جن میں آیات قرآنی کندہ ہیں۔ ان کتبوں کے کاتب کا نام "محمد" کندہ ہے۔ مسجد کے تین طرف صحن میں سرائے تھی۔

۲) مصطفیٰ خاں کی مسجد۔ نیا قلعہ: ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں جب کہ دکن میں طوائف الملوکی اور خانہ جنگیوں کا دور دورہ تھا تو خان اعظم مصطفیٰ خاں نے بادشاہ کی توجہ دلائی کہ قلعہ گولکنڈہ مضبوط نہیں ہے۔ اطراف و جوانب کی یورشوں سے اس کی تباہی کا اندیشہ ہے۔ اس لیے اس کو مضبوط کرنا چاہیے۔ بادشاہ نے خان اعظم مصطفیٰ خاں کی رائے سے اتفاق کر کے قلعہ گولکنڈہ کی بیرونی فصیل تعمیر کروائی جس میں آٹھ دروازے ہیں۔

اسی خان اعظم مصطفیٰ خاں نے بلند کرسی پر ایک بڑی مسجد بنائی جو عبداللہ قطب شاہ کے دور میں نئے قلعے کے احاطے میں آگئی ہے۔ مسجد اور اس کا صحن شمال سے جنوب تک ۱۲۰ فیٹ اور مشرق سے مغرب تک ۱۳۰ فیٹ ہے۔ صحن مسجد میں تین قبور ہیں۔

مسجد کا ہال شمال سے جنوب تک (۴۲) فیٹ اور مشرق سے جنوب تک (۲۹) فیٹ ہے۔ مسجد کے سامنے کے رخ پر تین کمانیں ہیں۔ ہر ایک کمان (۱۴) فیٹ چھ انچ بلند ہے اور (۱۰) فیٹ چھ انچ عریض ہے۔

اس مسجد سے شمال و جنوب میں دو ہال ۲۱x ۳۰ فیٹ کے ہیں۔ مسجد سے ان ہالوں میں راستہ ہے اور مسجد سے چھت پر جانے کی سیڑھیاں
اس مسجد کی خصوصیت صحن کے تین طرف (۱۰) فیٹ بلند دیوار تراشیدہ پتھروں کی بنی ہوئی ہے۔ جن میں کمانیں بھی تراشی گئی ہیں۔ اور جنوبی دیوار کے درمیان میں مسجد کا دروازہ ہے۔ اس دروازے پر ایک کتبہ ہے۔ جس میں اس مسجد کا سنہ تعمیر ۹۶۹ھ م ۱۵۶۲ء کندہ ہے۔ یہ مسجد قطب شاہی طرز تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔

(۳) ملا خیالی کی مسجد ۔ میا قلعہ : نئے قلعے کے جلالی برج کے قریب ملا خیالی کی مسجد اور مشہور ہتیان کا درخت ہے۔ ملا خیالی ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں مشہور دکنی شاعر تھے۔

اس مسجد کی کرسی (۱۰) فیٹ بلند ہے۔ مسجد پر جانے کے لیے کرسی کے جانب جنوب سیڑھیاں ہیں۔ مسجد کا ہال شمال سے جنوب (۳۶) فیٹ اور شرق سے غرب تک (۱۴) فیٹ ہے۔ غربی دیوار کے درمیان محراب مسجد ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ محراب مسجد میں سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد کے مشہور خوش نویس محمد بن سید صدرالدین کا بنایا ہوا کتبہ بہ خط ثلث تھا۔ مسجد کے اندرونی حصے میں نہایت خوب صورت رنگین نقش بنائے گئے تھے۔ سامنے کے رخ پر تین کمانیں ہیں۔

مسجد ملا خیالی کے سامنے ہتیان کا درخت ہے۔ اس درخت کا پوست ہاتھی کی کھال کے مشابہ ہے۔ اس لیے اس کو ہتیان کا درخت کہتے ہیں۔ اس درخت کے تنے کا دور تقریباً (۹۰) فیٹ ہے۔ زمین سے دس فیٹ بلندی کے بعد اس درخت کے تنے کا حصہ قدرے گنبد نما ہے اور کچھ نیچے تنے میں ایک دریچے کے طور پر بنا ہوا ہے۔ اس دریچے سے اندر جانے کے بعد پیڑ کا اندرونی حصہ زمین تک گیا ہے۔ جس میں ہوا اور روشنی اس دریچے سے آتی ہے۔ اس کھوکھلے حصے کے اندر ایک سو مربع فیٹ مسطح اور صاف زمین ہے۔

(۴) بالاحصار کی مسجد: قلعے کے بالاحصار کے راستے پر ایک چھوٹی سی متناسب مسجد ہے۔ جسے ابراہیم قطب شاہ نے بالاحصار کے ساتھ تعمیر کروایا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس مسجد کو محمد شاہ بہمنی اول (عہد حکومت ۱۳۵۸ تا ۱۳۷۵ء) نے جب چند یوم قلعہ۔ گولکنڈہ میں قیام پذیر تھا یہ مسجد تعمیر کروائی۔ لیکن مسجد کے معائنے سے پتہ چلتا ہے کہ طرز تعمیر قطب شاہی ہے۔

یہ مسجد تین کھلی کمانوں پر مشتمل ہے۔ جن کے شمالی اور جنوبی سمت میں دو مینار بنائے گئے ہیں اور میناروں پر علموں کے پنجوں کے نشان اور آرائش ہے۔ مینار ہشت پہلو ہیں اور کنول کی پتیوں سے سجائے گئے ہیں اور مینار گردش چھت کے اوپر دائرہ نما مینار پر بنائی گئی ہے۔ اور آخر میں چھوٹے سے قبہ کو کنول کی پتیوں سے سجایا گیا ہے اور آخر میں گچ میں تعمیر کردہ کلس ہیں۔ عمارت کا اندرونی حصہ گچ کی کمانوں سے مزین کیا گیا ہے۔ تعمیر میں غالباً یہ پہلی کوشش تھی کہ مسجد کے دونوں جانب اونچے مینار تعمیر کیے گئے۔ چوں کہ یہ مسجد پہاڑی پر تعمیر کی گئی ہے اس لیے دور دور سے نظر آتی ہے۔

III محمد قلی قطب شاہ کی تعمیر کردہ۔ چینی مسجد:

خزانہ بلڈنگ میوزیم گولکنڈہ کے روبرو ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کو محمد قلی قطب شاہ نے اپنے ابتدائی دور حکومت جب کہ سلطنت قطب شاہیہ کا صدر مقام محمد نگر گولکنڈہ تھا تعمیر کروائی۔

چینی مسجد (۱۷) فیٹ شمال سے جنوب تک اور شرق سے غرب تک ۹ فیٹ ہے۔ مسجد کے مشرقی رخ پر تین کمانیں ہیں اور ہر ایک

لمان ۸ فیٹ بلند ہے اور چار فیٹ عریض ہے۔ چوکھٹ دار سنگ سیاہ پر قرآنی آیات کندہ ہیں اور سنہ تعمیر ۱۰۹۷ھ م ۱۶۸۹ء کندہ ہے۔ اس مسجد
یں کار کاشی (رنگین ٹائل) کا کام حال تک تھا۔ اس لیے اس مسجد کا نام چینی مسجد مشہور ہو گیا۔

۱۷ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں تعمیر کردہ مساجد:

۱) ہیرا خانہ کی مسجد: گولکنڈہ ہی وہ مقام ہے جو ان قطب شاہی سلاطین کی وجہ سے لپنے بیش قیمت ہیروں کے لیے تمام عالم میں مشہور
ا۔ مارکو پولو سیاح نے لکھا ہے کہ جو ہرات میں سے کوئی ایسا نہیں جو گولکنڈے میں نہ ملتا ہو۔ کوہِ نور ہیرا جو اس وقت تاجِ برطانیہ میں ہے وہ
ں گولکنڈے کے بادشاہوں کا بیان کیا جاتا ہے اس کے سوا نایاب موتی اور دوسرے ایسے جو ہرات یہاں کے خزانے میں تھے، جو اس زمانے
، دنیا کے کسی بادشاہ کے پاس نہ تھے۔ قطب شاہی حکومت اپنی دولت کے لیے دنیا میں مشہور تھی۔ اس زمانے میں گولکنڈے کا دوسرا نام
یروں کا شہر" تھا۔ اب یہاں ہیرا خانہ کی مسجد باقی رہ گئی ہے۔

مسجد ہیرا خانہ ایک مربع وسیع چار دیواری کے اندر واقع ہے۔ اس کے احاطے کی دیواریں بلند ہیں۔ جن کے آثار میں مسافروں اور
ہ کے لیے حجرے بنے ہوئے تھے۔ غالباً اسی مسجد کے قریب ہیرے تراشنے کے کارخانے تھے۔ اس لیے اس مسجد کا نام ہیرا مسجد یا ہیرا خانے کی
ہد مشہور ہو گیا۔

اس مسجد کی تین کمانیں ہیں اور دو خوب صورت بلند مینار ہیں۔ صحن میں ایک چبوترے پر حوض ہے۔ یہ مسجد سلطان عبداللہ
ب شاہ کے عہد میں ۱۰۷۹ھ م ۱۶۶۸ء میں تعمیر ہوئی تھی جب کہ سلطنت قطب شاہیہ کا دارالحکومت شہر حیدرآباد تھا۔
مسجد کی رو کار کی کمانوں کے اوپر بجائے پتھر پر حروف کندہ کرنے کے لکڑی پر عبارت کندہ ہے جس کا خط فارسی نستعلیق کا بہت ہی
ہ نمونہ ہے۔

مہ:۔

"دین کا شہنشاہ اور پادشاہوں کا قطب جو حاجت مندوں کے لیے فیض کا سرچشمہ ہے (حضرت ابراہیم) خلیل اللہ کی طرح
ایک کعبہ بنایا۔ چاند اور سورج اسی کے ذرے ہیں۔ ایسی فیض رساں بنا یعنی عمارت کے لیے پادشاہ حسین کو منتخب کیا۔
ہاتف نے اس کی بنیاد رکھنے کی تاریخ کہی۔ یہ فیض کا مرکز ہمیشہ قائم رہے۔"
اسی ہیرا خانے کی مسجد کے محراب پر سنگ سیاہ میں خطِ طغرا کا بھی بہترین نمونہ ہے۔ جس پر یہ عبارت کندہ ہے:

مہ:

"بے شک مسجدوں کو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور روز قیامت کا ایمان (عقیدہ) رکھتا ہے۔ نماز قائم کرتا اور زکواۃ دیتا
ہے اور بجز اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتا۔ امید کہ یہی لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔ ز* اس تحریر کو بندہ (خدا)
تقی الدین محمد بن صالح الجبرائی نے ۱۰۷۰ھ میں لکھا۔

مسجد حیات بخش بیگم۔ گنبدانِ قطب شاہی: گولکنڈے کے قطب شاہی مقبروں میں حیات بخش بیگم کے مقبرے سے
، اس نیک بخت ملکہ کی مسجد کلاں ہے۔ دکن کی یہ نامور خاتون ایک بادشاہ کی بیٹی، بادشاہ کی بیوی اور بادشاہ کی ماں تھی، اور ہر حیثیت

سے سلطنت کے انتظام میں دخیل رہی۔ اس مسجد کے طرزِ تعمیر سے حیات بخش بیگم کے تعمیری ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ پوری عمارت پر اعلیٰ قسم کی استرکاری ہے۔ اس میں پانچ درہ دالان در دالان ہے۔ چھت لداؤ کی ہے۔ منڈیر پر خوب صورت کنگورے ہیں جن میں پانچ گلدستے بنے ہوئے ہیں۔ ایوان کے دونوں پہلوؤں پر دو بلند مینار ہیں۔ جن کی برجیوں کے نیچے کنول کی پتیاں اور انناس کے خوب صورت نمونے بنے ہوئے ہیں۔ عمارت کے رو کار پر ہندسی اشکال کی جالیاں ہیں۔ بیرونی محرابوں کی پیشانی پر خوب صورت بیل اور زنجیرے بنے ہوئے ہیں۔ رو کار کی آرائش، میناروں کی گولائی اور محراب کے بانک پن نے عمارت میں رعنائی پیدا کر دی ہے۔ یہ عمارت اس قدر پاکیزہ اور سبک ہے کہ اس میں زمانہ حسن پیدا ہو گیا ہے۔ چاندنی رات میں اسے دیکھتے رہیں تو قلب پر خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

قطب شاہی طرزِ تعمیر:

قبے کا عدم استعمال: قطب شاہی دور میں مسجدیں کثرت سے تعمیر ہوئیں۔ لیکن ان میں قبے کا استعمال نہیں کیا گیا۔ پورے قطب شاہی دور میں قلعہ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں دو ہی ایسی مسجدیں ہیں جن کے داخلی دروازے پر ایک ایک قبہ نظر آتا ہے۔ ایک ان میں سے پٹن چرو دروازے کے پاس کی مسجدِ صفا اور دوسری قلعے کی جامع مسجد ہے۔ اتفاق سے یہ دونوں مسجدیں سلطان قلی قطب الملک کی تعمیر کردہ ہیں۔ اگرچہ بعد میں قطب شاہیوں نے اپنا مستقل تمدن قائم کیا۔ ایک علاحدہ طرزِ تعمیر رائج کیا اور تقریباً دو سو سال کی طویل مدت میں سینکڑوں مسجدیں بنا ڈالیں مگر قبے کا استعمال ایک میں بھی نہیں کیا۔ قبہ سازی عمارت کا سب سے مشکل جز ہے۔

سوائے جامع مسجد قلعہ محمد نگر کے اس کی چھت عماری نما ہے۔ تمام مساجد کی چھتوں میں یکسانیت ہے۔ دیواروں کے گوشوں میں کمانوں کے سروں پر اور پاکھوں کے اطراف چھوٹے بڑے مقعر مثلث ہوتے ہیں جو ہموار سطح کو خوش نما گوصوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ستون بھی ایک ہی طرح کے ہیں چھوٹے ہوں یا بڑے مربع ہی استعمال کیے گئے ہیں۔

قلعہ گولکنڈہ کی جامع مسجد جو سلطان قلی قطب الملک (قطب شاہ اول) بانیِ سلطنت قطب شاہی کی تعمیر کردہ ہے اور مسجدِ صفا جس کے عقب میں قلعے کا مشہور برج پٹلہ برج ہے اور جس پر اورنگ زیب عالم گیر کی مشہور "توپ فتح رہبر" ہے۔ سلطان قلی کی تعمیر کردہ ہے۔

دونوں مسجدوں کی کمانوں کے سرے پر نوک کم اور جھوک بالکل نہیں ہے پاکھے بالکل سیدھے ہیں گوشوں پر خم نہیں کھائے ہیں اور پاکھوں پر مع گوشوں کے صرف ایک ہی حاشیہ ہے۔ جامع مسجد کی رو کار کی کمانوں کے سرے پر ایک ایک چوڑا پھول اور بازو ڈال نما پھول ہے۔ اسی قسم کی کمانیں احاطے کی دیوار میں بھی بنی ہوئی ہیں۔ جس طرح بیدر کے قلعے کی مسجد کو چھجہ نہیں ہے اسے بھی نہیں ہے، اس کے منڈیر کی دیوار بھی ویسی ہی ہے جیسی بیدر کے قلعے کی مسجد کے گوشوں پر بجائے میناروں کے چار چھوٹی چھوٹی برجیاں (جن کو گلدستے کہنا چاہیے) اسی قسم کی ہیں جیسی گلبرگہ اور بیدر میں بہمنی دور کی عمارتوں پر ہوتی ہیں۔ یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ بیدر کے طرزِ تعمیر پر بنی ہیں۔

اسی طرح کٹورا حوض کے مغربی سمت میں تعمیر کردہ چھوٹی سی مسجد ابراہیم قطب شاہ کے دور میں ۹۷۹ھ م ۱۵۷۱ء تعمیر کی گئی ہے۔ اور مسجد بریدی کی کمانیں ترقی یافتہ فیروز شاہی طرز کی ہیں۔ نوک اوپر کو نکلی ہوئی ہے۔ دونوں طرف جھوک دے کر پاکھوں کو بڑی خوبی اور نزاکت سے درمیان میں خم دیتے ہوئے گوشوں پر جھکا دیا ہے۔

قلعہ گولکنڈہ کی اس مسجد کو بریدی کیوں کہتے ہیں اس کی وجہ قابل غور ہے۔ بریدی خاندان بیدر پر برسرِحکومت تھا کسی نہ کسی وجہ سے یہ نسبت اسی کی طرف ہوتی ہے۔ ایک تاریخی روایت ہے کہ امیر برید ثانی نے حیدرآباد میں پناہ لی تھی۔ امیر برید ثانی بریدی خاندان کا سب سے آخری اور نہایت کم زور بادشاہ ہے۔ ایسے بادشاہ جاتے جاتے زر و جواہر بھی اپنے ہم راہ لے جاتے ہیں۔ یہ محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس بے بسی اور جلاوطنی میں حصول ثواب کے خیال نے اس سے یہ مسجد بنوائی جو اب تک گولکنڈے میں بریدی خاندان کی یاد دلاتی ہے۔

قطب شاہی کمان: کمان عمارت کا سب سے اہم جز ہے، کیوں کہ قطب شاہی عمارتوں میں در و دیوار ہر طرف اسی کی کارفرمائی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اس بات کی مہر لگا دیتی ہے کہ یہ عمارت فلاں عہد کی اور فلاں خاندان کی تعمیر کردہ ہے۔

بہمنی طرزِ تعمیر میں بھی اس کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے اور قطب شاہی طرزِ تعمیر میں بھی اس کو وہی اہمیت حاصل ہے۔

قطب شاہی کمانوں کے پاکھے میں نوک بہت زیادہ گہری کی گئی ہے اور نوک کا لحاظ کر کے اس کے نیچے کے جھوک کو (جو دونوں طرف ہوتا ہے) بہت زیادہ لٹکا دیا جاتا ہے۔ جتنا اس جھوک کو لٹکایا ہے اس کے بعد کے پاکھے کے حصے کو اتنا ہی اوپر کو سمیٹا ہے اور پاکھے کی درمیانی گولائی کو بہت زیادہ پیچھے ہٹا کر اور پاکھے کے نچلے حصے کو (گوشوں کو) کہیں سیدھا رکھ کر اور کہیں کچھ خم دے کر لٹکا دیا ہے۔ جس سے کمان کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ کمان میں پاکھے ہی ایک ایسی چیز ہیں جن پر پوری کمان کے حسن کا دار و مدار ہے۔

اگر قطب شاہی طرز کی کمان کا مکمل نمونہ دیکھنا ہو تو گولکنڈے میں پیما متی کی مسجد کی روکار کی کمانوں کو دیکھیے یا شہر حیدرآباد میں مکہ مسجد کی روکار کی کمانوں کو دیکھیے۔

صحن مکہ مسجد میں آصف جاہی مقبروں پر جو کمانیں بنی ہیں (۱۹۲۹ء) وہ اسی طرز کی نقل ہیں۔ لطف تو یہ ہے کہ قطب شاہوں کا دور ختم ہونے کے بعد جب اسی طرز کی نقل کی گئی تو چوں کہ نقل بہت دشوار تھی اس لیے یہ کمان بھدے پن کے انتہائی معیار پر پہنچ گئی جس کی صرف ایک مثال آج گولی گوڑہ کے پاس کی مسجد سنگ ہے جو ۱۸۰۷ء میں تعمیر ہوئی ہے۔

پاکھوں کے حاشیے اور کلغی نما پھول: قطب شاہی کمان کی خوش نمائی میں اس کے پاکھوں اور گوشوں کے حاشیوں کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں سلیقے کے ساتھ استعمال نہ کی جائیں تو کمان میں بھدا پن آجاتا ہے۔

قطب شاہی معماروں نے حاشیوں کا بہت استعمال کیا ہے اور ان کے بیچ میں انناس، مچھلی کانٹے، گھنگھرو اور اسی قسم کے دیگر نقوش کا اضافہ کیا ہے۔

قطب شاہی کمان کے سِرے پر بیچ میں یا پتھر میں ابھرا ہوا ایک پھول بنا ہوا ہے جس کو کلغی نما یا طرہ نما کہہ سکتے ہیں۔ یہ پھول بھی قطب شاہی طرزِ تعمیر کی امتیازی چیز ہے ورنہ ابتدائی دور میں کمانوں کے سروں پر چوڑے چوڑے کنول کے (بیچ میں کھدے ہوئے) پھول ہوتے تھے جیسے کہ مسجد صفا میں ہیں۔

چھجے: قطب شاہی طرز کی ایک اور امتیازی چیز چھجوں کا سیدھا ہونا ہے، چھجے خواہ مسجد کے ہوں یا سرائے کے ہوں یا اور کسی عمارت کے سیدھے ہی ہوں گے۔ سلامی نہ ہوں گے البتہ پانی بہہ جانے کے لیے ان پر بیچ میں سلامی کر دی گئی ہے۔

مینار: جس طرح قطب شاہی کمان اپنی خاص وضع رکھتی ہے اسی طرح قطب شاہی مینار بھی اپنی امتیازی شان میں کسی اور جگہ کے مینار سے نہیں ملتے۔ میناروں میں بھی ایک حد تک بڑی یک سانی ہے اور ایک خاص طرز ان کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ میناروں ہی کو دور سے دیکھ کر آدمی سمجھ جاتا ہے کہ یہ قطب شاہی دور کی یا قطب شاہی طرز پر بنی ہوئی مسجد یا عمارت ہے۔

مینار مساجد میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان کی خوبی اور زشتی، مجموعی حیثیت سے پوری مسجد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ میناروں کی پستی بلندی اور جسامت، اصل عمارت کی پستی و بلندی اور جسامت کے مناسب ہونی چاہیے۔

قطب شاہی دور کے میناروں میں مینار گردشیں مسقف، ضخیم اور متعدد ہیں۔ اس کے علاوہ مینار گردشوں کے درمیانی حصوں کو خا بھی نہیں چھوڑا گیا ہے بلکہ کئی کئی منقش حلقے نیچے اوپر بنائے گئے ہیں۔ اوپر کے لٹو کی خوش نمائی، چند در چند آرائشی حلقے بنائے گئے ہیں، قطب شاہی طرز کا لٹو پیازی شکل کا ہوتا ہے اور اس کے لوازمات اس کے نیچے موج پہنے، انناس کا نقش، گھنگرو کا نقش اور گوناگوں حلقے ہیں

کنگنی کی دیوار: کنگنی کی دیوار قطب شاہی مساجد میں جو اس قدر بلند ہے اس کی ایک یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ چھت پر گنبد نہ ہونے کی و سے میناروں کے درمیان جو خلا محسوس ہوتا ہے اس کی پردہ پوشی کے لیے دیوار کو اتنا بلند کر کے گوناگوں نقوش سے آراستہ کرنا پڑا تاکہ ان نقوش سے لطف اندوزی میں اس درمیانی خلا کو محسوس نہ کرے اور گنبدوں میں اس کی ضرورت غالباً اونچی گردنوں کے چھپانے کے لیے پیش آئی ہے جن پر قبہ قائم ہے۔

(سلسلہ ص ۴۲ سے آگے)

○ ○ ○

رے جسے وہ تعمیر کر رہا ہے۔

اس مضمون کے ابتدائی حصے میں لکھا جا چکا ہے کہ آج قطب شاہی کاغذات کی بہت کم تعداد دست یاب ہے اور جو کاغذات دست یاب ہیں ان میں تحقیق کے نقطہ نظر سے اہم مواد موجود نہیں ہے۔ اگر قطب شاہی دور کے سرکاری کاغذات بشمول فرامین آج دست یاب رہتے تو وہ کاغذات آج ایک بڑی سلطنت کی تاریخ اور اس کے نظم و نسق کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کا بنیادی ماخذ ثابت ہوتے۔

○ ○ ○

(سلسلہ ص ۷۲ سے آگے)

درست کرنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ یہ مقام قلب شہر میں ہونے کی اہمیت رکھتا ہے جہاں اکثر اوقات مختلف ممالک کے سیاح آتے رہتے ہیں۔ میری ناچیز رائے ہے کہ مکہ مسجد اور چار مینار کے درمیان تمام گندی عمارتوں کو حاصل کر کے منہدم کیا جائے اور صرف چمن بندی کی جائے تو یہ نہایت دل فریب منظر ثابت ہوگا۔ علاوہ ازیں مسجد کے اندرونی صحن میں جو شاہی مقبرے ہیں وہ مدتوں سے بغیر کسی عمارت کے تھے کچھ عرصہ قبل اس پر پتھر کی عمارت بنا کر مسجد کے رخ کو کافر متاثر کیا گیا۔ کاش کہ پھر اس کو نکال دیا جائے اور قبور زیر سماں کر دی جائیں تو قلی قطب شاہ کی روح خوش ہوگی۔

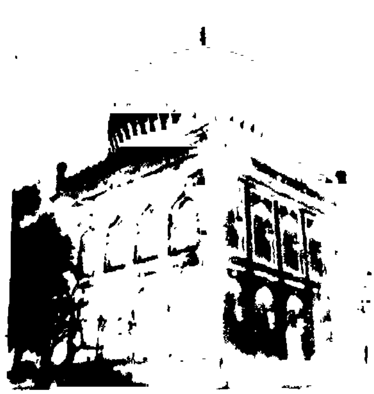
○ ○ ○



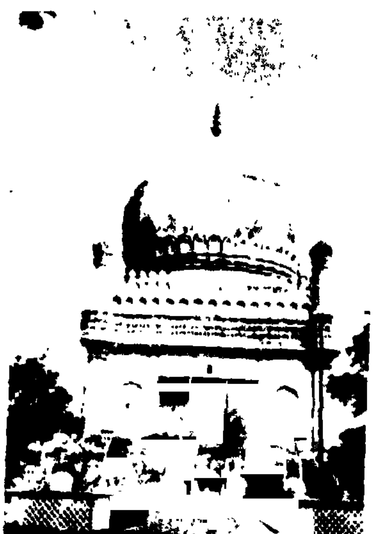
گنبد سلطان قلی قطب الملک



گنبد جمشید قلی قطب شاہ



گنبد ابراہیم قلی قطب شاہ



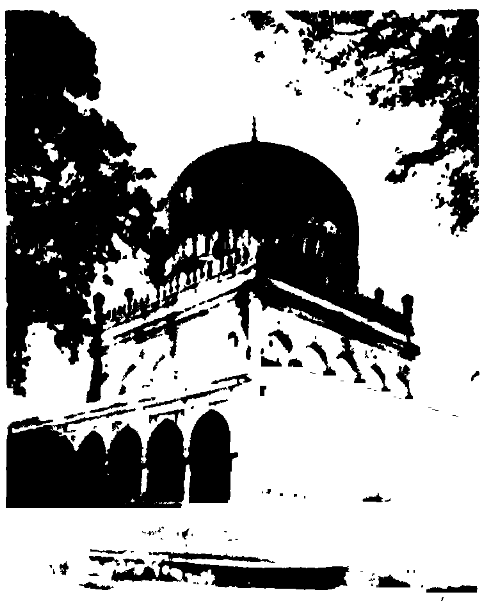
گنبد محمد قلی قطب شاہ



گنبد سلطان محمد قطب شاہ



گنبد عبداللہ قطب شاہ



گنبد حیات بخش بیگم

غلام ربانی

قطب شاہی مقبرے

عمارتیں رہنے سہنے کے لیے بنتی ہیں لیکن مقبرہ ایسی عمارت ہے جو صرف دیکھنے کے لیے بنتی ہے۔ اس کا مقصد بنانے والے کی یادگار قائم کرنا ہوتا ہے اس لیے سارا زور اس کی مضبوطی اور استحکام پر دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مقبرے زیادہ مستحکم ہوتے ہیں۔ گولکنڈے کے شاہی محل، محل سرائیں، ایوانات اور دروازے کھنڈر ہو کر رہ گئے ہیں، لیکن ان ہی بادشاہوں کے مقبرے اچھی حالت میں ہیں۔ ان عالی شان عمارتوں نے کہیں سے جنبش نہیں کھائی ہے۔

دکن میں سب سے پہلا مقبرہ سلطان علاء الدین حسن بہمنی کا ہے جو تغلق طرز پر تعمیر ہوا تھا۔ تغلقی گنبد چپٹے ہوتے تھے، دیکھنے میں اچھے نہیں معلوم ہوتے تھے، ان کے نیچے گردن بھی نظر نہیں آتی تھی۔ گلبرگہ کے معماروں نے گنبد کو بلند کرنے کے لیے اس کا پایہ اونچا کیا اور گنبد کی وضع کو انار نما بنا دیا۔ رفتہ رفتہ ان میں گولائی آتی گئی۔ چناں چہ بعد کے سب گنبد کروی ہیں اور بہمنی طرز ایک مستقل عنوان بن گیا۔ یہی بہمنی طرز گولکنڈہ پہنچا۔ چناں چہ قطب شاہی مقبروں کا نقشہ وہی ہے جو بہمنی مقبروں کا ہے۔ لیکن یہاں ان میں بہت کچھ ترمیم و اصلاح ہوئی اور بعض جدتیں ایسی ہوئیں جن سے عمارتوں میں رعنائی پیدا ہو گئی۔

تلنگانہ خوب صورت مندروں سے مالا مال ہے۔ اس سرزمین کے معماروں نے قطب شاہی مقبروں میں کام کیا، انھوں نے مقبروں کی تعمیر میں وہ چیزیں داخل کر دیں جن کو وہ پشتوں سے مندروں میں بناتے چلے آئے تھے۔ اس وقت تک مقبروں میں نقش و نگار کا رواج نہیں تھا۔ تلنگانے کے کاری گروں نے ان کو بیل بوٹوں اور پھول پتوں سے سجایا۔ یہ نقش و نگار چونے میں اس خوبی سے منبت کیے گئے کہ آخر کار یہی منبت کاری گولکنڈہ طرز کی خصوصیت بن گئی۔

قطب شاہی مقبرے بادی النظر میں ایک سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر ان کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقبروں کا یہ خوب صورت جھرمٹ گولکنڈہ اسٹائل کی ایک کتاب ہے جس سے اس طرز کے ارتقائی مدارج آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔

یہاں سب سے پرانا مقبرہ سلطان قلی قطب شاہ کا ہے جو اس خاندان کا بانی تھا۔ اس مقبرے کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تغلق آباد (دلی) سے غیاث الدین کا مقبرہ لا کر یہاں رکھ دیا گیا ہے۔ دونوں کی دیواریں گاؤدم ہیں۔ مخروطی ہونے کی وجہ سے ان کے کونے کمر کی شکل کے ہو گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دروازے اندر کو دھنسے ہوئے ہیں۔ پوری عمارت میں نقش و نگار کا نام نہیں ہے، حجم میں بھی برابر ہیں۔ وضع میں اس قدر مشابہ ہیں کہ دونوں ایک سانچے میں ڈھلے معلوم ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اس کی کرسی نیچی ہے اور تغلق کے مقبرے کی کرسی بہت بلند ہے۔ (اس مقبرے کا رقبہ ۵۔۹ مربع میٹر ہے اور یہ ۵۔۳۰ مربع میٹر چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اندرونی حصہ ہشت پہلو ہے جب کہ بیرونی حصہ چوگوشہ ہے دیواریں ۶ میٹر اونچی ہیں اور گنبد مزید ۶ میٹر بلند ہے۔ سنگ سیاہ کی لحد پر نسخ میں بطرز توقیع کتبہ کندہ ہے۔ اس گنبد کے اندر تین قبور ہیں۔)

یہ مقبرہ یہاں کے شاہی مقبروں میں سب سے چھوٹا ہے اور قلی قطب شاہ جیسے اولوالعزم سلطان کی آخری آرام گاہ کے لیے شایان شان نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ تمام عمر سلطنت کے استحکام میں لگا رہا، اسے مقبرہ بنانے کی فرصت نہیں ملی۔ یہ مقبرہ اس کے مرنے کے بعد تعمیر ہوا۔

اس کے بعد کے دوسرے فرماں رواؤں نے اپنے اپنے مقبرے اپنی زندگی ہی میں بنوا لیے تھے۔ (سلطان قلی نے ۱۵۴۳ء میں وفات پائی)

اس کے برابر جمشید قلی کا مقبرہ ہے جو قلی قطب شاہ کا بیٹا تھا۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے، اس پر نیچے سے اوپر تک مہین چونے کی استرکاری کی گئی ہے۔ وضع میں ہشت پہل ہے (نیم کروی گنبد کنول کے پتوں سے گھرا ہوا ہے اوپری منزل کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔) اس شکل کا مقبرہ ہندوستان میں کہیں نہیں ہے، البتہ بیجاپور میں حضرت خواجہ امین الدین اعلیٰ شیر خدا کا مقبرہ اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے)۔ (جمشید قلی نے ۲۲ جنوری ۱۵۵۰ء میں وفات پائی۔)

جمشید کے بعد اس کے کم سن بیٹے سبحان قلی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن چند مہینے بعد وہ تاریخ سے اس طرح غائب ہوا کہ اس کی قبر تک کا پتہ نہیں ہے۔ البتہ سلطان قلی قطب کے مقبرے کے برابر ایک چھوٹا سا مقبرہ ہے جو "چھوٹے ملک کا مقبرہ" کہلاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مقبرہ سبحان قلی کا ہو، مگر اس پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔

سبحان قلی کی جگہ اس کا چچا ابراہیم قطب شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کا مقبرہ پہلے دونوں مقبروں سے بڑا ہے اور بیدر کے بہمنی مقبروں کے نمونے پر بنا ہے۔ اس کی دیواروں پر چینی کا کام تھا جو خستہ ہو کر جابجا سے گر گئی ہے۔ لیکن کچھ نقش و نگار اب بھی باقی ہیں۔ (یہ گنبد چوگوشہ عمارت ہے۔ اس میں کچھ فاصلے سے کمانوں کی دو قطاریں ہیں جن سے عمارت کے دو منزلہ ہونے کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ہر کمان کے اوپر چار گوشوں میں چھوٹی چھوٹی کمانوں کا جنگلہ ہے۔ بیرونی حصے بکی کاشی کار اینٹوں سے تزئین کی گئی تھی جس کے آثار اب بھی ملتے ہیں۔ گنبد کا اندرونی حصہ ۹.۵ مربع میٹر ہے لیکن کونوں پر بنی ہوئی چار کمانوں کی وجہ سے اس کی شکل مثمن ہو گئی ہے۔ اوپر کے حصوں کی کمانیں اس کو سولہ پہلو کا بنا دیتی ہیں۔ گنبد کے اندر دو قبور ہیں۔) (ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ۱۵۸۰ء میں ہوا)

اس مقبرے سے گزر کر جب محمد قلی کے مقبرے پر پہنچتے ہیں تو نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ یہ عمارت زیادہ خوب صورت اور شان دار ہے۔ (زمین سے چبوترے کی بلندی ۲۰۲ میٹر ہے۔ پہلا چبوترہ ۶۵.۱۰ مربع میٹر ہے اس کے اوپر ایک اور چبوترہ بنا ہوا ہے جس کا ہر ضلع ہے۔ مقبرہ ۲۲.۵ میٹر اونچا ہے جس کا گنبد ۱۸.۲ میٹر بلند ہے۔) اس کی تعمیر میں چالوکیہ طرز کی خصوصیات موجود ہیں۔ دروازوں کے سامنے جو برآمدے ہیں ان کے ستون ایک ڈال کے پتھر کے ہیں۔ کاکتیائی مندروں میں اسی قسم کے تراشیدہ ستون جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ ستونوں کے سروں پر چار چار توڑے ہیں جن پر سلیں پاٹ کر چھت بنا دی گئی ہے۔ یہ چھتیں چالوکیہ طرز کی ہیں۔ ورنہ اسلامی عمارتوں میں ہر جگہ لداؤ کی چھتیں ہوتی ہیں۔ دیواروں پر سطح سے ابھری ہوئی پٹیاں ہیں جو ایک دوسری کے متوازی چاروں طرف چلی گئی ہیں اس طرح کی نگہیں مندروں میں عام ہیں، کہیں یہ نگہیں افقی ہوتی ہیں، کہیں عمودی، اس مقبرے میں افقی ہیں۔ غرض کہ تراشیدہ ستون، سرول، نگہیں توڑے اور چھجے سب چالوکی طرز کے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان برآمدوں میں کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی مندر میں کھڑا ہے۔

عمارت کے رو کار پر چونے میں نقش و نگار بنائے ہیں جن میں کنول کے پھول پتے، کنول کی کلیاں اور کنول کی پتیاں بنائی گئی ہیں کنول کو ہندو دیو مالا میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مقبرے پر ہندو مسلم طرز تعمیر کا امتزاج بہت نمایاں ہے محراب اور مینار جو خاص اسلامی چیزیں ہیں، اس عمارت میں نمایاں نہیں۔ (اصل قبر سرداب میں ہے جہاں جانے کے لیے راستہ بنا ہوا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء میں وفات پائی۔)

محمد قلی کے کوئی بیٹا نہ تھا، اس کے بعد اس کا بھتیجا محمد قطب شاہ جانشین ہوا۔ ان دنوں دکن میں بڑے مقبرے بنانے کا رواج تھا۔ چناں چہ جتنے بڑے مقبرے دکن میں ہیں، شمالی ہند میں نہیں ہیں محمد قطب شاہ کا مقبرہ بہت بڑا ہے۔ یہ عمارت اندر سے ہشت پہلو اور باہر سے چوکور ہے، جس کے گرد سات سات در کی گیلری چاروں طرف بنی ہوئی ہے۔ اصل عمارت ایک مکعب کی شکل میں ہے، یعنی اس کا طول و عرض اور بلندی سب برابر ہیں۔ (اس کا ہر ضلع ۲۲.۲ میٹر لمبا ہے۔ رواق کی چوڑائی ۶.۲۳ میٹر ہے) چبوترے پر جو عمارت ہے اس کی بلندی گنبد کی بلندی کے برابر ہے۔ اس زمانے میں جتنے بڑے مقبرے پائے جاتے تھے ان میں عموماً یہی تناسب رکھا جاتا تھا۔ عمارت میں شان پیدا کرنے کے لیے گنبد دوہرے بنائے جاتے تھے، یعنی ایک گنبد کے اوپر دوسرا گنبد بناتے تھے اور دونوں کے بیچ میں خلاء ہوتا تھا۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ زائر کسی زاویے سے دیکھے اس کو ایک وقت میں صرف ایک ہی گنبد دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کا دوہرا گنبد سب سے پہلے دلی میں سکندر لودھی کے مقبرے میں بنایا گیا تھا۔ یہ جدت اتنی مقبول ہوئی کہ ملک میں عام طور پر دوہرے گنبد بننے لگے۔ چناں چہ محمد قطب شاہ کے مقبرے کا گنبد بھی دوہرا ہے۔ اس مقبرے کی تعمیر میں بہت بڑے بڑے پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ یہ پتھر ۶ تا ۸ میٹر لمبے ہیں۔ گیلری کے دروں کی پوری محرابیں صرف دو دو پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی ہیں۔ قطب شاہی عمارتوں میں بڑے بڑے پتھروں کا استعمال عام ہے۔ یہ ہماڑ پنتھی طرز تعمیر کا اثر ہے۔ اس عمارت پر شروع میں مینا کاری کی گئی تھی جس کے نشان اب بھی کہیں کہیں باقی ہیں۔ (اس مقبرے میں محمد قلی قطب شاہ کے تین بیٹوں اور تین بیٹیوں کی قبریں ہیں۔ محمد قطب شاہ کا انتقال ۳۱ جنوری ۱۹۲۶ء کو ہوا۔)

اس کے پاس ہی حیات بخش بیگم کا مقبرہ ہے۔ اس خاتون نے بادشاہت تو نہیں کی مگر ایک بادشاہ کی بیٹی، بادشاہ کی بیوی اور بادشاہ کی ماں تھی، اور ہر حیثیت سے ملکی معاملات میں دخیل تھی، اسی لیے اس کا مقبرہ بھی شاہی مقبروں کے برابر بنایا گیا ہے۔ اس کا نقشہ بالکل وہی ہے جو اس کے شوہر سلطان محمد قطب شاہ کے مقبرے کا ہے۔ اس کا گنبد بھی دوہرا ہے، یہ مقبرہ شاہانہ عظمت و شان رکھتا ہے۔ (مقبرے کا چبوترہ زمین سے دو میٹر اونچا ہے۔ اصل عمارت ایک مربع ہال ہے جس کی چھت کے اطراف چھوٹے چھوٹے خوب صورت مینار بنے ہوئے ہیں۔ اس کے اوپر نیم کروی گنبد کنول کی پتیوں کے کٹورے میں بنادیا گیا ہے۔ جس کے اوپر تلنبے کا کلس ہے۔ چبوترہ ۳۰۰ مربع میٹر اور مقبرہ ۱۹ مربع میٹر ہے۔ حیات بخش بیگم عوام میں ماں صاحب کے نام سے مشہور تھیں۔ انھوں نے ۱۶۱۷ء میں وفات پائی۔)

اس شاہی قبرستان میں پچیس مسجدیں ہیں۔ بعض ایک دوسرے سے چند گز کے فاصلے پر ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں اتنی مسجدیں بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ سب غیر آباد ہیں۔ ان میں سب سے بڑی اور خوب صورت مسجد حیات بخش بیگم کی مسجد جلال ہے جو اس کے مقبرے سے متصل ہے۔ اس عمارت سے اس کی تعمیری ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ پوری عمارت پر اعلیٰ قسم کی استرکاری ہے۔ اس [illegible] پانچ دو کا دلان دو دالان ہے منڈیر پر خوب صورت کنگرے ہیں جن میں پانچ گل دستے ہیں۔ دونوں پہلوؤں پر دو بلند مینار ہیں جن کی برجیوں کے نیچے کنول کی پتیاں اور اناناس بنے ہوئے ہیں۔ روکار پر ہندسی اشکال اور جالیاں ہیں۔ بیرونی محرابوں کے بانکپن سے رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ عمارت اس قدر پاکیزہ ہے کہ اس میں زنانہ حسن پیدا ہو گیا ہے۔ چاندنی رات کی خاموشی میں اگر اس کو دیکھتے ہیں تو قلب پر خاص کیفیت طاری ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ حیات بخش بیگم نورانی پوشاک پہنے کھڑی ہے۔

ساتواں بادشاہ عبد اللہ قطب شاہ تھا۔ اس کا مقبرہ بہت بڑا ہے، دو منزلہ عمارت ہے، گنبد بھی دوہرا ہے مگر نشیب میں واقع ہے جس

(آگے ص ۵۹ پر)

ڈاکٹر سیدہ اصفیا کوثر

قطب شاہی دور کی خطاطی

دکن کی آزاد پانچ ریاستوں میں سب سے زیادہ قابل الذکر قطب شاہی سلطنت ہے جس نے نہ صرف قومی یک جہتی اور تہذیب رائج کیا بلکہ ہند آریائی ادب کو بھی مالامال کر دیا۔ کئی شعرا علما اور فن کار انعامات اور ایک بہتر زندگی کی تلاش میں، ایک بڑی تعدا عربستان، ترکستان اور ایران سے بطور مہمان یہاں آئے اور انھوں نے گولکنڈہ اور حیدرآباد کو اپنا دوسرا وطن بنایا۔ اس طرح گولکنڈہ فنون کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہ مقالہ قطب شاہی دور کے اہم عربی مخطوطات اور اس دور کی خطاطی کو اجاگر کرنے کی ایک ناچیز کو ہے۔ اور وہی مخطوطات لیے گئے ہیں جو کہ سالار جنگ میوزیم لائبریری میں موجود ہیں۔

گولکنڈہ اور حیدرآباد کی قطب شاہی حکومت فن خطاطی، نقاشی اور مصوری کی ترقی کے لحاظ سے بے حد اہمیت کی حامل ہے سلطان قلی، بانی سلطنت گولکنڈہ مصوری، خوش نویسی اور فنون لطیفہ کا عظیم سرپرست تھا۔

عربی اور فارسی دکن کی دو زبانیں تھیں جو خط نسخ، ثلث، کوفی، ریحان اور قدیم نستعلیق میں لکھی جاتی تھیں۔ دولت آباد، گلبرگہ، اور بیجاپور تعلیم حاصل کرنے کے اہم مراکز تھے۔ دولت آباد میں کاغذ کی تیاری شروع ہوئی۔ کتبوں کے لیے "خط پیچاں" اپنایا گیا۔ صوفی بادشاہوں، شعرا اور ادیبوں نے فارسی زبان اور اس کے رسم الخط کی ایک مضبوط بنیاد رکھی۔

بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈے کی قطب شاہی حکومت نے سترھویں صدی عیسوی کے اختتام تک علوم و فنون کی سرپرستی کی

گولکنڈہ اور حیدرآباد کے قطب شاہی حکمرانوں کے فنون لطیفہ اور خطاطی کو ایک نئی روح بخشی۔ اس سلطنت کا بانی سلطا قطب الملک خود بھی ایک اچھا خطاط تھا۔ اس کا تیسرا بیٹا اور دوسرا سلطان فارسی کا شاعر تھا۔ جس کا نام جمشید قلی قطب شاہ تھا۔ لیکن بد سے اس عہد کا کوئی مخطوطہ اور فرمان موجود نہیں ہے۔ اولین قطب شاہی بادشاہ، علم و فن کے سرپرست تھے۔ انھوں نے علما، شعرا ا کاروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے درباروں میں آنے کی دعوت دی۔ قاسم طبسی، شریف و قوجی اور خورشاہ ابراہیم قطب شاہ کے دو مشہور و مقبول شعرا اور ادبا تھے۔ خور شاہ نے "تاریخ عالم" تالیف کی، اس کا عنوان "تاریخ قطب شاہی" یا "تاریخ ایلچی نظام شاہی" سولھویں صدی کے وسط میں قاسم طبسی نے ایک نادر مخطوطہ "انشاء قاسم طبسی" کے نام سے تالیف کیا۔ یہ قلمی کتابیں سالار جنگ میوز شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہیں۔ اس دور کے مشہور خط یہ ہیں: کوفی، نسخ، ثلث و ریحان وغیرہ، اسی دور میں مخطوطات کی مختصر مصوری نیا اسکول ابھر کر سامنے آیا۔

شہر حیدرآباد کا بانی محمد قلی قطب شاہ اپنے پیش رو بادشاہوں سے زیادہ خوش قسمت رہا۔ کیوں کہ سولھویں صدی عیسوی کے میں اس کی زندگی ہی میں اس کا اپنا دیوان، دکھنی زبان میں مرتب ہوا اور اسے مصور بھی کیا گیا اس کو درباری کاتب زین الدین عل بہترین ثلث خاص، میں نقل کیا۔ قاسم علی مذہب نے "عنوان" اور "سرلوح" کی تزئین کی۔ یہ مخطوطہ، کاغذ، خطاطی، مرصع سازی اور " کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کا ہے۔ اس دور میں ثلث، ریحان کوفی، نستعلیق اور شکستہ رسم الخط کا بھی استعمال کیا گیا۔ یہ ایک عجیب اتفاق

سترھویں صدی کے اواخر میں دکن کے تمام قطب شاہی مخطوطے ایک خاص، خط ثلث میں تحریر کیے گئے۔ کئی فارسی مخطوطات پر قطب شاہی مواہیر بھی موجود ہیں۔ فارسی مخطوطات کی حد تک خط نستعلیق بہت تیزی سے پروان چڑھا۔ دکن کی مایہ ناز ہستی میر مومن استرآبادی ایک عمدہ خطاط تھے۔ ان کی خوب صورت نستعلیق فارسی مخطوطہ "رسالہ مقداریہ" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سالار جنگ میوزیم کے ذخیرہ مخطوطات میں محمد قلی قطب شاہ اور ان کے بھتیجے محمد قطب شاہ کے بھی مواہیر اور قلمی تحریریں موجود ہیں۔ ان کے دکنی اور فارسی دیوان ثلث خاص اور نستعلیق میں ان کی زندگی میں نقل کیے گئے۔ محمد قطب شاہ کے دور کے سب سے مشہور خطاط اور صوفی ابن خاتون آملی اور حسن کتاب دار خوش نویس خانی ہیں۔ جو خط نستعلیق اور نسخ کے ماہر تھے۔

محمد قطب شاہ نے بھی مخطوطات کی ایک بڑی تعداد کو اپنے کتب خانے کی زینت بنایا۔ تاریخ سلطان محمد قطب شاہ کو اسی دور کے یک نامعلوم کاتب نے نستعلیق میں تحریر کیا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ بھی ایک ماہر خطاط تھا۔ اس کے دور میں کئی درجہ اول کے خطاط گزرے ں۔ جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: محمد مومن عرب شیرازی، عبداللہ شیرازی اور نظاما وغیرہ۔ عبداللہ قطب شاہ خود بھی دکنی زبان کا شاعر ا۔ اس کا دیوان خط ثلث میں تحریر کیا ہوا کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے۔ اسی دور کا تحریر کردہ تاریخ ایلچی نظام شاہ کا ایک نسخہ تب خانہ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ یہ کافی ضخیم اور نادر نسخہ ہے۔ یوسف علی نے خط نسخ میں چند مخطوطے تحریر کیے جو قطب شاہی ر اختتام کا بہترین خطاط تھا۔ اسی طرح قطب شاہی دور کے کچھ اور خوش نویس: غلام محی الدین اور شیخ داہل وغیرہ ہیں۔ عبدالکریم نے معرکتہ را۔ فارسی لغت "برہان قاطع" ۱۶۸۱ء میں حیدرآباد میں نقل کی ہے۔ ۱۶۶۲ء کی نقل شدہ وجہی کی "سب رس" قدیم دکنی نثر خط ثلث میں تحریر گئی ہے۔ اس دور میں "شرح شرح تمہیدات عین القضات" صوفی میراں جی خدانما کی لکھی ہوئی ہے۔ وہ بھی خط نستعلیق میں تحریر شدہ ہے۔

کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں عربی کے مخطوطات بھی محفوظ ہیں جو قطب شاہی دور میں کتابت کیے گئے ہیں۔ اس دور میں عربی ان کے لیے خطاطی زیادہ تر نسخ ہی میں رائج تھی۔ اس کے علاوہ خط نستعلیق، کوفی، ثلث وغیرہ بھی عہد قطب شاہی میں استعمال کیے گئے۔

کتب خانے کا ایک قلمی نسخہ "اجزائے قرآن" (نمبر ۲۵) ہے۔ جسے کاتب زین الدین شیرازی نے اوائل سترھویں صدی عیسوی میں ربن خط نسخ میں نقل کیا ہے۔ یہ قرآن مجید حیات بخش بیگم کے فرزند سلطان عبداللہ قطب شاہ کی طرف سے عوام کے لیے وقف کیا گیا تھا۔ ں ۲۵۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کی سائز ۵.۶ X ۳ ۱۰. سنٹی میٹر ہے اور ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں ہیں۔ شروع کے دو صفحات پر طلائی کام حاشیوں کو مرصع کیا گیا۔ سوروں کے عنوانات لال روشنائی سے تحریر کیے گئے ہیں۔

ایک اور اہم نسخہ "اجزائے قرآن" جو بہترین نسخ میں تحریر ہوا ہے۔ اسے محمد نگر (گولکنڈہ) کے کاتب یوسف علی نے شاید وسط ویں صدی عیسوی میں لکھا تھا طلائی اور رنگین حاشیے ہیں۔ سوروں کے عنوانات زبرجد روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ قلمی نسخہ سلطان اللہ قطب شاہ کے دور کا ہے اس کا مخطوطہ نمبر ۳۳۶ ہے اس میں ۱۳۷ اوراق ہیں۔ اور ہر ورق پر ۹ سطریں ہیں۔ اس کی سائز ۹.۸ X میٹر ہے۔

ایک اہم قلمی کتاب ادعیہ پر ہے۔ جس کا نام "ادعیۃ الیوم واللیلۃ" ہے۔ یہ قلمی کتاب دن اور رات کی مختلف دعاؤں پر ہے۔ اس کو خطاط مہذب الدین احمد نے لکھا ہے۔ یہ خط نسخ میں ہے۔ اور سترھویں صدی کے اواخر یعنی قطب شاہی دور کے اواخر میں

نقل ہوا ہے۔ اس میں ۱۵۸ اوراق ہیں۔ اس کی سائز ۸.۲ X ۲ .۱۷ سنٹی میٹر ہے۔ یہ ایک نادر نسخہ ہے اور اس پر کئی دستخط موجود ہیں۔ اس مخطوطہ کا نمبر ادعیہ ۱۷ ہے۔

(۴) ایک اور قلمی نسخہ "شرح الفیہ" بھی خط نسخ میں تحریر ہوا ہے۔ اس مخطوطے کو خطاط طیفور بن سلطان البسطامی نے سترھویں صدی کے وسط میں بہ مقام حیدرآباد، نقل کیا ہے۔ اس قلمی کتاب میں متن سرخ ہے اور اعراب موجود ہیں۔ یہ مخطوطہ قطب شاہی دور کا ہے۔ جس کا موضوع "نحو" ہے۔ یہ ۲۷۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس مخطوطہ کا نمبر ۱/ ۳۸ ہے سائز ۱۹.۶X ۲ .۲۹ سنٹی میٹر ہے۔ اس پر محمد بادی الحسینی کی مہر ہے۔

(۵) ایک اور مخطوطہ "تحصیل المنافع" عقائد و کلام پر ہے اس کی کتابت خط نسخ میں کی گئی ہے۔ یہ شیعہ عقائد پر ایک تفصیلی بحث ہے: اس مخطوطہ میں ۹۲ اوراق ہیں۔ اس کا نمبر ۱۴۳ ہے۔ اس کی سائز ۶.۶X ۲ .۱۵ سنٹی میٹر ہے۔ حاشیوں پر سنہری اور رنگین کام ہے۔ یہ ۱۶۶۰ء کا نادر مخطوطہ، قطب شاہی دور کا ایک اہم نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

(۶) ایک مخطوطہ "الهداية في الاصول والفروع" جو خط نسخ میں بخط خلف بن محمد البحرانی کا تحریر کیا ہوا ہے۔ یہ سترھویں صدی عیسوی میں حیدرآباد میں لکھا گیا ہے۔ اس مخطوطہ میں اخلاقی اور خطیبانہ اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ اوسط سائز کے ۵۱ اوراق ہیں۔

(۷) ایک اہم مخطوطہ "العافية والوافية" میں ایسی، شیعہ احادیث جمع کی گئی ہیں جن کا تعلق خور و نوش سے ہے۔ اسے خطاط مہذب الدین نے بہترین خط نسخ میں تحریر کیا ہے۔ اس کا مصنف گولکنڈے کے قطب شاہی دور میں پروان چڑھا۔ لیکن زیر نظر نسخہ ۱۶۶۴ء میں بہ مقام مشہد تحریر کیا گیا۔ اور یہ ۳۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ سائز ۸.۲X ۲ .۱۵ سنٹی میٹر ہے۔ یہ بہترین عنوان اور رنگین جدول سے مزین ہے۔ قطب شاہی دور کا یہ نادر مخطوطہ ہے جو کہ حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا۔ اس کا نمبر ۱۰۲۵ ہے۔

(۸) ایک اور مخطوطہ فقہ امامیہ پر لکھا گیا ہے۔ اس کا نام "کتاب الحج" ہے اس کی خط نسخ میں کتابت کی گئی ہے۔ کاتب حسن بن عبداللہ بحرانی ہے۔ سترھویں صدی عیسوی کا یہ مخطوطہ گولکنڈے کی قطب شاہی دور کا ہے۔ یہ ۳۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ سائز ۶.۷X ۵ .۹ سنٹی میٹر ہے۔ اس پر طیفور بن سلطان محمد البسطامی کے دستخط موجود ہیں۔ جو عبداللہ قطب شاہ کے دور کا ایک ممتاز نثر نگار تھا۔

(۹) ایک اور قلمی کتاب "منتقى الجمان الديث الصحاح والحسان" جو شیعہ فن حدیث پر ترتیب دی گئی ہے۔ سولھویں صدی کے اواخر میں درباری خطاط زین الدین علی شیرازی نے خط نسخ میں اسے نقل کیا اور یہ ۳۹۶ اوراق پر مشتمل ہے اس کا خط کسی خاص خصوصیت کا حامل نہیں ہے۔

(۱۰) کتب خانہ سالار جنگ میوزیم کے نسخہ نمبر مصاحف ۲۹ کے متعلق مختصر مصوری کے مشہور نقاد مرحوم کارل کھنڈال والا کی رائے ہے کہ یہ سلطان قلی، قطب الملک کے دور حکومت میں نقل ہوا ہوگا اسے بہترین خط ثلث اور نسخ میں محمد بن شہاب الدین الہراوی نے ۱۵۳۷ء میں تحریر کیا۔ حاشیہ پر آرائشی خط کوفی کا استعمال ہوا ہے۔ اس مخطوطے میں ۳۲۶ اوراق ہیں، ہر ایک صفحے پر ۱۲ سطریں ہیں۔ سائز ۹.۳ X ۵ .۱۴ سنٹی میٹر ہے۔ شروع کے ۲ صفحات پر بہترین عنوان اور حاشیے دیے گئے ہیں۔ سفید اور طلائی روشنائی کا کھلا استعمال ہوا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی دور کے اولین عہد میں کوفی، ثلث اور نسخ، سلطنت گولکنڈہ میں کافی مقبول تھے۔

کتب خانہ سالار جنگ میوزیم عربی مخطوطہ "تفسیر القرآن" جو (نمبر ۹۰۹) شیعہ عقائد پر مبنی ہے۔ اسے حیدرآباد میں ۱۶۷۸ء میں مہذب الدین احمد نے تحریر کیا۔ یہ تفسیر امامیہ کا ایک نادر نسخہ ہے۔ جو ۶۶۴ اوراق پر مشتمل ہے۔

یہ قلمی نسخہ معیاری نستعلیق اور نسخ میں لکھا ہوا ہے اور بہترین عنوان سے مرصع ہے۔ حاشیوں پر بھی سنہری کام موجود ہے۔ اس نسخے سے معلوم ہوتا ہے کہ مہذب الدین احمد عہد عبداللہ قطب شاہ کے اہم کاتب تھے۔

○ ○ ○

(سلسلہ ص ۵۵ سے آگے)

سے اس کی عظمت میں فرق آگیا ہے اس عظیم الشان عمارت میں تناسب اور موزونی کی کمی ہے۔ کرسی نیچی ہے۔ چبوترہ بھی وسیع نہیں ہے۔ اس بلند عمارت کے لیے بہت وسیع اور بلند چبوترے کی ضرورت تھی۔ برجیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ کھلونا معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اس کہ جگہ بلند مینار ہوتے تو عمارت میں بڑی شان پیدا ہو جاتی۔ (اس کا چبوترہ ۸۲ مربع میٹر ہے جس کے ہر جانب سات کمانیں ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ۱۶۷۲ء میں ہوا۔)

ابوالحسن تانا شاہ اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا اس نے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح مقبرہ بنوانا شروع کیا تھا مگر ابھی گنبد نہیں بنا تھا کہ اس کی حکومت ختم ہو گئی۔ اس بد نصیب کے آخری ایام قلعہ دولت آباد کے چینی محل میں بسر ہوئے اور وہیں ۱۶۸۹ء میں انتقال ہوا۔ اس کی قبر خلد آباد (ضلع اورنگ آباد) میں موجود ہے۔ (اس ناتمام گنبد میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے داماد مرزا نظام الدین کی قبر ہے۔)

یہ قطب شاہی قبرستان آج کل ویران ہے مگر اس نے ایسے اچھے دن دیکھے ہیں کہ ہندوستان کے کسی شاہی قبرستان کو نصیب نہیں ہوئے۔ قبر کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی اور جہاں بہت سی قبریں ہوں وہاں ایک قسم کی اداسی اور افسردگی چھائی ہوتی ہے۔ لیکن اس قبرستان کی خاموش فضا میں وحشت پیدا نہیں ہوتی۔ یہاں اب بھی عظمت اور شان باقی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں ایک قسم کی پاکیزگی اور روحانیت پیدا ہوتی ہے اور زائر جب یہاں داخل ہوتا ہے تو یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کسی مقدس جگہ آگیا ہے اور یہی ان مقبروں کا مقصد تھا۔

[نوٹ اصل مضمون میں کچھ اضافے کیے گئے ہیں۔ ان عبارتوں کو قوسین میں دیا گیا ہے۔]

○ ○ ○

(سلسلہ ص ۱۱ سے آگے)

قطب شاہ جہاں چو از تقدیر   از جہاں جست سوئے جنت راہ
گو ابوالفضل سال وصلش نیز   معدن جود قطب شاہنشاہ

کتابیات

1. Sherwani, H.K, History of Medieval Deccan (1295- 1724 A.D) 2 Vols 1973 - 74
2. Bilgrami, Syed Ali Asghar. Land Marks of The Deccan , New Delhi Madras 1992
3. Siddiqui, Abdul Majeed. History of Golcunda . Hyderabad, 1956
4. Shah Rocco. Golcunda and The Qutb Shahs, Hyderabad, 1929

۔ بلگرامی، سید علی، تاریخ دکن، آگرہ ۱۸۹۷ء

○ ○ ○

راحت عزمی

قطب شاہی دور کے چند امراء و وزراء

شخصی اور مطلق العنان حکومت میں جب بادشاہ وقت کسی شخصیت کو اس کی علمی عظمت، تدبر و سیاست، دلیری و شجاعت اور امانت و دیانت جیسے اوصاف کے ساتھ جذبہ وفاداری و فداکاری کی آزمائش کے بعد اپنے دربار کا رکن بنالیتا ہے تو وہ شخصیت امیر کہلاتی ہے۔ یہ امارت صلاحیتوں کے بل بوتے پر حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً میر محمد سعید اردستانی ایران کے ایک جواہرات کے تاجر کا معمولی ملازم تھا۔ اپنے مالک کے ساتھ گولکنڈہ آیا تھا۔ یہاں اس کی صلاحیتوں نے جولانی دکھائی اور وہ عبداللہ قطب شاہ کے امراء عظام میں شامل کرلیا گیا۔ حکیم شمس اللہ قادری تحریر فرماتے ہیں:

"سلطان عبداللہ کے امراء عظام میں میر محمد سعید ایک نامور امیر گزرا ہے۔"

مطلق العنان شاہی میں امراء ہی سلطنت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے۔ اور یہی امراء عمائدین سلطنت کہلاتے تھے۔ کیوں کہ سلطنت کا عظیم الشان ایوان ان ہی ستونوں پر سربلند ہوکر شاہانہ عظمت و جلال کا مظہر بنتا تھا۔ تاریخ ان امراء کا عام طور پر حکومت کے دیے گئے عہدوں ہی سے تعارف کرواتی ہے۔ اس لیے ان عظیم المرتبت عہدے داروں کو امراء کے زمرے ہی میں رکھنا چاہیے۔

حکومت کے چند کلیدی عہدے یہ ہیں: پیشوا، اس کو وزیر اعظم اور وکیل مطلق بھی کہا جاتا ہے۔ میر جملہ، وزیر عین الملک، مجموعہ دار، دبیر اس کو دبیر الممالک یا منشی الممالک بھی کہا جاتا ہے، سر خیل، سر خیل شاہی، حوالہ دار وغیرہ۔ اب چند امراء و وزراء کا تعارف پیش خدمت ہے۔

مصطفیٰ خاں اردستانی: مصطفیٰ خاں کا اصلی نام سید کمال الدین حسین تھا۔ مصطفیٰ خاں خطاب تھا۔ ایران کے شہر اردستان کا رہنے والا تھا۔ بڑا ذی علم، بڑا مدبر، بڑا شجیع، اور بڑا خوش بیان تھا۔ اس نے دکن کی حکومتوں میں اپنی خوش بیانی سے توازن قوت کو برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کیا۔ خصوصاً گولکنڈے کے وقار کو سخت مرحلوں میں بھی شمہ برابر صدمہ پہنچنے نہیں دیا۔

صاحب تاریخ دکن (سلسلہ آصفیہ) مولوی عبدالغفور کا کہنا ہے کہ مصطفیٰ خاں اردستانی ابراہیم قلی کے دور حکومت میں گولکنڈہ آیا تھا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی کے ایک بیان کے مطابق وہ غالباً جمشید قلی کے دور میں یا قلی قطب الملک بانی سلطنت قطب شاہیہ کے آخری زمانے میں آیا ہوگا۔ کیوں کہ سبحان قلی کی تخت نشینی کے سلسلے میں گولکنڈے میں جو سیاسی ہلچل پیدا ہوگئی تھی اس وقت جمشید قلی کی بیوہ بلقیس زماں نے جن عمائدین کو اپنے بیٹے کی تخت نشینی کے لیے ہموار کیا تھا ان میں مصطفیٰ خاں بھی تھا۔ پروفیسر عبدالمجید لکھتے ہیں

"جن لوگوں نے بلقیس زماں کے ساتھ اتفاق کیا تھا وہ فرشتے کے الفاظ میں مصطفیٰ خاں اور صلابت خاں ترک اور دیگر عمائد تھے۔ حالات تیزی سے تبدیل ہوگئے۔ عین الملک اور جگدیو کی سیاسی کارستانی کے سبب قطب شاہی حکومت بربادی کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اردستانی نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور ابراہیم قلی کو بادشاہ بنانا مناسب سمجھا۔ بقول صاحب حدیقۃ العالم:

"مصطفیٰ خاں اردستانی و صلابت خاں و اکثر ازارکان دولت ہم قرار دادند کہ ابراہیم قطب شاہ را از بیجانگر طلبیدہ بادشاہ سازند"
(ص ۱۱۵)

اس نے تلنگانہ کی سرحد پر ابراہیم کا استقبال کیا۔ ابراہیم نے اس کی معاملہ فہمی اور اعلیٰ تدبر کی ستائش کی میر جملگی کا عہدہ عطا کیا اور
خلعت سے نوازا۔ مصطفیٰ خاں نے فوراً ہندو تاجروں سے دو لاکھ ہون قرض لے کر سلطنت کے اہم امور کا انتظام کر دیا۔ اس کے اعزازات میں
ازناموں کے ساتھ ساتھ اضافہ ہونے لگا۔ ابراہیم نے اپنی بہن سے اس کی شادی کر دی۔ اب وہ خان اعظم رکن سلطنت ہو گیا۔ دکنی حکومتوں
یں گولکنڈے کی طرف سے سفارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ کٹھن اور نازک موقعوں پر اور سخت مرحلوں میں گولکنڈے کی طرف سے
ادل شاہی اور نظام شاہی حکومتوں سے بات چیت کے ذریعے صلح صفائی کرائی اور ان کی آپس کی دوستی کو مستحکم کیا۔ فوجی نقطۂ نظر سے
لکنڈے کے قلعے کو مستحکم کیا۔ مضبوط فصیلیں بنوائیں۔ ملک کے باغیوں کا قلع قمع کیا اس کے صلے میں سلطنت کا پیشوا بنایا گیا۔ جب اس کی
قی آسمان کو چھونے لگی اور عروج نصف النہار پر پہنچا تو وہ "ہر عروجے را زوال است" کی زد میں آ گیا۔

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

تالی کوٹ کی جنگ میں فتح کے بعد قلعہ رائچور اور دوسرے قلعوں پر قبضہ کرنے کے لیے قطب شاہ، حسین نظام شاہ اور علی عادل شاہ
نے اپنے اپنے پیشوائے سلطنت، مصطفیٰ خاں اردستانی، عنایت اللہ اور کشور خاں کو روانہ کیا۔ یہاں مصطفیٰ خاں اردستانی سے ایک اصولی
ی سرزد ہو گئی۔ اس نے اپنے اختیار سے قلعے کی کنجیاں کشور خاں کے حوالے کر دیں۔ یہ غلطی اس کے حق میں غضب ہو گئی۔ ابراہیم قطب
نے اس کو فوراً عہدے سے معزول کر دیا اور بال بچوں سمیت گولکنڈے سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ مصطفیٰ خاں گولکنڈے سے نکل کر
ل شاہی حکومت کا ملازم ہو گیا۔ علی عادل شاہ نے اس کو ۲۲ ہزار فوج کی سرداری عطا کی۔

مصطفیٰ خاں نے گولکنڈے میں کتنی دولت کمائی تھی اس کا اندازہ اس طرح کیجیے کہ اس کا سامان آٹھ ہزار بیلوں اور بارہ ہزار آدمیوں
ذریعے گلبرگہ منتقل ہوا تھا۔ مصطفیٰ خاں نے عادل شاہی حکومت میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہاں بھی اس نے کافی دولت کمائی۔
کے (۱۸۰) جہاز بحر ہند میں عرب سے بنگال تک چلا کرتے تھے۔ تاریخ دکن کے مؤلف کے بیان کے مطابق مصطفیٰ خاں، کشور خاں کی
ش کا شکار ہوا اور محمد امین نامی ایک شخص کے ہاتھوں قتل ہوا۔

شاہ میر اصلی نام میر شاہ تقی تھا۔ میر شاہ میر کے نام سے معروف تھا۔ صاحب برہان مآثر علی طباطبا نے اس کے بارے میں لکھا ہے
ز مشاہیر فضلائے زمان۔۔۔۔بود" (ص ۴۱۵)
اور جگہ لکھتا ہے

"از جملہ فضلائے دوران بہ بلاغت بیان و طلاقت لسان امتیاز تمام داشت۔" (ص ۴۷۶)

میر شاہ میر بھی مصطفیٰ خاں اردستانی کی طرح گولکنڈے کے تخت و تاج کا انتہائی وفادار تھا۔ اس نے کڑے وقتوں میں بھی اپنے بادشاہ
ہ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بلکہ بھرپور رفاقت کی۔ وہ بہترین مقرر، اعلیٰ پائے کا مدبر اور بڑا ذی علم انسان تھا۔ شجاعت و بہادری میں بھی
جواب نہ تھا۔ ان ہی صلاحیتوں کی وجہ سے اس نے سفارت کے فرائض بھی انجام دیے اور فوج کا سپہ سالار بھی رہا۔ وہ گولکنڈے کا ایک

کامیاب سفیر تھا۔

ابراہیم قلعہ۔ گوندھیر کی مہم پر شاہ میر شاہ کو جرار فوج کے ساتھ روانہ کیا تھا اس نے میدان جنگ میں ایسی داد شجاعت دی کہ بقول علی طباطبا لوگوں نے رستم کی بہادری کے قصے کو فراموش کر دیا۔ معاملہ فہمی کا ایسا عالم تھا کہ ذرا سے اشارے پر سامنے والے کے منشا کو سمجھ جاتا تھا۔ یہی تیزی جنگی چالوں میں بھی تھی۔ جب عادل شاہی فوجیں قطب شاہی اور نظام شاہی لشکر سے پئے در پئے شکستیں کھانے لگیں تو عادل شاہی حکومت نے دشمن کے لشکر میں پھوٹ ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ فوج کی نقل و حرکت سے شاہ میر شاہ نے سازش کا پتہ چلالیا اور جوابی کارروائی شروع کی۔ سازش کے سرغنہ سید مرتضیٰ کے خیمے میں جاکر اس کو سازش کے انکشاف پر مجبور کر دیا۔

شاہ میر جس زمانے میں قلعے نلدرگ میں تھا اسی زمانے میں ابراہیم قطب شاہ کا گولکنڈے میں انتقال ہو گیا۔ شاہ میر کے لیے بادشاہ کی موت اس کے زوال کا سبب بنی۔ شاہ میر سوچ رہا تھا کہ ابراہیم قلی کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا حسین قلی تخت و تاج کا مالک ہو گا۔ اسی لیے اس نے اپنی بیٹی کو حسین قلی سے منسوب کیا تھا۔ شاہ میر اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا اگر بادشاہ کے انتقال کے وقت وہ مرکز میں رہتا۔ پائے تخت سے دور رہنے کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے نلدرگ سے گولکنڈہ پہنچنے سے پہلے ہیں محمد قلی قطب شاہ تخت سلطنت پر بیٹھ چکا تھا۔ میر شاہ میر ہوشیار آدمی تھا۔ اس تخت نشینی سے پیدا ہونے والے اپنے موقف کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے ہوشیاری سے کام لیا۔ اپنی روانگی سے قبل میرک معین استراوری اور محمد خواجہ سمنانی کو نظام شاہی حکومت کی طرف سے پیام تعزیت اور نئے بادشاہ کو تخت نشینی کی مبارک باد دینے کے لیے روانہ کیا۔ اس طرح اس نے اپنے لیے ایک ماحول پیدا کر لیا۔ کیوں کہ یہ لوگ بر سبیل تذکرہ بادشاہ سے شاہ میر کی وفاداری کی تعریف ضرور کرتے۔ یہ بات اس کے لیے مفید تھی۔ ان کے پہنچنے کے بعد جب وہ خود گولکنڈہ آیا تو محمد قلی قطب شاہ اس کے استقبال کے لیے بھاری سپاہ کے ساتھ آگے بڑھا۔ شاہ میر کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اتر گیا اور اس کے بغل گیر ہوا اور اس کو میر جملہ کے عہدے سے سرفراز کیا۔ بادشاہ کا یہ استقبال بھی سیاسی مصلحت سے خالی نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاہ میر حسین قلی کا طرف دار ہے اس سے اپنی لڑکی بھی منسوب کی ہے۔ لیکن بڑی ہوشیاری سے ہر معاملے میں اس کے مشورے پر عمل کر رہا تھا۔ اس طرح اس کے دل میں یہ احساس پیدا نہیں ہونے دیا کہ وہ اس کی وفاداری سے مشکوک ہے۔ یہ نوجوان بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کا مدبر تھا۔ نلدرگ کی مہم پر شاہ میر کے مشورے ہی سے بادشاہ خود میدان جنگ میں آیا اور فوج کی کمان سنبھالی۔ محمد قلی نے شاہ میر کی بیٹی سے بڑی دھوم دھام سے شادی بھی کر لی لیکن اس کی طرف سے اس کو جو اندیشہ تھا وہ دل سے نہیں نکل سکا۔ بہر حال وہ اس سے مطمئن نہیں تھا یوں بھی اچھے لوگ دنیا کی نظر میں کھٹکتے ہیں۔ گولکنڈے میں ایسے لوگ موجود تھے جو شاہ میر کے مخالف تھے اور اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ بالآخر شاہ میر کے خلاف ایک سازش کی گئی اور سازشی اس میں کامیاب ہوگئے۔ اس سلسلے میں ملکی اور غیر ملکی کے جھگڑے نے سازشیوں کی زیادہ مدد کی۔ ملک کے بعض اکابرین اس کے سخت خلاف تھے۔ ان ہی کی سازش کام کر گئی۔ باشاہ نے شاہ میر کو قید کر دیا پھر اپنے وطن اصفہان چلے جانے کا حکم دیا۔ وطن جاتے ہوئے: "شاہ مرزا در کشتی بیمار شد و بعیش از آں کہ بمنزلہ مراد رسید فوت شد (فرشتہ ص ۱۷۲)

محمد امین: محمد امین ۱۰۱۳ھ میں اصفہان سے گولکنڈہ آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ قطب شاہی حکومت اپنے عروج پر تھی۔ ہر شعبہ حیات ترقی کے راستے پر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہر طرف مرفہ الحالی اور فارغ البالی تھی۔ رعایا چین سے کھاتی تھی، میٹھی نیند سوتی تھی۔ اس وقت

ملہ الف خاں کا انتقال ہو چکا تھا۔ میر جملگی کی یہ جاگیر مخلوعہ تھی۔ مختلف لوگ اس جاگیر کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ حضرت میر محمد
ؒ کی سفارش اور محمد امین کی صلاحیتوں اور علمی قابلیت کا اندازہ کر کے محمد قلی قطب شاہ نے اس جاگیر پر اس کا تقرر کر دیا۔ اور سالانہ
ہ ہون تنخواہ مقرر کر دی اسی کے ساتھ مرصع قلم دان بوزارت سے سرفراز کیا۔ یہ محمد امین کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کیوں کہ جواہرات سے
قلم دان وزارت باشاہ نے کسی دوسرے میر جملہ کو عطا نہیں کیا تھا۔ محمد امین اپنے عہدے کا جائزہ لیتے ہی اپنے فرائض منصبی کی طرف
ہو گیا۔ سلطنت کے مداخل و مخارج کی تنقیح کی۔ بادشاہ کے منہ چڑھے سوری راؤ کے حسابات کی تنقیح کر کے سارے بقایاجات وصول
ر رقم داخل خزانہ کر دی گئی۔

۱۰۱۷ھ میں نبات گھاٹ کا ناگوار واقعہ رونما ہوا۔ چند غیر ملکی اوباشوں نے باغ نبات گھاٹ میں زبردستی گھس کر ایک رات خوب
کیا۔ صبح کو بادشاہ کو خبر ہوئی تو اس نے ان کو قتل کر دینے کا حکم دیا۔ مقامی لوگوں نے سرکاری آدمیوں کے ساتھ مل کر ہنگامہ مچا دیا۔ غیر
ں کو قتل کرنا اور ان کا مال لوٹنا شروع کر دیا۔ محمد امین کو اطلاع ملتے ہی اس نے اس فساد پر قابو پانے میں بڑی سرگرمی دکھائی اور تدبر
م لے کر یہ فتنہ فرو کیا۔

۱۰۱۸ھ میں محمد امین نے محمد قلی قطب شاہ کی دعوت کی۔ اس دعوت کا جس انداز سے اہتمام کیا گیا تھا اس کا ہر ہم عصر مورخ نے ذکر
، اس لیے یہاں اس دعوت کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اس دعوت سے قطب شاہی سلطنت میں دولت کی فراوانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی
محمد امین آنے والے زمانے کو اور بادشاہ وقت کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ شاہانہ نوازشوں کے طفیل دولت مندی کی کس بلندی پر پہنچا ہے۔
حدائق السلاطین، علی بن طیفور نے اس کا جس انداز سے ذکر کیا ہے وہ ایک اچھا انشائیہ بھی ہے۔

محل کو سات رنگوں سے آراستہ کیا گیا تھا ہر راستے کو مشک و عنبر سے مہکایا گیا تھا۔ محل کو مخمل، اطلس، مشجر اور زربفت کے پا انداز
بایا گیا تھا۔ سویرے ہی سے سارے اعیانِ سلطنت اور اکابرینِ حکومت دربار کی طرح اپنے اپنے مقام پر ایستادہ تھے۔ بادشاہ کی سواری
آئی شعرا نے قصیدے پڑھے اور حسبِ دل خواہ انعام پایا۔ محمد امین نے بادشاہ کی خدمت میں مرصع زین و لگام والے (۳۰) عربی النسل
ے، جواہرات سے مزین سونے کا کمر بند، ایک گول آئینہ جس میں ہیرے جواہرات جڑے تھے اور جس کے سونے کے فریم کو بھی جواہرات
استہ کیا تھا۔ (۱۴) مطلا مذہب قرآن مجید (۲۰) نفیس کشمیری شال، زربفت مخمل، کمخواب مشجر اور اطلس کے چودہ چودہ تھان، عمدہ
ں (۳۰) جوڑیاں اور چند سونے کی جواہرات سے بھری کشتیاں اور بہت سے قیمتی تحائف نذر کیے۔

دسترخوان پر اتنے اقسام کے کھانے چنے گئے تھے جن کا شمار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ محمد امین نے اتنی دولت اپنے سات سالہ دور
ت میں حاصل کی تھی۔ بادشاہ اس دعوت سے خوش ہوا اور تحفے قبول کیے۔ جب چلنے لگا تو اپنے کندھے پر سے شال نکال کر محمد امین کو
ی۔ محمد امین کے لیے یہ سب سے بڑا شاہی اعزاز تھا۔ اسی کے ساتھ بادشاہ نے بھی چند تحفے اپنے میزبان کو دیے۔

۱۰۲۰ھ میں محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہو گیا۔ نئے بادشاہ محمد قطب شاہ سے اس کی نہیں بنی۔ اس نے وطن لوٹ جانے کی
ست کی جو منظور ہوئی۔ وہ اپنی ساری دولت لے کر گولکنڈے سے نکلا۔ یہاں سے نیشا پور پہنچا۔ یہاں اس کی کوئی خاص پذیرائی نہیں
وہاں سے ایران چلا گیا یہاں بھی شاہ ایران نے کوئی خاص مقام نہیں دیا۔ محمد امین ایران سے پھر ہندستان آیا اور شہنشاہ جہانگیر کے

دربار میں باریاب ہوا اور نذر پیش کی۔ جہانگیر نے اس کو پانچ ہزاری منصب دار بنادیا اور بخشی گری کی خدمت دی اس نے اپنی تزک میں اس کا ذکر کیا ہے۔ محمد امین نے ۱۰/ ربیع الآخر ۱۰۴۰ھ کو فالج میں مبتلا ہو کر انتقال کیا اور آگرہ میں دفن ہوا۔

محمد امین نے حیدرآباد میں اپنی میر جملگی کے زمانے میں ایک باغ تعمیر کیا تھا جو امین باغ کہلاتا تھا۔ یہ باغ رشک بہشت تھا۔ اس کے حیدرآباد سے چلے جانے کے بعد یہ باغ شاہی مہمان خانے میں تبدیل ہو گیا۔ آج کل اسی باغ میں وکٹوریہ زچگی خانہ ہے۔ محمد امین خود بھی بہت اچھا شاعر تھا۔ اور شعرا کی سرپرستی کرتا تھا اس نے خمسہ نظامی بھی لکھا تھا۔

حضرت میر محمد مومنؒ: حضرت میر محمد مومنؒ استرآباد ایران کے ذی علم گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ علم معقول و منقول میں منتہی تھے۔ زہد و تقویٰ میں آپ اپنی مثال تھے۔ شاہ طہماسب صفوی نے شہزادے حیدر مرزا کی تعلیم و تربیت کے لیے حضرت قبلہ کا انتخاب کیا تھا۔ آپ شہزادے کے اتالیق تھے۔ شاہ طہماسب کے انتقال کے بعد ایران کے سیاسی حالات میں بڑی افراتفری پیدا ہو گئی تھی۔ ادھر شہزادہ حیدر مرزا قتل کر دیا گیا تھا۔ حضرت میر محمد مومنؒ کا وطن سے دل ٹوٹ گیا۔ انھوں نے ترک وطن کا فیصلہ کیا۔ وہاں سے سیدھے گولکنڈہ چلے آئے۔ اس وقت گولکنڈے میں قلی قطب شاہ کو تخت نشین ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ حضرت میر محمد مومنؒ نے ابتدائی چند سال تو درس و تدریس میں صرف کیے۔ پھر شاہی دربار سے وابستہ ہوئے۔ آپ کی ہمہ رخی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر بادشاہ نے آپ کو پیشوائے سلطنت، وکیل مطلق کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا۔ آپ آخری عمر تک اسی عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ اور اہم خدمات انجام دیں۔ قطب شاہی تہذیب کی تعمیر میں آپ نے اہم رول ادا کیا۔ آپ کے تفصیلی حالات کے مطالعے کے لیے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی کتاب "حیات میر محمد مومن" ملاحظہ ہو۔ حضرت قبلہ بہترین شاعر تھے۔ صاحب تصنیف بھی تھے۔ آپ کے دو رسالے بہت اہم ہیں ان میں ایک رسالہ الراجعہ ہے جو شیعوں کے بارھویں امام کی رجعت سے متعلق ہے دوسری کتاب رسالہ فی اوزان الشریعہ ہے اس کا دوسرا نام "مقداریہ" ہے۔ یہ رسالہ شرعی اوزان پر ہے۔ حضرت قبلہ صاحب تصرف بھی تھے۔ ۱۰۳۲ھ میں انتقال فرمایا اور اپنے ہی تعمیر کردہ "دائرہ میر محمد مومن" میں دفن ہوئے۔

علامہ ابن خاتون: علامہ شیخ محمد ابن خاتون ۱۰۰۹ھ میں بہ عہد محمد قلی قطب شاہ حیدرآباد آئے۔ ۱۰۲۰ھ میں قلی قطب شاہ کے انتقال سے کچھ پہلے حکومت سے وابستہ ہوئے (۵۰) سال حیدرآباد میں رہے (۴۰) سال سلطنت قطب شاہیہ کی خدمت کی ۱۰۵۹ھ میں انتقال کیا۔

علامہ ابن خاتون نے عہد محمد قلی قطب شاہ میں گولکنڈے کے سفیر کی حیثیت سے ایران میں خدمات انجام دیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور حکومت میں پیشوائی کے منصب پر فائز رہے۔ علم و فضل زہد و تقویٰ اور خدمت خلق میں اپنے استاد حضرت میر محمد مومنؒ کے حقیقی جانشین تھے۔ علامہ ابن خاتون شعر بھی کہتے تھے، عاملی تخلص تھا۔ صاحب تصنیف و تالیف تھے۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ علامہ کی تخلیقات سالار جنگ لائبریری میں محفوظ ہیں۔ علامہ کی تصانیف کے نام یہ ہیں: (۱) شرح الارشاد (۲) شرح اربعین (۳) شرح ۔ عباسی (۴) تکملہ جامعہ عباسی (۵) کتاب الامامت۔ تفصیلی حالات کے لیے راحت عزمی کی کتاب "علامہ ابن خاتون" ملاحظہ ہو۔

شریف الملک ملا محمد تقی: ملا محمد تقی عراق کے رہنے والے تھے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے دور حکومت میں مچھلی پٹنم کے حوالہ دار تھے۔ منصور خاں حبشی ملا کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ ملا کو شہر میں کوتوالی کا عہدہ دلانا چاہتا تھا۔ وہ بادشاہ کے مزاج میں بہت دخیل تھا۔ اس نے ملا کو مچھلی پٹنم سے بلوالیا۔ اس نے ملا کو بادشاہ کے حضور باریاب کرنا چاہا اس کے لیے تین "بہتر" تک لگاتار کوشش کی وہ ملا کو اپنے ساتھ روزانہ

ت خانہ عالی لے جاتا رہا لیکن بادشاہ نے کبھی باریاب نہیں کیا۔ وہ منصور خان حبشی کا مقصد کچھ رہا تھا۔ محمد قطب شاہ، ملا محمد مشتی کی
ں سے واقف تھا۔ وہ اس کو کوتوالی سے بڑا عہدہ دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے عہدے کو اپنے ذہن میں محفوظ بھی کر رکھا تھا۔ اس دوران
اہ نے کوتوالی پر نائب کوتوال حسن بیگ کو ترقی دے دی۔ منصور خاں اس ترقی سے مایوس ہو گیا۔ کیوں کہ وہ بادشاہ کے فیصلے کو نہیں
سکا تھا۔ لیکن اس نے اس ترقی سے نہ اپنا دل چھوٹا کیا اور نہ ملا کے دل کو چھوٹا ہونے دیا۔ اس نے ایک اور راہ نکالی ملا محمد مشتی کو اپنے ہم
کر میر جملگی کے عہدے کی تربیت دینا شروع کی اور بہت جلد اس عہدے کا اہل بنا دیا بادشاہ منصور خاں کی کوشش سے خوش تھا۔
ں کہ وہ ملا کو اونچا عہدہ ہی دینا چاہتا تھا۔

۱۰۳۱ھ میں میر جملہ منصور خاں حبشی کا انتقال ہو گیا۔ ملا میر محمد مشتی کے لیے منصور خاں کی موت ایک سانحہ تھی۔ وہ حالات سے
ان تھا۔ کیوں کہ جس مقصد سے منصور خاں نے اسے بلایا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا اور اسی دوران اس کی موت بھی واقع ہو گئی۔ لیکن ملا
اہ جو چاہتا تھا اس سے لاعلم تھا۔

محمد قطب شاہ نے ملا کو بلایا اور سرخیلی کے عہدے پر اس کا تقرر کر دیا۔ ملا نے سرخیلی کے عہدے پر فائز ہوتے ہی سارے معاملات
ں اپنے ہاتھ میں لے لیے کسی کو دخل اندازی کا موقع نہیں دیا۔ ملا نے سب سے پہلے برہمنوں کے زور کو توڑا جو رعایا پر ظلم و ستم کرتے
اسی کے ساتھ محاصل کی رقمیں سختی سے وصول کر کے داخل خزانہ کیں۔ محاصل کے وصول کرنے میں وہ کسی رعایت کا روادار نہ تھا۔ اب
خزانے میں رقمیں بروقت جمع ہونے لگیں۔ اسی زمانے میں ملا نے نارائن راؤ محمود دار سے اس کے ذمے کی ایک لاکھ تیس ہزار ہون کی
رقم کو وصول کر کے داخل خزانہ کیا۔ اسی کے ساتھ سرکش اور منافق چودھریوں اور سازشیوں کو قتل کر کے ملک و مالک کی حفاظت کی ان
کداویں بہ حق سرکار ضبط کر لیں۔

بادشاہ نے ملا کے ان کارناموں کے صلے میں شریف الملک کے خطاب سے نوازا اسی کے ساتھ ہیرے جواہرات سے مرصع وہ قلم دان جو
محمد قلی قطب شاہ نے محمد امین کو عطا کیا تھا ملا کو عنایت کیا۔ ملا کے لیے یہ بہت بڑا شاہی اعزاز تھا۔

اسی زمانے میں دکن میں مغلیہ سلطنت کے حملوں کی خبریں سن سن کر رعایا پریشان ہو رہی تھی۔ بادشاہ نے شریف الملک ملا کو پچاس
ہون کی جاگیر عطا کر کے ایک فوج تیار کرنے کا حکم دیا۔ ملا نے شاہی حکم کی فوراً تعمیل کی اور دکنیوں، عربوں اور پٹھانوں کی مضبوط فوج
کر کے داؤ محل کے میدان میں لا کھڑا کیا [illegible]

ملا محمد مشتی نے فوج کی تیاری کے ساتھ ساتھ خود بھی فن سپہ گری [illegible]۔ چوگان کھیلتے کھیلتے گھوڑے سے گر پڑا،
ں چوٹ آئی، علاج ہوتا رہا۔ شاہی دربار میں حاضری بھی ہوتی رہی۔ اسی دوران پیٹ میں مبتلا ہوا۔ مرض کے حملے بڑھنے لگے۔ ان ہی امراض
اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ لاوارث تھا۔ شاہی حکم سے ملا کی بیوہ اور دو بہنوں رشتہ داروں کو خلعت نوازشوں کے ساتھ ان کے وطن عراق بھیج
یا۔

ت نام خان: نیک نام خاں کا اصلی نام مرزا رضا قلی بیگ تھا۔ آبائی وطن ایران تھا۔ ذی علم آدمی تھا۔ شاہ عباس کے درباری امرا
سے تھا۔ ایک ناگوار واقعے سے دوچار ہوا۔ اپنی عزت و وقار کی حفاظت میں وطن سے چلا اور سیدھے حیدرآباد آ گیا۔ حیدرآباد کا دامن [illegible]

علم و فن کے لیے ہمیشہ کشادہ رہا ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ تھا۔ اس وقت کرناٹک میں میر محمد سعید اردستانی صوبے دار تھا۔ مرزا رضا قلی بیگ اس کا ملازم ہوا اور اہم کارنامے انجام دیے۔ وہ ملک و مالک کا زندگی بھر وفادار رہا۔ میر جملہ میر محمد سعید کی بغاوت کے بعد عبداللہ قطب شاہ نے رضا قلی بیگ ہی کو بہاں کا دیوان مقرر کر دیا۔ اس نے کرناٹک کا سابق میر جملہ سے بہتر بندوبست کیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اس کی کارکردگی سے مطمئن اور خوش ہو کر "نیک نام خاں" کا خطاب دیا۔ نیک نام خاں ایک طرح سے انگریز دشمن تھا۔ ان کے ذمے جو بھی رقم واجب الادا ہوتی پائی پائی وصول کرتا تھا۔ اس سلسلے میں کسی رعایت کا روادار نہ تھا۔

نیک نام خاں کئی عمدہ صلاحیتوں کا حامل تھا۔ وہ شاعر تھا۔ مدبر تھا۔ فن سپہ گری میں طاق تھا۔ اہل علم و فضل کا ہمدرد و مربی تھا۔ علما کی سرپرستی میں پیش پیش رہا کرتا تھا جب ایران سے چلا تا تو اپنے ساتھ علی بن طیفور جیسی قابل ہستی کو ساتھ لے آیا تھا۔ علی بن طیفور کئی علمی کتابوں کا مؤلف و مصنف ہے اس کی حدائق السلاطین زیادہ مشہور ہوئی۔

عبداللہ قطب شاہ نے مرزا رضا قلی بیگ کو نیک نام خاں کا بہت موزوں خطاب عطا کیا تھا۔ وہ زندگی بھر ایران میں بھی اور گولکنڈے میں بھی نیک نام رہا۔

نیک نام خاں نے ۱۰/ ذی الحجہ ۱۰۸۲ھ میں انتقال کیا۔ اس کو عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے شاہی گنبدوں میں دفن کیا گیا۔ مرنے کے بعد بادشاہ نے اس کو یہ اعزاز بخشا۔ وہ ابراہیم قطب شاہ کی گنبد والے چبوترے پر دفن کیا گیا۔ بادشاہ نے ایک فرمان کے ذریعے موضع "سنگاورم" وقف کیا جس کی آمدنی سے اس کی قبر پر روشنی، لنگر اور حافظوں کی تنخواہ دی جاتی تھی۔ یہ فرمان آج بھی اس کی لوح مزار پر کندہ سلطنت قطب شاہیہ کی ترقی کا سبب ایک تو بادشاہان وقت کی رعایا سے بے پناہ محبت تھی۔ دوسرا اہم سبب امراء، وزراء اور دوسرے کلیدی عہدوں پر فائز عہدے داروں کی بادشاہ سے وفاداریاں اور عوام سے محبت تھی۔ وہ عوام کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔ اسی باعث ملک میں امن و امان بھی رہا۔ اور ملک بیرونی حملوں سے امکانی حد تک محفوظ بھی رہا۔ اسی سکون پرور ماحول نے ہمہ رخی ترقی اور خوش حالی کے میدان کو وسعت دی۔ ان شخصیتوں کی زندگیاں وطن سے محبت کی قابل تقلید مثالیں ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

"گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را"

○ ○ ○

ڈاکٹر زینب حیدر

قطب شاہوں کی فارسی علما، ادبا اور شعرا کی سرپرستی

نیست در ایراں زمین سامان تحصیل کمال
چوں نیامد سوئے ہندستاں حنا رنگیں نشد

ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو جلد اول میں لکھتے ہیں کہ قطب شاہی بادشاہوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ تھی کہ وہ سب کے اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ انھوں نے ایک طرف اپنے نسلی خصائل باقی رکھے اور اسلامی علوم کو ترقی دی تو دوسری طرف اپنے ملک کی ب و تمدن کو اپنا کر ایک تیسرا کلچر پیدا کیا۔ (ص ۲۸۲) جس میں دونوں کلچروں کے صحت مند عناصر شامل تھے۔

پندرھویں صدی کے اختتام پر بہمنی سلطنت کا سقوط عمل میں آیا اور دکن کی پانچ سلطنتیں وجود میں آئیں۔ سلطان قلی جو بہمنی ن کا ایک وفادار ترین اور بزرگ ترین امیر شمار ہوتا تھا ۹۲۴ھ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور اپنی سلطنت کا قطب شاہی ت کے نام سے آغاز کیا۔

ڈاکٹر شریف النسا انصاری نے جنھوں نے حدائق السلاطین کی تدوین کی ہے اس کے مقدمے میں یوں رقم طراز ہیں: "سلاطین قطب خود کو ایرانی سمجھتے تھے اور دوستی کا ہاتھ صفویوں کی طرف دراز کیا اور دکن کی تہذیب و تمدن کو اس طرح نشو و نما کیا کہ پایہ تخت باد بنام "صفاہان نوین" مشہور ہوا۔" علامہ میر محمد مومن استرآبادی علیہ الرحمہ حیدرآباد کی تعریف میں لطب اللسان ہیں:

ای خدائی پاکت ہر زمان جان نوی سرمہ شد خاک تلنگانہ فرخ پائی تو
حیدرآباد از تو شد شاہان صفاہان نوی گر صفاہان نو شد از شاہ جہان عباس شاہ

گولکنڈہ، سلطان قلی قطب الملک بانی سلطنت گولکنڈہ ہی کے زمانے سے علما، شعرا اور ارباب کمال کا مرکز بن گیا تھا۔ ایران سے علما ۔ بڑی تعداد گولکنڈہ آئی اور یہ سلسلہ آخری قطب شاہ یعنی ابوالحسن تانا شاہ تک چلتا رہا۔ قطب شاہوں ہی نے ان کی نہ صرف سرپرستی کی ۔ے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ ان علما و مشاہیرن کی تعداد تو بہت زیادہ ہے جہاں پر صرف چند اہم علما اور ارباب کمال کا جائزہ لیا جائے

سب سے مشہور اور ممتاز عالم جو اس دور میں گزرے ہیں وہ میر محمد مومن استرآبادی ہیں۔ ان کا تعلق استرآبادی کے ایک معزز ی خاندان سے ہے۔ ان کے والد کا شمار بھی ایران کے جید علما میں ہوتا تھا۔ ۹۸۹ھ میں ہندستان آئے۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں بہت قدر و منزلت ہونے لگی اور محمد قلی نے ان کو پیشوا کے عہدے پر فائز کیا۔ انھوں نے گولکنڈے کے انتظام سلطنت میں بہت ہی ے نمایاں انتظام دیے۔ حیدرآباد شہر کی تعمیر ان کا نمایاں کارنامہ ہے۔ علامہ میر محمد مومن کو بہت ہی عزت و توقیر دی گئی۔ ان کو جلوخانے ل تک پالکی میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ اور یہ اعزاز صرف انھیں حاصل تھا اس کے بعد ابن خاتون علیہ الرحمہ کو یہ اعزاز ملا۔ کسی اور یہ اعزاز حاصل نہیں تھا۔ انھیں شہزادہ محمد سلطان کا اتالیق مقرر کیا گیا تھا جو میر محمد مومن کی تعلیمات کے اثر سے بہت ہی متقی اور

پرہیزگار ہوا۔ علامہ "رسالہ مقداریہ" کے مصنف ہیں جس میں شرح جعفریہ کے مطابق اوزان و پیمانہ جات کو بتلایا گیا ہے۔ عربی زبان میں انھوں نے کتاب "الرجعت" لکھی۔ اس کے علاوہ ان کا دیوان انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ ان کا فیض جاریہ "دائرہ میر مومن" ہے جہاں آج بھی تدفین کی جاتی ہے۔ اور کئی علما اور مشاہیر یہاں محو خواب ہیں۔ علامہ کو بڑی تنخواہ کے علاوہ جاگیر بھی عطا کی گئی تھی۔ لیکن انھوں نے دنیاوی چیزوں پر پیسہ خرچ نہیں کیا بلکہ مدرسہ اور مکتب کے اخراجات پر یہ رقم خرچ کی۔ اس زمانے کے دوسرے بڑے عالم علامہ ابن خاتون ہیں جن کے متعلق راحت عزمی نے مفصل کتاب لکھی ہے۔ یہاں مختصراً عرض یہ ہے کہ علامہ شیخ محمد ابن خاتون عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں سلطنت کے پیشوا تھے۔ وہ قطب شاہی دور کے ان علماء دین میں ہیں جن کی وسیع النظری، انسان دوستی، دانش وری، سماجی سوجھ بوجھ، علم و حکمت کی روشنی میں قطب شاہی تمدن کو سنوارنے اور نکھارنے میں مدد ملی۔ علامہ مجتہد العصر تھے درس و تدریس سے ان کو فطری لگاؤ تھا۔ علامہ ابن خاتون، محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد کے عہد میں گولکنڈہ آئے درس و تدریس سے زندگی کا آغاز کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے آخری دور میں سلطنت سے منسلک ہوئے۔ عہد محمد قلی قطب شاہ میں گولکنڈے کی سلطنت کی جانب سے مملکت ایران میں سفارت کی اہم خدمت انجام دی۔ کوئی نو سال اس ملک میں سفیر رہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے بالکل ابتدائی دور حکومت میں ایران واپس ہوئے۔ اور نائب پیشوائی کا عہدہ سنبھالا اور بعد میں پیشوا بنا دیے گئے اور عمر بھر اسی منصب پر فائز رہے۔ علامہ نے پانچ ضخیم کتابیں (۱) شرح ارشاد الاذہان، ترجمہ تاریخ قطب شاہی۔ شرح اربعین (۲) شرح جامع عباسی (۳) کتاب الامامت، تکملہ جامع عباسی (۴) "رسالہ فی جواب البہائیہ" اور (۵) تمہید القواعد لکھی۔ پانچویں کتاب کا موضوع شیعہ اصول فقہ ہے۔ کہنے کو علامہ کی یہ کتابیں نثر میں ہیں اور موضوع مذہبی ہے لیکن ان کی ادبی اہمیت بھی مذہبی اہمیت سے کم نہیں۔ ان کی زبان شیریں اور شگفتہ ہے۔ اس کے علاوہ علامہ ایک اچھے غزل گو شاعر تھے۔ ان کے کلام میں زندگی کی ہماہمی بھی ہے اور بلندی فکر بھی، راحت عزمی نے ان کے اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا لب و لہجہ بہت ہی شیریں ہے اور اشعار میں خاص قسم کا آہنگ ہے۔ قطب شاہی کے دور کے ایک اور عالم، مرزا رضا قلی بیگ نیک نام خان شاہ عباس صفوی کے دربار میں معزز عہدے پر فائز تھے۔ وہ حیدرآباد آئے اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں جگہ پائی وہ صاحب سیف و قلم تھے۔ جب مغلوں نے علی عادل شاہ کے دور میں بیجاپور پر حملہ کیا تو نیک نام خاں کو سپہ سالار بنا کر بھیجا گیا۔ نیک نام خاں نے علی بن طیفور کو ایران سے بلوایا اور اس کی سرپرستی کی۔ ابوالحسن تاناشاہ نے نیک نام خاں کو منگلور کا علاقہ بطور جاگیر عطا کیا۔

ملا مجلسی اصفہانی: محمد عبدالجبار ملکاپوری تذکرہ شعراء دکن میں لکھتے ہیں کہ ملا مجلسی تخلص و نام تھا۔ اصفہان مولد تھا۔ صاحب فضل و کمال تھا۔ محتشم کاشی کا شاگرد ہے۔ سخن داں و سخن فہم تھا۔ میدان شاعری میں خوب جولانی کرتا تھا۔ ظریف الطبع، لطیفہ گو، بذلہ سنج تھا عشق پرست و شیفتہ حسن تھا۔ شمالی ہند سے حیدرآباد آیا قطب شاہ کے دربار میں باریاب ہوا منصب مناسب پر سرفراز ہوا۔ ۱۱۰۰ھ میں رحلت کی۔ (تذکرہ، محبوب الزمن ص ۹۷۸)

اختر حسن صاحب اپنی کتاب "گولکنڈے کا فارسی ادب" میں لکھتے ہیں کہ:

"قیاس کہتا ہے کہ سلطان قلی قطب الملک کے عہد میں قطب شاہی سلطنت کا پایہ تخت اہل علم اور اصحاب قلم حضرات سے خالی نہیں رہا ہوگا۔" اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ "یہ بالکل ممکن ہے کہ بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد بیدر کے بعض ارباب کمال، اہل فضل و ہنر گولکنڈہ

ں ہو گئے ہوں اور سلطان قلی کے فیض سے کامیاب ہوئے ہوں۔ لیکن قطب شاہی تواریخ اور تذکروں میں اس دور کے عالموں شاعروں ادیبوں کے حالات نہیں ملتے۔

نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں لکھا ہے کہ سلطان قلی قطب شاہ کے زمانے میں سلطنت کا پایہ۔ ت گولکنڈہ ادیبوں، شاعروں اور ہنرمندوں سے خالی نہیں تھا۔ گولکنڈے میں آتش خانہ کے نام سے ایک مقام تھا جہاں شاعر و ادیب جمع ہوتے تھے۔ "تاریخ محمد قطب شاہی" میں آتش خانہ والی روایت کو ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے متعلق کیا گیا ہے۔ یہ قطب شاہی دور کی پہلی اور مستند تاریخ ہے۔ اس لیے ہم اس بیان کو صحیح سمجھ سکتے ہیں۔ اس دور کے صرف ایک زبردست عالم ملا حسین الطبسی کا نام ملتا ہے جو اس کے بار کا صدر جہاں رہا تھا۔ اس نے مرغوب القلوب کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ "تاریخ محمد قطب شاہی" میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

تاریخ محمد قطب شاہی کے مؤلف نے جمشید قلی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اہل فضل و کمال تھا اور کبھی کبھی شعر بھی کہتا تھا۔ جمشید ، عہد میں قاسم طبسی اور ملا شریف وقوعی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قاسم طبسی کو جمشید نے قطب اللہ پور کا موضع بطور علم پروری اور ادب زی عطا کیا۔

ملا شریف وقوعی جمشید کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ نہ اس کے حالات زندگی ملتے ہیں اور نہ کلام۔ ظاہر ہے کہ جمشید نے جو خود بھی قادر ام شاعر تھا ملک الشعرائی کا انتخاب یوں ہی نہیں کیا ہوگا۔ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا شاعر رہا ہوگا۔ تحفۃ الکرام میں میر محمد شریف وقوعی کا ذکر ہے جو سادات نیشاپور سے تھا اور لکھا ہے کہ یہ شعر و تاریخ دانی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔

قاسم طبسی اور وقوعی کے علاوہ جمشید کے دربار میں اور بھی شاعر ہوں گے۔ "تاریخ محمد قطب شاہی" اور حدیقۃ السلاطین میں ابراہیم ، قطب شاہ کی تخت نشینی اور پیدائش کے وقت شعراء فصیح بیان و ادبا بلیغ بیان کا ذکر ملتا ہے۔ جو بادشاہ کے صلے اور انعام سے بہرہ مند ئے۔ جمشید خود ایک پرگو شاعر تھا۔ جمشید کی زندگی کا یہ واقعہ اکثر مورخین نے نقل کیا ہے کہ جب وجیانگر کے محاصرے سے واپس ہوئے تو ن نظام الملک والی بیدر سے ملاقات کے لیے وہ بہ نفس نفیس بیدر پہنچا اور فرماں روائے احمد نگر سے اس کی خدمت میں خطاب پیش کرنا اتو اس اعزاز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فی البدیہہ یہ اشعار موزوں کر کے سنائے:

مرا نیست بہ چتار شاہی نیاز
خطابے نخواہم بہ عمر دراز

، کی شاعری میں لطافت، سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ اس کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ اور اس کے انداز بیان میں پختگی ہے۔ جمشید کے م میں منقبت بھی ملتی ہے۔

ابراہیم قلی قطب شاہ کی حکم رانی کا طویل زمانہ گولکنڈے کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ وہ ایک نیک نفس، باتدبیر اور دانش مند شاہ تھا۔ اس کے زمانے میں گولکنڈے کی سلطنت کو وسعت و بالیدگی حاصل ہوئی۔ اس نے کثرت سے مدرسے قائم کیے جہاں مفت تعلیم ، جاتی تھی۔ اور طلبا کو وظیفے اور انعامات دیے جاتے تھے۔ اس نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں دکن کی قومی تہذیب و ثقافت کی بنیاد رکھی۔ خود تو شاعر یا ادیب نہیں تھا لیکن شاعروں اور ادیبوں کی حد سے زیادہ قدر و منزلت کیا کرتا تھا۔

رفیع الدین ابراہیم شیرازی تذکرۃ الملوک میں لکھتا ہے کہ جب بھی باغوں سے اس کے یہاں میوہ آتا تو اس کا کچھ حصہ وہ شعرا
اور ادیبوں کے پاس بطور تحفہ ضرور روانہ کرتا۔ (تذکرۃ الملوک مؤلفہ رفیع الدین ابراہیم شیرازی مخطوطہ مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ۔

ڈاکٹر زور نے داستان ادب حیدرآباد میں لکھا ہے کہ ابراہیم کے دور کے فارسی شعرا کا حال تو معلوم نہیں البتہ اردو کے حسین شا
خیالی، سید محمود اور فیروز کا حال ملتا ہے۔ جس میں اول الذکر کا یہ حال تھا کہ اس نے ۹۷۳ھ میں ایک خوش وضع دو منزلہ مسجد تعمیر کروا
جو اب تک گولکنڈہ کے نئے قلعے میں موجود ہے۔ تاریخ قطب شاہی میں لکھا ہے کہ سفر و حضر میں ہمیشہ شاعر و ادیب ابراہیم کے ساتھ
اس نے اپنے محل کا ایک حصہ شاعروں اور عالموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ جگہ آتش خانہ کہلاتی تھی۔ اور یہاں اہل فکر و نظر ارباب علم
جمع ہوتے اور شعر و سخن کی محفلیں برپا ہوتیں۔ علمی و ادبی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا بعض اوقات بادشاہ بھی ان محفلوں میں شریک
ابراہیم کے عہد میں شعر و سخن کا چرچا اتنا بڑھ گیا تھا کہ بات بات پر شعرا نظمیں لکھتے اور صلہ و انعام پاتے۔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں
و ادب کے علاوہ مذہبی اور تاریخی موضوعات پر بھی کچھ کتابیں لکھی گئیں۔ خورشاہ بن قباد الحسینی نے اس زمانے میں ایک بسوط تاریخ
کی۔ وہ ابراہیم کے دربار کا ایک بلند پایہ مفکر اور محقق تھا۔ اس کے علاوہ ابراہیم کے عہد میں فلسفہ و حکمت کے بعض باکمال بھی گولکنڈہ
میں موجود تھے۔

قاسم طبسی نے اسناد اور خطوط کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو انشاء قاسم طبسی کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں طبسی کے زمانے
تاریخی واقعات اور ہند ایران روابط پر روشنی پڑتی ہے۔

دوسرا اہل قلم وفاخاں تھا جو ابراہیم قطب شاہ کا وزیر تھا اس کا نام معزالدین تھا۔ وہ اچھا شاعر تھا۔ ابراہیم اس کا بہت احترام کرتا
تیسرا شاعر میری تقی الدین معروف بہ میر شاہ بہت بڑا عالم بھی تھا۔ تاریخ تحفۃ الکرام اور آتش کدہ سے اس کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس
صرف دو شعر آتش کدہ میں ملتے ہیں:

لطف باخبر غایتی دارد	جود با ما نہایتی دارد
گوش بر حرف مدعا نکشند	ہر کہ بینی حکایتی دارد

محمد قلی قطب شاہ دکن میں مشترکہ تمدن و تہذیب کا بانی تھا۔ اس کے عہد میں مقامی عیدیں مثل بسنت، دیوالی، ہولی، دسہرہ
بہت ہی شان و شوکت سے منائی جاتی تھیں۔ اس نے ایرانی لباس ترک کر کے دکنی لباس اختیار کیا وہ ادب ظریف کو پسند کرتا تھا۔ اس کے
میں شعر و سخن اور موسیقی کو بہت ترقی ہوئی۔ اس کا ایک ضخیم دیوان ملتا ہے۔ کلیات محمد قلی کی کتابت ۱۰۲۵ھ میں انجام پائی۔ اس کے
میں قصہ۔ حسن و عشق، معاملہ بندی، رموز و نکات و معنی آفرینی پائی جاتی ہے اور اس کے کلام میں حسن بیان، خوب صورت تشبیہا
استعارات موجود ہیں:

زمستان محنت بدوعالم نفروشند کیفیت جتہ جرعہ پیمانہ خود ر

محمد قلی کے اشعار حافظ کی طرح آہنگ اور موسیقیت رکھتے ہیں ملاحظہ ہو:

پیچیدہ پیچم پادہ امیں رلہ ۔۔۔ ۔۔۔

اس کا ایک فارسی مرثیہ بھی موجود ہے۔

وجہی، دربار محمد قلی قطب شاہ کا ایک ملک الشعرا تھا۔ اس نے چار قطب شاہی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور اس نے بہت طویل ز
پائی ۱۰۱۸ھ میں مثنوی "قطب مشتری" لکھی۔ سلطان محمد کے عہد میں پندرہ سال گوشہ نشین رہا۔ سلطان محمد کی وفات کے بعد ۱۰۳۵
عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں "سب رس" تصنیف کی۔ وجہی کا فارسی دیوان کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے جو نو سو اشعار پر
ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ناقص الطرفین ہے۔ یہ دیوان غزل سے شروع ہوتا ہے اور ردیف وار ہے۔ اس میں رباعیات اور قطع
بھی موجود ہیں۔

جائے است درین بزم وجہی کہ ز رشکش حسرت بیاں خاک کند حکمت جم را

اس کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نام اسد اللہ وجہی تھا اور وہ اصلاً خراسانی تھا۔ اس کی طبیعت میں رنگینی اور عیش پرستی تھی۔

اس دور کا دوسرا شاعر مرزا امین شہرستانی میر جملہ تھا۔ مثنوی "خسرو شیریں" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۹ سال کی عمر میں وہ اپنے وطن
ہندستان آیا اور ۱۰۱۱ھ میں میر جملہ کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوا۔ اس کا تخلص "روح الامین" اور "روح امین" تھا اور اس نے خرد سالگی میں
شہرت حاصل کر لی تھی۔ ۱۰۲۷ھ میں اس نے بادشاہ سے اجازت لی تاکہ حج کے لیے جائے اور بیجاپور گیا۔ وہاں پر عادل شاہوں نے اس کی
خواہ پذیرائی نہیں کی اور حج کے بعد وہ شاہ عباس صفوی کی خدمت میں پہنچا اور چاہتا تھا کہ اس کا بحیثیت وزیر تقرر ہو لیکن اس کا یہ خو
شرمندہ تعبیر نہیں ہوا ناچار دہلی واپس آیا۔ جہانگیر نے اس کو بیس ہزاری منصب خلعت و انعام دیا اور شاہ جہاں کے عہد میں میر بخشی
عہدے پر سرفراز ہوا اور ۶۶ سال کی عمر میں ۱۰ ربیع الثانی ۱۰۳۸ھ وفات پائی۔ اس کا کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا لیکن ایک دیوان ہ
"گلستان ناز" پانچ مثنویوں کا مجموعہ شائع ہوا جو ہندستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس کے مجموعہ غزلیات کے دیباچے سے ما
ہوتا ہے کہ وہ عنفوان شباب میں غزلیں کہتا تھا۔ شمس اللہ قادری اس دیوان کی تدوین کا سال ۱۰۲۰ھ بتاتے ہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں۔
کیوں کہ وہ ۱۰۱۲ھ میں حیدرآباد آیا اور قطب شاہ کے دربار سے منسلک ہوا۔ اس نے "گلستان ناز" کا انتساب ارباب علم و فکر و صاحبان اہ
دسخن وران شیریں زبان، کے نام کیا ہے۔ اکثر غزلیں پانچ تا سات اشعار پر مشتمل ہیں۔ اس نسخے میں کشمیر کی مدح میں ایک قصیدہ موجود
لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کس زمانے میں کشمیر گیا۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے:

گل حدیقہ جہاں عکس خار کشمیر است
بہشت گستر نہاں شرم سار کشمیر است

وہ حقیقت میں غزل و مثنوی کا شاعر تھا قصیدہ کا شاعر نہیں تھا۔ اس نے مثنوی کو اوج کمال پر پہنچایا۔ اس کی شاعری میں سعدی کے اشعار
سادگی اور خوش آہنگی اور حافظ کی سرشاری موجود ہے۔ اس کے اشعار تکلف و تصنع سے پاک ہیں۔ ان میں نکتہ رسی، بلند خیالی، معنی آفر
موجود ہے:

ہست روح الامین پیمبر عشق امت او شوید با اصحاب

اس کو اپنی خداداد صلاحیت پر فخر تھا۔ وہ میر نجم و نظم ریز دعاؤں کا انتخاب کرتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

مرا در آتش غیرت پسند کرد و گذشت　　　　بہ جنبش مژہ ای ابرو بلند کرد و گذشت
رانبہ گرفت جنبش ، ندانیم راہ کیست　　　　معراج الامین بہ کفر و اسلام کردہ پشت

اس دور کا ایک اور شاعر حسین بن علی الفرسی ہے۔ وہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا ایک غیر معروف لیکن باکمال شاعر تھا۔ اس نے قطب شاہیوں کی تاریخ کو بیس ہزار اشعار میں شاہنامہ کی طرز پر نظم کیا ہے۔ اس کا تخلص فرسی تھا۔ اس تاریخ کا ایک حصہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ اس کا دوسرا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کا نام فرسی حسین بن علی لکھا ہے۔ اس مخطوطے کا نام "نسب نامہ قطب شاہی" ہے۔ اس کو زبان و بیان پر قدرت تھی اور کلام میں سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔

علامہ میر محمد مومن نے بحیثیت ایک ادیب و شاعر کے بھی شہرت حاصل کی۔ ڈاکٹر زور نے اس کے متعلق اپنی کتاب میں جو ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے لکھا ہے کہ آپ کی کتاب "رسالہ مقداریہ" جو محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں لکھی گئی تھی طبی و شرعی اوزان و پیمانہ جات سے متعلق ہے۔ یہ کتاب O.M.L حیدرآباد اور کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے اور ان کا ایک فارسی دیوان کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔ قطب شاہی عہد کی بعض تاریخوں میں ان کے چند اشعار ملتے ہیں۔ شاہنامے کے مؤلف اور حدیقۃ السلاطین کے مصنف نے ان کی اصلاح کی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی مدح میں ان کے قصیدے موجود ہیں۔ ایک قصیدہ سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت کیا گیا تھا جو پر شکوہ ہے:

کہنہ جامہ می فشانم جنبش جامان نوی　　　　بامحبت بازبستم عہد و پیمان نوی

میر محمد مومن کے اشعار میں علمیت، معنی آفرینی اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔

سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں عشرتی یزدی، علی گل استرآبادی، میر مومن، ادائی یزدی، محمد امین بن محمد شریف استرآبادی، قادر بیگ کوکی، خیالی اردستانی، سید مراد اصفہانی، حکیم کمالا کاشی کا بلند شعراء میں شمار ہوتا ہے۔

سلطان محمد فلسفہ، تاریخ و علوم دینی سے دل چسپی رکھتا تھا اور بیشتر اوقات علماء کی صحبت میں گزارتا تھا۔ اس کے کتب خانے میں مذہب، تاریخ، فلسفہ و تمدن کی کتابیں موجود تھیں۔ وہ ہمیشہ کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا اور ان پر تنقید کرتا تھا۔ سلطان محمد نے اپنے چچا محمد قلی قطب شاہ کا دیوان مرتب کیا اور اس پر مقدمہ لکھا۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ پہلے ظل اللہ اور پھر سلطان تخلص کرنے لگا۔ اس کا ایک دیوان کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے جو ۱۷۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے اشعار پر حافظ کا اثر ہے۔ اس کے دیوان میں ایک غزل "توحید باری" دو غزلیات "مدح شاہ اولیا" تین غزلیں در بارہ ائمہ معصومین علیہم السلام اور بارہ غزلیں و بارہ رباعیاں ہیں۔ آخر میں سید الشہدا حضرت امام حسینؑ کا ایک مرثیہ بھی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

قرب یارم ز خلق و دولت اوست　　　　این ہمہ حستتم زحمت اوست
چارہ ہم تلخ کابت لب خندان کردہ　　　　زہر رانوش لبت چشمۂ حیوان کردہ

"تاریخ محمد قطب شاہی" سلطان محمد کے عہد میں لکھی گئی جو کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ یہ کتاب قطب شاہی دور کے عمدہ ماخذوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ، چار مقالوں اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔

شکار نامہ: یہ حسینی الحسینی الطبسی کی تالیف ہے۔ جس کو بادشاہ کے دربار سے خطاب "لسان الغیب، وحید جہاں" ملا یہ ایک مقدمہ دس ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔

شکار نامہ: یہ حسینی الحسینی الطبسی کی تالیف ہے۔ جس کو بادشاہ کے دربار سے "لسان الغیب" وحید جہاں ملا۔ یہ ایک مقدمہ دس ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

عبداللہ قطب شاہ نے اپنے عہد میں ادب کا احیا کیا۔ جو شعراو باکمال سلطان محمد کے عہد میں گوشہ نشین ہوگئے تھے دوبارہ اپنی ادبی، علمی سرگرمیوں میں معروف ہوگئے۔ وجہی جو دربار محمد قلی قطب شاہ کا ملک الشعرا تھا اس عہد میں زندہ تھا اسے ایک نئی زندگی ملی اور گوشہ نشینی اور تنہائی سے باہر آیا۔ غواصی ایک ذہین، برجستہ گو شاعر تھا اور وجہی کے بعد ملک الشعرا ہوا۔

عبداللہ قطب شاہ نے ادبیات کے علاوہ مذہب، تاریخ، ریاضی، نجوم اور دیگر موضوعات پر کتابیں لکھوائیں۔ عبداللہ قطب شاہ ملاحسین آملی کا شاگرد تھا۔ اس نے "شرح نہج البلاغہ" اور "ہدایت الابرار" لکھی "کتاب المعارف" اور "راحت العمل" اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ سید نظام الدین، عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا۔ جس نے ۱۰۸ رسالے متعدد علوم و فنون کے بارے میں لکھے جو "شجرہ دانش وران" کے نام سے مشہور ہیں۔ شیخ احمد الہندی کی کتاب کا ترجمہ بہاالدین آملی نے فارسی میں کیا۔

شاہ قاضی نے عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے ایک کتاب "کثیر المیامین" کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ علامہ ابن خاتون کا ذکر علما کے زمرے میں کیا جاچکا ہے ان کے ہم عصر شعرا میں میر محمد سعید اصفہانی تھے جو میر جملہ کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے اور ساوات اردستان سے تھے۔ نظام الدین احمد صاعدی شیرازی نظاما تخلص کرتے تھے اور اپنے دور کے شاعروں اور ادیبوں میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ان کی تصنیف "حدیقۃ السلاطین" تاریخ کا بہت اچھا ماخذ ہے اور اس میں عبداللہ قطب شاہ کے زمانے کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ حوزہ علمیہ علامۃ الزمان شیخ محمد ابن خاتون العاملی میں آپ کو جگہ حاصل تھی۔

برہان تبریزی عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ آیا۔ اس نے لغت نویسی کے اصول کو مرتب کیا۔ اور ایک کتاب "برہان قاطع" کے نام سے مرتب کی جو ۱۰۶۴ھ میں تالیف ہوئی۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا دوسرا لغت نویس محمد علی ہے جس نے ضرب الامثال کو ردیف وار مرتب کیا اور ہر ضرب المثل کی تشریح کی۔ اس کتاب کا نام مختلف طرح سے لکھا گیا ہے۔ "جامع التمثیل"، "مجاہب الامثال" و "مجمع الامثال" وغیرہ یہ کتابیں ۱۲۶۸ھ میں طہران میں اور ۱۲۹۱ھ میں بمبئی میں شائع ہوئیں۔

سعید کاشانی: اس کا تخلص "سرمد" تھا۔ یہ اصلا یہودی تھے بعد میں اسلام قبول کر لیا اور ان کا شمار بڑے صوفیوں میں ہونے لگا۔ صاحب مرآۃ الخیال نے ان کو غدار و بد اشعار نیک لکھا ہے۔

علی بن طیفور کے ادبی آثار بہت زیادہ ہیں۔ لیکن آج صرف اس کی نثر کا نمونہ حدیق السلاطین جیسی دست یاب ہوتا ہے جس کا

موضوع مذہب، تصوف، تذکرہ اور سائنس ہے۔ اس کی دوسری تصانیف تحفہ ملکی، تحفہ قطب شاہی، شرح عوامل، انوار التحقیق، رسالہ معصومین، تحفۃ الغرائب، ترجمہ مکارم الاخلاق طبرسی، گنج نامہ در حل لغات شاہنامہ ہیں۔ حدیق السلاطین فی کلام الخواقین کو ڈاکٹر شریف النساانصاری نے مرتب کیا ہے۔

میر محمد کاظم حسینی کریم نے دس مثنویاں بنام "عشرہ مبشرہ" لکھیں۔ وہ رباعی گو شاعر بھی تھا اس نے چار ہزار رباعیاں فارسی زبان میں لکھی ہیں:

هر مصرع دیباچہ مستانہ من   رمزیست راز دل دیوانہ من
دیباچہ کریم بر رباعیات من   گنجی است کہ باشد بویرانہ من

اس نے ایک اور کتاب گنج نامہ کے نام سے لکھی جس میں اس نے بادشاہ کو عدل کرنے کی طرف راغب کیا ہے۔

[نوٹ: اس موضوع پر ڈاکٹر نجمہ صدیقہ کا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ انگریزی میں موجود ہے۔ جو ابھی طبع نہیں ہوا۔ اس کا عنوان "Development of Persian language and Literature in the reign of Qutub Shahis" ہے۔ ڈاکٹر ضیاالدین شکیب نے بھی اپنے غیر مطبوعہ پی ایچ۔ ڈی کے مقالے میں علماء و شعرا کا ذکر کیا ہے۔ "The external relations of Golconda with Iran" میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر صادق نقوی صاحب نے بھی اپنی کتاب "Golconda Iran Relations" میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

○ ○ ○

ڈی راما نج راؤ / ڈاکٹر زینت ساجدہ

قطب شاہی عہد میں تلگو شاعری

بہمنی حکومت کے زوال پر برار میں عماد شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی، بیجاپور میں عادل شاہی اور بیدر میں برید شاہی حکومتیں قائم ہو گئیں تو گولکنڈے کے صوبے دار قطب الملک نے بھی ۱۵۱۸ء میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ تلنگانہ کے لیے قطب الملک نیا نہیں تھا۔ خود مختاری کے اعلان سے چوبیس سال پہلے ہی سے وہ عملاً اس علاقے کا حکمران تھا۔ اس لیے نئی سلطنت کے استحکام میں اس کو کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ تلنگانے کے عوام اس سے بڑی محبت کرتے تھے اور عقیدت اور احترام سے "بڑے ملک" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔

قطب الملک کو اپنی سلطنت میں نئی تہذیبی روایات قائم کرنے کا بہت کم موقع ملا لیکن اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا کہ اس سلسلے میں اس نے غفلت برتی۔ آش خانہ کا نام قطب شاہیوں کے نام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ ایک محل تھا جہاں ادیب، شاعر اور دانش ور جمع ہوتے اور شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتیں، قطب الملک بھی ان صحبتوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔

قطب شاہی خاندان کے آٹھ حکم ران ہوئے ہیں۔ جنھوں نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ۱۶۸۷ء تک حکومت کی۔ ان کا تعلق تلگو بولنے والے علاقے سے تھا اس لیے انھیں سلاطین آندھرا بھی کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کے مشہور حکم ران ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ ر محمد قطب شاہ ہوئے ہیں جنھوں نے دکن کی سیاست اور تہذیب پر گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد حکومت (۱۵۵۰-۱۵۸۰ء) میں سلطنت کی بنیادیں مستحکم ہوئیں اور جب (۱۵۶۵ء) سلطنت وجیانگر کا خاتمہ ہوا تو اس کے حدود اور وسیع ہوگئے۔

سلاطین گولکنڈہ علم دوست، رعایا پروری، روشن خیال اور روادار تھے۔ ان کے عہد حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذہنی اور جذباتی اتحاد قائم ہو گیا تھا اور وہ ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر ہونے لگے تھے۔ اس تہذیبی لین دین کو ابراہیم قطب شاہ کے ر میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ وہ تلگو عوام میں بے حد مقبول تھا۔ آج بھی لوگ اس کو محبت اور عقیدت سے "ملک بھرام" کے نام سے یاد تے اور اپنا قومی ہیرو مانتے ہیں۔ یہ دکن کا پہلا مسلمان حکم ران ہے جس نے تلگو ادب اور تہذیب سے غیر معمولی دل چسپی لی۔ وہ شہزادگی ، زمانے میں سات سال تک وجیانگر میں جلاوطنی کی زندگی گزار چکا تھا۔ جہاں راجا کے دربار میں اس نے تلگو ادب کا مذاق پیدا کیا اور جب ۱۵ء میں وہ گولکنڈے کے تخت و تاج کا مالک ہوا تو اپنے اسی ذوق کی وجہ سے تلگو ادب اور شاعروں کی سرپرستی کی۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا اور تلگو زبان و ادب سے واقفیت تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھی جانے لگی تھی۔

ابراہیم قطب شاہ کا جانشین محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰-۱۶۱۲ء) بھی تلگو ادب اور تہذیب کا دلدادہ تھا۔ اس لیے اس کے عہد حکومت ابراہیم کی روایات پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی رہیں۔ محمد قلی قطب شاہ حیدرآباد کا بانی تھا۔ اس کے زمانے میں فن تعمیر کو بہت ترقی ہوئی۔ ینار، جامع مسجد، دار الشفاء، چار سو کا حوض، چار کمان، جلوخانہ، دولت خانہ شاہی، شاہی عاشور خانہ، ندی محل، خداداد محل، حنا محل و اسی کے ذوق حسن کاری کے مظہر ہیں۔ جن میں سے اب بعض کا صرف نام رہ گیا ہے۔ وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس نے ے کے تہواروں، تقریبوں رسم و رواج، موسموں اور عورتوں وغیرہ کے بارے میں جو نظمیں کہی ہیں اور جس روانی اور بے تکلفی کے ساتھ

اپنی شاعری میں تلگو الفاظ استعمال کیے اور اس میں مقامی رنگ کو سمویا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے دکن کی تہذیب اور تلگو زبان سے اس کو کتنا لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تلگو زبان کا شاعر بھی تھا لیکن ابھی تک اس کا تلگو کلام دست یاب نہیں ہو سکا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے بعد محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں بھی ذہنی تعمیر اور تہذیبی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے دربار سے فارسی اور اردو شاعروں کے علاوہ تلگو کے اہل علم اور شاعر بھی متوسل رہے، جن کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جائے گا۔

ادنکی گنگادھر کوی: گولکنڈے کا ممتاز شاعر ہے جس کو ابراہیم قطب شاہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کی مشہور تصنیف تپتی سمورن اپاکھیانم تلگو کے بہترین پربندھوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کی کہانی مہابھارت کے ایک قصے سے ماخوذ ہے، جس میں سمورنا اور تپتی کے فسانۂ عشق کی روداد بیان کی گئی ہے۔

گنگادھر کوی نے تپتی سمورن اپاکھیانم کو اپنے مربی اور سرپرست ابراہیم قطب شاہ کے نام معنون کیا ہے۔ دستور زمانہ کے مطابق اصل قصے سے پہلے قطب شاہوں کا شجرہ درج کیا گیا ہے جس کے بعد ابراہیم کی مدح میں شعر ہیں۔ پربندھ کی عام روش کے مطابق اس کے ہاں بھی صناعی اور مشکل پسندی پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا اسلوب بڑا تیکھا اور جان دار ہے۔ رفعتِ تخیل، جلالت اور شکوہ لفظی اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

پنی کنٹی تلاگنا: کاسلاناڈو کا رہنے والا اور ابراہیم کے عہد کا شاعر ہے۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ وہ ابراہیم کے دربار سے متوسل تھا۔ اس کی تصنیف یایاتی چرتر تلگو ادب میں منفرد اور امتیازی مقام رکھتی ہے۔ قطب شاہیوں کے عہد تک تلگو زبان اور ادب پر سنسکرت کا غلبہ رہا۔ یہاں تک کہ فنی موشگافیوں میں بھی سنسکرت بلاغت ہی کی پیروی کی جاتی تھی۔ لیکن قطب شاہیوں کے عہد میں خالص تلگو (اچا تلگو) میں شعر گوئی کا رجحان پیدا ہوا اور بہت سے جلد ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ اس تحریک کا بانی اور جنم داتا پنی کنٹی تلاگنا ہے جس نے یایاتی چرتر میں کم سے کم سنسکرت الفاظ استعمال کر کے خالص تلگو میں ادبی تخلیق کی کوشش کی ہے۔ یایاتی چرتر کو تلگو ادب میں وہی مقام حاصل ہے جو انشاء کی رانی کیتکی کی کہانی کو اردو ادب میں حاصل ہے۔

یہاں یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ تلاگنا سے پہلے ٹھیٹ تلگو میں شعر کہنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ تلاگنا کا یہ کارنامہ ہے اس نے پہلی بار پانچ ابواب پر مشتمل ایک مستقل نظم ٹھیٹ تلگو میں کہی اور پربندھ کے پورے لوازم کو برقرار رکھا۔ اس کو محض ایک تجربہ یا صناعت پارہ قرار دینا بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ اس میں ادبی تخلیق کے تمام صوری اور معنوی محاسن موجود ہیں اور ہر حیثیت سے وہ اس کی مستحق ہے کہ تلگو کے بہترین ادب کے ساتھ رکھی جائے۔

یایاتی چرتر کی زبان خالص روزمرے اور محاورے کی وجہ سے سنسکرت کا مذاق رکھنے والوں کے لیے نامانوس اور مشکل معلوم ہوتی ہے لیکن بجائے خود سلیس اور رواں ہے۔ ٹھیٹ تلگو محاورے نے اس میں عجیب سادگی اور پرکاری پیدا کر دی ہے۔ تلاگنا کا اسلوب شگفتہ اور جان دار ہے۔

یایاتی چرتر کی پیروی میں کئی شاعروں نے اچا تلگو میں نظمیں کہیں لیکن تلاگنا کو جو کامیابی نصیب ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں

آتی بلکہ ان میں سے بعض تو مقامی روزمرہ اور محاورے کے غلو کی وجہ سے چیستان بن کر رہ گئی ہیں۔ جن کا سمجھنا کن ولن باشندوں کے بھی بس کا روگ نہیں ہے۔ اسی لیے ایک نقاد نے کہا ہے۔ "ان منظومات کو آثار قدیمہ سمجھ کر کسی ادبی عجائب گھر میں محفوظ کر دینا چاہیے۔"

کندوکوری ردراکوی: وشنو برہمن تھا۔ اس نے اپنی تمام تصانیف کندوکور سومیشور کے نام معنون کی ہیں جس کی وجہ سے خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق ضلع نلور سے تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ سترھویں صدی کے اوائل میں گزرا ہے اور بعضے اس کو اٹھارویں صدی کا شاعر بتلاتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ وہ ۱۵۵۰ء۔ ۱۵۸۰ء کے درمیان بہ قید حیات تھا اور ابراہیم کے دربار سے متوسل تھا۔ ایک کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم نے ادبی خدمات کے صلے میں اس کو چنتل پالم جاگیر میں دیا تھا۔

کندوکوری ردراکوی کی دو تصانیف ہیں۔ ایک نرن کشا پا کھیانم اور دوسرے سگریو وجیم۔ نرن کشا پا کھیانم بڑا خوب صورت پربندہ ہے۔ اس سے سولھویں صدی کی سیاسی اور سماجی تاریخ کے بعض اہم گوشوں اور خاص کر تالی کوٹ کی جنگ کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ سلیش کاویہ ہے اور محاورے اور ضرب الامثال کے برجستہ اور برمحل استعمال نے اس کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔ ردراکوی کو مکالمہ نگاری میں بڑی مہارت حاصل تھی، جس کے بعض خوب صورت نمونے اس نظم میں ملتے ہیں۔

مرن گنٹی سنگراچاریہ: اسے بھی ابراہیم کی سرپرستی حاصل تھی۔ وہ دسرتھ راجانند ناچرتر اور نروشمیار ابھن کا مصنف ہے۔ سلاست شیرینی، اور اثر انگیزی اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں، جن کا وریش لنگم پنتلو نے بھی اعتراف کیا ہے۔

سارنگ سے تمیا: نیوگی برہمن اور شیومت کا پیرو تھا۔ اس کے گرو کا نام کندلا اچاریہ بتلایا جاتا ہے جو اپنے عہد کے اکابر علما میں شمار کیا جاتا تھا۔ سارنگ تمیا گولکنڈے کا کرنام اور محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سلطان محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ دونوں کا زمانہ دیکھا تھا اور اس کو ان دونوں کی سرپرستی حاصل رہی۔

سارنگ تمیا ویجنتی ولاسم کا مصنف ہے جو پربندہ ادب میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اپنی اس تصنیف کا اس نے سری رام کے نام انتساب کیا ہے۔ وہ قطب شاہیوں کا بڑا مداح تھا۔ چناں چہ ویجنتی ولاسم کے دیباچے میں اس خاندان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے محمد قلی قطب شاہ کی رعایا پروری، رواداری اور علم دوستی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس سلسلے میں سلطان محمد قطب شاہ سے اپنی دوستی کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "میرے اور سلطان کے درمیان راعی اور رعایا کا نہیں بلکہ وہ تعلق قائم ہے جو ایک سخن گو اور سخن سنج مربی کے درمیان ہوتا ہے۔"

ویجنتی ولاسم میں بھگتی اور شرنگار کی بڑی خوب صورت ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ تمیا کو الفاظ کے استعمال کا بڑا سلیقہ تھا۔ اس کا اسلوب حسب موقع کہیں نرم و نازک اور لطیف اور کہیں تند و تیز اور پر شکوہ ہوتا ہے لیکن فصاحت اور زور کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔

ملاریڈی: بکنا اولو سمستھان کے حکم راں خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو اپنے علم و فضل اور رعایا پروری کے لیے بہت مشہور تھا۔ خاندان کے آخری راجگان نے دوم کنڈے کو اپنا مستقر بنا لیا تھا، اس لیے یہ خاندان راجگان دوم کنڈہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔

ملاریڈی کا بھائی کاسی ریڈی بھی شعر و ادب کا ستھرا مذاق رکھتا تھا۔ اور محمد قلی قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ بادشاہ اس کو عزیز رکھتا تھا۔

ملا رپڑی کی تصانیف میں شٹ چکرورتی، شیولامر موترم اور پدما پران قابل ذکر ہیں۔ شٹ چکرورتی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے چھ حکمرانوں کی داستان حیات ہے جو سلیش کاویہ میں قلم بند کی گئی ہے۔ اس کی زبان مغلق ہے اور رعایت لفظی اور صنائع بدائع کے استعمال کی وجہ سے اسلوب مشکل پسندی کا شکار ہو گیا ہے۔ شیولامر موترم اور پدما پران میں سلیش کاویہ کا التزام نہیں برتا گیا ہے، اس لیے ان کی زبان سلیس اور اسلوب بیان شگفتہ اور دل چسپ ہے۔

ملا رپڑی اگرچہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور دربار گولکنڈہ میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ انتہائی خلیق اور منکسر المزاج تھا۔ اس نے اپنی تصانیف میں اپنے خاندان اور رشتے داروں کی تو بڑی تعریف کی ہے لیکن خود اپنے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔

سورنگی ماد ھوزایا: پدما ویلما، جٹ پول سمستان کا راجہ تھا۔ اس کی تصنیف چندریکا پریتیم پربندھ کے آخری دور کی معرکہ آرا تخلیق ہے جو دسوچرتر کے ڈھنگ پر لکھی گئی ہے۔ ماد ھورایا نے تلگو کے مثالی بندھوں کی بہترین خصوصیات کو بڑی چابک دستی کے ساتھ اپنایا ہے۔ جہاں تک سلیش کاویہ کا تعلق ہے رام راج بھوشن کے بعد اسی کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں ایک فرق یہ ہے کہ رام راج بھوشن نے سنسکرت اور تلگو سے برابر کام لیا ہے لیکن ماد ھورایا کا میلان سنسکرت کی طرف زیادہ ہے۔ اس کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ اس نے جو زبان اور طرز ادا اختیار کیا ہے وہ جذبات کے اتار چڑھاؤ اور حسن و عشق کے موضوعات کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔

گوپنا: ابوالحسن تاناشاہ (۱۶۷۲ - ۱۶۸۷ء) کے عہد کا مشہور رام بھکت ہے۔ کہتے ہیں کہ اکنا مادنا کے زمانے میں گوپنا بھدراچلم کا تحصیل دار تھا۔ ایک دفعہ جب مال گزاری کی رقم جمع ہوئی تو شاہی خزانے میں داخل کروانے کی بجائے اس نے ایک مندر کی تعمیر پر صرف کر دی۔ عہدے داران متعلقہ کو خبر ہوئی تو تصرف و تغلب کے الزام میں گوپنا کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ آج بھی قلعہ گولکنڈے میں لوگ ایک کوٹھری کی نشان دہی کرتے ہیں جہاں اس رام بھکت نے قید و بند کے دن کاٹے تھے۔ کہتے ہیں کہ گرفتاری اور نظر بندی کا گوپنا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ عبادات و اذکار میں مشغول رہا کرتا۔ اس کی اس بھگتی سے متاثر ہو کر سری رام ایک عام آدمی کے روپ میں ظاہر ہوئے اور مال گزاری کی رقم خزانہ شاہی میں داخل کروا دی۔ گوپنا رہا کر دیا گیا اور رام بھکت کے نام سے مشہور ہوا۔ گوپنا نے بھدراچلم میں جس مندر کی تعمیر کی تھی اس کے لیے تاناشاہ نے عطیات اور اوقاف مقرر کر دیے تھے جو آصف جاہی دور میں بھی جاری رہے۔

قید و بند کے زمانے میں گوپنا نے کچھ نظمیں اور گیت لکھے تھے جو بہت مشہور ہوئے۔ ایک گیت میں وہ اپنے بھگوان کو مخاطب کر کے کہتا ہے "سری رام میں نے پوری رقم آپ ہی کے نام پر صرف کی، اپنی ذات پر ایک کوڑی بھی خرچ نہیں کی، یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔" ایک اور جگہ کہتا ہے "اس روپے سے میں نے سیتاجی کی مورتی کے لیے زیور بنوائے تھے"

ان نظموں اور گیتوں میں بے انتہا خلوص، سادگی اور سوز و گداز پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ گوپنا کی زندگی ہی میں وہ زبان زد خاص و عام ہو گئے تھے۔

گوپنا سے داسرتھی شتک بھی منسوب کی جاتی ہے جو بھگتی شتکوں میں بہت بلند درجہ رکھتی ہے۔

○ ○ ○

پروفیسر اشرف رفیع

محمد قطب شاہ اور اس کے کارنامے

تاریخ کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ بعض سلاطین کے کارنامے ان کے پیش رو حکم رانوں اور ان کے بعد آنے والے تخت نشینوں کے درمیان اپنی حقیقی عظمت و اہمیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت قطب شاہی سلطنت کے محمد قلی قطب شاہ اور اس کے ۔اسے عبداللہ قطب شاہ کے درمیان ایک عابد، عادل، متقی، عالم، فاضل اور مدبر بادشاہ محمد قطب شاہ کے ساتھ پیش آئی۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور سے متعلق سلطنت کے عروج و ترقی کے تذکروں سے قطب شاہی عہد کی تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے پینتیس سالہ دورِ حکومت میں قطب شاہی سلطنت کے سیاسی انحطاط اور تہذیبی احیا اور ارتقا کا مورخین نے مکمل احاطہ کیا ہے لیکن سلطان محمد کے منصوبوں کو ام عروج تک پہنچانے والے ایک امن پسند اور علم پرور سلطان محمد قلی قطب شاہ کے رفیع الشان کارناموں اور اس کی شخصیت کی بھرپور صویر کشی نہیں ملتی۔ محمد قطب شاہ نے اپنے پیش رو حکم رانوں کی تفصیلی تاریخیں مرتب کروائیں اور ان کے کارناموں کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا، لیکن خود اپنے عہد اور اپنے کارناموں کو منظر عام پر لانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید یہ کام اس نے اپنے بیٹے عبداللہ قطب ماہ کے لیے اٹھا رکھا تھا۔

محمد قلی قطب شاہ کے بھائی شہ زادہ محمد امین کی بیوی خانم آغا کے بطن سے ۔بتاریخ ۱۷ مارچ ۱۵۹۳ء م ۲۳ ربیع الثانی ۱۰۰۱ھ چہار شنبہ کے دن شہ زادہ سلطان محمد مرزا تولد ہوا۔ اس موقع پر حضرت میر محمد مومن پیشوائے سلطنت نے ایک تہنیتی نظم لکھی اور آخری شعر میں ریخ نکالی۔ وہ شعر یہ ہے:

خورستم تاریخ آن فرخندہ گوہر ، عقل ، گفت
اولِ کام است و فیروزی و اقبال و ظفر

چوں کہ محمد قلی قطب شاہ کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، اس لیے اس نے اپنے بھائی کی رضامندی سے نو مولود شہ زادے کو گود لے ۔ ابھی شہ زادہ تین برس کا تھا کہ شہ زادہ امین کا انتقال ہو گیا۔ محمد قلی کی شفقتیں اور بڑھ گئیں اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شہ ادے کی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ قطب شاہی روایات کے مطابق انتظام کیا۔ علوم و فنون کی تعلیم قاضی سمنانی اور فن حرب و ضرب کی تربیت ماند میاں یوسف (تاریخ قطب شاہی) سے حاصل کی۔ اپنے بعد شہ زادہ سلطان مرزا کی جانشینی کو یقینی بنانے کے لیے قلی قطب شاہ نے اپنی ۔وتی بیٹی حیات بخش بیگم سے اس کی شادی کر دی۔ اس رشتے کے طے کرنے میں دو مصلحتیں پیش نظر تھیں۔ اول یہ کہ شاہ عباس صفوی کی واہش تھی کہ ایران کے کسی شہ زادے سے حیات بخش بیگم کی شادی کی جائے۔ اس مقصد کے لیے شاہ عباس نے اغرلو سلطان کو گولکنڈے یں سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اگر یہ شادی ہو جاتی تو سلطنت گولکنڈہ قطب شاہیوں کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ خود محمد قلی قطب ماہ کے بھائیوں یا اولاد میں سے کوئی دعوے دارِ سلطنت نہ اٹھ کھڑا ہو اور قطب شاہی بادشاہوں میں شیعیت کا تسلسل جاری رہے اسی لیے محمد لی قطب شاہ نے مرض الموت میں میر محمد مومن استرآبادی کو وصیت کی کہ سلطان محمد کو اس کا جانشین بنایا جائے۔ بادشاہ نے اپنی زندگی میں

امرا اور عمائدین سلطنت سے عہدِ وفاداری بھی لے لیا تھا۔ ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء م ۱۷ ذی قعدہ ۱۰۲۰ھ کو محمد قلی کا انتقال ہوا۔ حضرت میر مومن نے بہ عجلت تمام دوسرے ہی دن محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے جشن تخت نشینی کے موقعے پر دو تہنیتی قصائد پیش کیے ایک قصیدے میں تاریخ نکالی ہے اس قصیدے کے دو شعر پیش ہیں:

با محبت باز بستم عہد و پیمان نوی کہنہ جامہ می خشانم پیش جانانِ نوی
خواستم تاریخِ فرخندہ جلوست ، عقل گفت جملہ عالم نوبہارے شد ز سلطان نوی

سلطان محمد قطب شاہ بھی اپنے آباو اجداد کی طرح ایک علم دوست بادشاہ ثابت ہوا۔ اپنے پاکیزہ اخلاق، اعلیٰ کردار، تقویٰ، تدبر اور انتظامی لیاقت کی بدولت، سلطنت گولکنڈہ کے استحکام و تحفظ میں سلطان محمد قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ سے مختلف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ محمد قلی کو فنون لطیفہ سے گہرا لگاؤ تھا لیکن وہ شراب و شباب، راگ و رنگ کا بھی دل دادہ تھا۔ مذہبی معاملات میں اس نے رسم و رواج کی زیادہ سرپرستی کی جب کہ محمد قطب شاہ، مذہبی امور میں اعتدال پسند تھا۔ اپنے چچا کی طرح شعر و سخن کا عمدہ ذوق رکھتا تھا۔ علم و فضل کا قدر دان تھا۔ فلسفہ اور تاریخ سے اس کو خاص شغف تھا۔ اس کا کتب خانہ ہزاروں بیش بہا کتابوں کا مخزن تھا۔ شاہی کتب خانے میں زیادہ تر کتابیں اسی کا جمع کردہ تھیں۔ مطالعے کا شوقین تھا۔ جو کتابیں اس کے زیرِ مطالعہ رہیں ان پر اپنے قلم سے اس نے اپنی رائے بھی لکھی ہے اور دستخط ثبت کیے ہیں۔ شاہی کتب خانے میں داخل کتابوں پر شاہی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ محمد قطب شاہ کی دو مہریں تھیں۔ ایک مہر خطِ طغری میں تھی جس پر یہ شعر کندہ تھا:

مہر سلیماں ز حق ، گشتہ میسر مرا
نقش نگین ، دل است حیدرِ صفدر مرا

دوسری مہر پر "بندۂ شاہِ نجف سلطان محمد قطب شاہ" کندہ تھا۔ محمد قطب شاہ کے دو مختلف دستخط تھے۔ ایک "العبد محمد قطب شاہ" اور دوسری "العبد الخاص لمولاہ سلطان محمد قطب شاہ"۔ محمد قطب شاہ کے دربار میں علم منقول و معقول کے ماہرین، شعرا، علما اور اہلِ کمال موجود رہا کرتے تھے۔ دربار کی علمی مجلسوں میں اظہار خیال کی سب کو مکمل آزادی تھی۔

محمد قطب شاہ نے دکنی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ اس کے فارسی کلام میں ظل اللہ، ظل الٰہی، ظل للہ اور سلطان چار تخلص ملتے ہیں۔ اس کا دکنی کلام ابھی تک دست یاب نہ ہو سکا۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں بطور دیباچہ دکنی میں لکھی ایک نظم ملتی ہے۔ فارسی میں اس نے حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، رباعی اور غزلیں لکھی ہیں۔ فارسی کلام کے دو مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔ ایک مخطوطہ "مجموعہ مراثیِ سلطان محمد قطب شاہ" کے نام سے ہے۔ یہ مخطوطہ چھوٹی تقطیع کے جملہ ۲۵/ اوراق پر مشتمل ہے اس میں حمد نعت، منقبت، غزلیں، رباعی اور مرثیے شامل ہیں۔ دوسرا نسخہ "مجموعہ اشعارِ فارسی" ہے جسے سید ابرار حسین نوگانوی نے ۱۳۲۵ھ میں نقل کیا ہے۔ ترقیمے میں کاتب نے "اشعار غزلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ والیِ گولکنڈہ" لکھا ہے جو درست نہیں کیوں کہ شاعر نے تخلص ظل اللہ یا سلطان وغیرہ استعمال کیا ہے۔ محمد قطب شاہ کی غزلیں محمد قلی قطب شاہ کی عشقیہ غزلوں کے مقابل علم و حکمت اور تصوف سے لبریز ہیں ایک غزل کے چند شعر نمونتاً پیش ہیں:

یارب چو پر تری ، توز وصف لسان ما پنہاں شدہ زشرم ، زباں در دہان ما
جائے بود مقام خدا وندیت کہ ہست صد خندہ عقل راز چنین و چنان ما
ظل اللہ از شرور بداں درپناہ تست اے درگہہ جلال تو دارالامان ما

وسری غزل کا مقطع ہے:

چوں نہادی بہ رہِ عشق ، قدم ظل اللہ اندریں رہ روشِ شاہ و گدا راوریاب

سلطان محمد قطب شاہ پر حافظ کا بڑا گہرا اثر ہے۔ اکثر غزلیں اس نے حافظ ہی کے ردیف و قافیہ میں کہی ہیں۔ اگر ہم محمد قطب شاہ کی حمد نت نبی کریمؐ اور ائمۂ طاہرین کے مناقب اور دیگر اشعار کا تجزیہ کریں تو اس کی شخصیت، عقائد، نظریہ، حسن و عشق کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ ں نے امام حسین علیہ السلام اور شہداء کربلا کے مرثیے بھی لکھے ہیں۔ یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ اس کی شاعری اور شخصیت پر ابراہیم طب شاہ کے دور کے تلنگو اثرات اور محمد قلی قطب شاہ کی دکنی پسند ذہنیت اور دکنی ماحول کی چھاپ نہیں ملتی بلکہ اصفہان اور شیراز کی شاعری کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

دکنی زبان کی نشو و نما اور ترقی کا دور محمد قلی قطب شاہ کا عہد حکومت ہے۔ اس زبان کی سرپرستی میں محمد قطب شاہ نے کوئی خاص دل ہپی نہیں لی۔ وجہی کی شاعری اور غواصی کی مثنویوں کی بھی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہو سکی۔ حالاں کہ وجہی محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک شعراء اور منہ چڑھا شاعر تھا۔ غواصی بھی ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ جس نے دو ہزار دو سو اٹھاون ابیات کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال رف تیس دن میں مکمل کی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ بادشاہ کی خدمت پیش کی جاتی بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور غواصی نے مدح کا شعر بدل کر سے عبداللہ قطب شاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

وجہی صرف دکنی کا نامور شاعری نہیں تھا بلکہ علوم اسلامیہ، احادیث اور تصوف، شعر و ادب، عربی و فارسی علوم متداولہ اور مذاہب کے تقابلی مطالعے نے اس کی ایک بلند قامت اور علمی شخصیت کی تشکیل کی تھی اگر وہ محمد قلی قطب شاہ کے رنگ میں نہ رنگ جاتا، اس کے ذوق حسن و شباب اور رندی و سرمستی کو اپنا مسلک نہ بنایا ہوتا تو محمد قطب شاہ کے عہد میں بھی اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہو سکتی تھی۔ محمد طب شاہ کے زمانے میں گولکنڈے کا تہذیبی، ادبی اور لسانی ماحول، جن نئے رجحانات سے اپنی صورت گری کر رہا تھا وجہی کی تند مزاجی اور مانیت و امارت اور زندگی کرنے کے دیگر رویوں کو اس ماحول سے مطابقت نہیں تھی۔ دوسری طرف محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں وجہی نے سرکار و دربار میں اپنے کئی حریف اور مخالف بنا لیے تھے جو یہ نہیں چاہتے تھے کہ محمد قطب شاہ کے دربار میں اسے قدر و منزلت ملے لہذا رح طرح سے وجہی کے خلاف قطب شاہ کو باور کروانے لگے۔ اپنی ایک مسلسل غزل میں وجہی نے ان بگڑتے ہوئے حالات کا ذکر کیا ہے۔ طلع سے ان حالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مطلع ہے:

محبت از من جدا کردہ است دشمن پادشاہم را
گنہ از اوست گونا حق بہ شبہ گفت ایں گناہم را

محمد قطب شاہ جب تک حیات رہا وجہی سخت ذہنی اذیت اور مالی مشکلات میں مبتلا رہا۔ اس کا منصب و مقام چھن گیا۔ مگر انانیت اور

لنہ باقی رہا۔ کہتا ہے:

فقیرم ، کنج تنہائی ، خوش آمد ہوائے خدمتِ سلطاں نہ دارم

شخصی اور ذاتی اختلافات کے علاوہ محمد قطب شاہ کے عہد میں ایسے قوانین اور اصلاحات بھی جاری ہوئے تھے جو وجہی کی شخصی دیوں پر سخت پابندی عائد کر رہے تھے۔وجہی ہر طرف سے شکنجوں میں کستا چلا جا رہا تھا۔ بالآخر گوشہ نشینی اختیار کی۔ شاہ علی متقی گجراتی کا ید ہوا خود اپنے بھی معتقد اور مرید پیدا کر لیے لیکن عبداللہ قطب شاہ کا عہد آیا تو پھر گزرا زمانہ لوٹ آیا۔ عمر خاصی ہو چلی تھی عناصر میں دال باقی نہ تھا۔ خیر و شر کی دھوپ چھاؤں میں باقی زندگی صرف کی۔ جس کا ثبوت "عطاء رحمٰن" سے ملتا ہے۔

خاندانی روایات کے مطابق محمد قطب شاہ ذی علم ہستیوں اور اہلِ ہنر کا بے حد قدر داں تھا۔ اس کی سرپرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران ہ اہلِ کمال، شاعر اور ادیب گولکنڈے میں جمع ہونے لگے۔ ان شاعروں نے فارسی زبان میں علم و ادب کے ایسے کارنامے چھوڑے ہیں کہ جن اہمیت آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کم نہیں ہو سکی۔

اس دور کی سب سے پہلی اور اہم تصنیف تاریخ سلطان محمد قطب شاہ ہے یہ ضخیم اور معتبر تاریخ سلطان قلی قطب الملک سے لے کر طان محمد قلی قطب شاہ تک کے مکمل حالات پر مشتمل ہے۔ محمد قطب شاہ کے عہد حکومت کے ابتدائی پانچ سال (یعنی ۱۰۲۰ تا ۱۰۲۵ھ) کا اطہ کیا گیا ہے۔ تاریخ سلطان محمد قطب شاہ کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر زور نے ملا عبدالحکیم بتایا ہے۔ تاریخ کا دیباچہ خاصا طویل ہے لیکن اس میں بھی مصنف نے کہیں بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے اس تاریخ کا قلمی نسخہ سالار جنگ لائبریری میں محفوظ ہے جس کے ۳۱۴) اوراق ہیں۔

محمد قطب شاہ کے آخری زمانے میں ایک اور تاریخ "مآثر قطب شاہی" لکھی گئی تھی۔ اس تاریخ کا مولف محمد بن عبداللہ، محمد قلی طب شاہ کے عہد میں نیشاپور سے آیا اور گولکنڈے میں شاہی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ مآثر قطب شاہی میں سلطان محمد قطب شاہ کی وفات تک کے حالات بڑی تفصیل سے ملتے ہیں۔ "تاریخ سلطان محمد قطب شاہ" کی طرح "مآثر قطب شاہی" کی زبان نہایت ہی سادہ اور سلیس ہے۔

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں محمد الشبیر شاہ قاضی، میر محمد مومن کے ایک شاگرد رشید بھی دکن میں موجود تھے انھیں عربی اور رسی پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کا شمار ملک کے بڑے بڑے عالموں میں ہوتا تھا۔ محمد قطب شاہ کے حکم سے ۱۰۲۹ھ میں آٹھویں ام حضرت علی رضا کی تصنیف "کثیر المیامن" کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ کتاب کے آغاز میں محمد قطب شاہ کی مدح میں ایک طویل فارسی قصیدہ ی شامل ہے۔ (کثیر المیامن کا ترجمہ محمد مومن بن شرف الدین حسن شیرازی کے قلم کا لکھا ہوا سالار جنگ لائبریری میں موجود ہے۔ تاریخ تابت ۱۰۲۹ھ ہے۔)

اس عہد میں حسینی الحسینی الطبسی جیسا ایک صاحبِ کمال شاعر اور انشاء پرداز بھی گزرا ہے محمد قطب شاہ نے اسے "لسانِ غیب" اور حیدر جہاں" کا خطاب دیا تھا۔ طبسی نے ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ ابراہیم قطب شاہ کے لیے فن شکار پر ۹۸۱ھ میں ایک کتاب "صیدیہ" لکھی تھی۔ سلطان محمد قطب شاہ کی فرمائش پر طبسی نے ایک اور ضخیم کتاب "شکار نامہ" ترتیب دی، جسے ند قطب شاہ کے نام معنون کیا ہے۔ اس شکار نامہ، کے مطالعے سے طبسی کی علمی، سائنسی اور مذہبی معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ شکار کے

شرعی مسائل پر بحث کرتے ہوئے طبسی نے نہ صرف مذہب امامیہ بلکہ امام شافعی، امام حنیفہ اور امام مالک کے حوالے اور اقوال سے مدلل گفتگو کرتے ہوئے مسلمانوں کی اکثریت کے لیے اسے مفید بنانے کی کوشش کی ہے۔ مذہبی اور شرعی نوعیت کی اس کتاب میں علم حیوانات کے بارے میں بھی وسیع معلومات ملتی ہیں۔ آخر میں شکار کیے جانے والے بحری اور بری جانوروں اور پرندوں کی ایک طویل فہرست عربی، فارسی اور دکنی میں شامل کی ہے ساتھ ہی ساتھ شکاری جانوروں اور پرندوں اور خوش شکار سے متعلق دل چسپ قصے بھی بیان کیے ہیں۔ ان واقعات سے اس وقت کی تہذیب اور اعلیٰ اقدار زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ شکار نامہ، اپنے عہد کی ایک علمی، ادبی اور تہذیبی دستاویز ہے جس کا اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے۔ طبسی کی ایک تصنیف مرغوب القلوب بھی ہے جس کا حوالہ تاریخ محمد قطب شاہ میں دیا گیا ہے لیکن اب یہ نایاب ہے۔

مرتضائے ممالک اسلام حضرت میر محمد مومن جو محمد قلی قطب شاہ کے پیشوائے سلطنت تھے محمد قطب شاہ کے عہد میں بھی ۱۰۲۳ھ م ۱۶۱۴ء تک اسی عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے اپنی لیاقت اور علم و فضل سے ملک کو بہت فائدہ پہنچایا۔ بادشاہوں کو ان پر اتنا بھروسا تھا کہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ ہوتا تھا نہ کوئی عہدہ دار مامور ہوتا تھا۔ شیخ محمد بن خاتون، مرزا محمد امین اور مولانا اویس جیسے جید عالم شاعر اور مدبر ان کے آوردہ تھے۔ محمد قطب شاہ کے دور میں حضرت میر محمد مومن نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "رسالہ مقداریہ" لکھی تھی۔ یہ ایک سائنسی مقالہ ہے۔ اس میں ناپ تول، وزن اور فاصلوں سے متعلق بیش قیمت معلومات ملتی ہیں۔ اس رسالے سے اس زمانے کے فارسی نثری اسلوب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حضرت میر مومن نے فن حدیث میں کتاب رجعت، بھی اسی زمانے میں تصنیف کی ہے۔ "کثیر المیامن" پر عربی میں ان کا ایک بسیط دیباچہ بھی ملتا ہے جس سے ان کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔

فن طب میں حکیم تقی الدین محمد نے "میزان الطبائع قطب شاہی" اور میر مومن یزدی نے "اختیارات قطب شاہی" محمد قطب شاہ کے عہد میں ہی مکمل کی۔ اس کے علاوہ تصوف و اخلاق پر بہت ساری کتابیں اسی عہد میں لکھی گئی ہیں جو لندن کلکتہ، بانکی پور اور حیدرآباد کے کتب خانوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس دور کے دیگر ارباب علم و حکمت اور صاحبان بصیرت میں علامہ ابن خاتون، شیخ جعفر علی، سید کمال الدین مازندرانی، میر قطب الدین نعمت اللہ، نظام الدین احمد صادق کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد قطب شاہ کے عہد میں دکنی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی لیکن فارسی شعر و ادب کو جو فروغ حاصل ہوا تھا اسے کسی عنوان فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ محمد قطب شاہ اور ملا وجہی خود بھی فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ عشرتی یزدی، علی گل استرآبادی، میر مومن یزدی، محمد امین بن محمد شریف استرآبادی، قنبار بیگ کوکبی، صالی اردستانی، سید مراد اصفہانی اور حکیم رکنا کاشی جیسے فارسی کے بلند پایہ شاعر عہد محمد قطب شاہ میں سخن سرائی کر رہے تھے۔

قطب شاہی عہد کی تاریخ میں حضرت میر محمد مومن کے ہمہ جہتی اشتراک کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ ان کے قصائد کئی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً ان کا وہ قصیدہ جو انھوں نے محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت لکھا تھا بہت مشہور ہے اس کے دو شعر نمونتہً پیش ہیں:

یاد گار جدّ و عم سلطاں محمد قطب شاہ   آں کہ ہندستاں ز تنفیذش گشتہ ایران نوی

گر صفاہان نو شدہ است شاہ جہاں عباس شاہ   حیدرآباد از تو شد شہا ! صفاہانِ نوی

میر محمد مومن استرآبادی کے اکلوتے فرزند میر محمد الدین محمد فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ وہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں (۹۹۵ھ) حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل میں اپنے معاصرین میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ دنیوی جاہ و جلال سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ حدائق السلاطین (ورق ۱۹۱ / الف) کے مولف نے میر محمد الدین کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو خلق خدا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ۳۹ سال کی عمر میں ۲۲ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ کو حیدرآباد میں وفات پائی۔ حضرت میر محمد مومن یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ ٹھیک چالیس دن بعد وہ بھی رحلت کر گئے۔ حدائق اسلاطین میں اور دیگر تاریخی اور ادبی تصانیف میں محمد الدین کا انتخاب کلام ملتا ہے۔ حافظ کی مشہور غزل "این بحث باثلاثہ غلامہ می رود" کی زمین میں انھوں نے بھی غزل کہی ہے جس کا مقطع ہے:

اے محمد دیں خموش کہ گردم برآوری   ناموسِ عشق از اثرِ نالہ می رود

میر محمد مومن ادائی یزدی سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں منصب عمدہ پر فائز تھے۔ میر محمد مومن کے توسط سے دربار میں رسائی حاصل کی تھی۔ تذکرۂ شعرا کے مصنف طاہر نصرآبادی نے ادائی، کو ایک فصیح البیان شاعر قرار دیا ہے اس کا کلام وسیع مشاہدے۔ زندگی کے گہرے تجربات؟ ان اشعار سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

زراہ کودک بیدل چناں نمی ترسد   کہ من ز دیدن این زندگاں ہر اسانم

ہر کہ آمد نظرے کرد و خریدار نہ شد   گویا آئینۂ آویختہ در بازارم

تخت نشینی کے بعد سلطان محمد قطب شاہ نے مراد اصفہانی سے حضرت امیر حمزہ کی سوانح نظم کرنے کی فرمائش کی تھی۔ اصفہانی نے ایک سال بعد یعنی ۱۰۲۱ھ میں اس مثنوی کو مکمل کر لیا اور بادشاہ کی نذر کی۔ مراد اصفہانی ہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے حیدرآباد کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی۔ اس وقت شہر حیدرآباد کی عمر سترہ سال کی تھی۔ سترہ سال کے مختصر عرصے میں شہر حیدرآباد کی تزئین و آرائش، تہذیب و تمدن نے جو ترقی کی تھی اس کا اندازہ اس نظم سے ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر حیدرآباد کی آب و ہوا خوب صورت اور دل کش مناظر نے اسے اپنے وطن ایران کی یاد دلادی تھی۔ دو شعر پیش ہیں:

خجستہ فضاۓ بہشت انبساط   طرب خیز عشرت گہ پر نشاط

دہد دستہ دستہ گل از آسمان   منارش بہ گلدستۂ اصفہان

اس نظم کا سید نہار زالدین رفعت نے ترجمہ کیا تھا لیکن اب وہ نایاب ہے۔

عبدالجبار ملکاپوری (تذکرۂ محبوب الزمن ۶۱۲) میں لکھتے ہیں کہ جمالی اردستانی سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں دکن آیا تھا وہ فارسی کا ایک نامور شاعر تھا۔ بادشاہ نے اسے اپنے متوسلین میں شامل کر لیا تھا۔ عرصے تک حیدرآباد میں رہا بقول عبدالجبار ملکاپوری وہ صاحبِ دیوان بھی تھا۔

عشرتی یزدی بھی محمد قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد آیا تھا۔ حضرت میر مومن استرآبادی نے اس کی سرپرستی کی۔ ۳۰ برس کی عمر میں ۱۰۳۳ھ میں وفات پائی۔ فن شعر کے ساتھ ساتھ خوش نویسی میں کمال حاصل تھا۔ خط نستعلیق کا استاد مانا جاتا تھا۔ تذکرۂ محبوب الزمن میں اس

کے چند شعر ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑا قادر الکلام شاعر تھا، ایک شعر:

دوستاں در بوستاں چوں عزم مئے خوردن کنید　　　اول از یاران دور افتادہ یاد من کنید

عہد محمد قطب شاہ کے فارسی شاعروں میں علی گل استرآبادی کا نام بھی ملتا ہے جسے شعر و سخن میں کامل دست گاہ حاصل تھی۔

قطب شاہی عہد کا ایک بہت بڑا شاعر، مدبر، سیاس، منتظم اور مری جملگی کے معزز ترین عہدے پر فائز محمد امین شہرستانی تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد اور محمد قطب شاہ کے عہد حکومت کے اولین سال یعنی ۱۰۲۱ھ میں حیدرآباد چھوڑ کر ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں پہنچا تھا وہاں سے ایران گیا اور پھر دہلی آکر شہنشاہ جہاں گیر کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ جہاں گیر نے اسے بیس ہزاری منصب اور خلعت انعام سے سرفراز کیا۔ ۱۰۳۵ھ میں جہاں گیر کے انتقال کے بعد شاہ جہاں کے دربار میں میر بخشی کی خدمت پر مامور ہوا۔ ۶۹ برس کی عمر میں ۱۰/ ربیع الثانی ۱۰۴۷ھ کو دلی میں وفات پائی۔

محمد امین، روح الامین تخلص کرتا تھا اس کی غزلوں کا ایک دیوان "گلستان ناز" سالار جنگ میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں چار مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ (خسرو شیریں، مطلع الانظار۔ لیلیٰ مجنوں اور آسمان ہشتم) چوتھی اور آخری مثنوی آسمان ہشتم، کی تکمیل کر رہا تھا کہ محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہو گیا۔ ۱۰۲۱ھ میں مثنوی مکمل ہوئی۔ مثنوی کے دیباچے میں محمد قلی قطب شاہ کی تعریف و توصیف کے بعد محمد قطب شاہ کی مدح بھی کی ہے اور اسی کے نام یہ مثنوی معنون کی ہے۔

محمد قطب شاہ کے عہد میں ان شاعروں نے فارسی زبان و ادب کے ذخیرے میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے ان کے کارناموں سے دکن میں عہد بہ عہد علمی، سیاسی اور تاریخی تبدیلیوں اور تہذیب و تمدن کے متعلق نہایت کارآمد معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

محمد قطب شاہ فن تعمیر میں بھی بڑی دل چسپی رکھتا تھا۔ اس کے پندرہ سالہ دور حکومت میں تعمیر کے جو شاہ کار ملتے ہیں۔ ان میں فہرست بیت العتیق مکہ مسجد کا نام آتا ہے جس کا سنگ بنیاد اس عابد اور شب بیدار سلطان نے خود اپنے ہاتھوں رکھا تھا۔ یہ عظیم الشان مسجد ایرانی طرز کاشان دار نمونہ ہے۔ اس کی تعمیر ۱۰۲۷ھ م ۱۶۱۷ء میں شروع ہوئی جس کا سلسلہ محمد قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ کے دور میں اختتام سلطنت تک جاری رہا۔ تقریباً ۷۷ برس تعمیر جاری رہی آخر ۱۱۰۴ھ میں اورنگ زیب نے اسے موجودہ صورت میں مکمل کر دیا۔ اصل نقشے کے مطابق تعمیری آرائش و زیبائش کو یہ کہہ کر منسوخ کر دیا کہ:

کار دنیا کسے تمام نہ کرد　　　ہرچہ گیرید مختصر گیرید

مکہ مسجد کی تعمیر پر جملہ تیس لاکھ ہون خرچ ہوئے۔ ایک شاعر نے مسجد کی تعریف میں کیا خوب شعر کہا ہے:

طواف کعبہ اشرف میسرت گر نیست　　　بیا بہ کعبۂ ملک دکن عبادت کن

حیدرآباد کے محلے خیریت آباد کی مشہور و معروف مسجد سلطان محمد قطب شاہ کی بیٹی خیریت النساء نے اپنے استاد اخوند ملا عبدالملک کے لیے تعمیر کروائی تھی۔ اس مسجد کی تعمیر کا آغاز ٹھیک اسی سنہ میں ہوا جس سنہ میں محمد قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی۔ اور جس سنہ میں بادشاہ کا انتقال ہوا اسی سنہ میں تعمیری کام تکمیل کو پہنچا (۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۲ء - ۱۰۳۵ھ م ۱۶۲۶ء) مسجد میں ایک مقبرہ بھی بنوایا گیا تھا لیکن اخوند حرمین میں انتقال ہونے کی وجہ سے مقبرہ خالی رہ گیا۔ اس مسجد اور مقبرے پر پچی کاری اور منبت کاری انتہائی نفیس اور لاجواب ہے۔ مسجد

اور ان سے ملحق مدرسوں کے علاوہ اس دور میں بہت سے کاروان سرائے، حمام اور رفاہ عام کی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ خود سلطان محمد قطب شاہ کا مقبرہ بھی گورستان شاہی میں فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے جو بعد میں تعمیر ہونے والے قطب شاہی مقبروں کے لیے ایک مثال ثابت ہوا۔

سیاسی اور دفاعی مصلحتوں کے پیش نظر محمد قطب شاہ نے ایک نئے شہر سلطان نگر بنیاد ڈالی تھی جو چارمینار سے چھ میل کے فاصلے پر موجودہ سرور نگر کے پاس واقع ہے۔ اس نئے شہر کے بسانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ گولکنڈہ اور حیدرآباد کے ہنگامہ پرور اور پرہجوم دارالسلطنت سے قریب ایک پرسکون شاہی مستقر کی تعمیر کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ سلطنت وجیانگر کی امکانی فوجی کارروائیوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔ سلطان نگر میں شاہی محل کی دیوار کے اطراف اصل شہر بسانے کا منصوبہ بھی تھا جس میں آج بھی تین عمارتوں کے آثار ملتے ہیں۔ پہلی ایک عظیم مسجد، اس سے متصل شمالی مشرقی جانب کتب خانے کی ایک زبردست عمارت اور مسجد کے شمالی جانب ایک دروازہ، جو بیدر دروازہ کہلاتا تھا۔ سلطان نگر کی تعمیر جاری تھی کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہوگیا۔ شاید اسی لیے اس کے جانشین عبداللہ قطب شاہ نے اسے نحس تصور کرتے ہوئے تعمیری کام رکوادیے

خطاطی اور خوش نویسی کا فن تعمیر سے بہت قریبی ربط ہے۔ محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کے دورِ حکومت میں محمد اصفہانی، اسماعیل بن عرب شیرازی، صالح البحرانی، کلب علی بن محمد صادق اور محمد حسن شیرازی جیسے ماہرین نے مساجد، محلوں، مقبروں اور عمارتوں میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے کتبے آج بھی موجود ہیں۔

قطب شاہی دور کے فنِ تعمیر میں یہ جدت نظر آتی ہے کہ سنگ خارہ اور سنگ سیاہ کو مصفا کر کے عمارتوں کے رد کار میں اور کتبوں میں بہ کثرت استعمال کیا گیا ہے جس سے عمارتوں میں غیر معمولی پختگی اور حسن پیدا ہوگیا ہے۔

دیگر دکنی سلطنتوں کے ساتھ محمد قطب شاہ کی حکمت عملی یہ تھی کہ قطب شاہی مقبوضات میں جنگ و جدال کے ذریعے توسیع کرنے کے بجائے استحکام سلطنت اور بہترین انتظامیہ کو ترجیح دی جائے اور اپنی ہمہ جہتی قوت و طاقت کو مغلوں کے امکانی حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے محفوظ و تیار رکھا جائے۔ سلطنت احمد نگر کے انجام کو دیکھتے ہوئے محمد قطب شاہ نے اپنی دور اندیشی اور فراست سے آنے والے خطرات کو بہت پہلے ہی محسوس کرلیا تھا۔

محمد قطب شاہ نے اپنے عہد حکومت میں ایک ہی فوجی کارروائی کا حکم دیا تھا اور وہ بستر کے حکم ران پرتاپ شاہ کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے تھا۔ قطب شاہی جنرل کمال الدین مازندرانی کی سرکردگی میں سید حیدر اور عزت خاں کے ساتھ فوجیں روانہ کی گئیں۔ پرتاپ شاہ نے ہوش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے اور سلطان سے معافی کا خواستگار ہوا۔ محمد قطب شاہ نے اس کے قصور کو معاف کر دیا اور پھر سے اس کو قطب شاہی سلطنت   کے باج گزار حکم ران کی حیثیت سے بستر پر برقرار رکھا۔ یہ اس کے اعلیٰ اخلاق اور امن پسندی کا ایک واضح ثبوت ہے۔

گولکنڈے کے سلاطین میں سب سے پہلے محمد قلی قطب شاہ نے شاہ ایران سے اپنا سیاسی رشتہ جوڑا۔ شاہ ایران، شاہ عباس صفوی نے اغورلو سلطان کو ۱۶۰۳ء میں اپنا سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا تاکہ دونوں ملکوں میں دوستی اور یگانگت پیدا ہو۔ سفیرِ ایران کا گولکنڈے میں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور سفیر ایران اور اس کے ساتھیوں کو بیش قیمت خلعتوں سے نوازا گیا۔ ایرانی تحفوں میں موتیوں کا تاج، مرصع خنجر، چالیس

عراقی اور عربی گھوڑے تھے جو زرین لگاموں سے لیس تھے۔ شاہ عباس صفوی نے شہ زادی حیات بخش بیگم سے اپنے کسی شہ زادے کے لیے رشتے کی خواہش بھی کی تھی لیکن شہ زادی اس وقت تک شہ زادہ محمد قطب شاہ سے منسوب ہو چکی تھی۔ پانچ سال کے قیام کے بعد یہ سفارت بیش قیمت تحائف کے ساتھ ایران واپس ہوگئی۔

محمد قلی قطب شاہ کے انتقال اور سلطان محمد قطب شاہ کی جانشینی کے موقع پر شاہ ایران نے حسن بیگ قبچاق کو پیام تعزیت اور نوید تہنیت دے کر گولکنڈہ روانہ کیا، جس کے ساتھ جواہرات کا جڑاوی تاج، مرصع تلوار، ایک کٹار اور پچاس گھوڑے بطور تحفہ بھیجے تھے۔ ایرانی سفیر تقریباً تین برس گولکنڈے میں رہا۔ ان تین سالوں کے دوران سلطنت گولکنڈہ کی جانب سے تیس ہزار ہون بطور اخراجات قیام و احتشام عطا کیے گئے۔ نومبر ۱۶۱۶ء میں سفیر ایران کی واپسی کے موقع پر علامہ ابن خاتون کو گولکنڈے کا سفیر بنا کر ایران بھیجا گیا۔ علامہ ابن خاتون نے ایران میں دس سال سفارتی فرائض انجام دیے۔ ۱۰۳۵ھ میں ان کی واپسی کے موقع پر ماژندران کے سپہ سالار قاسم بیگ بربان کو ایران کے سفیر کی حیثیت سے گولکنڈہ روانہ کیا گیا۔ اس وقت حضرت میر محمد مومن اور سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہو چکا تھا اور کمسن عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہو گیا تھا۔

قطب شاہی سلطنت کی تجارت سالانہ کئی کروڑ روپیہ کی ہوتی تھی، بندرگاہوں سے اندرون ملک تجارتی سامان کے حمل و نقل کے لیے سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ مشرقی ساحل پر مسولی پٹنم کی بندرگاہ سے عرب، آفریقہ اور یورپی ممالک تک بحری تجارت ہوا کرتی تھی۔ اسی بندرگاہ پر سب سے پہلے ڈچ فیکٹریاں اور تجارتی دفاتر قائم ہوئے۔ کیوں کہ ڈچ تاجروں کی تجارت جزائر شرق الہند تک پھیلی ہوئی تھی ۱۶۰۲ء میں Dutch United East India Company نے اپنا تجارتی دفتر اور گودام مسولی پٹنم میں قائم کیا۔ [سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں مسولی پٹنم کی ڈچ فیکٹریوں کے علاوہ اس کے نواحی علاقے نظام پٹنم (سابقہ نام پٹہ پولی) میں بھی ایک ڈچ فیکٹری پولی کٹ (Pulicat) کے قریب قائم ہوئی تھی۔] اس زمانے میں بندرگاہ سے لائے جانے والے تجارتی مال پر ۱۶% محصول برآمد عائد کیا جاتا تھا۔ جس میں چھاپہ دلالی (Stamp and Brokerage) کا معمول بھی شامل تھا ڈچ تاجروں نے اس محصول کے خلاف سلطان سے اپیل کی۔ شاہی حکم جاری ہوا کہ محصول ۴% سے زائد نہ لیا جائے اور چھاپہ دلالی معمول ختم کردیا جائے۔ انگلش فیکٹریاں چنگم (Chungum) محصول سے مستثنیٰ کردی گئیں۔ یہ محصول سلطنت کے کئی مقامات پر حمل و نقل کے دوران وصول کیا جاتا تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی اور ۱۶۱۱ء میں کمپنی نے مسولی پٹنم اور ناگاپٹم میں اپنے تجارتی کارخانے قائم کیے۔ محمد قلی قطب شاہ کے
کیا گیا کہ کمپنی کی جانب سے بندرگاہ کے شاہی افسروں کو تین ہزار گھوڑا اماثل پارہ ہزار ایک سو پچاس روپیہ مغلیہ سالانہ ادا کیے جائیں۔

مسولی پٹنم سے ہیرے، یاقوت، فولاد، موٹا سوتی کپڑا، ریشم، کیلی کو، مسالے، گوند لاک اور تمباکو صندل کی لکڑی برآمد کی جاتی تھی۔ درآمدی اشیا میں اورک، جست، ٹین، لانگ کلاتھ، کاغذ، سونا اور چاندی شامل تھی۔ گولکنڈہ ہیروں کی عالمی منڈی تھا۔ ابتدا میں ہیرے کی کانیں ڈچ تاجروں کو پٹے پر دی گئی تھیں لیکن ۱۶۶۳ء میں سلطان محمد قطب شاہ نے اس پٹے کو منسوخ کر کے ہیرے کی تجارت کو شاہی اجارہ داری قرار دیا اور سارا کاروبار سرکاری عہدے داروں کے ذریعے انجام دیا جانے لگا۔ بندرگاہ کے افسر، قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا ایک اشاریہ (Index) بطور ریکارڈ رکھتے تھے۔

محمد قطب شاہ کا پندرہ سالہ دورِ حکومت، علمی کاوشوں، سیاسی استحکام، امن و امان اور خوش حالی کی وجہ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس عہد میں فارسی زبان و ادب اور ایرانی کلچر کو فروغ حاصل ہوا۔ شہر حیدرآباد کی طرح سلطان نگر بسانے کی کوشش کی گئی۔ خوب صورت اور شان دار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ تجارت کو ترقی ہوئی۔ مشرق و مغرب کے ممالک سے سفارتی اور تجارتی تعلقات مستحکم ہوئے مذہبی امور میں توازن اور اعتدال پیدا کیا گیا۔ گولکنڈے کی تہذیب میں رواداری اور عالم گیر انسانی اقدار کا اضافہ ہوا۔

سلطان محمد قطب شاہ نے بتاریخ ۱۳ جمادی الثانی ۱۰۳۵ھ م ۳۱ جنوری ۱۶۲۶ء وفات پائی اور اپنے بنائے ہوئے مقبرے میں دفن ہوا۔ تاریخ وفات "حشرش بہ علی ابن ابی طالب باد" سے نکلتی ہے۔

ماخذ: انگریزی

۱- شاہ منظور عالم، پروفیسر — Masulipatam - A Metropolitian Part in the 17th. Century - an article in Islamic Culture Hyd. July. 1959

۲- شروانی، پروفیسر ہارون خاں — History of the Qutb Shahi Dynasty (1974) طبع اول

۳- شروانی، پروفیسر ہارون خاں — Sultan Mohammed Qutb Shah Memoir No 5 Pakistan History Research Society. Karachi. 1962

۴- صدیقی، پروفیسر عبد المجید — History of Golconda (1956) طبع اول

۵- علی اصغر بلگرامی (ناظم آثار قدیمہ) — Land Marks of the Deccan. 1927

اردو

۶- اختر حسن، قطب شاہی دور کا فارسی ادب - حیدرآباد - دسمبر ۱۹۷۳ء۔

۷- بھوپال راؤ کے - وی، وزرائے عظام قطب شاہان - حیدرآباد - مارچ ۱۹۹۲ء۔

۸- راحت عزمی، علامہ ابن خاتون - حیدرآباد - ۱۹۹۲ء۔

۹- زور، ڈاکٹر محی الدین قادری، کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ - سلسلہ یوسفیہ (۱) ۱۹۴۰ء۔

۱۰- سعادت علی رضوی، کلام الملوک - سلسلہ یوسفیہ (۳) - ۱۹۳۸ء۔

۱۱- صدیقی، پروفیسر عبد المجید، تاریخ گولکنڈہ - حیدرآباد طبع دوم - ۱۹۶۴ء۔

۱۲- عبد الجبار ملکاپوری، تذکرہ محبوب الزمن

○ ○ ○

ہوئے بتایا کہ کس طرح وہ محمود شاہ بہمنی کے دربار سے وابستہ ہوا اور ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے تلنگانے کا صوبہ دار بنا۔ کاکتیہ عہد کے بنائے ہوئے مٹی کے قلعے کی از سرِ نو تعمیر کی۔ بالا حصار اور محلات بنوائے اور باغات لگائے۔ سید عابد حسین صاحب نے مقالے کے دوران قلعے کی مختلف تصاویر پیش کیں۔ نظامت کے فرائض جناب موہن پرشاد نے انجام دیے۔

یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کمیٹی پروفیسر جعفر نظام (صدر) جناب زاہد علی خاں (نائب صدر) پروفیسر مغنی تبسم (معتمد) جناب موہن پرشاد اور پروفیسر اکبر علی بیگ (کنوینرز) پر مشتمل تھی۔

○ ○ ○

ڈاکٹر محمد علی اثر

عہدِ عبداللہ قطب شاہ کے علمی، ادبی اور تہذیبی کارنامے

مملکتِ گولکنڈہ کا ساتواں فرماں روا عبداللہ قطب شاہ (پیدائش ۱۶۱۴ء، تخت نشینی ۱۶۲۶ء، وفات ۱۶۷۲ء) نہ صرف ایک رعایا پرور حکمران، دکنی تہذیب و تمدن کا معمار، رقص و موسیقی کا دلدادہ، اہلِ علم و ہنر کا سرپرست و مربی تھا بلکہ اقلیمِ سخن کا تاج دار بھی تھا۔ وہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کا نواسہ اور سلطان محمد قطب شاہ کا بیٹا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کا عہدِ حکومت ایک طرف، امن و سکون اور آسودگی و خوش حالی کا دور کہلاتا ہے تو دوسری طرف اندرونی بغاوتوں اور فتنہ و فساد کے باعث دورِ انتشار سے بھی عبارت ہے۔

سلطان عبداللہ کو خوش قسمتی سے میر قطب الدین نعمت اللہ، مرزا شہرستانی، خواجہ مظفر علی اور مولانا حسین جیسے نامی گرامی اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ بڑا علم دوست، دور اندیش اور منصف مزاج بادشاہ تھا۔ اس کی قدر دانی اور سرپرستی کا شہرہ سن کر دور دراز ممالک کے علما، فضلا اور اہلِ کمال حیدرآباد میں جمع ہو گئے تھے۔ فارسی کی مشہور لغت اسی کی نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچی اور نظام الدین احمد نے اپنی معرکتہ آرا کتاب "حدیقتہ السلاطین" اسی دور میں لکھی۔ عبداللہ قطب شاہ کا عہدِ حکومت اردو شعر و ادب کی سرپرستی اور فروغ کے سلسلے میں ایک زرین دور کی حیثیت رکھتا ہے وجہی، غواصی، ابنِ نشاطی اور جنیدی جیسے بلند پایہ شعرا اور ادیب اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، جنھوں نے بالترتیب "سب رس"، "طوطی نامہ"، "پھول بن" اور "ماہ پیکر" جیسی بے نظیر تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ علامہ ابنِ خاتون اسی دور کے ایک زبردست عالم تھے جن کی کوششوں سے حیدرآباد میں جگہ جگہ مدارس اور درس گاہیں قائم ہوئیں۔ ملک الشعرا غواصی نے اپنی ایک مثنوی میں عہدِ عبداللہ قطب شاہ کے پرکشش باغات و محلات، خوب صورت کوچہ و بازار، یہاں کی فرحت بخش آب و ہوا اور بلند پایہ درس گاہوں کے بارے میں لکھا ہے:

جو شہر اس شاہ کا ہے حیدرآباد سعادت ہور لقا اس کا ہے بنیاد
سراسر اس نگر کا جو ہوا ہے دکھیاں کا سکھ مریضاں کا دوا ہے
بلندی میں مدرسے کا جو ہے نام مگر آسمان کا ہے عین و تمام
صفائی اس نگر کے جو ہیں بازار ہزاراں اس میں چمناں ہور گلزار
کتابوں بیچ غلط نئیں کوچ حاشا کہ ہے یاں جنت کشور کا تماشا
عمارت یاں کے نادر میں کہوں کیا کہ چرخ اپنے جنم میں کہیں نہ دیکھیا
زمیں کے پیٹ پر اس شہر کا طرح جو کوئی دیکھیا سو پایا فرح پر فرح

عبداللہ قطب شاہ کو سیر و تفریح کا بہت شوق تھا۔ اپنی حکمرانی کے ابتدائی دور میں جب کہ مغلوں کی یورش شروع نہیں ہوئی تھی، وہ محمد قلی کی بنوائی ہوئی بلند و بالا عمارتوں "نبات گھاٹ"، "کوہ طور"، "باغ لنگم پلی" اور "حسین ساگر" کے محلات میں مقیم ہو کر جشنِ شبانہ ترتیب دیا کرتا تھا۔ اس کی رعایا پروری، وسیع القلبی اور رفاہِ عام کے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے مورخین نے لکھا ہے کہ ۱۶۳۰ء میں جب پورے ہندوستان میں ایک خوف ناک قحط ظہور پذیر ہوا تھا تو کس طرح اس نے مصائبِ قحط کو دور کرنے کے لیے حیدرآباد میں جگہ جگہ

کنوئیں کھدوائے، ہر محلے میں غلے کی تقسیم کا لنگر جاری کیا اور "ندی محل" کے میدان میں نماز استسقا پڑھوائی تھی۔ ان کوششوں اور تدابیر کے باوجود بھی جب بے شمار لوگ لقمہ اجل بن گئے تو ایک لاکھ افراد کے کفن دفن کے سارے انتظامات سلطنت کی طرف سے انجام دیے گئے۔ (۲)

قطب شاہی مورخین کا بیان ہے کہ سلطان عبداللہ مختلف سماجی ثقافتی اور ادبی امور میں اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کے نقش قدم پر چلتا تھا اور اس کے دور میں ان تمام تہذیبی اور مذہبی تقاریب کا احیا عمل میں آیا جنھیں اس کے والد محمد قطب شاہ نے موقوف کر دیا تھا۔ عہد محمد قلی کی تعیش پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے لکھا ہے کہ:

"شہر حیدرآباد کی ترقی کے ساتھ اہل شہر میں تعیشات کی بھی فراوانی ہو گئی تھی اور ہر جگہ عیش و عشرت کا سامان مہیا تھا جو شہری زندگی کا خاصہ ہے۔ چوں کہ قطب شاہی سلطنت میں امرا کی کثرت تھی اور ملک میں خوش حالی تھی۔ اس لیے ان کی بے کاری اور فارغ البالی کی وجہ سے ملک میں عیش و عشرت کا سامان ہونا ضروری تھا۔ اس میں خود بادشاہوں کی زندگی بھی اثر انداز تھی، یہ کچھ خلاف قیاس نہیں ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تعیشات میں اضافہ ہوا کیوں کہ بادشاہ خود عیش پرست تھا۔" (۳)

محمد قلی قطب شاہ کا جانشین سلطان محمد قطب شاہ چوں کہ ایک پاکیزہ اخلاق، اعلیٰ کردار اور مذہبی انسان تھا اس لیے اپنے دور حکومت میں اس نے نہ صرف نشہ آور اشیا پر پابندی لگادی، شعر و سخن اور رقص و سرور کی محفلوں کو موقوف کر دیا بلکہ بسنت، مرگ اور عید میلاد کے عوامی جشن بھی برخاست کر دیے تھے۔ سلطان عبداللہ نے اپنے دور حکمرانی میں، محمد قلی قطب شاہ کی قائم کردہ تمام سماجی، ادبی اور تہذیبی روایات کو از سر نو جلا بخشی۔ وہ شاعر اور فن کار جو سلطان محمد کے دور میں دل گیر اور مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے، ان کو دوبارہ اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا۔ محمد قلی قطب شاہ کا ملک الشعرا وجہی جو سلطان محمد کے دور حکومت میں گم نامی اور مفلسی کی زندگی گزار رہا تھا، عبداللہ قطب شاہ نے اسے دوبارہ دربار شاہی میں شرف باریابی بخشا۔ جس کا تذکرہ وجہی نے "سب رس" میں اس طرح کیا ہے:

صباح کے وقت، بیٹھے تخت، یکایک غیب تے رمز پاکر، دل میں اپنے کچ لیا کر، وجہی نادر فن کوں، دریادل گوہر سخن کوں، حضور بلائے، پان دیے بہوت مان دیے، ہور فرمائے کہ انسان کے وجود میں کچھ عشق کا بیان کرنا، اپنا ناؤں عیاں کرنا کچھ نشان دھرنا، وجہی ہو گئی گن بھریا، تسلیم کر کر سر پر بات دھریا۔" (۴)

عبداللہ قطب شاہ اور اس کے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طبیعت اور مزاج میں غیر معمولی مماثلت نظر آتی ہے دونوں نہ صرف یہ کہ خوش گو شاعر، علوم و فنون کے رسیا، پری جمالوں کی صحبت میں شغل ساغر و جام اور بزم ہائے رقص و سرود منعقد کرنے کے عادی تھے بلکہ شاعروں ادیبوں اور اہل کمال کی دل کھول کر سرپرستی بھی کرتے تھے۔ طبیعت اور مزاج کی اسی مناسبت کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں تمدنی اور ثقافتی نقطہ نظر سے، گولکنڈے میں وہی ماحول پیدا ہو گیا تھا جیسا کہ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں موجود تھا۔ غواصی نے "طوطی نامہ" میں اور مقیمی نے "چندر بدن و مہیار" میں لکھا ہے کہ عبداللہ کے روپ میں محمد قلی قطب شاہ نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ غواصی کے اشعار ہیں:

مہاراج سلطان عبداللہ ناؤں ثریا کے تارک پو اس کا پاؤں
دیکھت زور ورطالع اس راج کے صفادار روشن دلاں آج کے

کہیں یوں بحق علیؑ ولی — کہ پھر جگ میں آیا محمد قلی
دیا جیو پھر راگ ہور رنگ کوں — کیا دور سینیاں پو کے زنگ کوں
بدیاونت ملکے ملک کے تمام — ترے شہر میں آکے سب مقام

مقیمی کہتا ہے:

مقیمی توں کر صفت شہ کا اتا — جنے تجہ کوں روشن کیا ہے بتا
جو سلطان عبداللہ ہے شہہ گنبھیر — قمر شمس تے اس کا روشن ضمیر
کہ عدل ہور انصاف ہور داد کا — او ہے بادشاہ حیدرآباد کا
دکھن کے شہاں میں گرامی ہے او — گرامی اہے ہور نامی ہے او
دکھن کے شہاں دیکھ پھر یوں کہے — محمد قلی پھر کو آیا اہے

سلطان عبداللہ کو محمد قلی قطب شاہ کی طرح مذہبی اور غیر مذہبی تقاریب اور تہواروں سے غیر معمولی دل چسپی تھی۔ ان تقاریب کے موقع پر زرِ کثیر خرچ کر کے جشن کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ مذہبی تقاریب میں عید مولود نبی، محرم اور غیر مذہبی تقاریب میں بسنت اور مرگ کے تہوار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عید میلاد کا جشن "داد محل" کے میدان میں منعقد ہوتا تھا، جہاں یکم ربیع الاول سے بارہ دن تک دمامہ نقارہ اور نوبت بجتی۔ داد محل کے میدان کو خوب صورت خیموں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ رات میں آتش بازی اور چراغاں کا اہتمام کیا جاتا۔ اس موقع پر ماہرِ فن موسیقار، مغنی اور رقاص اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ عبداللہ قطب شاہ کو حضورِ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس سے بے پناہ عقیدت تھی۔ محمد قلی کی طرح اس کی غزل کا ہر مقطع "نبی صدقے" سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے کلیات میں عیدِ میلاد کے موضوع پر چار نعتیہ غزلیں بھی موجود ہیں۔ چند شعر دیکھیے:

نبی مصطفیٰ کا جو مولود آیا — جہاں صاف ہو سر بسر جگمگایا
خوشیاں کے کھلے پھول بن یک طرف تھے — زمیں شاد ہوی ہور گگن ذوق پایا
محمدؐ کے صدقے تھے سب دور کر غم — عجب کچ خوشی منج الٰہی دلایا
لکھ فیض سوں پھر آیا دن دین محمدؐ کا — آفاق صفا پایا دن دین محمدؐ کا
اسلام کرا تارا آیا جو نکل بھارا — چھپ کفر گیا سارا دن دین محمدؐ کا
یو عید ہمن ساجے نصرت کے بجے باجے — ہے جگ کے نبی راجے دن دین محمدؐ کا
روشن ہوئے ماناں جھمکائے رتن کھاناں — خط لیوے مسلماناں دن دین محمدؐ کا

عبداللہ قطب شاہ کی زندگی کا بیش تر حصہ اگرچہ عیش و عشرت میں گزرا لیکن محرم کا چاند دیکھتے ہی وہ ساغر و جام کو خیرباد کہہ کر سیا ماتمی لباس زیب تن کر کے پاپیادہ عاشور خانوں کا رخ کرتا تھا۔ "حدیقۃ السلاطین" کے مولف نے لکھا ہے کہ قطب شاہی سلاطین عشرہ محرم میں لباس شاہی کو جامہ عزا سے تبدیل کر دیتے تھے۔ گانے بجانے والے اپنے تمام آلات موسیقی غلافوں میں رکھ دیتے۔ شاہی اور عام باورچی خانوں میں گوشت کی آمد بند ہو جاتی اور نشہ آور چیزوں کی دکانیں بند ہو جاتیں۔"(۹)

غیر مذہبی تہواروں میں بسنت اور آمد برسات کے جشن گولکنڈے کے پر فضا مقامات پر بڑے دھوم دھام سے منائے جاتے تھے

قطب شاہ کے دیوان میں بسنت کے موضوع پر تین اور "مرگ" کے موضوع پر ایک غزل موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ــ بجا سچ گھر میں آج آیا بسنت خیب تے تازہ طرب لیایا بسنت
ں اصال یک دھر تے چھا آفاق پر رنگ کا برسانت برسایا بسنت
ــ سبریاں کی بزم کو بھورنگ سوں کر بہار ستان دکھلایا بسنت
براہی کو پیالے سوں لگے سرخوشی کا کام فرمایا بسنت (۱۰)

گرجیا ، بجلیاں ہو، الاپو راگ ملہارا کہ خوش موتیاں کے باراں ہو برسے میگھ کے دھارا
ں بجلیاں گھن کیاں اتم پتلیاں ہوں کندن کیاں لٹکتیاں کوئلیاں بن کیاں بنا بنگلم کا بارا
ہو دھرتی ساری دے پاپاں میں جیوں ماری صلا دے چرخ رنگاری کھلیا جوں پھول ہر تارا

دیگر قطب شاہی سلاطین کی طرح عبداللہ قطب شاہ نے بھی متعدد باغ اور عمارتیں بنوائی تھیں (۱۲) نظام الدین احمد نے "حدیقتہ ن" میں ایک عالی شان چار منزلہ محل کا تذکرہ کیا ہے، جس کی تعمیر میں ہاتھی دانت اور صندل کی لکڑی استعمال کی گئی تھی اور اندرونی ں پر رنگ کا کام کیا گیا تھا۔ مورخین نے اس محل کا نام نہیں بتایا البتہ خود عبداللہ قطب شاہ نے اس محل کا نام "عشرت محل" بتاتے اس کی تعریف و توصیف میں سات اشعار پر مشتمل ایک مربوط غزل لکھی ہے۔ اس محل کے خوب صورت طاق اور نقش و نگار سے مزین یوار کی مدح سرائی کرتے ہوئے سلطان عبداللہ نے اسے دکن کی آنکھوں کی پتلی اور ایک نو شگفتہ پھول کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ، زمین پر ایسا شان دار محل جمشید و دارا نے بھی نہیں بنوایا:

ی دل کھا عشرت محل مطبوع اوتارا ہوا جوتی زمیں کی ماتھے پر جیوں مشتری تارا ہوا
ر طاق یاں خوش طرح کا دستا دریچہ فرح کا عاجز ہوں اس کی شرح کا حیران سنسارا ہوا
نکھیاں سو چندر سور کے دیکھ آسماناں دور کے عاشق ہیں اس کے نور کے کیا خوب یو تھارا ہوا
یویں صفا دیوار سو ، لک نقش تھارے تھار سو خوش مان یاں عطار سو فردوس کا بارا ہوا
نازک انچھا بے بدل تکمن بھریا ایسا محل باندیا نہ کوئی آخر اول جمشید یا دارا ہوا
تیوں پھول تازہ بن منے ، جوں پوتلی لوچن منے تیوں آج اس دکھن منے یو محل اتم سارا ہوا
صدقہ نبی کے پالناں اس محل میا نے ہر زماں جم عبدلا شہ ترکماں بھوگی مکن بارا ہوا (۱۴)

عبداللہ قطب شاہ کا مکمل دیوان ہنوز دریافت نہیں ہوا۔ اس کے مطبوعہ کلیات میں ردیف "ث" تک جملہ ۱۷۹ غزلیں اور ایک ، ہے۔ محمد دکنی کے دوسرے شعرا کی طرح عبداللہ قطب شاہ کا کلام بھی ہندوستانی تہذیب و تمدن، مقامی ماحول اور طرزِ معاشرت کی انی کرتا ہے۔ شاعری کے پہلو بہ پہلو عبداللہ قطب شاہ کو فن موسیقی سے بھی غیر معمولی لگاؤ تھا۔ ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ اس نے ابراہیم ، شاہ جگت گرو کی "کتاب نورس" کے جواب میں موسیقی کے موضوع پر ایک منظوم کتاب بھی لکھی تھی۔ (۱۵) اس لیے اس کی غزلوں میں سے راگ راگنیوں کے علاوہ آلاتِ موسیقی جیسے سرمنڈل، چنگ و رباب، جنتر، طنبورا، دوتارا وغیرہ کا جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ نغمگی اور ائیت سلطان عبداللہ کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ہم قافیہ الفاظ کی تکرار سے اس نے اپنے کلام میں ترنم اور موسیقی کا جادو ہے۔ متعدد غزلوں میں اس نے چار چار یا اس سے زائد قافیوں کا استعمال کر کے ایک لَے اور جھنکار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند

اشعار دیکھیے:

پیالے پیالے پیالے یوچھنا　　دنیا میں دنیا میں بھی کچھ ہے جینا

زین جاتی نہ نیند آتی لگا چھاتی سیج اے ساقی　　کہ کھواتی ہوں رنگ راتی ہوں میں ماتی تری لالہ (۱۶):

چندر کلا ، ترا لگا ہے نرملا ، اچکلا　　سومج بھلا کے ہتلا ، کیا گھ ، وہ نرملا

نین میں لاتو کاجلا ، یتابلا نکوگھلا　　لبت اچپلا، بلوں بلا ، کہ چلبلا ، ہے وہ بلا

مرادلا ، ہے باؤلا ، الابلا ، سجے بلا　　جو مدپلا ، تجے گلا لیوں بھلا ، کے چنچلا (۱۷)

حوالے:

(۱) کلیات غواصی ص ۱۹۳، (۲) تاریخ دکن - اختر یمنانی و فصاحت جنگ جلیل - حیدر آباد ۱۳۲۸ھ ص ۲۳۶، (۳) عبد المجید صدیقی - تاریخ گولکنڈہ ص ۳۵۹ (۴) سب رس - وجہی مرتبہ: مولوی عبد الحق - ۱۹۳۲ء بلوچستان ص ۷، (۵) مطوطی نامہ "، (۶) ڈاکٹر زور تذکرہ مخطوطات جلد پنجم ص ۳۸، (۷) کلیات عبد اللہ ص ۹۷، (۸) دیوان عبد اللہ قطب شاہ ص ۷، (۹) حدیقتہ السلاطین ، (۱۰) دیوان عبد اللہ قطب شاہ ص ۱۰۲، (۱۱) ایضاً ص ۴۰، (۱۲) تاریخ گولکنڈہ ص ۴۲۱، (۱۳) حدیقتہ السلاطین ص ۸۸، (۱۴) دیوان عبد اللہ قطب شاہ ص ۹۵، (۱۵) دکنی ادب کی تاریخ ص ۷۰، (۱۶) "دیوان عبد اللہ قطب شاہ " ص ۵۳، (۱۷) ایضاً ص ۸

○ ○ ○

سیتیسواں

یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب

مارچ، اپریل ۱۹۹۶ء

یومِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب کمیٹی ۱۹۹۶ء

(سینتیسواں سالانہ اجلاس)

صدر: پروفیسر جعفر نظام صاحب — نائب صدر: جناب زاہد علی خاں صاحب

معتمد عمومی: پروفیسر مغنی تبسم — معتمدین: جناب موہن پرشاد صاحب ۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

کلچرل پروگرام کمیٹی

معتمدین: جناب حمایت اللہ صاحب ۔ جناب اسلم فرشوری صاحب

اراکین: جناب کوکب دری صاحب ۔ جناب غلام جیلانی صاحب ۔ جناب منظور الامین صاحب ۔ محترمہ رفیعہ منظور الامین صاحبہ محترمہ بلقیس علاء الدین صاحبہ ۔ جناب خان اطہر صاحب

اردو سمینار: معتمد: جناب منظور احمد صاحب

تلگو۔انگریزی سمینار معتمد: جناب موہن پرشاد صاحب

مشاعرہ: معتمد: جناب صلاح الدین نیر صاحب

سووینیر کمیٹی

معتمدین: جناب ولی قادری صاحب ۔ پروفیسر احمد اللہ خاں صاحب

اراکین: جناب محمد عبدالقیوم صاحب ۔ جناب موہن پرشاد صاحب ۔ جناب صلاح الدین نیر صاحب

پاٹ لک لنچ خواتین: معتمدین: محترمہ فاطمہ عالم علی خاں صاحبہ ۔ محترمہ پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ

پاٹ لک لنچ و مشاعرہ: معتمدین: ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب ۔ جناب سوز عابدی صاحب

کمیٹی برائے انتظامات گنبدان قطب شاہی

معتمدین: جناب مخدوم محی الدین صاحب ۔ جناب منظور ظفر صاحب

اراکین: جناب محمد عبدالقیوم صاحب ۔ جناب حبیب صاحب ۔ جناب محمد ابراہیم صاحب

نشر و اشاعت: معتمد: جناب محمد ابراہیم صاحب

Phones : Office (Delhi) : 3317210
Resi. (Jammu) : 3090?

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind) URDU GHAR, ROUSE AVENUE, NEW DELHI-110002

Prof. Jagan Nath Azad
President
پروفیسر جگن ناتھ آزاد

پیغام

یہ اطلاع میرے لیے دلی مسرت کا باعث ہوئی ہے کہ اس سال ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام یوم محمد قلی قطب شاہ کی سالانہ تقاریب کے ساتھ ہی ساتھ قلعہ گولکنڈہ کی پانسو سالہ تقاریب بھی منائی جارہی ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ صرف اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہی نہیں تھے بلکہ قومی یک جہتی کے بہت بڑے علم بردار بھی تھے۔ انھوں نے حیدرآباد کے چارمنار پر آمنے سامنے مسجد اور مندر تعمیر کرا کے اپنی فراخ دلی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کا کلام بھی ہندوستانی تہواروں کی خوش بو سے مہک رہا ہے۔ ہندوستان کی اتنی عظیم شخصیت اس امر کی مستحق ہے کہ اس کی یاد صرف ایک شہر میں نہیں بلکہ ملک کے متعدد شہروں میں منائی جائے۔

میں اس موقعے پر اپنی طرف سے اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کو، اس کے صدر پروفیسر جعفر نظام کو اور معتمد عمومی پروفیسر مغنی تبسم کو تہہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔

جگن ناتھ آزاد

Residence :- A-25, Government Quarters, Gandhi Nagar, Jammu Tawi (J&K) 180004

پروفیسر محمد حسن

پیغام

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو، یوم محمد قلی قطب شاہ تقریبات منارہا ہے ایک ایسے دور میں جب ہم بڑی تیزی سے اپنے ماضی کی شان دار روایات کو فراموش کرنے میں لگے ہوئے ہیں یہ اقدام بڑا ہی مبارک اور مستحسن ہے۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے جس روایت کی بنیاد ڈالی اسے پورے ملک میں یاد کیا جائے بلکہ یاد کیا جاتا رہے کہ یہ ملک اور معاشرے میں تفرقہ ڈالنے والی طاقتوں کے خلاف سب سے بڑا جہاد ہوگا اور قومی یک جہتی اور اتحاد ہی کو نہیں ادبی اور جمالیاتی وحدت کو بھی فروغ دے گا۔

محمد حسن

عزت مآب جناب خورشید عالم خاں صاحب
(گورنر ریاست کرناٹک)

مکتوب

پروفیسر جعفر نظام صاحب

اسلام علیکم!

میں چاہوں گا کہ آپ براہ مہربانی ادارۂ ادبیات اردو کے سارے احباب کو میرا شکریہ پہنچادیں کہ آپ سب نے مجھے جشن قلی قطب شاہ کے موقع پر مدعو فرمایا۔ آپ کا یہ جشن نہ صرف انتہائی شاندار تھا بلکہ دل چسپ بھی تھا۔

خدا کرے کہ ادارۂ ادبیات اردو کے جو اغراض و مقاصد ہیں وہ پورے ہوں اور اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے اس مفید اور اہم کام میں برکت دے۔

امید کہ مزاج بخیر ہوں گے

مخلص

خورشید عالم خاں



RAJ BHAVAN
BHOPAL- 462003

March 23, 1996

MESSAGE

I am happy to learn that the "Idara-E-Adabiyat-E-Urdu", Hyderabad is celebrating Mohd Quli Qutab Shah Day 1996 in the memory of the founder of the city of Hyderabad and also organising "Jashan-E-Golcunda "in March and April 1996.

I hope that the celebrations will help promote Deccani Culture, National Integration and Communal Harmony and further strengthen the bonds of mutual goodwill, friendship and fraternity.

My best wishes for the success of the celebrations.

(Mohd. Shafi Qureshi)

خیر مقدمی تقریر

افتتاحی اجلاس یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۹۶ء

پروفیسر مغنی تبسم (معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو)

عزت مآب عالی جناب خورشید عالم خاں صاحب گورنر کرناٹک اسٹیٹ، عالی جناب پروفیسر جعفر نظام صاحب صدر ادارۂ ادبیات اردو، جناب موہن پرشاد صاحب، پروفیسر اکبر علی بیگ صاحب، جناب حمایت اللہ صاحب، جناب اسلم فرشوری صاحب، معزز سامعین!

میں ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد اور یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کمیٹی کی جانب سے عزت مآب جناب خورشید عالم خاں صاحب گورنر کرناٹک اسٹیٹ کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔ عزت مآب خورشید عالم خاں صاحب کا خاندانی تعلق رؤسائے قائم گنج سے ہے لیکن سسرالی رشتے سے آپ کا حیدرآباد سے دیرینہ تعلق رہا ہے وہ اس طرح کہ آپ کے محترم خسر جناب ذاکر حسین صاحب مرحوم صدر جمہوریہ ہند کے والد جناب فدا حسین صاحب حیدرآباد میں وکالت کرتے تھے۔ بیگم بازار میں ان کی تعمیر کروائی ہوئی حویلی ابھی تک موجود ہے۔ ذاکر صاحب کے بھائی پروفیسر یوسف حسین خاں صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے صدر تھے۔ عزت مآب خورشید عالم خاں صاحب کے دو بھانجے اور ذاکر صاحب کے بھتیجے پروفیسر امتیاز حسین خاں صاحب اور پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب بھی عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ اس نسبت سے ہمارے معزز مہمان حیدرآباد اور حیدرآبادیوں کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔

عزت مآب جناب خورشید عالم خاں صاحب نے آگرہ یونیورسٹی اور پن سلوانیا یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ برس ہا برس عملی سیاست سے وابستہ رہے۔ آپ عرصے تک راجیہ سبھا اور لوک سبھا کے رکن اور مرکزی حکومت میں وزیر رہے۔ اور مختلف پورٹ فولیوز آپ کے ذمے رہے۔ امور خارجہ کے وزیر کی حیثیت سے آپ دنیا کے تمام ممالک میں جاچکے ہیں۔ آپ کو یونائیٹڈ نیشنز اور سکیورٹی کونسل کے اجلاسوں کو مخاطب کرنے کا اعزاز حاصل رہا۔ پھر آپ گوا کے گورنر مقرر ہوئے اور اب ریاست کرناٹک میں گورنر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔ ان تمام حیثیتوں میں آپ نے ملک اور عوام کی جو گراں قدر خدمات انجام دیں ان کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ آپ کو اردو زبان اور اقلیتوں سے گہرا تعلق خاطر رہا ہے۔ آپ مختلف علمی اور تعلیمی اداروں کی گورننگ باڈیز کے چیرمین اور رکن ہیں آپ ہی کے مساعی سے جامعہ دہلی کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا۔ آپ اس یونیورسٹی کے سابق چانسلر بھی رہے ہیں۔ ہماری دیرینہ خواہش تھی کہ آپ ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے منعقد کی جانے والی کسی تقریب کو زینت بخشیں۔ گذشتہ سال بھی یوم محمد قلی قطب شاہ کی افتتاحی تقریب میں آپ کو مدعو کیا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے دعوت نامہ بروقت نہیں پہنچ سکا۔ ہم بے حد ممنون ہیں کہ اس بار آپ نے ہماری دعوت قبول فرمائی۔ میں پھر ایک بار ادارۂ ادبیات اردو اور شہریان حیدرآباد و سکندرآباد کی جانب سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

میں آج کے اجلاس کے صدر اور ادارۂ ادبیات اردو کے سربراہ پروفیسر جعفر نظام کا بھی خیر مقدم کرتا ہوں۔ پروفیسر جعفر نظام صاحب کی شخصیت علمی، ادبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کا شمار ملک کے ممتاز سائنس دانوں میں ہوتا ہے۔ آپ کاکتیہ یونیورسٹی کے دو بار وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ اردو زبان و ادب سے آپ کو خاص لگاؤ ہے۔ گذشتہ برسوں میں ادارۂ ادبیات اردو نے جو ہمہ

بھی ترقی کی ہے جس میں قطب [illegible] حاصل ہے۔

پروفیسر سید [illegible] الدین قادری زور نے کوئی پچاس برس قبل اردو زبان و ادب اور بالخصوص دکنی کلچر کے تحفظ اور فروغ کے لیے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی بنیاد ڈالی تھی۔ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور نے ادارے کی عمارت کے لیے اپنی زمین کا عطیہ دیا جس پر ایوانِ اردو کی عالی شان عمارت قائم ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کا اہم شعبہ اس کا کتب خانہ ہے جس میں چالیس ہزار سے زیادہ مطبوعہ کتابیں ہیں اور تقریباً ڈھائی ہزار مخطوطات ہیں جن سے اطراف ملک اور بیرونی ممالک کے محققین استفادہ کرتے ہیں۔ ادارے کے امتحانات اردو عالم اور اردو فاضل عثمانیہ یونیورسٹی اور کاکتیہ یونیورسٹی کے مسلمہ امتحانات ہیں۔ اردو فاضل کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد ان یونیورسٹیوں میں بی۔اے میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ گذشتہ برسوں میں عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے باہمی تعاون سے اردو خواندگی کی مہم کامیابی سے چلائی گئی جس کے نتیجے میں ۲۳ ہزار طلبہ اردو نوشت و خواند سے واقف ہو چکے ہیں۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ایک میوزیم ہے جس میں قطب شاہی، آصف جاہی اور مغلیہ سلاطین کے فرامین سکے، اسلحہ، تصویریں، قدیم لباس، ظروف اور خطاطی کے نمونے محفوظ کیے گئے ہیں۔ اسے ایک ایسے میوزیم کی حیثیت سے ترقی دی جا رہی ہے جس میں حیدرآبادی تہذیب اور دکنی کلچر سے متعلق اہم نوادر اور دستاویزات یکجا کی جائیں گی۔ ادارے کا شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ بھی سرگرم عمل ہے۔ ادارے کا ترجمان رسالہ سب رس جو ایک علمی ادبی مجلہ ہے گذشتہ ۵۸ برسوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ادارے کے شعبۂ خواتین کا احیا عمل میں آیا ہے جس کے ماہانہ اجلاس پابندی کے ساتھ منعقد ہوتے ہیں۔

یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کی بنا پروفیسر سید محی الدین قادری زور نے سینتیس برس پہلے ڈالی تھی۔ یہ تقاریب ادارے کی سرگرمیوں کا مستقل حصہ بن چکی ہیں۔ یوم زور بھی ہر سال منایا جاتا ہے۔ یوم زور اور یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر سمینار منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر سمپوزیم اور ورک شاپ بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ خصوصی خطبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ادارے کی سرگرمیوں کا یہ مختصر سا خاکہ تھا۔ ہمیں قوی توقع ہے کہ بہی خواہانِ اردو کے تعاون سے اس ادارے کو ہم ہندستانی ایک اہم علمی، تحقیقی اور تمدنی مرکز کی حیثیت سے ترقی دے سکیں گے۔

شکریہ

○ ○ ○

اہم اطلاع

ادارے کو روز بروز "سب رس" کے زرِ سالانہ کے ایسے منی آرڈر موصول ہوتے ہیں جس کی Communication Slip پر بھیجنے والے کا نام اور پتے کا علم نہیں ہو پاتا۔ گذارش ہے کہ منی آرڈر فارم کی سلپ پر اپنا نام اور پتہ واضح لکھیں تاکہ رقم آپ کے نام جمع کرنے میں سہولت ہو۔ شکریہ

شعبۂ اشاعت

خطبہء صدارت

افتتاحی اجلاس یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۹۶ء

پروفیسر جعفر نظام (صدر ادارہ ادبیات اردو)

عزت مآب عالی جناب خورشید عالم خاں صاحب گورنر کرناٹک، معزز سامعین!

یوم محمد قلی قطب شاہ کے اس افتتاحی اجلاس میں، میں آپ تمام خواتین و حضرات کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ساتھ ہی ادارہ ادبیات اردو، یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کمیٹی اور شہر حیدرآباد و سکندرآباد کی طرف سے عزت مآب خورشید عالم خاں صاحب کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود انھوں نے ہماری درخواست قبول کی۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے افتتاح کے لیے تشریف لائے اور آج کے اجلاس کو زینت بخشی۔ پروفیسر سید محی الدین قادری زور بانی ادارہ ادبیات اردو نے آج سے سینتیس برس پہلے یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اب یہ تقاریب ریاست کے عوام بالخصوص شہریان حیدرآباد و سکندرآباد کا قومی تہوار بن چکی ہیں۔ ہم ہر سال محمد قلی قطب شاہ کی یاد اس لیے مناتے ہیں کہ ان کی ذات قومی یک جہتی، ہندو مسلم اتحاد اور دکن کے تلگو اردو مشترکہ کلچر کی علامت تھی۔

کسی قوم کی زندگی میں ادب، آرٹ اور کلچر کو نمایاں اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ نشانات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی قوم انسانی ترقی کی کس منزل تک رسائی حاصل کر سکی ہے۔ اس نقطہ نظر سے ہم دکنی ادب، آرٹ اور کلچر پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں، جس کو فروغ دینے میں قطب شاہی سلاطین بالخصوص محمد قلی قطب شاہ کا اہم حصہ رہا ہے۔

کوئی تہذیب مکمل پھول نہیں سکتی اگر عوام اس کے شریک غالب نہ ہوں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس بھید کو پالیا تھا۔ انھوں نے عوامی سطح پر اس تہذیبی انقلاب کا کام شروع کیا۔ انھوں نے مختلف لسانی اور مذہبی گروہوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لیے اہم اقدامات کیے۔ ان کے تہواروں، عیدوں اور مذہبی تقاریب کو سرکاری طور پر منانے کا اہتمام کیا۔ تلگو اور اردو زبان کے شعرا اور ادیبوں کی سرپرستی کی۔ مقامی فنون کو ترقی دی۔ اس عہد میں فنون لطیفہ بالخصوص مصوری اور عمارت سازی کے فنون میں ایرانی، ترکی اور مقامی عناصر کی آمیزش سے نئے اسالیب اختراع کیے گئے۔

محمد قلی قطب شاہ کا بڑا کارنامہ شہر حیدرآباد کی تعمیر اور آباد کاری ہے۔ انھوں نے شہر کے وسط میں چارمنار جیسی عمارت بنوائی جو فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس کے اطراف متعدد محلات تعمیر کیے گئے اور باغات لگوائے گئے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں رعایا خوش حال تھی۔ ملک میں امن و امان تھا۔ سلطنت کا نظم و نسق اور نظام عدل بے مثال تھا۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر تھے۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کا کلام اردو کے شعرا کے لیے مشعل راہ بنا۔ محمد قلی قطب شاہ اگرچہ بادشاہ تھے لیکن اپنے کلام میں وہ ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ انھوں نے عوام کے رسم و رواج، میلوں، تہواروں اور بدلتے ہوئے موسموں کی

گوناگوں خصوصیات پر دل کش نظمیں لکھیں۔ ساری اردو شاعری میں اس طرزِ خاص کی کوئی دوسری مثال مل سکتی ہے تو وہ نظیر اکبرآبادی کا کلام ہے۔

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ اس سال قلعہ گولکنڈہ کی تعمیر نو کے پانسو سال مکمل ہو رہے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے قلعہ گولکنڈہ کی پانسو سالہ تقاریب کا اہتمام بھی کیا جا رہا ہے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جانب سے ان تقاریب کو منانے کا خاص مقصد دکنی کلچر کا تحفظ ہے۔ ان تقاریب کے ذریعے عوام کو بالخصوص نئی نسل کو اپنے عظیم ثقافتی ورثے کے بارے میں واقفیت بہم پہنچانا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس ورثے کی حفاظت کریں اور دکنی کلچر کو مزید پروان چڑھائیں۔

آخر میں، میں عزت مآب خورشید عالم خاں گورنر کرناٹک سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا افتتاح فرمائیں اور اپنے افتتاحی خطبے سے نوازیں۔

○ ○ ○

خطبۂ افتتاحیہ

(افتتاحی اجلاس یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۹۶ء)

عزت مآب عالی جناب خورشید عالم خاں صاحب گورنر ریاست کرناٹک

مجھے آج یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقریبات میں شرکت کرتے ہوئے انتہائی مسرت ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے میں ادارہ ادبیات اردو یدرآباد کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کا جنھوں نے مجھے ان رنگا رنگ تقاریب میں شرکت کرنے کا موقع دیا۔ مجھے یہ جان کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ م محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب ساکنانِ حیدرآباد و سکندرآباد کے لیے ایک تہذیبی تہوار کی حیثیت رکھتی ہیں اور بلا لحاظ مذہب و ملت، عوام یر تعداد میں ان تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جب اس بے نظیر شہر کو بسایا تو اس کے ساتھ ہی اس نے ایک نئی ہذیب اور ایک نئے تمدن کی بنا بھی ڈالی تھی۔ اس نئی تہذیب کی بنیاد قومی یک جہتی، جذباتی ہم آہنگی، مذہبی رواداری اور سیکولرزم پر ستوار تھی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی خدمات کو اس سے بڑا خراج تحسین اور کیا ہو سکتا ہے کہ عوام اسی رواداری اور قومی یک جہتی کے ؛بات لیے یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو اور اس کے عہدے دار قابل مبارک باد ہیں کہ گزشتہ ۳ برس سے ہر سال وہ ان تقریبات کا اہتمام کرتے آرہے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں خاص طور پر پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری کی خدمات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ انھوں نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ہر سال ان تقاریب کے انعقاد کی بنا ڈالی۔

محمد قلی قطب شاہ کا ذہن ہر طرح کے مذہبی تعصبات سے پاک تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے ایسی چودہ تقاریب کو سرکاری طور پر منانے کا اہتمام کیا تھا جن میں دیوالی، شب برات، نوروز، بسنت عید، محرم وغیرہ شامل تھے۔ سلطان محمد قلی قطب کو کن اور اہل دکن سے بے حد محبت تھی۔ اس نے آبا و اجداد کا لباس ترک کر کے ہندستانی لباس پہننا شروع کیا اور دکن کی معاشرت اختیار یا۔

۱۵۷۰ میں محمد قلی قطب شاہ اپنے باپ ابراہیم قطب شاہ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ وہ ایک عادل اور دور اندیش بادشاہ تھا۔ دیبوں، شاعروں، فن کاروں اور عالموں کا قدر دان تھا۔ اردو، فارسی اور تلگو کے کئی شاعر اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کا کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ ایک حکمراں ہونے کے باوجود عام لوگوں کے رہن سہن، ان کے دکھ سکھ، میلوں ٹھیلوں اور تہواروں پر وہ گہری نظر رکھتا تھا۔ اس کے کلام میں جدت بھی ہے اور ندرت بھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے ایک بادشاہ کی حیثیت سے رواداری، قومی یک جہتی، حب الوطنی اور ہندو سلم مشترکہ تہذیب کی پاسبانی کی اور اپنی شعری کاوشوں سے اردو کی ترقی و ترویج میں بھرپور حصہ لیا۔

کہا جاتا ہے کہ شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھتے ہوئے محمد قلی قطب شاہ نے اپنے دل کی گہرائیوں سے خالق کائنات کی بارگاہ میں یہ دعا کی کہ

مناجات میرا توں سن یا سمیع
مجے خوش توں رکھ رات دن یا سمیع
مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں توں دریا میں مِن یا سمیع

محمد قلی قطب شاہ کی دعا مقبول ہوئی اور شہر حیدرآباد نہ صرف لوگوں سے معمور ہوا بلکہ اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی بزم آرائیوں کے لیے سارے عالم میں مشہور ہوا بلکہ آج بھی مشہور ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے اکتیس سال حکم رانی کی اور اپنی حکم رانی کے دوران وہ ہمیشہ اس جستجو میں رہا کرتا تھا کہ کس طرح حیدرآباد کو زیادہ سے زیادہ دل کش اور خوب صورت بنایا جائے۔ اسی غرض سے اس نے ایسی تعمیرات کروائیں جو آج بھی اس عظیم حکم ران کے جمالیاتی ذوق کی شاہد ہیں۔ چار مینار، جامع مسجد، خداداد محل، کوہ طور محل، چندن محل، حنا محل، حیدر محل وغیرہ شامل ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ نے شہر میں جگہ جگہ پیڑ لگوائے اور یوروپی سیاحوں نے اس کی شہادت دی ہے کہ شہر میں سبزہ و اشجار کی ایسی بہتات ہے کہ اسے باغ نگر کہا جاسکتا ہے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں دکن کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس سرزمین کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ یہیں پیدا ہوا۔ اردو کی پہلی تصنیف مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" تسلیم کی جاتی ہے جسے فخر دین نظامی نے ۱۴۲۱ اور ۱۴۳۵ کے درمیان میں شہر بیدر میں تصنیف کیا۔ دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے قدیم اردو کو جو شمال سے ایک طرح سے گھٹنوں کے بل چل کر بول چال کی زبان کی حیثیت سے یہاں آئی تھی، سہارا دیا اور پاؤں پاؤں چلنا سکھایا۔ اسے سنوارا، نکھارا، معیاری و ٹکسالی بنایا جو دکھنی اردو کے نام سے مشہور ہوئی۔

دکھنی اردو کے اس فروغ میں بہمنی، عادل شاہی، اور قطب شاہی سلطنتوں کے حکم رانوں کا بڑا رول رہا ہے اور ان سارے حکم رانوں میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت بے حد نمایاں اور خاص اہمیت کی حامل ہے۔

جب تک حیدرآباد شہر باقی رہے گا اردو زبان باقی رہے گی اور جب تک رواداری، قومی یک جہتی اور گنگا جمنی تہذیب کی روایات زندہ رہیں گی تب تک سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نام بھی باقی رہے گا۔

○ ○ ○

خطبۂ صدارت

(سیمینار: سلاطین گولکنڈہ اور ان کے کارنامے (پہلا اجلاس)

عالی جناب نواب شاہ عالم خاں صاحب

ذی قدر مہمانِ خصوصی وائس چانسلر جامعۂ عثمانیہ پروفیسر رام کشنیا صاحب، محترم پروفیسر جعفر نظام صاحب، صدر ادارہ ادبیات اردو معزز اراکینِ ادارہ ادبیات اردو، سامعینِ باوقار

آج اس تاریخی سیمینار کی صدارت میرے لیے باعثِ مسرت بھی ہے اور موجب افتخار بھی۔

ہم تمام شہریانِ حیدرآباد، پروفیسر جعفر نظام صاحب، ان کے رفقائے کار و اراکینِ ادارہ ادبیات اردو کے شکر گزار اور ممنونِ کرم ہیں کہ ان تمام کی شبانہ روز سرگرمیوں کی وجہ سے یہ ادارہ اپنی عظیم روایات اور شاندار کارناموں کی تاریخ مرتب کرتا جارہا ہے اور آئے دن ان سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اردو دانی کی گراں قدر کوششوں کے ساتھ ساتھ باضابطہ امتحانات اردو عالم اور اردو فاضل کا انعقاد اور اس کے ساتھ ساتھ اردو خوش نویسی اور خطاطی کے مراکز کا قیام قابلِ فخر کارنامے ہیں، جن کی توصیف و تعریف کے ساتھ ہر اردو دوست ان کا معترف بھی ہے۔

پروفیسر جعفر نظام صاحب کی اعلیٰ تعلیمی اور انتظامی صلاحیتوں اور دیرینہ تجربوں اور ان کے مخلص رفیقوں کی کاوشوں سے ادارہ ادبیات اردو، ترقی اور توسیع کے منازل طے کررہا ہے۔ ایوانِ اردو کی تزئینِ نو اردو ادب کے لیے نشاۃ ثانیہ ہے۔ ان اصحاب کی بے لوث اردو خدمات کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان جو بلاشبہ عوام کی زبان ہے، جو پیار و محبت کی زبان ہے جو انسانی دلوں کو جوڑنے کی زبان ہے، جو جذبات و احساسات کی ترجمان ہے۔ اس شہر محبت میں جو بلاشبہ ہندستان میں اردو کا مرکز ہے، مقبولیت کے ساتھ ساتھ ترقی کے منازل طے کرے گی۔ زبانِ اردو اور اس کے ادب و شعر میں اس کی زندگی کی توانائیوں میں اضافے کا سبب بنے گی۔

مجھے امید ہے کہ ادارہ ادبیات اردو اپنے دائرہ کار کو وسعت دیتے ہوئے سلاطین گولکنڈہ کے کارناموں کے ساتھ ساتھ عہدِ آصفی، خصوصاً قیام جامعۂ عثمانیہ کے بعد، اردو ذریعۂ تعلیم کے زرین عہد کی یاد تازہ کرنے اور اس شاندار دور کے عظیم کارناموں سے نئی نسل کو واقف کرانے کے لیے مستقبل میں اسی قبیل کے تاریخ ساز تقاریب پر اپنی توجہ مبذول کرے گا اور مستقبل کے معماروں کو اس اردو ذریعۂ تعلیم کے فیوض سے واقف کرائے گا کہ مادرِ علمیہ جامعۂ عثمانیہ نے کیسے کیسے قابلِ فخر فرزندوں کی تربیتِ ذہن و کردار کی کہ وہ نہ صرف فرزندانِ ملک وقارِ دکن بنے بلکہ جن کی علمیت اور قابلیت نے جامعۂ عثمانیہ اور سرزمینِ دکن کی عظمت کو دنیا کے ہر حصے میں تسلیم کرایا۔

ادارہ ادبیات اردو کے زیرِ اہتمام "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی تقاریب کا آغاز، جامعۂ عثمانیہ کے قابل فرزند، اردو ادب کے محسن، دکنی ادب کے محسن، دکنی ادب کے محقق، ماہر لسانیات پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے تقریباً (۷۰) سال قبل کیا تھا۔ ان تقاریب کے ذریعے دکنی زبان کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے ادبی اور دیگر کارناموں کو پیش کرنے کا سہرا ڈاکٹر زور کے سر

ہے۔ قطب شاہی سلاطین کی تاریخ ساز کارناموں کی کوئی تاریخ ۔ سمینار ہے جس میں سلاطین گولکنڈہ کے کارناموں پر صاحبانِ فکر و نظر روشنی ڈالیں گے۔

محترم سامعین!

آپ تمام اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں کہ سلطان قلی قطب، قطب الملک شہر ہمدان کا باشندہ اپنے چچا اللہ قلی کے ساتھ محمد شاہ بہمنی کے عہد میں بیدر آیا اور چند دنوں قیام کے بعد اللہ قلی محمد شاہ بہمنی سے اجازت لے کر اپنے وطنِ عزیز لوٹ گیا۔ لیکن نوجوان سلطان قلی نے قسمت آزمائی کے لیے سرزمین دکن کا انتخاب کیا۔ بخت نے یاوری کی۔ سلطان قلی اپنی غیر معمولی لیاقت اور شجاعت کی بدولت ترقی کرکے ۱۴۹۶ء میں تلنگ کا صوبہ دار مقرر کردیا گیا اور قطب الملک کا خطاب پایا۔ کچھ عرصے میں قلعہ گولکنڈہ کا اس کی ریاست میں اضافہ ہوگیا اور اس کی حیثیت ایک خود مختار فرماں روا کی سی ہوگئی۔ لیکن وفاداری بشرطِ استواری پر کاربند اور عامل رہا۔ اور اپنی تمام تر وفاداریاں تختِ بہمنی سے وابستہ کررکھیں۔ سلطنت بہمنی کے شیرازہ بکھرنے کا اندازہ کرنے کے بعد ۱۵۱۸ء میں خود مختاری کا اعلان کیا لیکن سلطان کا لقب اپنے نام کے ساتھ بہ حیثیت فرماں روا نہیں لگایا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاست اور محبت میں ہر چیز روا ہے۔

اس کے بیٹے جمشید نے جب یہ محسوس کیا کہ نود سالہ باپ اسے اقتدار سونپ نہیں رہا ہے تو اس نے یہ کہہ کر کہ "پینے سے تاج و تخت ملتا ہے" سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اپنے ضعیف العمر باپ کو قتل کرکے ۱۵۴۳ء میں، عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کے دو چھوٹے بھائی حیدر اور ابراہیم اپنی جانیں بچاکر وجیانگر میں پناہ لی۔ اس وقت ابراہیم نے چودہ برس کا تھا۔ یار قلی جمشید نے ۱۵۵۰ء میں وفات پائی۔ اس کا زمانہ خانہ جنگیوں اور خورشوں سے پر تھا۔ جمشید کے انتقال کے بعد اس کے دو سالہ کمسن فرزند کو جمشید کے وفاداروں نے بادشاہ بنایا۔ لیکن بہت جلد با اثر امراء سلطنت نے ابراہیم کو وجیانگر سے بلاکر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ ابراہیم قطب شاہ کا دورِ حکومت ۱۵۵۰ء سے ۱۵۸۰ء تک رہا۔ اور اپنے دورِ حکومت میں سلطان ابراہیم قطب شاہ برقراریٔ امن اور استحکام سلطنت میں کامیاب رہا۔ اور گولکنڈے کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر شہر کی مزید توسیع کے لیے موسیٰ ندی پر ۱۵۷۸ء میں ایک پختہ پل بنایا جو آج بھی "پرانا پل" کے نام سے موسوم ہے۔

محمد قلی قطب شاہ، سلاطین گولکنڈہ کے پانچویں سلطان کی حیثیت سے ۱۵۸۰ء میں سریر آرائے تختِ سلطنت ہوا۔

اکتیس سال تک نہایت ہی تزک و احتشام سے حکومت کی۔ ۱۶۱۱ء میں وفات پائی۔ محمد قلی قطب شاہ، اکبر اعظم اور جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ثانی کا ہم عصر تھا۔ اس کی جامع الحیثیات شخصیت تھی۔ محمد قلی قطب شاہ صرف سلطانِ گولکنڈہ ہی نہ تھا بلکہ وہ تو اقلیم فنونِ لطیفہ کا شہنشاہ تھا۔ جہانِ رنگ و بو کا متوالا، حسن کا دلدادہ، راگ و رنگ کا رسیا، شاعری کا شیدا جس نے دکنی زبان کو اپنی زبان پر اثر سے تاثیر دی، نغمگی عطا کی۔ گیتوں کو مدھر، تانیں دیں۔ حسن و دل کے ترانے فضا میں بکھیرے۔ حسین فطرت کے نظاروں سے اپنے فنِ شعر کو حسن اور رنگ عطا کیا۔ عیدوں، تہواروں، میلوں اور کھیلوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ محمد قلی قطب شاہ کی رواداری، وسعتِ قلبی کا یہ عالم رہا کہ جہاں اس نے محرم میں مرثیے اور سلام لکھے، عید، بقر عید، شب برات پر رومانی نظمیں لکھیں، وہیں اس نے ہولی جیسے رومان خیز رنگ و نور کے تہوار، دیپاولی کی پھلجھڑیوں، بہار کی رت کی رنگ رلیوں، بسنت کے بہار سامان میلوں اور مرگ سال پر عوام کی زبان میں عوام کے جذبات کو عوام میں گھل مل کر ان کی خوشیوں کو دوبالا کیا۔ ایک مشترکہ تہذیب کی بنیاد رکھی۔ جس میں مذہبی بھید بھاؤ نہ تھا۔ اس تہذیب کی بنیاد

انسانیت اور شرافت تھی۔ آج بھی اس گئی گزری حالت میں حیدرآباد کی تہذیب اور شرافت، سرزمینِ دکن کی شناخت بنی ہوئی ہے۔ اور یہ گنگا جمنی تہذیب، حقیقی معنوں میں ہندوستان کی نمائندہ تہذیب ہے۔ جس پر ہمیں فخر ہے، ہمیں ناز ہے۔ اس تہذیبی سفر کا آغاز محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوا اور اپنی تمام تر عظیم روایات کے ساتھ یہ ہمارا قومی ورثہ اور سرمایہ بنا ہوا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے حسنِ تخیل کا جیتا جاگتا نمونہ چار مینار، جیسی عالم گیر شہرت والی عمارت ہے جو ۱۵۹۲ء میں تعمیر ہوئی۔ جس کے در و دیوار کا ہر نقش حسین ہر سیاح کے دل پر نقش ہو جاتا ہے جس کی خوب صورت جالیوں سے رنگ و نور مخلفتار ہتا ہے۔ جس کی بلندی اور اس کے نقش و نگار سے مزین مینار ان عظیم کاریگروں اور فن کاروں کا احترام ہر دیکھنے والے کے دل میں پیدا کرتے ہیں۔ اس کی چھت پر تعمیر کردہ مسجد، محمد قلی قطب شاہ کی عظمت اور حرمت کا جذبہ، محبت اور عقیدت کے ساتھ اس کے حضور میں سپاس گزار بنا دیتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا شوقِ تعمیری تھا جس نے حیدرآباد میں کئی خوب صورت دل کش عمارتیں تعمیر کرائیں اور اس شہر کے حسن میں اضافہ کیا۔ بادشاہی محلات جیسے خداداد محل، جو آٹھ منزلہ تھا جس کی پانچویں منزل کا نام حیدر محل رکھا گیا تھا۔ اسی طرح محل کوہ طور، اعلیٰ محل، حنا محل، چندن محل، ندی محل، فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ ۱۵۹۷ء میں جامع مسجد تعمیر ہوئی۔ شاہی عاشور خانہ اور دارالشفاء ۱۵۹۵ء میں تعمیر ہوئے۔ کئی مسافر خانے بنوائے گئے جہاں سیاح اور تجارت پیشہ آرام کرتے تھے۔ دارالشفاء میں بیماروں کے علاج و معالجے کا بندوبست حکومت کے خزانے سے ہوا کرتا تھا۔

آج جب کہ دورِ جمہوریت ہے، حکومتیں عوام کی منتخب ہیں، عوام کی بھلائی اور بہبودی کے لیے کاش ان رعایا پرور بادشاہوں سے سبق حاصل کرتیں، عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے صحت عامہ کی برقراری کے لیے حکومتی خرچ پر چلائے جانے والے دواخانوں کا اہتمام کرتیں جہاں مفلس، لاچار، غریب عوام کو مفت علاج معالجے کی سہولتیں حاصل ہوتیں۔ اس کے برخلاف کارپوریٹ اور پرائیوٹ دواخانوں کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ جس پر اظہار افسوس کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

بالاحصار کی بلند چوٹیوں تک مٹی کی پائپ لائین سے آب رسانی کا انتظام و اہتمام انسانی عقل کو حیران کیے ہوئے ہے کہ کس اعلیٰ پائے کے انجنیروں نے یہ محیرالعقل کارنامہ انجام دیا جب کہ آج کے مشینی دور میں ہائیڈرو الکٹرک پاور کی بہتات کے باوجود بھی حیدرآباد عوام پانی کے لیے ترس رہے ہیں۔ جی میں آتا ہے کہ چلا کر کہوں "دور رفتہ کو آواز دینا" اور التجا کروں کہ "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" تاکہ سامانِ راحت مہیا ہو سکیں یا پھر ہمارے اربابِ اقتدار شہریوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے پوری توانائیاں صرف کریں تاکہ عوام آرام کی سانس لے سکیں۔

عہد محمد قلی قطب شاہ میں اور اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ حکم رانی (یعنی ۱۶۲۶ء سے ۱۶۷۲ء تک) میں شہر حیدرآباد کو "باغ نگر" کہا جاتا تھا۔ شجرکاری اور باغات کا وسیع سلسلہ سرزمینِ دکن کو گل زمین بنائے ہوئے تھے۔ ہر طرف لہلہاتے سرسبز و شاداب باغات تھے۔ آج کے حیدرآباد کو دیکھیے جو سمنٹ اور پتھر کا شہر بن گیا ہے جہاں تو باغات کا ذکر ہی کیا جنگل بھی نہ چھوڑے ہم نے۔

نتیجتہً حیدرآباد کا ماحول فضائی آلودگی اور ماحولیاتی کثافت کے باعث انسانی زندگیوں کے لیے خطرہ بن رہا ہے۔ اس جانب حکومتی کوششوں کے ساتھ ساتھ خود یہاں کے باشندوں کی ذاتی کاوشوں کی شدید ضرورت ہے کہ شجرکاری منصوبہ بند طریقے پر کی جائے تاکہ فضائی

آلودگی کم ہوسکے۔

قطب شاہی سلاطین نے گنبدان قطب شاہی کی تعمیر کرائی اور ایک نئے طرز تعمیر کی بنیاد رکھی۔ عبداللہ قطب شاہ بادشاہ کے زمانے میں گولکنڈے میں کاغذ سازی کے ساتھ ساتھ پارچہ بافی کی صنعت نے اس قدر ترقی کی تھی کہ کہا جاتا ہے کہ ایک دیا سلائی کے باکس میں مہین ساڑی سماجاتی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ نے سرزمین دکن کی معدنیات سے اس ملک کو دنیا کا دولت مند شہر بنادیا تھا۔ یہاں ہیرے جواہرات کی منڈی تھی، جس کا تاریخی ہیرا "کوہ نور" شہرت کا حامل رہا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے گولکنڈے کا آخری تاج دار ابوالحسن قطب شاہ المعروف بہ تاناشاہ تھا۔ جس کے مشہور وزیروں میں اکنا، مادنا تھے جو علی الترتیب کمانڈران چیف اور وزیر اعلیٰ کے عہدوں پر فائز تھے، گوپنا محصول گزاری کا اعلیٰ عہدے دار تھا۔ جس نے حکومتی خزانے سے ۹لاکھ پگوڈہ کی خطیر رقم سے رام مندر الیسٹ گوداوری میں تعمیر کرایا۔ بادشاہ وقت کی اجازت کے بغیر اس کی یہ جرات اور خیانت نے مزاج شاہانہ کو برہم کیا لیکن چوں کہ یہ رقم ہندوؤں کے ایک مقدس مندر پر خرچ کی گئی تھی ابوالحسن تاناشاہ نے اسے معاف کرتے ہوئے خاندان قطب شاہی کی تاریخی رواداری کا ثبوت دیا۔

محمد قلی قطب شاہ کے اس آباد کردہ شہر کو جس کی بنیاد پیار، محبت، رواداری اور بھائی چارگی ہے اب ہماری حکومت اپنی روادارانہ پالیسیوں کو روبہ عمل لارہی ہے۔ یہ امر دل خوش کن اور باعث طمانیت ہے کہ حکومت آندھراپردیش نے اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا موقف دینے کا اعلامیہ جاری کیا ہے۔ اس موقع پر ہماری حکومت سے میں گزارش کروں گا کہ اس اعلامیے کی عمل آوری پر توجہ دے اور اسے برف دان کی نذر نہ کیا جائے بلکہ عملی صورت گری کے لیے منصوبہ بندی کی جائے۔

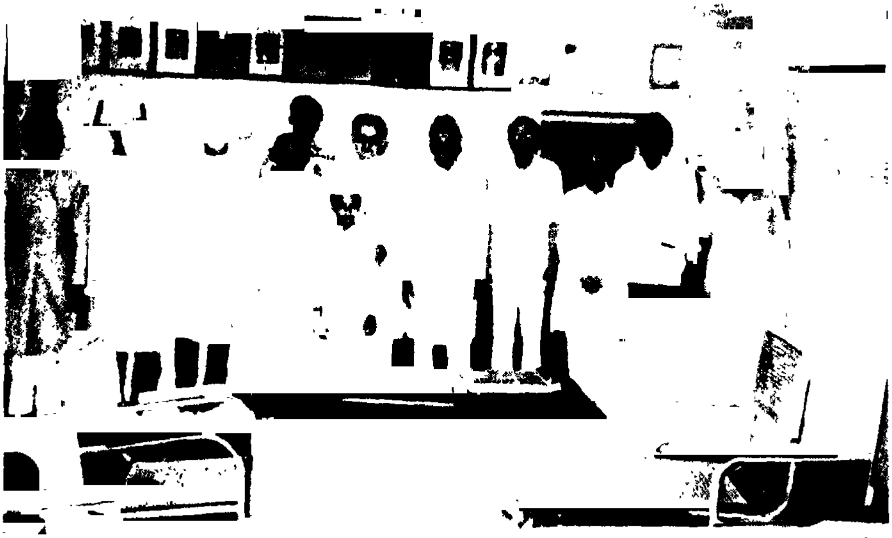
معزز سامعین! اس اظہار خیال کے بعد میں آپ سے رخصت کی اجازت کا طلب گار ہوں، کیوں کہ سلاطین گولکنڈہ کے کارناموں پر ہمارے شہر کے دانش ور فکر انگیز مقالہ جات پیش کریں گے جو ہماری معلومات میں اضافے کا سبب بنیں گے۔

آپ سے رخصت ہوتے ہوئے اور آپ تمام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلتے چلتے یہ بات عرض کروں گا کہ میں نے ملک اور بیرون ملک یورپ، امریکہ کی سیاحت کی، میرے تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ ذوق کے الفاظ میں سنیے گا کہ:

بہت خوش نما شہر دیکھے ہیں میں نے
مگر میرا جادو کہیں بھی نہیں ہے

خدا حافظ

○ ○ ○



عزت مآب جناب خورشید عالم خاں صاحب گورنر کرناٹک نے یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے افتتاحی اجلاس سے قبل ادارۂ ادبیات اردو کا معائنہ فرمایا

دائیں سے بائیں: شیخ قاسم صاحب، پروفیسر احمد اللہ خاں، ڈاکٹر آذر مینا، کوکب دری صاحب، پروفیسر جعفر نظام، عزت مآب خوشید عالم خاں صاحب (آگے) پروفیسر مغنی تبسم - (پیچھے) سید تقی الدین قادری صاحب، سید رفیع الدین قادری صاحب، محمد عبدالرشید صاحب، خواجہ سرور صاحب



یوم محمد قلی قطب شاہ ـ افتتاحی اجلاس

شہ نشین پر: دائیں سے بائیں: پروفیسر مغنی تبسم، جناب حمایت اللہ، جناب سید تقی الدین قادری صاحب، جناب سید رفیع الدین قادری صاحب، پروفیسر تقی خاں، پروفیسر جعفر نظام صاحب، عزت مآب خورشید عالم خاں صاحب (گورنر کرناٹک اسٹیٹ)، پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب



عزت مآب جناب خورشید عالم خاں صاحب (گورنر کرناٹک اسٹیٹ) خطبہ افتتاحیہ پیش فرماتے ہوئے۔



فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کار: خان اطہر، گائتری دیوی، تیجی، ریاض احمد اور ساتھی



مجید احمد خاں عرشی اور ہم نوا قوالی پیش کرتے ہوئے



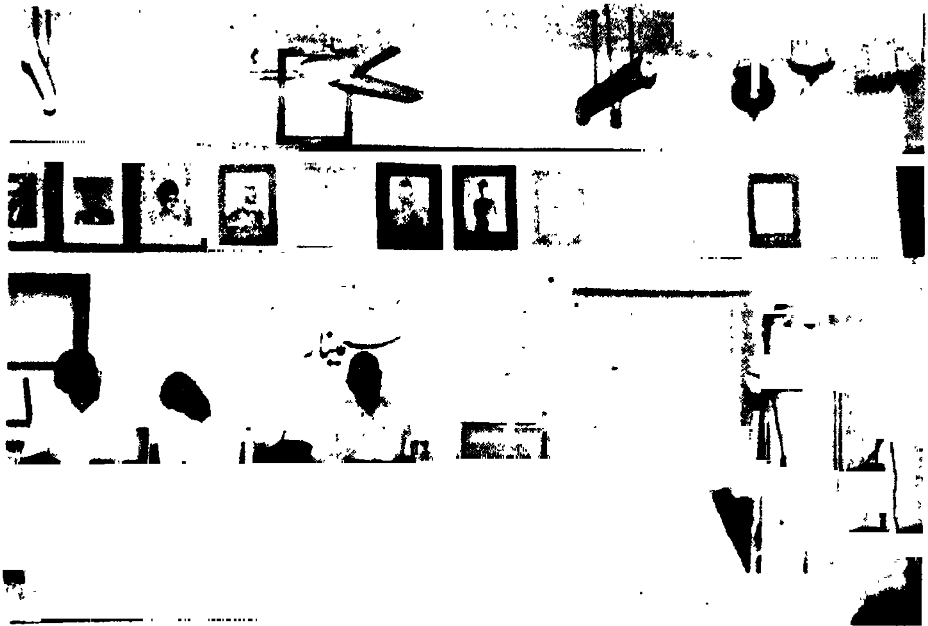
ڈرامہ "آج کی بھاگ متی": اسٹیج پر محمد قلی (سنجے پنجابی) رائے راؤ (جاوید کمال) بھاگ متی (چترا کلا) اور دوسرے فن کار



ڈرامہ "آج کی بھاگ متی" کے فن کاروں کے ساتھ گروپ فوٹو.   گورنر جناب خورشید عالم خاں، پروفیسر مغنی تبسم، جناب حمایت اللہ، جناب اسلم فرشوری، جاوید کمال، سنجے پنجابی، چترا کلا، شمس النساء، ماسٹر شفیع، مظہر ندیم، عمران، سہیل، راجہ اور دوسرے



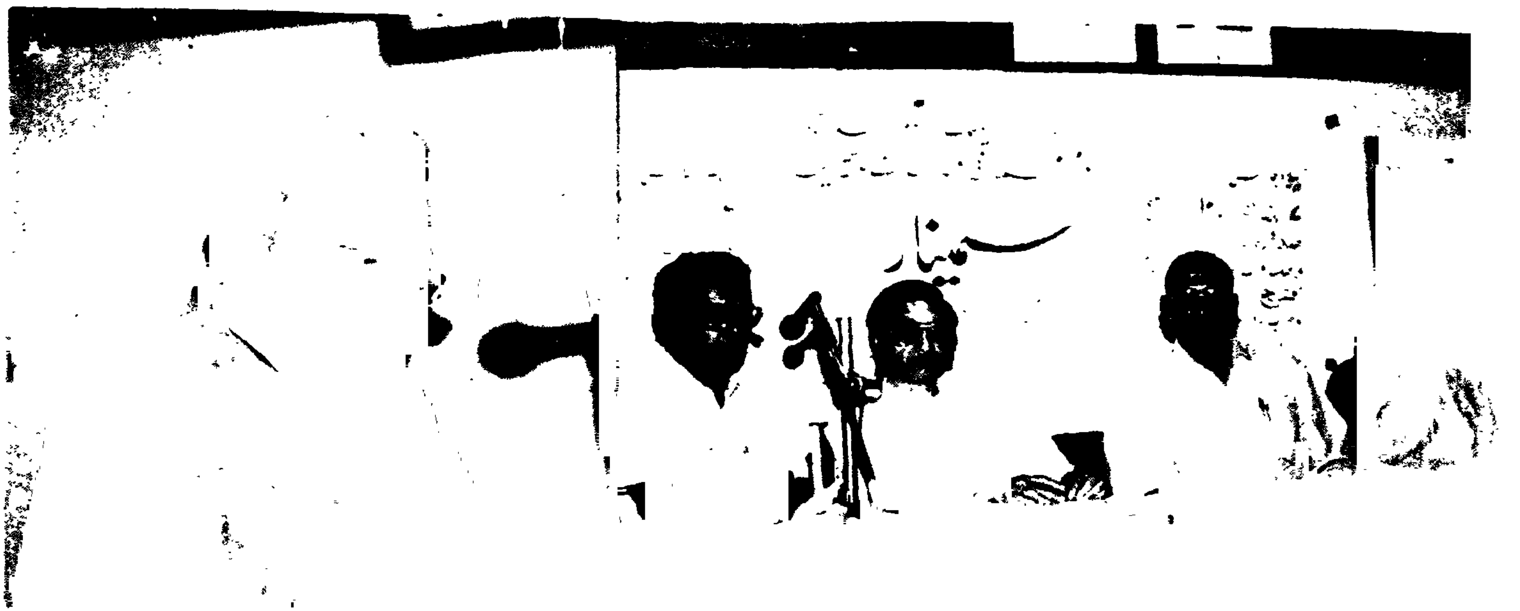
سمینار کا افتتاحی اجلاس: پروفیسر رام کشتیا صاحب (وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی)، جناب منظور احمد، پروفیسر جعفر نظام
جناب نواب شاہ عالم خاں، پروفیسر مغنی تبسم



سمینار: پہلا اجلاس: جناب محمد عبدالقیوم مقالہ پیش کرتے ہوئے۔
دائیں سے بائیں: جناب منظور احمد، پروفیسر جعفر نظام، پروفیسر اے۔ شریف، ڈاکٹر داؤد اشرف



مشاعرہ: جناب منظور احمد کلام سناتے ہوئے



سمینار کا دوسرا اجلاس: جناب راحت عزمی مقالہ پیش کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر جعفر نظام، جناب نریندر لوتھر، ڈاکٹر محمد علی اثر



تلگو انگریزی سیمنار: پروفیسر وائی، وائیکنٹم، وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی (سابق وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی) اور جناب عابد حسین مخاطب کرتے ہوئے۔

شہ نشیں پر جناب موہن پرشاد، پروفیسر جعفر نظام، پروفیسر سروجنی ریگانی



سیمینار کا افتتاحی اجلاس: سامعین کا ایک منظر



تلگو انگریزی سیمینار: سامعین کا ایک منظر

رپورٹ

ڈاکٹر بیگ احساس

یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۹۶ء

(سینتیسواں سالانہ اجلاس)

ادارۂ ادبیات اردو گذشتہ سینتیس برس سے یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا اہتمام کر رہا ہے۔ اس سال بھی یہ تقریبات اپنی روایتی دھوم دھام سے منائی گئیں۔ افتتاحی اجلاس ۱۳/ مارچ ۱۹۹۶ء یک شنبہ ۵ بجے شام احاطہ گنبد محمد قلی قطب شاہ منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر جعفر نظام صدر ادارۂ ادبیات اردو نے کی اور افتتاح عزت مآب جناب خورشید عالم خاں صاحب گورنر ریاست کرناٹک کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کے آغاز میں فائن آرٹس اکیڈمی کے فنکاروں نے وندے ماترم اور اقبال کا ترانہ، پیش کیا۔ پروفیسر مغنی تبسم، معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو نے خیر مقدمی تقریر کی۔ انھوں نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ عزت مآب خورشید عالم خاں صاحب کا حیدرآباد سے دیرینہ تعلق رہا ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ کے محترم خُسر جناب ذاکر حسین صاحب مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند کے والد جناب فدا حسین خاں صاحب حیدرآباد میں وکالت کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے بھائی پروفیسر یوسف حسین خاں صاحب، خورشید عالم صاحب کے دو بھانجے اور ذاکر صاحب کے بھتیجے پروفیسر امتیاز حسین خاں صاحب اور پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے کہا کہ خورشید عالم صاحب ایک عرصے تک راجیہ سبھا اور لوک سبھا کے رکن اور مرکزی حکومت میں وزیر رہے۔ اور اب ریاست کرناٹک میں گورنر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خورشید عالم صاحب کو اردو زبان اور اقلیتوں سے گہرا تعلق خاطر رہا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اجلاس کے صدر پروفیسر جعفر نظام کا بھی خیر مقدم کیا۔ انھوں نے ادارے کے سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر سید محی الدین قادری زور نے کوئی باسٹھ برس قبل اردو زبان اور دکنی کلچر کے تحفظ کے فروغ کے لیے اس ادارے کی بنیاد ڈالی تھی۔ انھوں نے کتب خانہ، شعبہ امتحانات، میوزیم، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ اور ادارے کے ترجمان رسالے "سب رس" کے بارے میں تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ خیر مقدمی تقریر کے بعد فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کاروں نے مناجات محمد قلی قطب شاہ، ریاض احمد اور ساتھی نے ترانہ دکن پیش کر کے ایک سماں باندھ دیا۔ خاں اطہر اور گائتری دیوی نے محمد قلی قطب شاہ کی غزل اور اقبال کی نظم گورستان شاہی پیش کر کے ایک خوب صورت فضا بنائی۔ پروفیسر جعفر نظام صاحب صدر ادارۂ ادبیات اردو نے خطبہ صدارت پیش کیا۔ انھوں نے پروفیسر سید محی الدین قادری زور، بانی ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ قلی قطب شاہ تقاریب جن کا آغاز سینتیس برس پہلے ہوا تھا اب ایک قومی تہوار بن چکی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کسی قوم کی زندگی میں ادب، آرٹ اور کلچر کو نمایاں اہمیت ہوتی ہے۔ یہی وہ نشانات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی قوم انسانی ترقی کی کس منزل تک رسائی حاصل کر سکی۔ ہم دکنی ادب آرٹ اور کلچر پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں جس کو فروغ دینے میں قطب شاہی سلاطین بالخصوص محمد قلی قطب شاہ نے اہم حصہ ادا کیا۔ انھوں نے محمد قلی قطب شاہ

کی خدمات کو خراج پیش کرتے ہوئے کہا کہ حسن اتفاق سے اس سال قلعہ گولکنڈہ کی تعمیر نو کے پانسو سال مکمل ہو رہے ہیں ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے قلعہ گولکنڈہ کی پانسو سالہ تقاریب کا اہتمام بھی کیا جارہا ہے۔ انھوں نے عزت مآب خورشید عالم خاں سے درخواست کی کہ وہ محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا افتتاح فرمائیں۔ جناب خورشید عالم خاں صاحب گورنر ریاست کرناٹک نے افتتاحی خطبے میں کہا کہ انھیں مسرت ہے کہ وہ اس رنگارنگ تقریب میں شرکت کر رہے ہیں جو ایک تہذیبی تہوار کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس بے نظیر شہر کو بسایا تو ساتھ ہی ایک نئی تہذیب و تمدن کی بنا بھی ڈالی۔ اس نئی تہذیب کی بنیاد قومی یک جہتی، جذباتی ہم آہنگی، مذہبی رواداری اور سیکولرزم پر استوار ہے۔ انھوں نے پروفیسر سید محی الدین قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ کا ذہن ہر طرح کے مذہبی تعصبات سے پاک تھا۔ اس نے جن چودہ تقاریب کو سرکاری طور پر منانے کا فیصلہ کیا تھا اس میں دیوالی، شب برات، وغیرہ شامل تھے۔ انھوں نے محمد قلی قطب شاہ کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے قدیم اردو کو جو شمال سے ایک طرح سے گھٹنوں کے بل چل کر بول چال کی زبان کی حیثیت سے یہاں آئی تھی، سہارا دیا اور پاؤں پاؤں چلنا سکھایا۔ دکنی اردو کے فروغ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ جب تک حیدرآباد شہر باقی ہے اردو باقی رہے گی اور جب تک اردو باقی ہے دکنی تہذیب باقی رہے گی۔

خطبہ افتتاحیہ کے بعد محترمہ رفیعہ منظور الامین صاحبہ کی تحریر کردہ تمثیل "محمد قلی" کو فائن آرٹس اکیڈمی کے فن کاروں نے پیش کیا جسے بے حد سراہا گیا۔ ظہیر احمد خاں وارثی نے قوالی پیش کی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کنوینر قلی قطب شاہ تقاریب ۱۹۹۶ء کے شکریہ پر اس تقریب کا اختتام ہوا۔ نظامت کے فرائض جناب موہن پرشاد، کنوینر محمد قلی قطب شاہ تقاریب ۱۹۹۶ء نے انجام دیے۔ شائقین کی ایک کثیر تعداد نے اس تقریب میں شرکت کی۔

افتتاحی اجلاس سے قبل ۱۳ مارچ ۱۹۹۶ء صبح ۱۰ بجے قاری آغا مصطفی نے تلاوت کلام پاک کی۔ کیپٹن عباس عابدی نے مرثیہ محمد قلی پیش کیا۔ مولانا غلام عسکری رشید نے ذاکری اور جناب آغا عباسی نے نوحہ پیش کیا۔ ایک بجے دن پاٹ لک لنچ (مرد و خواتین) کا اہتمام کیا گیا جس کے معتمدین، ڈاکٹر غیاث صدیقی، سوز عابدی اور خواتین کے معتمدین محترمہ فاطمہ عالم علی خاں اور پروفیسر اشرف رفیع تھیں۔ ۳ بجے دن مشاعرہ ہوا جس کے معتمد سوز عابدی تھے۔ عوام کی سہولت کے لیے چار مینار، مہدی پٹنم اور نامپلی سے خصوصی بسوں کا انتظام کیا گیا۔

۱۷/ اپریل ۱۹۹۶ء یک شنبہ ساڑھے دس بجے صبح سمینار (اردو) "سلاطین گولکنڈہ اور ان کے کارنامے" ایوان اردو پنجہ گٹہ میں منعقد ہوا۔ پروفیسر وی۔ رام کشنیا، وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے افتتاح فرمایا۔ پہلے اجلاس کی صدارت عالی جناب نواب شاہ عالم خاں صاحب نے کی۔ پروفیسر اے۔ شریف، ڈاکٹر داؤد اشرف، جناب محمد عبدالقیوم، ڈاکٹر سیدہ اصفیہ کوثر نے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر وی۔ رام کشنیا، وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ انھوں نے اردو میڈیم سے تعلیم پائی ان کی تحریر اتنی خوش خط تھی کہ اساتذہ دوسرے طالب علموں کو ان کی تحریر دکھا کر انھیں خوش خطی کی طرف راغب کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا بانی ادارہ پروفیسر سید محی الدین قادری زور سے بہت قدیم رشتہ ہے۔ جس زمانے میں زور صاحب چادر گھاٹ اسکول کے پرنسپل تھے وہ اس اسکول کے طالب علم تھے انھیں زور صاحب کے شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے اس طرح ادارے سے ان کا رشتہ برسوں قبل قائم ہو چکا ہے۔ انھوں نے ادارے کی

میوں کو سراہا اور کہا کہ یہ ادارہ دکنی زبان اور کلچر کے تحفظ اور فروغ کے لیے اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ انھوں نے محمد قلی قطب شاہ راج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا قلی کی شاعری میں رنگینی بھی ہے اور تہذیبی پہلو بھی نمایاں ہیں۔ اردو پر قلی کے بہت احسانات ہیں ں فراموش کرنا ممکن نہیں۔

جناب نواب شاہ عالم خاں صاحب نے بطور مہمان خصوصی مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر جعفر نظام کی اعلیٰ تعلیمی اور انتظامی یتوں اور دیرینہ تجربوں اور ان کے مخلص رفیقوں کی کاوشوں سے ادارۂ ادبیات اردو ترقی اور توسیع کے منازل طے کر رہا ہے۔ انھوں طوقع کا اظہار کیا کہ ادارۂ ادبیات اردو اپنے دائرہ کار کو وسعت دیتے ہوئے سلاطین گولکنڈہ کے کارناموں کے ساتھ ساتھ عہد آصفی، صا قیام جامعہ عثمانیہ کے بعد اردو ذریعہ تعلیم کے زریں عہد کی یاد تازہ کرنے کے لیے مستقبل میں اس طرح کی تقاریب کا اہتمام کرے نھوں نے زور صاحب کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا اور قطب شاہی سلاطین کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا آج کہ جمہوریت کا دور ہے حکومتیں عوام کی منتخبہ ہیں، عوام کی بھلائی اور بہبودی کے لیے کاش ان رعایا پرور بادشاہوں سے سبق حاصل ں۔ ڈاکٹر داؤد اشرف نے "قطب شاہی حکمراں اور ان کے فرامین" کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ قطب دور کا کوئی سرکاری ریکارڈ محفوظ نہیں ہے۔ محفوظ ریکارڈ میں صرف ۴۳ فرامین کے موجود ہونے کا ذکر ہے۔ لیکن شاید ۱۶۸۷ء کی آخری ۔میں قطب شاہی دور کا سارا ریکارڈ ضائع ہو گیا۔

جناب محمد عبدالقیوم نے "گولکنڈہ کی قطب شاہی مساجد" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے مسجد صفا، مسجد یک خانہ، نگینہ ، مسجد ملا خیالی، چینی مسجد اور لنگر خانے کی مسجد کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر اے۔ شریف نے "دکن میں آرٹ اور آرکیٹیکچر" کے ن سے ایک معلوماتی مضمون پیش کیا۔ انھوں نے عہدہ داران ادارۂ ادبیات اردو سے خواہش کی کہ وہ اس ادارے کو ایک ریسرچ سنٹر بن پاکہ دکنی تہذیب کو نئی نسل کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ ڈاکٹر سیدہ اعظمیہ کوثر نے کتب خانہ سالار جنگ میوزیم کے مخزونہ عربی طات پر مضمون پیش کیا۔

دوسرا اجلاس ۲/۳۰ بجے دوپہر شروع ہوا۔ جناب نریندر لوتھر نے صدارت کی۔ جناب راحت عزمی نے مضمون "قطب شاہی دور جند امرا و وزرا" پیش کیا۔ پروفیسر اشرف رفیع نے بعنوان "سلطان محمد قطب شاہ" مضمون پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ محمد قطب شاہ کا حکومت سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زریں دور اور عبداللہ قطب شاہ کے زوال آمادہ دور کے درمیان ہے اس لیے مورخین نے اس پر ب توجہ نہیں کی۔ محمد قطب شاہ ایک متقی بادشاہ تھا وہ علما کی صحبت پسند کرتا تھا۔ اس نے شرعی احکام کو اپنی سلطنت میں نافذ کیا۔ اس ،آگ و رنگ اور لہو و لعب پر پابندیاں عائد کر دیں جو رسم و رواج کے نام سے ریاست میں مروج تھیں۔ وہ فارسی کا بہترین شاعر تھا۔ محمد علی اثر کے مضمون کا عنوان "عبداللہ قطب شاہ کے دور میں علم و ادب کی ترقی" تھا۔ انھوں نے اس دور کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ،کرتے ہوئے عبداللہ قطب شاہ کی شاعرانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی۔

جناب نریندر لوتھر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ سبھی مقالے معلومات آفریں تھے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کے مقالے سے ان کی مات میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے محمد قلی قطب شاہ پر انگریزی میں کتاب لکھی ہے اور اس عہد کا گہرائی سے مطالعہ کیا لیکن

آج کے مقالوں [illegible] کی معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔ انھوں نے پروفیسر اشرف رفیع کے تحقیقی مقالے کو سراہتے ہوئے کہا کہ ایسے کئی گوشے ابھی ماضی کے اندھیرے میں گم ہیں جنھیں روشنی میں لانا محققین کی ذمے داری ہے۔ انھوں نے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ اردو اور فارسی کا شاعر تھا اس نے تلگو میں شاعری نہیں کی۔ خواہ مخواہ ہی اسے تلگو شاعر کہا جاتا ہے۔ دونوں اجلاسوں کی نظامت کے فرائض جناب منظور احمد نے انجام دیے۔

اس موضوع پر ایک مذاکرہ ۔ انگریزی سمینار پروفیسر وائی وائیکنٹم وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی ورنگل کی صدارت میں ۱۴/ اپریل ساڑھے دس بجے صبح منعقد ہوا۔ پروفیسر سی۔ نارائن ریڈی نے سمینار کا افتتاح کیا۔ پروفیسر سروجنی ریگانی، پروفیسر راداکرشن شرما، پروفیسر ست نارائن سنگھ اور جناب سید عابد حسین نے مقالے پیش کیے۔

پروفیسر جعفر نظام، صدر ادارۂ ادبیات اردو نے خیر مقدمی تقریر کی۔ انھوں نے پروفیسر سی نارائن ریڈی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ وہ تلگو زبان کے بہت بڑے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ شاعر ہیں۔ انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی نوازا گیا ہے۔ وہ حکومت آندھرا پردیش کے جلیل عہدوں پر فائز رہے۔ وہ اردو میں بھی عمدہ غزلیں کہتے ہیں۔ پروفیسر جعفر نظام نے کہا کہ پروفیسر وائی وائیکنٹم وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی کا شمار ملک کے اہم مورخین میں ہوتا ہے۔ ان کے تحقیقی کاموں کو ملک اور بیرون ملک سراہا گیا ہے وہ ممتاز ماہر تعلیم بھی ہیں۔

پروفیسر سی نارائن ریڈی نے افتتاحی خطبے میں کہا کہ آج ہم رام اور رحیم کی بات کرتے ہیں جب کہ ابراہیم قلی قطب شاہ اپنی ہندو مسلم رعایا میں بہت مقبول تھا۔ ہندو اسے تلگو میں "ابھارام" کہتے تھے اسی طرح محمد قلی قطب شاہ بھی عوام میں بے حد مقبول تھا۔

پروفیسر وائی وائیکنٹم نے صدارتی خطبے میں کہا کہ قطب شاہی سلاطین نے دکن میں ایک نئے کلچر کی بنیاد ڈالی۔ شعر و ادب کے علاوہ فنون لطیفہ کے تمام شعبوں کو ترقی دی خصوصاً رقص اور موسیقی کو بڑھاوا دیا۔ انھوں نے سمینار میں پیش کردہ مقالوں کو سراہا اور کہا کہ ان مقالوں کو شائع کیا جانا چاہیے۔

پروفیسر سروجنی ریگانی نے "قطب شاہی دور میں معاشی فلاح و بہبود" کے عنوان سے تلگو میں مقالہ پیش کیا۔ اس مقالے میں انھوں نے پارچہ بافی اور ہیرا تراشی کی صنعت کا خصوصی مطالعہ پیش کیا انھوں نے کہا کہ اس دور میں ریاست کی معیشت کو بے حد ترقی ہوئی اس لیے عوام خوش حال تھے۔

پروفیسر ست نارائن سنگھ نے "محمد قلی قطب شاہ اور اس کی شاعری" پر انگریزی میں مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنی طرز کا منفرد شاعر تھا جس کا مقابلہ کسی اور شاعر سے نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ قلی قطب شاہ کے کلام کو جدید اردو میں پیش کیا جائے۔

پروفیسر راداکرشن شرما نے "قطب شاہی سلاطین اور نظام پٹنم کی بندرگاہ" پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ نظام پٹنم پورٹ بہت قدیم بندرگاہ تھی جسے قطب شاہوں نے ترقی دی تھی۔ اس بندرگاہ کی وجہ سے سیاحت اور تجارت کو فروغ ہوا۔

جناب عابد حسین صاحب نے اپنے مقالے میں پہلے قطب شاہی فرماں روا سلطان قلی قطب الملک کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالتے

(سلسلہ ص پر)

نقد و نظر

[تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

نام کتاب: موجِ رواں (شاعری) مصنف: قمر ساحری سائز: ۸/اڑیمائی صفحات: ۱۹۲۔ مجلد
ناشر: شایان اکیڈمی، بی۔۸، سلیمان پلازا۔ گلشن اقبال بلاک۔۱، کراچی ۴۷، پاکستان قیمت: ۱۵۰/- (علاوہ ڈاک خرچ)

قمر ساحری کا تعلق سرزمین حیدرآباد دکن سے ہے۔ وہ ایک برگشتہ اور باغی شاعر کی حیثیت سے ابھرے۔ ملاؤں اور جاگیردارانہ نظام ف ولولہ انگیز نظمیں لکھیں۔ ان کے دو مجموعہ، کلام زلزلے اور ضربِ آتشیں بمبیں سے شائع ہوئے۔ پاکستان جانے کے بعد انھوں نے ے شعری مزاج کا اثر قبول کیا۔ لب و لہجے میں نمایاں تبدیلی آئی۔ کراچی سے دو شعری مجموعے شاخِ تازہ اور حرفِ آئندہ شائع ہوئے۔ تازہ موجِ رواں" رباعیوں اور رباعی کے اوزان میں کہی گئی نظموں، غزلوں اور ایک مثنوی تیغ گزیدہ پر مشتمل ہے اس کے علاوہ آزاد تجربہ بھی انھوں نے کیا ہے اور رباعی کے اوزان میں آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔

قمر ساحری کو رباعی پر کافی دسترس حاصل ہے اور انھوں نے بڑی خوب صورت رباعیاں کہی ہیں جو اس صنف میں اضافے کی رکھتی ہیں۔ رباعی کے چوبیس اوزان میں سے انھوں نے چند اوزان ہی کو اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ رباعی میں اس کی گنجائش ہے کہ رعہ رباعی کے چار الگ اوزان میں ہو سکتے ہیں لیکن بہت کم شاعروں نے اس جواز سے فائدہ اٹھایا ہے۔ قمر ساحری اس طرف توجہ کریں ں کے آہنگ میں تنوع پیدا کر سکتے ہیں۔ رباعی کے اوزان میں جو غزلیں اور منظومات اس مجموعے میں شامل ہیں وہ بھی اس تنوع سے ہیں۔ بعض اصناف کی شناخت ان کے سانچے سے ہوتی ہے جس میں بحر بھی شامل ہے۔ غزل کے سانچے کا یہ التزام ہے کہ قوافی اور ردیف کی کے ساتھ تمام مصرعے ہم وزن ہوں۔ رباعی کے سانچے کا تقاضا ہے کہ پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں معینہ قوافی اور ردیف کے ں کے علاوہ چاروں مصرعے رباعی کے کسی نہ کسی وزن میں ہوں۔ آزاد غزل اور آزاد رباعی کا تصور ہی سراسر غلط ہے۔ نظم کی صنف غزل اعی سے مختلف ہے۔ ابتداً نظم نگاری کے لیے مختلف سانچے جیسے مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند اور مثنوی کا سانچہ وغیرہ ں کیے گئے۔ کسی سانچے کی تخصیص نہیں تھی اس لیے نئی وضع کے بند اختراع کیے گئے اور آزاد نظم کا وجود ممکن ہو سکا۔ اس کے برخلاف ں آزاد غزل کا تجربہ ناکام رہا۔ آزاد رباعی کا تجربہ بھی لاحاصل ہے۔ قمر ساحری آزاد رباعی کے جھمیلے میں پڑنے کے بجائے رباعی کے اوزان کی الٹ پھیر سے رباعی کے نئے نئے آہنگ پیدا کریں تو یہ اس صنف کی بڑی خدمت ہوگی۔ عظمت اللہ خاں نے رباعی میں کے تجربوں کے لیے ایک وسیع میدان کی نشان دہی کی تھی لیکن کسی شاعر نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ قمر ساحری اپنے توسن فکر کو ان میں دوڑا سکتے ہیں۔ رباعی کے موضوعات میں بھی وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

نمونۂ کلام

رباعیاں

معلوم نہیں کون یہاں لایا تھا
کیا بات ہوئی دھوپ کہاں سے اتری
اک قافلۂ رنج کشاں آیا تھا
اس پیڑ کا کل تک تو گھنا سایہ تھا

صدیوں کے ہر اک پل میں بہت کچھ دیکھا
اب اور کہاں تاب کہ دیکھوں کچھ اور
گزرے ہوئے ہر کل میں بہت کچھ دیکھا
تاریخ کے جنگل میں بہت کچھ دیکھا

بس ایک ہی انداز ہے ملیے جس سے
ہر موڑ پہ ہیں ایک ہی چہرے والے
ہر شخص کے لب پر ہیں پرانے قصے
اس شہر میں اب بات کریں تو کس سے

آزاد رباعی:

چڑھتا ہوا دریا ہے اتر جائے گا
تعمیر کے نقشوں سے نہ غافل ہونا
طوفاں کا اثر جائے گا
یہ دورِ خرابی ہے گزر جائے گا

خوابیدہ خیالوں کو جھنجھوڑا میں نے
بحروں میں مقید تھی رباعی کل تک
ویرانۂ اسلاف کو چھوڑا میں نے
اس قید کو توڑا میں نے

اشعار منزل:

شہر سے، شہر کی رونق سے ہمیں کیا لینا
جو محبت سے ملے بس اسے اپنا لینا
دل کہاں ہوگا سوالوں کے جواب آنے تک
اک نظر دیکھنا اور رازِ دروں پا لینا

حرفِ ناگفتہ اب آئے کہ نہ آئے لب تک
جب سبق یاد کیے ہیں انھیں دہرا لینا

(مغنی تبسم)

کتاب کا نام: نظم سمندر (شاعری)　　مصنف: کالی داس گپتا رضا　　مرتب: عبد اللہ کمال　　سائز: ڈیمائی

صفحات ۱۴۴　　ناشر: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ ۔ بمبئی ۴۰۰۰۲۰　　غیر مجلد　　قیمت: سو روپے

نظم سمندر، اردو کے ممتاز محقق اور ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کے کلام کا انتخاب ہے۔ ان کے تین شعری مجموعے شعلۂ خاموش ۱۹۶۸ء)، شورش پنہاں (۱۹۷۰ء) اور شاخ گل (۱۹۷۴ء) شائع ہو چکے ہیں۔ نظم سمندر میں ان تینوں مجموعوں کے علاوہ غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب بھی شامل ہے۔ انتخاب کا کام عبد اللہ کمال نے انجام دیا ہے جو جدید شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس انتخاب کا پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے اور کالی داس گپتا رضا کی شاعری کے ارتقائی مراحل کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

کالی داس گپتا رضا کی نظمیں ان کے اپنے فکر و احساس کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات متنوع ہیں۔ سیاسی، سماجی مسائل کے علاوہ روزمرہ زندگی کے تجربات و مشاہدات اور مناظر فطرت پر اپنے تاثرات اور جذبات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ نیل کمل، بے کتابی کا یک لمحہ، لاوارث، سوکھا سہما پنا، امرت منتھن، بھگوان بدھ کا تیاگ، میں اور تنہائی اس مجموعے کی چند قابل ذکر کامیاب نظمیں ہیں۔ طبع زاد نظموں کے علاوہ چند منظوم تراجم، ٹیگور سے چند ماخوذ تضمینیں اور اقبال کے اشعار پر دو نظمیں بھی اس انتخاب کی زینت بڑھا رہی ہیں۔ نمونہ، کلام کے طور پر ایک مختصر نظم پیش ہے:

لاوارث

مسافر آکے منزل پر اچانک
رک گیا کیسا
کوئی کہہ دے ہے منزل
دوسرا اک نام رستے کا

بھکاری اپنے ہی در کا
سدا کرتا رہا پھیرا
کوئی تھا ہی کہاں گھر میں
جو اس کو بھیک دے دیتا

مغنی وقت کے صحرا میں
کھو بیٹھا ہے سر اپنا
کوئی وارث نہیں ہے اب
ناسرامیدہ ترانوں کا

(مغنی تبسم)

نام کتاب۔ نگیٹیو سے پازیٹیو تک (خاکے) مصنف: ڈاکٹر عزیز اندوری سائز: ڈیمائی غیر مجلد

صفحات: ۸۰ طابع: دگ درشن آفسیٹ پریس۔ اندور۔ قیمت: تیس روپے

ڈاکٹر عزیز اندوری کی کتاب "نیگیٹیو سے پازیٹیو تک میں "۲۱ خاکے شامل ہیں۔ ان میں کوثر چاند پوری، گلزار دہلوی، مخمور سعیدی اور ندا فاضلی جیسی مشہور شخصیتیں بھی ہیں اور قیصر اندوری، ذہین نقوی، عقیل ناروی، وقار قریشی، اظہار شادانی، شعری بھوپالی، پروفیسر آفاق احمد اور عبیر ناصر جیسی شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی نے خاکوں کا تجزیہ بہ عنوان "فن تصویر کشی اور عزیز اندوری اور محمود ذکی نے مصنف کی شخصیت کا تجزیہ "پیکر فکر و عمل۔ عزیز اندوری" کے عنوان کے کیا ہے۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی کے اس خیال سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ کتاب کا عنوان دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ فوٹو گرافی کے فن کے متعلق کوئی کتاب ہے۔ خاکوں کے آخر میں مصنف نے تاریخ اور مقام بھی درج کیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ یہ خاکے کس شہر میں اور کس دور میں لکھے گئے۔ زیادہ تر خاکے دلی میں اور پندرہ روزہ "ارض وطن" دلی کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اس سے مصنف کا دلی سے جو ربط ہے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ عزیز اندوری جو شاعر ادیب، محقق، تنقید نگار و انشائیہ نگار ہیں اس کتاب کی اشاعت کے بعد خاکہ نگار بھی کہلائیں گے) نے "چند الفاظ" کے عنوان سے مختصر سا پیش لفظ لکھا ہے۔ انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ "کسی شخصیت کے نگیٹیو اور پازیٹیو دونوں کو ان کی تمام رنگت کے ساتھ پیش کرنا اور وہ بھی مسلسل قہقہوں کی شکل میں نہیں زیر لب تبسم کی صورت میں نمایاں کرنا ہنسی مذاق نہیں۔ اس کے "بے انسانی نفسیات" (؟) کے ساتھ ہی انسان کی مزاجی کیفیت کو بھی نیگیٹیو اور پازیٹیو بنانے کا ہنر آئے بغیر کسی شخصیت کی ہو بہو تصویر اتارنے میں ایک ساتھ کئی کیفیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

پتہ نہیں وہ کن کیفیتوں سے گزرے لیکن نہ تو کسی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ ان خاکوں میں ملتا ہے اور نہ کہیں زیر لب تبسم نمایاں ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے عزیز اندوری نے تشبیہات کے استعمال کے لیے یہ خاکے لکھے ہوں، تشبیہات بھی ایسی جن کا اوصاف سے کم تعلق ہے۔ تمام خاکے مردوں کے ہیں لیکن اکثر تشبیہہ نسوانی ہیں۔ مثلاً وہ مرد کے ہونٹوں کے لیے گلاب کی پنکھڑیوں سے تشبیہہ دیتے ہیں۔

اس کتاب میں شامل خاکے یا تو دوستی کی خاطر یا اظہار ممنونیت کے لیے لکھے گئے ہیں۔ کوثر چاند پوری، مخمور سعیدی اور ندا فاضلی کے خاکے نسبتاً غنیمت ہیں۔

کتاب کے آخر میں پروفیسر عبدالعزیز کی رائے شامل ہے جس میں انھوں نے خبردار کیا ہے کہ "عزیز کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔"

(بیگ احساس)

O O O

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پانسو سالہ جشن گولکنڈہ کے موقع پر
مبارکباد پیش کرتے ہیں

منجانب: سید سعید بھائی مینجنگ پارٹنر الفلاح کمپنی رجسٹرڈ

الفلاح کمپنی رجسٹرڈ کی منفعت بخش پیش کش

- بلا سودی کاروبار کے ذریعے جائز کمیشن حاصل کیجیے
- ہر ماہ پابندی کے ساتھ گھر بیٹھے کمیشن حاصل کرنے کی سہولت

فکر اور پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے تشریف لائیے

★ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کو درخشاں بنائیے
★ رقم مشغول کرکے تمام پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کیجیے

الفلاح کمپنی رجسٹرڈ آپ کی خدمت کیلئے تیار ہے

یاد رکھیے! بلا سودی کاروبار، جائز کمیشن، ڈسپلن اور پابندی کے ساتھ کمیشن کی ادائی
الفلاح کمپنی (رجسٹرڈ) کا طرۂ امتیاز
اپنے اطمینان کے لیے ایک بار ضرور تشریف لایئے۔

الفلاح کمپنی رجسٹرڈ

پولیس کمشنر آفس روڈ پرانی حویلی حیدرآباد

AL FALAH COMPANY
POLICE COMMISSIONER OFFICE
ROAD, PURANI HAVELI, HYD.
Ph : 565848

سن اجراء ۱۹۳۸ء — بہ یادگار سید محی الدین قادری زور — فون: 310469

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۵۸ — جولائی ۱۹۹۶ء — شمارہ: ۷

مجلس مشاورت

صدر: پروفیسر جعفر نظام — نائب صدر: زاہد علی خاں

اراکین: پروفیسر گوپی چند نارنگ — پروفیسر سید سراج الدین

رمن راج سکسینہ — محمد منظور احمد — غلام جیلانی — ڈاکٹر بیگ احساس

معتمد: پروفیسر مغنی تبسم

مدیر: مغنی تبسم

معاونین: غلام جیلانی — بیگ احساس

پبلیکشن اسسٹنٹ: اقبال علوی

فی پرچہ : ۱۰ روپے

زر سالانہ : ۱۰۰ روپے

کتب خانوں سے : ۱۲۵ روپے

مشرق وسطی اور امریکہ : ۲۵ ڈالر

پاکستان برما سری لنکا و بنگلہ دیش : ۱۰ ڈالر

انگلستان : ۱۵ پونڈ

ناشر: ادارۂ ادبیات اردو — پنجہ گٹہ روڈ — حیدرآباد ۸۲

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے سی ایس سائیں پرنٹرس میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا (کمپیوٹر کتابت: شارپ کمپیوٹرس)

اس شمارے میں

پہلی بات

اردو میں تنقید کی موجودہ صورتِ حال زیادہ تشفی بخش نہیں ہے۔ تنقید کا ایک اہم مقصد ادب کی تحسین ہے جس کے لیے سب سے پہلے ذوقِ صحیح درکار ہے۔ پھر نقاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ادب شناسی کے اصولوں سے بہرہ مند ہو۔ اس کے پاس وہ اوزار ہوں جن کے ذریعے وہ کسی ادب پارے کے حسن و قبح کو پہچان سکے۔ ادب میں سارا کھیل زبان کا ہوتا ہے۔ اس کھیل کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ہر زبان میں قاعدے مدون کیے گئے ہیں۔ ہماری زبان میں بھی عروض، بلاغت اور بدیع کے علوم موجود ہیں۔ ان علوم کے واضعین کا زبان کا علم محدود اور ناقص تھا۔ اب لسانیات کے علم نے بہت ترقی کرلی ہے اور اسلوب شناسی کے میدان میں بھی آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ بیشتر ماہرینِ لسانیات ادبی نقاد نہیں ہیں اور اکثر ادبی نقاد لسانیات اور اسلوبیات سے نابلد ہیں۔ ضروری ہے کہ لسانیات اور اسلوبیات کے جدید علوم کی روشنی میں عروض، بلاغت اور بدیع جیسے علوم کے نقائص کو دور کرتے ہوئے اسلوب شناسی میں ان قدیم علوم سے بھی استفادہ کیا جائے۔

گزشتہ ایک صدی میں تنقید کے نت نئے نظریے سامنے آئے ہیں ان میں سے کوئی نظریہ بھی ادب کی تحسین کے معاملے میں خود مکتفی نہیں ہے۔ ہم کسی نظریے کو مکمل طور پر رد بھی نہیں کرسکتے۔ لیکن ہماری تنقید افراط و تفریط کا شکار ہے۔ جب کوئی نیا نظریہ سامنے آتا ہے تو اسے یا تو سرے سے رد کردیتے ہیں یا اس کو حرفِ آخر سمجھ کر تمام اگلے نظریوں پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتے ہیں۔ ساختیات اور ردِ تشکیل کے بارے میں حالیہ مباحث اس کی مثال ہیں۔ نئی تاریخیت اور کلچر کی شعریات کی طرف ابھی زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے جس نے ادب کے مطالعے کا ایک نیا زاویہ پیش کیا اور جو اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تانیثی تنقید سے بھی نقادوں نے کم ہی استفادہ کیا ہے۔ آج کل تنقید میں نظریاتی مباحث تو بہت ہو رہے ہیں لیکن عملی تنقید میں ان نظریوں کا انطباق کم ہو رہا ہے۔ نظریہ جب تک نقاد کی جمالیات کا حصہ نہیں بن جاتا وہ اپنی شعریات تشکیل نہیں دے سکتا۔ اچھی عملی تنقید کی کمی کا شاید یہی سبب ہے۔

آخر میں ایک بات کہنا چاہوں گا۔ یہ صحیح ہے کہ لفظ زبان کی اکائی نہیں ہوتا۔ کسی کلام میں انفرادی طور پر استعاروں، علامتوں اور مجازِ مرسل، کنایوں اور صنائع وغیرہ کی نشان دہی سے بات نہیں بنتی لیکن انھیں نظر انداز کرکے صرف معانی کو مقصودِ تنقید بنانا بھی درست نہیں بلکہ گمراہ کن رویہ ہے۔ اعلیٰ ادبی تخلیق تحیر آفریں ہوتی ہے اور اسی میں اس کے معانی مضمر ہوتے ہیں جن کو محسوس کیا جاسکتا ہے ، سادہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لفظوں کا کھیل دل کش ہوتا شطرنج کے کھیل کی طرح۔ آپ شاہ، وزیر، اسپ، فیل، اونٹ اور پیادوں کی چال سے واقف نہ ہوں تو نہ تو شطرنج کھیل سکتے ہیں نہ ہی اس کھیل سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ کلام میں استعاروں، کنایوں اور صنائع کا خاص رول ہوتا ہے ان کی بھی اپنی چالیں ہوتی ہیں جو کھیل کو بناتی بگاڑتی ہیں۔ اس لیے شعر کی تحسین کے لیے عروض، بلاغت و بدیع کا علم ناگزیر ہے۔ جدید تنقید (New Criticism) نے بھی جسے "ادب بدر" کردیا جارہا ہے تنقید کو چند اچھے حربے دیے تھے ان سے دست بردار ہوجانا کہاں تک مناسب ہے!

(مغنی تبسم)

کتاب: مرزا غالب

مصنفہ: ڈاکٹر نتالیا پری گارینا

مترجم: اُسامہ فاروقی

باب: ۱۴

شمعِ سحر

اے مقدس خورشید درخشاں، ضیا پاشی کر!
جس طرح پو پھٹتے ہی تیری روشنی کے سامنے
چراغ بے نور ہو جاتا ہے
اسی طرح عقل و دانش کے لافانی سورج کے سامنے
جھوٹی دانش مندی ماند پڑجاتی اور بجھ جاتی ہے
زندہ باد، خورشیدِ تاباں!
اے اندھیرے، تو دور ہو جا!

(پوشکن)

اپنی ایک فارسی غزل میں غالب لکھتے ہیں:

خوشا کہ گنبد چرخ کہن فرو ریزد
اگرچہ خود ہمہ بر فرق من فرو ریزد
بہ رہ ام رہ دوری کہ گر بیفشانم
بجائے گرد، روان از بدن فرو ریزد

اے خوشا! وہ دن کہ جب یہ گنبد گردوں گرے
اور وہ بھی یک بہ یک آکر گرے سر پہ مرے
ایسی لمبی رہ سے آیا ہوں، ذرا جھٹکوں اگر
گرد کے بدلے مری جاں ہی بدن سے گر پڑے

(ترجمہ: مضطر مجاز)

فلک ناانصاف کے تعلق سے اس للکار میں ہمیں نظامِ دنیا سے بے زار اور تغیرات کے آرزو مند انسان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اتنی آزمائشوں سے گزر چکا ہے کہ اب وہ کسی بھی آزمائش سے خوف زدہ نہیں ہے۔ گزری ہوئی زندگی کے ماہ و سال

نے چکّی کی طرح اس کے دل و جان کو پیس کر خاک کر دیا ہے۔ لیکن عنفانی میرا فسانہ کے ان الفاظ میں انسان کی بلند ہمتی اور قسمت کے جبر کے خلاف حتی الامکان جدّ و جہد کرتے رہنے کا پیغام مضمر ہے۔ مسلسل "آز مائشوں" کے تختۂ مشق انسان کے حوصلے کی عظمت اور انسان کے مقدر پر غالب کا یقین غیر متزلزل تھا اور اسے انھوں نے بڑی مصیبتیں جھیل کر حاصل کیا تھا۔ تفتہ کے نام اپنے خط مورخہ 26/ جون 1858ء میں وہ لکھتے ہیں: "رجب علی بیگ سرور نے جو "فسانۂ عجائب" لکھا ہے، آغاز داستان کا شعر اب مجھ کو بہت مزا دیتا ہے:

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

ایک اور فارسی غزل میں وہ ثابت قدمی اور عزم محکم کے مضمون کی طرف لوٹتے ہیں:

برتر بھی پرد ز ملک ، بہر کسر نفس
خود را بہ بند سلسلۂ آدم الکنم
دو زندگر بہ فرض زمین را بہ آسمان
حاشا کزین فشار در ابرو خم الکنم

اونچا اڑوں فلک سے مگر بہر کسر نفس
آدم سے اپنا سلسلہ ہر حال میں ملاؤں
بالفرض آسماں کو زمیں پر اگر گرائیں
حاشا کہ میں فشار سے ابرو میں خم بھی لاؤں

(ترجمہ: مضطر مجاز)

ہم نے اس سے پہلے بھی غالب کی شاعری کی اس خصوصیت یعنی عالمی شاعری کے شہ پاروں سے توارد و توافق کی نشان دہی کی ہے۔ اپنے ایک قطعے میں انھوں نے خود اس بارے میں لکھا ہے:

ہزار معنی سرجوش خاص نطق من است
کز اہل ذوق دل و گوشے از عسل بردست
زرفتگان بہ یکے گر توارد م رو داد
مدان کہ خوبی آرائش غزل بردست
مراست ننگ ولی فخر اوست کان بہ سخن
بہ سعی فکر رسا جا بدان محل بردست
مبرگمانِ توارد ، یقیں شناس کہ دزد
متاعِ من ز نہان خانۂ ازل بردست

رکھتا ہے کتنے معنی سرجوش میرا نطق
لذت ہے اس میں ایسی کہ پانی بھرے عسل
اگلوں سے میرا کوئی توارد اگر ہوا
کب کم ہوئی ہے خوبی آرائش غزل
ہے ننگ مجھ کو اس کے لیے وجہ فخر ہے
فکر رسا کو میری جو پہنچا ہے برمحل
اتنا یقین کر کہ کوئی چور لے اڑا
میری متاع کو زِنہاں خانۂ ازل

(ترجمہ: مضطر مجاز)

ہو سکتا ہے کہ گراں باری تقدیر کے بارے میں خیال شاعرانہ، انسان کے مقدر سے تصادم کا موضوع واقعی نہاں خانۂ ازل میں محفوظ تھا، اس انتظار میں کہ کوئی آنے اور "کلید الفاظ" سے مضامین کے اس خزانے کو کھولے۔۔ اور یہ تقریباً حرف بہ حرف ہوریس کے ان الفاظ سے مطابقت رکھتا ہے، جن کے بارے میں گوئٹے نے کہا تھا کہ وہ ساری انسانیت کے تجربے پر منطبق ہوتے ہیں: "اگر گنبد گردوں بوسیدہ ہو کر ٹوٹ جانے تو اس کے گرنے سے بھی وہ خوف زدہ نہیں ہو گا۔ لیکن کسی بھی پچھلے تجربے کی روشنی میں اور "سبک ہندی" کے لیے مخصوص کسی بھی مبالغہ آرائی کے وسیلے سے اس بار یہ پیش

گوئی کرنا ممکن نہ تھا کہ باہمت شاعر کے سر پر آسمان کس شدت کے ساتھ ٹوٹ کر گرنے والا ہے۔ اور صرف اس کا "شب چراغ اور ستارۂ سحر۔ یعنی اپنی پوری طاقت سے تقدیر کے مقابلے پر کمر بستہ ہوجانے والی اس کی عقل اور اس کی مستقل حس ظرافت زندگی کے آخری برسوں کی اس کی خط و کتابت سے ابھرنے والی بے رونق اور اداس تصویر کو خوش گوار بناتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس زمانے کی دلی کے معاشرے کے دردناک حالات کی بہ دولت ہی غالب کے سوانح نگاروں کو شاعر کی زندگی کے اس دور سے متعلق وافر مواد میسر ہے۔ اگر اس سے قبل کے دور کے پورے پورے مہینوں بلکہ برسوں کے بارے میں بھی کبھی کبھی صحیح اطلاعات دست یاب نہیں ہوتیں اور کسی طرح کے بھی ذرائع معلومات کا فقدان ہے تو 1858ء کے آغاز سے محققین کو غالب کے بے شمار خطوط دست یاب ہیں، جن کی حیثیت نہ صرف دل چسپ تاریخی دستاویزوں کی ہے، بلکہ جو اس کے ساتھ ساتھ شاعر کی زندگی کے آخری دور کی ماہ بہ ماہ اور کبھی کبھی تو روز بہ روز کی تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔

اس دور میں غالب نے شاعری تقریباً ترک کر دی تھی۔ لیکن شعر کی تخلیق اب بھی ان کے بس کے باہر نہیں تھی، گو کہ انھیں ایسا لگتا تھا کہ "دل میں جوش بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زندگی باقی نہیں رہی۔۔ (خط بہ نام آرام مورخہ 13/ نومبر 1859ء) اطراف کی حقیقت وہم و خیال کا تاثر پیدا کرتی ہے، سینے سے نکلنے والی سانسیں سراب کی مانند ہیں۔ شہرت، عوام کا جوش اور شاعری کے قدر دانوں کی محبت، یہ سب کسی دوسری دنیا کی باتیں ہیں۔ تفتہ کے نام اپنے خط (مورخہ 1859ء) میں وہ پکارا اٹھتے ہیں: "لیکن شاعروں کو شہرت سے کیا حاصل ہوا؟!"

دلی ویران ہوگئی تھی۔ ستمبر 1857ء میں انگریزوں کے قبضے کے بعد، ظلم و تشدد کے خوف سے، بے شمار لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔

شہر میں مسلمان درحقیقت باقی ہی نہیں رہے تھے۔ ہندوؤں کو صرف تین ماہ بعد واپسی کی اجازت ملی تھی۔ جنوری 1858ء میں ان کی واپسی کو بڑے پیمانے کی واپسی کہہ سکتے ہیں۔ گھروں میں چولھے پھر جل اٹھے، چراغ روشن ہوگئے، صرف مسلمانوں کے گھر سونے اور اجاڑ تھے۔ ان کے در و دیوار پر سبزہ اگ رہا تھا۔ ہر لمحہ سبزۂ سر دیوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ بہ دستور خالی ہے۔۔ ("دستنبو"، ترجمہ: رشید حسن خاں) اس کے باوجود غالب اور ان کے گھر والوں کی حالت میں بہ ہر حال کچھ بہتری کی شکل پیدا ہوئی، کیوں کہ ان کے ہندو دوست وقتاً فوقتاً ان کے ہاں پھل پھلہار اور شراب بھیج کر اور تھوڑی بہت مالی امداد کے ذریعے حتی الامکان ان کی خبر گیری کرتے رہتے تھے۔ وہ ان کے پڑوسی تھے، ان میں سے بعض ان کے شاگرد تھے، غالب اپنے خطوط میں ان کا ذکر کرتے ہیں: شیو جی رام برہمن، ہیرا سنگھ، بال مکند وغیرہ، جو اپنی خاطر داری اور خبر گیری سے ان کی زندگی کو خوش گوار بنانے کا جتن کرتے رہتے تھے۔

لیکن بہ حیثیت مجموعی غالب کے معاملات بہت ہی بگڑے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ پنشن کی ادائگی کی بحالی کے بارے میں سوچنا بھی فضول تھا۔ سہارا بس ایک تحفے تحائف کا یا اگر صاف گوئی سے کام لیں تو اوروں کی داد و دہش کا رہ گیا تھا۔ کبھی کبھی دوسرے شہروں سے شاگرد، خصوصاً تفتہ، روپے پیسے بھیج دیتے تھے۔ لیکن ان سب سے گزر بسر بھی مشکل ہی سے ہو پاتی تھی۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ گھر کا انگڑ کھنگڑ بیچنے کی نوبت آگئی۔ ہر باشندۂ ہندوستان کے گھر میں، چاہے مفلس و قلاش ہو یا اس کے برعکس متمول اور نام ور، بیوی کے زیوروں کو آڑے وقتوں کے لیے بچا کر رکھا جانا والا سب سے بیش قیمت مال سمجھا جاتا ہے۔ انھیں خاندان میں ناقابل دست اندازی ذخیرے کی طرح احتیاط سے رکھا اور پہنا جاتا ہے، یہ گہنے پشت در پشت منتقل ہوتے ہیں اور خاندان والے ان سے اسی وقت دست بردار ہوتے ہیں جب گزر بسر کے دوسرے

کوئی وسیلے باقی نہیں رہتے۔ لیکن فلک کینہ پرور نے غالب کا حسب معمول پھر ایک بار بے دردی کے ساتھ مذاق اڑایا۔ شوہر کی عملی صلاحیتوں پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے اس بار امراؤ بیگم نے طے کیا کہ گھر میں موجود زیور اور قیمتی چیزوں کی حفاظت کے لیے خود ضروری قدم اٹھائیں گی۔ جب یہ واضح ہوگیا کہ دلی اب لوٹی جانے والی ہے اور کسی ایک مسلمان کا گھر بھی بخشا نہیں جائے گا تو امراؤ بیگم نے اپنے زیورات انھیں کالے میاں کے ویران لق و دق گھر میں چھپانے کا تہیہ کرلیا، جنھوں نے کسی زمانے میں غالب کو قید سے چھوٹنے پر اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ درباری ہونے اور بغاوت کے دوران دربار کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے الزام میں کالے میاں یا تو حراست میں اور زیر تفتیش تھے اور ہو سکتا ہے کہ اس وقت زندہ بھی نہ رہے ہوں۔ امراؤ بیگم موقع دیکھ کر کالے میاں کے گھر پہنچ گئیں، اپنے گہنے پاتے گھر کے تہہ خانے میں چھپا دیے، دروازے پر مٹی تھوپ کر اسے مٹی سے ایسے بند کر دیا کہ کسی کو اندازہ بھی نہ ہو کہ وہاں کچھ ہے۔ لیکن انگریز ان ہوشیاریوں کو خاطر ہی میں نہیں لائے۔ ان کے حکم کے بہ موجب اہم باغیوں کے گھر صاف سیدھے زمین کے برابر کر دیے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کالے میاں کی حویلی گویا کہ استرے سے چھیلے گئے مسطح قطعہ زمین میں تبدیل ہوگئی جب کہ اسی چرخِ ستم پیشہ کی تلوّن مزاجی کے نتیجے میں غالب کا گھر اس بار لوٹ مار کرنے والے سپاہیوں سے بچا رہا: جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں غالب کے با اثر پڑوسی کی بہ دولت محلے کی حفاظت کے لیے سپاہیوں کا پہرا بٹھا دیا گیا تھا۔

جولائی 1858 میں، جب کہ غالب کی پنشن بند ہوئے پندرہ مہینے ہو رہے تھے، وہ اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں: "اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا، سب بیچ کر کھا گیا، گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔ جو حالت کہ اس وقت در پیش ہے ظاہر ہے کہ اس کا انجام یا موت ہے یا بھیک مانگنا۔" (دستنبو)۔

اپنے خطوط میں یہ خیال وہ مسلسل دہراتے ہیں کہ دلی میں ان کی موت پر رونے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ ان کی ایک ابتدائی دور کی غزل کے موضوعِ شاعرانہ اور زندگی کی تلخ حقیقت کے مابین اب غیر متوقع طور پر توافق پیدا ہو جاتا ہے:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مجروح کے نام اپنے خط مورخہ 7/ اکتوبر 1858ء میں بغاوت کے نتیجے میں سارے ہندوستان میں تتر بتر ہو جانے والے اپنے دوستوں کا شمار کرتے ہوئے غالب پکار اٹھتے ہیں: "خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں، سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے۔ سُنّی الگ، شیعہ الگ، نیک جدا، بد جدا۔"

ان کی حسِ مزاح اس وقت بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی، جب وہ تسلیم کرتے ہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے، اس کی وہ نہ تو پیش بینی کر سکتے ہیں اور نہ اس کے لیے پہلے سے کچھ انتظام کر سکتے ہیں۔ مجروح کے نام اپریل 1858ء کے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: "یہ میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا۔ آئندہ خدا رزاق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب، جب ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے!"۔ تاہم وقت گزرتا جاتا ہے، حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور افسردگی شدت کے ساتھ ان کو اپنی گرفت

میں لے لیتی ہے اور انھیں اس مضمون کی سی باتیں لکھنے پر مجبور کردیتی ہے کہ افلاس، رسوائی اور موت ان کا مقدر ہے، اور یہ کہ سینکڑوں احباب کی ناوقت موت نے ان کو ہمیشہ کے لیے دل گیر کردیا ہے۔

ایک شاعر متخلص بہ جنون کو ستمبر 1859ء میں لکھتے ہیں: "وہ خط جس میں اشعار سید مظلوم کے تھے، مجھ کو پہنچا۔ اور میں نے اس خط کا جواب تم کو بھیجا اور ذکر اشعار قلم انداز کیا۔ فارسی کیا لکھوں؟ یہاں ترکی تمام ہے! اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر! ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں، آپ غم زدہ اور آپ غم گسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے، پا بہ رکاب ہوں۔"

جیسا کہ اوپر ہم ذکر کرچکے ہیں بغاوت کے دوران غالب نے روزنامچہ لکھنا شروع کیا۔ اسلوب کی حد تک انھوں نے اپنا نصب العین خالص فارسی زبان میں ایک ایسی تصنیف کی تخلیق قرار دیا جس میں قدیم ذخیرۂ الفاظ سے کام لیا جائے اور عربی الفاظ سے پرہیز کیا جائے۔ غالب کے زیر استعمال دو فرہنگوں میں سے ایک سترہویں صدی عیسوی کی مشہور لغت "برہان قاطع" تھی (لغت کے نام میں جس کے معنی "آخری سند" ہوتے ہیں، خودستائی جھلکتی ہے، جو اس زمانے کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی)۔ فارسی زبان کی فرہنگ نویسی کے مسائل میں ناقابل تردید سند سمجھے جانے والے اس ماخذ پر ایک نظر ڈالتے ہی غالب کو اندازہ ہوگیا کہ اس میں بے شمار غلطیاں اور اسقام ہیں۔ غالب نے "قاطع برہان" کے نام سے اس کے رد میں ایک تصنیف پر کام شروع کیا۔

1860ء کے دہے کے آغاز میں احباب نے "دیوان اردو" کی دوبارہ اشاعت کا تقاضا شروع کیا۔ اب پتہ چلا کہ بغاوت کے دوران ان کی نظم و نثر کے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخے، جنھیں ان کے برادر نسبتی ضیاء الدین احمد خاں نے بڑے جتن سے اکٹھا کیا تھا، تباہ ہوگئے۔ ان کے کتب خانے میں غالب کا سارا کلام تھا۔ غالب، آرام کے نام اپنے خط مورخہ 11/ دسمبر 1858ء میں لکھتے ہیں: "جو نظم و نثر میں، میں نے کچھ لکھا وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا۔ چناں چہ "کلیات نظم فارسی" چون پچپن جزو، اور "پنج آہنگ" اور "مہر نیم روز" اور "دیوان ریختہ" سب مل کر سو سوا سو جزو مطلی اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یک جا فراہم ہے۔" مغل شاہ زادوں میں سے ایک نے اس مجموعے کی نقل تیار کروائی تھی اور اس طرح سے دہلی میں کلام غالب کے کم از کم دو مکمل مجموعے موجود تھے۔ مگر بغاوت کی ناکامی کے بعد ضیاء الدین خاں اور ان کے بھائی امین الدین خاں کو اپنی ساری ملکیت قسمت کے ہاتھ چھوڑ کر دلی سے راہ فرار اختیار کرنی پڑی اور ان کا کتب خانہ لٹ گیا اور تباہ ہوگیا۔ نتیجتاً اب دہلی میں غالب کی تصانیف کے نسخے ڈھونڈھنے پر نہیں ملتے تھے۔

نومبر 1858ء میں مسلمان تھوڑا تھوڑا کر کے شہر واپس آنے لگے، لیکن سابقہ طرز زندگی کی بحالی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ چوں کہ بغاوت ابھی پوری طرح سے کچلی نہیں گئی تھی اور جا بہ جا اس کے نئے مراکز قائم ہو رہے تھے، انگریز مسلمانوں کی سرگرمیوں پر پابندی کی سخت گیر پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ دلی میں زندگی دشوار سے دشوار تر ہوتی جا رہی تھی، مہنگائی بڑھ رہی تھی، نئے نئے محصول عاید کیے جا رہے تھے۔ شہر میں درآمد کی جانے والی اشیائے خوردنی پر لگائے جانے والے ٹیکسوں میں سے ایک کے بارے میں، جس کا انگریزی میں سرکاری نام "ٹاؤن ڈیوٹی" یعنی شہر کا درآمدی محصول اور عوام کی زبان میں "پون ٹونی" تھا، غالب از راہ طنز لکھتے ہیں کہ اب صرف اناج اور اپلیاں محصول سے بچی ہیں۔

غالب کو کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ ان کی زندگی کے دن بس گنتی کے رہ گئے ہیں اور حالاں کہ انھیں فن تاریخ گوئی سے کبھی کوئی دل چسپی نہ تھی، اب وہ اپنی موت کی پیشین گوئی کرتے ہوئے مادۂ تاریخ نکالتے ہیں۔ اس کا ذکر وہ جنون کے نام

اپنے اس خط میں کرتے ہیں جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ خط کے آخر میں وہ فارسی زبان میں تحریر کرتے ہیں:

کیستم من کہ جاودان باشم
چون نظیری نماند و طالب مرد
ور بگویند در کدامین سال
مُرد غالبؔ ؟ بگو کہ "غالبؔ مُرد"۔

اس مادّۂ تاریخ "غالب مرد" سے حروف ابجد کے اعداد کے مطابق ان کے مرنے کی تاریخ 1277 ہجری یا بہ الفاظ دیگر 1860ء نکلتی تھی۔

تاہم وہ ابھی بہ قیدِ حیات تھے اور انھیں اپنے افراد خاندان اور متعدد نوکروں کے گزر بسر کی، جن میں سے کسی کو بھی انھوں نے بغاوت کے دنوں میں جواب نہیں دیا تھا، فکر کرنی پڑتی تھی۔ غالبؔ کو ایسا لگتا تھا کہ اگر کنبے کو کھلانے پلانے کی ذمہ داری ان کے سر نہ ہوتی تو وہ ان روپیوں پر جو انھیں احباب بھیجتے تھے اور پنشن کی بحالی پر جن کے حصول کی وہ آس لگائے بیٹھے تھے، کسی طرح گزر بسر کر لیتے۔ وہ سوچتے ہیں کہ شاید بہتر یہی ہو کہ وہ بیوی اور پوتوں کو لوہارو بھیج دیں۔ خطوط میں کبھی ایک تو کبھی دوسرے رشتہ دار کو مخاطب کرتے ہوئے وہ استعانت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ان کے بعض خطوط کے "سنگ دلانہ" لہجے کی توضیح شاید اسی سے ہوتی ہے۔ تفتہ کے نام اپنے خط مورخہ 19/ دسمبر 1858ء میں وہ دونوں کے ایک ملاقاتی کی بیوی کی موت پر اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔ غالبؔ، تفتہ کو لکھتے ہیں کہ وہ اس دوست کو ان کی طرف سے بھی پرسہ دیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ دوبارہ شادی نہ کرنے کا بھی مشورہ دیتے ہیں۔ وہ پکارا لکھتے ہیں: "اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے!"۔ اور آگے حکیم سنائی کی ایک حکایت کا حوالہ دیتے ہیں۔ بیٹا جب باپ کے پاس شادی کی اجازت لینے آیا تو اسے یہ جواب ملا: "میرے بیٹے، کسی قیمت پر شادی نہ کرنا، جتنا جی چاہے، معصیت میں زندگی گزار دے، لیکن شادی مت کر!"۔

کافی عرصہ بعد، مہرؔ کے نام خطوط میں، جنھوں نے مرزا کو اپنی محبوبہ کے بارے مطلع کیا تھا، یہی موضوع پھر سامنے آتا ہے۔ پہلے خط میں غالب انھیں بہت پُر اثر طریقے سے دلاسا دیتے ہیں، لیکن دوسرے خط میں بہ ظاہر محبوبہ سے دائمی جدائی پر ان کے دلی رنج و غم میں شریک ہونے سے انکار کرتے ہوئے، گویا کہ تمام رسمی باتوں سے کنارہ کشی کرتے ہوئے، ناقابل بیان ظرافت کے ساتھ وہ اس بحرانی صورت حال کا "حل" ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ مہرؔ کی محبوبہ، جیسا کہ اس کے نام، چُنّا جان، سے ظاہر ہے، طوائف تھی۔ غالبؔ لکھتے ہیں: "کسی کے مرنے کا وہ غم کرے، جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی! کہاں کی مرثیہ خوانی! آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ، اور اگر ایسے ہی گرفتاری سے خوش ہو، تو چُنّا جان نہ سہی، مُنّا جان سہی!---

لیں نو کن اے دوست ہر نو بہار | بہ ہر سالِ نو کر تقویمِ نو مدام
کہ تقویمِ کہنہ نہ آید بہ کار | کہ تقویمِ پارینہ آئے نہ کام

(ترجمہ: مظفر [illegible])

اہل و عیال کی بندشوں سے آزادی کے لیے وہ علم الٰہیات کی رو سے بھی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی ایک فارسی رباعی میں ان کا یہ "فلسفۂ آزادی" نظر نواز ہوتا ہے:

آن مرد کہ زن گرفت دانا نبود | شادی جو کرے دانا وہ کیوں کر کہلائے
از غصہ فراغتش ہمانا نبود | کیوں کر غم و غصّے سے فراغت وہ پائے
دارد بہ جہان خانہ وزن نیست درو | عالم یہ خدا کا گھر ہے زن جس میں نہیں
نازم بہ خدا چرا توانا نہ بود | پھر کیوں نہ خدا اتنا توانا ہو جائے

(ترجمہ مظفر مجاز)

لیکن افسوس! یہ محض الفاظ تھے۔ وہ بیوی اور پوتوں کو چھوڑ نہیں سکتے تھے، انھیں ہمیشہ ان کی خاطر مد نظر رہتی تھی اور ان سے ایک لمحے کے لیے جدائی بھی ان کے لیے ناقابل تصور تھی۔ چناں چہ ان کی بے پناہ ظرافت کی آئینہ دار ایک رباعی میں ہم کو حقیقت تو ملتی ہے لیکن آدھی:

زانجا کہ دلم بہ وہم دربند نبود | یوں ہے کہ یہ دل وہم میں بند نہیں
باہیچ علاقہ سخت پیوند نبود | خطّے سے کسی بھی کوئی پیوند نہیں
مقصود من از کعبہ و آہنگ سفر | یعنی سفر کعبہ سے مقصود مرا
جز ترکِ دیار و زن و فرزند نبود | جز ترکِ دیار و زن و فرزند نہیں

(ترجمہ مظفر مجاز)

1859ء میں نواب رام پور جو خود کو غالب کا شاگرد مانتے تھے، ماہانہ سو روپے بھیجنا پھر سے شروع کرتے ہیں اور 1860ء میں بہ اصرار انھیں رام پور بلاتے ہیں۔ سفر رام پور سے پہلے تقریباً دو سال تک غالبؔ اپنی پنشن کی بحالی کے لیے جدو جہد کرتے رہے تھے۔ اسی پنشن کی خاطر انھوں نے "دستنبو" کا منصوبہ بنایا اور بڑے جتن سے اس کی اشاعت کا انتظام کیا، اس امید پر کہ ان کی یہ تصنیف بغاوت کے دوران انگریزوں کے تعلق سے ان کی وفاداری کے ثبوت کا کام دے گی۔ اسی مقصد سے انھوں نے کافی سرگرمی سے کام لیتے ہوئے اپنے واحد سرکاری ذریعۂ آمدنی کی بحالی کی درخواست کے ساتھ مختلف ممدوحوں کی خدمت میں دھوم دھام کے قصیدے بھیجے۔ ماہانہ چھبیس روپے آٹھ آنے کی اپنی پنشن کی بحالی کے لیے غالب کی جدو جہد کے اس نئے دور نے پھر ایک جاسوسی کہانی کا روپ اختیار کر لیا، جو غالب کو مہنگی تو ضرور پڑی، لیکن غنیمت ہے کہ اس بار کسی کی موت یا قتل کی نوبت نہیں آئی۔ چوں کہ اپنے پنشن کے موضوع کو ادبی شکل دے کر غالب کو شاید کچھ تسلّی ملتی تھی، اس سلسلے میں اٹھائے جانے والے تقریباً ہر قدم سے وہ خطوط کے ذریعے اپنے احباب کو مطّلع کرتے رہتے تھے۔ نتیجۃً ہم گویا کہ ان واقعات کے روزنامچے سے استفادہ کرتے ہوئے بعض دل چسپ تفصیلات کی یاد تازہ کر سکتے ہیں۔

30/ جنوری 1858ء۔ غالبؔ، تفتہ کو لکھتے ہیں کہ برطانوی حکام کو ان کا شہر میں ہونا معلوم ہے۔ اس کے باوجود ان کی طلبی میں کوئی عجلت نہیں دکھائی گئی ہے، نہ ہی اپنی صفائی دینے کے لیے اور نہ ہی کسی اور غرض سے۔ مئی 1857ء سے غالب کو پنشن کی ادائیگی بند تھی۔ (اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کیوں کہ 1835ء سے انھیں پنشن دہلی کے کلکٹر، یعنی ہندوستان کے انگریز انتظامیہ کے ہاں سے مل رہی تھی)۔ یہ اور بات ہے کہ خارج از امکان نہیں کہ بغاوت کے زمانے میں انھیں بہادر شاہ کے دربار سے کچھ عطیے ملتے رہے ہوں۔

فروری۔ کلکتے سے ہائی کمشنر ہند جان لارنس دہلی آتے ہیں۔ غالب ان کی آمد کے موقع پر آغازِ بہار کے ذکر پر مشتمل ایک غزل لکھتے ہیں۔ 19/ فروری کو انھوں نے غزل بذریعۂ ڈاک روانہ کی۔ تاہم پتہ نہیں کس شگونِ بد اور پیش اندیشیوں کی

وجہ سے غالب نے ان کے ہاں باریاب ہونے کی کوشش نہیں کی۔ غزل کے ساتھ انھوں نے پنشن کی بحالی کے لیے ایک عرض داشت بھی بھیجی۔

8/ مارچ کو عرض داشت اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دی گئی کہ اسے راست نہیں، متعلقہ محکمے یعنی دہلی کے کمشنر کے توسط سے بھیجنا چاہیے۔

12/ مارچ ۔ عرض داشت کمشنر دہلی چارلس سانڈرس کے ہاں پیش کی گئی۔ سانڈرس نے اسے کلکٹر کے پاس تحقیقات کے لیے اور یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ کہیں غالبؔ بغاوت کے زمانے میں ان کی وفاداری کو اشتباہ میں ڈالنے والے افعال کے مرتکب تو نہیں ہوئے ہیں۔

7/ اگست ۔ استفسار کوتوالِ شہر کے پاس بھیجا گیا۔ جواب موافق آیا۔ ریزیڈنٹ ایجرٹن نے غالب کو اپنے ہاں طلب کیا اور کچھ سیدھے سادے سوال کیے، نتیجتہً غالبؔ کو پنشن کی جلد ہی بحالی کی پھر اُمید بندھی۔ اب ان کو ایک ہی فکر ہے: پندرہ ماہ کی بقایا رقم بھی ملے گی یا از سرِ نو ادائگی شروع ہوگی۔ فروری 1859 ء میں غالبؔ، مجروحؔ کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ دو دن قبل بائیس ماہ کے انتظار کے بعد بالآخر کوتوال کے ہاں ان کی طلبی ہوئی جس نے "اسد اللہ خاں پنشن دار" سے ایک تحریری بیان اس امر کی وضاحت کے لیے طلب کیا کہ آیا ان کو بہ صورت رقم یا کسی طرح کی کوئی اور آمدنی ہوتی ہے اور اگر ہوتی ہے تو کہاں سے اور کتنی۔ اپنے بیان کی تصدیق کے لیے پنشن خوار کو چار گواہ بھی پیش کرنے چاہئیں۔ غالب، جن کو تلخ تجربوں نے اس معاملے میں اب کافی سمجھ دار بنا یا دیا تھا لکھتے ہیں: "تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا اور آئندہ کو پنشن جاری ہو جائے گا۔ نہ صاحب، یہ تو ممکن ہی نہیں۔"

جب کہ پنشن کی بحالی کی کارروائی معمول کے مطابق آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور کہیں ختم ہوتی نہیں دکھائی دیتی تھی پولیس کے سربراہ نے سو روپے کے حساب سے "مدد خرچ" کے نام سے علی الحساب مالی امداد قبول کرنے کی تجویز ان کے سامنے رکھی۔ لیکن غالبؔ نے قاعدے سے ان کو ادا شدنی رقم کی جلد ہی وصولی کی توقع میں اس تجویز کو رد کر دیا۔

24/ فروری 1859 ء۔ کمشنر سانڈرس نے غالبؔ کو پھر طلب کیا۔ لیکن طلبی پر جب غالبؔ اس کے ہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ مسٹر سانڈرس شکار پر چل دیے ہیں۔ دوسرے دن غالب پھر وہاں گئے۔ اس بار ان کا خوش اخلاقی سے استقبال کیا گیا۔ سانڈرس نے ان سے اعزازی عطیوں کے لیے انگلستان سے خط و کتابت کے بارے میں دریافت کیا۔ ساتھ ہی ساتھ کمشنر نے "دستنبو" سے اپنی واقفیت کا بھی اظہار کیا اور اپنے لیے نیز پنجاب کے کلکٹر میکلوڈ کے لیے اس کتاب کے دو نسخوں کی فرمائش کی۔ غالبؔ مطمئن واپس لوٹے اور گو کہ پنشن کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی، انھوں نے جو کچھ بھی پیش آیا اسے ایک فال نیک سمجھا۔

25/ فروری کو غالب کتابیں لے کر گئے۔ پیشی میں ان سے کچھ دیر انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس اثنا میں مسٹر سانڈرس اپنی بگھی کی طرف جاتے ہوئے غالبؔ کے پاس سے گزرے۔ غالبؔ نے انھیں یاد دلایا کہ ان کی فرمائش پر کتابیں وہ اپنے ساتھ لائے ہیں۔ جواب ملا "منشی جیون لال کو دے جاؤ۔" غالبؔ وہاں سے چلے آئے (خط بہ نام مجروح، مارچ 1859 ء)۔ یکم مارچ کو ملاقات کا موقع ملا، دوستانہ بات چیت ہوئی۔ اپنے خط میں اس کی اطلاع دیتے ہوئے غالبؔ، جو پچھلے سالوں میں صریحاً تو ہم پرست ہو گئے تھے، خط میں بار بار صاحب کرامت، مشکل کشا حضرت علی کا نام لیتے ہیں اور بالآخر پکار اٹھتے ہیں: "دیکھو سیّد اسد اللہ الغالب علیہ السّلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کسی طرح بچایا۔ بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔"

7/ مارچ کو مجروح کو لکھتے ہیں کہ گورنر جنرل نے پنشنوں کے بارے میں پنجاب کے گورنر سے صورتِ حال دریافت کی ہے اور یہ کہ پنشن کی پوری رقم دو ماہ میں مل جائے گی! بنابریں غالب نے پیشگی سو روپے کی ادائگی کی پیشکش قبول کرلی۔

27/ مارچ کو الہ آباد سے گورنر جنرل کے ہاں "دستنبو" کے موصول ہونے کی اطلاع ملی۔ لیکن اپریل، مئی میں ایک اڑچن کھڑی ہوجاتی ہے کیوں کہ ان پر دربار سے تعاون اور باغیوں کی طرف سے ڈھالے جانے والے سکوں پر کندہ کروانے کے لیے شعر کہنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ غالب بے حد پریشان ہیں اور اپنے سبھی دوستوں سے خطوط میں 1837ء یعنی بہادر شاہ ظفر کے سالِ تختِ نشینی کے "اردو اخبار" کے شمارے تلاش کرنے کے لیے منتیں کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا قیاس یہ ہے کہ یہ معاملہ دراصل ان سکوں کا ہے جو ذوق نے اس موقع پر لکھ کر بادشاہ کے حضور میں گزرانے تھے۔ یوسف مرزا کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں: "ورنہ خیر، کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حکّامِ صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکّہ نہیں کہا، اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں، اور گناہ بھی ہے تو ایسا کیا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اوز بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہوجائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں؟"

جولائی کے خطوط غلط فہمی کے دور ہونے اور حضرت علیؓ کی جانب سے مشکل کُشائی کی اُمید سے بھرے ہوئے ہیں۔ غالب کا خیال ہے کہ پنشن کا معاملہ کلکتے میں خود گورنر جنرل کے ہاں زیرِ تصفیہ ہے۔ اکتوبر 1859ء میں وہ مجروح کو لکھتے ہیں: "رہا میرا پنشن، اس کا ذکر نہ کرو، اگر ملے گا تو تم کو اطلاع دی جائے گی۔"

نومبر 1859ء۔ پنشن کے بارے میں پہلے کی طرح کسی کو کوئی خبر نہیں ہے (خط بہ نام مجروح)۔

دسمبر میں گورنر جنرل کے ورودِ دہلی کے موقع پر دربار منعقد کیا جاتا ہے، جس میں پہلے غالبؔ کے لیے ایک معزز جگہ مقرر تھی اور جس کے دوران عموماً ان کو خلعت فاخرہ سے نوازا جاتا تھا۔ لیکن اس بار اس جلسے میں شرکت کے لیے ان کو مدعو نہیں کیا جاتا۔ نومبر میں غالب رام پور جانے کا تہیّہ کرتے ہیں، گو کہ اس شرط پر کہ یہ کام وہ پنشن کے معاملے کا قطعی فیصلہ ہونے پر ہی انجام دیں گے۔

29/ دسمبر 1859ء۔ حسین مرزا کے نام خط میں اطلاع دیتے ہیں کہ دو بار گورنر جنرل کے ہاں گئے اور دوسری بار سکریٹری کے ہاں رسائی ہوئی۔ اس نے ازراہ تضحیک ان سے دریافت کیا: "غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے۔ اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟" مرزا کی نظر میں عالم تیرہ و تار ہوگیا۔ ان الفاظ کا بس ایک ہی مطلب تھا: تمام اُمیدوں کا خاتمہ۔ وہ لکھتے ہیں: "یہ جواب پیامِ نومیدیِ جاوید ہے، نہ دربار، نہ خلعت، نہ پنشن۔ اِنّا للّٰہ واِنّا الیہ راجعون۔"

فبروری 1860ء میں پنشن کی ادائگی کے ان کے تمام مطالبوں کی، باغیوں سے تعاون کی بنا پر نامنظوری کی اطلاع کے ساتھ، سرکاری جواب موصول ہوا۔ گورنر جنرل کے میر منشیوں اور سکریٹریوں سے ان کی معاملت میں ایک اور، مایوس کر دینے والی تفصیل بھی تھی۔ کسی وقت، 1856ء میں غالبؔ نے دہلی کے ریزیڈنٹ کیننگ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا لیکن وہ واپس کر دیا گیا اور اب غالب سے کہا گیا کہ وہ آئندہ ملکۂ معظمہ کے ملازمین کو اس طرح کی تحریروں سے تنگ نہ کیا کریں۔ (خط بہ نام بے خبر، مارچ 1863ء)۔

نواب یوسف علی خاں کی فرمائش پر غالب کا سفرِ رام پور بالآخر وقوع پذیر ہوا۔ بہت دنوں سے وہ اس کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ طرفین کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبّت کے جذبات کے پیشِ نظر یہ سفر ناگزیر بھی ہوگیا تھا اور

بالآخر اہم بات یہ کہ اس سفر کی بہ دولت غالبؔ کو نواب کی طرف سے قابلِ لحاظ مالی امداد بھی مل رہی تھی۔ سو روپے ماہ وار کے علاوہ وہ اس غرض سے "سفر خرچ" کے ڈیڑھ سو روپے زائد بھی دے رہے تھے۔ اس کے باوجود رام پور میں مرزا کے قیام کا پیش نامہ مختصر ہی رہا۔ نواب نے رام پور میں اور کچھ دن ٹھہرنے کے لیے بہت کہا، لیکن غالبؔ جن کا یہاں کم از کم چھ ماہ قیام کا ارادہ تھا، ڈھائی مہینے ہی میں وہاں سے واپسی کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔

انھی دنوں تحریر شدہ، مجروحؔ کے نام اپنے خط کا آغاز وہ اپنی اس بہ عجلت روانگی کی خاصی غیر متوقع توضیح سے کرتے ہیں۔ وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ماہِ رمضان کی آمد آمد ہے، جس کے دوران وہ، بہ قول خود، جامع مسجد میں قرآن خوانی کا بھی ناغہ نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ ان کے خط سے پتہ چلتا ہے، ہر رات مسجد میں نمازِ تراویح میں شرکت بھی ان کے معمول میں داخل ہے، چناں چہ واپسی کے لیے ان کے پاس معقول وجہوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ آگے غالب لکھتے ہیں:

اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔۔ یہاں یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ رام پور میں قیام سے انکار غالبؔ کی جیب کے لیے یوں کہنا چاہیے کہ تباہ کن تھا۔

لیکن اب کچھ ایسے حالات وقوع پذیر ہوئے جو بالکل غیر متوقع تھے۔ واپسی کا راستہ مراد آباد ہو کر جاتا تھا۔ جہاں دس سال قبل کی طرح اب بھی صدر الصدور کے عہدے پر سیّد احمد خاں فائز تھے۔ غالبؔ، یہ سمجھتے ہوئے کہ سیّد احمد خاں کے دل میں ان کے تعلق سے اب بھی رنجش باقی ہوگی، یہ تصوّر بھی نہیں کرتے تھے کہ وہ سیّد احمد خاں کے ہاں بہ حیثیت مہمان ٹھہریں گے۔ ان کے تعلقات ابھی بحال نہیں ہوئے تھے۔ تاہم یہ معلوم ہونے پر کہ غالب کو چند دن مراد آباد میں گزارنے ہوں گے، سیّد احمد خاں نے عالی ظرفی سے کام لیتے ہوئے غالبؔ کا شہر کے باب الداخلہ پر ہی استقبال کیا اور اپنا مہمان بنا کر خود انھیں اور ان کے ہم راہیوں کو سامان سمیت اپنے گھر لے آئے۔ غالبؔ رضامند تو ہو گئے لیکن چوں کہ انھیں ابھی تک پورا یقین نہیں تھا کہ ان کے استقبال کا محرک محض خلوص ہے تو انھوں نے سوچا کہ اپنے میزبان کو ذرا آزما کر بھی دیکھنا چاہیے۔ گھر پہنچ کر انھوں نے اس طرح سے کہ سب دیکھ لیں، شراب کی بوتل نکالی اور اسے ایک نمایاں جگہ پر رکھ دیا۔ لیکن بوتل جلد ہی غائب ہو گئی۔ یہ پوچھنے پر کہ وہ کہاں گئی، بجائے جواب دینے کے، سیّد احمد خاں غالبؔ کو ایک اسباب کی کوٹھری میں لے گئے جہاں بوتل رکھی تھی اور وضاحت کی کہ وہ بوتل کو ایسی جگہ جو سب کی نگاہ میں ہو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے تاکہ لوگ فضول یاوہ گوئی نہ کریں۔ غالبؔ نے بوتل اٹھائی تو دیکھ کر کہا کہ اس میں خیانت ہوئی ہے، سچ بتاؤ کس نے پی ہے۔ حافظ نے سچ کہا ہے:

> واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　　چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

اپنے میزبان کی معنی خیز خاموشی سے وہ سمجھ گئے کہ وہ ریاکاری سے اتنے ہی دور ہیں جتنے کہ وہ خود اور اس صورت حال نے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بچی کھچی سرد مہری کو بھی دور کر دیا۔ یہ واقعہ حالیؔ کی لکھی ہوئی سیّد احمد خاں کی سوانحِ حیات میں بیان کیا گیا۔ غالب نے اپنی پنشن کی ساری عجیب و غریب کہانی سیّد احمد خاں کو سنائی اور اس کی بحالی کی درخواست کی برطانوی حکام کی طرف سے نامنظوری کے بارے میں بتایا۔ یہ گفتگو اپریل میں ہوئی اور مئی میں غالب اپنے عزیز دوست اور شاگرد تفتہ کو خط لکھتے ہیں، جو اسے پڑھ کر اتنے ہی خوش اور متعجب ہوئے ہوں گے جتنے کہ خود غالبؔ۔ اپنے اس ہندو دوست کو غالب "مرزا تفتہ" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے، حالاں کہ ان کا نسلاً مغل اشرافیہ سے، جس کے نمائندے "مرزا" کے لقب سے مخاطب کیے جانے کا استحقاق رکھتے تھے، کوئی تعلق بالکل نہیں تھا۔ تفتہ نسبتاً نیچے درجے کی کائستھوں کی ذات

سے تعلق رکھتے تھے، جس کے افراد بیش تر مرزا تھے اور ایک زمانے سے دفتری فرائض کی بجاآوری اور نتیجتاً ایک مخصوص دور تک فارسی زبان سے بھی وابستہ تھے۔ ایک ہندو سے ایسا طرزِ تخاطب غالبؔ کی خوش دلی کی نہایت عمدگی سے آئینہ داری کرتا ہے۔ وہ "مرزا تفتہ" کو لکھتے ہیں: "ایک امر عجیب تم کو لکھتا ہوں اور وہ امر بعد تعجب مفرط کے موجب نشاطِ مفرط ہو گا۔ میں اجرائے پنشن سرکار انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے وہ نقشہ پنشن داروں کا جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے صاف لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے، گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میرے پنشن کے اجراء کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا، میں نے بھی سنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہ آئندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہو گا۔"

اور واقعی پنشن کی ادائگی کے بند ہونے سے اب تک جتنی بقایا رقم ان کے حساب میں نکلتی تھی انھیں مل گئی۔ انھوں نے ساری رقم آخری پائی تک اپنے قرض دہندوں میں تقسیم کر دی اور پھر بھی مقروض رہے۔ نئے قاعدے کے مطابق پنشن کی ادائگی ہر چھ ماہ پر ہوتی قرار پائی تھی اور اس کی وجہ سے مرزا پھر قرض کے جال میں پھنس گئے اور پھر معاملات پرانے ڈھرے پر لگ گئے۔

غالبؔ یہ رقم کیسے حاصل کر پائے، اس بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں اور اندازے لگائے گئے ہیں۔ خود غالب کا بڑی حد تک خیال یہ تھا کہ ان کی کامیابی نواب رام پور کی اعانت کی مرہون منت ہے۔ لیکن محققین کی اکثریت کو کہیں زیادہ قرین قیاس یہ بات لگتی ہے کہ اس میں سیّد احمد خاں کا ہاتھ ضرور رہا ہو گا اور محض اس عہدے نے جس پر وہ فائز تھے انھیں اس الجھے ہوئے معاملے کی یک سوئی کے لیے اپنی کوشش کے اظہار سے باز رکھا۔ بہرحال سیّد احمد خاں اب شاعر کے بااثر دوستوں میں وہ واحد شخص تھے، جس کو اس کی اہمیت کا اندازہ تھا اور غالباً انگریزوں کے ہاں اثر و رسوخ رکھنے والے اور ان کے اعتماد کے اہل آدمی ہونے کی وجہ سے وہی اس معاملے کی پیش رفت پر مثبت طور سے اثرانداز ہو سکتے تھے۔

لیکن غالبؔ کی صحت، جو فکر مندی اور تنگ دستی کی وجہ سے پہلے ہی سے خراب ہو چکی تھی، اب بد سے بدتر ہو جاتی ہے جولائی 1860ء میں شفقؔ کے نام اپنے ایک خط میں وہ دہلی کو یکے بعد دیگرے غارت کرنے والے پانچ لشکروں* کا ذکر کرتے ہیں: پہلے تو باغیوں کا لشکر تھا، پھر انگریزوں کا، اس کے بعد قحط، ہیضے کی وبا اور کسی غیر معمولی شدید بخار کی لہر، جس نے غالبؔ کے سب گھر والوں اور خود ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جہاں تک ہیضے کا تعلق ہے، تو اس وبا نے مرزا کو ان کے نکالے ہوئے خود اپنی وفات کے مادۂ تاریخ میں مضمر پیشین گوئی کے پورے نہ ہونے کی توجیہہ کا موقع فراہم کیا، کیوں کہ انھوں نے بہت سنجیدگی سے یہ ادّعا کیا تھا کہ وہ تاریخ جس کی اس میں نشان دہی کی گئی ہے جمع تفریق کا نہیں، سچّے الہام کا نتیجہ ہے۔ اس لیے جب یہ سال، یعنی 1860ء، گزر گیا تو اسے انھوں نے یہ کہہ کر ہنسی میں ٹالا کہ اس وقت مرنے میں، جب کہ وبائے عام میں سبھی مر رہے تھے، میری کسرِ شان تھی اور اگر پیشین گوئی پوری ہو جاتی تو لوگ سوچ سکتے تھے کہ میں اور سب

---

* پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا، دوسرا خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے، تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزاروں آدمی بھوکے مرے، چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے، پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ سے مبتلا ہیں۔ ایک بڑا لڑکا (باقر علی خاں) ایک داروغہ (کلّو)۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

لوگوں جیسا ہی ہوں، ان سے ذرا بھی بہتر نہیں ہوں۔ تہر کے نام اسی زمانے میں لکھے ہوئے اپنے خط میں وہ اپنی جوانی کے دنوں کو یاد کرتے ہیں، جب وہ اور تہر دونوں ایک ہی طوائف کی نگہ التفات کے آرزو مند تھے۔ تب غالبؔ کو نہ تو اپنے دوست کی خوب صورتی پر رشک آتا تھا اور نہ ان کی کام یابی پر۔ لیکن ان کو رشک اس بات پر ہے کہ تہر داڑھی منڈوا سکتے ہیں، جب کہ خود مرزا کو اب داڑھی رکھنی پڑ رہی ہے۔ اوّل تو یہ کہ داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے اور "تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے"، دوسرے یہ کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ غالب کی کیفیتِ مزاج واقعی بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے اور ان کی زندگی کے آخری سالوں کے خطوط ان کی علالتوں، بڑھتے ہوئے ثقل سماعت، جو آخر آخر میں پورے بہرے پن میں متبدل ہو گیا تھا، بینائی کی کمی اور ہاتھوں میں رعشے کی تفصیلات سے بھرے ہوئے ہیں۔ مزید برآں بہ ظاہر غالب کو فساد خون کا بھی کوئی عارضہ تھا جس کے نتیجے میں بدن پر ہتھیلی کے برابر مشکل سے ٹھیک ہونے والے پھوڑے نکل آتے تھے۔ ایک بار تو ایسے پھوڑے ان کے بدن پر تیرہ جگہوں پر نکل آئے تھے۔ ان کو حافظے کی کم زوری کی بھی شکایت ہو گئی تھی۔ پہلے حافظہ ان کو کبھی دھوکا نہیں دیتا تھا، اب انھیں اکثر خطوط میں اپنے شاگردوں کے سامنے بہ غرض اصلاح ان کے بھیجے ہوئے اشعار کے تعلق سے صفائی دینی پڑتی ہے۔ کبھی وہ اشعار بعد اصلاح کسی دوسرے ہی شخص کے پاس بھیج دیتے ہیں اور کبھی اوراق کہیں، ایسی جگہ ڈال دیتے ہیں کہ بہت دیر تک انھیں ڈھونڈھ ہی نہیں پاتے۔ کبھی وہ اشعار بھول جاتے ہیں۔ جب ان کے کم عمر دوست اور رشتہ دار ضیاء الدین احمد خاں کے بیٹے علاء الدین احمد متخلص بہ علائی، نے، جن سے غالبؔ کی اکثر خط کتابت رہا کرتی تھی، کسی قصیدے کا ایک شعر اور ایک رباعی بھیجنے کی فرمائش کی، جو علائی کے خیال میں انھیں اچھی طرح سے یاد ہونی چاہیے، تو مرزا پکارا ٹھتے ہیں: "مکرّر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا۔ مکرّر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کہ کون سی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے، اب کے تو مقرّر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، اوستا کی قسم، گرو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔"

1861ء میں "دیوانِ اردو" کی دوبارہ اشاعت کے سلسلے میں کام پھر شروع ہوا۔ 1860ء میں اپنے سفر رام پور کے موقع پر نواب صاحب کے کتب خانے میں غالبؔ کو اپنے "دیوانِ اردو" کا وہ نسخہ ملا، جو انھوں نے کبھی نواب کے پاس تحفۃً بھیجا تھا۔ انھوں نے فرمائش کر کے اس کی نقل حاصل کی اور اس نے خود ان کی نگرانی میں شائع ہونے والے اس آخری ایڈیشن کے لیے بنیاد کا کام دیا جو 1862ء میں کان پور سے شائع ہوا۔

وہ مستقل شکوہ شکایتیں، جن سے غالب کے اس زمانے کے خطوط بھرے پڑے ہیں، اپنی جگہ، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی شہرت بڑھتی جاتی ہے۔ ان کو ہندوستان کے کونے کونے سے اور کبھی کبھی تو انگلستان سے بھی خط وصول ہوتے ہیں، اور پتہ چاہے جیسے بھی لکھا گیا ہو، سبھی خطوط ان تک پہنچ جاتے ہیں۔

غالب کے پتے کا سوال ان کی جاے سکونت بدلنے کی کوششوں کی وجہ سے پیدا ہوا: جس گھر میں وہ رہ رہے تھے اور جس کی ایک زمانے سے مرمت نہیں ہوئی تھی، موسلادھار بارش میں بالکل ڈھ گیا تھا۔ اپنے ایک خط میں وہ اپنے گھر کی تصویر کھینچتے ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا، دیواریں گر گئیں۔ اگر بارش دو گھنٹے ہوتی ہے تو چھت اور کئی گھنٹے ٹپکتی ہے، سارے گھر میں جگہ جگہ برتن رکھ دیے گئے ہیں، تاکہ چھت سے ٹپکنے والا پانی ان میں جمع ہو اور فرش پانی سے نہ بھیگے۔

نہ صرف یہ کہ فراغت کی زندگی کا بھرم قائم رکھنا بلکہ کسی طرح لشتم پشتم گزر بسر کرنا بھی دشوار سے دشوار تر ہوتا جاتا ہے، گھر میں ہمیشہ مفلوک الحال رشتہ دار اس اُمید میں موجود رہتے ہیں کہ یہاں انھیں فاقے سے مرنے تو نہیں دیا

جانے گا اور اپنے ایک خط میں غالب کھانے والوں کی تعداد، جن کی ذمہ داری ان کے سر ہے، ہمیں بتاتے ہیں۔ علائی کے نام اپنے خط مورخہ 19/ جولائی 1862ء میں وہ لکھتے ہیں: "التوائے شرب شراب: 22/ جون، شروع شراب: 10/ جولائی۔ اور اگلے خط مورخہ 27/ جولائی میں وہ اس وقفے کی وجہ کی صراحت کرتے ہیں: "بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو جا مارا، اِدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسّک مہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو۔ نہ مُول، نہ سود۔۔۔۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مُول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکی دار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا، گزارا مشکل ہو گیا! روزمرّہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بہ جانِ درویش۔ صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینہ بچا، روزمرّہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا: "تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟" کہا گیا کہ "جب تک وہ نہ پلائیں گے۔" پوچھا: "نہ پیو گے، تو کس طرح جیو گے؟" جواب دیا کہ "جس طرح وہ جلائیں گے۔" بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرض متفرق ادا ہو گیا، متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی، گوشت پورا آنے لگا!

چوں کہ بھائی نے (یعنی ضیاء الدین خاں نے۔ مصنفہ کتاب) وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی، ان کو یہ عبارت پڑھا دینا

قرض خواہوں اور ساہو کاروں کی دنیا سے سال ہا سال کے تعلق کی وجہ سے مرزا کے پاس ان سے نبٹنے کا کافی تجربہ تھا۔ یہ امید رکھنا کہ ادائگی قرض کے علاوہ ان کے پنجے سے چھوٹ نکلنے کا کوئی بے خطر طریقہ بھی ہے، ظاہر ہے کہ مشکل تھا، لیکن تاریخ ادائگی کے التوا کی کوشش تو کی ہی جا سکتی تھی! ایک بار ساہو کار نے مرزا سے فرمائش کی کہ وہ اپنے دوست حسین مرزا سے قرض کی وصولی میں اس کی مدد کریں۔ حسین مرزا دہلی میں نہیں تھے، برے حال میں تھے اور کسی نہ کسی دن دہلی واپس ہونے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ غالب نے سوچا کہ یہاں قرض خواہ کو دانش مندی سے کام لینے کا فائدہ سمجھانا مناسب ہو گا۔ غالب نے کہا: "لالہ، جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے تو اس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمھارے کھیت ہیں۔ پانی دو تو اناج پیدا ہو۔" ایسا لگتا ہے کہ یہ خیال ساہو کار کے لیے بالکل خلاف توقع تھا، لیکن وہ قرض دار کے ساتھ کیسے پیش آیا اس کا ہمیں علم نہیں۔

تاہم خود غالب آخر وقت تک قرضوں سے سبک دوش نہ ہو سکے، جو جیسا کہ سب جانتے ہیں ایک مسلمان کے لیے بڑی رسوائی کی بات اور سنگین گناہ ہے۔

نواب رام پور یوسف علی خاں کا 1865ء میں انتقال ہوا۔ ادھر کئی سال سے ان کی فیاضی سے شاعر کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ نواب اکثر سو روپے ماہانہ کی مقررہ رقم پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ مختلف بہانوں سے مالی امداد میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ ان کے جانشین کلبِ علی خاں نے بھی تلمّذ گوئی میں غالب کی شاگردی کی خواہش ظاہر کی۔ اس سلسلے میں نئے نواب کی مسند نشینی کی تقریب کے موقع پر غالب کو رام پور مدعو کیا گیا۔ سن رسیدہ شاعر کے لیے سفر بے حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس کے قبل دنوں اور مہینوں، مستقل ضعف اور طرح طرح کی بیماریوں کی وجہ سے وہ بستر سے نہیں اٹھتے تھے۔ پہلے بھی غالب پالکی میں سفر کی بے آرامی کی شکایت کیا کرتے تھے، حالاں کہ اس زمانے میں اس سے زیادہ آرام دہ ذریعۂ آمد و رفت کا وجود نہیں تھا۔ ایک انگریز سیاح کے الفاظ میں پالکی کے سفر میں مسافر کو یا تو دم گھٹ کر مرنے کا خطرہ لگا رہتا

تا، کیوں کہ دوڑتے ہوئے کہاروں کے پاؤں کے نیچے سے گرد کے زبردست مرغولے اٹھتے رہتے تھے اور اگر مسافر پالکی کے پردے گرا دے تو تازہ ہوا کے نہ پہنچنے سے جاں بہ حق ہو جانے کا ڈر لگا رہتا تھا!

اس کے باوجود وہ اپنے نوجوان پوتوں کی معیّت میں سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ رام پور کے قیام میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی گو کہ غالب کچھ فکر مند ضرور تھے کہ نئے نواب زادِ راہ کی ادائگی کو ٹالے ہوئے ہیں۔ غالب نے نواب کے استاد کی ذمہ داری سنبھال لی اور نواب کی نظم و نثر کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ نواب کی فارسی بندشوں پر گرفت مضبوط نہیں تھی۔ لیکن جب دلی محاکمے کا سوال ہوتا تو معمول کے مطابق سن رسیدہ شاعر کو اس کی پروانہ ہوتی کہ رئیس شاگردوں کی لغزشوں سے کبھی کبھی چشم پوشی کرنے میں کوئی خاص ہرج نہیں۔

مسند نشینی کے موقع پر شان دار جشن اور آتش بازی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دیدہ زیبی سے آراستہ پیراستہ ہاتھیوں پر سوار نواب اور ان کے مقربین پھینک پھینک کر لوگوں کے ہجوم میں روپے پیسے لٹا رہے تھے۔

لیکن اب واپسی کے سفر کی تیاری بھی ضروری تھی۔ غالب پہلے پوتوں کو روانہ کرتے ہیں اور پھر خود سفر پر نکلتے ہیں۔

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد	اگر نہ دل میں کھٹک لائیں یہ نظارے تمام
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گزرد	زہے روانی عمر اپنی جو سفر میں کٹے

(ترجمہ: مضطر مجاز)

واپسی کا سفر اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ برسات کا موسم شروع ہو گیا تھا، مراد آباد کے سامنے گزر گاہ پانی سے کٹ کر بہہ گئی تھی۔ غالب کسی طرح سے دوسرے کنارے پہنچے، لیکن ان کے گرم کپڑے وغیرہ کہاروں کے ساتھ سامنے کے کنارے پر ہی رہ گئے۔ ٹھنڈے اور سیلے ہوئے کمرے میں گزاری ہوئی ایک رات تھکے ماندے اور دائم المرض شاعر کو بالکل فریش بنا دینے کے لیے کافی تھی۔ غالب مراد آباد میں رک گئے، جہاں دوران علالت انھیں پھر ایک بار اپنے پرانے دوست شیفتہ سے ملاقات کا موقع ملا۔ وہ رام پور جا رہے تھے اور یہ معلوم کر کے کہ مراد آباد میں غالب بیمار پڑے ہوئے ہیں وہ شاعر کی عیادت کو آئے۔

غالب لشتم پشتم کسی طرح دلی پہنچے۔ لیکن سفر میں جھیلی ہوئی تکالیف نے پھر نئی قوت کے ساتھ اپنا اثر دکھایا۔ شاعر کی قسمت میں ایک اور مایوسی کا سامنا کرنا لکھا تھا۔ وقت رخصت نواب کلب علی خاں نے بہت باضابطہ یہ عندیہ دیا تھا کہ وہ غالب کے تعلق سے اپنے باپ کے تمام قول و قرار نباہتے رہیں گے۔ مگر افسوس کہ جب اس پر عمل کا وقت آیا تو معاملہ دوسرا ہی نکلا۔ باپ کے مقابلے میں ان کے یہ فرزند کہیں کم مہربان اور اہم بات یہ کہ کہیں کم سخی نکلے۔ ان کے پاس سے روپے بھی تاخیر سے آتے تھے اور وہ شاعر کے پاس سے موصول ہونے والے قصائد اور دیگر تصانیف کا صلہ دینا بھی بھول جاتے تھے (قاعدے کے مطابق یہ صلہ اس مشاہرے کے علاوہ ان کو ملنا چاہیے تھا جس کے وہ بہ حیثیت استاد مستحق تھے)۔ غالب کی کسی ایک معاملے سے متعلق بہیتری درخواستوں کو بھی وہ بغیر جواب کے ٹال جاتے تھے۔ غالب کے بڑے پوتے کی شادی ہو گئی اور راجہ الور کے دربار سے منسلک ہو کر اب انھوں نے وہیں کی رہائش اختیار کر لی۔ اس ریاست کے ذکر سے ہی اس قسمت کے بارے میں ہماری کہانی شروع ہوئی تھی، جس نے ہمارے شاعر کے خاندان کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ الور کے آسمان میں ستاروں کا محل وقوع پوتے کے لیے خیر و برکت کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔ تاہم چھوٹے پوتے کی خبر گیری اب بھی غالب کے سر تھی۔ اس کی شادی کرنی تھی اور تب ہی غالب خود کو سرپرستی اور پالنے پوسنے کے اپنے فرض سے فارغ سمجھ سکتے تھے۔ لیکن دولہے والوں کے ذمے جو اخراجات ہوتے ہیں، غالب کی آمدنی ان کی

متحمل نہیں تھی۔ نواب نے خود مرزا کے چھوٹے پوتے کی شادی کے معاملے میں دل چسپی کا اظہار کیا اور ان سے اس کام کے لیے مطلوبہ رقم کے بارے میں دریافت کیا۔ غالب نے جواب دیا کہ کسی معینہ رقم کی نشان دہی تو ان کے لیے مشکل ہے۔ لیکن ان کے رتبے کے لوگوں کے لیے یہ اخراجات عام طور سے دو ہزار روپے ہوتے ہیں۔ نواب نے چپ سادھ لی اور غالب کی روپوں کے بارے میں انھیں یاد دہانی کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وقت گزرتا رہا اور شادی کا وقت قریب آرہا تھا۔ تب غالب نے یاد دہانی کے پے در پے دو خط کھیجے اور لکھا کہ کم کز کم آٹھ سو روپے در کار ہوں گے۔ اس خط کے لفافے پر نواب کے پیش کار کے ہاتھ کی یہ تحریر ملتی ہے: "کوئی حکم صادر نہیں ہوا۔ اور یہ رقم منظور نہیں ہوئی۔ غالب کی زندگی میں چھوٹے پوتے کی شادی بہر حال نہیں ہو پائی۔

حسب معمول شاگردوں کی طرف سے غالب پر بہ غرض اصلاح اشعار کی بھر مار رہتی ہے اور وہ انھیں لکھتے ہیں کہ کام کے اس مستقل طومار سے عہدہ برا ہونے کی ان میں طاقت نہیں ہے۔ ان کے نہایت زود گو شاعروں میں سے ایک، یعنی تفتہ شاعر پر اپنے اشعار پر اصلاح کی فرمائشوں کی بھر مار کیے رہتے ہیں۔ غالب بہ خوبی سمجھتے ہیں کہ اگر شاگردی کے اتنے لمبے عرصے کے بعد بھی ان کے چیلے کی پیش رفت قابل ذکر نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مساعی لاحاصل ہیں۔ اس لیے غالب نے ایک "فوجی حکمت عملی" کا منصوبہ باندھا۔ انھوں نے شاگرد کو مطلع کیا کہ ان کے اشعار اب اصلاح سے بے نیاز ہیں۔ تفتہ نے اس بات کو غالب کی سنجیدہ رائے پر محمول کیا اور طے کیا کہ اب وہ اپنے اشعار مرزا کے پاس بس یوں ہی بھیجا کریں گے، جیسے ایک شاعر دوسرے شاعر کے پاس بھیجتا ہے۔ مگر غالب نے جو کھیل شروع کیا تھا اس کو جاری رکھ نہیں پائے اور جب شاگرد کے ہاں الفاظ کا غلط استعمال ان کی نظر سے گزرا تو اگلے خط میں ان کو فوراً پھٹکار سنائی۔ تاہم جب غالب کے دائرۂ نظر میں ایک لائق نوجوان شاعر ذکا نمودار ہوا تو وہ بہ خوشی اس کی شاعرانہ صلاحیت کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینے کا بیڑہ اٹھالیتے ہیں۔ (غالب ذکا کے تعلق سے گہرا تعلقِ خاطر محسوس کرتے ہیں گو کہ یہ خطوط تک ہی محدود تھا، ان کی کبھی بھی ملاقات نہیں ہوئی)۔ ذکا جنوبی ہندوستان کے باشندے تھے اور ایک غریب مسلمان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ غالب کے وہ بچپن ہی سے پرستار تھے اور شاعر سے ملاقات کو انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا۔ اس غرض سے انھوں نے طے کیا کہ پہلے حیدرآباد منتقل ہو جائیں۔ وہ اپنے قصبے سے کافی طویل سفر پا پیادہ طے کر کے وہاں پہنچے۔ تاہم آگے شمال کی طرف جانے کے لیے ان کے پاس نہ وسائل تھے اور نہ موقع، اس لیے انھوں نے غالب سے بہ ذریعۂ تحریر ربط قائم کیا اور ان دونوں کے درمیان زور شور کی خط کتابت شروع ہو گئی، جس سے اس بات کی کہ غالب اب بھی کیسے قابل قدر معلم و ماہر اسلوبیات تھے اور ترتیب و تہذیب متن پر کیسی لاجواب قدرت رکھتے تھے، ایک بار پھر توثیق ہوتی ہے۔

اس زمانے میں غالب ہر لحاظ سے اپنی وضع پر قائم رہے۔ پہلے کی طرح اب بھی ان کو اپنی آزاد خیالی پر فخر تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ مذہب اسلام کی مختلف باریکیوں اور اس کے اصول و احکام کی تشریح کے دوران دینیات اور تقلیدی علوم کے مسائل سے اپنی، واقفیت کی نمائش کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اب وہ اکثر حضرت علیؑ کا ذکر کرتے ہیں اور اس طرح سے گویا کہ شیعیت سے اپنی وابستگی پر زور دیتے ہیں، لیکن ان اذکار کا تعلق ہمیشہ یا تو فال نیک کی تلاش سے ہوتا ہے اور یا پھر اس مقدس اور برگزیدہ شخصیت کی جانب سے مشکل کشائی سے، بہ الفاظ دیگر اس میں مذہب سے زیادہ توہم پرستی کا دخل تھا۔

اس کے باوجود غالب کے بہت سے ہم عصر، جن میں فضل حق مرحوم یا آزردہ وغیرہ جیسے مذہبی حلقوں میں نہایت اونچا مقام رکھنے والے ان کے احباب بھی شامل تھے، ان مسائل میں ان کے اونچے درجۂ استعداد کے ہمیشہ معترف

ہے۔ حضرت جی گوالیاری (سید علی غمگینؔ، دہلوی)۔ غالبؔ کو لکھتے ہیں: "آپ کو علم تصوّف میں جو دست گاہ ہے جس کا اظہار آپ کے خطوں سے ہوا، وہ علماءِ ظاہر کو بھی نہیں ہے۔" غالبؔ کی تشریحات کی خصوصیت، تصوّف کے بعض نظریوں کی خاصی آزادانہ ضیح ہے، اس بنا پر متعدّد محققین کا خیال ہے کہ یہ ہندومت اور خصوصاً ویدانت کے اثر کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس خیال کو رد کرنا بھی مناسب نہ ہو گا کہ یہ ان کی قوّتِ متخیّلہ اور مجازی تصوّرِ کائنات کا بھی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس کائنات میں جگہ صرف شاعرانہ ال متناقض اور تضادات کے لیے ہے، لیکن اس کائنات میں زندگی کے تضاد، وحدتِ کائنات اور اس کے تمام عناصر کے بط باہمی کے عظیم تصوّر سے اور عالمِ امکان کے ہر ذرّے کے وجود میں مضمر گہرے معنی کو تسلیم کرنے سے دور ہو جاتے ں، یعنی ان تمام باتوں سے جن کے لیے اردو فارسی شاعری تصوّف کی مرہونِ منّت ہے۔ غالبؔ کی تشریح میں "وحدت الوجود" نظریہ اپنی منطقی حد تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اس کے لیے اس ویدانت کی حدود بھی تنگ ہیں جو اس کائنات کو فریبِ نظر یا مایا تو رار دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کو عدمِ محض نہیں مانتی۔ غالبؔ یہ ثابت کرتے ہیں کہ تصوّف کی منطق کی رو سے عالم ظاہر کے کلیتہً غیر حقیقی ہونے کے بارے میں بہ آسانی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔

متذکرۂ صدر حضرت غمگینؔ گوالیاری کے نام ایک خط میں (یہ خط میکشؔ اکبر آبادی کے خاندانی ذخیرۂ کتب میں موجود ہے اور اس کا حوالہ انھوں نے مجموعے "غالبؔ، مشرق کا عظیم شاعر" میں شامل اپنے مضمون میں دیا ہے) غالبؔ لکھتے ہیں فرد کی زندگی کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ اولاً باپ کا نطفہ رحمِ مادر میں پہنچتا ہے اور پھر نو ماہ کی مدت کے بعد بچّہ دنیا یں آتا ہے۔ ایک معیّنہ مُدّت تک شیرِ مادر سے اس کی پرورش ہوتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ بولنا شروع کرتا ہے ر ہر طرح کے الفاظ بولتا ہے۔ اس کا نام زید رکھا گیا۔ اور جب بڑا ہوا تو تحصیلِ علم کی طرف راغب ہوا، علوم میں دست رس اصل کی اور لوگوں کو سیدھا راستہ بتلایا۔ اس طرح سے وہ ستّر سال جیا، بیماری نے اسے آگھیرا اور پھر اس نے اس دنیا سے حلت کی۔ اسے سپردِ خاک کیا گیا اور اس کے مدفن پر ایک اونچا گنبد تعمیر کیا گیا۔ اور اب یہ مقام زیارت گاہ بن جاتا ہے اور ک جو کچھ بھی مزار کے پاس مانگتے ہیں ان کو ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اور اس جیسے سیکڑوں، جن کا تصوّر کیا جا سکتا ہے، ہم کہتے ں کہ وہ سبھی کھلا ہوا اور بے بنیاد واہمہ ہیں۔ ابتدا سے انتہا تک، حمل کے ٹھہرنے کے لمحے سے سپردِ خاک کرنے کے نت تک، یہ سب زید کی "عینِ ثابتہ" ہے، جب کہ زید وجودِ مطلق میں ثابت ہے، اور نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ کبھی معدوم ہوا، اور یدائش و وجود، گفتگو اور سماعت، زندگی اور وفات، یہ سب زید کی عینِ ثابتہ ہے، جو ہمیشہ اُس میں اقامت گزیں تھا اور رہے گا ...اور اگر موجود میں سے میں صرف وجودِ ہستی لوں تو اس صورت میں بلاشبہ "اعیان" کا مفہوم صرف امکان ہو گا اور میں سے کبھی "اعیانِ ثابتہ" کا نام نہ دوں گا، کیوں کہ اس صورت ــــ میں، وجودِ واجب یعنی خدا سے انکار ضروری ہو جانے گا۔

اس خط میں بھی، جیسے ہم نے خط کے دست یاب اصل نسخے کی مطابقت میں مطبوعہ متن سے خفیف سے فرق کے اتھ نقل کیا ہے، غالبؔ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔ ان کی منطق کا قولِ متناقض عالمِ امکان کے تمام مظاہر کی وحدت کو اننے والے تصوّرِ کائنات میں مضمر ہے۔ ان کی نگاہِ باطن کو جو مخصوص تیزی عطا ہوئی ہے اس کی مثال اس شمع کی سی ہے جو بھنے کے وقت بجھنے سے پہلے آخری بار پوری آب و تاب سے بھڑک اٹھتی ہے۔

مولوی عبدالرزاق شاکرؔ کے نام خط میں، جس میں تاریخ تحریر درج نہیں، وہ لکھتے ہیں:

یر و مرشد:

اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

خبر ہے۔ پہلا مصرع:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

یہ مبتدا ہے، شبِ غم کا جوش، یعنی اندھیرا ہی اندھیرا، ظلمتِ غلیظ، سحر ناپیدا، گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں ا؛ دلیل صبح کے وجود پر ہے، یعنی بجھی ہوئی شمع، اس راہ سے کہ شمع وچراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسبابِ تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامِ صبح موید ظلمت ہوگی، وہ گھر کتنا تاریک ہو گا!۔

غالبؔ کی زندگی کے آخری ایام سبّ وشتم کی حد تک پہنچ جانے والی تنقید کے اس ہنگامے سے انتہائی بے لطف رہے جو فارسی لغت نویسی پر پہلی بار 1862 ء میں "قاطعِ برہان" کے نام سے اور پھر 1865 ء میں بعد نظر ثانی "درفشِ کاویانی" کے عنوان سے شائع ہونے والی ان کی لسانیاتی تصنیف کو لے کر برپا کیا گیا۔ درجۂ استناد رکھنے والوں کے خلاف رائے ظاہر کرنے کی پاداش میں غالب پر فارسی زبان سے ناواقفیت اور اس کے بعد دوسرے طرح طرح کے الزامات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ گویا کسی کے نامبارک ہاتھوں نے وہ گٹھری کھول دی ہو جس میں سابقہ بہتان تراشی اور سبّ وشتم کے بھوت بند تھے۔ غالبؔ کے پاس گم نام خطوط آنے لگے، جن میں ان کو عادی شراب خور اور بد مذہب کے القاب سے نوازا جاتا تھا، عذاب دوزخ سے ڈرایا جاتا تھا اور پشت در پشت ان کے سارے خاندان کو گالیوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ بغاوت کی ناکامی، ظلم و تشدّد، بہیترے روشن دماغ لوگوں کے پھانسی پانے اور تباہ وبرباد ہوجانے کی وجہ سے دہلی کے مسلمان معاشرے پر طاری حد درجہ انحطاط کے ماحول میں اس طرح کا ردِّ عمل ایسا کچھ خلافِ توقع بھی نہیں تھا۔ ظلمت پسندی کا نہ ختم ہونے والا گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ان حالات میں متعصب عوام الناس کے دل ودماغ پر حکم رانی کرنے والے مذہبی پیشواؤں کے لیے اسلام کا استحصال اور بیرونی اور اندرونی دشمنوں سے "اسلام خطرے میں ہے۔" کا نعرہ بلند کرنا ظاہر ہے کہ بالکل فطری امر تھا۔ اس زمانے میں، جسمانی اعتبار سے ٹوٹنے ہوئے ہی سہی، لیکن اپنی آزاد خیالی پر قائم اور عقلِ انسانی اور آمدِ صبح پر مضبوطی اور مستقل مزاجی سے یقین رکھنے والے عظیم انسان کی شخصیت اِس انبوہ کے لیے کیسا چیلنج ثابت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ لگانا ایسا کچھ مشکل نہیں ہے۔

غالبؔ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی موت کی گھڑی قریب آرہی ہے۔

اوراقِ زمانہ درنوشتیم و گزشت
درفنِ سخن یگانہ گشتیم و گزشت
مے بود دوائے ما بہ پیری غالبؔ
زان نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت

اوراق کے لکھنے میں جوانی گزری
تدوینِ سخن میں عمر فانی گزری
پیری میں دوا ہماری مے تھی غالبؔ
سو اس میں بھی ناکام زندگانی گزری

(ترجمہ: مضطر مجاز)

انھوں نے 15/ فبروری 1869 ء کو انتقال کیا۔ بہت سے اخباروں نے اپنے قارئین کو شاعر کی موت کی اطلاع پہنچائی۔ میرٹھ کے اخبار نے یعنی اس شہر سے شائع ہونے والے اخبار نے جہاں غالبؔ کے دوست شیفتہؔ اب رہتے تھے، اطلاع دی: "نواب نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں، المتخلص بہ غالبؔ، مشہور و باکمال فارسی داں نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ غالبؔ کی علمی کامیابیوں اور شاعری میں ان کے کمال سے ان کے سبھی ہم عصر واقف ہیں۔ ایسا باکمال شخص شاذ ہی دنیا میں پیدا ہوتا ہے"۔

بہیترے شاعروں نے مرثیے لکھ کر ان کی موت پر ماتم کیا۔ الطاف حسین حالؔی نے بھی ان کی یاد میں ایک قابل قدر مرثیہ تحریر کیا۔

غالب کو اہلِ سُنّت کے طریقے کے موافق دفنایا گیا، لیکن جیسا کہ انھوں نے پیش بینی کی تھی ان کے جنازے پر "شیخ و برہمن" سُنّیوں اور شیعوں کے مابین جھگڑا پھوٹ پڑا۔ موخرالذکر چاہتے تھے کہ تجہیز و تکفین کے مراسم شیعہ مذہب کے مطابق ادا کیے جائیں۔

جنازے میں ایک جمّ غفیر شریک تھا، جس میں غالبؔ کے احباب اور رشتہ دار بھی تھے اور حالؔی کے الفاظ میں "شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ" بھی۔ حالؔی لکھتے ہیں "ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور سنی دونوں مل کر یا علاحدہ علاحدہ ان کے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں ان کا برتاؤ سُنّی اور شیعہ دونوں کے ساتھ یک ساں رہا تھا، اسی طرح مرنے کے بعد بھی دونوں فرقے ان کی حق گزاری میں شریک ہوتے۔" غالب کو جانتے ہوئے اسلام کے ان دو فرقوں کے ساتھ غالب کے یک ساں برتاؤ کے بارے میں حالی کے الفاظ کے تسلسل میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں کے ساتھ یک ساں جس مزاج کے ساتھ پیش آتے تھے۔

من آن نیم کہ زمرگم جہان بہم نخورد
فغانِ زاہد و فریاد برہمن یاد آر

نہیں میں وہ کہ میری موت سے ہلچل نہ ہو بپا
بلک کر رو اٹھے زاہد، کرے نہ یہ برہمن فریاد

(ترجمہ مضطر مجاز)

لیکن شاعر کی موت کے بیس سال بعد "یادگارِ غالبؔ" کی تصنیف کے وقت حالی کو پورا یقین نہیں تھا کہ کلام غالبؔ کی قسمت میں لمبی عمر پانا لکھا ہے۔ ان پچھلے سالوں میں ایک نیا ادب معرضِ وجود میں آگیا تھا جو ایسا لگتا تھا کہ اپنے ولولے کے اعتبار سے اور ادب مغرب سے مستعار لی ہوئی نئی اصناف ادب کے اعتبار سے ان تمام روایات سے، جو غالبؔ کی تخلیقات کا سرچشمہ تھیں، بے حد دور تھا۔ حالؔی لکھتے ہیں: "پس اگر مرزا کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا شاعر فرض کرلیا جائے تو بھی اس زمانے میں ان کی نظم و نثر کے نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنا اور ان کے مبلغِ کمال کو لوگوں سے روشناس کرانا بہ ظاہر ایک ایسا کام معلوم ہوتا ہے جس کا وقت گزر گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اس کو قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہو سکتا، خصوصاً ہندوستان کی لٹریری ترقی جس قدر مشرقی زبانوں کے قدیم لٹریچر سے وابستہ ہے ایسی یورپ کے موجودہ لٹریچر سے نہیں ہے۔"

اور کچھ زمانہ گزرا اور تبھی غالبؔ بہ حیثیت شاعر اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ قارئین کی نظروں کے سامنے آئے۔ شمع کا بجھنا ضروری تھا تاکہ نورِ خورشید یعنی ان کی شاعری سے ہماری آنکھیں روشن ہوں۔

مژدۂ صبح درین تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

تیرہ و تار ایسی راتوں میں صبح کی مجھ کو خوش خبری دی
شمع بجھائی اگر میری تو سورج کی بھی نشان دہی کی

(ترجمہ: مضطر مجاز)

★

کتابیات

ماخذ

غالب، مرزا۔ منتخبات۔ فارسی اور اردو سے روسی ترجمہ۔ ترتیب: ظ۔انصاری۔ فارسی سے ترجمہ:
نتالیا پری گارنا اور گ۔ی۔ علی ایف، اردو سے ترجمہ: ن و گلیموف۔ پیش لفظ: نتالیا پری گارنا۔ ماسکو، 1980
غالب، مرزا۔ غزلیات۔ ترتیب، اردو سے لفظ بہ لفظ ترجمہ اور حاشیے: ل۔ا۔وسیلوا،
پیش لفظ: ب۔گ غفوروف۔ ترجمہ۔ و۔پتاپووا۔ ماسکو۔ 1966ء
غالب، مرزا اسد اللہ خاں غالب، منتخب آثار فارسی، ترتیب و پیش لفظ: ا۔ غفوروف۔ دوشنبہ، 1967ء (بہ زبان تاجک)
غالب، مرزا۔ گلِ رعنا (غالب کا اردو اور فارسی کلام)۔ پیش لفظ: مالک رام، دہلی، 1970ء (بہ زبان اردو)
غالب مرزا۔ دستنبو۔ لاہور، 1969ء (بہ زبان فارسی)
غالب، مرزا۔ دیوانِ غالب، ترتیب، حاشیے اور پیش لفظ: امتیاز علی عرشی۔ علی گڑھ، 1980ء (بہ زبان اردو)
غالب، مرزا۔ کلیاتِ غالب (فارسی کلام کا مجموعہ)۔ پیش لفظ: الطاف حسین حالی، لاہور، 1965ء
غالب، مرزا۔ مہر نیم روز۔ لاہور۔ 1969ء۔ (بہ زبان فارسی)
غالب، مرزا۔ پنج آہنگ۔ لاہور۔ 1969ء۔ (بہ زبان فارسی)
غالب، مرزا۔ خطوطِ غالب۔ جلد 1، 2۔ لاہور، 1969ء (بہ زبان اردو)

تحقیقی تصانیف

بہ زبان روسی و تاجک:

اسنے ساریف، ا۔ی۔ ہندوستان کی اقوام۔ ماسکو، 1981ء
اسی پوف، ا۔م۔ 1859-1857ء کی ہندوستان کی عظیم بغاوت۔ ماسکو، 1957ء
اشرفیان، ک۔ز۔ تیرھویں صدی سے لے کر وسط اٹھارویں صدی تک عہد وسطی کا ہندوستانی شہر۔ ماسکو، 1983ء
پلادوا، ش۔ مکتوب ہائے اردوے مرزا غالب۔ دوشنبہ، 1966ء (بہ زبانِ تاجک)
سلتی کوف، ا۔و، ہندوستان کے بارے میں خطوط۔ ماسکو، 1985ء
غفارف، ا۔ حیات و ابجادیات مرزا اسد اللہ غالب، دوشنبہ، 1965ء (بہ زبانِ تاجک)۔
کراو غلی، رخ۔گ۔ آغوز رزمیہ نظم۔ ماسکو۔ 1976ء
مرزا غالب، مشرق کا عظیم شاعر، مجموعۂ مضامین، ماسکو، 1972ء
ہندوستان۔ ہندوستان کی تاریخ پر مضامین۔ ماسکو، 1959ء

بہ زبانِ اردو:

ورشید الاسلام۔ غالب۔ علی گڑھ۔ 1960ء
حالی، الطاف حسین۔ یادگارِ غالب، جلد 1، 2۔ کراچی، 1962ء
۔انصاری۔ غالب شناسی۔ بمبئی۔ 1965ء

عبدالرؤف عروج۔ بزمِ غالب۔ کراچی 1969 ء
عرش ملسیانی۔ فیضانِ غالب۔ دہلی، 1977 ء
غالب کے لطیفے۔ ترتیب: انتظام اللہ شہابی۔ دہلی۔ سنہ اشاعت نامعلوم۔
ممتاز حسین۔ غالب، ایک مطالعہ۔ کراچی، 1969 ء
اردوئے معلی۔ غالب نمبر۔ شمارہ 2، 3، حصہ 2، جلد 2۔ دہلی، 1960 ء
تنقیدِ غالب کے سو سال۔ مجموعۂ مضامین۔ لاہور، 1969 ء
سب رس، ماہ نامہ۔ غالب نمبر۔ حیدرآباد۔ 1966 ء، ستمبر، اکتوبر۔
بہ زبان اطالوی و انگریزی)

A. Bausani. La poesia di Ghalib.--Two essays by Ahmad Ali a Alessandro Bausani. Serie Orientale Roma XXXIX. Ron 1969.

Ghalib, the Poet and his Age. Ed. by Ralph Russell. N. 1972.

Kirmani Waris. Evaluation of Ghalib's Persian poetry. Aligai 1972.

Mahmud, Sayyid Fayyaz. Ghalib. A critical introduction. Laho 1969.

Russell R. and *Khurshidul Islam*. Ghalib Life and letters. 1969.

Ram Malik. Mirza Ghalib. Delhi, 1968.

Spear P. Delhi. A historical scetch by Persival Spear. O 1945.

Spear P. Twilight of the Mughuls. Studies in late Mughul Del Cambridge, 1951.

(سلسلہ ص ۳۰ سے آگے)
پروپیگنڈا لٹریچر اور خود کو پروپیگنڈا مشین کا ایک پرزہ بن جانے کے خطرے سے آگاہ نہ ہو۔

زیرِ نظر افسانہ اس تجربے کی پہلی مثال میں ہے۔ ایسا تجربہ اگر بہت نزدیک کا ہو تو مصنف کے پاس صحافت کی رپورٹنگ سے بچنے کے لیے بہت کم میدان ہوتا ہے۔ یوں بھی اچھی اخباری رپورٹ اور افسانے میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔

عالمی ادب کی طرح اردو میں بھی اہم شاعروں کے اہم اشعار کے پس منظر کو ڈھونڈنے کا تھوڑا بہت رواج ہے۔ اگر یہ رواج ترقی پائے اور فکشن کی دنیا کو بھی اپنالے تو باشعور قاری کو اس کے بہانے کچھ اور جواہر گراں مایہ ملیں گے اور تحقیق کرنے والے اور قاری کی مصنف کے شعور تک زیادہ گہری پہنچ ہوگی اور یہ کہ اس کا ذہن کتنا حساس تھا، کن واقعات اور سماجی تقاضوں کے لیے خود کو وا کر دیتا تھا۔

ہر بڑی کہانی کے پیچھے ایک اور کہانی چھپی ہوتی ہے۔ جہاں اس کا امکان ہو اسے ڈھونڈنا بھی ادب کی ذمے داری ہے اور بلاشبہہ یہ اپنی جگہ خود یہ ایک جائز ادبی کام ہے۔

○ ○ ○

حسن منظر

فسادات کے افسانوں کے پس پردہ افسانے

۱۹۴۷ء

۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو رات ۹ بجے ہم لاہور ریلوے پلیٹ فورم پر ہکابکا کھڑے تھے۔ میرے والد، میری والدہ، بڑی بہن اور میں۔ ہمیں ٹ ایڈین ریلوے نے مراد آباد سے لاہور ۴۰ من بوجھ لے جانے اور ہم چاروں کا سیکنڈ کلاس کا پاس دیا تھا۔ لیکن دونوں ہی پروانے بے گئے۔ نہ کسی نے ہمارے پاس کو راستے میں دیکھا نہ اگر ہم کوشش کرتے بھی تو کسی ٹرین میں ہمارے سامان کے لیے جگہ ہوتی۔ ہم ایک زی ٹرین کی ایسی بوگی میں گھس گھسا کر آئے تھے جس میں اب یاد نہیں آتا کہ کوئی برتھیں تھیں۔ اگر ہوں گی تو ہم سے دور تھیں۔ ہم، جس کو اں جگہ ملی، فرش پر بیٹھے تھے۔ پانی کم تھا۔ ایک خاندان جسے والد مرحوم نے ملٹری ٹرین میں جگہ دلوائی تھی کیوں کہ اس کا آفیسر کمانڈنگ یجر سلیم) ان کا علی گڑھ یونیورسٹی کا ساتی تھا، کھانے پینے میں ڈیڑھ دن ہمارا شریک رہا۔ حسن پور کی ایک گلابی سفید رنگت والی نوجوان کی، جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہلکی سی آواز کے ساتھ ناک پونچھ لیتی تھی۔ پتہ ہیں اس رو کے نہ رکنے والا بہتا ہوا زکام تھا یا یہ اپنا شہر چھوڑنے کے آنسو تھے جو اس کی آنکھوں اور ناک سے چھلک آتے تھے۔ دونوں ہی چیزیں یسے چہروں پر بھلی لگتی ہیں۔ وہ لڑکی رہیلہ تھی یعنی ایسے خاندان کی فرد جس کے آباو اجداد پٹھانوں کے علاقے سے صوبہات متحدہ میں آن کر بھی رہ بسے تھے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ نہ اسے نہ اس کے گھرانے کے کسی فرد کو اب پشتو کی شد بد تھی اور اب وہی گھرانے اس علاقے کی طرف مارہے تھے جس کے ایک علاقے میں پشتو بولی جاتی تھی۔

میں چند گھنٹے ڈرا، سہما ہوا بیٹھا رہا کیوں کہ جب ٹرین مراد آباد کے اسٹیشن پر آئی تو وہاں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ فوجی سپاہی ٹرین کے ہر روازے کے سامنے رائفلیں سنبھال کر کھڑے ہوگئے۔ وہ ٹرین میں بلا کر کے چڑھ جانے والوں کو روک رہے تھے۔ میرے والد کے ایک وست سردار رنجیت سنگھ جنھیں میں نے شاید برسوں سے نہیں دیکھا تھا نہ جانے کہاں سے وہاں آگئے۔ انھوں نے پہلے میرے والد، والدہ سے پہ کہا پھر مجھ سے بولے "ارے معوض تو بھی جارہا ہے!" میں انھیں قاعدہ بڑھنے سے بھی پہلے سے جانتا تھا اور ان کے خاندان کو بھی۔

یکبارگی اس ہلڑ میں میں نے اپنے تینوں گھر والوں کو بوگی کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا اور گھبرا کر دوڑ کر خود بھی چڑھ جانا چاہا۔ لیکن ان کے اور میرے درمیان اتنی دیر میں رکاوٹ کی دو جھنجریاں کھڑی ہو چکی تھیں: مجھ سے نزدیک وہ لوگ تھے جو کسی طور ٹرین میں سوار ہو جانا چاہتے تھے اور ان کے بعد سینگنیں لگی ہوئی رائفلیں سنبھالے فوج کے جوان تھے جو اس ہلے کو دھکوں، گھونسوں اور جو کچھ ان کے ہاتھ میں تھا اس سے روک رہے تھے۔ مجھ میں اس بھیڑ میں گھس جانے کی ہمت نہیں تھی جو پریشان کی ہوئی چیونٹیوں کی لائنوں کی طرح منتشر اور مسلسل حرکت میں تھی۔ میں خوف زدہ اور بے تاب تھا۔ والد صاحب نے اندر سے مجھے اپنی جگہ پر ٹھہرے رہنے کا اشارہ کیا۔ میں حالاں کہ اس شہر میں پل کر بڑا ہوا تھا۔ لیکن ڈر رہا تھا کہیں اس میں نہ رہ جاؤں۔ پھر پاس سے گزرتے ہوئے میجر سلیم سے انھوں نے میری طرف اشارہ کرتے

کچھ کہا۔ میرے لیے تھوڑا سا ر خنہ آدمیوں کی لہروں میں پیدا ہوا اور میں بھاگ کر ٹرین میں چڑھ گیا اور بہت دیر تک بوگی میں اپنی جگہ پر
ا بیٹھا رہا۔ پلیٹ فورم کب پیچھے رہ گیا مجھے پتہ نہیں چلا۔ اس دن اور اگلے دن راستے میں جہاں بھی ٹرین رکی فوجی اس کے دونوں طرف
ں سنبھال کر کھڑے ہوگئے۔ ایسا لمحہ آنے پر مسافروں کا بولنا بند ہوجاتا تھا اور پھر پتہ چلتا تھا آگے ریلوے لائن اکھاڑی ہوئی ہے۔ جگہ جگہ
مر تاخت و تاراج کے نشان تھے۔ انتہائی، اتنا بے لطف سفر میں نے پہلے کبھی طے نہیں کیا تھا۔ راہ کا ہر پلیٹ فورم زندگی سے خالی تھا۔
ار رنجیت سنگھ کے علاقے میں تھے اور وہاں تھے جو میرا علاقہ تھا۔

اگلی شام اندھیری میں ہمیں ایک خالی پلیٹ فورم پر چھوڑ کر ٹرین چلی گئی، شاید اس کے انجن کو پانی لینا تھا سستانا تھا۔ لوگ ادھر
لھر گئے۔ ہمارے زبردستی کے مہمان خاندان کے سربراہ نے پہلا کام یہ کیا کہ ہم سے دور ایک اور روشنی کے کھمبے کے نیچے اپنا ڈیرا جمایا
انے کے بعد ہم سے معذرت کی کہ ان کا کھانا بند رکھے رکھے خراب ہوگیا تھا۔ ۴۰ من بوجھ اور فرنیچر کی جگہ ہم شاید صرف دو یا تین
، سائز کے لوہے کے ٹرنکس، چند چھوٹی چیزیں اور ایک ہولڈ اول میں سب کا اوڑھنا بچھونا لے کر آپائے تھے۔ اس سے زیادہ کی ہمیں جگہ
ملتی۔ لوہے کے ٹرنکس ٹرین کے لوہے کے ڈبوں میں کہیں بند تھے، ان ڈبوں کو لاہور میں نہیں کھلنا تھا۔ ہم ہولڈ اول اور چھوٹی چیزیں
لے سنبھالے ادھر چل پڑے جدھر زیادہ روشنی تھی اور ریلوے اسٹیشن کی عمارتیں سردی کی رات میں کھڑی ٹھٹھر رہی تھیں۔ ٹرین کے
ر ۳۴، ۳۶ گھنٹے سکڑ سکڑا کر بیٹھے رہنے سے میرے گھٹنوں اور کولھوں کو تو کیا پورے جسم کو اکڑا دیا تھا۔ مجھے اپنا بستر یاد آرہا تھا جو نہ
کتنے سو میل پیچھے ہم چھوڑ آئے تھے اور جو خاندان کی تحویل میں تھا جس کے سربراہ نے یو۔ پی۔ میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا، جس کے بھائی
ارے ساتھ سفر کیا تھا۔ بڑے بھائی پر ہمارا گھر ہتھیا لینے پر مجھے غصہ آرہا تھا اور چھوٹے پر ہمارا کھانا کھانے اور اپنا نہ کھلانے پر۔ حالات
ہ کی صلاحیت ابھی مجھ میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں سراسر محبت او . . . تھا جو اس عمر میں سب لڑکے لڑکیاں ہوا کرتے ہوں سوائے ان
ھوں نے اس سے کم عمری میں سب کچھ کھو دیا ہو۔

ویٹنگ روم مسافروں سے ٹھسا ٹھس بھرے تھے۔ لیکن عورتوں والوں میں سے ایک میں والدہ اور بڑی بہن کو کہیں نہ کہیں جگہ مل
۔ والد صاحب اور میں اسی ویٹنگ روم کے . . . . کی چاروں سے بچتے ہوئے پلیٹ فورم پر سوئے اور چوں کہ وہ کئی ہفتوں کی
، دوڑ سے بری طرح تھکے ہوئے تھے اس لیے ا . . . سوئے کہ . . . کے ساتھ بیچ رات میں راولپنڈی نہ جاسکے جو اس کی آخری منزل تھی
ں جاکر انھیں ہمارا سامان ملتا۔

والد صاحب کو کیسے راولپنڈی ۔۔ [illegible] میں میجر سلیم کو ڈھونڈھنے اور سامان کی تلاش میں کیا دکھ اٹھانے پڑے
ھوں نے معلوم نہیں ہونے دیا۔ ان کی [illegible] میں نے پلیٹ فورم کی دنیا میں گزارے۔ ایک بڑے سے گملے میں لگے
پودے کی جگہ جس کی اچھی طرح نگہداشت کی گئی ہو میں نے خود کو زندگی میں پہلی بار ایک ایسی باڑ میں لگا پایا جو دور تک پھیلی ہوئی تھی
میں سے تراشا گیا تھا کہیں سے نہیں اور جس میں سبزے کو روندنے والوں نے جگہ جگہ راستے بنادیے تھے۔

جب والد صاحب مع سامان کے آگئے تو ہم ایک روپیہ روز پر دس پورے کے ایک مکان میں دو تین ہفتے پڑے رہے۔ پردس
ے سے چند ہی ماہ پہلے سیلاب کا پانی ہٹا تھا اور مکان کی دیواروں پر ہاتھی ڈباؤ پانی کا نشان تھا۔ دہلی اور بریلی، آگرہ، اودھ اور گورکھپور

کشمیریوں میں میں نے رہٹ نہیں دیکھے تھے، کسانوں کو پروتے دیکھا تھا۔ اردو کے ایک افسانے میں پنجاب کے رہٹوں کے اوحلو سے گر والی ٹھنڈے پانی کی دھاروں کا ذکر پڑھ کر میں ان پر بن دیکھے فریفتہ تھا۔ تب میری وہ عمر تھی جس میں بہت دن کی بات ہے کے نوجوان زادے ان دیکھی اور کسی دور کے دیس میں رہنے والی لڑکی کے الامان والحفیظ حسن کی تعریف سن کر بغیر تصویر تک دیکھے اس پر جی جان عاشق ہو جاتے تھے۔ کیوں کہ اس زمانے میں نہ بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گرافی تھی نہ کلر۔ نہ ہی لاہور سے نکلنے والے اس رسالے میں رہٹ تصویر چھپی تھی کیوں کہ میری بدنصیبی، وہ ادبی پرچہ تھا۔

اس ٹھنڈے سے پہلے مکان سے جس میں دو خاندان اس طرح پڑے تھے کہ مرد ایک کمرے میں سوتے تھے عورتیں دوسرے میں۔ کھیتوں میں سے ایک راستہ ایک رہٹ کو جاتا تھا۔ پہلے ہی دن میں اتفاقاً اس رہٹ پر جا پہنچا اور بغیر کسی کے بتائے اسے پہچان گیا۔ میں نے پانی اس طرح پیا جس طرح لوگ طواف خانہ کعبہ کے بعد چاہِ زمزم کا پانی پیٹ بھر کر پیتے ہیں۔ یہ عمل کئی دن جاری رہا کیوں کہ میرے پاس کرنے کے لیے کچھ اور نہیں تھا۔ والد صاحب اور ان کے دوست جنھیں عمر میں بڑے ہونے کی وجہ سے وہ استاد کہتے تھے، نوکری سے متعلق کاموں کے سلسلے میں صبح گھر سے نکل جاتے تھے اور میرا اسکول میں داخلہ اس وقت تک کے لیے ملتوی رکھا گیا تھا جب سر چھپانے کو جگہ ہو جائے۔ ایک روپیہ روز کا مکان بڑوں کے لیے تو کیا خود میرے لیے تشویش کا باعث تھا۔ کیوں کہ جس طبقے سے میرا تعلق تھا اس کے بچے بھی پیسے کی قیمت جانتے ہیں اور ہمیشہ ڈرا کرتے ہیں کہ کہیں ختم نہ ہو جائے۔

اچانک، چند ہی دن بعد، میرے گردوں میں درد اٹھ کھڑا ہوا۔ رہٹ کا پانی گو خوب صورت اور بامزہ تھا اور اس کے گرنے کی آواز بیلوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کی آواز سے ہم آہنگ تھی لیکن تھا ایسے کنوئیں کا جو سیلاب کے پانی سے حال ہی میں گھل مل چکا تھا۔ شہر کے سیلاب کا پانی جنگل کے سیلاب کے پانی سے اجزائے ترکیبی میں یکسر مختلف ہوتا ہے اور تاثیر میں بھی۔ رہٹ کے پانی کو کھیت جی لگا کر پی رہے تھے اور پھل پھول رہے تھے۔ میں نے اسے پی کر کھٹیا پکڑ لی۔

ان دنوں کا لاہور خبریں ہی خبریں تھا اور وہاں کے گلی بازار سامانِ حیرت فراہم کرتے تھے۔ میں نے شاہ عالمی بازار کو دیکھا جو بے چھت اور بے دروازہ مکانوں کا شہر تھا۔ ایک مکان کی دوسری منزل کی پشت کی دیوار میں بنی الماری میں دو اچاریاں رکھی تھیں۔ وہی جو چینی مٹی کی ہوتی ہیں اور جن کی گردن کے نیچے ہرے یا کتھئی رنگ کا چوڑا سا دائرہ ہوتا ہے۔ قلعہ نما ریلوے اسٹیشن کے باہر کے وسیع، ڈامر سے ڈھکی ہر سمت سے کھلنے والی سڑکوں کے چوک میں جاڑوں کی سخت سردی میں ہر سڑک کے کنارے متوازی پڑے ہوئے جسم نظر آتے تھے جن میں سے ایک پر رویل انڈین ایئر فورس کا خوش نما نیلا گرم کوٹ چڑھا ہوا تھا۔ جب ہمیں ریلوے اسٹاف ٹرانزٹ کیمپ میں، ۴۰ میو روڈ پر جگہ مل گئی اور ہمارے واحد کمرے میں کھانا پکنے لگا تو میں اس نیلے کوٹ والے کو رات کا بچا کچا کھانا پہنچانے لگا۔

ان جسموں کو جو ان گنت تھے ٹرکوں سے رزق ملتا تھا۔ ہر صبح ٹرک سے اتر کر چند مرد ایک سرے سے دوسرے تک ان جسموں کو ہلا ہلا کر چیک کرتے جاتے تھے۔ جو ہلانے جانے پر خود نہیں ہلنے لگتا تھا اس جسم کو اٹھا کر ٹرک میں لوڈ کر دیا جاتا تھا۔ ایک جسم کی جگہ دوسرا جسم لے لیتا تھا۔ ایک دن رویل انڈین ایئر فورس کا نیلا کوٹ مجھے اپنی جگہ پر نظر نہیں آیا۔ اچھا ہوتا کہ اس کے اندر کا آدمی اپنی جگہ کے ساتھ ساتھ اسے بھی نئے آنے والے کے لیے چھوڑ جاتا۔ یوں تو وہ اس کے کفن کے کام میں آیا ہوگا اور کفن ایسے حالات میں ایک غیر ضروری چیز ہوتا ہے۔

ایک دن ہمارے کیمپ میں ایک آدمی آیا اور ایک مٹی کے تیل کے پیپے کو جس میں خالص دانے دار، خوشبو والا دیسی گھی تھا۔۔۔۔
ن نہیں جو ان دنوں تک مقبول نہیں ہوا تھا۔۔۔۔ بہت سستے داموں انبالے کی ایک عورت کے ہاتھوں بیچ کر چلا گیا۔ اس آدمی کا گھر
تھا اور اس نے ان دنوں کے محاورے میں "میں مہاجرین ہوں" کہہ کر اپنی زندگی کے سوانح بیان کیے اور یہ کہ وہ پاؤ، آدھ سیر گھی دے
نی بوجھ کو دن بھر در در اٹھائے پھرنا نہیں چاہتا، بیچے گا تو پورا ڈبہ۔ گھی سستا تھا اور ڈبے کو خریدنے میں اس عورت کو جو خود "مہاجرین
سرے "مہاجرین بھائی" کی مدد کرنے کی روحانی خوشی مل رہی تھی۔

بعد میں کیمپ میں ایک شور مچا گھی کی تہہ کے نیچے وہ چیز تھی جسے سور کھاتے ہیں۔ گھی کے ڈبے کے ساتھ عورت کو اپنا چمچہ بھی پھینکنا
ا گا۔

اس قسم کی خبریں ان دنوں عام تھیں اور یہ باتیں بھی اس طرح اپنے پچھلے شہروں کو لکھنے کے لائق تھیں جس طرح یہ خوش خبری کہ بکری
ت جسے ہم ایک روپے سیر پیچھے چھوڑ کر آئے تھے یہاں دس آنے سیر تھا۔ اس کا بھید بعد میں کھلا کہ جن لوگوں کو جانوروں کے ریوڑ اور
لے تھے وہ انھیں بیچ باچ کر جلد از جلد کہیں آگے نکل جانا چاہتے تھے کیوں کہ دادا، پردادا سے وہ کوئی اور کام کرتے آئے تھے اور بھیڑ
ں کے گوشت کو کھانے میں اس سکون اور صبر کی ضرورت نہیں ہوتی ہے جس کے بنا جانوروں کو پالا نہیں جاسکتا ہے۔ ایک نیا تجربہ
ے لیے یہ تھا کہ شہر میں بن کٹے ہوئے انتہائی فربہ بیل یعنی بجار نہیں تھے جو صوبہ جات متحدہ میں چمنوں کی ترکاری اور پھل بیچنے والوں کے
ں پر دن بھر منہ چلاتے نظر آتے تھے اور انھیں مار نہیں پڑتی تھی صرف پیار بھری ڈانٹ سے بھگایا جاتا تھا۔ میں جانتا تھا لاہور کے بجار
سما چکے ہیں۔

شہر میں جگہ جگہ ابلے ہوئے انڈے بکتے نظر آتے تھے۔۔۔۔ وہ بھی ہاتھ آئی ہوئی مرغیوں کے تھے، اسی لیے سستے تھے۔ یوں بھی چند آنے یا
، بنا لینے کے لیے یہ سب کم راس المال طلب کاروبار تھے۔

سرحد پار سے عورتوں کے گلے یا ریوڑ بھی مہینوں تک آتے رہے۔ یہ وہ عورتیں نہیں تھیں جو اپنے گھر والوں کے ساتھ پیدل چل
ر پہنچی تھیں۔ وہ کہاں کس طرح غائب ہوتی گئیں ان کی بپتائیں اس دور کے کہانی کاروں کو خام مال فراہم کرتی تھیں۔

اول اول ۶۰ میو روڈ کے کیمپ کا ایک اندازاً ۲۰ x ۹ فٹ برآمدے کے ٹکڑے میں جگہ پا کر جس کی تین طرف سے نیلا کپڑا لگی ہوئی
وں کی چلونوں سے حد بندی کی گئی تھی اور چوتھی طرف دیوار تھی، میں نے جو کام سب سے پہلے کیا وہ یہ تھا کہ میو روڈ پر اس سمت چل
ریلوے اسٹیشن سے پرے جاتی تھی، جس پر میں جانتا تھا کہیں جاوید منزل ہوگی جس کا نام میں بانگ درا، ضرب کلیم اور بال جبریل میں
چکا تھا اور بہت خوش تھا کہ ہمیں میو روڈ پر جگہ ملی ہے۔ رہنے کی جگہ کی تنگی اور زندگی کو بچے اس عمر میں محسوس نہیں کیا کرتے جو اس
میری تھی۔ اقبال کے خواب کی تعبیر بتانے والا یوسف اگر تھا تو وہ مصلحتاً خاموش رہا۔ سڑک چلتے ہوئے اٹھائے ہاتھ کو شاہوں کی گودی سے پہلے
وہ کاری گری کی رحس سے مبرا عمارت نظر آئی اور اچھی لگی۔ یہ بات بھی ایسی تھی کہ میں اسے اپنے پرانے اسکول کے ساتھیوں کو فخر سے
لکھتا تھا۔ مرادآباد کے ہیوٹ مسلم ہائی اسکول، بعد میں مسلم انٹر کالج، کے میٹن ہال کی دیواروں پر اقبال کے اشعار کے طغرے لگے تھے
گوں کے گھروں میں بھی ایسے طغرے دیکھنے میں آتے تھے۔ کوڑی تو نہیں پائی، دھیلے، پیسے اور آنے جمع کر کے ان کتابوں کو خریدنے سے

پہلے ایک ملنے والے کے گھر میں صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا والے قطعے کا طغریٰ پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا۔ جوش کی کس زبان سے رہے ہو آج اے سوداگروں والی نظم کے بعد جو نظمیں مجھے خود بخود یاد ہو گئی تھیں وہ تھیں ترانہ ہندی، سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا اور ہندستانی بچوں کا قومی گیت، چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا، نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا، میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے۔ - یہ دور میری اسکول کی زندگی سے پہلے کا دور تھا جب مجھ سے ہر جگہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام، والی نظم سنانے کہا جاتا تھا کیوں کہ انگریزی راج سے نفرت عام تھی اور رسالہ "ہندوستان" کے جس شمارے میں وہ نظم چھپی تھی اس کے تمام پرچے ضبط کر لیے گئے تھے۔ "یاد تو ہو گا تمھیں جلیان والا باغ بھی" کے ایک لفظ (جلیان) کو میرے دماغ نے ایک ایسے لفظ سے بدل رکھا تھا جو میں نے بارہا ان اشتہاروں میں پڑھا، جو راہ چلتے ہوئے دیواروں پر لکھے نظر آتے تھے۔ لیکن اس تحریف کو سن کر باوجود چہروں پر مسکراہٹ آجانے کے کوئی مجھے اس پر ٹوکتا نہیں تھا۔

، جموں سے نکلنے والے رسالے "رتن" میں چھپی ہوئی نظم "اقبال اور ٹیگور" کے پہلے دو اشعار:

اقبال اور ٹیگور گو دونوں ہی بڑے تھے — پر ابا یہ کہتے تھے کہ اقبال بڑا ہے
ٹیگور کی نظریں ہیں کہ اٹھتی نہیں اوپر — اقبال ہمالہ کی بلندی پہ کھڑا ہے

موقف کو تسلیم کرنے میں مجھے بڑا تامل ہوا کیوں کہ میں دونوں کو ایک دوسرے کا مدمقابل نہیں سمجھتا تھا۔ یہ راز مجھ پر بہت بعد میں کھلا کہ اس طور ہماری ذہنی تربیت کی جارہی تھی۔ بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کے ساتھ ساتھ ٹیگور کی کچھ نظمیں اور "دی ہوم کمنگ" اور "کابلی والا" میرے ذہن پر پہلے کی طرف راج کرتی رہیں۔ "دی کنگ آف دی ڈارک چیمبر"، "گورا"، "گیت انجلی"، "دی مینِنگ آف آرٹ" پڑھنے کا وقت ابھی کافی آگے تھا۔ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء، میرے سابقہ اسکول میں اس طرح منائی گئی کہ ہم سب نے برگدوں کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر، ترانۂ ہندی، پڑھا تھا۔ اپنے نئے وطن کے اسکول میں اس موقع کا ذکر آجانے پر میں نے قدرے شکست سے اپنے نئے ساتھیوں سے پوچھا "تم نے آزادی کیسے منائی تھی؟"

انھوں نے کہا:

ہم نے چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

پڑھا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہیں گڑبڑ ہوئی ہے۔ میں نے ترانۂ ہندی پڑھا تھا، انھوں نے ترانۂ ملی۔

جاوید منزل کی زیارت کر کے میں خوش خوش اپنے کیمپ لوٹ آیا جس کے اطراف میں ان جسموں کی پھیلائی ہوئی کھکر اہند اور سڑاہند بسی ہوئی تھی جن کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔ شہر کے مختلف علاقوں سے آنے والی خبروں کی طرح کیمپ کے پیچھے کی پتلی نہر کے ہمراہ اسٹیشن پر جا کر نکلنے والی کچی سڑک سے بھی ایک دن یہ خبر اچانک اٹھی تھی کہ وہاں کوئی لاش پڑی ہے جس کے قمیص کے دامن کو سنٹی سے اٹھا کر لڑکے اس کی شناخت کرا رہے تھے۔ کبھی کبھی دھرم پورے کی نہر میں بھی کوئی لاش تیرنے، نہانے والوں کے ہاتھ آجاتی تھی جو اسے آگے جانے دیتے تھے۔

ہر روز صبح کلچے والوں کی آوازیں کیمپ کی اندرونی سڑک پر گونجتی تھیں جن کا میں نے صرف نام پڑھا تھا، دیکھا نہیں تھا اور ساتھ ہی میں اخبار فروشوں کی صدائیں و اخبار، زمیندار، نوائے وقت، مغربی پاکستان ٹائمز اخبار سے سننے میں آتی تھیں۔ مجھے آخر الذکر کی جزوری سی پر

حیرت ہوتی تھی کہ کیسے لفظ پاکستان کو مغربی اور ٹائمز کے بیچ میں جگہ دے کر ایک لفظ کی بچت کر رہے ہیں ورنہ انھیں پکار نا پڑتا اخبار، زی وآر نوآئے وقت، مغربی پاکستان، پاکستان ٹائمز، اخبارے، جو صوتی اعتبار سے وزن اور غنگی سے خارج ہوتا ہے۔ ہم مغربی پاکستان لینے لگے اور جب چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض اور ایوب احمد کرمانی کا امروز سامنے آیا تو گو میں ترقی پسند تحریک سے ناواقف تھا اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے مجھے وہ اخبار پسند آیا اور اسے، ہم ایک اخبار فروش سے لینے لگے جس کا نام صنوبر تھا حالاں کہ کنڈیل (کنیر) یا گرحل زیادہ مناسب ہوتا اور وہ بھی بن پتوں اور پھولوں کا۔

ان ہی دنوں اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ ایک عورت کو جس سے آزادی کی رستاخیز نے سب کچھ چھین لیا تھا (جب نہ معلوم کس وجہ سے) ایک عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے بڑی اچنبھے کی بات جج سے کہی۔ وہ عورت لٹیروں، قاتلوں اور سماج کے قسم ہا قسم کے خدمت گزاروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہوئی نہ جانے کن کن چیک پوسٹس سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی اور اسے اسٹریچر یا منجی (چارپائی) پر عدالت میں لایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ نہ شوہر تھا، نہ باپ، بھائی یا بیٹا۔ جب جج نے کیس پر نظر ڈال کر اس سے پوچھا "تمھیں کوئی سٹیٹ منٹ دینا ہے؟" تو اس نے بڑی نقاہت سے کہا "کیا آپ بھی سٹیٹ مینٹ لیں گے؟" آخری بات اس نے ہاتھ جوڑ کر کہی ہوگی۔ یہ میرا خیال ہے۔

میں نے آزادی ۱۹۴۷ء کی اس قیامت کا ذکر کرتے ہوئے ان واقعات میں سے بس ان چند کو دہرایا ہے جن کا یا تو میری ذات سے تعلق ہے یا جو میرے علم میں آئے۔ لیکن ایسے واقعات بے شمار تھے جنھوں نے دوسروں کو بھی متاثر کیا۔ ان میں جن کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت بخشی تھی تاریخ کے اس خام مال کو اپنے ذہن کے کارخانوں میں نئی شکل دے کر ادب، فلم، تھیٹر اور مصوری کے تکمیل شدہ فن پاروں (سمپورن کلاؤں) کی حیثیت سے بازار میں لا رہے تھے جہاں مغربی دنیا میں ٹیمس کے کنارے نظر آنے والی آرٹ ایکزیبشنز کی طرح ان تصاویر نے پرانی مستند تصاویر کی جگہ کچھ عرصے کے لیے مکمل طور سے لے لی تھی اور ان میں سے کچھ ابھی تک اپنے سے پرانے مرقعوں کے ساتھ یاد اور پسند کی دیوار پر نظر آتی ہیں۔ اس دور کے جن سماجی اہمیت کے حامل واقعات کو ادبی یا فنی تخلیقات کا روپ نہیں ملا کتنوں اور اخباروں میں دبے کے دبے رہ گئے۔ نئے ذہنوں کو سنوارنے، ظلم اور زیادتی سے نفرت دلانے اور محبت، برداشت، درگزری اور سہل نتاگی اقدار کی آبیاری کرنے کا ان کو موقع ہی نہیں ملا۔ کل کا اخبار کوئی نہیں پڑھا کرتا، "ایک کہانی دو شہروں کی" ہمیشہ پڑھی جائے گی۔

کسی بھی رست خیز کے کربیہ مناظر اور تلخ سوانح کو فنی تشکیل دے کر ہر تخلیقی صلاحیت رکھنے والا باشعور ادب اپنے احتجاج کا اظہار کرتا ہے۔ کم تر درجے کے ادیب کے حصے میں ان واقعات میں صرف لذت، دہشت سے الفت اور نفرت کے الاؤ کو بھڑکانے والا ایندھن آتا ہے۔ ویت نام کی لاانتہاہی جنگ عظیم سے جو امریکی فکشن رائٹرز اور فلم سازوں کو یافت ہوئی وہ موخرالذکر صنف میں آتا ہے۔ افراد کی دنیا کے، ایک دور کے ساتھ، خاموشی سے گزر جانے کا المیہ مرزا ہادی حسن رسوا (امراؤ جان ادا) جیسے حساس تخلیقی فن کار کے قلم کا جویا ہوتا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر سکھ کا اس مسلمان لڑکے کے اپنا دیس چھوڑ کر دوسرے دیس جانے پر مجبور ہونے پر افسوس، بے در و دیوار مکانوں کا شہر جس کے ایک گھر میں رہنے والی کو جہاں اور سب کھونے کا قلق ہو گا وہاں شاید اس کا بھی کہ اچار کچھ ہی دن پہلے دو اچاریاں بھر بھر کر ڈالا تھا، باوجود آزمائش سے تھوڑے ہی دن پہلے ہو گزرنے کے بعض لوگوں میں دھوکا دینے کی صلاحیت کی برقراری اور بعض میں مطلب پرستی کا نہ مٹنا، اپنا

دفاع نہ کر سکنے والی عورتوں کا ہمدردی کے بھروپ میں اس حد تک پامال کیے جانا کہ وہ معمولی سے اشارے پر اپنے جسم کو ہر کس و ناکس کے سپرد کر دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھنے لگیں، کھو دینے کے غم پر جسمانی تکلیف سے بچاؤ غالب آجائے ۔۔۔۔ ان تمام واقعات کا افسانوں، کہانیوں اور ناولوں سے پاؤں بھاری ہے۔ اس مضمون میں میرا اشارہ واضح طور سے اس آخری واقعے کی طرف ہے جسے اردو پڑھنے والے پچھلی تین دہائیوں سے پڑھتے آئے ہیں۔ نہ معلوم وہ کون عورت تھی اور ایک تھی یا کئی ایک تھیں۔

سندھ میں ہندستان سے بمبئی کے راستے آنے والے چند مسافروں کی معصومانہ مدد جس طرح ایک دیہاتی نے کی تھی اس نے مجھ سے ۱۹۴۸ء میں میری سب سے پہلے چھپنے والی کہانی دہقان لکھوائی تھی۔ میں ان دنوں بھی سمجھتا تھا غیر منقسم ہندستان کے تمام دیہاتیوں کی زبان ایک ہے۔ اس اعتقاد کی بنیاد کلکتہ، بمبئی اور لاہور میں بننے والی اردو، ہندی فلموں پر تھی جن میں اہم کردار ضرورت پڑنے پر بے نام شہر کا رخ کرتے تھے۔ اور سندھ کے اس گاؤں والے سے میں نے وہی جملہ کہلوایا تھا جو میں ایسے موقع پر اپنے یہاں کے کسی گاؤں والے سے سنتا۔ اس سے پہلے جو کہانیاں میں لکھا کرتا تھا انھیں ایک بے جلد رجسٹر میں لکھتا جاتا تھا۔ اسکول اور کولج کی درمیانی چھٹیوں میں ایک صبح جب سب سو رہے تھے میں نے اس واقعے کو ایک کہانی کی شکل میں لکھا اور ہمت کر کے ہفتہ وار استقلال کو بھیج دیا۔ میری کم عمری، کم علمی اور جھجک کو لاجرم جذبات کی شدت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے ہوں گے۔

ہر تخلیقی کام اس بڑے اجتماعی کام کا ایک جزو ہوتا ہے جو کسی معاشرے میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ اس کے تین منبعے بہ آسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ کوئی واقعہ حال یا ماضی کا جو مصنف یا شاعر کے علم میں آئے یا جس کا اس نے مشاہدہ کیا ہو یا خود اس پر بیتے اس کے شعور میں آنے پر اس کی طرز فکر کے تابع ہوتا ہے۔ وہ اسے لکھنے پر مہمیز بھی کر سکتا ہے اور اٹھا کر ذہن سے باہر پھینک دیے جانے کا مشورہ بھی دے سکتا ہے۔ یہاں شعور سے یہ مراد ہرگم نہیں ہے کہ وہ اس کے لایا تحت الشعور میں ہوتا ہے۔ پھینک جانے کا مشورہ بھی دے سکتا ہے۔ یہاں شعور سے مراد ہرگز نہیں ہے کہ وہ اس کے لایا تحت الشعور میں ہوتا ہے پھینک دیے جانے کا مطالبہ وہ جب ہی کرے گا جب اظہار نامناسب ہو یا مصنف کی موجودہ طرز فکر سے اس کا بہلاوہ عمل مختلف ہو۔ بہت کم ہیرو یا نائک کسی کے تاعمر ہیرو یا نائک ہوتے ہیں۔ اس چناؤ میں رومانی تخیلات سب سے پہلے شہید ہوتے ہیں۔

۲۔ ماحول کے کسی اشارے کا خیالات کی رو کو جنم دینا جس کی لہریں اپنی لگروں پر ان گنت، چھوٹے چھوٹے واقعات، حسی تجربے، سانحے اور خوشی کے لمحے اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں اور بالآخر یہ رو اپنی سب سے بلند لہر پیدا کر کے تخلیق کے سمندر تٹ پر آہستگی سے پھیل جاتی ہے۔ بسا اوقات مصنف یا شاعر کو سب سے پہلے ابھرنے والا وہ خیال یاد بھی نہیں رہتا ہے نہ ماحول کے وہ اشارے cues جنھوں نے اس رو کو جنم دیا تھا۔

۳۔ کسی معاشرے کی اس وقت کی ذہنی ساخت، جو اس کی نراش، آس اور درد دھ (احتجاج) سے جنم لیتی ہے خود اپنے تخلیقی کام کرنے والوں کو اس نراس، آس اور درودھ کو ظاہر کرنے پر اکساتی ہے اور اس عمل میں فن کار کا دماغ خود اپنے اندر چھپے ہوئے تجربات کے خزانے کو کھنگوڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔ تخلیق کا یہ عمل خود کو تباہ کر لینے کی بے انتہا طاقت رکھتا ہے یعنی اگر مصنف یا شاعر اپنے فن پارے کو

(آگے ص ۲۳ پر)

مطالعہ

یوسف ناظم

دیوانِ غالب کُل و نسخہ رضا

دانش گاہوں کے تعلیمی نصاب میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں ان میں نئے مضامین کا اضافہ بھی وقفے وقفے سے ہوتا رہا ہے لیکن ب کے منتخبین، یعنی انتخاب کنندگان دو مضامین کو نصاب میں شامل کرنا ہمیشہ بھول جاتے ہیں۔ یہ دو مضامین ہیں غالبیات اور اقبالیات۔ بات کو اس لیے اولیت حاصل ہے کہ غالب پہلے پیدا ہوئے تھے اور اب تو ان کی ۲۰۰ سالہ "یادش بخیر" کا موقع قریب آگیا ہے اور اتفاق کی ہے کہ اس عظیم شاعر کو یاد کرنے والے قدر داں لوگ ہیں بھی عظیم آباد کے۔ اسے نسبت وجدانی کہا جاتا ہے۔

غالبیات کے مضمون کے محققین، ماہرین اور معلمین کی تعداد اتنی ہی ہوگی جتنی اس مضمون کے متعلمین کی ہے (متعلمین میں مجھ ہیچ مداں بھی شامل ہیں جو برسوں سے غالب کو پڑھ رہے ہیں۔ لیکن موصوف کی چند غزلوں کے چند اشعار کے آگے ان کی سخن شناسی پر مار سکی)۔ جو شاعر یہ کہتا تھا کہ:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

شاعر کو یوں بھی کہنا پڑا کہ:

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

غالب درحقیقت "عجیب الخیال" شاعر تھے۔ اپنی تردید خود کرتے تھے۔ ریختہ کو رشکِ فارسی بھی کہتے تھے اور پھر یہ بھی فرماتے تھے کہ کا اردو کلام "بے رنگ من است" اور اگر نقش ہائے رنگ رنگ دیکھنے ہوں انھیں فارسی میں پڑھیے۔ ظاہر ہے ایسے شاعر کے کلام پر کوئی یقی، علمی اور پائیدار کام کرنے کے لیے حوصلہ، وقت، توفیق، ذوق لگن اور دقتِ نظر کی خصوصیات درکار ہیں۔ یہ ساری تشبیب دیوانِ ب (کامل) نسخہ گیان رضا کے لیے ہے جس کا تیسرا ایڈیشن صحیح معنوں میں "زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منصہ شہود پر جلوہ گر" ہوا ہے۔ نسخہ رضا سے گریز ممکن نہیں کیوں کہ شاید یہ کتاب غالبیات کے مضمون میں حرفِ آخر ہو۔ اب کس کے پاس وقت ہے اور کڑنی مراحل، اس دورِ فاسد میں کس کا جگر ہے کہ ایسے صبر آزما کام کا بیڑا اٹھائے۔ لیکن شعر و ادب کی دنیا میں وہ گریز بہر حال لازمی ہے جو تشبیب کے تا ہے۔

ڈیمائی سائز کی ۵۶۳ صفحوں پر مشتمل یہ کتاب "غالبیات" کے مضمون میں ایک اہم اضافہ ہے۔ کالی داس گپتا رضا، نفیس، و دیدہ ب اور موقر کتابیں شائع کرنے کا حلف اٹھا چکے ہیں۔ اور اس بار گراں سے بخوبی عہدہ برآ بھی ہو چکے ہیں۔ فاضل مرتب کے کتب خانے میں ب سے متعلق کتابیں اور رسائل دو ہزار سے زیادہ کی تعداد میں موجود ہیں اور ظاہر ہے یہ صرف خوب صورتی یا نمائش کے لیے الماریوں میں

سجا کر نہیں رکھے گئے ہیں فاضل مصنف نے ان کا بغور مطالعہ کیا ہے ان کی "حاشیہ پری" کی ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں بھی فاضل مرتب کو نشان لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی حاشیے میں نشان لگے ہوں گے۔ یہ کتاب برسوں کے مطالعے، ذہنی و دماغی کاوش اور دیدہ ریزی کی دین ہے جس پر فاضل مرتب کو بجاطور پر ناز ہونا چاہیے۔ لیکن فاضل مرتب نے اپنے مقدمے میں اپنے تمام ہم عصروں، پیش روؤں اور دوستوں کا ذکر کرکے اس بات کا ثبوت بھی دیا ہے کہ انھوں نے کہاں کہاں سے گل چینی کی ہے اور کہاں نکتہ چینی (لیکن یہ نکتہ چینی در حقیقت نکتہ سنجی ہے)۔ فاضل مرتب نے ایسا معلوم ہوتا ہے، غالب کے ان تمام پرزوں کو اکٹھا کرنے میں بے انتہا وقت اور روپیہ صرف کیا ہے جو اڑکر ادھر سے ادھر بکھر گئے تھے۔ ایک کتاب "یوسف ہندی قید فرنگ" میں مصنفہ محسن بن شبیر جب ان کے ہاتھ لگی تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اور اس کتاب کا مطالعہ انھوں نے بارہ سال کی عمر میں کیا تھا لیکن یہ ان کے حافظے میں موجود تھی۔ اور ۵۸ سال پرانی خواہش جب پوری ہوئی تو انھیں اندازہ ہوا کہ غالب واقعی ولی تھے گو کہ بادہ خوار تھے۔ گپتا جی نے "نسخہ رضا" شائع کرکے ثابت کر دیا کہ تحقیق کے لیے دائم المریض ہونا ضروری ہے۔ ڈیڑھ دو سال کا مطالعہ کوئی مطالعہ نہیں ہوتا۔ اور تحقیق کے معاملے میں متعلم، معلم سے زیادہ قابل قدر ہوتے ہیں۔ غالب کے جاننے والوں میں زیب داستان باتیں، مبالغہ، غلط فہمی، راویوں کی طرف سے افسانہ طرازی یہ سب محاسن و معائب عام ہیں گپتا جی نے ان داستانوں کو فرضی اور غیر معتبر ثابت کیا ہے اور اس کے ثبوت میں لکھا ہے کہ متعلقہ شعر اور مفروضہ داستان میں زماں و مکاں کا فرق ہے۔ ان کی تحقیق اور دلائل کو رد نہیں کیا جاسکتا گو کہ بعض مقامات پر وہ ایک سخت گیر صدر الصدور کی طرح فیصلہ صادر کرتے ہیں اور شاعرانہ معاملات میں ذرا سی بھی رعایت یا مروت سے کام نہیں لینا چاہتے۔ گپتا جی نے اپنے تحقیقی رویے اور ناقدانہ طرز فکر کے بارے میں صاف صاف لکھا ہے کہ "جب تک غالب کے تمام کلام کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ نہ کیا جائے گا ہم نتائج اخذ کرنے میں اکثر ٹھوکریں کھاتے رہیں گے۔ میں نے اسی مقصد کو رہنما بنا کر اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ تاریخی ترتیب ہی سے غالب کے سوانح اور فکری ارتقا کا صحیح تجزیہ ہوسکے گا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ غالب کے اردو کلام کے کئی ایک مخطوطے فراہم ہو چکے ہیں جو ان کے مختلف فکری ادوار کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اور پھر مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کا مرتبہ دیوان غالب موجود ہے جو کسی نصیحت عظمیٰ سے کم نہیں۔" (ص ۲۶) مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو اس سے بہتر خراج عقیدت شاید ہی کسی اور نے پیش کیا ہو لیکن وہ حالی اور محمد حسین آزاد کو معاف نہیں کرتے۔ حالی کے اس بیان کو کہ جیل میں "کپڑا اور تمام ضروریات ان کو (غالب کو) گھر سے پہنچتی تھیں۔ وہ غالب ہی کے ایک فارسی شعر کے حوالے سے غلط قرار دیتے ہیں۔ غالب نے اس شعر میں کہا ہے کہ "از کف شحنہ اسد مہ و نانم وزید۔" راقم الحروف کوئی سراغ رساں یا جاسوس نہیں لیکن اتنا کہنے کی جرأت تو کرہی سکتا ہے کہ غالب کے اس مصرع سے حالی کے بیان کی تردید نہیں ہوسکتی۔ کف شحنہ، کا واسطہ تو بہرحال ضروری تھا۔ اسی طرح "ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا" اس شعر کے تعلق سے محمد حسین آزاد نے جو کچھ لکھا اور حالی نے اسے دہرایا، گپتا جی اسے غیر درست قرار دیتے ہیں انھوں نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ "شعر والا قصہ تو نرا افسانہ ہے"۔ بہرحال گپتا جی کی دقت نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

فاضل مرتب کا مطالعہ غیر معمولی حد تک وسیع ہے۔ انھیں بیدل اور خیام کے اشعار زبانی یاد ہیں بلکہ بیدل کے تو وہ عاشق ہیں۔ میر کے اشعار کا حوالہ بھی اس کتاب میں ملتا ہے اور قدیم کے شعر بھی انھیں حفظ ہیں۔ مرزا غالب کے اس شعر کو فاضل مرتب نے بیدل کے ایک شعر کا ترجمہ بتانے میں بھی تکلف نہیں کیا:

مئے سے غرضِ نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیے

ص ۱۹ پر فاضل مرتب نے لکھا ہے "یہ مرزا بیدل کے شعر کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔"

مطلبم از مئے پرستی تر دماغی ہا نہ بود یک دو ساغر آب دارم گریۂ مستانہ را

اور فٹ نوٹ میں بیدل کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے بیدل نے بھی یہ مضمون خیام کی رباعی ہی سے اڑایا ہے۔"
راقم الحروف صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ تحقیق بہت خطرناک صنفِ ادب ہے۔

فاضل مرتب نے غالب کے کلام کے گیارہ دور مقرر کیے ہیں اور جن ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا ہے " ۱۹ ماخذوں میں سے ۸ ماخذ انھوں نے نہیں دیکھے ہیں اس لیے ان ۸ ماخذوں کو فاضل مرتب نے دیوانِ غالب مرتبہ عرشی (اشاعت دوم) کے وسیلے سے پڑھا ہے۔ غالب کے جملہ اشعار کی تعداد ۴۲۲۶ بتائی گئی ہے جن میں "حرفِ نامعتبر" کے عنوان سے ۳۰ شعر بھی شامل ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ "تحقیق کوئی ہنر [illegible] ہے [illegible] مرزا [illegible]
اس صنف [illegible] واس لحاظ [illegible] کالی داس گپتا رضا نے اس "مرحلہ [illegible]" کو طے کرنے میں یقیناً جراتِ رندانہ سے کام لیا ہے اس میں ان کا زورِ بازو بھی شامل ہے اور توفیقِ ایزدی بھی۔ اس سعادت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ان کی عمر کے کتنے سال صرف ہو گئے ہیں یہ خود ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ کتاب بجائے خود ایک قاموس کی حیثیت رکھتی ہے اور ان ۴ تصویروں نے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس انسائیکلوپیڈیا کو ایک یادگار کا درجہ دے دیا ہے۔ بالخصوص غالب کے آخر وقت کی تصویر غالب کی زندگی کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ فاضل مرتب کے الفاظ یہ ہیں۔

چاروں تصویریں اور درج ذیل مختصر اقتباسات مرقعِ غالب سے ماخوذ ہیں:

"۱۔ یہ تصویر کلیاتِ غالب طبع دوم میں چھپی تھی ۱۸۶۳ء مرزا کی زندگی میں۔

۲۔ موقلم کی یہ رنگین نادر تصویر مرزا غالب نے بہادر شاہ ظفر کو پیش کی تھی۔

۳۔ موقلم کی یہ رنگین سنہری تصویر ۱۲۸۲ھ کی بنی ہوئی ہے۔

۴۔ بقول نواب امیر الدین احمد خاں، فرخ مرزا "یہ اخیر وقت کی تصویر ہے اور مرنے سے کچھ مہینے پہلے کی ہے۔" میرے اوپر فوٹو لیا گیا تھا۔ مرزا صاحب کو والد صاحب (نواب علاء الدین خاں علائی) نے مجبور کیا تھا۔"

راقم الحروف نے پہلی مرتبہ یہ چاروں تصویریں یک جا دیکھی ہیں۔

کتاب کے آخری صفحات بے حد اہم ہیں۔ ان میں فہرستِ اشعار کا بہ لحاظ سالِ فکر اور فہرستِ اشعار بہ لحاظ حروف تہجی شامل ہیں۔ آخر میں اشاریے کے عنوان کے تحت ان تمام اشخاص، کتب و رسائل اور مقامات کی تفصیل [illegible] ہے جن کا ذکر کتاب میں آیا ہے۔ یہ حصہ کوئی ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس ضخیم کتاب کے مطالعے میں سہولت کا باعث۔

غالب کو محققین اور مفکرین نے ہر زاویے سے دیکھا، پرکھا اور برتا ہے لیکن کالی داس گپتا رضا نے جتنے قریب سے انھیں دیکھا ہے (تاریخ وار دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے صبح و شام دیکھا) شاید ہی کسی دوسرے محقق نے دیکھا ہو۔ کالی داس گپتا رضا اس لحاظ سے شریف النفس محقق ہیں کہ جب بھی کہیں سے کوئی چیز لیتے ہیں اس کا حوالہ ضرور دے دیتے ہیں کہ یہ مال کہاں سے دست یاب ہوا ہے۔ غالب سے متعلق داستانوں

کو اگر انھوں نے رد کیا ہے تو تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ خود غالب نے بھی تو اپنا ایک فرضی استاد مقرر کر لیا تھا، عبد الصمد نامی اور بعد میں کہ "میں نے تو یہ بات یوں ہی کہہ دی تھی ورنہ مجھے کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ "غالب اور آہنگ غالب" (مصنفہ یوسف حسین خاں) میں تفصیل موجود ہے۔

زیر نظر کتاب سے پہلے فاضل مرتب کی ۱۵ کتابیں غالب سے متعلق (نہایت اہتمام کے ساتھ) شائع ہو چکی ہیں۔ گو کہ گپتا جی۔ مقدمے میں کہا ہے کہ "میں آج سے اپنی عمر کے ۷۰ ویں سال میں داخل ہو رہا ہوں اس لیے احتیاطاً یہ تو نہیں کہتا کہ میں غالب پر مزید نہیں کروں گا مگر تن تنہا کوئی موقر اور ضخیم کام شاید اب مجھ سے بن نہ پڑے۔ اس لیے رخصت۔" یہ ۲۵ اگست ۱۹۹۴ء کی تحریر ہے او داس گپتا رضا الفضلہ اب بھی ضخیم ہی موقر کام کرنے کے موقف میں ہیں۔ یہ نسخہ، رضا ان کی صحت کا ضامن ہے۔

"دیوان غالب کامل (نسخہ گپتا رضا" کی اشاعت پر یعنی اس کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت پر میں کون ہوتا ہوں کہ فاضل مرتہ خدمت میں مبارک باد پیش کروں۔ یہ منصب غالب پر تحقیقی کام کرنے والوں کا ہے۔ مجھے تو یہ یاد ہے کہ مشفق خواجہ نے مجھے اپنی تحقیقی کتاب بہ طور تحفہ بھیجی تو یہ لکھا تھا کہ میں یہ کتاب اس لیے بھیج رہا ہوں کہ لوگ آپ کو تحقیقی کتاب پڑھتے دیکھ کر ہنسیں (لیکن میر کب کسی کے ہنسنے کا برا مانا ہے۔)

غالب کے جتنے بھی نسخے چھپے ہیں ان میں یہ سب سے بیش قیمت نسخہ ہے کیوں کہ یہی ایک نسخہ تو میرے پاس ہے۔ اس لیے زیب ہے اسے جس قدر اچھا کہیے۔

کتاب کا سرورق نفیس ہے اور غالب کے فوٹو کی طرح سہ رنگی ہے۔ اس کتاب کو فن تحقیق کا ایک بے مثال نمونہ بھی کہا جا سکتا کہ اس میں جتنے بھی فٹ نوٹ اور حوالے ہیں وہ مستند ہیں میرا فرمایا ہوا کے درجے کے ہیں ان پر صرف انگشت شہادت لکھی جا سکتی۔ فاضل مرتب سے چوں کہ میں بر بنائے خوش قسمتی قریب سے واقف ہوں اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ گپتا جی طبعاً حزم و احتیاط کے شائق اور عا ہیں۔ وہ کوئی بات بغیر سند کے نہیں کرتے۔ زیر نظر کتاب میں ص ۵۰ پر استدراک کے عنوان سے خود مؤلف نے جو اقتباس دیا ہے وہ آفتا آمد دلیل آفتاب، کے مصداق ہے۔ پروفیسر عطاء الرحمان عطا کا۔۔۔۔؟ کا مضمون جو ایوان اردو دہلی کے شمارہ ستمبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا اس مضمون میں فاضل مؤلف کے مطالعے کی داد دی گئی تھی۔ میں اکثر سوچتا ہو کہ یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالے نہیں لکھوائے جا۔ چاہئیں اور اگر مقالے لکھوانے ہی ہیں تو انھیں تحقیقی نہیں تعارفی مقالوں کا نام دینا چاہیے۔ تحقیق ایک صبر آزما بلکہ جان لیوا کام ہے اور صرا ان لوگوں کو زیب دیتا ہے جو اس کام کو خورد و نوش سے بھی زیادہ اہم سمجھیں۔

میں تو سمجھتا ہوں ایک کتاب کا مطالعہ بجائے خود ایک تحقیقی نوعیت کا کام ہے کالی داس گپتا رضا الفضلہ کہتے ہوں گے کاو کاو سخت جا ہائے تنہائی نہ پوچھ۔

O O O

اکبر حیدرآبادی

دیوار کے پیچھے

رنگ برنگے نقش
صنوبر اور دیودار کے پیڑ کے اندر سے
رعنائی کے پھول کھلاتے جاتے ہیں
سائبان میں دھوپ کے
اپنا روپ جگاتے جاتے ہیں

یہ سب دین ہے سورج کی
(بھیک نہیں یہ سندرتا کی)
دین ہے ان داتا کی
جب وہ اپنے ہاتھ کھینچ لے
جھولی اپنی خالی کر کے
رخصت ہو جائے
پھر سب اجلے منظر
اک دیوار کے پیچھے
(اپنے منھ پر کالک مل کے)
اندھیاروں کا جشن مناتے رہ جائیں گے
ہاتھ میں لے کر اک دوجے کا ہاتھ

تسخیر

سر اٹھا کر چل رہی ہے آج پھر میری انا
آج پھر میرے مقابل
آئینے ہی آئینے ہیں
آج پھر میرا وجود
پھیل کر اک بے کراں میدان میں
جذب کرتا جا رہا ہے
بے کراں میدان کا سارا وجود

اٹوٹ اکائی

پت جھڑ نے
مرے آنگن میں
ڈھیر لگا دی سوکھے پتوں کی
لوٹ لی کس نے ان کی خوشبو؟
ان کے رنگ پھیکے؟
ان کی نزاکت
ان کی لطافت
ان کے روپ کجیلے
اک دوجے میں جذب ہو گئی جاں ان کی
اک دوجے میں ڈوب گئی
پہچان ان کی

اک دوجے کی چھایا بن کر
اک دوجے کا انگ بن کر
ایک ہوئے
جیتے جی تو الگ الگ تھے
مر کر ایک ہوئے

خسارہ

وقت کے ہاون دستے میں
عمر عزیز کے کتنے پر اسرار درخشاں لمحے
چکنا چور ہوئے
کتنے چراغ تمنا کے
بے نور ہوئے

ڈوبا سورج پھر سے ابھر بھی جاتا ہے
خزاں رسیدہ شاخ نکھر بھی جاتی ہے
عمر گریزاں کے گہنائے روشن لمحے
گہنائے ہی رہتے ہیں

راشد آزر

لے آئے وہی خواب

جینے کا ہر اک شخص کا ہوتا ہے اک انداز
ہم نے بھی اک انداز سے دن اپنے گزارے
جن خوابوں کو سینے سے لگائے رہے برسوں
ہم ان کے لیے مرتے بھی، جیتے بھی رہے ہیں

لیکن یہ ہمارا المیّہ ہے کہ ہم نے
سمجھا تھا جنھیں روح کی تسکین کا ساماں
خود ان کو بھلا بیٹھے مصیبت کی گھڑی میں
اور دن جو پھرے اپنے تو سب شرم و حیا چھوڑ
پہنچ آئے تھے اک عالم عسرت میں جنھیں ہم
لے آئے وہی خواب کباڑی کی دکاں سے

دوستی کی حد

معلوم ہے ہمیں کہ یہ دنیا کی ریت ہے
تنہا جہاں میں آئے تھے، تنہا ہی جائیں گے

کچھ دوستی کی حد بھی ہے، مجبوریاں بھی ہیں
کیا اپنے ساتھ کوئی لحد میں بھی جائے:
اتنا ہی دوستوں نے کیا تو بہت کیا
آئے، سپردِ خاک کیا، اور چلے گئے

○ ○ ○

دو ہسپانوی نظمیں

رفائیل البرٹی

ترجمہ: سید خالد قادری

ابد

ابد کیا ہے؟
ایک بہتی ہوئی ندی
ایک مسلسل بھاگتا ہوا گھوڑا
یا ایک بھٹکی ہوئی فاختہ کی کوک

جب ہم چل پڑتے ہیں
آخری سفر پر
ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر
تب ---- ہوائیں آتی ہیں
اور ہمارے کان اور ہماری آنکھیں کھول کر
ہمیں دکھاتی ہیں
کائنات کے اسرار

آج جب میں بھی چل پڑا
سب کو پیچھے چھوڑ کر
اس بہتی ندی کے کنارے کنارے
میرے آگے ہے ---- ایک مسلسل بھاگتا ہوا گھوڑا
اور پیچھے ----
ایک بھٹکی ہوئی فاختہ کی کوک

اب تیز ہواؤں کی سرسراہٹ
جیسے مجھ سے سرگوشیاں کرتی ہے
ابد ---- ایک بہتی ہوئی ندی ہے
ایک مسلسل بھاگتا ہوا گھوڑا
ایک بھٹکی ہوئی فاختہ کی کوک

انتونیو مچاڈا

ترجمہ: سید خالد قادری

زمین برہنہ ہے

زمین برہنہ ہے
اور روح ---- زرد افق کی طرف سر اٹھائے
کسی مادہ بھیڑیے کی مانند
ماتم کناں ---- ایسے میں
اے گم نام شاعر!
تو کسے ڈھونڈ رہا ہے؟

راستے دل پر بوجھ
مضمحل بوجھل قدم
برفیلی ہواؤں میں ٹھٹھرتی رات
ازلی دوریاں
اور منزلیں ---- ناقابل تسخیر

وہاں دور پہاڑوں پر کھڑے
سیاہ ننگے درختوں کے آسیب
ان کے عقب میں سونا ہے ---- اور انسانی خون
ایسے میں ---- اے گم نام شاعر!
مردہ سورج کے اطراف
تو کسے ڈھونڈ رہا ہے؟

○ ○ ○

افتخار عارف

○

کوئی مژدہ نہ بشارت نہ دعا چاہتی ہے
روز اک تازہ خبر خلقِ خدا چاہتی ہے

موجِ خوں سر سے گزرتی تھی سو وہ بھی گزری
اور کیا کوچۂ قاتل کی ہوا چاہتی ہے

شہرِ بے مہر میں لب بستہ غلاموں کی قطار
نئے آئینِ اسیری کی بنا چاہتی ہے

کوئی بولے کہ نہ بولے قدم اٹھیں نہ اٹھیں
وہ جو اک دل میں ہے دیوار اٹھا چاہتی ہے

ہم بھی لبیک کہیں اور فسانہ بن جائیں
کوئی آواز سرِ کوہ ندا چاہتی ہے

یہی لو تھی کہ الجھتی رہی ہر رات کے ساتھ
اب کے خود اپنی ہواؤں میں بجھا چاہتی ہے

عہدِ آسودگیٔ جاں میں بھی تھا جاں سے عزیز
وہ قلم بھی مرے دشمن کی انا چاہتی ہے

بہر پامالیٔ گل آئی ہے اور موجِ خزاں
گفتگو میں روشِ بادِ صبا چاہتی ہے

خاک کو ہمسر مہتاب کیا رات کی رات
خلق اب بھی وہی نقشِ کفِ پا چاہتی ہے

○

ہم نہ ہوئے تو کوئی افق مہتاب نہیں دیکھے
ایسی نیند اڑے گی پھر کوئی خواب نہیں دیکھے

نرمی اور مٹھاس میں ڈوبا بھی مہذب لہ
تلخ ہوا تو محفل کے آداب نہیں دیکھے

پیشِ لفظ سے اختتام تک پڑھنے والا قار
جس میں ہم تحریر ہیں بس وہی باب نہیں دیکھے

لہو رلاتے، خاک اڑاتے موسم کی سفاک
دیکھتے ہیں کب تک یہ شہر گلاب نہیں دیکھے

بپھرے ہوئے دریا کو ہوا کا ایک اشارہ کافی
کوئی گھر، کوئی بھی گھر سیلاب نہیں دیکھے

بے معنی بے مصرف عمر کی آخری شام کا آنسو
ایک سبب دیکھے گا سب اسباب نہیں دیکھے گا

ایک ہجرت اور ایک مسلسل دربدری کا قصہ
سب تعبیریں دیکھیں گے کوئی خواب نہیں دیکھے گا

مصطفیٰ شہاب

○

عکس کو دیکھ کے لگتا ہے کمی ہے مجھ میں
آئینہ کہتا ہے موجود سبھی ہے مجھ میں
روشنی ، تجھ کو بھی درپیش ہے اک اور سفر
دور تک جائے گی جو آگ لگی ہے مجھ میں
پھر نہ ہو مجھ کو ترے ترک تعلق پہ ملال
پھر اچانک کوئی دیوار گری ہے مجھ میں
ہم کو نفرت سے سروکار نہیں ، پھر بھی یہ رنگ
کبھی تجھ میں ہے نمایاں تو کبھی ہے مجھ میں
صبح تک جانے کہاں مجھ کو اڑا کر لے جائے
ایک آندھی جو سرِ شام چلی ہے مجھ میں
رات کا خوف ہے اور دن سے گریزاں ہوں شہاب
نفی ہر لحظہ کسی لمحے نے کی ہے مجھ میں

○

من جو بھیتر دیکھ رہا ہے
ڈوب کے ساگر دیکھ رہا ہے
کشتی میں گھر جانے والے
دیکھ ، سمندر دیکھ رہا ہے
بول رہی ہے خاموشی بھی
آئینہ گر دیکھ رہا ہے
میں اپنے گھر میں بے گھر ہوں
اور بھرا گھر دیکھ رہا ہے
ٹوٹ رہی ہے ڈور ہوا کی
شعلہ اٹھ کر دیکھ رہا ہے

○ ○ ○

صلاح الدین نیر

سب جانتے ہیں صاحبِ دستار کون تھا
کل تک یہاں قبیلے کا سردار کون تھا

درباری سازشوں میں حکومت چلی گئی
سب ہم سے پوچھتے ہیں کہ حق دار کون تھا

جس کی دعا سے ٹل گئیں ساری مصیبتیں
بستی میں ایسا صاحبِ کردار کون تھا

ملبے میں دب کے رہ گئے بستی کے سارے لوگ
سب پارسا اگر تھے گنہ گار کون تھا

پھرتے ہیں سارے لوگ مجاہد بنے ہوئے
یہ تو بتائیے کہ سردار کون تھا

مزدوری کی تو دستِ ہنر کٹ کے رہ گئے
خلعت ملی ہے کس کو سزاوار کون تھا

وحشت پسند کہہ تو دیا یہ بتائیے
لاشوں کا شہر شہر خریدار کون تھا

سہمے ہوئے سے لوگ ہیں نیر کہیں بھی کیا
معلوم سب کو ہے پسِ دیوار کون تھا

رکھا نہ کہیں کا ہمیں آئینہ گری نے
مجبور کیا آپ سے جب خوش نظری نے

وہ جس نے ہمیں دی تھی اجالوں کی بشارت
وہ چہرہ دکھایا ہی نہیں دیدہ وری نے

آئے نہ نظر، دستِ کرم چومنے والے
ہر ایک کو دیکھا یہاں دریوزہ گری نے

کیا جانیے کتنوں کا بھرم کھول دیا ہے
دروازے پہ دستک کی طرح بے خبری نے

ہم جیسے فقیروں کے ہوئے ہاتھ بھی خالی
جب کاسۂ غم چھین لیا دربدری نے

برسوں کی مسافت ہوئی جب طے تو بتایا
شائستہ نظر مجھ کو تری ہم سفری نے

اس شخص سے کھل کر نہ ہوئی گفتگو نیر
ہم کو تو کہیں کا نہ رکھا معتبری نے

○ ○ ○

ڈاکٹر محبوب راہی

○

نہ ذکر خیر نہ کار ثواب کرتا ہوں
منافقت سے مگر اجتناب کرتا ہوں

سوال کرتا ہوں تیرے سوال پر اک اور
جواب دے کے تجھے لاجواب کرتا ہوں

خیال سادہ کو پہنا کے شعر کا ملبوس
حقیقتوں کو بدلتا ہوں خواب کرتا ہوں

اندھیرے دیکھیں کہاں جاکے منہ چھپاتے ہیں
کہ ذرے ذرے کو اب آفتاب کرتا ہوں

تمام دنیا مخاطب ہے میری ویسے تو
اگرچہ خود سے بہ ظاہر خطاب کرتا ہوں

دکھائی دیتا ہے ہرسو دھواں دھواں راہی
حیات رفتہ کا جب احتساب کرتا ہوں

○ ○ ○

فاطمہ تاج

تسلیوں سے بہے جارہے ہیں اشک الم
نہ اب ہے جبر تمنا نہ کوئی مشق ستم

تمام اہل خرد کو تلاش کرنا ہے
چھپاکے وشت نے رکھے ہیں کچھ جنوں کے قدم

نہ جانے کون سی وحشت میں ہم نکل آئے
صدائیں دیتے رہے ہم کو پاسبان حرم

ہر ایک سانس بھی آزار ہی لگی ہم کو
ہمارے دل میں رکھے جب بھی آرزو نے قدم

دریدہ دامن دل تاج کیسے پھیلائیں
اب امتحان کے قابل نہیں ہیں دست کرم

○ ○ ○

آصف فرخی

درخت کا ڈر

یہاں کوئی درخت کٹتا ہے؟ انھوں نے گلی میں گھستے ہی پوچھا۔

اب یہ بات بھی نہیں کہ اس گلی میں وہ بہت دنوں کے بعد آئے ہوں۔ ہر دسویں پندرھویں ان کا ہمارے ہاں پھیرا لگتا ہی تھا۔ ہمارے گھر آتے جاتے انھوں نے اس درخت کو دیکھا تو ضرور ہوگا۔ اتفاقی طور پر نظر پڑ گئی ہوگی، ورنہ وہ درخت اتنا نمایاں نہیں تھا کہ نظریں اس کی طرف اٹھ جائیں۔ درخت بھی وہ ایسا کون سا غیر معمولی تھا۔ یوں ہی خدا جانے کس قسم کا تھا۔ گلی کے اتنے حصے میں روشنی کا راستہ کھل گیا ہوگا اس کے کٹ جانے سے، یا ادر گلی کے مستقل اندھیروں میں فرق پڑا ہوگا جو انھوں نے درخت کے بارے میں پوچھا، یا پھر کسی چیز کے ہٹ جانے سے، شروع میں ایک خالی پن سا محسوس ہوتا ہے۔ بعد میں یہ اس جگہ کی مستقل کیفیت کا جزو بن جاتا ہے اور کوئی اس کے بارے میں سوال نہیں پوچھتا۔

پھر بھی ایسے سوال نہیں کرنے چاہئیں۔ ایک تیز دھار سی پھر ٹہنیاں کاٹنے لگتی ہے۔ اور اس کا جواب بھی سامنے ہی بکھرا ہوا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے، باہر سے کھردرے اندر سے نرم اور ہلکے رنگ کے، شاخیں جن پر پتے ابھی تازہ تھے اور ہوا کے ساتھ اسی طرح ہل رہے تھے جیسے زمین پر گرنے سے پہلے کھڑے درخت پر ہلتے آئے تھے۔ جو شاخیں کٹ کر ذرا آگے گری تھیں، وہ سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کے پہیوں تلے دب کر چچ گئی تھیں اور ان کے پتے ٹوٹ کر آگے تک پھیل گئے تھے۔ سڑک کے روڑے مٹی میں ملے ہوئے اور وہاں جمع ہو جانے والے کوڑے کرکٹ، جیسے پلاسٹک کی خالی تھیلیاں، گھروں سے اڑ کر آنے والے پھٹے ہوئے کاغذوں اور پھینکی جانے والی چیزوں میں شامل ہو گئے تھے۔

اس مکان پر چند دن پہلے ہی سفیدی ہوئی تھی اور وہ ملگجی دیواریں جن کے آدھے آدھے حصے پر سیلن کھایا ہوا لونی لگا ہوا چونا جھڑتا رہتا تھا، مختلف نظر آ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی پتہ چلتا تھا کہ ان کی حالت بدلی ہے۔ گیٹ پر سفید رنگ ہوا تھا اور لیٹر بکس پر سرخ، کیوں کہ لیٹر بکس اصل میں اندر کی طرف تھا اور باہر سے دیکھنے پر صرف ایک شگاف معلوم ہوتا تھا، گھر کے کونے کھدروں میں جمع کوڑا کباڑ پھینکا گیا ہوگا اور اس کا حلیہ درست کیا گیا۔ وہ درخت بھی اس کے ساتھ ساتھ صاف کر دیا گیا۔

وہ درخت اس مکان کے رہنے والے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں تھا۔ پڑوس میں کون رہتا ہے، کیا کرتا ہے، شہر میں اس طرح کے سوالوں میں پڑنے کا وقت کس کے پاس ہے۔ درخت تو آتے جاتے دکھائی دے جاتا تھا۔ اس گھر کے دروازے پر ایک مرتبہ دو لڑکیاں کھیلتی ہوئی نظر آئیں تھیں۔ بڑی، جس کی عمر پانچ سال کے لگ بھگ ہوگی، دبلی تھی اور اس کے سامنے کے دو دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور چھوٹی ڈھائی تین سال کی ہوگی۔ "آؤ کنواں ڈھکن کرتے ہیں" میں نے وہاں سے گزرتے ہوئے بڑی لڑکی کو چھوٹی سے کہتے سنا۔ اس سے پہلے کہ میں آگے نکلتا، ان کا یہ کھیل بھی دیکھ لیا۔ بڑی نے انگوٹھا اور انگلی گول کر کے کہا۔ یہ "کنواں" اور دو انگلیاں اس پر رکھ کر کہا یہ "ڈھکن"۔ پھر وہ دونوں انگلیاں وہاں سے ہٹ گئیں جیسے کنویں کا منھ کھل رہا ہو۔ آہستہ چلنے کے باوجود اتنی دیر میں، میں آگے نکل چکا تھا اور

وہ دونوں لڑکیاں اس درخت کے پیچھے چھپ چکی تھیں جو دیوار کے ساتھ اگا ہوا تھا۔

ایک اور مرتبہ، اس گھر کے دروازے سے میں نے ایک عورت کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ عینک کے چوڑے چوڑے شیشے نقاب کے اوپر تک آ رہے تھے، اور عینک اٹھا کر اس نے آنکھوں کے کونے برقعے کے دامن سے صاف کیے۔ ایک لڑکی اس سے لپٹی ہوئی چل رہی تھی۔ عورت نے ایک ہاتھ اس لڑکی کے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ یہ لڑکی، ان دونوں میں سے نہیں تھی جن کو میں نے اس دن دیکھا تھا۔ یہ لڑکی ان دونوں سے بڑی ہوگی۔ وہ عورت اور وہ لڑکی میرے آگے آگے چل رہے تھے اور میں اپنے گھر آتے ہوئے ان کو دیکھتا رہا۔ میں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا تو وہ دونوں گلی کے دوسرے موڑ سے اب بھی دور تھیں۔

جس دن ہوا کا تیز جھکڑ چلا تھا اس درخت کا ایک موٹا سا ٹہنا ٹوٹ گیا۔ لیکن پوری طرح نہیں ٹوٹا کہ زمین پر گر پڑتا۔ جو حصہ ٹوٹا نہیں تھا اس سے لٹکا رہا، لٹکے لٹکے وہ ہلتا رہا اور بجلی کے تاروں کو چھو گیا۔ ہمیں اس وقت پتہ چلا جب شام کے ساتھ گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ پوری گلی میں بجلی نہیں تھیں۔ ہم کتنی دیر اندھیرے میں بیٹھے رہے۔ اور اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے تھک گئے تو باہر کے اندھیرے میں آگئے۔ زیادہ تر گھروں کے لوگ باہر ہی نکل آئے تھے اور سڑک پر کھڑے تھے۔ ایک طرف کو تین چار آدمی ٹولی بنائے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کی طرف چلا گیا۔

میں نے خود شعلہ نکلتے دیکھا۔ کونے والے مکان کے بخاری صاحب جوش کے ساتھ بول رہے تھے۔ وہ تو خیریت ہو گئی ورنہ ساری گلی میں آگ لگ جاتی۔ کھمبے کے تاروں سے شعلہ نکلا اور تار جل گئے۔ اس درخت کی ٹہنی جو ٹوٹی ہے، وہی ٹکرائی تھی تاروں سے اور ایک تار سے ہوتی ہوئی آگ دور تک چلی گئی۔ سرکٹ شارٹ ہو گیا۔

گلی کے لوگ باتیں کرنے لگے کہ اس حادثے سے ان سب کے گھر جل سکتے تھے اور اب انھیں کچھ کرنا چاہیے۔ اس مکان کا کوئی آدمی وہاں موجود نہیں تھا۔

ان لوگوں کو خبر تو کرنی چاہیے ---- کسی نے تجویز پیش کی۔

خود تو اندھیرے سے نکلے نہیں۔ ان کی وجہ سے کتنا بڑا حادثہ ہو سکتا تھا ---- ایک آواز آئی۔

گلی کے سب لوگوں کو چل کر ان سے بات کرنی چاہیے۔ کوئی اور بولا:

"بجلی والے کہہ رہے ہیں کہ یہ مستقل خطرہ ہے۔ شاخیں تاروں سے الجھتی ہیں اور ان کی وجہ سے آگ لگ سکتی ہے۔" کسی نے تفصیل بتائی۔

"ان کو یہ درخت کٹوانا پڑے گا۔" یہ کس نے کہا، میں دیکھ نہیں سکا۔ کیوں کہ میں مڑ کر درخت کی طرف دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں لپٹا ہوا وہ درخت خاموش کھڑا تھا۔ جیسے سر جھکائے ان کا فیصلہ سن رہا ہو۔ سامنے بڑی سڑک سے گزرنے والی کسی گاڑی کی تیز بتی پڑی تو ایک دم سے مجھے ایسا لگا کہ وہ چپ چاپ کھڑا ہوا درخت نہیں ہے، کوئی آدمی ہے۔ سبز آدمی جس کو بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہے اور اس کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہے۔ صرف ایک لمحے کے لیے۔ وہ گاڑی گزر گئی، روشنی بجھ گئی اور درخت اپنی پچھلی شکل پر لوٹ آیا۔

ٹوٹے ہوئے تار بھی جوڑ دیے گئے اور ذرا دیر بعد بجلی بحال ہو گئی۔

اس کے بعد میں نے اس درخت کی طرف خاص طور سے دیکھنے کا اہتمام بھی نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اس شام گھر واپس آتے ہوئے حسن صاحب کی گاڑی میں بروزانہ واپس آیا کرتا تھا۔ انھوں نے میری توجہ اس خالی جگہ کی طرف مبذول کروائی جہاں سے اس درخت کو کاٹ دیا گیا تھا۔ وہاں اب دھوپ بھری ہوئی تھی۔ میں نے یاد کرنا چاہا کہ وہ کون سا درخت تھا، اس کے پتے کیسے تھے، اس کی شاخیں کیسی تھیں، ایک عام سے درخت کی عام سی تصویر کے سوا ذہن میں کچھ نہ آیا۔ لیکن اس کے بعد رات گئے تک ایک ہرا بھرا سا اندھیرا ذہن میں بھر تا رہا، دور کے ایک درخت کے پتے جھڑ رہے تھے۔

اس درخت کے پوری طرح یاد نہ آنے پر اس درخت کا دھیان آیا جسے میں اس سے زیادہ جانتا تھا۔ شہر کے دوسرے درختوں کی طرح وہ کچھ جگہ سے بے جگہ معلوم ہوتا تھا۔ گرومندر والی سڑک پر، جس کا بدلا ہوا پورا نام سہیلی والی مسجد کبھی میری زبان پر نہ چڑھ سکا، چوراہے سے پہلے جس طرف پھولوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ ان کے عین سامنے، میں اس کا پتہ یوں بتا سکتا ہوں کہ جیسے شہر کی کسی عمارت یا مقام کا پتہ بتایا جاتا ہے۔ فٹ پاتھ پر جہاں اس کی جڑیں ہیں، وہاں سے سیمنٹ میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور جڑوں کے زور سے اتنا حصہ اوپر اٹھ گیا ہے۔ فٹ پاتھ کے دوسری طرف جنگلے کے اندر جو چھوٹا سا پارک ہے، اس میں چند ایک درخت تو ضرور ہیں، مگر شہر کے دوسرے پارکوں کی طرح اس میں مالش کرنے والے، شرط لگا کر تاش کھیلنے والے اور کالج سے بھاگے ہوئے لڑکے یا اس قسم کے لوگ جمع رہتے تھے۔ درختوں کی چھاؤں بھی چھدری سی ہے۔ پھر وہاں کون جائے۔

جن دنوں میں یونیورسٹی جاتا تھا، یونیورسٹی کی بس کے انتظار میں وہیں کھڑا ہوتا تھا، اس درخت کے سائے میں گنے کا رس بیچنے والا بھی ٹھیلا لگاتا تھا۔ وہ گنے کا رس بیچنے والا تو کہیں ادھر ادھر ہو گیا، اب پولیس کی ایک گاڑی کھڑی رہتی ہے جس کے کھلے ہوئے پچھلے حصے میں پولیس کے سپاہی دن بھر سگریٹ پیتے رہتے ہیں، تاش کھیلتے رہتے ہیں اور سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کو روک کر ان کی تلاشی لیتے ہیں۔

بہت دن نہیں ہوئے کہ وہ درخت میرے روز کے معمول کا حصہ تھا۔ اب ادھر سے میرا گزر نہیں ہوتا۔

اس وقت بیٹھے بٹھائے بے وجہ وہ درخت یاد آیا تو ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا کہ پچھلے وقت سے نکل کر کوئی ہرا بھرا آدمی آیا ہے اور مجھے آوازیں دے رہا ہے۔ میں ڈر کے مارے کانپ گیا۔

میں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو زبردستی روکا۔ یہ ڈر کاہے کا ہے؟

یہ اس درخت کا ڈر ہے، مجھے اندازہ ہوا، یہ اس درخت سے ڈر نہیں ہے جو مجھے یاد آیا ہے اس درخت کے لیے ڈر ہے۔

اس درخت کی جڑیں مقررہ حد بندی سے بڑھ کر فٹ پاتھ کے اندر تک پیوست ہیں۔ اس کے پتے سڑک پر گرے رہتے ہیں، اس درخت میں کسی ہرے بھرے آدمی کی جھلک دیکھ کر پولیس کے سپاہی اسے کاٹ نہ ڈالیں۔ انھیں کون روکے گا، کس کو خبر ہوگی۔

میں اسی بات سے تو ڈرا ہوا ہوں کہ شہر کے درخت خبر اس وقت بنتے ہیں جب کٹنے لگتے ہیں۔

○ ○ ○

ظہیر الغنی

بوڑھا مسافر

بوڑھا مسافر کافی پی رہا تھا۔ کافی کی پیالی کو تہذیب یافتہ لوگوں کی طرح انگوٹھے سے نہیں بلکہ دہقانوں کی طرح پورے ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گویا وہ کافی پینے کے ساتھ ساتھ اس کی گرمی کو بھی پیالی کے لمس سے اپنی ہتھیلی کے ذریعے اپنے جسم میں منتقل کر لینا چاہتا تھا۔ بوڑھے مسافر کے سامنے بیٹھی، ہوٹل کے مالک کی خوب صورت جوان سکریٹری نے اس بات کو نوٹ کیا مگر اسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ غریب بوڑھا ہر سال ایک ہفتے کے لیے آکر ہوٹل میں ٹھہرتا ہے۔ کم کرائے کے کمرے میں رہتا ہے اور خاموشی سے ایک معمولی آدمی کی طرح ایک ہفتہ قیام کر کے چلا جاتا ہے۔ اس کا لباس بھی معمولی آدمیوں کا سا تھا اور کل ملا کر اس کی شخصیت ایک معمولی بلکہ غریب آدمی کی لگتی تھی۔ اس سے زیادہ کسی مسافر کے متعلق اسے جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ غریب آدمی اگر دہقانوں کی طرح کافی کی پیالی کو پکڑے تو تعجب کی کیا بات ہے؟

ہمیشہ کی طرح اس سال بھی وہ آیا اور ایک معمولی کمرہ کرائے پر لے لیا۔ اتفاق سے مسافر زیادہ آگئے اور کمرے کم پڑ گئے۔ ہوٹل کے منیجر نے اس مسکین صورت مسافر کو اس معمولی کمرے سے بھی ہٹا کر کونے میں ایک ایسے کمرے میں منتقل کر دیا جو بہت چھوٹا تھا اور سنٹرل ایر کنڈیشن کے لیے لگائے ہوئے پائپ اس کمرے میں سے گزرتے تھے۔ ان پائپوں سے نکلنے والی گرمی سے کمرہ اور بھی گرم ہو گیا تھا۔ بے چارہ بغیر کسی احتجاج کے اس کمرے میں چلا گیا مگر دو تین گھنٹے میں ہی اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے کراہنے کی آواز جب باہر تک سنائی دی تو ادھر سے گزرنے والے ایک بیرے نے ہوٹل کے منیجر کو اطلاع دی۔ ہوٹل کے مالک کی سکریٹری باربرا بھی اس وقت کسی کام سے منیجر کے پاس آئی تھی۔ مالک کے تئیں اس کی وفاداری کا تقاضا تھا کہ ہوٹل میں کوئی غیر معمولی بات ہو تو اس کے متعلق پوری جانکاری رکھے اس لیے وہ بھی منیجر کے ساتھ اس بوڑھے کے کمرے میں گئی۔ وہاں جا کر دیکھا تو کمرہ تنور کی طرح تپ رہا تھا اور بوڑھے مسافر کو سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ ایر کنڈیشن کی وجہ سے کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ باربرا نے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ ڈاکٹر بلوا بھیجا اور آکسیجن سلنڈر کا انتظام بھی کر دیا۔ غرض اس کی بیمار داری کی پوری ذمے داری اپنے سر لے لی۔ مالک کے تئیں اس کی وفاداری کا تقاضا اتنا تو نہ تھا۔ ایک بوڑھے غریب مسافر پر اسے ترس آگیا تھا۔

جب مسافر کو ذرا ہوش آگیا تو ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق اسے ہسپتال لے جانے کا سوال اٹھا۔ بوڑھے مسافر نے اپنی کم زور مگر فیصلہ کن آواز میں کہا کہ وہ ہسپتال نہیں جائے گا۔ اس کی بیمار داری کے لیے ایک نرس کو بلایا جائے۔ نرس کو بلانے کا خرچہ بہت ہوگا۔ یہ غریب اتنا خرچ برداشت نہیں کر پائے گا۔ منیجر اور ہوٹل کا اسٹاف اسی کشمکش و پیچ میں تھے کہ باربرا نے منیجر سے کہا "تم نرس کو بلالو۔ میں مالک سے کہہ کر ایک دن رات کا خرچہ ہوٹل کی طرف سے دلوا دوں گی۔ آگے کے لیے دیکھا جائے گا۔"

اگلے دن جب کچھ افاقہ ہوا تو بوڑھے مسافر نے منیجر کو بلا کر شکریہ ادا کیا اور دریافت کیا کہ نرس کو کتنے دن کے لیے بلایا گیا ہے اور کتنا خرچہ ہوگا۔ پھر اس نے ایک سادہ کاغذ پر اپنے بینک کے منیجر کے نام ایک رقعے کے ذریعے کچھ رقم ہوٹل کو ادا کرنے کا آرڈر لکھ دیا۔ رقم اتنی

ں کہ نرس کے تین دن کے خرچے کے علاوہ کچھ رقم فاضل بھی بچ رہے تاکہ دوائیں منگوائی جاسکیں۔

یہ عجیب آدمی ہے۔ اس کے پاس چیک بک بھی نہیں یہ بنک کے نام ایک رقعہ کیا کاغذ کے پرزے پر رقم ادا کرنے کا آرڈر لکھ رہا ہے۔ ہوٹل کے منیجر نے خاموشی سے وہ کاغذ کا پرزہ لے لیا اور سیدھا ہوٹل کے اکاؤنٹس آفیسر کے پاس گیا۔ اکاؤنٹس آفیسر کے لیے بھی یہ تجربہ الا تھا۔ اس نے بنک کے منیجر کو ٹرنک کال کر کے کہا کہ فلاں صاحب نے اتنی رقم کا رقعہ بنک منیجر کے نام لکھ دیا ہے۔ کیا یہ رقم وصول جائے گی۔ بنک منیجر نے بلا توقف کہا کہ ہاں ان صاحب کا چیک یا سادہ کاغذ کا پرزہ بھی بلا کھٹکے کیش ہو جائے گا۔ وہ کون ہے، اس کے ؤنٹ میں کتنا روپیہ ہے، یہ پوچھنا مناسب نہ تھا۔ اگر وہ پوچھتا بھی تو اس کا جواب نہ ملتا۔ بنک والے کسی کھاتے کی خبر کسی غیر کو نہیں تے۔

اس دوران بار برا روز صبح و شام دونوں وقت بوڑھے مسافر کی عیادت کو آتی رہی۔ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر اس کا دل بہلاتی ر نرس کو زیادہ توجہ سے تیمار داری کرنے کو کہتی۔ بار برا کے دل میں بوڑھے سے ہمدردی اب محبت میں بدلتی جارہی تھی۔ ادھر بوڑھا ر برا کا احسان مند تھا اور اس کی احسان مندی محبت میں بدلتی جارہی تھی۔

تیسرے دن جب بار برا بوڑھے مسافر کی عیادت کو آئی تو اسے ہشاش بشاش پایا۔ بوڑھے نے کہا کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ س کی ضرورت نہیں۔ بار برا کو ایک گونہ تسلی ہوئی کیوں کہ اس کو بھی فکر تھی کہ نرس کا خرچہ بے چارے غریب کی حیثیت سے جتنی جلدی بار ختم ہو، اتنا ہی اچھا ہے۔ پھر بوڑھے مسافر نے نرس کا بہت شکریہ ادا کیا، اس کی خدمت کو سراہا اور اسے رخصت کر دیا۔

نرس کے جانے کے بعد اس نے بار برا کی ہمدردی کی تعریف کرنا شروع کر دی اور شکر گزاری کے الفاظ دوہراتا رہا۔ ازراہِ احسان ندی اس نے بار برا سے کہا "مس! تم نے میرے لیے اتنی تکلیف اٹھائی ہے۔ تمھاری تیمار داری کی وجہ سے ہی میں اتنی جلدی صحت یاب سکا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمھاری دعوت کروں۔ کیا آج شام کو ڈنر پر تم میرا ساتھ دو گی۔ میں کہیں باہر نہیں جاسکتا۔ اسی ہوٹل کے ڈائننگ م میں ڈنر کے لیے ایک ٹیبل ریزرو کرادو۔"

بار برا کے لیے بوڑھے کی کسی خواہش کو نامنظور کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ اس نے فی الفور کہا "بہتر ہے" وہ یہ بھول گئی کہ آج رات کو ر کے لیے ہوٹل کے منیجر چارلس سے وعدہ کر چکی ہے۔ ویسے بھی آج کی رات اس کے اور چارلس کے لیے بہت اہم تھی۔ کل سے ہوٹل سرے مالکوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ دوسرے مالکوں کا نام صیغہ راز میں تھا۔ بہرحال معلوم نہیں، نئے مالک بار برا اور چارلس کو نوکری ں برقرار رکھیں گے یا نہیں۔ پھر ان دونوں کے حالات کیا ہوں گے؟ نئی ملازمت کے لیے کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔ یہ دونوں پھر کبھی مل ملیں گے یا نہیں۔ یہی سب باتیں کئی روز سے ان دونوں کے درمیان موضوعِ گفتگو بنی رہی تھیں اور آج رات کے ڈنر کو وہ ایک یادگار شام انے والے تھے۔ بوڑھے مسافر کی موجودگی میں وہ سب کچھ بھول گئی۔

بار برا نے جب بوڑھے مسافر کے ساتھ ڈنر کے لیے ایک ٹیبل ریزرو کرانے کے لیے کہا تو چارلس بہت برہم ہوا۔

"آج رات کو تم نے میرے ساتھ ڈنر کے لیے وعدہ کیا تھا!"

"او چارلس! میں تو بالکل بھول گئی۔ بوڑھے مسافر کی مسکین صورت دیکھ کر اتنا ترس آتا ہے کہ بے چارے کی کسی خواہش سے انکار کرنا

ناممکن ہو جاتا ہے۔"

"ہاں ایسا ہی ہوتا ہے، خیر جانے دو۔ چارلس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں یہ کہا اور منہ پھیر لیا۔ آج ہوٹل کی نوکری کا آخری دن تھا پھر بھی ڈیوٹی تو پوری کرنا ہی تھی۔ نئے مالک کے دو ڈائرکٹر آج صبح آچکے تھے اور ہوٹل میں ٹھہرے تھے تاکہ ہوٹل کے حالات اور ملازمین کی کارکردگی کو خود دیکھ لیں۔ انھیں کے فیصلے پر اس کی نوکری کے باقی رہنے کا دارومدار تھا۔ اس کی خاطر مدارات اور ہوٹل کے نظام میں کسی طرح کی کمی نہ رہ جائے۔ آج غم جاناں کے لیے فرصت نہیں تھی۔

بار برا نے آگے بڑھ کر چارلس کو چوم لیا۔ بولی:

"ڈنر کے بعد میں تمھارے ساتھ چلوں گی۔ رات بھر باتیں کریں گے۔"

"اب تم مجھ پر ترس کھا رہی ہو؟"

"نہیں، وعدہ خلافی کے لیے شرمندہ ہوں اور جرمانہ ادا کر رہی ہوں" پھر کچھ یاد کر کے بولی "وہ بوڑھا عجیب آدمی ہے۔ یہ ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ڈنر کھانا چاہتا ہے۔ شاید اسے اندازہ نہیں کہ بل کتنا ہوگا۔ تم ایسا کرنا کہ ڈنر کا بل کینفے میریا کے ریٹ پر بنوا دینا۔ باقی رقم میں دے دوں گی۔"

چارلس کا موڈ بار برا کے بوسے اور رات کو ساتھ چلنے کے وعدے سے ٹھیک ہو گیا تھا۔ بولا "یہ تو ترس سے کچھ زیادہ ہے۔ کوئی اور چیز ہے۔"

ڈنر کے میز پر بار برا نے بوڑھے البرٹ سے کہا۔ آپ کی طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔ تبھی تو آپ کافی کی پیالی کی گرمی اپنی ہتھیلی کے ذریعے اپنے جسم میں لے لینا چاہتے ہیں۔"

بوڑھا البرٹ مسکرایا۔ بولا "مس! دراصل یہ دیہاتی عادت مجھے ٹنڈرا کے علاقے میں پڑ گئی تھی۔ وہاں اتنی سردی پڑتی ہے کہ گرمی کے کسی سوتے کو ضائع نہیں کیا جا سکتا"

آپ ٹنڈرا میں بھی رہ چکے ہیں۔ وہاں کیسے جانا ہوا؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے" بوڑھے البرٹ نے کہا۔

"میں وہاں سونے کی کان کی تلاش میں گیا تھا۔ میں اور میرا دوست جیمس۔ وہ تو ہٹا کٹا آدمی تھا۔ مگر میں وہاں کی سردی برداشت نہیں کر سکا۔ بیمار پڑ گیا"

"تب تو آپ کو بہت نقصان ہوا ہوگا آپ کے دوست نے سونے کی کان پر قبضہ کر لیا ہوگا" بار برا نے کہا۔

"نہیں مس! دنیا میں اچھے آدمیوں کی کمی نہیں ہے" البرٹ نے بتایا "جیمس مجھے بے ہوشی کے عالم میں ہسپتال لے گیا۔ وہاں سے ہسپتال بھی دو سو میل کی دوری پر تھا اور سواری بھی عام طور پر نہیں ملتی تھی۔ بڑی مشکل سے جیمس نے مجھے ہسپتال لے جانے کا انتظام کیا۔ میرے علاج اور بیمارداری کا انتظام کر کے وہ کام پر واپس آگیا اور کان کی کھدوائی کا کام شروع کیا۔ جب اس کے پاس سے کوئی خبر نہیں آئی تو میں بھی یہی سمجھا تھا کہ اس نے مجھے چلتا کر کے سارے کاروبار پر خود قبضہ کر لیا مجھے اچھا ہونے میں تین سال لگ گئے۔ جب میری طبیعت بہتر

ہوئی اور کچھ جان میں جان آئی تو قرض ادھار کر کے میں پھر وہاں پہنچا۔ میرے دل میں شک تو پہلے ہی سے تھا۔ وہاں پہنچا تو لوگوں نے بتایا کہ کان تو بہت اچھی چل پڑی ہے اور انھوں نے مالک جیمس کی بہت تعریف کی۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میں بھی اس کان میں برابر کا حصے دار ہوں۔ میں غصے میں بھرا ہوا جیمس کے پاس پہنچا۔ مجھے دیکھ کر وہ باغ باغ ہو گیا، مجھے سینے سے لپٹا لیا۔ مگر میں اس کی یہ سب باتیں مصنوعی سمجھا۔ اس کو بہت برا بھلا کہا۔ جتنی گالیاں مجھے آتی تھیں سب دے ڈالیں۔ لیکن وہ ہنستا رہا۔ پھر اس نے کہا "اچھا بیٹھو تو سہی۔ ذرا دم لے لو۔ ابھی تمھاری سب شکایتیں دور ہو جائیں گی" میں بھی گالیاں دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ تھوڑی دیر دم لینے کو بیٹھ گیا۔

بوڑھے البرٹ کو یہ کہانی سنانے میں مزہ آ رہا تھا۔ گزرے ہوئے لمحے پھر اس کی یاد میں تازہ ہو رہے تھے۔

"پھر وہ مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر اپنے وکیل کے پاس لے گیا۔"

البرٹ نے کہانی بیان کرنا جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وکیل کو میں پہچانتا تھا۔ جب ہم نے کام شروع کیا تھا تو اسی کو اپنا وکیل مقرر کیا تھا۔ اس وقت ہم دونوں نے الگ الگ وصیت نامے لکھ دیے تھے کہ ایک حصے دار مر جائے تو دوسرا اس کے حصے کا مالک ہو جائے گا۔ ہم نے احتیاط کے طور پر اسی وکیل کے مشورے سے یہ وصیت نامے لکھے تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے جیتے جی اس وصیت نامے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ سونے کی کان کا تنہا مالک بن بیٹھے گا۔ میں نے وکیل کو بھی بہت برا بھلا کہا۔ وکیل ہنستا رہا۔ اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک اور دستاویز نکالی جو جیمس نے حال ہی میں لکھوائی تھی۔ اس کے مطابق اس نے ان کاغذات کو رد کر دیا تھا جن کے ذریعے اس نے اپنی تنہا ملکیت درج کرائی تھی اور پہلے کی طرح ہم دونوں کی مشترکہ ملکیت قائم کرا دی تھی۔ وکیل نے بنک کی ایک پاس بک بھی نکالی جس میں پچھلے دو سال سے میرے نام میں روپیہ جمع کرتا رہا تھا۔ اب تک اس میں دس ملین ڈالر جمع ہو چکے تھے مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب حقیقت ہے کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ وکیل نے مجھے سمجھایا کہ جب میں بیمار ہو کر ہسپتال چلا گیا تو سرکاری اور کاروباری کاغذات پر میرے دستخط ناممکن ہو گئے۔ کان سے سونا نکلنے سے پہلے ہی کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔ اس مجبوری کی وجہ سے میرے وصیت نامے کو استعمال کر کے سرکاری ریکارڈ میں جیمس تنہا مالک بن گیا اس کے من میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ وہ ہر سال منافع کی رقم کا آدھا حصہ میرے نام بنک میں جمع کر دیتا تھا اور پاس بک وکیل کے پاس رکھتا تھا۔ جب میری صحت یابی کی خبر اسے ملی تو اس نے پچھلی دستاویز کو رد کر کے نئی دستاویز لکھ دی اور سرکاری ریکارڈ میں بھی میرا نام درج کرا دیا۔"

باربرا یہ کہانی حیرانی سے سن رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ اگر یہ دیوانے کا خواب نہیں ہے اور بوڑھا سچ بول رہا ہے تو اس نے ڈنر کے بل کو کینے میں ریسٹورنٹ پر بتانے کے لیے کہہ کر بڑی غلطی کی۔ بیماری کے دوران اس نے بوڑھے کو غریب مسکین سمجھ کر جو کام کیے وہ تو خیر پردۂ راز میں رہیں گے لیکن یہ بل تو ویٹر ابھی لائے گا اور یہ بوڑھا فراست سمجھ جائے گا۔ اتنا دولت مند تو عالی شان ہوٹلوں کے ڈائننگ روم میں ڈنر کے دام بھی جانتا ہو گا۔ کوئی اس پر ترس کھائے یہ اس کو برا لگے گا۔

اپنے دل کو اطمینان دلانے کے لیے اس نے کہا "مسٹر البرٹ اب تو ہر سال آپ مانٹریل سے آتے ہیں۔ کیا اب سونے کی کان پر نہیں جاتے؟"

"کبھی کبھی چلا جاتا ہوں۔ مانٹریل میں دوسرے کاروبار ہیں۔ اس کی دیکھ بھال میں خود کرتا ہوں۔ میں نے ان کاروباروں میں

جیمس کو برابر کا حصہ دے رکھا ہے۔"

بار برا کی حیرت ہر لمحے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے کرسی کو چھو کر دیکھا، آیا وہ جاگ رہی ہے یا خواب میں پریوں کی کہانی سن رہی ہے

اتنے میں اس کی نظر چارلس پر پڑی جو اپنی ڈیوٹی کے آخری دن ڈائننگ روم پر ایک نظر ڈالنے آیا تھا کہ سب انتظام ٹھیک ہو اور مہمانوں کی سروس میں کوئی کسر نہ رہ جائے بار برا نے زور زور سے ہاتھ ہلا کر اسے بلایا۔ بوڑھے مسافر سے اس نے کہا "مسٹر البرٹ! یہ تو بڑی مبہوت کر دینے والی کہانی ہے۔ چارلس کو بھی سننے کے لیے بلا لیتی ہوں۔"

چارلس میز کے قریب پہنچ گیا تو بولی "چارلس! مسٹر البرٹ کی یہ کہانی سنو۔ تم نے آج تک پریوں کی بھی ایسی کہانی نہیں سنی ہوگی۔"

چارلس کرسی پر بیٹھ گیا تو بولی "چارلس! تمھیں معلوم ہے۔ مسٹر البرٹ منڈرا میں سونے کی کان کے مالک ہیں اور مانٹریل میں ان کے دوسرے کاروبار بھی ہیں۔"   البرٹ سے مخاطب ہو کر "اچھا مسٹر البرٹ، آپ کے دوسرے کاروبار کیا ہیں؟"

"ایک کارخانہ، دو تین جہاز ہیں، تین چار ہوٹل ہیں" البرٹ نے کہا۔

"ہوٹل؟" بار برا اور چارلس بہ یک وقت حیرت کے ساتھ بول اٹھے۔ تین چار ہوٹلوں کا مالک اس خاکساری کے ساتھ ان کے عالی شان ہوٹل میں ایک معمولی آدمی کی طرح ٹھہرتا ہے اور یہ کسی طور یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ اتنا بڑا آدمی ہے۔

البرٹ مسکرایا اور بولا "اب کہانی یہاں تک پہنچ گئی ہے تو یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں کہ کل اس ہوٹل کا معاملہ بھی طے ہو جائے گا

اتنے میں وہ دونوں ڈائرکٹر جو آج صبح آئے تھے اور بہت شان دار کمروں میں ٹھہرائے گئے تھے ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ مالک کی ہدایت پر چارلس اور بار برا نے ان کی بہت آؤ بھگت کی تھی اور ان کی خاطر مدارات کا خاص اہتمام کیا تھا۔ چارلس کے پوچھنے پر بھی انھوں نے مالک کا نام نہیں بتایا تھا۔ کہا تھا کہ کل ملکیت ٹرانسفر ہونے کے وقت معلوم ہو جائے گا۔

ب ان کو آتا دیکھ کر چارلس اور بار برا کھڑے ہو گئے۔ ان کو کرسیاں پیش کیں۔ البرٹ بیٹھا رہا۔ ان کی خیریت دریافت کی اور گفتگو شروع ہوئی۔ ان کا لہجہ بے حد مؤدبانہ تھا۔ بار برا کو یقین ہو گیا کہ مسکین صورت بوڑھے کی کہانی خواب نہیں حقیقت ہے۔

(ارتھر ہیلی کے ناول "ہوٹل" سے ماخوذ)

* * *

(سلسلہ ص ۱۵ سے آگے)

رہی۔ "غالب" پر ان کا مطبوعہ ڈرامہ ہند و پاک کے ڈرامائی ادب میں اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ پاکستان میں انھوں نے ریڈیو اور ٹی وی کے لیے متعدد اعلیٰ معیار کے ڈرامے لکھے۔ نذیر محمد خاں نے عبدالحفیظ پیرزادہ کی انگریزی کتاب "قائد اعظم محمد علی جناح" کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ نذیر محمد خاں مرحوم کے ڈراموں کے مجموعے کی اشاعت عمل میں آئے تو ان کی یاد کو زندہ رکھنے کا موجب ہوگا اور صحیح معنوں میں ایک باشعور اور حساس فن کار کو خراج عقیدت ہوگا۔

○ ○ ○

وقار خلیل

ادارے کی خبریں

ادارے کا معائنہ:

جناب یوسف ناظم (بمبئی) نے ۱۰/ فروری ۱۹۹۶ء کو ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور اپنے تاثرات سپرد قلم کرتے ہوئے لکھا کہ ادارۂ ادبیات اردو میں اپنی حاضری پر مجھے ناز اس لیے ہے کہ میں اس ادارے کے بانی مبانی ڈاکٹر زور کا شاگرد رہا ہوں۔ اس زمانے میں بھی میں یہاں آیا تھا جب میں مرحوم کا شاگرد تھا اور اس کے بعد بھی، جب میری پہلی تصنیف "کیف و کم" ادارا ہذا سے چھپی تھی۔ لیکن آج یہاں آکر میری آنکھیں جو کبھی نہ کسی دن بند ہونے والی ہیں کھل گئیں، ادارے کے میوزیم کا مطالعہ میں نے شاید اس سے پہلے نہیں کیا تھا۔ میں واقعی حیرت زدہ رہ گیا اور مجھے ادارے کے معتمد عمومی پروفیسر مغنی تبسم کے غیر معمولی سلیقے، لگن بلکہ محنت شاقہ کا قائل ہونا پڑا اس ادارے کو انھوں نے اپنی مسلسل حاضری اور توجہ سے نئی زندگی سے آشنا کر دیا ہے۔"

فرانسیسی اسکالر گائی۔ دے والنس اور ان کی بیگم بھی اپنی ریسرچ کے سلسلے میں ادارہ آئیں اور ادارے کے معائنے کے بعد اپنی خوشنودی کا یوں اظہار کیا:

Many thanks for the very nice welcome we had. and for showing us some treasures of this library. We do hope to find some interesting material for our thesis on European physicians in 17th. and 18th centurie.s India

Mr. GUY DE VALENCE 18th Februry 1996.

and Mrs. FRANOISE DE VALENCE.

جناب فاروقی نازکی (سری نگر، کشمیر) نے ۲۹/ فروری ۱۹۹۶ء کو ادارے کے معائنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ادارۂ ادبیات اردو کے ساتھ دیرینہ عقیدت رہی ہے، اس کے بانی ڈاکٹر زور میرے استاد تھے۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ یہ ادارہ ترقی کے منازل طے کر رہا ہے اور ہر اعتبار سے فعال ہے۔ اللہ اس ادارے کو بلندیاں عطا کرے اور اردو کی خدمت کا جذبہ کارکنان کے دلوں میں ہمیشہ موجزن رہے۔

جناب عابد صدیقی نیوز ایڈیٹر دوردرشن (حیدرآباد): عرصے بعد جناب فاروقی نازکی کے ہمراہ "ایوانِ اردو" میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ میوزیم، لائبریری اور مخطوطات کے شعبوں کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی، علمی سرمائے کو جس سلیقے سے محفوظ رکھا گیا ہے، وہ قابل قدر

ہے۔(۲۹-۲-۱۹۹۶ء)

دیوان سید صولت حسین صاحب سجادہ نشین و نبیرۂ حضور غریب نواز اجمیر، ادارہ تشریف لائے۔ انھوں نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کیے: "مختصر وقت میں ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبوں خصوصاً مخطوطات کو دیکھنے کا موقع ملا، قرآن شریف کے ایک مخطوطے نے بے حد متاثر کیا۔ پہلی مرتبہ اس انداز میں قرآن شریف لکھا ہوا دیکھا۔ بے انتہا مسرت ہوئی۔ انشاء اللہ کسی موقعے پر سکون سے پورا وقت لے کر اس ادارے کے علمی خدمات کا تجزیہ کروں گا۔(۲۶/ مارچ ۱۹۹۶ء)

عزت مآب جناب خورشید عالم خاں (گورنر کرناٹک) نے یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے افتتاح سے قبل ادارے کا معائنہ کیا اور اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا: "آج ادارۂ ادبیات اردو کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، بہت مفید اور اچھا کام ہو رہا ہے، خدا آپ لوگوں کے کاموں میں برکت دے اور آپ کو اپنے مقاصد میں کامیابی ہو"(۳۱/ مارچ ۱۹۹۶ء)

پروفیسر عبدالودود اظہر (دہلوی) جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی نے ادارے کے مختلف شعبوں کے کام کا تفصیل سے جائزہ لیا اور اس رائے کا اظہار کیا "ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبے اس ادارے کی بقا کے ضامن ہیں اور ترقی کے امکانات کے لیے نئے نئے پروگراموں کے منتظر بھی۔ کتب خانہ، درس و تدریس، خطاطی، میوزیم، مجلہ "سب رس" سب ہی دوبارہ نئی تبدیلیوں کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔"(۱۶ مئی ۱۹۹۶ء)

امتحانات ادارۂ ادبیات اردو:

ادارے کے امتحانات اردو ماہر، اردو عالم اور اردو فاضل ۱۱/ مئی ۱۹۹۶ء سے ۱۴/ مئی ۱۹۹۶ء تک حیدرآباد کے مرکز اردو ہال حمایت نگر کے علاوہ اضلاع کے مندرجہ ذیل (۱۷) مراکز پر ایک ساتھ منعقد ہوئے:

بودھن (شکر نگر)، بوچم پاڈ پراجکٹ، نیکمال، سرپور کاغذ نگر، سنگاریڈی، شمس آباد، عادل آباد، کاماریڈی، کرنول، کریم نگر، مدورمنڈل (ورنگل)، محبوب نگر، میدک، نظام آباد، نلگنڈہ اور اتر پردیش کے دو متعلقہ جات۔ ان امتحانات میں جملہ ذکور و اناث کی تعداد (865) رہی۔

نتائج امتحانات اردو دانی، زبان دانی اور انشاء:

ادارۂ ادبیات اردو اور عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام ۲/ جون کو منعقدہ اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو انشا کے امتحانات شہر حیدرآباد کے ۵۹ مراکز کے علاوہ اضلاع کے ۸۰ مراکز پر ایک ساتھ منعقد ہوئے۔ جن میں پندرہ ہزار سے زائد طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ امتحان میں غیر اردو داں لڑکے اور لڑکیوں کی معتد بہ تعداد شریک تھی جملہ کامیاب طلبہ کا فی صد ۹۳.۸ رہا۔ شہر حیدرآباد سے جملہ ۱۲۶۷۸ درخواستیں وصول ہوئیں اور ۱۰۱۵۳ طلبہ و طالبات امتحان میں شریک ہوئے جن میں سے ۹۶۳۶ طلبہ و طالبات کو کامیاب قرار دیا گیا۔ اس طرح شہر حیدرآباد میں کامیابی کا فی صد ۹۴.۹ رہا۔ حیدرآباد میں دو سوچے مراکز میں یہ امتحانات منعقد کیے گئے جن میں سے دو بڑے مراکز المدینہ انسٹیٹیوٹ چھاؤنی ناد علی بیگ سے ۴۲۲ طلبہ و طالبات اور محبوبیہ اسلامک اسکول و ہیرپورہ میں ۲۴۳ طلبہ و طالبات نے ان امتحانوں میں شرکت کی۔ اضلاع سے ۳۰۱۵ درخواستیں وصول ہوئیں جن میں سے ۲۵۹۱ شریک امتحان رہے اور ۲۳۲۱ طلبہ و طالبات کو کامیاب قرار دیا گیا۔

کامیابی کافی صد ۸۹.۵ رہا۔ گریڈوں کے ۵۰ مراکز میں بارہ سو سے زائد طلبہ و طالبات امتحان میں شریک ہوئے۔ ہمکنڈہ میں انجمن فلاح المسلمین کے مرکز سے ۲۶۸ طلبہ و طالبات اور محبوب نگر کے اسٹار پرائمری اسکول مرکز میں دو سو سے زائد طلبہ و طالبات شریک امتحان رہے۔

ایوانِ اردو میں علی سردار جعفری کا توسیعی لکچر:

۱۳/ مارچ ۱۹۹۶ء کو ایوانِ اردو میں نامور دانش ور جناب علی سردار جعفری نے "اقبال کا فردوسِ خیال" کے زیرِ عنوان توسیعی لکچر دیا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کی۔ ابتداً پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ نے جناب جعفری کا تعارف کرواتے ہوئے ادارے کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر جعفر نظام نے معزز مہمان کا خیر مقدم کیا۔ جناب علی سردار جعفری نے اپنے پر مغز خطبے میں اقبال کی اردو، فارسی شاعری اور ان کے خطبات کے حوالے سے فکرِ اقبال پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ جناب جعفری نے اشتراکیت کے بارے میں اقبال کے خیالات کا جائزہ لیا انھوں نے بتایا کہ اقبال کی فکر کے بعد مابعد الطبعیاتی تصورات ابھی تک ناقابلِ فہم ہیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے جناب جعفری کی اقبال شناسی کو خراجِ تحسین ادا کیا۔

شعبۂ خواتین ادارہ کا اجلاس:

"شعبۂ خواتین" ادارۂ ادبیاتِ اردو (پنجہ گٹہ) کا ادبی اجلاس زیرِ صدارت پروفیسر اشرف رفیع ایوانِ اردو پنجہ گٹہ میں ۱۹/ جون کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر اختر سلطانہ کا مضمون "قرۃ العین حیدر تحریروں کے آئینے میں" اور محترمہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ کی شعری تخلیقات تبصرے کے لیے پیش کی گئیں۔ محترمہ قمر جمالی جوائنٹ سکریٹری شعبۂ خواتین نے اجلاس کی کارروائی چلائی۔ آغاز میں پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ، جنرل سکریٹری شعبۂ خواتین نے جناب رضا وصفی، جناب احمد جلیس، جناب اکمل حیدرآبادی، جناب یسین علی خاں اور محترمہ زبیدہ یزدانی صاحبہ کے انتقال پر ملال پر تعزیتی قرار داد منظور کی اور مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور ارکان خاندان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔ محترمہ اختر سلطانہ نے اپنا مضمون "قرۃ العین حیدر تحریروں کے آئینے میں" پیش کیا جو ان کے Ph.d کے مقالے "قرۃ العین حیدر فن و شخصیت" کا ایک حصہ ہے۔ بعد ازاں محترمہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ نے چار مختلف النوع نظمیں مختلف عنوانات کے تحت پیش کیں۔ پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے دونوں تخلیقات پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر سید حسن اور محترمہ فاطمہ عالم علی خاں صاحبہ نے بھی تبصرے میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر اشرف رفیع نے صدارتی خطبے میں محترمہ اختر سلطانہ کے مضمون کے لہجے اور اس کی زبان کی ستائش کی اور کہا کہ قرۃ العین حیدر جیسی پیچیدہ دل چسپ اور عالمانہ شخصیت کا محاسبہ محدود الفاظ اور محدود گنجائش میں کرنا امر مشکل ہے لیکن اختر سلطانہ نے یہ کر دکھایا۔ انھوں نے کہا کہ محترمہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ نے شعری میدان میں صنف نظم کو اپنایا اور اس کی ناز برداریاں سہہ رہی ہیں جو ایک صحت مند رجحان ہے۔ آخر میں قمر جمالی کے شکریے پر محفل برخواست ہوئی۔

○ ○ ○

نتائج امتحاناتِ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" منعقدہ مئی ۱۹۹۶ء

اردو ماہر: درجہ اول بلحاظ رول نمبر ۲، ۱۹، ۰ ... ۴۱، ۳۵ درجہ دوم: ۱، ۳، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳/۱، ۲۱ تا ۲۵، ۲۸ تا ۳۴
۳۶ تا ۳۹، ۴۳ تا ۴۴، ۴۶، ۴۷ تا ۵۱، ۵۶ تا ۶۱، ۶۶ تا ۶۸، ۷۰، ۱۰۳، ۱۱۱ تا ۱۱۳، ۱۲۳ درجہ سوم: ۹، ۲۷، ۳۵

اردو عالم: درجہ اول بلحاظ رول نمبر: ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۵۹، ۲۶۰، ۳۰۲، ۳۱۷، ۳۲۷، ۳۳۱، ۳۳۳، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۵ تا ۳۵۲،
۳۵۴، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳ ۴۲۲ تا ۴۲۵، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۴۵، ۴۵۲، ۴۶۰، ۹۷۷، ۹۸۲ درجہ دوم: ۲۰۱ تا ۲۰۴، ۲۰۶،
۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۴، ۲۱۵/۱، ۲۲۱ تا ۲۲۴، ۲۲۶ تا ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۴۶، ۲۵۰، ۲۵۸، ۲۵۸/۱، ۲۵۹، ۲۵۹/۱، ۲۶۲،
۲۶۳، ۲۸۲ تا ۲۹۵، ۲۹۷، ۳۰۱، ۳۱۳ تا ۳۱۶، ۳۲۰ تا ۳۲۳، ۳۲۵، ۳۲۸، ۳۳۲، ۳۳۴، ۳۳۶ تا ۳۳۸، ۳۴۱ تا ۳۴۴
۳۵۳، ۳۵۵ تا ۳۵۸، ۳۶۳ تا ۳۶۸، ۳۸۲، ۳۸۵، ۳۸۷، ۳۹۱، ۳۹۳ تا ۳۹۵، ۳۹۸، ۴۰۳/۱، ۴۱۱ تا ۴۱۵، ۴۱۷،
۴۱۹، ۴۲۱، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۷، ۴۳۰ تا ۴۳۲، ۴۳۴، ۴۳۶، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۵۸، ۹۷۹ تا ۹۸۱ درجہ سوم: ۲۸۱، ۲۸۴، ۲۸۳
۴۴۳، ۴۵۲، ۴۵۹، تکمیل: ۲۱۶ تا ۲۱۸، ۲۳۳ تا ۲۳۵، ۲۵۱ تا ۲۵۳، ۲۷۶، ۲۷۹، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۶۵/۱، ۴۶۶،
۴۶۹ تا ۴۷۸ — **اردو فاضل بلحاظ مراکز:** لودھن: درجہ دوم: ۴۸۱، ۴۸۴ تا ۴۸۷،
۴۸۹ تا ۴۹۴، ۶۴۵ تا ۶۵۳ درجہ سوم ۴۹۵ تا ۴۹۷، ۶۵۰ تکمیل: ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۹۸
کامیاب پارٹ I ۴۹۹ تا ۵۰۲؛ پوچم پاڈ پراجکٹ: ۵۰۵، درجہ سوم ۵۰۳، ۵۰۴، ۶۵۴، ۶۵۶
کامیاب پارٹ I ۵۰۶ تا ۵۱۸؛ ٹیکلمال: درجہ دوم: ۵۱۹، ۵۲۱، ۵۲۲ درجہ سوم ۵۲۰، ۶۵۸، ۶۵۹ تکمیل ۵۲۳، ۵۲۴
کامیاب پارٹ I ۵۲۵ تا ۵۲۸ سولپور (کاغذنگر): درجہ دوم ۵۲۹ تا ۵۳۵، ۶۶۰، کامیاب پارٹ I ۵۳۶، ۵۳۷
سنگاریڈی درجہ دوم ۶۶۳ درجہ سوم ۵۳۸ تا ۵۴۱، ۶۶۱، ۶۶۲ تکمیل: ۵۴۲، ۵۴۳ کامیاب پارٹ I ۵۴۵ تا ۵۴۹
شمس آباد: درجہ دوم: ۵۵۰، ۵۵۱، ۶۶۴، ۶۶۵ کامیاب پارٹ I ۵۵۲ تا ۵۵۸ کاماریڈی: درجہ دوم ۵۶۵، ۵۷۰
کامیاب پارٹ I ۵۶۶ تا ۵۶۹، ۵۷۱، ۵۷۵ کرنول: درجہ دوم ۵۷۴ تا ۵۸۱، ۵۸۹ تا ۵۹۶، ۵۹۸ درجہ سوم ۵۹۷ پارٹ I ۵۸۲ تا ۵۸۸
کودیم نگر: درجہ دوم: ۵۹۹، ۶۰۳ تا ۶۰۵، ۶۰۷ تا ۶۱۲ درجہ سوم: ۶۰۶ مدور منڈل: درجہ دوم ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۶
درجہ سوم: ۶۱۵، تکمیل ۶۱۷ تا ۶۲۱ محبوب نگر: درجہ دوم: ۶۲۳ تا ۶۲۶، ۶۲۸، ۶۳۰ تا ۶۳۷، ۶۳۹ درجہ سوم: ۶۲۷، ۶۲۹
۶۳۸، تکمیل ۶۲۲، ۶۳۳، ۶۴۰ کامیاب پارٹ I ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۲ نلگنڈہ درجہ دوم: ۶۴۳ درجہ سوم: ۶۴۵، ۶۴۶ تکمیل ۶۴۴
کامیاب پارٹ I ۶۴۹ نارائن پیٹھ: درجہ دوم ۶۰۹ تا ۶۱۴، ۶۲۲ تا ۶۲۵، ۶۲۵/۱ تکمیل: ۶۱۵ کامیاب پارٹ I ۶۱۶ تا ۶۲۱
نظام آباد: درجہ دوم: ۶۲۶ تا ۶۳۰، ۶۳۲ کامیاب پارٹ I ۶۳۳ تا ۶۴۱ میدک: درجہ دوم: ۶۰۳ تا ۶۰۸
حیدرآباد، ذکور: درجہ دوم: ۷۱۵، ۷۱۸، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۴ تا ۷۳۶، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۴ تا
۷۵۶، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۱ تا ۷۹۶ درجہ سوم: ۷۳۹، ۷۴۳، ۷۹۷ تکمیل ۷۵۸ تا ۷۶۰، ۷۶۳، ۷۶۵، ۷۶۷ تا ۷۷۰
۷۹۰ کامیاب پارٹ I ۷۷۱، ۷۷۳، ۷۷۶ تا ۷۷۸، ۷۸۲، ۷۸۷ اناث: درجہ اول: ۸۸۰ درجہ دوم: ۸۰۰ تا ۸۰۴، ۸۰۶ تا
۸۰۷، ۸۰۹، ۸۱۱، ۸۱۳ تا ۸۱۵، ۸۱۹ تا ۸۲۱، ۸۲۷، ۸۲۹، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۹، ۸۴۱، ۸۶۱، ۸۷۷/۱، ۸۷۹، ۸۸۱
۸۸۳، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۸، ۸۸۹ درجہ سوم: ۸۱۷، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۴۲، ۸۷۷ تکمیل: ۸۲۵، ۸۳۱، ۸۴۵
۸۴۷، ۸۴۹، ۸۵۱، ۸۵۳، ۸۵۵، ۸۷۸ کامیاب پارٹ I ۸۵۶ تا ۸۶۰، ۸۶۲ تا ۸۷۳، ۸۷۵، ۸۷۶

وقار خلیل

وفیات

نسیم حجازی: اسلامی کرداروں کے تناظر میں اردو میں عہد جدید کے اہم ادیب نسیم حجازی نے اپنے ناولوں کے ذریعے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی تھی۔ ۳/ مارچ ۱۹۹۶ء کو مقبول عوام ناول نویس، صحافی اور ادیب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوا۔ راشد الخیری اور صادق سردھنوی کے ساتھ نسیم حجازی کے تاریخی ناول مقبولیت کی معراج کمال کو پہنچے۔ مرحوم کی علمی خدمات تادیر یاد رکھی جائیں گی۔

نذیر بنارسی: ممتاز شاعر نذیر بنارسی طویل علالت کے بعد ۸۷ سال کی عمر میں بہ مقام بنارس ۲۴/ مارچ ۱۹۹۶ء کو انتقال کر گئے۔ نذیر مرحوم ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار اور ملی جلی تہذیب کی علامت تھے۔ ان کے والد کا نام نور محمد تھا۔ وہ ۲۵/ نومبر ۱۹۰۹ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ حکومت ہند نے ان کی شعری خدمات کے اعتراف میں پدم شری ایوارڈ عطا کیا تھا جسے نذیر مرحوم نے قبول نہیں کیا۔ چار شعری مجموعے چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی ایک نظم "صبح بنارس" بہت مشہور ہوئی۔ حکومت اتر پردیش اور دیگر علمی و شعری اداروں سے نذیر بنارسی کو ادبی اعزازات بھی ملے۔ وہ اپنے کلام اور مخصوص ترنم کی وجہ سے مشاعروں کے کامیاب شاعر بھی رہے۔ زندگی کے آخری لمحے تک وہ فرقہ پرستی کے خلاف صف آرا رہے اور کبھی کسی مفاد کی خاطر اپنے اصولوں سے ایک قدم ہٹنا گوارا نہیں کیا۔

نواب میر لیسین علی خاں: میر لیسین علی خاں ۲۹/ اپریل ۱۹۹۶ء کو تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں بہ مقام لندن انتقال کر گئے۔ آپ کے والد نواب میر حسن علی خاں حیدرآباد کے جاگیردار اور شریف خاندان کے فرد تھے۔ لیسین علی خاں مرحوم نے ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں حاصل کی۔ پھر جامعہ عثمانیہ سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ ریاست حیدرآباد کے محکمہ انکم ٹیکس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوئے اور اپنے افراد خاندان کے ساتھ لندن منتقل ہوئے۔ قیام لندن کے زمانے میں بھی آپ نے حیدرآباد دکن کی شعری و ادبی روایات کو تابندہ رکھا۔ انھیں بچپن ہی سے شعر و ادب سے لگاؤ رہا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نیاز فتح پوری کے مشہور ادبی رسالہ نگار کے "داغ نمبر" کی ترتیب میں آپ نے بھرپور معاونت کی تھی اور داغ کے حیدرآبادی تلامذہ پر اہم مواد فراہم کیا تھا۔

نواب میر لیسین علی خاں کے روابط ادارۂ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زورؔ سے گہرے اور استوار تھے۔ ادارے کے کتب خانے کے لیے آپ نے سینکڑوں کتابیں اور نادر مخطوطات تحفتہً عطا کر کے اہم خدمت انجام دی۔ ماہنامہ "سب رس" میں عہد محبوبیہ اور عہد عثمانی کے شعراء پر آپ کے مضامین بھی شائع ہوئے اور شعری تخلیقات بھی چھپ کر مقبول ہوئیں۔ آپ کی شریک حیات محترمہ زبیدہ یزدانی بھی آپ کی وفات کے بعد رحلت کر گئیں پس ماندگان میں دو صاحب زادے ہیں، جو لندن میں مقیم ہیں۔

احمد جلیس: ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے سرکردہ عہدے دار، ادیب، صحافی اور استاد ادبیات اردو احمد جلیس ڈپٹی ڈائرکٹر دوردرشن کیندر بنگلور کا ۹/ مئی ۱۹۹۶ء کی شام قلب پر شدید حملے کے سبب بنگلور میں انتقال ہوا۔ دوسرے دن حیدرآباد میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ جلیس مرحوم عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے تھے۔ ممتاز کالج اور انوار العلوم کالج میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کارگزار رہے، پھر آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے اور اپنی علمی اور فنی صلاحیتوں کے سبب ترقی کے مدارج طے کیے۔

بھائی سے اہد ذوق، ڈرامہ نگاری، خاکہ نویسی اور اداکاری سے دل چسپی رہی، صحافتی رپورٹنگ میں انھیں خاصی مہارت حاصل
مزاح کے کالم نویس بھی رہے۔ روزنامہ "منصف" میں ان کا کالم شائع ہوتا رہا۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے برسوں ایک مستقل
چھوٹی باتیں" نشر کرتے رہے۔ احمد جلیس بزرگ سخن ور علامہ حیرت بدایونی کے فرزند اور محترمہ جیلانی بانو کے بھائی تھے۔ اا.
کے نثری مضامین مرتب کرکے شائع کیے جائیں تو ایک ذہین اور باصلاحیت قلم کار کو بھرپور خراج عقیدت ہوگا۔

حیدرآبادی: میر صادق علی اکمل حیدرآبادی کا ۱۱/ مئی ۱۹۹۶ء کو حیدرآباد میں بہ عارضہ قلب انتقال ہوا۔ اکمل جوان فکر اور
مزاج شاعر تھے۔ شکیل بدایونی کے شاگرد تھے۔ برسوں بمبئی میں قیام رہا۔ شکیلہ بانو بھوپالی کے ساتھ اکمل مرحوم نے امیر خسرو اور فن
پر ایک مبسوط کتاب مرتب کی تھی جسے شمع بک ڈپو دہلی نے شائع کیا ہے۔
اکمل نظم اور غزل کے نئے رجحانات کے حامل خوش فکر شاعر تھے۔

نوری: سید بہاء الدین شاہ نوری طویل علالت کے بعد ۲۹/ مئی ۱۹۹۶ء کو رحلت کر گئے۔ وہ روزنامہ "انگارے" اور سلیمان اریب
مشہور ادبی ماہنامہ "صبا" سے منسلک رہے۔ ان کی صحافتی خدمات کا کرائم رپورٹرس اسوسی ایشن کی طرف سے اعتراف کیا گیا تھا اور ایوارڈ
دیا گیا تھا۔ شاہ نوری منکسر المزاج اور مخلص اردو دوست تھے۔

محترمہ زبیدہ یزدانی: محترمہ زبیدہ یزدانی سابق پروفیسر شعبہ، تاریخ ویمنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی کا ۱۱/ جون ۱۹۹۶ء کو لندن میں
سال کی عمر میں انتقال ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

زبیدہ صاحبہ پدم بھوشن ڈاکٹر غلام یزدانی کی بڑی صاحب زادی اور نواب میر یسین علی خاں کی شریک حیات تھیں۔ وہ آکسفورڈ
یونیورسٹی کی فارغ التحصیل تھیں۔ ان کا شمار ممتاز مؤرخین میں ہوتا ہے۔ زبیدہ صاحبہ نے خواتین کی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر "دیستان
عالیہ" کی بنیاد رکھی تھی۔ آج یہ درس گاہ حیدرآبادی خواتین اور طالبات کے لیے مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔
محترمہ زبیدہ یزدانی نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "توبۃ النصوح" کا انگریزی ترجمہ شائع کیا تھا، جسے خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔
دو معرکۃ الآرا انگریزی تصانیف "رسل برگیڈ" اور "دی لاسٹ نظام" ہیں، یہ کتابیں علی الترتیب آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی سے شائع
ہوئیں۔

زبیدہ صاحبہ تقریباً بیس سال سے اپنے بچوں کے ساتھ لندن میں مقیم تھیں۔ حیدرآبادی ادب، ثقافت اور تاریخ پر آپ کے انگریزی
مغربی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔

نذیر محمد خاں: برصغیر ہند و پاک کے نام ور حیدرآبادی ڈرامہ نگار ادیب نذیر محمد خاں ۱۹/ جون ۱۹۹۶ء کی شب کراچی پاکستان میں بہ
عارضہ قلب انتقال کر گئے۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کیا تھا۔ کچھ عرصہ اکاؤنٹنٹ جنرل آفس میں کارگزار رہے اور پھر کراچی
منتقل ہوگئے۔ تین سال قبل نذیر محمد خاں صاحب مختصر قیام کے لیے حیدرآباد آئے تھے اور ادارۂ ادبیات اردو کا بھی معائنہ کیا تھا۔ مرحوم
وسیع المطالعہ اور زندگی کی جانب فلسفیانہ رویہ رکھنے والے دانش ور قلم کار تھے۔ ان کے ڈرامے دکن ریڈیو اور پھر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد
سے نشر ہوتے رہے اور عوام میں مقبولیت کے حامل رہے۔ اردو کے ریڈیائی ڈراموں کی تاریخ میں نذیر محمد خاں کو کل ہند شہرت حاصل
(آگے ص ۵۰ پر)

بیادگار سید محی الدین قادری زور
فون: 310469
اجراء ۱۹۳۸ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد ۵۸ اگست ۱۹۹۶ء شمارہ ۸

فی پرچہ	۱۰ روپے	مشرق وسطیٰ اور امریکہ	۲۵ ڈالر
زرسالانہ	۱۰۰ روپے	پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	۱۵ ڈالر
کتب خانوں سے	۱۲۵ روپے	انگلستان	۱۵ پونڈ

ناشر: ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۸۲

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے بی ایس۔ ایس ... میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات ... سے شائع کیا (کمپیوٹر کتابت: شارپ کمپیوٹرس)

فہرست مضامین

پہلی بات

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے نعرے اگرچہ فرسودہ ہو چلے ہیں لیکن اردو تنقید آج بھی ان کی اسیر ہے۔ ادب برائے ادب بے معنی فقرہ ہے۔ جب کہ ادب برائے زندگی کا نعرہ مغالطہ خیز اور گمراہ کن ہے۔ یہ ادب اور زندگی میں دوئی پیدا کرتا ہے۔ اس سے ادب کی قائم بالذات حیثیت کی نفی ہوتی ہے اور وہ غیر ادبی مقاصد کے حصول کا محض ایک ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ادب زندگی کی عکاسی، ترجمانی یا رہنمائی نہیں کرتا بلکہ ادب خود زندگی ہوتا ہے جسے ادیب تخلیق کرتا ہے۔ یہ تخلیق زبان میں ہوتی ہے زبان سے باہر نہیں۔ ادبی تخلیق میں ہم جن تجربات و مشاہدات، احساسات اور جذبات سے گزرتے ہیں وہ زبان ہی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ادب کا مطالعہ کرنا ادب کو بسر کرنا ہے اسے معنی پہنانا نہیں ہے۔ ادبی تخلیق کی معنویت اس کے پورے وجود میں مضمر ہوتی ہے ایک شجر کے مانند۔ شجر محض اس لیے بامعنی نہیں ہے کہ اس کی لکڑی سے ایندھن کا کام لیا جائے یا فرنیچر بنایا جائے یا اس کے سائے میں بیٹھ کر آرام کیا جائے یا اس کے پھل کھائے جائیں یا ماحول کو انسانی زندگی کے لیے ساز گار بنایا جائے۔ شجر کی معنویت ان پر مشتمل ہے نہ ان میں مقید وہ ان سب کے ماورا ہے۔ یہی صورت ادبی تخلیق کی ہے۔ قاری / نقاد کسی ادب پارے کو جو بھی معنی دیتا ہے وہ اس کے معنی نہیں ہوتے۔ ہر تشریح اسے تعین کی قید میں لے آتی ہے۔ اس کے حسن کو محدود کر دیتی ہے تعبیر اور تشریح کے ذریعے ادب پارے کی تحسین ممکن نہیں۔ یہ ایک غور طلب سوال ہے کہ وہ تنقیدی رویے جو تعبیر اور تشریح کو اساس بناتے ہیں کہاں تک مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں؟

مغنی تبسم

ا۔ شمس الرحمن فاروقی

مرزا غالب

مصنفہ: نتالیا پری گارنا

(ترجمہ: اسامہ فاروقی)

نتالیا پری گارنا کی روسی تصنیف "مرزا غالب" کا نہایت سلیس اور دل کش اردو ترجمہ (از اسامہ فاروقی) ہم ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد میں پڑھتے رہے ہیں۔ یہ کتاب کئی لحاظ سے دل چسپی کی حامل ہے۔ اول تو یہ کہ روسی زبان میں یہ غالب کی پہلی مفصل سوانح عمری ہے۔ دوسری غیر ملکی زبانوں میں جو سوانح عمریاں ہیں (مثلاً رسل اور خورشید الاسلام کی Ghalib: Life and Letters) وہ پری گارنا کی کتاب کے مقابلے میں ذرا محدود ہیں۔ کیوں کہ پری گارنا نے اپنی کتاب میں نفسیاتی، سیاسی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ انھیں غالب سے اتنی ہی محبت ہے جتنی شیخ اکرام، رسل اور خورشید الاسلام کو ہے (بلکہ پری گارنا کی عقیدت ان لوگوں سے شاید کچھ بڑھ کر ہی ہوگی)۔ پھر بھی انھوں نے غالب کی عیب پوشی کی ہے نہ عیب جوئی۔ بلکہ سب معاملات کو سیدھے سچے طور پر اپنے نقطۂ نظر سے بیان کر دیا ہے۔ مارکسی [illegible] اور مکتب خیال کی پروردہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے تاریخ کے سلسلے میں مارکسی مصنفین، مثلاً کنور محمد اشرف اور خود مارکس سے [illegible] کی ہے، لیکن وہ ان کی اندھی مقلد نہیں ہیں۔

ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ نتالیا پری گارنا کلاسیکی اردو فارسی کی شعریات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتی ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ شاعری تہذیب کا اظہار ہوتی ہے نہ کہ سماجی حالات کا مشینی، خود کار انعکاس۔ (واضح رہے کہ جدید مارکسی نقادوں خاص کر لوسین گولڈمان Lucien Goldman نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ ادب میں سماجی حالات کا مشینی، خود کار انعکاس ہوتا ہے۔ لیکن آج بھی ہمارے یہاں کے "ترقی پسند" نقاد اس مفروضے کے مؤید معلوم ہوتے ہیں)۔ پری گارنا کو اس بات کا بھی پورا احساس ہے کہ ہمارے یہاں قبل جدید معاشرے میں شاعر کا مقام یہ تھا کہ وہ [illegible] کا ایک کارآمد [illegible] تھا اور اس کا کام تھا شعر کہنا (اس کے برخلاف روایتی سوویت نظام میں بہت سے شاعر اس لیے جیل یا سائبیریا بھیج دیے جاتے تھے کہ وہ کوئی کام نہ کرتے تھے۔) لہٰذا شاعری صناعت تھی اور شاعر صناع ("صناع" بہ معنی اہل حرفہ یا پرولتاری نہیں، جیسا کہ محمد حسن سمجھتے ہیں، بلکہ بہ معنی ماہر شخص)۔ شاعر چونکہ لفظوں کا کام کرتا تھا اس لیے اس کے یہاں مہارت اور ہنرمندی میں حکمت اور عقل بھی شامل ہوتی تھی۔ لہٰذا اگر شاعر قصیدہ لکھ رہا ہے تو وہ جھوٹ کا کاروبار نہیں کر رہا ہے اور نہ ایسا کوئی "ناپاک دفتر" [illegible] رہا ہے جو "عفونت میں سنڈاس سے بدتر ہے۔" وہ محض اپنی مہارت اور حکمت کا اظہار کر رہا ہے تاکہ وہ روزی کما سکے اور دنیا پر اپنے کمال کا سکہ بٹھا سکے۔ پری گارنا کہتی ہیں (باب ۱۳):

> متاخر جاگیردارانہ سماج کے تاریخی حالات میں اور اس سماجی نظام کے آدرشوں اور معیارات اور ادب کی نسبت سے روایت کے مطابق کیے جانے والے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھیں تو یہ نقطۂ نظر بالکل فطری تھا۔ [یعنی "ادبی مشاغل" سے حاصل ہونے والی کمائی کے بارے میں علمی اور غیر رومانی نقطۂ نظر] ادبی پیشے کی ایک نوع کے طور سے قصائد کے

ذریعے رقم کا حصول روایت کے مطابق ایک قابل قبول امر سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ اس بنیاد پر تو بادشاہوں کے لیے تاج بنانے والے سناروں اور زردوزی کے کام کے چوغے سینے والے درزیوں پر بھی.... گھٹیا زمانہ سازی کا الزام عاید کیا جاسکتا ہے۔

جس طرح کلاسکی اردو غزل کی شعریات کو صحیح طور پر بیان کرنے کی پہلی کوشش اس غزل کے پاس داروں اور وارثانے نہیں، بلکہ یک غیر ملکی (اطالوی) ماہر الیساندرو بوسانی Alessandro Bausani ۱۹۲۱ء تا ۱۹۸۸ء) نے کی (ملاحظہ ہوں "اردو غزل" اور غزل" پر اس کے مضامین جو انسائکلو پیڈیا آف اسلام میں شامل ہیں) اسی طرح قصیدے کے بارے میں یہ حقیقت اردو والوں نے نہیں بلکہ پری گارنا نے سب سے پہلے بیان کی ہے کہ قصیدہ جھوٹ کی پوٹ اور ذہنی و روحانی دیوالیہ پن کا مظہر نہیں تھا، بلکہ ایک فن تھا۔ یہ ماہرانہ ر پیشہ ورانہ کارروائی تھی، جس کے اپنے آداب و اصول تھے۔

مجھے پری گارنا سے یہ ضرور کہنا ہے کہ کلاسکی اردو / فارسی قصیدہ اور غزل کی تشکیلی قوت "جاگیردارانہ سماج کے آورشوں اور معیارات اور تاریخی حالات میں نہیں بلکہ ہندو + مسلم اور عرب + ایران تصور کائنات میں تلاش کی جانی چاہیے۔ اور شاعر کا مرتبہ محض سلائی بنائی کرنے والے کاری گر کا نہیں بلکہ لفظوں کے ذریعے "حکمت" بیان کرنے والے اور "کمال" ظاہر کرنے والے کا ہونا چاہیے۔ یوسف حسین کی کتاب Ghalib : The man, the times ۱۹۸۹ء) میں شاعر کے مرتبے کے بارے میں مربیانہ یا اختصاریت پسند Reductionist) نظریے کا اظہار نہیں ہے اور اس ... قابل قدر ہے۔ لیکن کلاسکی اردو شعریات کے بارے میں ورماکی علومات یوسف حسین اور رسل اور اسلام سے بھی کم ہے۔ پھر، وہ فارسی سے نابلد ہیں۔ ان کے برخلاف پری گارنا کو فارسی کا اچھا علم اور وق ہے۔ ور انھوں نے غالب کی نظم و نثر فارسی سے خوب کام لیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ "شاعری کچھ نہیں ہے صرف مصنف کے سوانح حیات یا داخلی کوائف ہیں" کا اصول جس نے رسل اور اسلام کی کتاب Three Mughal Poets کو خراب کیا ہے، اور جو بیسویں صدی کے اوائل سے ہمارے یہاں رائج ہوا، مغرب کی رومانی ور سوانحی تنقید کا ایسا اصول ہے جسے ہم لوگوں نے بہت اختصاریت پسندی (Reductionism) کے ساتھ برتا۔ یہ اصول اب مغرب الے بھی ترک کر چکے ہیں، لیکن اردو میں اس کا چلن اب بھی باقی ہے۔ بجنوری کے یہاں اس کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں اور اکرام نے بھی سے خوب برتا ہے۔ پری گارنا بھی اس کی اسیر معلوم ہوتی ہیں، اگرچہ یہاں ان کا سرچشمہ اردو کے نقاد نہیں بلکہ مارکسی رومانی تنقید ہے۔ س اصول کو بے محابا برتنے کے باعث ہمارے اردو والے غالب کی غزل

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے

و ۱۸۵۷ء کی تباہی پر مرثیہ بتاتے رہے۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ غزل تو ۱۸۲۱ء کی ہے جب انقلاب ۱۸۵۷ء کا نام و نشان نہ تھا، تو ہم گ یہ کہنے لگے کہ شاعری چشم داخل بیں نے ۱۸۵۷ء کا منظر ۱۸۲۱ء ہی میں دیکھ لیا تھا! یا پھر یہ کہ ۱۸۵۷ء نہ سہی ۱۸۲۱ء سہی، لیکن تباہی و ربادی تو میر کے زمانے سے موجود تھی! غالب کی غزل:

درگریہ از بس ناز کی رخ ماندہ برخاکش نگر وآں سینہ سودن از تپش برخاک نم ناکش نگر

کے بارے میں پری گار نا کہتی ہیں (باب ۱۳) کہ یہ غزل:

> غالب نے اس بغاوت کے زمانے ہی میں لکھی ہے۔ غزل میں ایک ایسی عورت کی تصویر کھینچی گئی ہے جو کبھی عالی رتبہ اور تونگر تھی، اور اب اس کے افلاس کے دن آگئے ہیں۔ اسے ناقابلِ یقین اذیتیں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ اس غزل میں واقعات کی طرف واضح اشارے تو شاید نہیں ملتے، لیکن اپنے مضمون کے اعتبار سے اسے غالب کی غزلوں میں "کلیتہً استثنائی مقام حاصل ہے۔

یہاں پہلی گڑبڑ تو یہ ہے کہ یہ غزل ۱۸۴۵ء کے مطبوعہ دیوانِ فارسی میں شامل ہے۔ لہٰذا اس کا کوئی تعلق بغاوت ۱۸۵۷ء سے نہیں۔ دوسری بات یہ کہ مضطر مجاز کا ترجمہ جو اصل متن کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، حسبِ معمول خوب ہے لیکن غزل کے صرف چھ شعر درج ہیں۔ روسی سے ناواقف ہونے کی بنا پر میں یہ معلوم کرنے سے قاصر ہوں کہ نتالیا پری گار نا نے بھی چھ ہی شعر دیے ہیں یا پوری دس شعر کی غزل کا ترجمہ دست یاب نہ ہونے کی وجہ سے چھ ہی شعروں پر اکتفا کی گئی ہے۔ اگر دس کے دس شعر سامنے ہوں تو پری گار نا کا یہ دعویٰ بڑی حد تک غلط ثابت ہوتا ہے کہ غزل میں "ایسی عورت کی تصویر کھینچی گئی ہے جو کبھی عالی رتبہ اور تونگر تھی اور اب اس کے افلاس کے دن آگئے ہیں" وغیرہ۔ تیسری بات یہ کہ غالب نے اپنی غزل نظیری کے جواب میں لکھی ہے۔ نظیری کا مطلع ہے:

چشمش براہے می رود مژگانِ نم ناکش نگر　　　　در سینہ دارد آتشے پیراہنِ چاکش نگر

سات شعر کی یہ غزل بڑی حد تک مسلسل ہے اور اس کا مضمون عمومی طور پر یہ ہے کہ معشوق اب کسی اور پر عاشق ہو گیا ہے اور جس شخص پر وہ عاشق ہوا ہے وہ نظیری (یعنی متکلم، نہ کہ محمد حسین نظیری نیشاپوری شاعر) خود ہے:

وحشی غزالے کز حیا رم در بیاباں می خورد　　　　رام نظیری می شود در ہوش و ادراکش نگر

غالب کی غزل میں بھی یہی بات ہے کہ معشوق کو کسی اور پر عاشق دکھایا ہے۔ جو چار شعر پری گار نا کی کتاب میں محذوف ہیں، ان میں سے دو شعر حسبِ ذیل ہیں:

بر مقدمِ صید افگنے گوشے بر آوازش ببیں　　　　در بازگشتِ توسنے چشمے بہ فتراکش نگر

بہر آستانِ دیگرے در شکر دربانش ببیں　　　　در کوئے از خود کم ترے در رشک خاشاکش نگر

برسبیلِ تذکرہ یہ عرض کر دوں کہ غالب کا "خاشاکش نگر" والا شعر نظیری کی تقریباً پوری غزل پر بھاری ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اس غزل میں کہیں سے بھی اس عورت کی تصویر نہیں آتی جس کا ذکر پری گار نا نے کیا ہے۔ اشعار کو لغوی بیانات سمجھنے کے ہی باعث انھوں نے ایک اور جگہ غالب کے شعر:

اس حلا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد　　　　مالِ سنی کو مباح اور خونِ صوفی کو حلال

سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کی "ستم پیشہ ڈومنی" شیعہ تھی یا تشیع کی طرف مائل تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کسی "الٰہی بخش حاکم احمد خاں" کی کسی تحریر کا حوالہ دیا ہے۔ میرا خیال ہے اہلِ غالب میں شاید ہی کوئی "الٰہی بخش حاکم احمد خاں" یا ان کی تحریر کو جانتا ہو۔ (مجھے تو یہ نام بھی غلط معلوم ہوتا ہے)۔ بہرحال پری گار نا خود لکھتی ہیں کہ الٰہی بخش کی روایتیں قابلِ اعتبار نہیں" اور "یہ بھی ممکن ہے کہ اس

واقعے کا ماخذ محض یہ شعر ہو۔" (باب ۵) جب شیعہ ڈومنی یا طوائف کے وجود کے بارے میں شواہد کیا، کسی قسم کی زبانی گپ بھی ہم تک نہیں پہنچی ہے تو نتالیا پری گارنا کو زیادہ احتیاط لازم تھی۔ لیکن وہ الٰہی بخش کے بیان کردہ قصے سے اتنی متاثر ہو گئیں کہ انھوں نے شعر کو شاہد کے طور پر استعمال کیا، اور پھر اس شہادت سے انکار بھی کیا، لیکن لکھ دیا کہ "ایک بات البتہ صاف ہے، وہ دل فریب تھی اور قیاس غالب یہ ہے کہ وہ ڈوم ذات کی "معمولی" بت پرست "ستمگر" اور "بے دین" لڑکی تھی اور مرزا اس کی خاطر اپنا مذہب بدلنے کے لیے تیار تھے۔" اس دعوے کی دلیل میں وہ اس طرح کا شعر پیش کرتی ہیں (باب ۵):

دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا آخر کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا

دل کی رسومیات اور غزل گوئی کے شرائط کو نظر انداز کر کے اسے مغربی طرز کی Lyric فرض کرنے کے یہی نتائج ہوتے ہیں۔

نتالیا پری گارنا کی کتاب کے سب سے عمدہ حصے وہ ہیں جہاں انھوں نے سبک ہندی، خیال بندی اور تجریدی استعارہ و پیکر سے مملو شاعری سے بحث کی ہے۔ جہاں انھوں نے اردو کے نقادوں (مثلاً خورشید الاسلام کی کتاب "غالب: ابتدائی دور") اور حالی سے کسبِ فیض کیا ہے۔ غالب کے اسلوب کا شجرہ بیان کرنے میں انھوں نے روسی ہئیت پسندوں کا اصول بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ وہ کہتی ہیں (باب ۳):

> مرزا غالب کی ابتدائی شاعری متعدد ادبی ادوار کے تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے، جن میں ابتدائی مغلیہ عہد کی سولھویں صدی کی فارسی شاعری، آخری مغلیہ عہد کی سترھویں اور ابتدائی اٹھارویں صدی کی فارسی شاعری اور اسی طرح سے بشمول میر اٹھارویں صدی کی اردو شاعری شامل ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز کی اردو شاعری کی اس پیڑھی کے شاعر اس میں شامل نہیں ہیں جو شاعری میں غالب کے قریب ترین متقدمین یا "آبا" کے زمرے میں ہیں۔ لیکن دنیائے شاعری میں آبا و اخلاف کے درمیان سلسلۂ ارتقا عام طور سے اتنا استوار نہیں ہوتا جتنا چچا بھتیجوں کے درمیان۔ "آبا" کے زمرے سے اپنی شاعری کے اس دور میں غالب نے صرف ایک ناسخ کو چنا۔ اردو شاعری میں اپنے "اجداد" کے زمرے سے انھوں نے میر، انشا اور سودا کا انتخاب کیا۔ لیکن بنیادی توجہ انھوں نے "سبکِ ہندی" کے فارسی گو شاعروں بیدل، صائب، غنی کاشمیری اور شوکت بخاری یعنی ان شاعروں کو دی جن کے مرزا" پرپوتے" لگتے ہیں، کیوں کہ جیسا کہ روسی شاعر نوسب مندیلشتام نے کہا ہے "بہت سے ایسے خزانے ہیں جن سے پوتے محروم رہ جاتے ہیں اور ان پر تصرف پرپوتوں کا ہوتا ہے۔"

نتالیا پری گارنا نے غالب کے شجرۂ شاعری میں انشا، سودا اور ناسخ کو شامل کر کے غیر معمولی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ مندیلشتام کا اقتباس اور چچا بھتیجوں والا نکتہ (جو براہِ راست اشکلاوسکی سے مستعار ہے) پری گارنا کی اصول سازی میں روسی ہئیت پسندوں کے اثر کی نشان دہی کرتا ہے۔ میں مندرجہ بالا اقتباس پر اتنا ہی اضافہ کر سکتا ہوں کہ غالب کی صرف ابتدائی شاعری نہیں، تمام شاعری میں وہی اثرات نظر آتے ہیں جن کا ذکر پری گارنا نے اوپر کیا ہے۔

پری گارنا نے اردو فارسی کا مطالعہ محض رسی یا محدود سطح پر نہیں کیا ہے۔ ان کا ثقافتی اور ادبی شعور بھی، ہمدردانہ غور و فکر اور سبکِ ہندی کی شاعری سے فطری مناسبت کے ذریعے پروان چڑھا ہے۔ ان کی معلومات وسیع اور تعصبات بہت کم ہیں۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے

کہ روسی زبان میں یہ کتاب ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تھی، یعنی اس زمانے میں جب روسی مملکت میں اظہار و فکر کی وہ آزادی نہ تھی جو آج ہے۔ اس کے باوجود پری گارنا کی کتاب روایتی روسی سوویت مفروضات سے آزاد ہے۔ غالب کی زندگی ایک کم و بیش بے رنگ زندگی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے سوا اس میں کوئی تلاطم، کوئی تشدد آمیز واقعہ، کوئی روح فرسا المیہ نظر نہیں آتا۔ کلکتے کا طویل سفر انھوں نے ضرور کیا تھا، مگر اس کے بعد ان کا حجرہ۔ حیات کسی اہم موڑ سے آشنا نہ ہوا۔ اس نسبتاً غیر دل چسپ زندگی نامے کو پری گارنا کے بیانیے نے دل چسپ اور دل کش بنا دیا ہے۔

محمد اسامہ فاروقی کا ترجمہ عام طور پر رواں اور پڑھنے میں آسان ہے۔ کے پہلے وہ مخدوم محی الدین کی حیات اور شاعری کے بارے میں الیکسی سوخاچیف(Alexei S[illegible]khachev) کی کتاب ۔ ۔ ۔ یا کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ (مکتبہ ۔ حکمت، حیدرآباد ۱۹۹۳ء) مخدوم کے مقابلے میں غالب کا ترجمہ زیادہ صبر آزما کام تھا۔ اسامہ فاروقی نے نتالیا پری گارنا ۔ ۔ ۔ یہ کام بہ خوبی انجام دیا ہے۔ پری گارنا نے فارسی اردو سے اقتباسات روسی زبان میں خود ترجمہ کر کے شامل کتاب کیے تھے۔ ان ۔ ۔ ۔ تلاش کر کے انھیں بجنسہٖ یا (اردو ترجمے میں) درج کیا گیا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ غالب کے فارسی اشعار کا منظوم ترجمہ بھی (مترجم مضطر مجاز) اکثر و بیش تر شامل کر لیا گیا ہے۔ ترجمہ تقریباً ہر جگہ کامیاب اور درست ہے اور کتاب کی افادیت بڑھاتا ہے۔

پون ورما کی کتاب کی طرح پری گارنا کی کتاب بھی غالب کی تہذیب اور ثقافت کو اندر سے دیکھنے اور پھر وہاں سے غالب کی حیات و کائنات کو بیان کرنے کی کوشش ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ پون ورما کو فارسی نہیں آتی، لیکن اردو انھوں نے صرف غالب سے دل چسپی کے باعث سن بلوغ کو پہنچنے کے بہت بعد سیکھی)۔ اردو والے غالب پر آج تک ایسی کوئی کتاب ہم نہ پہنچا سکے۔ یہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

سید خالد قادری

کلچر کی شعریات

یہ مضمون جو دراصل ۱۹۸۷ء میں لکھا گیا تھا اسٹیفن جے۔ گرین بلاٹ (Stephen J. Green blatt) کے مضامین کے مجموعے "Learning to Curse" مطبوعہ ۱۹۹۰ء کا آخری مگر اہم ترین مضمون ہے۔ مضمون کا آغاز مصنف کے اس انکشاف سے ہوتا ہے کہ نئی تاریخیت (New Historicism) جو ایک اصطلاح کے طور پر ہر طرف رائج ہو چکی ہے کیوں کر اس کے ذہن نے ایک ایسے لمحے میں اختراع کی تھی جب اسے نشاۃ ثانیہ سے متعلق کچھ منتخب مضامین کا دیباچہ لکھنے کے دوران کسی ایسے عنوان کی تلاش تھی جو ان مضامین کی نمائندگی کر سکے۔ اسے یہ مضامین معروف ادبی میگزین "Genre" کے لیے انتخاب کرنے تھے۔

" I Collected a bunch of essays and then, out of a kind of desperation to get the introduction done, I wrote that the essays represented something I called a "New Historicism." I have never been good at making advertising phrases of this kind; the name stuck much more than other names, I had very carefully tried to invent over the years. In fact I have heard quite a lot of talk about the " New Historicism " (in Australia Called Neo-Historicism). There are articles about it, attacks on it, references to it - in dissertations : the whole thing makes me quite giddy with amazement " (Green blatt, " Towards a poetics of culture ")

سرمایہ دارانہ جمالیات میں پائے جانے والے تضادات کے مد نظر گرین بلاٹ نے اس مضمون میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھا کہ نئی تاریخیت اپنے آپ میں کوئی باقاعدہ نظریہ نہیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ عملی تنقید کے ایک طریقۂ کار کے طور پر برتا جا سکتا ہے۔

گرین بلاٹ جسے "نئی تاریخیت" کی تنقیدی اصطلاح کا موجد کہا جا سکتا ہے اپنے ان تصورات کو ایک طرف مارکسزم اور دوسری طرف مابعد وضعیات (Post structuralism) کے پس منظر میں پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ۱۹۷۰ کے آس پاس جب وہ برکلے کیمپس " Berkeley Campus " میں مارکسی جمالیات پڑھایا کرتا تھا اور پھر بعد کے دور میں جب اس میں ذہنی تبدیلیاں آئیں اور اس نے "کلچر کی شعریات" جیسے مضمون کے کورس پڑھانے شروع کر دیے۔ اس کا کہنا ہے کہ مارکسی جمالیات کے معروف امریکی مدبر فریڈرک جیمسن (Frederic Jameson) کے نظریات میں ابھی ان کی ۱۹۸۱ء کی تصنیف سیاسی لاشعور (The Political unconscious) اور پھر مابعد جدیدیت اور متاخر سرمایہ داری کی تمدنی منطق"

" Post Modernism or the Cultural Logic of Late Capitalism."

New Left review No. 146, 1984.)

کے درمیان تبدیلیاں آئی ہیں مگر اس کا ذمہ دار وہ نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کا بدلا ہوا امزاج ہے۔ خود جیمسن (F. Jameson) کے مطابق اس کے نظریے میں تبدیلی سرمایہ دارانہ نظام میں در آیا وہ تغیر ہے جس کی وجہ سے آج اس کی دو اقسام کی شناخت ممکن ہے۔ ایک صنعتی سرمایہ داری جو سماجی اور معاشی تفریق پیدا کرنے والی تھی اور دوسری متاخر (معاصر) سرمایہ داری جو سماجی تفریق کو اس حد تک مٹانے کے درپے ہے کہ اس کے مثبت پہلو بھی باقی نہ رہ جائیں۔

مصنف، ارنسٹ مینڈل (Earnest Mandel) سے اتفاق کرتا ہے جس کا خیال ہے کہ آج ہم (اہل مغرب) متاخر سرمایہ داری، کے دور میں آچکے ہیں اور اس میں تمدنی پیداوار (Cultural Production) اور اس کے استعمال یا کھپت کے اصول بدل چکے ہیں۔ یہ ایک ہمہ قومی (Multionational) دنیا ہے جہاں جذبات کی نہیں بلکہ ایک قسم کی شدت کی کارفرمائی ہے۔ جہاں ہر چیز ... سطحیت پائی جاتی ہے۔

آگے چل کر مصنف ان خیالات کا اظہار کرتا ہے کہ آج طباعت اور الیکٹرانک ... ملکیت کا چلن ہونے سے نہ صرف یہ کہ تمام تر بیانیہ (Discourse) ... Communal ... مرحلوں سے بھی گزر رہا ہے اور یہ سب ایک ایسے دور میں وقوع پذیر ہو رہا ہے جب کہ نہ صرف قارئین کا حلقہ بلکہ نشر و اشاعت سے تجارتی مفادات بھی اتنے وسیع ہو چکے ہیں کہ جن کا تصور بھی سرمایہ دارانہ نظام کے وجود میں آنے سے پہلے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس عظیم پر عوامی بیانیے کو منظم کرنے (یا سرمایہ داری کے تابع بنانے) کی کوئی بھی کوشش ماضی میں کہیں نظر نہیں آتی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ آج یہ سوال دوبارہ ایک دوسرے انداز سے اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ کیا عام سماجی دائرے سے ہٹ کر آرٹ کا ایک مختلف اور مخصوص دائرہ ہو سکتا ہے خاص طور پر سرمایہ دارانہ نظام میں جہاں ملکیت کے رائج قوانین اس مسئلے سے سیدھا تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ہم فلم، ٹی۔ وی، الیکٹرانک میڈیا اور کمپیوٹر وغیرہ کو مدنظر رکھیں تو شاید یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اب ویسی کسی صورت کی گنجائش نہیں۔ گو کہ ہم سترھویں صدی سے پہلے (یورپین) اور اس سے قبل کے ایسے تہذیبی ادوار میں بھی جب ماس پروڈکشن (Mass Production) کا تصور نہ تھا خالص فن کارانہ تمدنی بیانیے (Artistic - Cultural discourse) اور سماجی بیانیے کے درمیان تفریق کر سکتے تھے۔ مگر آج کی سرمایہ داری نے ہمیں اس حد تک مفلوج بنا دیا ہے کہ ہم بس "Individual Subjects" ہیں اور یوں یہ تفریق اقل ترین درجے کو پہنچ گئی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس صورت حال میں ہم میں سے بہتوں کو انسان کے تمثیلی زوال کی گونج سنائی دے گی۔

انسانی وجود کبھی مکمل، متحرک اور جامع تھا۔ اجتماعی سماجی نفسیات سے علاحدہ اس کی اپنی الگ کوئی نفسیات نہ تھی۔ سیاست، شاعری بھی ایک دوسرے سے یوں جدا نہ تھے اور پھر سرمایہ داری نے دیکھتے ہی دیکھتے اس سوچے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ نہ صرف سماج کی اجتماعیت انتشار کا شکار ہو گئی بلکہ فرد کا وجود بھی مفلوج و ناکارہ ہو کر رہ گیا۔

عہد حاضر کے سرمایہ دارانہ سماج کے تحت یہ نظریات زیادہ تر فریڈرک جیمسن کی تحریروں پر مبنی ہیں جب کہ مابعد وضعیات مفکروں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

لیوطارڈ (Jean Francois Leotard) کے نزدیک بیانیے کے الگ الگ ماڈل یا ان کے درمیان تفریق کی بنیاد اسمائے خاص (Proper Names) ہیں جب کہ سرمایہ داری "ناموں" کو مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ ایک زبان کی اجارہ داری رایک ایسے نٹ ورک (Network) کے پھیلاؤ کی سعی کرتی ہے جس میں اس کا مفاد پوشیدہ ہو۔ سرمایہ داری کے اس رجحان کو باختن (Bakhtin) (Monologism) کا نام دیتا ہے۔ جب کہ انفرادی ناموں کو ختم کر دینے کے سرمایہ دارانہ رجحان کی مثال لیوطارڈ نازیوں کی اس کوشش سے دیتا ہے جو لاکھوں یہودیوں کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے کی گئی تھی۔ وہ اسے دنیا کے نقشے اور انسانی تاریخ سے ناموں کا ایک جہان حذف کر دینے کے "ارادے (Will) سے تعبیر کرتا ہے۔

لیوطارڈ کے ان نظریات سے بحث کرتے ہوئے گرین بلاٹ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ یہ ہے کہ اگر مندرجہ بالا باتیں مان لی جائیں تو پھر یہ بھی ماننا ہوگا کہ سرمایہ دارانہ سماج میں انسان کی انفرادی اہمیت پر زور دیے جانے کی بات ایک سطحی اور پر فریب مفروضے سے زیادہ نہیں۔ مگر اتنی جلد یہ نتیجہ نکالنا بھی ہوش مندی کی دلیل نہ ہوگا اگر مارکس کے ان نظریات کو مدنظر رکھا جائے جن کے مطابق یہ سرمایہ داری ہی ہے جس نے مغرب کی اجتماعی سماجی زندگی اور اقتدار پر سب سے کاری زخم لگایا ہے۔

جیمسن کا نظریہ، سرمایہ داری جہاں سماجی بیانیے کے مختلف دائروں کے وجود کی بات کو ایک مفروضہ بتاتے ہوئے تمام بیانیے کو ایک ہی مادی اکائی سے مربوط قرار دیتا ہے۔ وہیں لیوطارڈ اس قسم کی (Monological Unity) کے تصور کو محض ایک التباس قرار دیتا ہے اس کے خیال میں اس جھوٹی یک جہتی (False Integration) کا سبب سرمایہ داری ہے۔

ان دونوں ہی اہم فلسفیوں کے نظریات جو بات واضح طور پر سامنے لاتے ہیں وہ یہ ہے کہ سرمایہ داری ایک وسیع اور پیچیدہ سماجی اور معاشی تحریک ہی نہیں بلکہ ایسے فلسفیانہ اصولوں کی محرک بھی ہے جو ادب اور آرٹ کی جمالیات کو اس حد تک بدل سکتے ہیں کہ وہ سرمایہ داری کی تابع ہو جائے۔

اس مضمون میں ایک جگہ گرین بلاٹ، Anthony Dolan (ایک وھائٹ ہاؤس کے صدر کی تقریر لکھنے والے) کا حوالہ بھی دیتا ہے جس کا خیال ہے کہ آج کا مخصوص امریکی آرٹ، ہم سب کو اپنے انداز میں ڈھال لینے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لیے نہیں کہ وہ حقیقت سے دور لے جاتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ حقیقت کو ابھار کر اسے حقیقی زندگی سے بڑا اور برتر بنا کر ہمارے سامنے لاتا ہے۔

گرین بلاٹ کے خیال میں یہ بیان آرٹ کے بارے میں، جمالیاتی حقیقت کے مجموعی حقیقت سے ہٹ کر اپنا الگ وجود رکھنے کی بات کو قطعی طور پر ختم کر دیتا ہے۔ اس کے مطابق، جمالیاتی حقیقت عمومی حقیقت کا کوئی برتر اور بہتر متبادل نہیں بلکہ وہی ایک اور قطعی حقیقت جس کا ہم سب حصہ ہیں اور جو، آرٹ کی شدت سے، ہم کنار ہو کر جمالیاتی حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سولھویں صدی سے شروع ہو کر جب کہ جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کا اثر آرٹ پر محسوس کیا جانے لگا تھا سرمایہ داری کے موجودہ عہد تک، ہمہ اقسام کے بیانیے (discourses) نہ صرف وجود میں آئے بلکہ وہ تمام بہ یک وقت الگ الگ رہنے اور ایک دوسرے میں ضم ہونے کے عمل سے بھی گزر رہے ہیں۔

نوی تنقید کسی فن پارے کا ان تاریخی یا اساطیری واقعات سے رشتے کے اظہار کے لیے جن کے حوالے اس میں موجود ہوں کئی ایسے الفاظ ہیں جو کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کنایہ (Allusion) تمثیل، علامت اور Mimesis وغیرہ۔ مگر آج یہ لگتا ہے جیسے یہ الفاظ کچھ عرصہ قبل تک ناگزیر ہونے کے ساتھ ساتھ تنقیدی زبان کی ضروریات کی بھرپور کفالت بھی کر سکتے تھے آج بدلتے ہوئے پس منظر میں ناکافی سے لگنے لگے ہیں۔

جہاں گرین بلاٹ نارمن میلر (Norman Mailer) کی تصنیف "The Executioner's Song" کی مثال پیش کرتا ہے جو نہ صرف ایک ناول اور ٹی۔وی سیریل کے طور پر بے حد مقبول ہوئی بلکہ صابن، کار اور کاسمیٹکس کی فروخت کا ذریعہ بھی بنی۔ یہ ناول Gary Gilmore نامی اس امریکی مجرم کی زندگی کے حقیقی حالات پر لکھی گئی ہے جس نے قتل کے جرم میں دی جانے والی عدالت کی سزا کو ناکافی قرار دے کر پھانسی کی سزا کا مطالبہ کیا تھا جو امریکی قانون کے مطابق ممنوع تھی۔ جہاں مصنف نے ڈاکیومنٹری حقیقت نگاری (Documentary realism) اور Romance themes کو بڑی مہارت سے باہم مربوط کیا ہے۔ ایسی ہی ایک مثال امریکی مجرم Jack H. Abbot کے خطوں پر مبنی ناول In the belly of the Beast کی بھی ہے۔ جیک ایبٹ اپنی جیل کی زندگی کے حالات قلم بند کر کے نارمن میلر کو روانہ کرتا رہا تھا جسے بعد میں Random House کے ایڈیٹر ایرول میکڈونالڈ (Erol Macdonald) نے ایک ناول کا فارم دے دیا۔

گرین بلاٹ کے مطابق جو کلچرل مظاہر (Cultural Phenomenon) ان کتابوں اور ٹی۔وی سیریل کا ماخذ ہیں ان کی طرف اشارہ کرنے کے لیے پرانی تنقیدی اصطلاحات ناکافی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا یہ خیال بھی ہے کہ یہ اصطلاحات سابق تمدنی ادوار اور ان کے ادب کے بیچ پائے جانے والے رشتے کے اظہار کے لیے بھی کافی نہیں ہیں۔ چناں چہ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ایسی اصطلاحات وضع کی جائیں جو آرٹ اور ادب میں دکھائی دینے والے اس عمل کے اظہار کی متحمل ہو سکیں کہ کس طرح سرکاری یا غیر سرکاری دستاویز، شخصی خطوط اور اخبار کے تراشے وغیرہ ایک قسم کے بیانیے کی سرحدوں کو عبور کر کے دوسری قسم کے بیانیے کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر کسی بڑے اشاعتی ادارے، فلمی پروڈکشن کمپنی یا کسی سرمایہ دار کی مالیاتی جائیداد (Aesthetic Property) بن جاتے ہیں۔

حال میں Micheal Baxandall نے آرٹ اور سوسائٹی کے باہمی رشتے اور اس کی بصیرت کی مناسب صورت کا ذکر یوں کیا ہے:

" Art and society are analytical concepts from two different kinds of categorization of human experience - - - - unhomologous systemetic constructions put upon interpenetrating subject matters. In consequence in any attempt to relate the two we must first modify one of the terms till it matches the other "

Green Blatt کے مطابق ہمیں یہ بھی ذہن نشین رکھنا ہے کہ آرٹ خود اپنا الگ وجود رکھنے والا کوئی مقدس شعلہ نہیں جسے انسانی عمل سے علاحدہ سمجھا جائے بلکہ وہ کسی طرح کے اظہارات Manipulations کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے (یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے جب ہم ایسی چیزوں کو بھی دھیان میں رکھیں جو اپنی ابتدا میں آرٹ کے طور پر نہیں تخلیق کی گئی تھیں جیسے پروپگنڈہ لٹریچر اور آرٹ، پوسٹرس یا دعائیں وغیرہ) یوں کہا جا سکتا ہے کہ آرٹ، تخلیق کار یا تخلیق کاروں کے ایک مخصوص گروہ جو معاشرتی طور سے باہم مربوط ہو اور سماج کے مختلف اداروں اور رسوم و قواعد کے باہم اختلاط سے وجود میں آتا ہے۔ اس طرح آرٹ نہ صرف یہ کہ سماجی لحاظ سے بامعنی ہوتا ہے بلکہ ایک لین دین کا بھی متقاضی ہوتا ہے جسے عام طور پر لذت(Pleasure) اور دل چسپی(Interest) کے پیمانوں سے ناپا جاتا ہے۔

گرین بلاٹ کے خیال میں آج آرٹ اور ادب سے متعلق بیش تر نظریاتی مباحث کو ان نئی تنقیدی اصطلاحات کی جستجو سے تعبیر کیا جانا چاہیے جو آج کے مخصوص کلچرل مظاہر اور ان کے زیر اثر وجود میں آنے والے ادب کے باہمی رشتے کو واضح کر سکیں۔

○ ○ ○

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی

مارماڈیوک پکتھال اور ریاستِ حیدرآباد

اس وقت میرے پیش نظر مارماڈیوک پکتھال کی وہ مستند سوانح حیات ہے جو ان کی وفات (۱۹/ مئی ۱۹۳۶ء) کے بعد مسز پکتھال کی فرمائش پر Anne Fremantle نے Loyal Enemy کے نام سے لکھی تھی اور جو ۱۹۳۸ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب کراؤن سائز کے لگ بھگ ۴۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ میرا اپنا یہ مضمون اسی سوانحی کتاب پر مبنی ہے۔

مارماڈیوک پکتھال کی شخصیت میرے نزدیک اہم اور جاذب توجہ اس لیے ہے کہ:

(۱) اول تو وہ ایک سچے مسلمان تھے۔ جیسا کہ ان کے سوانح حیات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔ اپنے مشرق کے پہلے سفر کے بیس سال بعد تک تو وہ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے لیکن بعد ازاں اسلامی تعلیمات اور خاص کر قرآنِ حکیم کے مطالعے کے زیرِ اثر ان کی شخصیت میں انقلاب نما تبدیلی آئی اور وہ ۱۹۱۴ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس وقت مارماڈیوک پکتھال کی عمر ۳۹ سال کی تھی۔

(۲) دوسرے مارماڈیوک پکتھال کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ قرآنِ حکیم کی آیات کے معنی و مطالب کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کا ہے۔ یہاں میں نے ترجمہ کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ کیوں کہ اس امر پر بیش تر علما متفق ہیں کہ قرآنِ حکیم کا دنیا کی کسی اور زبان میں ترجمہ تقریباً ناممکن ہے اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ قرآنِ حکیم کے صحیح معنی و مطالب اسی شخص پر آشکار ہو سکتے ہیں جس کو کلاسیکی عربی زبان پر عبور حاصل ہو۔ جارج سیل سے لے کر اب تک قرآنِ حکیم کے معنی و مطالب کو انگریزی میں منتقل کرنے کی جن لوگوں نے کوشش کی ہے (زیادہ تر انگریز) ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ عربی زبان پر وہ کامل قدرت رکھتے تھے۔ اس کے برخلاف مارماڈیوک پکتھال کو عربی زبان پر نہ صرف کامل قدرت حاصل تھی بلکہ وہ عربی میں بلا تکلف گفتگو کر سکتے تھے۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ "میں کئی مسلمان علماء کے مقابلے میں زیادہ اچھی عربی جانتا ہوں"

(۳) تیسرے یہ کہ نظام سابع کی ذات سے مارماڈیوک پکتھال کو بے پناہ عقیدت تھی وہ انھیں اپنا مربی سمجھتے تھے کیوں کہ اگر نظام دو سال کی رخصت پوری تنخواہ پر مرحمت نہ فرماتے تو وہ قرآن کے تشریحی ترجمے کا کام بہ حسن و خوبی مکمل نہ کر پاتے۔

ستمبر ۱۹۲۰ء میں بمبئی میں آمد، انگریزی اخبار بامبے کرانیکل سے بحیثیت ایڈیٹر وابستگی اور بمبئی کے چار سالہ قیام کے دوران میں خلافت تحریک سے دل چسپی، علی برادران سے ان کی شناسائی اور دوستی اس کے علاوہ دوسری کئی مصروفیات، یہ تمام باتیں ایک علاحدہ تفصیلی مضمون کی متقاضی ہیں۔

بامبے کرانیکل کے ادارے سے سبک دوش ہونے کے بعد مارماڈیوک پکتھال اور ان کی بیگم کیپٹن سالومن (جے۔ جے۔ اسکول آف آرٹ بمبئی) کے بنگلے میں منتقل ہوگئے تھے۔ شروع ہی سے مارماڈیوک پکتھال کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرآنِ حکیم کے معنی و مطالب اور اس کے تشریحی ترجمے کو انگریزی میں منتقل کرنے کا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ نظام حیدرآباد نے ان کے اس پراجیکٹ میں غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کیا تھا۔ لہٰذا وہ حیدرآباد میں کوئی مناسب ملازمت کے خواہاں تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے نظام کی خدمت میں ایک عرضی بھی بھ

دی تھی۔ ان ہی دنوں کیپٹن سالومن کے بنگلے میں سر اکبر حیدری اور نواب راس مسعود جنگ (ناظم تعلیمات) مارماڈیوک پکتھال سے ملنے آئے تھے۔ یہاں پر ان کے سوانح نگار کا یہ انکشاف حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ سر اکبر حیدری اور نواب راس مسعود جنگ نے انھیں عثمانیہ یونیورسٹی کے پرنسپل کے عہدے کی پیش کش کی تھی۔ دراصل ان دونوں حضرات کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہو گئی تھی کیوں کہ اس عہدے کے لیے پہلے ہی کسی اور شخص کا انتخاب ہو چکا تھا (غالباً پروفیسر عبدالرحمان خاں) البتہ مارماڈیوک پکتھال کا تقرر چادر گھاٹ ہائی اسکول کے پرنسپل کی حیثیت سے کیا گیا تھا جس کو انھوں نے بہ خوشی منظور کر لیا تھا۔

یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو مسٹر اور مسز پکتھال حیدر آباد پہنچے تھے۔ اپنے عہدے کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے اپنی والدہ اور انگلستان کے دوسرے دوستوں کو جو خطوط لکھے تھے ان میں اسکول اور ریاست حیدر آباد کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں۔ مثلاً چادر گھاٹ ہائی اسکول صرف لڑکوں کے لیے مختص ہے اور تقریباً ایک ہزار طلبہ اس اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ حیدر آباد بلاشبہ علم و ادب اور تہذیب و شائستگی کا گہوارہ ہے۔ حیدر آباد کے حکم ران نظام، علماء اور ادبا کی خاص طور پر سرپرستی فرماتے ہیں۔

ایک اور خط میں حیدر آباد کے محل وقوع اور اس کی خصوصیات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"دکن (یعنی حیدر آباد بشمول برار) ہندستان کی اہم ریاستوں میں سے ایک ہے۔ تاریخی اعتبار سے ہندستان کا یہ آخری خطہ ہے جس کو مغلوں نے اپنی سلطنت میں شامل کیا تھا۔ حیدر آباد کا شمال مغربی علاقہ مرہٹہ (بہ معنی مرہٹواڑہ) کہلاتا ہے جہاں گیہوں اور کپاس کی پیداوار ہوتی ہے جب کہ جنوب مشرقی علاقے میں چاول اور آم کی بہ کثرت پیداوار ہے۔ اور یہ تلنگی بولنے والوں کا علاقہ ہے۔ حیدر آباد کی آبادی آرین اور ڈراوڈین نسل کے باشندوں کے مکسچر پر مشتمل ہے۔ آرین عام طور پر مسلمان اور سکھ ہیں اور زیادہ تر ہندو ڈراوڈین نسل سے تعلق رکھتے ہیں (مارماڈیوک پکتھال کی یہ نسلی تقسیم نہ صرف دل چسپ بلکہ قابل غور ہے) ریاست کا شمال مغربی علاقہ کافی زرخیز ہے جب کہ جنوب مشرقی علاقے میں دور دور تک پھیلی ہوئی چٹانیں، ٹیلے اور گنبد نما پتھر کے تودے (Boulders) ایک عجیب ادا سی کا سماں پیش کرتے ہیں۔ البتہ میدانی حصوں میں جھاڑیوں کی بہتات ہے۔ ادھر ادھر تالاب نظر آتے ہیں جن میں ندیوں کا پانی آکر جمع ہوتا ہے مگر یہ ندیاں گرمی کے موسم میں بالکل خشک ہو جاتی ہے۔ بعض تالاب کافی بڑے ہیں۔ جیسے کہ پاکھال کا تالاب ہے۔ اس کے اطراف گھنے جنگل ہیں جن میں شیر، چیتا، ہرن اور دوسرے جنگلی جانور بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔"

ایک اور جگہ مارماڈیوک پکتھال لکھتے ہیں کہ نظام حیدر آباد کا شمار دولت برطانیہ کے وفادار حکم رانوں میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ غدر کے ہنگامے کے دوران ایک انگریز نے کہا تھا:

If Nizam goes , all goes.

ہزاکزالٹڈ ہائنس نواب میر عثمان علی خاں نہ صرف دنیا کے متمول ترین فرد ہیں بلکہ ایک ایسی ریاست کے حکم ران ہیں جہاں کی اکثریت ہندو ہے۔ اور اردو ریاست کی سرکاری زبان ہے (مارماڈیوک پکتھال نے اردو میں بھی کافی دست گاہ پیدا کر لی تھی)۔ انھوں نے جیوگرفیکل میگزین کے ماہ اپریل ۱۹۳۱ء کے شمارے میں حیدر آباد کے بارے میں ایک بسوط مضمون لکھ کر چھپوایا تھا۔

حیدرآباد پہنچنے کے بعد مسٹر اور مسز پکتھال سیف آباد میں پروفیسر اسپیٹ کے ساتھ ان کے مکان میں مقیم تھے۔ پروفیسر اسپیٹ ان کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ اس زمانے میں سیف آباد کا علاقہ یوروپین باشندوں کے لیے مخصوص تھا۔ آمد و رفت کے لیے غیر آرام دہ شکرم یا تانگے ملتے تھے۔ لیکن مارماڈیوک پکتھال پروفیسر اسپیٹ کی کار میں اسکول جایا کرتے تھے جس کو ان دونوں دوستوں نے Share کر رکھا تھا۔

جنوری ۱۹۲۷ء میں سہ ماہی رسالے اسلامک کلچر کا پہلا نمبر مارماڈیوک پکتھال کی ادارت میں شائع ہوا تھا جس کے وہ ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اسلامک کلچر کے پہلے نمبر سے لے کر اس کے چالیسویں نمبر تک وہ اس رسالے کو بڑی دیانت داری کے ساتھ ایڈٹ کرتے رہے۔ پروفیسر اسپیٹ لکھتے ہیں کہ اسلامک کلچر ایک معیاری رسالہ تھا جس کا شمار دنیا کے بہترین علمی رسالوں میں ہوتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد مارماڈیوک پکتھال اور ان کی بیگم پروفیسر اسپیٹ کے مکان سے سول سروسیز ہاؤز منتقل ہوگئے جس کے مارماڈیوک پکتھال نگراں مقرر ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک ناول لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اپنے ایک انگریز دوست کو انھوں نے لکھا تھا کہ اس ناول کے پلاٹ کا تعلق جہد اور رنگ و نسب سے ہے(۱)۔

(۱۹۲۷ء میں) مدراس میں انھوں نے اسلام پر لکچر بھی دیے تھے جو خطبات مدراس کے نام سے جمال محمد صاحب کی نگرانی میں شائع ہوئے تھے۔

اسی سال کے اواخر میں مارماڈیوک پکتھال یورپ گئے تھے۔ اپنی رخصت کے زمانے کا زیادہ تر حصہ انھوں نے قرآن مجید کے تشریحی ترجمے کے سلسلے میں یورپ کے چند ماہرین سے صلاح مشورے میں گزارا تھا۔ حیدرآباد واپسی پر اپنے ایک خط میں انھوں نے حیدرآباد میں پلیگ کی وبا کے بارے میں لکھا تھا۔ اسکول بند کر دیا گیا تھا۔ البتہ آفس کے کام سے وہ ہفتے میں دو دن اسکول جایا کرتے تھے۔ پبلک امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ کے لیے اسپیشل کلاسس کا انتظام کیا گیا تھا۔

۱۹۲۹ء میں نظام نے از راہ مراحم خسروانہ مارماڈیوک پکتھال کو دو سال کی رخصت پوری تنخواہ کے ساتھ منظور کی تھی تاکہ وہ ترجمے کا کام مکمل کر سکیں۔ انگلستان پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد وہ اپنے دوست ہاشمی (۲) کو لکھتے ہیں کہ اس عرصے میں انھوں نے ابن ہشام (اصل میں ابن اسحاق) کی سیرت رسول اللہ پڑھی ہے۔ ایک جرمن اسکالر Zoldeke کی ہسٹری آف دی قرآن کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے۔ ابن خلدون کے مقدمے کے اس حصے کے بارے میں بھی لکھا ہے جو سیرت سے متعلق ہے۔

۱۰/ نومبر ۱۹۲۹ء کو مارماڈیوک پکتھال مصر پہنچے تھے اور اپنے ساتھ قرآن مجید کے ترجمے کا مکمل مسودہ بھی لے گئے تھے تاکہ مصر کے علماء سے اس ترجمے کے بارے میں مشورہ کر سکیں۔ مارماڈیوک پکتھال نے یہ بھی سنا تھا کہ کس طرح ایک مسلم اسکالر کے انگریزی ترجمے کو جامعۃ الازہر کی مسجد کے صحن میں بر سر عام نذر آتش کیا گیا تھا اور مصر میں اس ترجمے کے داخلے پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ مصر کے قدامت پسند علماء قرآن حکیم کے کسی بھی زبان میں ترجمے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ چنانچہ مارماڈیوک پکتھال کو بھی ان کے ترجمے کے سلسلے میں مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ البتہ مصر کے بعض روشن خیال دانش ور مارماڈیوک پکتھال کے ترجمے کی حمایت میں تھے۔ اس سلسلے میں مصر کے اخبار الاہرام میں کئی مراسلے بھی شائع ہوئے تھے۔ مارماڈیوک پکتھال کو ڈاکٹر طہٰ حسین (مصر کے نابینا دانش ور) نے یہ صلاح دی تھی کہ وہ شاہ مصر

سے رجوع ہو کر ترجمے کے مسئلے کی یکسوئی کے لیے درخواست کریں۔ مگر مارماڈیوک پکتھال جانتے تھے کہ شاہِ مصر علمائے ازہر کی رائے کے
خلاف نہیں جائیں گے۔ انھوں نے قدرے جذباتی ہو کر یہ جواب دیا تھا۔۔۔۔ "چونکہ مجھے ہز اگزالٹڈ ہائنس نظام جیسے بادشاہ کی سرپرستی حاصل
ہے تو کسی اور شاہ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔" ویسے ہندستان میں بھی جید علماء کی کمی نہیں ہے۔"

جامعہ ازہر کی طرف سے انھیں ایک خط ملا تھا جس میں ان کے کام کی ستائش کی گئی تھی اس کے ساتھ مصر کے عالمِ دین شیخ المراغی کا Testimoni بھی تھا جس میں یہ صلاح دی گئی تھی کہ قرآنِ حکیم کے ترجمے کے بجائے معنی اور تشریحی ترجمے کے الفاظ استعمال کیے جائیں (۳)۔

بالآخر ۱۹۳۰ء میں۔

The Meaning of the Glorious Quran An Explanatory Translation by

Mohammed Marma Duke Pickthall

کے نام سے یہ ترجمہ شائع ہوا۔ جس کو ہز اگزالٹڈ ہائنس دی نظام کے نام نامی سے معنون کیا گیا تھا۔ اس تشریحی ترجمے کے پبلشر لندن۔ ے الفرڈ اف تھے (۴)۔

ترجمے کے کام کی تکمیل کے بعد مارماڈیوک پکتھال حیدرآباد جانے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے کہ انھیں نظام کا ایک فرمان ملا جس کی رو سے انھیں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے حیدرآباد ڈیلی گیشن کا سکریٹری نامزد کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں خاص طور پر برار کی Lease کا مسئلہ اٹھایا گیا تھا۔ لندن سے انھوں نے اپنے دوست ہاشمی کو لکھا تھا کہ وہ کانفرنس کی تقریروں اور اس کے شرکاء کی ذہنیت سے بڑی حد تک مایوس ہو چکے ہیں۔ مولانا محمد علی اور ان کے برادر شوکت علی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے مگر دل الذکر کی صحت اچھی نہیں تھی۔ کانفرنس کی کارروائی کے دوران محمد علی لندن میں وفات پاگئے اور کانفرنس کے شرکاء پر ایک طرح کی ی مسلط ہو گئی۔ اس طرح سال کے ختم پر مارماڈیوک پکتھال حیدرآباد واپس آگئے۔

۱۹۳۱ء میں دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی مگر اس مرتبہ مارماڈیوک پکتھال حیدرآباد ڈیلی گیشن کے ممبر نہیں تھے۔ مارماڈیوک پکتھال سیول سروس ہاؤز کے کام سے مطمئن تھے۔ وہ مشترک ڈائننگ روم میں طلبہ کے ساتھ طعام میں شریک ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک دل چسپ اسکٹ "دی گریٹ حیدرآباد ریوولیوشن" لکھا تھا (The Great Hyderabad Revolution)

۱۹۳۱ء کے اواخر میں نظام نے سابق خلیفہ ترکی کی صاحب زادی درِ شہوار کے ساتھ والا شان شہزادہ اعظم جاہ اور ان کی بھتیجی نیلوفر کے ساتھ شہزادہ معظم جاہ کے رشتۂ مناکحت کے سلسلے میں گفت و شنید کے لیے مارماڈیوک پکتھال کو اسپیشل آفیسر مقرر کیا تھا۔ جیسا کہ مارماڈیوک پکتھال کی سوانح حیات کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے انھوں نے انقلاب سے پہلے کا ترکی بھی دیکھا تھا اور اس کے بعد جب مصطفی کمال پاشا نے ۱۹۲۴ء میں خلافت کے ادارے کا خاتمہ کر کے خلیفہ کو معزول کر دیا تھا جس کے نتیجے میں خلیفۃ المسلمین اپنے اہل و عیال کے ساتھ انتہائی فلاکت میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے تو اس صورت حال سے مارماڈیوک پکتھال زیادہ خوش نہیں تھے کیوں

کہ وہ خلافت کے ادارے کو مسلمانانِ عالم کے لیے ایک روحانی مرکز کا درجہ دیتے تھے۔ لیکن مارماڈیوک پکتھال اس بات پر خوش ت
ہندستان کی سب سے بڑی ریاست کے حکمراں نظام جو دنیا کے متمول ترین فرد تھے اور جنھوں نے سابق خلیفہ کے نام پنشن بھی جاری کر
تھی ان کے شہزادگان کے ساتھ ترکی کی شہزادیوں کا رشتہ طے پا جائے۔ دراصل خلافت تحریک کی ناکامی کے بعد مولانا محمد علی نے نظا
اس رشتے کی صلاح دی تھی۔

نظام نے مارماڈیوک پکتھال کو یہ ہدایت لکھ بھیجی تھی کہ نکاح کے رسوم کی تکمیل کے بعد شہزادے اپنی دلہنوں کے ساتھ حجاز بہ
اور عمرہ کی سعادت حاصل کریں۔(۵)

نظام نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ سابق خلیفہ ترکی بہ نفس نفیس نکاح کی رسم ادا کریں۔ انھوں نے ایک ٹرسٹ بھی قائم کیا تھا
کے دو ممبروں میں سے ایک سر اکبر حیدری تھے۔ اور دوسرے ممبر کی نامزدگی کا اختیار خلیفہ ترکی کو دیا گیا تھا۔ اس ٹرسٹ میں دونوں
زادیوں کے مہر معجل کی رقم شامل کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ دلہنوں کی شادی کے لباس اور زیورات کے لیے نظام نے خطیر رقم کی منظو
دی تھی۔ مارماڈیوک پکتھال کی رو سے نکاح کی تاریخ ۱۸/ نومبر مقرر کی گئی تھی(۶) جو کہ نظام کی سالگرہ(۷) کی تاریخ تھی۔ نکاح کے
مارماڈیوک پکتھال نے رائٹر سروس کے ذریعے ایک کمیونکے بھی جاری کیا تھا جس کا مضمون خود نظام نے لکھ کر بھیجا تھا۔

نظام کی ہدایت کے باوجود شہزادے اور ان کی دلہنیں عمرہ پر اس لیے نہ جاسکے کہ ان دنوں یمن میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھ
چنانچہ ایک ہفتہ سے زاید طرابلس میں گزارنے کے بعد شہزادے اور ان کی دلہنیں بمبئی سے ٹرین کے ذریعے حیدرآباد پہنچے۔(ان
ساتھ مسٹر اور مسز پکتھال بھی تھے)۔ حیدرآباد میں ان کا نہایت شاندار پیمانے پر استقبال ہوا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ مارماڈیوک پکتھال کے قیام حیدرآباد کے دس سال پورے ہونے میں کچھ عرصہ باقی تھا۔ ویسے وہ چادرگھاٹ اسکول
پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ باقی مدت کے لیے نظام نے مارماڈیوک پکتھال کو پرنس بسالت جاہ کا کنٹرولر مقرر کیا؛
بحیثیت کنٹرولر وہ حیدرآباد میں منعقد ہونے والی تقاریب اور مختلف جلسوں میں بسالت جاہ کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ اس کے عا
Crossword Puzzle حل کرنے میں بسالت جاہ کی مدد کرتے تھے۔

مارماڈیوک پکتھال کی بایوگرافر نے لکھا ہے کہ بسالت جاہ کے کنٹرولر شپ کے زمانے میں انھوں نے باقاعدہ ڈائری لکھنی شروع
تھی جو مصنفہ کی رائے میں ای۔ ایم۔ فارسٹر کی ڈائری کی طرح دلچسپ تھی(۷)۔

ڈائری میں دنوں کے نام جیسے شنبہ، یک شنبہ، دوشنبہ وغیرہ تو لکھے گئے ہیں لیکن تاریخ اور سن درج نہیں کیے گئے ہیں۔ یہاں
صرف چند واقعات مختصراً بیان کریں گے:

بسالت جاہ کی معیت میں اوٹی کا سفر اور وہاں کے قیام کے واقعات۔

جنرل عثمان کے جنازے میں شرکت جہاں وہ سوگواروں کے ہجوم میں دو گھنٹے تک بیٹھے رہے کیوں کہ نظام تشریف لانے وا
تھے۔

وائسرائے کی آمد کے سلسلے میں ریہرسل کا اہتمام اور اس میں شرکت۔

وائسرائے کے استقبال کی تفصیلات۔

شہزادی درِ شہوار اور ان کے نوزائیدہ بچے (نواب مکرم جاہ) کے استقبال کے لیے نام پلی اسٹیشن پر حاضری۔

مارماڈیوک پکتھال لکھتے ہیں کہ ایک روز وہ ڈنر سے فارغ ہوئے تھے کہ سفید Napkin سے ڈھکی ہوئی پلیٹ انھیں بھیجی گئی۔ اس کے ساتھ سلپ پر مسٹر پکتھال اور مسز پکتھال لکھا ہوا تھا۔ Napkin ہٹانے پر پلیٹ میں ٹوسٹ کے دو ٹکڑے نظر آئے جو شاہی دستر خوان سے نظام نے ان کے لیے روانہ فرمائے تھے۔

آخر میں ڈائری کا اہم اندراج:

نواب کاظم یار جنگ کی دختر کی شادی میں، ہم ملک پیٹ گئے۔ دولھا کی کار پھولوں سے لدی ہوئی دیکھی۔ دلہن کے خاندان کے لڑکے اندر شامیانے میں داخل ہونے کے لیے دولھا سے Bargain کر رہے تھے۔ نواب صاحب نے بتلایا کہ یہ ہندو رسم ہے۔ نکاح سے رسم کی ادائگی تک ہم شامیانے میں بیٹھے رہے۔ جب روانہ ہو رہے تھے تو تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ (۸)

یکم جنوری ۱۹۳۵ء کو مارماڈیوک پکتھال کی دس سالہ مدت ملازمت اختتام کو پہنچی۔ نظام نے اپنے ایک خط میں مارماڈیوک پکتھال کی خدمات کی ستائش کی تھی۔ مسٹر اور مسز پکتھال کی آئندہ زندگی کے لیے نظام نے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔

سر اکبر حیدری نے جو اس وقت فینانس ممبر تھے ڈپارٹمنٹ کی سفارش پر زاہد پنشن کے اجرا کی منظوری دی جب کہ مدت ملازمت کے اعتبار سے وہ اس قدر پنشن کے مستحق نہیں تھے۔

مسٹر پکتھال اور مسز پکتھال (۹) کی روانگی سے قبل نظام نے انھیں ایک فیملی لنچ پر مدعو کیا۔ مارماڈیوک پکتھال کو ایک طلائی گھڑی اور مسز پکتھال کو ایک طلائی نکلس بہ طور تحفہ عنایت فرمایا۔

۱۰/ جنوری ۱۹۳۵ء کو مسٹر اور مسز پکتھال انگلستان کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں کی مصروفیات کے بارے میں ان کی سوانح نگار Anne Fremantle نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اس عرصے میں مارماڈیوک پکتھال نے اپنے حیدرآباد کے دوستوں خاص کر پروفیسر اسپیٹ اور مسز ہاشمی سے خطوط کے ذریعے برابر ربط قائم رکھا۔ ان ہی دنوں ہندستان کے اخباروں نے یہ خبر شائع کی تھی کہ مسٹر پکتھال اور مسز پکتھال باقاعدہ طور پر اسپین میں Settle ہونا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر مارماڈیوک پکتھال کو حیرت بھی ہوئی اور اس خبر سے وہ بڑی حد تک محظوظ بھی ہوئے تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ کچھ عرصہ اسپین میں رہ کر وہ مسلم اسپین کے بارے میں ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔

۱۸/ مئی ۱۹۳۵ء تک مارماڈیوک پکتھال کی صحت کافی حد تک اچھی تھی اور اس عرصے میں وہ اسلام کے ثقافتی ورثے پر اپنے لکچروں پر نظر ثانی کرنے میں مصروف تھے۔ اس روز لنچ پر انھوں نے درد کی شکایت کی۔ دوسرے روز یعنی ۱۹/ مئی کو اخبار پڑھنے کے دوران انھیں ایک طرح کی بے چینی کا احساس ہوا۔ آرام لینے کی غرض سے وہ اوپر کے کمرے میں گئے۔ تھوڑی دیر بعد مسز پکتھال انھیں دیکھنے اوپر گئیں۔ جیسے ہی انھوں نے کمرے میں قدم رکھا مسز پکتھال ان کی طرف لڑکھڑاتے قدموں سے بڑھے اور اچانک اپنی شریک حیات کی باہوں میں دم توڑ دیا۔ (۱۰)

=====OOO=====

حواشی

(۱) واضح ہو کہ مارما ڈیوک پکتھال کئی ناولوں اور کہانیوں کے مصنف تھے انگریزی ادب میں ان کا ایک خاص مقام تھا۔ اس کے علاوہ وہ کئی سنجیدہ علمی مقالوں کے مصنف بھی ہے۔ زیر نظر مضمون میں ان کے ادبی کارناموں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ مقامی یونیورسٹی حتیٰ کہ قدیم عثمانیہ کالج اور نگ آباد کالج کی لائبریری میں مارماڈیوک پکتھال کی ایک بھی کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے۔

(۲) مارماڈیوک پکتھال کی سوانح عمری میں کوئی "ہاشمی" کے نام خطوط کا ذکر ہے۔ میرے خیال میں حیدرآباد میں ہاشمی Surname والے صرف دو اشخاص علمی اور ادبی حلقوں میں جانے جاتے تھے۔ ایک تو ہاشمی فرید آبادی ہیں جو غالباً دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے متعلق تھے اور دوسرے نصیر الدین ہاشمی معلوم نہیں ان میں کون سے ہاشمی کے ساتھ مارماڈیوک پکتھال کی دوستی تھی۔ ان کے علاوہ اگر کوئی اور ہاشمی تھے تو صرف Surname کی بنا پر ان کی شناخت مشکل ہے۔

(۳) مارماڈیوک پکتھال کی بایوگرافی میں ترجمے کے مسئلے پر بنایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۴) حیدرآباد میں بھی یہ تشریحی ترجمہ قرآن حکیم کی عربی آیات کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

(۵) حال ہی میں میری نظر سے مسز روی سکے۔ باوا کی کتاب "آخری نظام" گزری ہے (سن اشاعت ۱۹۹۲ء) اس کتاب کے باب ٹرکش کنکشن میں خلیفہ ترکی کی صاحب زادی اور بھتیجی کے ساتھ حیدرآباد کے شہزادگان کے عقد کا ذکر تو ہے لیکن اس سلسلے میں کہیں بھی مارماڈیوک پکتھال کے رول کا ذکر نہیں

(۶) مسز روی سکے۔ باوا نے اپنی کتاب میں نکاح کی تاریخ ۱۲/ نومبر لکھی ہے۔

(۷) عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فارسٹر نے اپنے ناول A Passage To India کے اسکول ماسٹر کا کردار مارماڈیوک پکتھال کو سامنے رکھ کر لکھا تھا لیکن مارماڈیوک پکتھال نے اس بات کا انکار کیا ہے۔

(۸) راقم کے چچا ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی شادی نواب کاظم یار جنگ کی دختر سے ہوئی تھی، ڈائری کا یہ اندراج یقیناً اسی شادی کے متعلق ہے۔

(۹) مسز پکتھال کا پورا نام Mrs. Muriel Marma Duke Pickthal ہے۔

(۱۰) مارماڈیوک پکتھال کے سوانح حیات میں ان کی تجہیز و تکفین اور آخری آرام گاہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

عقائد کے اعتبار سے وہ اپنے آپ کو سنی حنفی المذہب مسلمان کہتے تھے۔ (بہ حوالہ سوانح حیات)

●●●●●●●●●●

پروفیسر سید سراج الدین

فرنانڈو پسووا (Fernando Pessoa)

تعارف

فرنانڈو پسووا، پرتگیزی شاعر، ۱۳/ جون ۱۸۸۸ء کو لزبن میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور کچھ برس پسووا نے اپنے سوتیلے باپ کے ہاں جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن میں گزارے جہاں اس نے انگریزی تعلیم پائی۔ سترہ برس کی عمر میں وہ لزبن لوٹا اور عمر کے باقی تیس سال اس نے اسی شہر میں گزارے۔ لزبن میں اس نے انگریزی اور فرانسیسی میں کاروباری خطوط لکھ کر معمولی سی آمدنی پر زندگی گزاری۔ شادی نہیں کی اور اس کی معاشقانہ زندگی گھٹی گھٹی اور اداس رہی۔ گاہ گاہ اس نے پرتگال کی ادبی زندگی میں سرگرم حصہ لیا۔ ۱۹۱۵ء میں لزبن میں ایک ادبی رسالہ جاری ہوا تھا، آرفیو (Orphew) - کچھ ہی روز جاری رہ کر بند ہو گیا لیکن شہر کی ادبی زندگی پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ پسووا نے اس رسالے کے لیے مضامین لکھے اور بڑی سرگرمی سے اس کے لیے کام کیا۔ شہر کی سب ہی ادبی شخصیتوں سے اس کی ملاقات ہوئی لیکن دوستی کسی سے نہیں۔ پسووا نے اپنی ابتدائی نظمیں انگریزی میں لکھیں جو ایلیٹ کی فرانسیسی نظموں کی طرح بے کار گئیں۔ اس کی پرتگیزی نظمیں چھوٹے رسالوں میں چھپتی رہیں۔ صرف ایک مجموعہ اپنی نظموں کا پسووا نے اپنی زندگی میں چھپوایا۔ "منساجم" (Mensagem) یعنی "پیغام" اس کا عنوان تھا۔ البتہ اس نے ڈیڑھ سو نظموں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ جس کو وہ پٹرارک کی طرز پر کینسیونیرو (Concioneiro) یعنی "گیتوں کی کتاب" کا نام دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں چھپ نہیں پایا۔ اس کے علاوہ ایک صندوق اس نے مسودوں سے بھرا ہوا چھوڑا تھا جس میں کوئی سو نظمیں اور ملی ہیں۔ پسووا اپنے پیش رو کیموانس (Camoens) کے ساتھ پرتگال کے دو اعلیٰ ترین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔

فرنانڈو پسووا بہت ہی نادر قسم کا شاعر ہے۔ بے حد جدید لیکن جدید تو اور بہت سے شاعر ہیں پسووا نے ایک خاص تخلیقی جدت کی۔ اس نے محسوس کیا کہ آدمی کی کئی کیفیتیں، کئی حالتیں ہوتی ہیں اور بعض خاص حالتوں میں وہ ایک اور ہی آدمی بن جاتا ہے، خود مختار، اپنے ایک الگ کردار اور شخصیت کا مالک۔ لہذا پسووا نے اپنے علاوہ تین اور شاعر تخلیق کیے۔ البرتو کیرو (Alberto Caeiro) ، رکاردو ریئس (Recordo Reis) الوارو دے کامپوس (Alvaro de Compos) - یہ پسووا کے فرضی نام نہیں ہیں بلکہ اس سے الگ شخصیتیں ہیں جو اپنی آواز اور اپنا لہجہ رکھتی ہیں۔ پسووا کا یہ احساس تھا کہ جو باتیں وہ ان تین اشخاص سے کہلواتا ہے وہ انھیں کو زیب دیتی ہیں۔ وہی باتیں اگر وہ خود کہے تو ناموزوں لگیں گی۔ چناں چہ جس نظم کا میں نے ترجمہ کیا ہے وہ اور اس کا شاعر جس طرح وجود میں آئے اس کی کہانی خود پسووا نے یوں بیان کی ہے۔

مارچ ۱۹۱۴ء کی آٹھ تاریخ تھی۔ میں اٹھا اور ایک اونچی میز پر پہنچ کر میں نے کاغذ کھینچا اور لکھنا شروع کیا، کھڑے کھڑے، جیسا میں ہمیشہ لکھتا ہوں۔ اور میں نے کوئی تیس نظمیں لکھ ڈالیں، ایک ہی رو میں، ایک انبساط کے عالم میں جس کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ میری زندگی کا سب سے تابناک دن تھا جو مجھے پھر کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ میں نے جس عنوان کے تحت لکھنا شروع کیا۔ وہ تھا "بھیڑوں کا

رکھوالا" اور میں نے اپنے اندر ایک اور شخص کو جنم لیتا محسوس کیا جس کو میں نے فوراً البرتو کیرو کا نام دے دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کیرو گویا میرا استاد ہے۔"

اس کے فوراً بعد پسووا نے چھ نظمیں پسووا کے نام کے تحت لکھیں اور جلد ہی رکاردو ریس اور الوارو دے کامپوس وجود میں آئے۔ پسووا، کا جو شعری مجموعہ ہے وہ انھیں چار ناموں کے تحت الگ الگ حصوں میں چھپا ہے۔ پسووا نے اپنے تجربات دوسروں کی زبانی بیان کیے اور اس طرح ایک نئی معروضیت کو جنم دیا۔ "بھیڑوں کا رکھوالا" ایک عجیب نظم ہے۔ اس میں ایک دہقانی سادگی نیچر سے گہری قربت میں ڈھل گئی ہے جو صرف آبرتو کیرو کا حصہ ہے، پسووا کا نہیں۔ کیرو اپنے بارے میں کہتا ہے کہ صرف میں ہی نیچر کا شاعر ہوں زیر نظر نظم میں منظر کشی نہیں صرف نیچر کے وجود کا احساس ہے جو شاعر کے وجود سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ وجود اور صرف وجود۔

جیسا اوپر ذکر ہو چکا پسووا کی زندگی اداس اور ناکام گزری۔ ایک خوف اس کا پیچھا کرتا تھا کہ کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔ اس خوف کا ذکر اس نے اپنے خطوط میں بار بار کیا ہے۔ اس کے اطراف بھی ادب و فن کی دنیا میں ایسے لوگ تھے جن میں سے اکثروں نے یا تو خودکشی کی یا دیوانے پن تک پہنچے۔ چناں چہ پسووا نے اتنی شراب پی کہ اس کا جگر خراب ہو گیا اور ۱۹۳۵ء میں اس نے وفات پائی۔

فرناندو پیسووا / آلبرتو کیرو

ترجمہ: پروفیسر سید سراج الدین

بھیڑوں کا رکھوالا

میں نے کبھی بھیڑیں نہیں پالیں
لیکن جیسے میں ان کا رکھوالا رہا ہوں
میرا من چرواہا ہے،
سورج اور ہواؤں اور موسموں کا شناسا،
ان کی آہٹ سے آشنا، ان کا ہم سفر۔
انسانوں سے دور
فطرت کی پر سکون تنہائی
میرے پاس آ بیٹھتی ہے
لیکن میں عذاب کی ساعت کی طرح اداس رہتا ہوں
جب کہ وادی کے اس کنارے
سردی اپنا قدم رکھتی ہے
اور لگتا ہے کہ رات آگئی،
چپ چاپ
جیسے تتلی کھڑکی سے اندر آجائے۔
مگر میری اداسی شانت اداسی ہے
کیوں کہ فطری ہے اور موزوں بھی۔
جب روح کو اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے
اور انگلیاں بے سوچے پھول چننے لگتی ہیں
تو اداسی ہی ہونی چاہیے دل میں۔

سڑک کے اس موڑ سے آتی
کسی منڈے کی گھنٹیوں کی آواز
میرے افکار کو آسودہ کر جاتی ہے،

بس یہ افسوس رہتا ہے
کہ مجھے اس آسودگی کا علم ہے،
اگر یہ علم ہی نہ ہوتا تو میرے افکار
آسودہ اور اداس نہیں
آسودہ اور بشاش ہوتے۔
سوچنا ایک زحمت ہے
پڑتے پانی میں بھیگتے ہوئے چلنے کی طرح
جب کہ ہوا تیز ہو رہی ہو اور لگے کہ بارش بڑھ جائے گی۔

میری کوئی تمنا ہے نہ طلب۔
مجھے شاعر بننے کی کوئی ہوس نہیں
شعر تو اپنے کو تنہا رکھنے کا اک بہانہ ہے،
اور اگر کبھی میرا دل یہ چاہتا ہے
کہ خیال ہی خیال میں اک بھیڑ بن جاؤں
(یا پھر بھیڑوں کا پورا گلہ بن جاؤں
تاکہ میرا وجود سارے کہسار پہ پھیل جائے
اور کئی جان داروں کی خوشی مجھے ایک ساتھ نصیب ہو)
اگر میں کبھی ایسا چاہتا ہوں
تو اس کی وجہ بس اتنی ہے
کہ غروب کی گھڑیوں میں،
یا پھر، جب بادل سورج کے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرتا ہے
اور خاموشی کی اک موج گھاس پر سے گزر جاتی ہے،
تو جو کچھ مجھے محسوس ہوتا ہے وہی لکھتا ہوں۔

جب میں اپنی نظمیں موزوں کرتا ہوں
یا سڑکوں اور اونچے راستوں پر چلتے چلتے
خیالوں میں اپنے شعر لکھتا ہوں
تب مجھے لگتا ہے جیسے چرواہے کی درانتی میرے ہاتھ میں ہو۔
پہاڑ کی چوٹی پر میری پرچھائیں دکھائی دیتی ہے
گویا میں وہاں کھڑا
اپنے گلے کی آہٹ پر کان لگائے
اپنے خیالوں کا نظارہ کر رہا ہوں
یا اپنے خیالوں پر کان لگائے اپنے منڈے کو دیکھ رہا ہوں
اور میرے ہونٹوں پر ایک ان جانی مسکراہٹ ہے
اس شخص جیسی
جو کوئی بات نہ سمجھتے ہوئے بھی
سمجھنے کا بہانہ کرتا ہے۔

میں ان سب لوگوں کو سلام کرتا ہوں جو شاید کسی روز میری نظمیں پڑھیں
جب بس پہاڑی کے اوپر پہنچتی ہے
اور لوگوں کی نظر مجھ پر پڑتی ہے
تو میں گھر کے دروازے پر کھڑا
اپنی چوڑی چرواہے کی ہیٹ اٹھا کر
انھیں سلام کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں
کہ انھیں دھوپ، اور جب ضرورت ہو، بارش نصیب ہو
اور میری خواہش یہ ہوتی ہے
کہ ان کے گھروں میں کسی کھلی کھڑکی تلے
ایک محبوب کرسی ہو، جس پر بیٹھ کر
وہ میری نظمیں پڑھیں،
اور پڑھتے پڑھتے انھیں خیال آئے
کہ گویا میں بھی کوئی قدرتی شے ہوں
مثلاً وہ پرانا پیڑ جس کے سائے میں
وہ اپنے بچپن کے کھیلوں سے تھک کر

آستین سے پسینہ پونچھتے، آبیٹھتے تھے

نہ سوچنا ایک اچھا خاصہ فلسفہ ہے۔
میں دنیا کے بارے میں کیا سوچتا ہوں؟
مجھے کیا پتہ کہ کیا سوچتا ہوں
اگر بیمار ہوتا تو شاید کچھ ضرور سوچتا۔
مظاہر قدرت، علت و معلول، آتما پرم آتما، تخلیق جہاں
ان باتوں کے بارے میں میرا کیا خیال؟ کیا رائے ہے؟
میں نہیں جانتا،
میرے لیے ایسی باتوں پر سوچنے کے معنی ہیں
آنکھیں بند کر لینا اور کچھ نہ سوچنا،
اپنی کھڑکی کا پردہ کھینچ دینا۔
(ویسے میری کھڑکی پر کوئی پردہ نہیں)

یہ قدرت کے اسرار! مجھے کیا پتہ کہ یہ سب کیا راز ہے؟
راز تو بس اتنا لگتا ہے
کہ کوئی ایسا نہیں جو اس راز کے بارے میں سوچ سکے۔
اگر کوئی دھوپ میں کھڑا ہو کر آنکھیں بند کر لے
تو وہ سورج کی شناخت کھونے لگتا ہے
اور بہت سی ایسی باتیں سوچنے لگتا ہے جن میں تمازت ہے
پر جب وہ آنکھیں کھولتا اور سورج کو دیکھتا ہے
تو پھر کچھ سوچ نہیں سکتا
کیوں کہ سورج کی روشنی
ہمارے فلسفیوں اور شاعروں کے خیالات سے اعلیٰ تر ہے
اور سورج کی روشنی کو پتہ نہیں کہ وہ کیا کر رہی ہے
اور اسی سبب سے وہ کبھی بھٹکتی نہیں اور سب پر مہربان اور عام۔

فلسفہ؟ ان درختوں کا کیا فلسفہ ہے؟
اپنی ٹہنیوں کے ساتھ پتوں کے تاج سجائے سبز رہنا

اور اپنے وقت پر بھل دینا۔
ان کے بارے میں ہم کبھی غور نہیں کرتے
ہم لوگ ان کے وجود کے احساس سے بے بہرہ ہیں
لیکن ان کے فلسفے سے بہتر کون سا فلسفہ ہے؟
یعنی یہ نہ جاننا کہ وہ کیوں ہیں
اور اس نہ جاننے کو بھی نہ جاننا۔

"اشیا کی ماہیت۔۔۔۔"
"کائنات کے معنی"
مجھ میں نہیں آتا لوگ کیوں ایسی باتوں پر سوچتے ہیں
یہ تو ویسا ہی ہے جیسے کوئی بیٹھا
اسباب و علل پر غور کرنے لگے
جب کہ سورج کی روشنی پھوٹ رہی ہو
اور درختوں پر اک سنہری غبار
اندھیرے پر چھا رہا ہو

اشیا کی ماہیت پر غور کرنا ایک ایسا ہی بے کار عمل ہے
جیسے صحت کے بارے میں غور کرنا
یا کسی چشمے کو پانی کا کٹورا پیش کرنا۔
مظاہر کے صرف ایک ہی معنی ہیں
اور وہ یہ کہ ان کے کوئی معنی نہیں
میں خدا کو نہیں مانتا کیوں کہ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں
اگر خدا یہ چاہتا کہ میں اسے مانوں
تو وہ ضرور مجھ پر ظاہر ہوتا
میرے دروازے سے در آتا
اور کہتا "یہ رہا میں"
(غالباً یہ باتیں
ان لوگوں کو مضحکہ خیز لگیں گی
جو نہیں جانتے کہ چیزوں کو دیکھنا کیا ہوتا ہے

وہ اس شخص کی باتوں کو نہیں سمجھ سکتے
جو اشیا کے بارے میں وہی کہتا ہے
جو ان کا دیکھنا اسے سکھاتا ہے)

لیکن اگر خدا وہی ہے جو یہ پھول یہ درخت ہیں
اور یہ پہاڑ اور سورج اور یہ چاندنی ہے
تو پھر میں ہر ساعت ہر گھڑی اس پر ایمان لاتا ہوں
اور میری ساری زندگی ایک عبادت ہے
ایک حضوری جو بصری بھی ہے اور سماعی بھی۔
لیکن اگر خدا یہ درخت اور پھول
اور یہ پہاڑ اور سورج اور چاندنی ہے
تو پھر میں اسے خدا کیوں کہوں؟
میں اسے پھول، درخت، پہاڑ، چاندنی اور سورج
کیوں نہ کہوں؟
اگر وہ مجھ پر ظاہر ہونے کے لیے
سورج، چاندنی، پھول، درخت اور پہاڑ بن جاتا ہے
اور اگر وہ مجھ پر درخت، پہاڑ، چاندنی، سورج اور پھول
بن کر ظاہر ہوتا ہے
تو اس کے معنی یہ ہیں
کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اسے درخت، پہاڑ
پھول، چاندنی اور سورج ہی سمجھوں۔
لہٰذا میں اس کا فرمان بجا لاتا ہوں
(خدا اپنے بارے میں جانتا ہے
میں اس کے بارے میں تو نہیں جان سکتا)
میں اس کی اطاعت ایک فطری زندگی گزار کے کرتا ہوں
میں اسے چاندنی، سورج، پھول، درخت اور پہاڑ
کا نام دیتا ہوں اور بغیر اس کے بارے میں کچھ سوچے
اس سے محبت کرتا ہوں
میرے لیے دیکھنے اور سننے کا عمل ہی خدا کو یاد کرنا ہے

اور میں ہر گھڑی اس کے ساتھ ہوں۔

میں اپنے گاؤں میں بس اتنی ہی کائنات دیکھ سکتا ہوں
جتنی کہ زمین پر کھڑے مجھے دکھائی دیتی ہے۔
لہٰذا میرا گاؤں اتنا ہی وسیع ہے جتنی کوئی اور زمین
میری قامت میری نظروں کی پہنچ کے برابر ہے
میرے قد کے برابر نہیں۔

بہت آہستگی سے
بہت ہلکے سے
ہوا کا ایک جھونکا گزر جاتا ہے
اور مجھے پتہ نہیں چلتا کہ میں سوچ رہا تھا
اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔

میرا قافیوں سے کوئی واسطہ نہیں
ایک دوسرے کے پاس کھڑے کوئی دو درخت ایک سے نہیں ہوتے۔

میں ایسا ہی لکھتا ہوں جیسے پھول رنگ لاتے ہیں
مگر میرا حرف ان پھولوں کی طرح بے عیب نہیں
کیوں کہ مجھ میں وہ الوہی سادگی نہیں
جو ظاہری کو سب کچھ سمجھتی ہو۔

میں دیکھتا ہوں اور میرا احساس جاگ اٹھتا ہے
بس ویسے ہی جیسے پانی نشیب کی طرف بہتا ہے
میری شاعری بھی ہوا کے جھونکے کی طرح فطری ہے

کسی شے میں، ہم بس اسی شے کو دیکھتے ہیں
اگر ایک چیز میں کوئی دوسری چیز بھی ہوتی
تو وہ ہمیں ایک کیوں نظر آتی؟
اگر دیکھنا اور سننا، دیکھنا اور سننا ہیں

تو پھر اس میں دھوکا کیسا؟
اصل بات یہ ہے کہ ہم دیکھنا سیکھیں
اس طرح کہ جب ہم دیکھ رہے ہوں تو کچھ سوچیں نہیں
اور جب سوچ رہے ہوں تو کچھ دیکھیں نہیں۔

لیکن اس کی خاطر ہم غریب انسانوں کو،
جو اپنی روح کو ہمیشہ ڈھانکے رکھتے ہیں
بہت کچھ بھولنا اور بہت کچھ سیکھنا پڑے گا،
نئے درس لینے ہوں گے۔
اس خانقاہ کی آزاد فضا میں داخل ہونا ہوگا
جہاں، شاعروں کا بیان ہے
کہ تارے، راہب اور پھول ایک دن کے پر جوش، شرم سار گنہ گار تھے
لیکن جہاں بالآخر
تارے تارے ہیں اور پھول پھول
اسی لیے تو ہم انھیں تارے اور پھول کہتے ہیں۔

یہ صابن کے جھاگ سے نکلتے حباب
جو ایک بچہ اپنی گھاس کی نلکی سے بکھیر رہا ہے
یہ بھی ایک شفاف اور روشن فلسفہ ہیں
بے قصد اور مظاہرِ فطرت کی طرح گریزاں اور ناپائیدار
مظاہر کی طرح ہماری نظروں کے آشنا،
جو ہیں بس وہی ہیں
اپنی شفاف گولائی میں بے عیب اور مکمل
اور کوئی شخص، اور خود یہ بچہ بھی یہ نہیں سوچتا
کہ یہ جو ہیں اس کے سوا بھی کچھ ہو سکتے ہیں۔
ان حبابوں میں بعض روشنی کی موجوں میں ایسے گم ہو گئے ہیں
کہ دکھائی ہی نہیں دیتے
اس ہوا کے جھونکے کی طرح جو پھولوں کو بس ذرا سا چھو لیتا ہے
اور ہم اس کے گزرنے کو صرف اس لیے پہچانتے ہیں

ہمارے اندر کوئی چیز ہوا میں اڑنے لگتی ہے
ہر شے زیادہ واضح لگنے لگتی ہے

ں کبھی کسی بہت ہی شفاف، بے عیب، روشن دن میں
ب کہ ہر چیز بہت حقیقی لگتی ہے
ں گھڑی بھر کو رک کر یہ سوچتا ہوں
میں کس لیے چیزوں کے حسن کی بات کرتا ہوں
پھولوں اور پھلوں میں حسن ہے؟
میں ان کی ایک الگ شکل اپنا ایک وجود ہے اور بس
سن کا بجائے خود کوئی وجود نہیں
ہ تو محض اس مسرت کا نام ہے جو کسی شے کو دیکھ کر
میں نصیب ہوتی ہے
ر میں کیوں چیزوں کو بے وجہ حسین کہتا ہوں؟

ں میں بھی، جو صرف جینے کے لیے جیتا ہوں،
یں بھی لوگوں کے اس جھوٹ میں پھنس جاتا ہوں
وہ چیزوں کے بارے میں کہتے رہتے ہیں،
وہ چیزیں جن کی واحد صفت ان کا وجود ہے۔

کیا کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ میری کوئی سرّی فکر ہو؟
ہاں ہے، لیکن وہ صرف میرے جسم کی سرّیت ہے
میری روح بہت سادہ ہے، اس کی کوئی سوچ نہیں
میرا سرّی علم بس یہ ہے کہ کوئی علم نہیں
زندگی صرف زندہ رہنے کا نام ہے۔

میں نہیں جانتا کہ نیچر کیا ہے۔ میں تو صرف اس کا گیت گاتا
میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر
ایک الگ تھلگ چونے کی سفید دیواروں والے مکانوں میں رہتا ہوں
بس یہی میری پہچان ہے۔

رات کے سناٹے میں میری آنکھ کھلتی ہے
اور میری ٹک ٹک کرتی گھڑی ساری رات کا احاطہ کر لیتی ہے
باہر پھیلی کائنات کا مجھے کوئی احساس نہیں
میرے کمرے میں اندھیرا ہے اور سفید دیواروں کی دھندلی اجلاہٹ

دیواروں کے پرے ایسا سکوت ہے کہ گویا کوئی شے موجود نہیں
میرے ہاتھ پڑی گی اور میز پر رکھی گھڑیوں کی ٹک ٹک
زمین و آسمانوں کے سارے وجود کو نگل گئی ہے۔
میں اس سوچ میں گم ہوں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ کیا رمز ہے؟
پھر میں رک جاتا ہوں اور میرے لبوں کے کناروں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
میری گھڑی کا سارا رمز
ایک چھوٹے سے وجود میں
اس عظیم رات کے سمٹ آنے کا عجیب احساس ہے اور بس

کسی بے پناہ روشن دن
جب آپ کا بے اختیار جی چاہے
کہ کاش پہلے اتنا کام کر لیا ہوتا
کہ آج کچھ نہ کرتے
ایک ایسے روشن دن مجھے
کسی جنگل میں چھپے رستے کی طرح
اس عظیم راز کی ایک جھلک نظر آئی
جس کا ذکر نام نہاد شاعروں کے ہاں ملتا ہے
نیچر کا کوئی وجود نہیں
ہاں پہاڑ، وادیاں اور میدان ہیں
درخت اور پھول ہیں، سبزہ ہے
ندی نالے اور پتھر ہیں
لیکن کوئی کل نہیں جس کے یہ ٹکڑے ہوں
ان کے رشتے ڈھونڈنا ہماری اک بیماری ہے
نیچر ٹکڑوں کا نام ہے جس کا کوئی شیرازہ نہیں

غالباً یہی وہ راز ہے جس کا ذکر لوگ کرتے ہیں
یہ وہ سچائی ہے جو مجھ پر بے سوچے آپ ہی عیاں ہوئی
یہی وہ سچائی ہے جس کو لوگ ڈھونڈتے ہیں اور پاتے نہیں
اسے صرف میں نے پایا کیوں کہ میں نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی

میں اپنے گھر میں داخل ہو کر کمرے کی کھڑکی بند کر دیتا ہوں
گھر کے لوگ میرے لیے لیمپ لے آتے اور مجھے خدا حافظ کہہ کر چھوڑ جاتے ہیں
میں اپنی پر سکون آواز میں انھیں خدا حافظ کہتا ہوں۔
خدا کرے میری زندگی بس یوں ہی رہے:
دھوپ سے روشن یا بارش سے نم دن
یا ایسے طوفانی کہ گویا دنیا کا خاتمہ آپہنچا ہو
سہانی شامیں اور کھڑکی کے نیچے سے گزرتے لوگ
جن کو دیکھنا میری دل چسپی.
درختوں اور ان کے سکوت پر اک آخری نظر
پھر کھڑکی کا بند اور لیمپ کا روشن ہونا
نہ کچھ پڑھنا، نہ سوچنا، نہ سونا
بس زندگی کو اپنے اوپر سے ندی کی طرح بہنے کا احساس
اور وہاں دیواروں کے پرے
ایک عظیم سکوت
جیسے کوئی خدا محو خواب

○ ○ ○

قاضی سلیم

تعبیر

سوتے جاگتے چاند ستاروں کی مخمور نگاہوں نے دیکھا
بونے ٹھگنے پودے اور چھتنار تناور پیڑ جو اب تک
اپنے اپنے استھانوں پر پھلتے پھولتے
دور ہی دور سے
صرف ہواؤں کی پیغام بری پر خوش تھے
اپنی گہری اور گھنیری چھایا کے تانے بانے بنتے
اپنا اپنا پراگ چہیتوں کو بھجواتے
قدموں میں کچھ پھول نچھاور کرتے
پتوں کا سنگیت ------
سناتے ، سنتے ، کھو جاتے
بوجھل اور گھنی راتوں میں جب شاخیں
سپنوں کے بوجھ سے جھک جاتیں
تب سو جاتے

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
یگوں یگوں کی پیاس ----
------ پیو ملن کی جلتی پیاس بھڑک کر
کالی کی ریکھاؤں میں پھیل گئی
ایسے لگا
ٹھنڈی برفیلی جھیل میں
سورج کا ایک دہکتا ٹکڑا ٹوٹ گرا
چاروں اور مسلسل زلزلے دھکے
شور دھماکے
دہاڑتے پربت
چیختے جنگل
گرج گرج برساتیں
جانے کتنی صدیوں کے دن تھے
کتنی صدیوں کی وہ راتیں

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا

بجتے کانوں میں لیکن گونج رہی ہیں
سناٹے کی سانسیں
سنکھوں سیپوں میں بس جاتی ہیں
ساگر کی دھیمی دھیمی آوازیں
آوازوں کی تہہ میں
گاتا پھوسی جیسے
ٹوٹے ہکلاتے لفظ
ادھورے بول
دور فضا کی پھیلی نیلی دھند میں
اک بے آب پھڑکتی مچھلی
بھولا بھٹکا سا بے چین ہیولیٰ
تنہا ڈولتا اڑتا پر
یہاں ، وہاں ----
دبی چھپی اک ہلچل سی
پھیر بدل کی خواہش سی
اک سازش نئی
لگتا ہے شاید اندھے پاتالوں میں
شانت------
اکیلی اونگھتی گائے
سینگ بدلنے والی ہے

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
آج انھیں پیڑوں پودوں کی نس نس میں
بہتے رس کے بدلے
خون کی دھارا جاگ اٹھی ہے
تپ تپ کر برمائے ہوئے
ارمان بڑھے
آپس میں ملے
مضبوط جڑیں دھرتی سے اکھڑیں
-------چلنے لگیں

محمد علوی

رات ہزاروں آنکھوں والی

ایک آنکھ والے دن نے
اتنی بھیڑ بھری دنیا میں
کب مجھ کو پہچانا ہے!
لیکن رات کی بات اور ہے!
رات ہزاروں آنکھوں والی
مجھ کو دیکھتی رہتی ہے!
پیار سے مجھ کو کہتی ہے
میں تجھ کو پہچانتی ہوں
تیرے دکھ کو جانتی ہوں

○ ○ ○

بے چارہ چاند

رات نے جلدی جلدی
تارے سمیٹے
اندھیرے لپیٹے
اور تیرتی ڈوبتی
افق کے اس پار اتر گئی
باوری جلدی میں
چاند۔ ہمیں چھوڑ گئی
بے چارہ چاند
سورج سے آنکھ ملا کے
روشنی کھو رہا ہے!
اندھا ہو رہا ہے

○ ○ ○

رفعت سروش

خوابوں کی دنیا

تمھارے خط مجھے پھر لے گئے خوابوں کی دنیا میں
جہاں لب ریز جھیلیں ہیں
روپہلی مچھلیاں ہیں، تیرتی پھرتی ہیں پانی میں
سنہری کشتیاں ہیں، بادباں ہے خود ہوا جن کی
کہستانی فضا ہے۔ بارشیں ہیں
حسن ہے بھیگا ہوا
شرمائے ہے جب دیکھتا ہے عکس پانی میں
چٹانیں ہیں بنے ہیں سنگ پاروں سے جہاں ایواں
کھلے آنگن، بڑے دالان ہیں، اونچی منڈیریں ہیں
دریچے۔ چاند جن سے جھانکتا ہے خواب گاہوں میں
روپہلی چاندنی کے تار جس دم چھیڑ دیتے ہیں ستار اپنا
ہوائیں لوریاں گاتی ہیں،
خوابوں کی حسیں پریاں اتر آتی ہیں آنکھوں میں
سحر کے دل کشا منظر،
جہاں انگڑائیاں لیتا ہے سورج بانسری کی تان کو سن کر

مگر دنیا میں خوابوں کی کہیں تعبیر ملتی ہے!!

○ ○ ○

جنم دن

نئی کرن نے اچانک کیا سلام مجھے
وہ آسمان سے اتری تھی رتھ میں سورج کے
میں اس کی شوخ نگاہی پہ ملتفت سا ہوا
قریب آئی ـــــ مرا چہرہ غور سے دیکھا
کہا ـــــ بس آج ہی اتری ہوں آسمانوں سے
تمھارے بارے میں سورج سے یہ ہوا معلوم،
کہ یہ دوانہ ہے،
اکثر سفر میں رہتا ہے
میں اس کے پاس انہتر برس سے آتا ہوں
یہ ایسا بوڑھا ہے بچپن جوان ہے جس کا

○ ○ ○

علی ظہیر

دفنِ آفتاب

(خلیج کی ایک شام)

رل رہا ہے ریت میں
لہولہان آفتاب
اپنے جسم کی تمام تر حرارتیں لیے
پھوٹتی امیدیں ان گنت بشارتیں لیے

ریت کی صداقتیں تمام تر سراب ہیں
ریت کے بدن پہ صرف پانیوں کی چھاپ ہے
سمندروں کا عکس ہے
سراب ہے ۔ سراب ہے ۔

دفنِ آفتاب پر
نہ رات بال کھولے گی
نہ چاند منھ دکھائے گا
نہ تارے پاس آئیں گے

ایک شور بے کراں سے پھیلتی صدائے موسیقی
پیرہن اتارتے تھرکتے جسم
چند عقابی آنکھیں جن کو گھورتی
یہ دفنِ آفتاب کے رسوم ہیں

مگر یہ آفتاب بھی عجیب ہے
روز مر کے جیتا ہے
صبح کی اذان پر
صبا کا نرم اور لطیف ہاتھ تھام کر
مشرقی افق سے سینہ تان کر ابھرتا ہے
یہ آفتاب بھی عجیب ہے!

○ ○ ○

ثروت زہرا

ایک نظم

زندگی
آگ کا تکمیل ہو چکی ہے
جہاں سے زخم کے لیے
راکھ لی جا رہی ہے
بندگی
زمین و آسمان کی حدوں کا
میل ہو چکی ہے
جہاں سے کائنات کا خط استوا
شروع ہو جانا چاہیے
شاعری
حروف کی ترکیل ہو چکی ہے
کہ جسے شعور کی ضرورتوں کے مطابق
استعمال کیا جا رہا ہے
خوابوں کو
آنکھ کی جیل ہو چکی ہے
جہاں وہ اگی اور پھر اگی
پیشی کے انتظار میں
آنسوؤں کے ساتھ جھڑتے جھڑتے
اپنے ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں

○ ○ ○

گھر

خلا میں جالا ٹنگا ہوا ہے
اور اس کے دھاگے کے اک سرے پر
ہوا کی جنبش پہ ایک مکڑی
خود اپنی سولی پہ اوندھی لٹکی
ہوا کی سانسوں پہ ڈولتی ہے

○ ○ ○

عطیہ فاطمہ

ملاقات

خاموش دیواریں
خالی کمرے
چھت پر لٹکتے جالے
جھینگر کی جھائیں جھائیں
کالی رات
سیاہ دوشالا اوڑھے
آتی تھی ملنے
کس سے ملنے؟
اندھیرے سے!
نہیں نہیں
شاید میں راستہ بھٹک گئی ہوں

جھوٹ

سمجھا تھا میں نے
بھول چکا ہوں گی
جب اپنے دل سے مٹا چکی ہوں
مگر اچانک سرِ راہ جب اس کا سامنا ہوا
تو گم گشتہ جذبوں کے
کھلتے ہوئے موسم میں
مجھے لگا
جھوٹ تھا وہ گزرا ہوا عرصہ
جو تنہا رہ کر ہم نے بتایا تھا

خوش نصیب

اے املتاس کے پھول
تیری قسمت کتنی اچھی ہے
کیوں کہ تیرا رنگ زرد ہے
بہار آئے کہ خزاں
تیرا رنگ کبھی بدلتا نہیں
تیرے چہرے کو
کوئی پڑھ سکتا نہیں
کتنا خوش نصیب ہے تو

○ ○ ○

افتخار عارف

○

حدود جاں سے پرے جارہا ہے اور طرف
لہو بدن کو لیے جارہا ہے اور طرف

گہے زمیں کی طرف شاخِ سرخ رو کی مثال
مثالِ ابر گہے جارہا ہے اور طرف

غبارِ جادۂ بے اعتبار ، آخر کار
تلاش کرکے مجھے جارہا ہے اور طرف

مری طرح ہے مرے شہر کا مقدر بھی
بکھر بکھر کے لیے جارہا ہے اور طرف

میں ایک اور طرف جارہا ہوں خواب کے ساتھ
زمانہ مجھ کو لیے جارہا ہے اور طرف

محاذ رات نے کھولے ہوئے ہیں دل کے خلاف
مگر چراغ جلے جارہا ہے اور طرف

○

آسمانوں پر نظر کر انجم و مہتاب دیکھ
صبح کی بنیاد رکھنی ہے تو پہلے خواب دیکھ

دوش پر ترکش پڑا رہنے دے پہلے دل سنبھال
دل سنبھل جائے تو سوئے سینۂ احباب دیکھ

ہم بھی سوچیں گے دعاءِ بے اثر کے باب میں
اک نظر تو بھی تضادِ منبر و محراب دیکھ

موجۂ سرکش کناروں سے چھلک جائے تو پھر
کیسی کیسی بستیاں آتی ہیں زیرِ آب دیکھ

بوند میں سارا سمندر آنکھ میں کل کائنات
ایک مشتِ خاک میں سورج کی آب و تاب دیکھ

افتخار عارف کے تند و تیز لہجے پر نہ جا
افتخار عارف کی آنکھوں میں الجھتے خواب دیکھ

○ ○ ○

مصحف اقبال توصیفی

○

یہ کیسا کھیل ہے، اب اس سے بات بھی کرلوں
کہے تو جیت کو اپنی میں مات بھی کر لوں

یہ اختیار مرا، تجھ کو جس طرح سوچوں
سحر کو شام کہوں، دن کو رات بھی کر لوں

بلاؤں (اشکوں سے روشن کروں یہ آنکھ کا گھر)
پر، تیری یاد کو، اور دل سے گھات بھی کر لوں

یہ دکھ رہے گا کہ ہر گام پر بچھڑنا ہے
اگر سفر میں تجھے اپنے ساتھ بھی کر لوں

کسی کا نام نہ لوں اور غزل کے پردے میں
بیان اس کی میں ساری صفات بھی کر لوں

تو میری ذات کا محور، مرا مدار بھی تو
یہ مشتِ خاک اسے کائنات بھی کر لوں

○ ○ ○

محمد علوی

○

سر پھری یادوں نے گھیرا تھا بہت
رات پہلو میں اندھیرا تھا بہت

غیر سے اب دوستی کرلی تو کیا
کچھ دنوں پہلے وہ میرا تھا بہت

پیڑ کے گرنے سے پہلے دو گھڑی
شاخ پر اس کی بسیرا تھا بہت

ایسا لگتا ہے کہ دنیا دیکھ لی
اس گلی کا ایک پھیرا تھا بہت

گھر سے نکلا تو گلی سنسان تھی
اس سے علوی سویرا تھا بہت

○ ○ ○

مظفر مجید

○

سمجھ رہے تھے بہار آئی ہم اپنے دیوانے پن میں آکر
ببول خوش بو اڑا رہے تھے گلاب کے پیرہن میں آکر

یہی نہیں ہے کہ اگ رہے ہیں عمارتوں کے مہیب جنگل
مزہ تو یہ ہے کہ بستے جاتے ہیں ڈھور ڈنگر بھی بن میں آکر

الف کا ہم نام بے رکھیں گے۔ نئے نئے ذائقے چکھیں گے
کہ لفظ چولا بدل رہے ہیں ہماری فردِ سخن میں آکر

عروسِ شبنم حیا کی ماری، کرن کی تیار تھی عماری
کہ ناگہاں رہ گیا اٹھ کر غریب سورج گہن میں آکر

ارے یہ شیریں زباں کہ کچھ کم نہیں ہے چشمہ حلاوتوں کا
کچھ اور بھی ہو گئی ہے شیریں ہمارے کڑوے دہن میں آکر

کروڑوں نابینا ماہ و انجم فلک کا دامن ٹٹولتے ہیں
ہیں کتنے سورج کہ اپنی بینائی کھو چکے ہیں کرن میں آکر

رہیں سلامت وہ جھیل آنکھیں، جھکی جھکی سی جھیل آنکھیں
سکون ملتا ہے اے عزیزو سبھی کو اپنے وطن میں آکر

اگر ذرا سوچیے تو تھیں وہ بھی کیسی کیسی عجیب باتیں
جو خوش نصیبی سے اپنی مظفر نکل گئیں اپنے من میں آکر

اعجاز عبید

○

یہ دن کیسے ستم گر ہوگئے ہیں
ہم اپنے گھر میں بے گھر ہوگئے ہیں

مری آنکھوں سے نکلے تھے جو آنسو
تری آنکھوں میں گوہر ہوگئے ہیں

جہاں اک دن دھنک لہرائی اس نے
ہم اس رستے کے پتھر ہوگئے ہیں

صدا اپنے ہی در پر دے رہے ہیں
عجب پاگل گداگر ہوگئے ہیں

لہو سے یوں لکھو گے نثر کب تک
اٹھو دفتر کے دفتر ہوگئے ہیں

○ ○ ○

○

تجھ چشم نمی گواہ رہیو
مجھ دل کی لگی گواہ رہیو

ان آنکھوں کی سازشیں عجب ہیں
اے سادہ دلی گواہ رہیو

آنکھیں بھی ہیں خشک، چپ بھی ہوں میں
شائستہ لبی گواہ رہیو

مجھ لب پہ نہ اس کا نام آیا
اے نزع دمی گواہ رہیو

ٹھہروں بھی تو کیا زمیں رکے گی
پیہم سفری گواہ رہیو

تجھ بن نہ کبھی قرار آیا
بستر شکنی گواہ رہیو

اوروں سا تمھیں بھی میں نے چاہا
تم خود بھی کبھی گواہ رہیو

○ ○ ○

کاوش عباسی

زمینِ دل کو رہینِ بہار کر کچھ اور
شگوفہ ہائے محبت میں رنگ بھر کچھ اور

میں پھرتا تھا ان ہی سڑکوں پہ نامراد کبھی
پر اب تو کہتی ہے جیسے ڈگر ڈگر کچھ اور

ابھی کہاں کوئی اک مستقل ٹھکانہ مرا!
ابھی تو رہنا ہے اس دل کو دربدر کچھ اور

لگیں گے زخم تو اب بھی، پھریں گے رسوا بھی
پہ ہوگا مدِ نگاہِ بلند تر کچھ اور

غلط جو کہتے ہو کاوش سفر تمام ہوئے
ابھی پھرائے گا یہ خوابِ خوب تر کچھ اور

○ ○ ○

اسلم عمادی

تماشا یوں بھی گراں مایہ ہے نہ ہونے کا
ہے دور دور تک اب شہرہ جان کھونے کا

ہے روح ویسے بھی آتش زدہ ترے غم سے
ہمیں کہاں کبھی احساس اپنے ہونے کا

ہمارے شہر کا موسم عجیب تھا کہ جہاں
گماں ہر ایک پہ دائم تھا اک کھلونے کا

فضا میں جلتے ہوئے گوشت کی یہ بو کیسی؟
یہاں ثبوت دیا کس نے آگ ہونے کا

ہوئے طیور و شجر مشت پر خس و خاشاک
کہ اب چمن بھی کوئی ضابطہ ہے سونے کا

ہمیں تو شکوہ نہیں، ہم جو خوب جانتے ہیں
کہ تجھ کو شوق ہے نشتریوں ہی چبھونے کا

خموش چیزوں پہ گر غور کیجیے اسلم
تو ان پہ شائبہ ہوتا ہے جان رونے کا!

○ ○ ○

یاسمین گل

○

ہمیں تو اس کے لہجے پہ گماں کچھ اور ہی تھا
عدالت میں وہ آیا تو بیاں کچھ اور ہی تھا

وفورِ شوق کا ہر رنگ اڑ جاتا نہ کیسے
جہاں کچھ اور سوچا تھا، وہاں کچھ اور ہی تھا

ہم اپنی آنکھ میں منظر سجا کر چل پڑے تھے
کہ اگلے پل تو دیکھا سماں کچھ اور ہی تھا

بہت سے خوش گمانوں سے ملے، جب ہم نے جانا
کلامِ خوشنما میں وہ کم زباں کچھ اور ہی تھا

بنے کیا کیا فسانے موسموں کی چپ کے لیکن
ہوا بدلی تو رنگِ داستاں کچھ اور ہی تر تھا

کسی بھی مسئلے کی ہم پہ نہ کھل پائی حقیقت
زباں پہ اور کچھ، زیرِ زباں کچھ اور ہی تھا

○ ○ ○

○

وہی تو یہ راز جانتا ہے کہ شرحِ اصلِ جمال کیا ہے
میں سات رنگوں میں بھیگتی ہوں تو اس میں میرا کمال کیا ہے

عجیب نشے میں جھومتی ہے پہاڑ کی سربلند چوٹی
زمیں نے بادل کو چھو لیا ہے، نہ بھیگنے کا سوال کیا ہے

وہ دور جنگل میں ایک غنچہ جھکتی شاخوں پہ کیوں کھلا ہے
جو باعثِ حسنِ نظر نہیں ہے تو خوبیِ خدوخال کیا ہے

یہ چاند کی اتنی پوری نظروں میں، گہری نظروں میں کیا کشش ہے
سمندروں کی ہتھیلیوں پر یہ پانیوں کا اچھال کیا ہے

اسے خبر ہے تو یہ، کہ چپ ہوں، مجھے پتہ ہے، میں رقص میں ہوں
مگر کسی کو یہ کیا پتہ ہے، یہ تھاپ کیا ہے، یہ تال کیا ہے

○ ○ ○

ڈاکٹر کرامت علی کرامت

○

کچھ تو امواجِ حوادث کے قرینے ہوتے
جھیلنے کے لیے تب دل کے سفینے ہوتے

حال کی چھت سے میں فردا کا نظارہ کرتا
کاش ہموار کبھی وقت کے زینے ہوتے

یوں تو انمول تھے، تم وب کے رہے کانوں میں
بن کے الماس انگوٹھی کے نگینے ہوتے

اہلِ ثروت کے شبستاں کے مہکتے ہوئے پھول
دن میں مزدور کے ماتھے پہ پسینے ہوتے

عاقبت زود تکلم کی سنور ہی جاتی
تجربے اپنے جو انمول دفینے ہوتے

جن کو ہے ناز کہ سجدوں کا نشاں رکھتے ہیں
ان کے دل میں نہ کسی کے لیے کینے ہوتے

مثلِ آئینہ کرامتؔ چمک اٹھتی تاریخ
گردِ نفرت سے اگر پاک یہ سینے ہوتے

○ ○ ○

○

باغوں میں شور وغل ہے مگر عندلیب چپ
کیا بات ہے کہ میرا شگفتہ نصیب چپ

میری شکستگی پہ ہے مہرِ سکوت کیوں ؟
سارے حریف کیوں ہیں پریشاں، رقیب چپ

میرے مرض کا حال بتاتا نہیں کوئی
احباب صرف روتے ہیں اور ہے طبیب چپ

شمعِ وفا کے قتل پہ آرے ہیں اشک ریز
لیکن کلش ، مینارہ ، نشانِ صلیب چپ

طاری ہے ایک سکتہ کرامتؔ کچھ اس طرح
ماحول ہے عجیب ، امیر و غریب چپ

○ ○ ○

زبیر شفائی

○

ہر کرن قلم کردے
رات دن نام کردے

روشنی بھٹکتی ہے
میرے فن میں ضم کردے

سوچ میرے بارے میں
سوچ کر رقم کردے

آبگینہ ۔قی کر
اور خاک نم کردے

دھڑکنیں زیادہ ہیں
ایک سانس کم کردے

دیکھ لوں میں شکل اپنی
آئینہ علم کردے

لکھ زبیر بسم اللہ
بقیہ کالعدم کردے

○ ○ ○

○

چاک سے وقت کی رفتار بڑھا سکتا ہے
خاک زندہ ہے وہ پائندہ بناسکتا ہے

لیے بیٹھا ہوں میں ہاتھوں میں کھلی تلواریں
میرا جوہر ہی مرے سامنے آسکتا ہے

تو ہوا ہے نہ کرن ہے نہ ہے موجِ خوش بو
اس خرابے سے نکل کر نہیں جاسکتا ہے

وقت بے وقت کھنک اٹھتی ہے زنجیر اپنی
یہ تماشا مجھے ویرانہ دکھاسکتا ہے

موجِ دریا سے اٹھی چل پڑی پیچھے کی طرف
یہ عمل بیتے ہوئے دن ابھی لاسکتا ہے

شاخ کے پھول کو جوڑے میں سجانے والا
وہ تو موسم کو بھی پوشاک بناسکتا ہے

پنکھڑی پنکھڑی ہوجائیں گے جب پھول زبیر
زرد ہونے سے مجھے کون بچاسکتا ہے

○ ○ ○

عرفان احمد عرفی

کھڑکی

یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ صبح ہوتے ہی زمین پر جوں ہی روشنی کی صف بچھتی وہ بھی انگلیوں کی پوروں میں تسبیح کے دانے رولتی چہل قدمی کے لیے سڑک پر آنکلتی۔ اس پہر سڑک پر بس وہی لوگ دکھائی دیتے جو منھ اندھیرے مسجد کا رخ کیا کرتے۔ ایک زمانہ تھا اس سڑک پر وہ بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتی فٹ پاتھ کے کنارے کھڑے درختوں کو پیچھے چھوڑ رہی ہوتی جیسے اب سڑک پر چلتے لوگ اس سے آگے نکل رہے ہوتے ہیں۔ اب تو ٹانگوں میں اتنی طاقت ہی نہ تھی۔ پیٹھ اور پنڈلیوں سے درد بھی نہ جاتا تھا لہٰذا دھیان تسبیح کی طرف بٹائے رکھنا مجبوری تھی۔ دن بھر مصروف رہنے کے بہانے بھی اس نے ڈھونڈھ ہی نکالے تھے۔ خانساماں رکھا ہی اس لیے نہیں تھا کہ اس بہانے کھانا وہ خود پکا لیتی تھی البتہ سرونٹ کوارٹر میں ایک عورت ضرور تھی جو چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔

گھر تھا کہ تنہائی کا گھونسلا جہاں اسے اپنی اداسی کے پر سمیٹ کر لوٹنا ہی پڑتا۔ گھر سے باہر تھوڑی دور تک جاتی ہوئی بس یہ ایک بے رونق سی سڑک تھی جو اسے زندگی کیے جانے پر اکسائے رکھتی۔ سینے پر چلتی پھرتی زندگی کا بوجھ اٹھائے کبھی بھی صفحۂ ہستی سے نہ مٹنے کے مصمم ارادے سے اپنی جگہ پر جمی سڑک جو کبھی کبھی اس کے پیروں میں سے اتنی زیادہ سرک جاتی کہ مڑ کے دیکھتی تو وہی سڑک جو تھوڑی دیر پہلے اس کی دم ساز تھی اس کی دشمن دکھائی دیتی۔ اب تک دھوپ درختوں میں سے پتوں کی سیڑھیاں اتر کر ہر سو لمبی تان سو رہی ہوتی۔ سڑک سے اتنا نہ ہوتا اس کی خاطر تھوڑا سا اپنا آپ سمیٹ لیتی، اتنا کہ اس کا گھر قریب آ جاتا۔ آخر روز کا ساتھ تھا۔ اتنا تو اسے کر ہی لینا چاہیے تھا۔

ایک وقت تھا صبح سیر کے دوران ارد گرد بنگلوں کی بیرونی آرائشیں خاموشی کی زبان میں اسے بہت کچھ کہہ رہی ہوتیں۔ تب تک مکین سو رہے ہوتے اور کھڑکیوں اور روشن دانوں میں نصب شور ڈالتے ائر کنڈیشنر انھیں مزید سوئے رہنے کو لوریاں دے رہے ہوتے۔ چلتے چلتے اکثر کسی گھر کی بالکنی یا ٹیرس پر سجی پھولوں سے لدی بیل کو سراہنے وہ چند ساعت ٹھہر جاتی مگر اب تو ان بنگلوں کی چھتوں پر سے اس کے دھیان کی گیند لڑھکتی ہوئی سڑک پر آ گری تھی جس پر سے نظریں ہٹائے بغیر وہ پہروں چلتی رہتی، اگرچہ کبھی کبھار اس کے کسی قدم کی ہلکی سی ٹھوکر سے وہ گیند کہیں گم بھی ہو جاتی جیسا کہ اس روز وہ گیند اچھلی اور اتنی بے قابو ہوئی کہ سڑک کے کنارے ایک نو تعمیر شدہ اور بے آباد بنگلے کی بالائی منزل پر نصب کھڑکی سے جا لگی۔ نئے طرز کی کشادہ اور خوب صورت کھڑکی جو کسی نایاب لکڑی کے فریم میں اپنے چمک دار شیشے سنبھالے مرمر سے بنی عمارت کے اوپر یوں جڑی تھی جیسے گوری پیشانی پر بندیا۔

بالکل اک ایسی ہی کھڑکی اس تصویر میں بھی نمایاں تھی جسے چند روز پہلے اس نے ڈاک میں موصول کیا تھا۔ اداسیوں اور جدائیوں کے بے رحم سمندر عبور کرتی ہوئی ڈاک جیسے دور دیسوں سے اڑتے خوش خبریوں کے پرندے اپنی اپنی چونچ میں تسلیوں کے دانے لیے اس کے سامنے ڈھیر کر جاتے جنھیں ایک اک کر کے وہ چگتی اور جب ختم ہو جاتے تو اپنی خالی آنکھیں آسمان میں گاڑ لیتی، کیا خبر کوئی پرندہ پھر سے لوٹ آئے۔۔۔۔ یہ خیریت نامے ہی تھے جن سے اسے اپنے ہونے کا پتہ رہتا۔ اگرچہ ان کے موصول ہونے اور انھیں ایک باقاعدگی دیے رکھنے میں بھی اس کا اپنا ہی ہاتھ تھا۔ آئے دن قلم تھامے وہ کاغذ لے کر لکھ رہی ہوتی اور انتظار کے راستے روشن کرتی رہتی۔ صبح چہل قدمی کے دوران تسبیح

کے علاوہ قریب کے پوسٹ بکس کو خط کے لفافے سپرد کرنا بھی اس کا ایک خاص کام ہوتا۔

جیسے جیسے جانے والے جاتے رہے گھر کی دیواریں تصویروں سے بھرتی گئیں۔ یوں تو اسے ایک ایک کر کے سب کے جانے کا د
مگر ایک "ہاں" جو اس سے سرزد ہوئی زندگی بھر کا پچھتاوا بن گئی۔ ان دیکھی دنیا میں ان دیکھے لوگوں کو بیٹی کا سپرد کرنا اپنے ہی ہاتھوں و
جسم کے کسی حصے کو کاٹ دینے سے کم نہ تھا۔ شاید تب اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ کب جانتی تھی جب سب دور اس پار سد
جائیں گے تو زندگی پوسٹ بکس تک جانے والی سڑک پر چہل قدمی کرتی رہ جائے گی۔ تصویریں، خط اور کبھی کبھار کے فون تھے جو رابطے
رہے۔ اگرچہ برسوں میں پھیلے اس انتظار میں وہ دن بھی آئے جو ملاقاتوں کے تھے لیکن ایسے دن آتے تو لمحوں میں بیت جاتے اور جب جا
پہلے سے بھی زیادہ اداس کر جاتے، جیسے پھولوں کے موسم لوٹ جائیں تو بھی خالی گل دان مہکتے رہتے ہیں۔

شروع شروع میں سب اپنے بچوں سمیت چھٹیاں گزارنے اس کے پاس آتے بھی رہے لیکن اب وقت کے ساتھ ساتھ اگلی نسلوں
ہم راہ ان کی مصروفیات اور مجبوریاں بھی جوان ہو رہی تھیں اور یوں ملاقاتوں میں وقفے بڑھنے لگے۔ اس پر گھر میں دست یاب پرانے وقت
سہولیتں نئے دور کی عادتوں کے برعکس تھیں۔

"امی اب آپ ہمارے پاس چلی آئیں ـــــ اس گھر کو چھوڑیں اور ہمارے گھر چل کر آرام سے دن گزاریں ـــــ"

ایسے میں وہ چہرے پر ایک رسمی سے مسکراہٹ پھیلا دیتی۔ اب بھلا انھیں کیا بتاتی کہ اس گھر کے در دریچوں سے اس کی وابستگ
نوعیت کیا ہے۔

"امی اب تو ان صوفوں کے کورز بدل دیں ـــــ"

"پردے پرانے ہو چکے ہیں پھر ان لی ریلنگ کس قدر رکاوٹوں والی ہے۔"

"ریفریجریٹر بدلنا پڑے گا ـــــ برسوں سے یہی فرج اس گھر میں ہے۔"

"امی اب تو اس میز کی جان چھوڑ دیں ـــــ کتنے روپے چاہئیں کبھی کی رہنے دیں آپ تو ـــــ"

انھیں کیا معلوم وہ چند روپے جو اس کے بیٹے اسے دیا کرتے ہیں، کیا اس کی گزر بسر ان ہی پیسوں میں ہے۔ وہ تو محض ایک احس
تعلق پیدا کیے رکھنے کا بہانہ ہے ـــــ مگر یہ سب کچھ ان پر ظاہر کرنا بھی تو ضروری نہیں۔

بیٹے اور بہوئیں جب اس کے رہن سہن اور اس کے گھر کی اندرونی آرائش کو تنقید کا نشانہ بناتے تو بیٹی کی جدائی کی پھانس اور
شدت سے اس کے دل میں چبھنے لگتی۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ بیٹی کو بھی اس کے گھر کی پرانی چیزیں اس حالت میں ہرگز قبول نہ ہوں گی
پتہ نہیں کیوں ایسے میں وہ چاہتی تھی، بات کرنے کو سہی، کوئی کھڑکی تو کھلی ہو ـــــ اس مرتبہ کی ڈاک میں بیٹی نے اسے اپنے نئے گھر کی
تصویریں بھیجی تھیں۔ وہ پہروں ایک ایک تصویر پر نظریں جمائے گھر کی تفصیل میں کھوئی رہتی، بیٹی کے گھر میں خود کو رہتی بستی محسوس ک

یہ تصویر جس بھی زاویے سے اتاری گئی تھی ایک کھڑکی تھی جو پس منظر میں ضرور دکھائی دیتی۔ گھر کی بالائی منزل پر نصب وہ خو
صورت کھڑکی بستی سڑک کے کنارے نو تعمیر شدہ اس بے آباد اور ویران بنگلے کی کھڑکی سی تھی۔ تصویر میں دکھائی دیتی کھڑکی کے اندر گر

دوں کے رنگ سے گھر کی اندرونی آرائش کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔ شام کو جب ہوائیں بادل گھیر لاتی ہوں گی تو اکثر وہ کھڑکی کھول کر موسم کا
رہ کرتی ہوگی۔ ممکن ہے اس کے بچے جب لان میں کھیلتے ہوں تب بھی وہ اسی کھڑکی سے انھیں پکارتی ہو۔ پھر اس کھڑکی سے وہ موسم کی
وٹ کا اندازہ بھی کرتی ہوگی اور اس دن کے بارے میں سوچتی ہوگی، آیا اسے کپڑے دھو کر سکھانے کے لیے باہر پھیلانے ہیں کہ نہیں۔
ش کی رفتار بھی وہ اسی کھڑکی سے دیکھتی ہوگی۔

اب جب بھی چہل قدمی کرتے ہوئے وہ سڑک پر اس بنگلے تک نکل آتی تو پتہ نہیں کیوں دور سے دکھائی دیتی بنگلے کی کھڑکی میں اسے
ں بیٹی کی پرچھائیں نظر آتی۔ ایک روز جب وہ بنگلے کے باہر کھڑی اپنے ہی کسی دھیان میں گم تھی اچانک بنگلے کے مرکزی داخلے پر تعینات
ڈ نے اسے چونکا دیا۔۔۔۔

"بیگم صاحب! گھر تو مکمل ہوگیا ہے۔ لک آنے ہی والے ہیں۔"

جانے کیوں اسے بنگلے کے آباد ہونے کا انتظار رہنے لگا۔ اندر ہی اندر سے وہ یہ ارادہ کیے ہوئے تھی کہ بنگلے میں داخل ہو کر کھڑکی تک
ور جائے گی۔ ایسے میں وہ ان تمام بہانوں کے تانے بانے بنتی جن کی بنیاد پر اسے بنگلے کے اندر گھومتے ہوئے بالائی منزل کی اس کھڑکی تک
ا تھا۔ اسے چھونا تھا۔ ممکن ہے وہ اس کھڑکی سے لپٹ کر رونے بھی لگ جائے۔۔۔۔ اور کبھی ایسا بھی سوچتی کہ اگر بنگلے کے مالک کو وہ
ف طور پر بتا بھی دے کہ اس کھڑکی سے ان کا کیا تعلق ہے تو یوں بھی اس کا مقصد پورا ہو سکتا ہے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ممکن ہے یہ بات
ب کو قائل نہ کر سکے وہ یہ خیال ذہن سے جھٹک دیتی۔

ان دنوں اس کا بڑا بیٹا اپنے بیوی بچوں سمیت اسے ملنے آیا ہوا تھا۔۔۔۔ بہو گھر میں ہر وقت چلتے پھرتے ڈرائنگ روم میں رکھی
ھار میز کی تنقید کا نشانہ بنائے رکھتی۔

"بھلا سیٹنگ روم میں اس "اینٹیک" کو سجانے کی تک کیا ہے؟۔۔۔۔ آئینہ اس قدر دھندلا چکا ہے کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔۔۔۔
اری بیٹی کے رشتے کی بات اس شہر میں ہو رہی ہے۔ شاید منگنی کی رسم اسی گھر میں ہو۔۔۔۔ خدا کے لیے ہی اس پرانے وقتوں کی ڈریسنگ
ل کو یہاں سے ہٹائیے۔۔۔۔ اسے ڈس پوز آف کر دیجیے۔"

بیٹے اور بہو کی آرائش خانہ کے سلسلے میں نت نئی تبدیلی کے ہر مشورے کا مقابلہ وہ خاصی مزاحمت سے کرتی چلی گئی۔۔۔۔ مہمانوں
آمد قریب تھی اور ڈریسنگ ٹیبل بہو کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔۔۔۔ اس پر یہ کہ ڈریسنگ ٹیبل گھر میں کہیں اور بھی
رکھی نہیں جا سکتی تھی۔

"باقی ہر تبدیلی جو تم چاہتی ہو کر لو بہو لیکن میں اسے یہاں سے نہیں ہٹاؤں گی۔۔۔۔"

"تو پھر تو اسی یہ ضد والی بات ہوئی نا۔۔۔۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ اول تو ڈریسنگ ٹیبل ڈرائنگ روم میں رکھی نہیں جاتی۔ اس
اتنی بھدے قسم کی ڈریسنگ۔۔۔۔"

کئی روز تک ڈریسنگ ٹیبل گھر میں تنازعے کا باعث بنی رہی۔ بعض اوقات بحث ناخوش گوار لہجوں اور جملوں کے تبادلے کی صورت
ا اختیار کر لیتی۔

ایک شام جب اسے کسی کام سے گھر کے باہر جانا تھا واپس آئی تو ڈرائنگ روم تو کیا گھر کے کسی کونے میں وہ ڈریسنگ ٹیبل نہیں تھی ---- پتہ نہیں کیوں ان ہی قدموں گھر سے نکلی اور تیز رفتاری سے کھڑکی والے بنگلے کی طرف چل پڑی۔ آج جانے کہاں سے اس کی ٹانگوں میں اتنی طاقت بھی آگئی تھی اور پنڈلیوں میں درد بھی نہیں تھا---- جوں ہی کھڑکی والے بنگلے پر اس کی نظر پڑی وہ ایک لمحے کو وہیں رک گئی ---- کھڑکی کھلی تھی اور بنگلے کے اندر کاروں اور لوگوں کا ہجوم تھا۔ تو گویا بنگلہ آباد ہو گیا اور اب وہ آسانی سے اندر جا سکتی ہے---- کھڑکی والے کمرے تک---- لیکن کس بہانے؟---- یہ سوچ کر وہ کچھ دیر وہیں رکی رہی----

"بس جی قدرت کے کھیل ہیں اپنے بنگلے میں آباد ہونے کی دیر تھی کہ چل بسی---- مالکن آج صبح ہی آئی تھیں---- زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔" بنگلے کی جانب جاتے ہوئے کچھ لوگ اس کے قریب سے گزرے۔ ان کی بات سن کر خوشی کی ایک پھوار اس کے اندر پھوٹ پڑی۔ گویا اس لمحے بنگلے میں داخل ہونے کے لیے کسی واقفیت، کسی بہانے کی ضرورت نہیں تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ بنگلے کی عمارت میں تھی----

"میت اوپر ماسٹر بیڈ روم میں ہے----" کسی نے اس کی راہ نمائی کی---- سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ آنکھوں میں دریا چڑھ آئے مشکلوں سے وہ اپنا آپ ضبط کیے ہوئے تھی مگر جوں ہی اس نے کھڑکی کے سامنے بیڈ پر رکھی میت دیکھی اس سے رہا نہ گیا اور سارے بند ٹوٹ گئے۔ میت کے سرہانے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"ماں لگتی ہے---- اتنا تو مائیں ہی رو سکتی ہیں----" کمرے میں موجود سوگ وار عورتوں میں چہ مگوئیاں سی رینگنے لگیں---- سینہ پیٹتے ہوئے اسے بالکل کچھ نہیں آ رہی تھی کہ سفید چادر سے ڈھکی لاش اس کی اپنی ہے کہ بیٹی کی۔

برسوں پہلے ایک روز جب وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے ہی کسی دھیان میں گم تھی تو وہ اچانک عقب سے نمودار ہوئے تھے اور بغیر کچھ بولے چپکے سے اسے ایک ہار پہنا گئے۔ اس شام عہد و پیماں کیے پورا ایک برس ہونے کو تھا۔ وہ عکس آج بھی اس آئینے میں محفوظ تھا اس کے بچوں کو دھندلا دکھائی دیتا تھا۔

اس کے بالوں کی چاندی کا تقاضا بھی تو یہی تھا کہ وہ اس آئینے کو دھندلا ہی رہنے دیتی۔

○ ○ ○

سلسلہ ص ۳۸

بھی اس مقولے کو غلط قرار دیتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ جنگوں اور محبتوں کا سلسلہ تا دیر جاری رہے لیکن آداب اور اخلاق کے ساتھ۔ یہ آداب و اخلاق زندگی کے ہر شعبے میں رائج ہیں سماج میں بھی اور ازدواج میں بھی۔

آئیے ہم سب مل کر اعلان کریں کہ جنگ میں اور محبت میں سب کچھ جائز نہیں ہے اس لیے ہر دو معاملوں میں اہل رزم و بزم احتیاط سے کام لیں۔

○ ○ ○

یوسف ناظم

جنگ میں سب کچھ کبھی روا نہیں رکھا گیا

جس کسی نے بھی یہ کہا کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے بہت غلط کہا۔ جنگ کا تجربہ تو ظاہر ہے ایسے شخص کو جو گھر کے کسی کونے میں بیٹھ کر مقولے کہتا رہا ہو، ہو ہی نہیں سکتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کی خشک زندگی میں محبت نے کبھی جھانک کر نہیں دیکھا۔ تاریخِ عالم آپ نے بھی پڑھی ہوگی اور ہم نے بھی تھوڑی تھوڑی پڑھی ہے اسی تاریخ میں صاف الفاظ میں لکھا ہوا ہے کہ جتنی بھی بڑی جنگیں منعقد ہوئیں ان میں اخلاق و آداب اور اصول و ضوابط کی پوری پوری پابندی کی گئی یعنی جنگیں صرف دھوپ اور دن کے اجالے میں لڑی گئیں۔ جوں ہی سورج غروب ہونے پہ مائل ہوا اور زمین پر سائے بڑھنے لگے جنگ کے سورماؤں نے اپنے اپنے محاذوں سے جنگ کو فی الفور ملتوی کرتے ہوئے و باقی آئندہ، کا اعلان کر دیا۔ بندوقیں خاموش اور توپیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ سارے سپاہی وفورِ مسرت سے مشروبات اور ماکولات پر ٹوٹ پڑے۔ پرندے جو خوف زدہ ہو کر کسی نامعلوم جگہ پر پناہ لینے چلے گئے تھے اپنے اپنے ٹھکانوں پر شب بسری کے لیے واپس ہونے لگے۔ ان میں سے کچھ پرندے تھوڑی دیر کے لیے امن کی فاختاؤں کی طرح بھی اڑنے لگے کہ امن خواہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو بہ ہر حال امن ہوتا ہے۔ التوائے جنگ کا یہ قاعدہ غالباً اب بھی رائج ہے۔ ویسے اس تاریخِ عالم میں شب خون مارے جانے کی داستانیں بھی پائی جاتی ہیں لیکن غیر اخلاقی افعال تو ہمیشہ ہی ہوتے رہتے ہیں ان سے مقررہ اصول و ضوابط پر حرف نہیں آتا۔ ہمارے اس بیان یعنی مدلل بیان کی روشنی میں آپ نے ہم سے متفق ہونے کا فیصلہ کر لیا ہوگا کہ جنگ میں سب کچھ روا ہے کا مقولہ غلط ہے۔ آپ نے اگر اقبال کو تفصیل سے پڑھا ہے تو آپ کے علم میں ہوگا کہ جنگ کے دوران کو وقفہ برائے نماز کی بھی گنجائش تھی۔ اصل میں آدمی کو مقولے کہنے سے پہلے تاریخِ عالم پڑھ لینی چاہیے بلکہ فلسفے کی کتابوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے کیوں کہ بعض وقت ان میں بھی کام کی باتیں درج ہوتی ہیں اور زیادہ نقصان نہیں پہنچاتیں۔ مقولہ ایسا ہونا چاہیے کہ جس کی شرح کی جائے تو اس میں کوئی نقص نہ پایا جائے۔ جنگ میں سب کچھ کبھی روا نہیں رکھا گیا۔ اب بھی جب کہ جنگ جو قومیں (پہلے صرف قبائلی اقوام جنگ جو ہوتی تھیں) بہت متمدن ہو گئی ہیں اسپتالوں اور مدرسوں پر بم نہیں گرائے جاتے (ہوا ہی غلط سمت میں چل رہی ہو تو بات اور ہے)۔ بموں کو مریضوں کے لیے استعمال کرنا منع ہے۔ یہ صرف صحت مند اور تن درست لوگوں کے لیے بنائے جاتے ہیں اور مخصوص فلموں کی طرح صرف بالغوں کے لیے۔ اس لیے مدرسوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ (مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں)۔ اس حقیقت کی روشنی میں بھی یہ مقولہ کہ جنگ میں سب کچھ روا ہے، غلط ہے۔ اس مقولہ نگار (یا مقولہ گو) شخص کو شاید اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ نہ صرف میدانِ جنگ کے کچھ اصول مقرر تھے بلکہ جنگ ختم ہو جانے اور صلح کی دستاویزات پر دستخط ہو جانے کے بعد بھی جنگ کا تقدس برقرار رکھنے کی غرض سے جنگی قیدیوں تک کے حقوق کو شہریوں کے حقوق سے برتر مانا جاتا ہے اور ان کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ شہریوں کے غذائی معاملات میں اکثر دقتیں پیش آتی ہیں (جو آئندہ بھی پیش آتی رہیں گی) اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ شہریوں میں قوتِ برداشت بہت ہوتی ہے لیکن جنگ ہارنے والے قیدیوں کو بھوکا نہیں رکھا جا سکتا۔ ان کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ معززین اپنے ملک کے عوام الناس نہیں ہوتے بلکہ ایک لحاظ سے انھیں سفارتی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے

[illegible] صحیح ہے تو پھر ہمارا "زیر بحث مقولہ" غلط ہے۔ مقولے بھی اگر مقالوں کی طرح غیر مستند ہو جائیں تو پھر دنیا کو مقولہ [illegible] کیا رہ جائے گی۔

[illegible] جنگیں تو جنسِ جنگ وانتقام کے ساتھ لڑی جاتی ہیں۔ کئی جنگ در میان میں طویل فاصلہ ہونے اور تہذیب و معاشرت کے کافی حد تک مختلف الوضع ہونے کے باوجود آپس میں متحد ہو جاتے ہیں کیوں کہ معاملہ جنگ کا ہوتا ہے اور اپنے اپنے ملک کے اندرونی انتشار کو بھول کر غنیم کی سرکوبی کی تدابیر پر غور و خوض کرتے ہیں۔ جنگ کے موقعے پر تو ہم نے دو چار نہیں، ڈیڑھ درجن ملکوں کو آپس میں متحد ہوتے دیکھا ہے (جنگ نہ ہوئی مزاحیہ مشاعرہ ہو گیا) ------- ویسے اتحادِ ثلاثہ کی شہرت کس نے نہیں سنی۔

رہا محبت کا معاملہ تو یہ اور بھی زیادہ سنجیدہ معاملہ ہے۔ اس میں صرف ضوابط کا نہیں روابط کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ممدوح مقولہ نگار کے ذہن میں شاید اغوا اور اس قسم کی دوسری وارداتیں کلبلا رہی ہوں گی جو ظاہر ہے غیر دستوری اور غیر اخلاقی تھیں لیکن یہ بھی اس طرح کی خلاف ورزیاں تھیں جیسی کہ جنگی معاملات میں غیر مہذب لوگوں سے سرزد ہوئی ہیں۔ ان وارداتوں سے اخلاق پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور یوں بھی اغوا وغیرہ کی وارداتیں صرف اخباری نوعیت کی ہوتی ہیں انھیں تاریخی اہمیت حاصل نہیں تاریخی واقعات میں شاید ہی کوئی واقعہ ایسا رونما ہوا ہو گا جس میں محبت کے دونوں فریقوں کو مفرور ہونے کی ضرورت پیش آئی ہو دو مشہور اور لاثانی عشاق نے جن کے نام مجنوں اور فرہاد تھے، کوئی غیر اخلاقی رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی محبت کی خاطر اپنی جان دی۔ حالاں کہ مجنوں کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ چاہتا تو لیلیٰ کا اغوا کر لیتا۔ یہ اس کے لیے بہت آسان تھا۔ سب جانتے ہیں کہ لیلیٰ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے اپنے گھر سے صحرا میں دور چلی جایا کرتی تھی۔ وہ بھی تنہا نہیں۔ اس موقعے پر سگِ لیلیٰ [illegible] پیچھے دوڑتا رہتا تھا لیکن وہ ایک بے ضرر قسم کا سگ لیلیٰ تھا السیشن یا باؤنڈ نہیں تھا اور نہ اس نسل کا کتا تھا جسے اس کے آبا کے کارناموں کی بنا پر محکمہ پولیس کے ڈاگ اسکوائڈ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس کی شہرت تو صرف اس بنا پر تھی کہ وہ لیلیٰ جیسی خاتون کا [illegible] ورنہ وہ معنوی اعتبار سے بلی سے بھی کم تر درجے کا کتا تھا اس سے مجنوں کو کسی قسم کی گزند نہیں پہنچ سکتی تھی اور مجنوں کی نیت ہوتی (جیسی کہ عام عشاق کی ہوتی ہے) تو وہ ضرور لیلیٰ کی اونٹنی کا راستہ روک کر اور اپنی محبت کا واسطہ دے کر، لیلیٰ سے کوئی ایسی بات کہتا اور اسے فرار ہونے پر اکساتا لیکن وہ ایک شریف النفس شخص تھا اس اور کی نیت، کورے کاغذ کی طرح صاف تھی۔ دوسری طرف واقعہ ہے۔ فرہاد کو شیریں کے اغوا کی سہولت حاصل نہیں تھی کیوں کہ شیریں محل کی چار دیواری میں رہتی تھی۔ (وہ محل نشیں نشیں دوشیزہ تھی)۔ محل کے ارد گرد پہرا بھی لگا رہتا ہو گا اور شیریں کو شاید سیر و تفریح کی بھی عادت نہیں تھی، ہو گئی تھی تو اسے محل جانے کی ضرورت نہیں پڑی ہو گی۔ خود محل کا احاطہ کافی وسیع ہو گا چہل قدمی آسانی سے ہو سکتی ہو گی لیکن ہمارا خیال ہے یہ مواقع ہوتیں تو فرہاد گو کہ مجنوں سے زیادہ تن درست اور تنومند شخص تھا ہرگز ہرگز کسی غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب نہ ہوتا۔ اسے بھی اپنی اور شرافت حاصل تھی جو مجنوں کے ضمیر اور خمیر میں تھی اس لیے فرہاد نے بھی اپنی محبت کو اعلیٰ سطح ہی پر رہنے دیا۔ تن دہی کے کھودتا رہا اور اس سے پہلے کہ وہ شیریں کو اور اس کے عزیز و اقارب کو گھر بیٹھے (یعنی محل بیٹھے) شیر خوار بنا سکتا اس نے اسی تیشے کے لیے ظفر مندی کا ذریعہ بن سکتا تھا، خود کو خدا کے سپرد کر دیا اور یہ بتا دیا کہ بندے کی مرضی کیا تھی۔ اس لیے ہم محبت کے معا

(باقی ص

دلیپ سنگھ

رسالدار کا انٹرویو

دوردرشن کے دہلی اسٹیشن نے ایک بار مجھے خط لکھا کہ مجھے کسی کا انٹرویو لینے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے فلاں تاریخ کو صبح گیارہ بجے متعلقہ پروڈیوسر سے ملنا ہوگا۔

میں جب مقررہ تاریخ اور وقت پر پروڈیوسر کے کمرے میں پہنچا تو وہاں ایک بزرگ بھی بیٹھے تھے۔ عمر تو شاید ان کی پچھتر کے اوپر ہوگی لیکن صحت ماشااللہ بہت اچھی تھی۔ ان کی بڑی بڑی مونچھوں نے ان کے چہرے کو اور بھی رعب دار بنا رکھا تھا۔ پروڈیوسر نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ رسالدار بدلو سنگھ صاحب ہیں اور دنیا کی پہلی اور دوسری عظیم جنگوں میں اپنی بہادری کا لوہا منوا چکے ہیں۔ فوج سے انھیں اس قدر محبت ہے کہ ان کے بیٹے اور پوتے بھی فوج میں ہیں۔ آپ نے ان ہی کا انٹرویو لینا ہے۔ مزید ہدایتیں دیتے ہوئے پروڈیوسر کہنے لگا کہ اچھا انٹرویو وہ ہوتا ہے جس میں انٹرویو لینے والا کم اور دینے والا زیادہ بولے۔ آپ بھی یہ بات ذہن میں رکھیے گا۔ جب میں رسالدار کے ساتھ ان کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو کہنے لگے کہ رسالدار صاحب دوسری جنگ عظیم میں مصر کے مورچے پر دشمن کے گھیرے میں آگئے تھے اور پھر بڑی بہادری سے اس گھیرے سے نکل آئے تھے۔ آپ وہ واقعہ سنانے کے لیے انھیں ضرور کہیے گا۔ درشکوں کو اچھا لگے گا۔

وہاں سے نکل کر میں رسالدار صاحب کو دوردرشن کے میک اپ روم میں لے گیا۔ رسالدار صاحب پوچھنے لگے کہ یہاں کیا ہوگا۔ میں نے بتایا کہ یہ لوگ آپ کو ٹی وی پر پیش کرنے کے لیے تیار کریں گے۔ رسالدار صاحب کہنے لگے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کام کے لیے گھر سے تیار ہو کر آیا ہوں۔ یہ کہتے ہی وہ کمرے سے باہر نکل پڑے۔ بڑی مشکل سے میں انھیں بہلا پھسلا کر واپس لایا اور سمجھایا کہ یہ لوگ آپ کو اس طرح سنوار اور سجا دیں گے کہ آپ واقعی رسالدار لگیں گے۔ میری بات سنتے ہی بدلو سنگھ بولے "اس کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ میں گھر سے اپنا ڈسچارج سرٹیفکٹ ساتھ لایا ہوں جس پر صاف لکھا ہوا ہے کہ میں فوج میں رسالداری کے عہدے پر پہنچ کر ہی ڈسچارج ہوا تھا۔ دکھاؤں تجھے؟"

میں تو ان کا جواب سن کر ہتھیار ڈالنے کو تیار ہو گیا، لیکن میک اپ آرٹسٹ نے منت سماجت کر کے انھیں کرسی پر بٹھالیا اور ان کے چہرے پر پوڈر لگانے لگا۔ اس عرصے میں میرا بھی میک اپ ہوا۔ میک اپ آرٹسٹ نے اپنا کام ختم کرنے کے بعد رسالدار صاحب کو آئینہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے اب آپ کے چہرے پر کتنا رعب داب ہے۔ آپ واقعی رسالدار لگ رہے ہیں۔" یہ سنتے ہی انھوں نے جواب دیا کہ اگر تم اتنا پوڈر لگا کر کبھی میرے پاس فوج میں بھرتی ہونے آتے تو میں تمھیں فجر کور میں بھی نہ لیتا۔ یہ کہتے ہوئے رسالدار صاحب نے اپنے چہرے پر لگا ہوا پوڈر اپنی پگڑی کے شملے سے پونچھ دیا۔

رسالدار صاحب کے ساتھ اسٹوڈیو کی طرف جاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میں جس مہم پر جا رہا ہوں اس میں کامیاب ہو کر نکلنا آسان نظر نہیں آتا۔

اسٹوڈیو پہنچے تو فلور مینجر نے کیمرہ آن کروا دیا۔ کیمرہ آن ہوتے ہی ہم دونوں کی تصویریں سامنے رکھے مانیٹر پر آگئیں۔ تصویر دیکھ کر

رسالدار صاحب نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا کہ تصویر میں تو تو بھی اچھا خاصا فوجی لگ رہا ہے حالاں کہ تمھارے قد کے آدمی کو فوج میں کوئی گھاس بھی نہ ڈالے۔ اسی لیے میں سنیما میں دکھائی جانے والی عورتوں کو خوب صورت نہیں مانتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب ٹرک بازی ہے۔

فلور مینجر نے ہمیں کہا کہ کچھ بولیے تاکہ آپ کی آواز کا ٹیسٹ ہو سکے۔ پہلے اس نے مجھے بولنے کو کہا۔ یہ سنتے ہی رسالدار صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا کہ "اچھا تو بھی میری طرح اناڑی ہے اور میری طرح پہلی بار یہاں آیا ہے۔"

میرا ٹیسٹ ہو گیا تو رسالدار صاحب سے کہا گیا کہ وہ کچھ بولیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا بولوں؟ فلور مینجر نے کہا کہ آپ کچھ بھی بول دیجیے۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی آواز درشکوں تک پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ رسالدار صاحب نے بڑی پاٹ دار آواز میں کہا۔ "اے ہیر بھائی سن رہی ہو، میں دوردرشن سے بول رہا ہوں۔"

رسالدار صاحب کی آواز کی گرج سنتے ہی فلور مینجر نے سر پیٹ لیا اور کہنے لگا "رسالدار صاحب آہستہ بولیے" رسالدار صاحب کہنے لگے "بھائی میں بات کر رہا ہوں اپنی ہیر بھائی سے۔ تو اسے جانتا نہیں ہے۔ وہ اونچا سنتی ہے۔ اگر میں آہستہ بولوں گا تو میری بات شاید تمھارے دوسرے درشکوں کو تو سنائی دے جائے لیکن میری بیوی کے پلے نہیں پڑے گی۔"

بڑی مشکل سے رسالدار صاحب کو راضی کیا گیا کہ وہ اپنی نارمل آواز میں بولیں۔ انھیں راضی کرنے کے لیے فلور مینجر پرونوٹ لکھ کر دینے کو تیار ہو گیا کہ اگر ان کی آواز ان کی بیوی تک نہ پہنچی تو وہ نوکری سے استعفیٰ دے دے گا۔

انٹرویو شروع ہوا تو میں نے پہلا سوال داغا "رسالدار صاحب ہمارے درشکوں کو اپنا نام بتایئے۔"

"کون سا نام بتاؤں درشکوں کو؟" رسالدار صاحب بولے "نام تو میرا، میرے باپ نے رکھا تھا بدلو سنگھ۔ لیکن کبھی اس نے مجھے اس نام سے پکارا نہیں۔ وہ مجھے منگلو کہتا تھا کہ میں منگل وار کو پیدا ہوا تھا۔ ماں میری مجھے بلو نگڑا کہتی تھی کہ ہمارے ہاں کے بلو نگڑے بھی میرے قد کاٹھ کے ہوتے تھے۔ ننھیال میں مجھے منڈو کہتے تھے کہ ان دنوں میرے سر پر بال نہیں تھے۔ بعد میں آگئے تھے لیکن پھر چلے گئے۔ فوج میں مجھے شکرا کہتے تھے کہ میں دشمن پر حملہ اسی طرح کرتا تھا جیسے شکرا چڑیوں پر کرتا ہے۔ میری ہیر بھائی مجھے چھوکرے کا بابو کہتی ہے حالاں کہ چھوکرا خود اب پچاس کے پیٹے میں ہے۔ تو بول درشکوں کو کیا نام بتاؤں۔"

ایک سیدھے سادھے سوال کا اتنا لمبا جواب سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ گھبراہٹ کے عالم میں میں نے کہا کہ بدلو سنگھ چلے گا۔ رسالدار صاحب بولے "کیسے چلے گا سسرے۔ آج تک تو چلا نہیں۔ میں تو خود اپنے کو یقین دلانے کے لیے کہ میں بدلو سنگھ ہوں اپنا ڈسچارج سرٹیفکٹ ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔

اگلا سوال کرنے سے پہلے میں نے کہا "رسالدار صاحب آپ مجھے سسرے نہ کہیں تو مہربانی ہوگی۔ یہ سنتے ہی رسالدار صاحب نے میری ٹھوڑی پکڑ کر کہا "برا مان گیا ہے سسرے۔ ارے میں تو اپنے چھوکرے کو بھی سسرے کہتا ہوں۔ یہ کوئی گالی تھوڑے ہی ہے۔ یہ تو ہماری بول چال کی بھاشا کا ایک لفظ ہے جس کے بغیر ہماری زبان نہیں چلتی۔ برا نہیں ماننا سسرے۔" میں نے کہا "میرے برا ماننے کی بات نہیں ہے رسالدار صاحب ٹیلی ویژن والے برا مانتے ہیں" کہنے لگے "بات تیرے میرے بیچ ہو رہی ہے، وہ سسرے بیچ میں کہاں سے آگئے؟" اس مقام پر

مجھے فلور مینجر نے اشارہ کیا کہ بات کو آگے بڑھاؤ۔ چناں چہ میں نے اگلا سوال داغا۔

"رسالدار صاحب آپ فوج میں بھرتی کیوں ہوئے؟"

"بھائی میرے، میرے باپ کی کون سی جاگیر تھی جو میں کھاٹ پر پڑا روٹیاں توڑتا رہتا۔ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ سو فوج میں بھرتی ہو گیا۔"

"آپ کچھ اور بھی تو کر سکتے تھے۔"

"مثلاً" رسالدار صاحب نے پوچھا۔

"دکانداری کر سکتے تھے۔ سبزی بیچ سکتے تھے۔"

"ارے سس ---- چھ فٹ لمبا اور بیالیس انچ چوڑی چھاتی والا آدمی بینگن بیچتا کیا اچھا لگتا ہے" یہ کہنے کے بعد رسالدار صاحب نے محسوس کیا کہ انھوں نے ایسی بات کہہ دی ہے کہ ان کا حق بنتا ہے کہ وہ اس پر دو منٹ تک قہقہہ لگا سکیں۔ چناں چہ انھوں نے قہقہہ لگایا اور میں ان کا منہ تکتا رہا۔ جب ان کی ہنسی تھمی تو انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا "ہاں تو اگر آلو پیاز بیچنا شروع کر دے تو بیچ سکتا ہے کہ بھگوان نے تیری شکل وصورت ایسی ہی بنائی ہے" یہ کہنے کے بعد انھوں نے پھر ایک بھرپور قہقہہ لگایا جس کے دوران میں بیوقوفوں کی طرح ان کا منہ تکتا رہا۔

اسی لمحے مجھے فلور مینجر نے اشارہ کیا کہ یار بات کو آگے بڑھاؤ۔ کل پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔ میں نے سوچا سیدھا مصر والے واقعے پر آجاؤں جس کی طرف اشارہ پروڈیوسر نے کیا تھا۔

چناں چہ میں نے کہا "رسالدار صاحب۔ آپ ایک دفعہ مصر میں دشمن کے نرغے میں آگئے تھے اور پھر بڑی بہادری سے نکل گئے تھے۔ ہمیں وہ قصہ سنائیے۔"

رسالدار صاحب نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا "لگتا ہے تو نے سن رکھا ہے۔"

میں نے فوراً وضاحت کی "نہیں، نہیں۔ میں نے کہاں سن رکھا ہے۔"

رسالدار بولے "اگر سن نہیں رکھا تو پھر تمھیں کیسے پتہ ہے کہ میں مصر میں دشمن کے نرغے میں آگیا تھا۔ تو میرے ساتھ تو تھا نہیں۔ میں نے کہا "رسالدار صاحب، میں آپ کے ساتھ تو نہیں تھا لیکن بہادروں کی بہادری کے قصے بھی کبھی چھپے رہے ہیں۔" رسالدار صاحب میرا جواب سن کر خوش ہوگئے اور کہنے لگے "تو پھر سنو۔ شام کا وقت تھا۔ پانچ نہیں تو ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ میں اپنے یونٹ کے دس سواروں کے ساتھ گشت لگا کر کیمپ کی طرف آرہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ دشمن کے سپاہی سامنے بندوقیں تانیں کھڑے ہیں۔ وہ تعداد میں چوں کہ ہم سے چار گنا تھے اس لیے ہم نے سوچا کہ مقابلہ کرنے کے بجائے پیچھے لوٹ جانے میں ہی بہتری ہے۔ چناں چہ میں نے اپنے سواروں کو حکم دیا کہ اباؤٹ ٹرن ہو جاؤ۔ جوں ہی ہم اباؤٹ ٹرن ہوئے تو ہم نے دیکھا کو پیچھے بھی دشمن کی فوج کھڑی ہے۔ اب ہمیں وشواش ہو گیا کہ ہم گھر گئے ہیں۔ میرے قریب سپاہی دیال سنگھ تھا کہنے لگا۔ "رسالدار صاحب حکم دیجیے کہ اب کیا کیا جائے" میں نے کہا۔ "سسر نے دم لے۔ ابھی تو میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ کیا کیا جائے۔ تجھے کیا حکم دوں" ہم لوگ چپ چاپ گھوڑوں پر بیٹھے رہے۔ ہمارے گھوڑے بھی چپ۔ اتنا تو تیرے کو پتہ ہی ہوگا کہ گھوڑا آدمی سے زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے۔" مجھے پتہ تو نہیں تھا لیکن میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہی بہتر سمجھا۔ رسالدار

صاحب بولے "میں اپنے گھوڑے پر سوار اپنے دماغ کا پورا زور لگا کر سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔"

رسالدار صاحب یہاں تک پہنچے تو فلور منیجر نے ہاتھ گھما کر مجھے اشارہ کیا کہ صرف ایک منٹ رہ گیا ہے۔ گفتگو کو سمیٹنا شروع کیا۔ اس کا اشارہ رسالدار صاحب نے بھی دیکھ لیا۔ مجھے کہنے لگے کہ یار، کیا نام ہے تمھارا، دیپ سنگھ۔ وہ سامنے کھڑا چھوکرا بڑا پریشان لگ رہا ہے اسے کوئی تکلیف ہے کیا؟

اب فلور منیجر کے ساتھ میں بھی گھبرا گیا۔ کل آدھا منٹ رہ گیا تھا۔ میں نے زبردستی بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا "رسالدار صاحب نے جرأت سے کام لیا اور دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے گھیرے سے باہر نکل آئے۔"

میرا جملہ مکمل ہوا تو کیمرے آف کر دیے گئے اور فلور منیجر اور میں نے مل کر سکھ کا سانس لیا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھنے ہی والا تھا کہ رسالدار صاحب نے زبردستی مجھے بٹھاتے ہوئے کہا "یہ تو کیسے کہہ دیا سسرے کہ ہم دشمن کے گھیرے سے باہر نکل آئے۔ ہم تو ابھی تک گھیرے میں ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کیا جائے۔"

میں نے کہا "رسالدار صاحب، وہ فوٹو گرافر جو ہمارا فوٹو لے رہے تھے، ان کے جانے کا وقت ہو گیا تھا اس لیے میں نے سوچا گفتگو کو یہیں ختم کر دیا جائے۔" رسالدار صاحب کہنے لگے "وہ جائیں اپنی ماؤں کی اس میں۔ سوال تو نے کیا تھا۔ تو جواب سنے بغیر کیسے جا سکتا ہے۔ چناں چہ میں بیٹھ گیا اور رسالدار صاحب نے اپنا قصہ آگے بڑھایا۔ "میں بہت دیر تک سوچتا رہا اور دشمن کی فوج کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ اس نرغے سے بچ نکلنے کا بس ایک ہی راستہ ہے۔ دشمن کو یقین دلاؤ کہ ہم نے ہار مان لی ہے۔ چناں چہ آہستہ آہستہ گھوڑے بڑھاتے ہوئے، ہم دشمن کی طرف چل دیے اس طرح جیسے گرفتار ہونے جا رہے ہوں۔"

رسالدار صاحب یہاں تک پہنچے تھے کہ کسی نے اسٹوڈیو کی بتیاں بجھا دیں۔ میں نے کہا "رسالدار صاحب چلیے باہر چل کر بات کرتے ہیں۔" ارادہ میرا یہ تھا کہ ڈیوٹی آفیسر سے چیک لے کر میں کھسک لوں گا۔ رسالدار صاحب میرے ساتھ ڈیوٹی آفیسر کے کمرے میں گئے۔ ڈیوٹی آفیسر نے انھیں چیک دیا تو کہنے لگے کہ میں نہیں لوں گا۔ میں نے پورا قصہ تو سنایا ہی نہیں۔ ڈیوٹی آفیسر سمجھ دار آدمی تھا کہنے لگا چیک تو لیجیے، باقی قصہ اگلے پروگرام میں سنا دیجیے گا۔

رسالدار صاحب نے یہ سن کر چیک لیا اور جیب میں ڈال لیا، لیکن جب میں اپنا چیک لے کر رخصت ہونے لگا تو انھوں نے مجھے گردن سے پکڑ لیا اور کہا "تو کہاں جا رہا ہے سسرے۔ پوری بات سنے بغیر پیسے وصول کر لیے۔ یا تو چیک واپس کر یا میری پوری بات سن۔

چناں چہ مجھے باہر لان میں بٹھا کر رسالدار صاحب نے پورا قصہ سنایا جس کا لب لباب تو وہی تھا جو میں آپ کو بتا چکا ہوں لیکن اسے سنانے میں انھوں نے پورا ایک گھنٹہ لگایا۔ میں جب بھی انھیں ٹوکتا مجھے یہ کہہ کر ڈانٹ دیتے کہ بڑے صاحب نے تمھیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ خود کم بولنا اور مجھے زیادہ بولنے دینا۔

انٹرویو جس طرح ریکارڈ ہوا تھا اسی صورت میں ٹیلی کاسٹ ہو گیا۔ دوردرشن نے البتہ مجھ پر پابندی لگا دی کہ آئندہ مجھے انٹرویو کرنے کا کوئی پروگرام نہیں دیا جائے گا۔

حب الوطنی کا جذبہ مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور میں اپنے دیش کے سپاہیوں کی بہادری کے کارنامے سن سن کر بہت خوش ہوتا ہوں لیکن پتہ نہیں کیوں میرے دل میں بار بار خیال آتا ہے کہ کاش رسالدار بدلو سنگھ کو دشمن اپنی حراست میں لے لیتا۔

نقد و نظر

[تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجی جائیں - تبصرہ نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے -]

ید بیضا (شاعری) مصنف: برق موسوی مرتب: پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ تبصرہ نگار: وقار خلیل

حضرت برق موسوی (۵ / مارچ ۱۹۲۰ء تا ۸ / جنوری ۱۹۷۹ء) اردو اور فارسی کے قادر الکلام سخن ور تھے۔ ان کے پردادا شہید دہلوی معاصر و شاگرد شاہ نصیر دہلوی تھے۔ حضرت برق موسوی کے دادا امیر کاظم علی شعلہ اور ان کے دو صاحب زادے حکیم نوزش علی لمحہ اور حکیم میر نادر علی رعد عہد آصفیہ کے نامور اساتذہ سخن میں ممتاز تھے۔ حضرت برق موسوی حضرت رعد کے منجھلے فرزند تھے۔

زیر نظر مجموعہ کلام " ید بیضا " صوری اور معنوی ہر اعتبار سے دل کش قلب و نظر ہے جسے حضرت برق کے ہمشیر زادے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے نہایت اخلاص اور احترام سے " بہ خط شاعر " آفسٹ طریق طباعت سے آراستہ کیا ہے۔

" ید بیضا " کا پیش لفظ پروفیسر غلام عمر خاں صاحب نے تحریر کیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں " برق صاحب کے کلام کی نمایاں خصوصیت جو قاری کو پہلی نظر میں متاثر کرتی ہے ان کی شاعری کا ڈکشن یا لفظیات و اسلوب ہے جو اصغر، فانی اور یگانہ کی یاد دلاتا ہے۔ برق کو زبان و اسلوب کے اعتبار سے استاد سخن کا مرتبہ حاصل تھا ساتھ ہی وہ ایک صاحب فکر شاعر تھے۔ فکر و خیال کی ندرت، احساس کی تازگی اور جذبے کی حرارت ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

" ید بیضا " کے فاضل مرتب پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ۴۵ صفحات پر مشتمل سیر حاصل مقدمہ تحریر کرتے ہوئے اپنے ماموں حضرت برق موسوی کی شخصیت اور شاعری پر معروضی انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور برق موسوی کی حیات اور ان کے علمی کارناموں کو شرح و بسط کے ساتھ روشن کیا ہے۔ برق موسوی کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر بیگ نے درست لکھا ہے کہ " برق موسوی کو ان کی زندگی میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اس لیے ان کی شاعری کے جوہر نظم نگاری میں نمایاں ہوتے ہیں۔ "

" ید بیضا " میں برق موسوی کے شعری ابیات کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے حصہ اول " جذب و یقیں " کے زیر عنوان ۱۷ طویل نظمیں ہیں جن میں آخری رسول، خاک رہ بوتراب، حب علی، سلام بہ حضور امام تشنہ کام، شان حیدر نے بہت متاثر کیا۔ حصہ دوم " انقلاب و ارتقا " میں ۲۳ نظمیں شامل ہیں جو افق زندگی، معاشرہ، وطنیت، قومیت اور رہبران ملک و قوم سے عبارت ہے۔ " حصہ سوم کو " مسکراتے آنسو " کا نام دیا گیا ہے جس کے تحت زندگی اور حسن فطرت کی بوقلمونی اور حیات و حرکت کے نکات کو قادر الکلام سخن ور نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور فکری و فنی ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے اچھے نقوش روشن کیے ہیں۔ " ید بیضا " کے چوتھے اور آخری حصے میں " گنگناتی آہیں " کے زیر عنوان ۲۳ غزلیں شامل ہیں جس کے بارے میں پروفیسر مغنی تبسم صاحب کی اس رائے پر صاد کیا جاتا ہے کہ غزل میں برق نے اپنے لہجے کی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ جذبات و احساسات کے ساتھ انھوں نے فنی نزاکتوں کا بھی بڑا خیال رکھا ہے۔ صنائع کو غیر محسوس طریقے

سے برتنا اور تشبیہ نگاری میں ندرتیں پیدا کرنا برق کی غزلیہ شاعری کا نمایاں وصف ہے۔

چند شعر درج ذیل کیے جاتے ہیں:

رحم کر اے ہوائے نومیدی شمع امید جھلملاتی ہے
بے کس دبے نواہوں میں، تہمت زور و زر نہیں دولت شعر کے سوا، کیا ہے، خدا کا نام ہے
خالی نہیں ہے حسن سے دنیا کی کوئی شئے جو چیز ہے وہ اپنی جگہ لاجواب ہے
ایسے ہم عمر بھر جہاں میں رہے جیسے رہ جائے کوئی رات کی رات
اب سویرا ہوا ہی چاہتا ہے ہوگئی ختم زندگی کی رات
میں تجھ سے مانگتا ہوں خود تجھی کو ہر اک سائل سے آگے جارہا ہوں
ساری پابندیاں ہیں سچ کے لیے جھوٹ پر کوئی احتساب نہیں
آہ اے برق موسوی یہ دور ! سچ ہے اور آفتاب نہیں

[ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر۔پنجہ گٹہ۔حیدرآباد قیمت: سو روپے]

پیش رفت (شاعری) مصنف: محبوب راہی تبصرہ نگار: ڈاکٹر رفعت سلطانہ بیگم

محبوب راہی اردو کے نئے شاعروں میں جانے پہچانے ہیں۔ تین چار شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں اور اب اپنی شناخت کی منز طرف رواں دواں ہیں۔ نئی شاعری کے کئی لہجوں اور اظہار کے پیرایوں میں ایک تو وہ شیریں اور حلاوت لیا ہوا انداز ہے اور دوسرا قد کھردرا سپاٹ اور دو ٹوک ---- محبوب راہی کی غزل دراصل موخرالذکر رنگ کی حامل ہے۔ خود انھوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ "نئ شعرامیں اپنے منفرد لب ولہجہ اور اچھوتے ذائقے کی بنا پر مظفر حنفی کی شاعری میرے لیے سب سے زیادہ مرغوب، پسندیدہ اور متاثر کن تھ اور ان کی شاعری پر اظہار خیال کرنے والے بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ مظفر حنفی سے قریب ہیں۔ ان کا نیا شعری مجموعہ "پیش رفت" پڑھیے کا ثبوت بھی مل جائے گا۔ "پیش رفت" میں غزلیں، نظمیں، رباعیات اور تضمینیں شامل ہیں۔ رباعیات بھی متاثر کرتی ہیں لیکن پلہ بھ بے غزلوں کا۔ نئی غزل ، پیرایہ ، اظہار کی طرح داری، لہجے کی کاٹ اور اسلوب کے جس تیکھے پن کی وجہ سے نئی ہے، محبوب راہی کی غزلوں یہ ساری چیزیں مل جائیں گی۔ فکری عنصر کچھ اور درآجائے تو ان چیزوں کا نکھار اور فزوں ہوجائے۔

موضوعات کا جہاں تک تعلق ہے. محبوب راہی کی غزل کے موضوعات لگ بھگ وہی ہیں جو آج کے اور غزل گو شاعروں کے ہی کہ انھوں نے حسن وعشق کے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن روایتی انداز سے خود کو بچائے رکھا ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ انھور کوئی نئی راہ نکالی ہے لیکن جو پیرایہ کہ انھوں نے اختیار کیا ہے وہ متوجہ کرتا ہے۔ حسن و عشق کی باتیں بھی کچھ اور لگتی ہیں اور زندگ زمانے کا حال احوال بھی ان کا اپنا۔ یوں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نئی غزل بھی اب جو نیا روپ اختیار کررہی ہے اس میں محبوب راہی کی کی اپنی اہمیت ہے۔ انھوں نے فن کی حد تک کلاسکی سے اپنے آپ کو وابستہ رکھا ہے جس کے باعث ان کے ہاں پختگی ملتی ہے جی چاہتا ہے

کا کلام پڑھیں۔ "پیش رفت" سے کئی اشعار کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ چند ایک میں بھی درج کرتی ہوں:۔

وہ میر کی طرح تھا جو کل تک ۔ چپک رہا ہے کمان جیسا
لاکھ وہ دشمن سہی کچھ ظرف رکھتے ہیں اگر ۔ دشمنوں سے بھی ملیں گے خیر خواہوں کی طرح
کاش اک ایسا کرشمہ بھی کسی دن ہو جائے ۔ ڈھونڈنے خود کو جو نکلوں تو تجھے پا جاؤں
رخصت اے انا ! جا تیرا اللہ نگہبان ۔ اس دور کو اب تیری ضرورت بھی نہیں ہے

[ناشر: مصنف قیمت: ایک سو ساٹھ (۱۶۰) روپے]

دائرہ در دائرہ (شاعری) مصنف: حیدر نایاب تبصرہ نگار: ڈاکٹر رفعت سلطانہ بیگم

صنف کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن کوئی ادبی تخلیق محض اس لیے امتیاز کی حامل نہیں ہوتی کہ وہ فلاں صنف میں تحریر کی گئی ہے۔ صنف بھی کسی ادبی تخلیق کی کامیابی اور قبولیت کی ضامن ہوتی ہے لیکن ادبی تخلیق کا مقام متعین ہوتا ہے اس سے کہ وہ کس قدر ادبی ہے، اس میں زندگی اور معاشرے کی جھلکیاں اور بو باس کتنی پائی جاتی ہے اور وہ عصری تقاضوں سے کس قدر ہم آہنگ ہے۔ "دائرہ در دائرہ" حیدر نایاب کی مختصر نظموں کا مجموعہ ہے۔ قبل ازیں وہ "لمحوں کی بازگشت" جیسا شعری مجموعہ پیش کر چکے ہیں۔ "دائرہ در دائرہ" کی یہ مختصر نظمیں پابند بھی ہیں، آزاد بھی، نثری بھی اور کہیں کہیں قطعات کی صورت میں بھی مل جاتی ہیں۔۔۔۔ ان ہیئتوں پر بعد میں غور کیجیے، مجھے خوشی ہے کہ یہ ایک اچھا شعری مجموعہ ہے جس میں ادبی حسن بھی ہے، معاشرتی زندگی کے تقاضوں کی آئینہ داری بھی اور عصری حسیت بھی۔ مختصر نظموں میں ارتکازِ فکر کی اہمیت ہوتی ہے اور یہ ضروری ہے کہ معنوی طور پر بھرپور ہوں۔ قطع نظر اس کے کہ حیدر نایاب نے فنی تقاضوں کی تکمیل بھی کی ہے۔ ان کی نظمیں ارتکازِ فکر کی حامل اور معنوی طور پر بھرپور ہیں۔

حیدر نایاب کے موضوعات میں تنوع ہے۔ انھوں نے رومانی موضوعات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے، مذہبی شخصیات، کردار اور واقعات بھی ان کے ہاں ملتے ہیں۔ اپنے اطراف و اکناف کی عکاسی بھی انھوں نے کی ہے اور جہاں تہاں تخیل کی کار فرمائی بھی ہے۔ قومی قائدین اور ملک کی سیاست سے بھی انھوں نے صرفِ نظر نہیں کیا۔

حیدر نایاب کے پیرایۂ اظہار میں ہر چند کہ سپاٹ اور کھردرا پن ملتا ہے لیکن ان کی نظمیں متوجہ کرتی ہیں۔ انھوں نے صرف شاعری نہیں کی سوالیہ نشان بھی بنائے اور قارئین کی فکر کو بیدار کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ یہی ان کی منظومات کی خوبی ہے۔ ہمارے یہاں مختصر نظموں کا رواج چل پڑا ہے۔ مختصر نظموں کا سرمایہ خاصا طے گا لیکن بہت کم ایسی ہوتی ہیں جنھیں بھرپور اور مکمل کہا جا سکے۔ "دائرہ در دائرہ" میں ایسی کئی نظمیں مل جائیں گی جنھیں اردو کی مختصر نظموں کے انتخاب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ میں یہاں چند مختصر نظمیں درج کرتی ہوں، اندازہ ہوگا:

دو دلوں کا پیار ۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔ کوئی کہتا ہے قیامت ہے قریب
دوڑا یا ہے وہ ۔ کہ اب کیا ہونے والا ہے ۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بکواس ہے

چلتے چلتے جس پہ وطن کے بیچ پر کیھا سب مگر یہ ملتے ہیں
چورلباطے تماشاہونے والا ہے حشر سا ہر روز برپا کر رہا ہے آدمی
ہر طرف، ہر سمت اور ہر ملک میں

[ناشر: نایاب پبلیکیشنز، بھوبنیشور قیمت پچاس (۵۰) روپے]

شعر (شاعری) مصنف: اکرام نقش تبصرہ نگار: علی ظہیر

اکرام نقاش کا شعری مجموعہ (غالباً پہلا) "شعر" پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہم ان کے شعور اور لاشعور کی دو پٹریوں پر سفر کر رہے اور تازہ ہوا کے جھونکے ہماری سانسوں میں اتر رہے ہیں۔ اکرام نقاش کی شعوری اور لاشعوری فکر میں اتنی مماثلت ہے کہ ہم ان کو صوفی شاعر بھی کہہ سکتے ہیں:

بھی ہوئی فضائے غزلاں کے روبرو جنگل تھا، قہقہے تھے، خدا تھا، میں دنگ تھا

آج کی، سیاسی اور تجارتی طاقت وروں کے تسلط والی، دنیا میں خدا کی غیر جانب داری ہم پر شعوری طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کہ یہی بات لاشعور بھی محسوس کر رہا ہے

تو مشاغل مصروف میں بکھروں کہ ٹوٹوں !!!:

"شعر" میں اکرام نقاش نے صرف غزلیں ہی رکھی ہیں۔ نقاش کی گرفت زبان اور بیان دونوں پر ہے اور انھوں نے چھوٹی بحر بڑی بڑی باتیں کہہ دی ہیں:

مال و متاع و جاہ نہیں دکھ پر آنکھ میں پانی دے
چاندنی اور جگمگا اٹھی دل ہے۔ کوئی خیال گزرا ہے

ایک خصوصیت ان غزلوں کی یہ ہے کہ کسی غزل میں بھی مقطع نہیں ہے۔ یا یوں کہیں کہ مقطع میں تخلص یا شاعر کا نام نہیں۔ نہیں کھلتا کہ نقاش، اکرام کے نام کا حصہ ہے یا تخلص۔ اگر نقاش، تخلص ہے تو پھر شاعر نے اس کو معنوی انداز میں برتا ہے اور رنگارنگ غزلیں پیش کی ہیں اور بقول اکرام:

چلیں سب کی راہ تو لطف کیا ہو الگ سے اپنی ڈگر ذرا

لیکن وہ "اپنی ڈگر" پر چلنے کی مشکلات سے واقف بھی ہیں:

اس تاراج سفینے کو سمت و سفر امکانی دے

"شعر" کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کے شعرا میں یقیناً اکرام نقاش پوری طرح اپنی طرف متوجہ کرنے والے شاعر ہیں۔

[ملنے کا پتہ: آصفیہ کالج، ام۔ ایس۔ کے روڈ گلبرگہ (کرناٹک) قیمت: پچاس (۵۰) روپے]

بیادگار سید محی الدین قادری زور

سن اجراء : ۱۹۳۸ء   فون : 310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۵۸   ستمبر ۱۹۹۶ء   شمارہ : ۹

فی پرچہ : ۱۰ روپے
زر سالانہ : ۱۰۰ روپے
کتب خانوں سے : ۱۲۵ روپے
مشرق وسطی اور امریکہ : ۲۵ ڈالر
پاکستان بنگلہ دیش سری لنکا : ۱۰ ڈالر
انگلستان : ۱۰ پونڈ

ناشر : ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲ (اے پی) انڈیا

پبلیکیشن اسسٹنٹ   اقبال طوسی   کمپیوٹر کتابت   شارب کمپیوٹرز

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے [illegible] پریس سے چھپوا کر ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا

اس شمارے میں

مقالے

مطالعہ

نظمیں

غزلیں

افسانے

نقد و نظر

پروفیسر معین الدین عقیل

سر آسمان جاہ کا سفر یورپ

(حیدرآباد سے اٹلی کے روابط اور انیسویں صدی میں اطالوی معاشرت کے مشاہدات پر مشتمل - ایک اردو ماخذ)

حیدرآباد اور اٹلی کے روابط کی مدت گو اتنی طویل نہیں، جتنی کہ ہندوستان اور اٹلی کے مابین رہی ہے، لیکن دکن کے وہ علاقے، جو
. میں مملکت حیدرآباد میں شامل رہے (۱)، تجارت اور اطالوی تبلیغی مشنریوں کی سرگرمیوں کے باعث اٹلی سے تعلقات میں مربوط رہے
ہ۔ ہندوستان میں یورپی لوگوں کے استحکام اور پھر انگریزوں کے اقتدار کے وقت تک اٹلی کا رابطہ ہندوستان سے کچھ کم مستحکم اور مستقل نہ
۔ ان دونوں ممالک کے درمیان تجارتی اور کاروباری روابط عہد قدیم سے موجود رہے ہیں۔ (۲) ان روابط میں اس وقت نمایاں اور مزید
افہ ہوا، جب مملکت روما۔ یونان، ایشیائے کوچک، شام، فلسطین، مصر اور میسوپوٹامیا تک وسعت اختیار کر گئی۔ لیکن ان روابط میں اس
ت کمی آئی جب اسلام یورپ اور ہندوستان کے درمیانی خطوں میں ایک واضح قوت کے طور پر ابھرا، اور اس نے مشرق کی جانب یورپ کے
ھتے ہوئے قدموں کو ایک طویل عرصے کے لیے روکے رکھا۔ اس عرصے میں اٹلی اور ہندوستان کے رابطے کی راہ میں بھی رکاوٹیں اور
کلات پیدا ہوئیں لیکن یہ روابط یکسر ختم نہ ہو سکے۔ (۳) رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود اطالوی مبلغ اور سیاح ہندوستان پہنچتے رہے۔
' اطالوی مبلغوں اور سیاحوں کے سفرنامے، جو اگرچہ تعداد میں زیادہ نہیں، لیکن اس بارے میں قیمتی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ (۵)

یہ صورت حال عروج اسلام کے بعد گیارھویں صدی سے پندرھویں صدی کے آخر تک برقرار رہی کہ اس میں ایک اور واضح اور اہم
ہلی واسکوڈے گاما کے توسط سے پرتگال کے ہندوستان پہنچنے پر رونما ہوئی۔ اور بالآخر سلطنت روما کو، جسے ۱۴۱۵ء میں سقوط سیوتا کے
ث پرتگال سے ہزیمت اٹھانی پڑی تھی، ہندوستان سے اپنے دیرینہ روابط سے آئندہ کے لیے بڑی حد تک دست کش ہونا پڑا۔ اور بعد میں
ں دونوں ممالک کے درمیان رابطہ اور تعلق کی نوعیت کبھی غیر معمولی نہ بن سکی۔

اس صورت حال میں حیدرآباد سے بھی اٹلی کے روابط کی نوعیت کچھ زیادہ مختلف نہ ہو سکتی تھی۔ اور نہ اس کے لیے بظاہر امکانات
جود تھے۔ مملکت حیدرآباد اپنے قیام (۱۷۲۸ء) کے بعد سے داخلی معاملات میں اگرچہ بڑی حد تک خود مختار تھی، اور معمولی خارجی معاملات
ں بھی اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے کر لیتی تھی، لیکن برطانوی حکومت ہند کی متابعت اختیار کر لینے کے بعد اس کے لیے کسی بیرونی ملک
ے مخصوص اور قریبی روابط قائم کر لینا ممکن نہ تھا۔ ان علاقوں سے، جو اس کی مملکت میں شامل رہے، اٹلی سے عہد قدیم میں تجارتی رشتے قائم
ے (۶) لیکن برطانوی عہد میں اس کے اٹلی کے ساتھ کسی قسم کے تعلق اور رابطے کے بارے میں معلومات بہرحال تحقیق طلب ہیں۔

اٹلی یا سلطنت روما سے ہندوستان کی نسبت کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ روم، ہندوستانی قصوں اور کہانیوں کے حوالے سے
ندوستانیوں کے لیے پرکشش رہا ہے، لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ نام اور یہ لفظ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل
ں، جب کہ پہلی جنگ عظیم کے پس منظر میں ترکی کی سیاسی حیثیت بین الاقوامی سطح پر زیادہ نمایاں ہو کر ابھری، دنیائے اسلام کے
لمانوں میں لفظ "روم" سلطنت ترکیہ کے لیے مستعمل ہوتا رہا۔ اور ہندوستان کے عام مسلمان بھی، جو ترکی اور اٹلی کے اصل اور مختلف

سیاسی تعلقوں سے بے خبر تھے، لفظ "روم" سے خاص نسبت اور جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ چناں چہ اس لفظ کی مجموعی مقبولیت کا سبب ہی تھا کہ مسلمان اہل علم بھی سلطنت ترکیہ کے لیے "روم" کا لفظ استعمال کرتے رہے۔ مثلاً اٹھارویں صدی کے آخر میں خواجہ عبدالقادر نے اپنے ترکی کے سفرنامہ "وقائع منازل روم" (۷) میں ترکی کے لیے روم کے استعمال کی جو روایت قائم کی تھی، انیسویں صدی کے آخر میں معروف عالم اور مورخ شبلی نعمانی نے بھی اپنے "سفرنامہ، روم، مصر و شام" میں اس روایت کو برقرار رکھا (۸) اس ایک سو سال کے عرصے میں دیگر ہندوستانی سیاحوں نے، جنھوں نے یورپ کا سفر کیا، اپنے سفر کے دوران ترکی سے گزرتے ہوئے اسے بالعموم مملکت روما سے موسوم کیا اور اٹلی کا ذکر اٹلی کی حیثیت سے کیا ہے۔ اس قسم کے سفرنامے بھی ہندوستان اور اٹلی کے درمیان رابطہ کی ایک صورت کے مظہر ہیں۔ جس طرح اطالوی سیاحوں نے ہندوستانی معاشرے اور تہذیب کے مشاہدات کے توسط سے قیمتی معلومات یک جا کی ہیں، بعض ہندوستانی سیاحوں نے بھی اپنی سیاحت کے دوران اٹلی یا اس کے کسی خطے کے بارے میں اسی طرح کی معلومات قلم بند کی ہیں۔ یہ معلومات زندگی، معاشرے اور تہذیب کا احاطہ کرتی ہیں اور اپنے عہد کے مطالعے کا ایک قیمتی وسیلہ اور ماخذ بھی ثابت ہوتی ہیں۔

حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے سیاحوں میں یوسف کمبل پوش اور نواب مظہر علی خاں آسمان جاہ کو دیگر سیاحوں کے مقابلے میں زیادہ اہم قرار دیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس نے اپنے سفرنامہ "عجائبات فرنگ" (۹) میں ابو طالب خاں لندنی (۱۷۵۲ء- ۱۸۰۶ء) کے سفرنامے "سیر طالبی فی بلاد افرنجی" (۱۰) کے بعد پہلی مرتبہ گہرے مشاہدے اور تجربے کا ثبوت دیا۔ اور آخر الذکر اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس نے اس وقت کے سیاحوں کے مقابلے میں اٹلی کا سفر قدرے تفصیل سے کیا اور اپنے سفر اٹلی کے حالات بھی مفصل لکھے۔ ان کا یہ سفرنامہ، جس میں ان کے سفر یورپ کے مفصل حالات درج ہیں ان کی ضخیم سوانح عمری "صحیفۂ آسمان جاہی" (مرتبہ تیج رائے، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۰۳ء) میں شامل ہے۔

آسمان جاہ کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ وہ عرف عام میں ایک سیاح سے زیادہ ایک خود مختار مملکت کے نمائندے کی حیثیت سے اٹلی کے سفر پر گئے تھے اور ان کے سفرنامہ سے جہاں ایک طرف آخر انیسویں صدی کے اٹلی کی تہذیبی و معاشرتی زندگی پیش نظر آتی ہے تو دوسری طرح اس سے اٹلی اور حیدرآباد کے درمیان کے روابط پر قدرے روشنی بھی پڑتی ہے۔ ایک ایسی صورت حال میں کہ اٹلی اور حیدرآباد کے درمیان ہندوستان کے برطانوی عہد میں روابط کی کوئی نظیر عام نہیں، اس اردو سفرنامے سے ان ممالک کے درمیان روابط کی جانب ایک ہلکا سا اشارہ ملتا ہے۔ اور اگر چہ یہ پہاڑ کھود کر چوہا نکلنے کے مترادف ہے، لیکن تمام تر اندھیرے کے مقابلے میں روشنی کی یہ ایک کرن بھی غنیمت ہے، اور اس لحاظ سے یہ کم یاب اردو ماخذ جہاں حیدرآباد اور اٹلی کے مابین روابط پر چند اہم معلومات فراہم کرتا ہے، وہیں انیسویں صدی کے اٹلی کی تمدنی زندگی کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اور اس ماخذ کو، دیگر ماخذ کی نایابی کے باوصف، ایک اہم اور قیمتی دستاویز کی حیثیت کے حامل کہا جاسکتا ہے۔

سر آسمان جاہ (۱۸۳۹ء- ۱۸۹۸ء) محمد مظہر الدین خاں، رفعت جنگ، بشیر الدولہ، عمدۃ الملک، اعظم الامرا امیر کبیر۔ نواب سلطان الدین خاں سطوت جنگ، بشیر الملک (۱۸۱۴ء- ۱۸۴۵ء) کے فرزند اور نواب محمد فخر الدین خاں تیغ جنگ، شمس الدولہ، شمس الامرا (۱۷۸۰ء- ۱۸۶۳ء) امیر کبیر کے پوتے تھے۔ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ (۱۱۸۸- ۱۲۶۵) اس خاندان کے مورث اعلیٰ تھے، جن کا سلسلہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ ان کا خاندان مملکت آصفیہ میں ہمیشہ بلند مرتبہ اور اعلیٰ مناصب پر فائز رہا اور خصوصاً ان کے دادا نواب شمس الامرا کو علم دوستی اور علم پروری کے باعث خاصی شہرت اور امتیاز حاصل ہوا۔ خود آسمان جاہ مملکت آصفیہ میں اولاً ۱۸۶۹ء میں صدر المہام عدالت

(وزیر انصاف) اور پھر ۱۸۸۷ء میں صدر المہام (وزیر اعظم) کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۸۹۴ء تک فائز رہے۔ جنوری ۱۸۸۸ء میں حکومت برطانیہ کی جانب سے "سر" کا خطاب دیا گیا (۱۱)

ان کا سفر یورپ اپریل سے جولائی ۱۸۸۷ء تک، چار ماہ کے عرصے پر مشتمل ہے۔ قریب قریب یہ وہی زمانہ ہے، جب اٹلی کے ادیب دی۔ گوبرناتس (A De Gubernatis) (۱۸۴۰ء - ۱۹۱۳ء) نے کچھ عرصہ قبل ہندوستان کی سیاحت کی اور ایک سال قبل اپنا سفرنامہ ہند "Peregrinazione Indiane" دو جلدوں میں مرتب کیا۔ اس کی پہلی جلد "India Centrale" جو وسطی اور شمالی ہند کے حالات سفر پر مشتمل تھی، فلورنس سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی اور دوسری جلد۔ India Meridionale، e Seilan - جو جنوبی ہند اور سری لنکا کے بارے میں تھی، ۱۸۸۷ء میں طبع ہوئی۔ آسمان جاہ کا معاصر غالباً یہ پہلا اطالوی سیاح ہے، جس نے اواخر انیسویں صدی میں اپنا سفرنامہ بھی شائع کیا اور جو مملکت حیدرآباد کے حالات سفر پر بھی مشتمل ہے۔ (۱۲) اس شخص نے اپنے سفر حیدرآباد کے دوران عمائدین مملکت کے علاوہ نظام میر محبوب علی خاں (۱۸۶۸ء - ۱۹۱۱ء) اور وزیر اعظم سر سالار جنگ (۱۸۲۹ء - ۱۸۸۳ء) سے بھی ملاقات کی۔ قریب قریب اسی عرصے میں نکولو دے کونتی (Nicolo De Conti) نے بھی ہندوستان کی سیاحت کی اور اپنا سفرنامہ تحریر کیا۔ (۱۳)

آسمان جاہ کے سفر کا مقصد دراصل لندن میں ملکہ وکٹوریہ کے جشن جوبلی میں مملکت آصفیہ حیدرآباد کی نمائندگی اور شرکت تھا، جو جون ۱۸۸۷ء میں منعقد ہو رہی تھی۔ وہ یکم اپریل کو بمبئی سے ایک اطالوی جہاز "دومانیکو" کے ذریعے عدن اور مصر ہوتے ہوئے ۲۰/ اپریل کو اٹلی کے جنوبی ساحلی شہر کٹینیا پہنچے۔ یہ اٹلی میں ان کا پہلا مستقر تھا۔ ویسے اٹلی سے ان کا معنوی تعارف جہاز کے سفر کے دوران بھی ہو گیا تھا۔ جب ۹/ اپریل کو ایسٹر کی تقاریب کی مناسبت سے چند اطالوی، جو ان کے ہم سفر تھے، بہروپ بدل کر ناچتے گاتے رہے۔ اس کا پس منظر دریافت کرنے پر انھیں معلوم ہوا تھا کہ اس ناچ گانے کا مقصد دراصل چندہ جمع کرنا تھا۔ تاکہ اس چندے سے ان لواحقین کی امداد ہو سکے جن کے افراد خانہ اٹلی میں کسی جگہ زلزلہ آنے کی وجہ سے فوت ہو گئے تھے۔ تماشا کرنے والے یہ افراد مختلف مقامات اور مختلف جہازوں میں اس طرح تماشا کر کے رقوم جمع کرتے اور متاثرین کو بھیجا کرتے۔ آسمان جاہ کے قلب و ذہن پر اطالویوں کی اس قومی ہمدردی کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ جہاز پر کام کرنے والے ان مزدوروں اور خلاصیوں کا، جو بغیر آرام کیے جہاز پر مصروف کار رہتے تھے، محنت اور تھکن کے باوجود اپنی قوم کے لیے چندہ جمع کرنے کا اس طرح اہتمام کرنا انھیں بہت بھلا لگا۔ ان کے خیال میں اس قوم کی ترقی اور خوش حالی اسی قومی ہمدردی اور اتفاق کے باعث تھی۔ (۱۴)

کٹینیا ان کے سفر اٹلی کا باب داخلہ تھا، وہ ۱۹/ اپریل کی شب اس کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے۔ ان کے مشاہدے کے مطابق یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا اور انگریزی وضع کا شہر تھا۔ تین اور چار منزلہ عمارتوں کا انھوں نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ اور ان تمام سڑکوں کو حیرت سے دیکھا ہے۔ جن پر پتھر بچھے تھے۔ اسی طرح انھیں وہ گھوڑے بھی بہت پر کشش اور عمدہ نظر آئے، جو یہاں کے باشندوں کی گاڑیوں میں جتے ہوئے تھے۔ انھیں دیگر امرا کی طرح گھوڑوں سے خاصی دل چسپی تھی۔ ان کے خیال میں یہ گھوڑے آسٹریلیا یا ویلر تھے۔ اور انھوں نے اپنی حسرت کا اظہار کیا ہے کہ ایسے گھوڑے حیدرآباد نہیں پہنچتے تھے۔ انھوں نے شہر کی سیر کے دوران ایک باغ عامہ دیکھا، جس کے درمیان ایک بلند مقام پر ایک "بینڈ اسٹانڈ" بنایا گیا تھا، جہاں سے کھڑے ہو کر سارے شہر کو دیکھا جاسکتا تھا۔ اس کا نام انھوں نے "پانورلما" بتایا ہے۔ اسی جگہ انھوں نے ایک قدیم تھیٹر بھی دیکھا، جو کئی سال سے بند تھا۔ (۱۵) کٹینیا سے ان کا جہاز اسی دن میسینا کے لیے روانہ

ہوا۔ ان دونوں ساحلی شہروں کے درمیان کا فاصلہ انھوں نے ۴۵ میل تحریر کیا ہے اور انھیں سارے راستے میں پہاڑوں کے دامن م عمارتیں اور مکانات نظر آتے رہے۔ انھوں نے اس راستے کو بہت خوب صورت پایا اور لکھا ہے کہ اس سے بہتر دریائی راستہ شاید ہی کوئی او ہوگا۔(۱۶)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سفر سے قبل یا دوران سفر اٹلی کی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی معلومات کے مطابق سسلی، جس م یہ دونوں شہر کٹینیا اور مینیا شامل ہیں، ۲۷ سال سے اٹلی میں شامل تھا۔ انھوں نے مینیا کی آبادی اس وقت ایک لاکھ چھبیس ہزار اور کٹینیا ایک لاکھ بتائی ہے۔ سینیا کو بھی انھوں نے گھوم پھر کر دیکھا اور یہ بھی انھیں کٹینیا کی طرح نظر آیا۔ یہاں کے گھوڑے بھی ان کے لیے ان پر کشش تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس شہر میں تجارت بہت ہوتی ہے اور یہاں ایک بہت بڑی فوجی تربیت گاہ بھی ہے۔ وہ اس تربیت کو دیکھنا چاہتے تھے، لیکن کسی وجہ سے وہ بند تھی، اس لیے دیکھ نہ سکے۔ تجارتی ساحلی شہر ہونے کی وجہ سے مختلف مقامات کے لوگوں کا آنا جانا یقینی تھا۔ اور خود ان کے جہاز میں بھی بہت سے لوگ نیپلز اور جنیوا کے لیے اور دو سو فوجی نیپلز جانے کے لیے سوار ہوئے۔ وہاں کے مقامی باشندے اجنبیوں کو دیکھنے کے شوق میں ان کے گرد اس طرح جمع ہو جاتے کہ ان کے لیے راستہ چلنا دشوار ہو جاتا۔(۱۷) شاید ان کا رویہ مختلف القوم اور مختلف النسل لوگوں کے ساتھ ہوتا تھا۔

شام کے چھ بجے ان کا جہاز نیپلز کے لیے روانہ ہوا۔ رات گیارہ بجے انھوں نے اپنی بائیں جانب دو آتش فشاں پہاڑ دیکھے، جن م آگ روشن تھی۔ صبح گیارہ بجے وہ نیپلز پہنچے۔ یہ شہر انھیں نسبتاً زیادہ پسند آیا۔ یہاں ان کا قیام بلسٹر ہوٹل میں رہا، جو ایک بلند مقام پر اچھی ج واقع تھا اور جہاں سے سمندر اور شہر صاف نظر آتے تھے۔ یہاں بھی بہت اچھے گھوڑے ان کے دیکھنے میں آئے۔ دو تین مقامات پر ان کا گز سرنگوں میں سے بھی ہوا، جو پاؤ میل سے بھی زیادہ طویل تھیں۔ ان میں سے گاڑیاں وغیرہ گزرتی تھیں اور دن رات گیس کی روشنی کا انت رہتا تھا۔ تمام سڑکیں انھیں سنگ بستہ اور جگہ جگہ نشیب و فراز نظر آئے۔ باغ عامہ انھیں بہت چھوٹا، خراب اور قابل دید نہ لگا۔ انھیں ایک جزیرے کے بارے میں بھی بتایا گیا کہ شہر کے بہت قریب ہے اور اس کے پہاڑ پر ایک عمارت ہے، جسے قید خانے کے طور پر استعمال کیا ج ہے اور اس میں دائم الحبس قیدی رکھے جاتے ہیں۔ اس وقت اس قید خانے میں ۹۰۰ قیدی تھے۔(۱۸) یہاں کی پولیس کی انھوں نے بہت تعر کی ہے۔ انھوں نے یہاں کے مقامی باشندوں سے سنا کہ اپریل میں یہاں گرمی ہوتی ہے لیکن اپنے قیام کے دوران انھیں ہلکی بارشوں اور سرد ہی سے واسطہ رہا۔ ان کی معلومات کے مطابق اس وقت اس شہر کی آبادی چھ لاکھ تھی۔

تین دن کے قیام کے بعد ۲۴/ اپریل کو وہ بذریعہ ریل گاڑی روم روانہ ہوئے۔ اس وقت نیپلز سے دن میں دو مرتبہ ریل ر جاتی تھی اور چھ گھنٹے میں روم پہنچتی تھی۔ وہاں ان کا قیام کو نتیو ہوٹل میں رہا جو اسٹیشن کے قریب واقع تھا۔ اس وقت اس میں مسافروں ک لیے دو سو کمرے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی انھیں اطلاع ملی کہ روم میں ہر اتوار اور جمعرات کو کوئی نہ کوئی تماشا ہوتا ہے، چناں چہ اس دن گھوڑ د تھی۔ اس کا انھیں نہایت شوق تھا، چناں چہ وہ اسے دیکھنے کے لیے گئے۔ اسی دن اس دوڑ کو دیکھنے کے لیے شہنشاہ روم امبرتو (۱۸۷۸ء ۱۹۰۰) بھی اپنی ملکہ کے ساتھ وہاں آئے تھے، اور سابق خدیو مصر اسمٰعیل (۱۸۳۰-۱۸۹۵) بھی جو ان دنوں روم میں تھے، اسے دیکھنے کے وہاں موجود تھے۔ دوڑ کے میدان سے ملحق تین حصوں پر مشتمل ایک بلند عمارت تھی، جس کا درمیانی حصہ شہنشاہ اور ان کے مصاحبین وغی کے لیے مخصوص تھا اور اس کے دونوں جانب کے حصوں میں ٹکٹ لے کر بیٹھا جا سکتا تھا۔ ایک ٹکٹ کی شرح ۲۰ فرانکس تھی۔ دوڑ دیکھنے کے لیے آنے والے تماشائیوں کی گاڑیوں میں جو گھوڑے، بگھیاں اور چوڑیاں تھیں اور ان کی تعداد اور اقسام اس قدر زیادہ تھیں کہ آسمان جاہ

انھیں ناقابل احاطہ لکھا ہے۔ دوڑ کے اختتام پر پہلے ملکہ اپنے جوڑے میں اور پھر دوسری گاڑی میں شہنشاہ روانہ ہوئے۔ شہنشاہ کی گاڑی کے اطراف تماشائیوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔

بعد میں انھوں نے روم کے اس معروف، افتادہ اور خراب "تھیٹر ہاؤس" کو بھی دیکھا، جسے "کالیوسم" کہتے ہیں۔ ان کی معلومات کے مطابق اس کا محیط نصف میل کے برابر تھا اور اس میں بہ یک وقت، ۸۷ ہزار افراد تماشا دیکھ سکتے تھے۔ ۱۸ سو سال پہلے وہ عمارت تعمیر ہوئی تھی اور ۵۰ کروڑ روپے اس کی تعمیر میں صرف ہوئے تھے۔ اور ۱۵ ہزار غلاموں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ جو قیدی اور مسیحی روم۔ میں پکڑ کر لائے جاتے تھے، انھیں اس کے بیچ میں چھوڑ کر ان پر درندے جانور چھوڑ دیے جاتے تھے اور لوگ اوپر بیٹھ کر تماشا دیکھا کرتے تھے۔(۱۹)

نیپلز کے مقابلے میں انھیں روم کے راستے خاصے کشادہ نظر آئے۔ ان پر ٹرامیں چلتی تھیں اور جو اس وقت بمبئی میں چلنے والی ٹراموں سے قدرے چھوٹی تھیں۔ یہاں انھیں لوگ زیادہ تر سیاہ لباس پہنے نظر آئے، چناں چہ اس بات پر انھوں نے تعجب کا اظہار کیا ہے۔ عمارتیں انھیں یہاں بلند نظر آئیں، جو آٹھ منزل تک تھیں۔ ان پر نقاشی کا کام بہت عمدہ کیا گیا تھا۔ قدیم عمارتوں کو ان کی اصل حالت پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ دکانوں اور مکانوں کی وضع انھیں اسکندریہ جیسی نظر آئی۔ انھوں نے یہاں دنیا کے سب سے بڑے گرجا گھر کو بھی دیکھا، جو ان کی معلومات کے مطابق ۳۰۰ فٹ لمبا اور ۲۰۰ فٹ چوڑا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کئی سو پادری دن رات اس میں عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ دیواروں اور چھت پر مصوری کا جو کام ہے، وہ حیران کن ہے۔ پھر انھوں نے وہاں قریبی عجائب گھر کو بھی دیکھا اور وہاں انھیں اس کی چیزیں نادر نظر آئیں۔ انھوں نے بالخصوص ممیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ سیر اور تفریح کے دوران انھوں نے ایک امیر کے خانگی باغ کو بھی دیکھا، جو ہمیشہ جمعرات اور اتوار کو عام لوگوں کی سیر کے لیے کھلا رہتا تھا۔ اس کی روشیں خوب صورت تھیں، لیکن زیادہ آراستہ نہیں تھیں۔ اس میں ایک اونچے مقام سے سارے شہر کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک باغ عامہ تھا، جس میں ایک گھڑیال بنائی گئی تھی، جو پانی کے زور سے چلتی تھی۔(۲۰)

روم میں ان کے قیام کا سب سے اہم پہلو ان کی شاہ "امبرتو" سے ملاقات ہے، جو خود شہنشاہ کی مرضی پر ان کے ایک ایلچی کے توسط سے دی جانے والی دعوت کی بنیاد پر ۲۶/ اپریل کو ایک شاہی محل میں تخلیے میں ہوئی۔ یہ ملاقات، جس کی اگرچہ کوئی سرکاری اور سیاسی حیثیت نہیں تھی، لیکن اس لحاظ سے اہم تھی کہ اس میں دوران گفتگو، جو ان دونوں کے درمیان فرانسیسی زبان میں ہوئی، کچھ ایسے موضوعات سامنے آئے جن سے حیدرآباد اور اٹلی کے درمیان روابط کی ایک ہلکی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے اور اس سے اس موضوع پر مزید مطالعے و تحقیق کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ شاہ اٹلی کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے بارے میں بہت کچھ سنتے رہے اور خاص طور پر حیدرآباد میں اطالوی باشندوں اور سیاحوں کو دوران سفر و قیام سہولتیں اور رعایتیں دیے جانے پر اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اطالوی سیاح واپس اٹلی پہنچ کر ہندوستان اور حیدرآباد کے بارے میں جو کچھ تاثرات بیان کرتے تھے ان سے شاہ اٹلی واقف تھے۔ ان ہی تاثرات کا نتیجہ تھا کہ ان کے دل میں بھی ہندوستان جانے اور اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ مملکت حیدرآباد کے بعض خطوں میں شیر اور دوسرے شکار بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ وہاں باقاعدہ اور بے قاعدہ فوجوں کی حیرت انگیز جمعیت بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ چناں چہ اپنے سپاہی اور شکاری ہونے کا ذکر کرتے ہوئے وہ حیدرآباد جانے کی خواہش بھی بیان کرتے رہے۔ گفتگو کے دوران شاہ اٹلی نے مملکت حیدرآباد کی فوجوں کی تعداد اور تفصیل دریافت کی اور مملکت کے خاص امرا کی ذاتی فوجوں کا حال بھی پوچھتے رہے۔ جب انھیں آسمان جاہ سے یہ معلوم ہوا کہ خود ان کی فوج کے کرنل کو برن کا تعلق آر ایچ بی ڈبلیو ۴۲ سے ہے، تو انھوں نے ا

رجمنٹ کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ وہ رجمنٹ ان اعلیٰ ترین فوجوں میں سے ایک تھی، جو ان کی نظر سے گزری ہیں اور اپنے فرزند (شہزادہ) کا ذکر کیا کہ جب وہ مالٹا میں مقیم تھے تو اس نامور فوج نے ان کی میزبانی کی تھی۔ اس گفتگو کے اختتام پر شاہ اٹلی نے نظام کے لیے کامیابی اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا۔(۲۱)

روم کے بعد اٹلی میں آصف جاہ کا اگلا مستقر فلورنس تھا، جہاں وہ ۲۹/ اپریل کی شام کو پہنچے اور یورپ ہوٹل میں قیام کیا۔ انھوں نے شہر کی سیر کی، "عجائب خانہ" دیکھنے کے لیے گئے اور دوران سیر پارک روڈ پر ایک جگہ مہاراجہ کولہاپور (۱۸۶۶-۱۸۷۰) کا ایک مجسمہ دیکھا، جو ۱۸۷۰ء میں انگلستان کی سیر و سیاحت سے واپسی کے وقت فلورنس میں فوت ہو گئے تھے۔ ایک بلند تفریحی مقام، پر جہاں سے سارا شہر صاف نظر آتا تھا، انھوں نے ایک ریستوران میں حضرت داؤدؑ کی ایک بڑی تصویر آویزاں دیکھی۔ فلورنس سے وہ ۳۰/ اپریل کو وینس پہنچے۔ یہاں ان کا قیام وکٹوریہ ہوٹل میں رہا جس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس میں ۱۲۵ کمرے رہائشی تھے۔ انھیں یہ بات وینس پہنچنے کے بعد معلوم ہوئی تھی کہ یہاں تمام شہر میں نہریں ہیں اور کشتیوں کے سوا آمد و رفت کے لیے کوئی سواری استعمال نہیں ہو سکتی۔ تمام راستے، شاہراہیں اور گلیاں انھوں نے پانی سے بھری ہوئی دیکھیں۔ ہر گھر کے دروازے پر انھوں نے ستون دیکھے، جن سے کشتیاں باندھی جاتی تھیں۔ اور یہ بھی دیکھا کہ لوگ اپنے گھروں کا کوڑا کچرا اسی پانی میں ڈال دیتے ہیں، جس کی وجہ سے عفونت رہتی ہے۔ ان کی معلومات کے مطابق اس وقت وینس کا رقبہ ۷ میل اور آبادی سوا لاکھ تھی۔ شہر میں ۱۴۶ نہریں اور ان پر چار سو پل تھے۔ جس دن وہ وینس پہنچے، انھیں معلوم ہوا کہ اسی دن شاہ اٹلی روم سے وینس پہنچ رہے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کو جھنڈیوں اور پردوں سے آراستہ کر رکھا ہے۔ دوپہر ایک بجے شہنشاہ اپنی ملکہ اور شہزادوں اور امرا کے ساتھ ریل سے اتر کر اپنی اپنی مخصوص کشتیوں میں، جو طلا اور نقرہ اور مخمل وغیرہ سے آراستہ کی گئی تھیں، سوار ہوئے۔ پولیس کا انتظام اچھا تھا۔ عوام کو نظارہ کرنے کی آزادی تھی، صرف شہنشاہ کے اطراف محافظوں کی کشتیاں موجود تھیں۔ جب شہنشاہ اپنی جائے قیام پر پہنچے تو وہاں موجود لوگوں نے انھیں دیکھ کر خوشی کا بلند بانگ اظہار کیا اور شہنشاہ کے اندر چلے جانے کے باوجود وہاں مجتمع رہ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ معلوم ہوا کہ شہنشاہ کی تخت نشینی کے بعد، یہ ان کا وینس کا پہلا دورہ تھا۔ رات بھر لوگ ان کی جائے قیام کے اطراف جمع رہ کر بینڈ بجاتے رہے۔

دوسرے دن گیارہ بجے شہنشاہ اپنے امرا کے ساتھ نہایت مرصع کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے والد کے مجسمے کی تقریب تنصیب کی رسم ادا کرنے کے لیے گئے۔ وہاں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ شہنشاہ نے اس جگہ پہنچ کر ایک تقریر کی اور پھر رسم ادا کی۔ اور پھر واپس چلے گئے۔ ان کی یہاں آمد اور روانگی کے وقت توپوں کی سلامی دی گئی۔ اس رات شہر میں ہر طرف چراغاں کیا گیا اور کشتیاں بینڈ بجاتے ہوئے بادشاہ کے محل کے سامنے سے گزرتی رہیں۔

وینس کے بعد آصف جاہ کا اٹلی میں آخری مستقر میلان تھا۔ یہاں وہ ۲/ مئی کی صبح پہنچے اور یورپ ہوٹل میں قیام کیا۔ یہ شہر انھیں بہت پسند آیا۔ اسے دیکھ کر انھوں نے کئی صورتوں میں اپنی حیرت اور تعجب کا اظہار کیا ہے۔ بہت سے مقامات پر سڑکوں پر انھوں نے بجلی کی روشنی آویزاں دیکھی اور انھیں رات کو بجلی کی روشنی کے باعث دن کا سا سماں لگا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس امر پر بھی تعجب کا اظہار کیا ہے کہ انھیں یہاں بہت لوگ کبڑے اور لنگڑے نظر آئے۔ انھوں نے ایک گرجے کا ذکر بھی خصوصیت سے کیا ہے، جو سنگ مرمر سے بہت عمدہ بنا ہوا تھا اور اس کی تعمیر میں تین کروڑ روپے خرچ ہوئے تھے۔ گھوڑے اور کتے بھی انھیں یہاں بہت اچھے نظر آئے۔ جس ہوٹل میں ان کا قیام تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ اس کے باہر بہت لوگ انھیں دیکھنے کے لیے جمع رہتے تھے۔ اور اگلے دن ۳/ مئی کو وہاں سے ایک [illegible] میں

اس کا نام بطور [illegible] ہوا۔ ۱۴ [illegible] سے [illegible] وغیرہ ہوگئے۔

حواشی

(۱) یہ علاقہ دریائے [illegible] کے درمیان [illegible] ہیں۔

(۲) ان دو ادوار کے متعدد [illegible] مطالعہ کے لیے [illegible] ملاحظہ ہو

" Commerce Between the Roman Empire and India " (E.H. Warmington)

(لندن، ۱۹۲۸ء)، [illegible] " I Talia E Oriente " (G. Tucci) (میلان، ۱۹۴۹ء)

(میلان، ۱۹۴۹ء)، [illegible] " Foreign Trade and Commerce in Ancient India " (دہلی، ۱۹۵۶ء)، وغیرہ

(۳) [illegible] " India and Italy " [illegible]

ایم چیمنو اور ایف شیاپی (R.M. Cimino & F.Scialpy) — (روم، ۱۹۷۴ء)۔

(۴) [illegible] ہے

" The Cambridge History of India " جلد ۳ (دہلی، ۱۹۵۷ء) ص ۶۵۹

(۵) (Pietro Amat) Biografia Dei Viaggiatori Italiani Con la Bibliografia Delle

Relagion Di Viaggian Dal Madesioni Dettate

(روم، ۱۸۸۱ء) اور [illegible] (Vincenzo Bellemo) [illegible] " I Viaggi Di Nicolo De

Conti " (میلان، ۱۸۸۳ء) ص ۱-۲۹ [illegible] ہے۔

(۶) دار مکتی، تصنیف مذکور، ص ۲۳۲، ۲۴۵، ۲۵۲، ۲۸۶، ۲۹۱

(۷) علی گڑھ، ۱۸۹۵ء۔

(۸) علی گڑھ، ۱۸۹۲ء۔

(۹) لکھنؤ، ۱۸۶۵ء، جامعہ الطباعت، لاہور، ۱۹۶۳ء۔

(۱۰) مرزا ابوطالب خاں "مسیر طالبی فی بلاد افرنجی" انگریزی ترجمہ: چارلس اسٹورٹ "Africa and Europe"

(Charles Stewart) Travels of Mirza Abu Taleb Khan in Asia. دو جلدیں (لندن، ۱۸۱۰ء)

(۱۱) تفصیلات کے لیے: [illegible] "صحیفہ آصف جاہی" (حیدرآباد، ۱۹۱۳ء)

(۱۲) جلد دوم، ص ۳۹-۹۲

(۱۳) " I Viaggi Di Nicolo De Conti " مرتبہ [illegible] (میلان، ۱۸۸۶ء)

(۱۴) "صحیفہ آصف جاہی" ص ۳۱۲

(۱۵) ایضاً، ص ۳۴۹

(۱۶) ایضاً، ص ۳۵۰

(۱۷) ایضاً، ص ۳۵۱

(۱۸) ایضاً، ص ۳۵۷

(۱۹) ایضاً، ص ۳۴۹، انھوں نے ان جانوروں کی تعداد [illegible] بیان کی ہے۔

(۲۰) ایضاً، ص ۳۴۲

(۲۱) تفصیلات کے لیے: ایضاً، ص ۳۴۵-۳۴۸

○ ○ ○

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

فراق کا اسلوبِ شعر

اسلوب، اگر شخصیت ہے تو فراق اردو کے معدودے ان چند شاعروں میں شمار ہوتے ہیں، جن کا اسلوب ان کی شخصیت بھی ہے، مزاج اور زندگی بھی ۔۔۔۔۔ فراق کی زندگی ڈھکی چھپی نہیں، ایک نہیں، کئی زاویوں سے ۔ پہلی بات تو یہ کہ فراق ہمارے اسی دور کے شاعر ہیں ۔ ان کو دیکھنے، ان سے ملنے ملانے اور رسم و راہ رکھنے والوں کی آج بھی بڑی تعداد ہے ۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے اپنے انٹرویوز، احباب سے گفتگو، خطوط، اپنے شعری مجموعوں کے دیباچوں وغیرہ ہی میں نہیں بلکہ اپنی شاعری میں بھی کہیں کھل کر اور بسا اوقات اشاروں کنایوں میں اپنی زندگی کے بیش تر واقعات پیش کر دیے ہیں ۔

فراق کی زندگی کچھ عجیب و غریب واقعات سے عبارت رہی ۔ درد و غم کس کی زندگی میں نہیں ہوتے ۔ اس خصوص میں کسی عام فرد یا بڑے فن کار کی تخصیص نہیں ۔ فن کار کا کمال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ ان درد و غم کو جمع کر کے دیوان بنا دیتا ہے ۔ فراق کی زمانے نے بلاشبہ قدر کی ۔ ان کو اس سلسلے میں شکوہ رہا ہو اور بات ہے لیکن ان کی ذات اور شاعری کو چاہنے والے اور پرستار تھے ۔ چھوٹے موٹے اکرام و اعزاز کی گنتی کہاں تک ؟ گیان پیٹھ جیسا ملک کا عظیم ایوارڈ انھیں ملا ۔ زندگی اور زمانے سے انھیں اور کیا مل سکتا تھا لیکن ان کی ذاتی زندگی پر غور کیجیے، بقول فراق "یہ اداس اداس بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی" ۔۔۔۔۔ کیا کیا دکھ تھے کہ جنھوں نے فراق کو گھیر رکھا تھا ۔ تاحدِ نظر غموں کا ایک بے کراں سمندر اور ان میں ایک جزیرہ سا فراق ! ۔۔۔۔۔ گرفتاری اور قید، چلیے نظر انداز کر دیں کہ سیاسی بنیادوں پر ہوئی تھی لیکن ازدواجی زندگی کی ناکامی جو قیدِ حیات اور بندِ غم کی طرح رہی، دو جوان بھائیوں کا انتقال، جوان بیٹی کا داغِ مفارقت اور بیٹے کی عین جوانی میں خود کشی ۔۔۔۔۔ ان حالات میں کوئی تو پاگل بھی ہو جائے لیکن فراق میں تھوڑی بہت تنک مزاجی اور چڑچڑاپن ہی در آیا ۔ فراق نے ان حالات میں زیست کیسے کی ہوگی اور کیوں کر کی ہوگی، اس کا اندازہ، ہر ایک اپنے بہ قدرِ ظرف لگا سکتا ہے ۔ جب کہ خود فراق نے بھی نہایت اچھوتے انداز میں اپنے ان بے اتھاہ اور بے ثغور غموں کا بیان کیا ہے:

یہ نہ پوچھ کتنا جیا ہوں میں، یہ نہ پوچھ کیسے جیا ہوں میں
کہ ابد کی آنکھ بھی لگ گئی مرے غم کی شامِ دراز میں

غم، انسان کو پاگل بنا سکتا ہے، پاگل بنا دیتا ہے لیکن اگر ظرف عالی ہو تو مزاج میں نرمی، آہستہ روی، متانت، انکساری، قوتِ برداشت، قرار اور ٹھہراؤ کی کیفیات بھی نکھر سکتی ہیں ۔ فراق کے یہاں یہی ہوا، انھوں نے اس غم سے بڑے کام لیے، اس غم کو اپنی زندگی بنا لیا بلکہ اپنی شاعری ۔ زہرِ غم پی کر زیست کرنے کا سلیقہ انھوں نے اپنے غموں سے سیکھا ۔ بقول فیض:

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے

چناں چہ مایوسی اور کرب کے باوجود فراق کے کلام اور خاص طور پر ان کے لہجے میں جو ایک داخلی ٹھہراؤ اور اسلوب میں جو ایک مہذب

ناپن ہے وہ اس غم کو گوارا بنالینے اور ایک عمر گوارا بنالینے کا نتیجہ ہے اور کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ فراق نے شعوری طور پر یہ
لست کی، غم کو انگیز کیا۔ یہ شعر سنیے:

میں نے اس آواز کو پالا ہے مر مر کر فراق — آج جس کی نرم لو ہے شمع محراب حیات

نرمی، آہستہ کلامی، ٹھہراؤ اور دھیمی دھیمی کیفیت نے فراق کے کلام کو پر تاثیر اور پسندیدہ بنادیا:

آہستہ کلامیاں ہماری — ہر دل میں گونجتی رہیں گی

فراق، غموں کی آگ میں دہکتے ہیں لیکن غموں کی یہ دہک، مصائب و آلام کا یہ لاوا ان کے کلام میں ایک نرم اور ٹھنڈی آنچ کی صورت
ظاہر ہوا کہ ان کے پڑھنے والے ایک کیف کی دولت اور دل آسائی کی کیفیت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ اس کا باعث سوائے اس کے اور کچھ
ہیں کہ اس درد و کرب اور رنج و محن کے باوجود فراق کے پاس جمالیاتی احساس اور حسیاتی دل کشی ہے۔ کہ ناخوش گواریاں بھی خوش گوار
غم و اندوہ بھی مسرت بخش لگتے ہیں۔ فکر کی گہرائی اور احساس کی تہہ داری نے ان کو مزید نکھار دیا ہے۔ یہ انسان پر فن کار کی فتح ہے۔ ایسے
ار غم کی داستاں ہی نہیں سناتے بلکہ غم کو اپنائیت کا حامل بھی بنادیتے ہیں۔ خود فراق نے بھی ان غموں سے لذت حاصل کی ہے، ان کو
وڑ کیا ہے:

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو — وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرادیا
وہ اک ذرا سی جھلک برق کم نگاہی کی — جگر کے زخم نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا

اب یہ اشعار، ان میں ہجر کی، درد کی، کرب کی، الجھنوں کی اور ریزہ ریزہ زندگی کی بات ضرور ہے لیکن اشعار کی تہہ داری کا اندازہ لگائیں تو
ن و سرور کی دولت بھی ہاتھ آتی ہے۔ یہ فراق کے اسلوب کا کمال ہے۔ بقول ان کے:

"ٹھنڈک اور تراوٹ کا احساس، مادی اور روحانی دونوں معنوں میں میرے بہت سے اشعار میں ملے گا" (۱) جی ہاں اشعار سنیے:

دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے دوست — خاک کا اتنا چمک جانا بہت دشوار تھا
وہ تھا مرا دل خوں گشتہ جس کے مٹنے سے — بہار باغ جناں تھی، وجود دنیا تھا
طبیعت جب بھی گھبراتی ہے ان سنسان راتوں میں — ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں
ترک محبت کرنے والو، کون ایسا جگ جیت لیا — عشق سے پہلے کے دن سوچو کون بڑا سکھ جیت لیا

فراق نے ہر چند کہ نظمیں بھی لکھی ہیں اور بعض بہت اچھی اور عمدہ نظمیں لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ مجنوں
گورکھپوری نے جو فراق کے قریبی احباب میں بھی رہے، لکھا ہے "فراق کا مزاج غزل ہے۔" آل احمد سرور، فراق کو ہمارے بڑے غزل گو
اعروں میں شمار کرنے کے باوجود واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ "انھوں نے اگرچہ نظمیں بھی کہی ہیں مگر نظم میں ان کا کوئی بڑا کارنامہ

ہیں۔ اور رشید احمد صدیقی نے فراق کو اس صدی کے چار بڑے غزل گو شاعروں میں شمار کیا ہے ۔۔۔ مختصر فراق کا غزل سے گہرا رشتہ ہے۔ تا عمل غزل ہی سے ان کی شناخت ہوئی اور آئندہ بھی ان کی شاعری کا تشخص صرف غزل سے ہوگا۔ مزید یہ کہ فراق نے جہاں جہاں اور جب جب ذکر کیا ہے، زیادہ تر غزل گو شاعروں کا ذکر کیا ہے یا کم از کم ان شاعروں کا، جن کی نظم نہیں بلکہ غزل اردو شاعری کی آبرو رہی ہے۔ وہ متاثر بھی غزل گو شاعروں سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک طرف اگر وہ کہتے ہیں کہ عالم رویا میں انھوں نے میر کو اپنی غزلوں پر وجد کرتے دیکھا ہے تو انھوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے:

صدقے فراق اعجاز سخن کے، کیسے اڑالی یہ آواز　　ان غزلوں کے پردوں میں تو میر کی غزلیں بولیں ہیں

غالب، مومن، مصحفی، امیر مینائی اور مسلی لکھنوی سے استفادے کو وہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان اساتذہ کی غزلوں کی زمینوں میں انھوں نے غزلیں کہی ہیں۔ ریاض خیرآبادی اور وسیم خیرآبادی سے انھوں نے مشورۂ سخن کیا اور ان کے ہم عصر شاعروں میں شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، حسرت، فانی، یگانہ، اصغر اور جگر سے ان کے مراسم اور ان میں سے بعض سے تو مراسم خصوصی رہے۔ ایک تو غزل کا مزاج بڑی حد تک غم ہے اور پھر ان شاعروں میں زیادہ تر وہ ہیں جن کی شاعری کا عنوان غم رہا یا کم از کم جزو ہے۔ غم جن کی شاعری پر محیط ہے فانی سے قطع نظر کہ وہ غم کو کسی اور انداز میں قبول کرتے ہیں۔ اگرچہ فراق پر فانی کا اثر بھی ہے۔ مثلاً ایسے اشعار:

کیا جانیے موت پہلے کیا تھی　　اب میری حیات ہوگئی ہے
اس دور میں زندگی بشر کی　　بیمار کی رات ہوگئی ہے

لیکن فراق، غم میں کھو نہیں جاتے اور نہ خود کو افسردہ بنالیتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ غم سے فرار حاصل کرتے ہوں۔ یہ غم ان کی شاعری میں موجود ہے۔ ان کا مزاج بھی اور ان کے اسلوب میں جاری و ساری بھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ فراق کے شخصی مصائب اور رنج و محن اردو غزل کی روایات، کلاسیکی اور ہم عصر شعراء کے کلام کا مطالعہ ۔۔۔۔ ان ساری چیزوں نے ان کے اسلوب کی تشکیل میں حصہ لیا ہے اور اس طرح آگے چل کر ان کے ہاں ایک انفرادی اور امتیازی شان پیدا ہوئی۔ فانی کی طرح وہ زندگی بیزار نہیں، سیلابِ غم کے باوجود وہ زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں، لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی غزل اس کی غماز ہے۔ اشعار ہیں:

میں آسمانِ محبت پہ رخصتِ شب ہوں　　ترا خیال کوئی ڈوبتا ستارہ ہے
میں یہ بھی کہہ نہیں سکتا، بدل گئی وہ نگاہ　　وہی ہیں لطف و کرم اب مگر وہ بات نہیں
ابھی سنبھلے رہو کہ دن ہے فراق　　رات پھر بے قرار ہو لینا

فراق کے اسلوبِ شعری کی تشکیل میں "رات" کی بڑی اہمیت ہے۔ کلیدی اہمیت! ایک لفظ کی صورت میں بھی، ایک استعارے کی حیثیت سے بھی اور کہیں کہیں ایک اشارے کے طور پر بھی۔ دن، ہنگاموں، چلت پھرت، دھوم دھام، تیزی، شدت اور بھاگ دوڑ کا مظہر ہے تو رات خاموشی، آہستگی، نرم روی، سکون، ٹھنڈک اور خنکی کی۔ زندگی، دن کو مصروف بہ کار ہوتی ہے تو رات کو آہستہ خرام اور مائل بہ آرام۔ دن میں بہلاوے کے سو سو بہانے ہیں لیکن رات اپنی ذات میں گم۔ دن میں فرد خود کو زندگی کے ہنگاموں میں کھو دیتا ہے لیکن رات میں غم زدہ انسان، فراق جیسا انسان، اپنی تنہائیوں کے سوا کسی اور کو ہم دم و ہم مجلس نہیں بنا سکتا۔ شاعری ہی اس کی انیس و رفیق ہوتی ہے۔ فراق نے

ژ اور شاعری دونوں میں اپنی ذات کے اس پہلو کو بڑی شدت سے نقاب کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی زیادہ تر نظمیں، غزلیں شب کے سنّاٹے ہر میں لکھی گئی ہیں۔ شب کا پچھلا پہر جب کہ کائنات پر ایک بے کراں، گمبھیر اور پر اسرار خاموشی محیط ہوتی ہے۔ سارا عالم اپنی ذات میں محو در ہوشمندی سے بے نیاز ہوتا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام "پچھلی رات" اور "رمز و کنایات" بھی اس سمت اشارہ کرتے ہیں۔ اور پھر ایسے اشعار بھی تو ملاحظہ ہوں:

تاریکیاں چمک گئیں آواز درد سے — میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئیں

شب ہے آہستہ، چل رہی ہیں ہوائیں — کچھ سناؤ فراق کے اشعار

فراق کے شعری مجموعوں کا قدرے گہری نظر سے بھی مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ "رات" کا کردار ان کی شاعری اور اسلوب پر بہت زیادہ حاوی ہے اور "رات" کی صفات خاموشی، آہستہ روی، نرماہٹ، لطافت اور نکہت وغیرہ ان کے اسلوب میں رچ بس گئی ہیں۔ رات اس رنگ روپ اور مدھم مدھم لہجے سے فراق کا اسلوب شاید ہی مزین ہوتا۔ چند اشعار:

ہماری رات چلی جائے گی تمھارے ساتھ — ہماری رات کو لے کر ابھی یہاں سے نہ جاؤ

کب لپٹنے ہوش میں شب غم کائنات ہے — اے درد ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

شام ہے میں ہوں تنہائی ہے — تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا

ہم اہلِ انتظار کے آہٹ پہ کان تھے — ٹھنڈی ہوا تھی، غم تھا ترا، ڈھل چکی تھی رات

جب دل کی وفات ہو گئی ہے — ہر چیز کی رات ہو گئی ہے

آ گئی رات تیرے جانے کی — اب نہیں صبح مسکرانے کی

اسلوب کی تشکیل میں جہاں داخلی عناصر کی شمولیت ہوتی ہے خارجی عوامل کی کار فرمائی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ داخلی عناصر میں ن کار کی اپنی زندگی، اس کے خاندانی حالات، اس کے خیالات اور افکار اور خارجی عوامل میں اس کا ماحول، دوست احباب اور عزیزوں رشتے اروں سے اس کا برتاؤ، اس کی زبان اور اس کی زبان ہی کا نہیں دوسری زبان کا ادب اور مروجہ اسالیب ---- ان میں سے ہر چیز اور ساری فزیں کسی فن کار کے اسلوب کی صورت گری میں حصہ لیتی اور وقتاً فوقتاً اس کے اسلوب کو متاثر بھی کرتی رہتی ہیں لیکن اسلوب میں گہرائی، ندرت اور بانکپن اسی وقت ممکن ہے اور اسی وقت فن کار صاحبِ اسلوب ہوتے ہیں جب ان کے ہاں یہ داخلی اور خارجی عوامل توازن اور تعدال کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں اور یہ ہم آہنگی جتنی زیادہ مربوط اور محکم ہوگی اسلوب اتنا ہی دیرپا، دل کش اور اثر انداز ہوگا۔ واقعی فن کار صاحبِ اسلوب ہوتے ہیں۔ ان کے اسلوب کے وقیع اور کامیاب ہونے کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ان کے فن میں داخلی اور خارجی عوامل ایک جان دو قالب ہو جاتے ہیں۔ فراق نے بھی یہی کیا کہ اپنی داخلی کیفیات کو خارجی عوامل سے ہم آہنگ کر دیا۔ دونوں کو ایک تصویر کے دو رخ بلکہ ایک منظر کے دو حصے بنا دیا۔ ایک موقع پر وہ لکھتے ہیں:

"زبان اور اسلوب سے متعلق میرا نظریہ یہ رہا ہے کہ زبان کے خارجی حصے کو یعنی لغت کو داخلی حصے کا ترجمان بنا دیا جائے۔ لغت میں جنم لے چکنے کے بعد شاعر کی تخلیقوں میں الفاظ کو پھر سے جنم لینا چاہیے اور عام الفاظ میں مخصوص

محدود تخیل اور مخصوص آواز اور تحت الالفاظ صفات پیدا ہونی چاہئیں۔ لفظوں، فقروں اور شعر کی صوتیات کی ایک شخصیت رونما ہونی چاہیے اور یہ شخصیت بھی بہ یک وقت نمایاں اور جہت دار ہونی چاہیے۔(۲)

اس سے یہ بھی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ فراق الفاظ کے معاملے میں کس قدر محتاط ہیں۔ وہ خود کو مروجہ لغت کا پابند نہیں رکھتے بلکہ الفاظ کی باز تخلیق کرتے ہیں کہ الفاظ ان کے جذبات و محسوسات سے ہم آہنگ ہوجائیں۔ ان کے داخل اور درون کی ترجمانی کرنے لگیں ان کی لے مدھم ہوجاتی ہے۔ اشعار میں کہیں سرگوشیوں کا گمان ہوتا ہے، کہیں خود کلامی کا احساس ہوتا ہے، کہیں جمالیاتی فضا پیدا ہوجاتی ہے اور کہیں دھیمی دھیمی کیفیت، خنکی اور گھلاوٹ کہ یہ اشعار بس فراق کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست　　سوچ لیں اور اداس ہوجائیں
اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی　　یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں
غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست　　وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں
ہم سے کیا ہوسکا محبت میں　　خیر، تم نے تو بے وفائی کی

اس مدھم مدھم لہجے، نرمی اور گھلاوٹ کے باعث فراق کا اسلوبِ شعر نہایت رکھ رکھاؤ اور ایک طرفگی کا حامل ہوجاتا ہے۔ میں اس کو اسلوب کا ارفع درجہ کہوں گا کہ فن کار کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ جائے۔ فراق کے ہاں یہ آرٹ بھی ہے کہ لگتا ہے وہ کچھ نہیں کہہ رہے ہیں لیکن ہمارے ذہن پر فوراً دستک ہوتی ہے گویا کوئی آیا ہے معانی و مفاہیم کا ایک جلوس لیے ہوئے۔ کتنے دل موہ لینے والے اشعار ہیں اور معنوی طور پر کیسے جہت دار:

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر　　بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں
شام بھی تھی دھواں دھواں، من بھی تھا اداس اداس　　دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں
بتائیں کیا دلِ مضطر اداس تھا کتنا　　کہ آج تو نگہہِ ناز نے بھی سمجھایا
تم بھی تو تم نہیں ہو آج　　ہم بھی تو آج ہم نہیں

فراق اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جن کا دیگر زبانوں کے شعر و ادب کا مطالعہ خاصا وسیع رہا۔ مغربی زبانوں، بالخصوص انگریزی شعر و ادب کا مطالعہ تو ادھر کئی ایک نے اپنے اپنے طور پر کیا ہی ہے لیکن ہندی اور سنسکرت ادب پر بھی فراق کی گہری نظر تھی۔ جے دیو، ودیا پتی اور سورداس کی شاعرانہ فکر اور اسلوب اور ہندی شاعری کی روایات سے انھوں نے فیض اٹھایا تھا۔ ہندی اور سنسکرت تہذیب اور دیومالا کی جھلکیاں بھی ان کے کلام میں مل جاتی ہیں۔ کولرج، ورڈزورتھ اور آسکر وائیلڈ وغیرہ سے فراق غیر معمولی طور پر متاثر رہے اور کمال یہ ہے کہ شعوری طور پر اور مشن کی حیثیت سے فراق نے ان سب کو اپنے کام میں لایا۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

"میرے وجدان پر عمر بھر ہندستان کے قدیم ترین اور پاکیزہ ترین ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ اور نظریۂ زندگی کا گہرے سے گہرا اثر رہا ہے۔ اس کے ساتھ تاریخِ ہند کے دور بہ دور بہترین ادب اور دیگر فنی کارناموں، عہدِ مغلیہ کی بہترین ہندی شاعری، ہندستان کے سنگیت اور ہندستان کے مزاج کا بھی گہرے سے گہرا اثر رہا ہے جسے ہندستان نے اپنی رنگارنگ تاریخ

میں جنم دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بہترین فارسی اور اردو شاعری، انگریزی کے بہترین نظم و نثر کا ادب، فلسفہ، اشتراکیت کی نظریات قدیم و جدید، یورپ کے ثقافتی خزانوں اور کارناموں کے اثرات بھی میری غزل پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ (۳)

فراق کی غزل پر یہ چیزیں اثر انداز ہی نہیں ہوئیں ان کی شاعرانہ فکر اور اسلوب کا جزو بھی بن گئیں اور کچھ ایسا جزو کہ اس کے بغیر ں کے اسلوب کی شناخت ہی ممکن نہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے اس بارے میں روشنی ڈالی ہے:۔۔۔

"ان کے فکر و بصیرت اور ذوق کی تربیت میں ہندو معاشرت اور ہندو فلسفے کے صالح عناصر سے لے کر مسلم تہذیب اور مدنیت اور پھر مغرب کے تمام مفکروں اور فن کاروں کی بہترین تخلیقات کے قابلِ قبول اثرات تک داخل ہیں جو بادام شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ ان کی شاعری بھی طرزِ فکر اور اسلوبِ اظہار دونوں اعتبار سے اسی امتزاج کا ایک خوش آہنگ اظہار ہے۔" (۴)

فراق کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے اور احتشام حسین کے الفاظ میں:

"ابتدا میں تقریباً ایک روایتی اسلوب کی تقلید کرتے تھے لیکن چوں کہ ان کے پاس خوب سے خوب تر کی جستجو کرنے والا ایک سیماب صفت اور جولاں و رقصندہ ذہن تھا اس لیے وہ بڑی خوبی سے اس کی گرفت سے آزاد ہو گئے۔" (۵)

اور ان کے اس جولاں و رقصندہ ذہن کو جلا دینے میں مشرق اور مغرب کی تہذیب، ہندی، سنسکرت، فارسی اور مغربی زبانوں کے ر ادب کے صالح عناصر کی کارفرمائی رہی ہے جس کی ترجمانی فراق کے اشعار میں عموماً لیکن خاص طور پر ان اشعار میں ہوتی ہے جہاں انھو نے تشبیہات اور استعارات سے کام لیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کے باب میں فراق کا رویہ کچھ اور ہی ہے۔ جو ان کے تخیل کی تازگی و ں اور ان کے شعری ادراک اور طرزِ احساس کی آئینہ داری کرتا ہے اور یہ دیگر شعراء سے بڑی حد تک مختلف بھی ہے۔ فراق کے ہاں ہات و استعارات وغیرہ کا روایتی انداز نہیں اور نہ وہ تشبیہات اور استعارات وغیرہ کو محض نمائش کے لیے استعمال کرتے ہیں بلکہ اس ح اشعار میں جہاں معنوی طور پر تہہ داری پیدا ہوتی ہے ایک جمالیاتی کیفیت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ سچ پوچھیے تو فراق کا جمالیاتی احساس ف جمالیاتی نہیں اس میں استدلال اور تفکر کی کارفرمائی بھی ہے اور بقول شخصے اسے "جدلیاتی جمال پرستی یا جمالیاتی جدلیت قرار دیا جائے تو سب ہے۔" اس میں روایات کا گہرا شعور بھی ہے اور تازہ ہواؤں کی بھینی بھینی مہک بھی۔۔۔۔ مختصر یہ کہ فراق تشبیہات و استعارات کے ب میں نظر کی وسعت، تخیل کی رفعت اور فکر کی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں جو ان کے مہذب اور رچے ہوئے مذاق اور نشستہ و شائستہ مزاج ین ہے۔ بایں وجہ ان کے ہاں حسیاتی دل کشی کا احساس ہوتا ہے۔ صوتی خوش آہنگی اور اظہار کی بے ساختگی نے ان کے تشبیہات و عارات کو نیا رنگ دے دیا ہے یوں ان کا اسلوب طرفگی کا حامل اور نادر و لالہ کار ہو جاتا ہے۔ نہ جانے ایسے کتنے اشعار پیش کیے جا سکتے ۔ میں چند ایک پر اکتفا کر دوں گا:

دلوں کو میرے تبسم کی یاد یوں آئی — کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ
وہ پچھلی شب نگہِ نرگسِ خمار آلود — کہ جیسے نیند میں ڈوبی ہوئی ہو چندر کرن

دلفِ شبوں کی چاند بکھیر کبھی کی دمک — مسب ملا ہے ہر رنگ و چمن کیا کہنا
کاجل ملی آنکھ پہ ہے جھری — جیسے دن رات دھیان میں بسا ہو
سر تا بسر اس کے جسم کا انداز — سانس وشنو کی جیسے ساگر میں
رنگت میں کھِلا اس طرح اپنے حسن کی کھاکر — پھول جس طرح نکھرے سرکنے سے شبنم کے
شرم و حیا کم ہوتے ہوتے حسن پہ وہ جوبن آیا — جیسے گھٹا کے چھٹے چھٹے چاندنی رات نکھر آئے
ہر لمحہ ہے کسی نے سمجھا کو — زندگی ہے کہ رام کا بن باس

فراق کا اسلوب غزل کا اسلوب ہے، ایجاز و اختصار کا اسلوب ہے۔ فراق نے غزل کے اس دائرے میں رہتے ہوئے تفصیل و تشریح سے بھی کام لیا ہے۔ اشاریت کا استعمال وہ کم کرتے ہوں لیکن اشاریتی لہجہ اور اشاریتی اسلوب ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اس طرح بھی ان کے ہاں ایک طرح کی بے ساختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا اسلوب مزید پرکشش ہو جاتا ہے۔ دیگر اور خاص طور پر "پھر بھی" ردیف والی غزل کے اشعار پڑھیے۔ مثلاً:

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی — یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے ہاں مگر پھر بھی

یہ فراق کے اسلوب کا کمال ہے۔ ان کا آرٹ ہے۔ اس طرح ان کے اسلوب کی جدت داری اور جدت دلنوازی نہیں طرح دار بھی ہو جاتی ہے۔ فراق نے اردو غزل کو بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن فراق کا اسلوب، اردو غزل کو ان کی سب سے بڑی دین ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کے اس اسلوب میں اردو شاعری کی کئی آوازیں، مدھم مدھم شامل محسوس ہوتی ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ نہ انھوں نے کسی کی نقل کی اور نہ مانگے کے اجالے سے کام لیا ہے۔ فراق کا اسلوب تو فراق کا اپنا اسلوب ہے، ایک خاموش گہرائی، سبک روی، رچی ہوئی خطابیت، استدلالی رومانیت اور شستہ و شائستہ جذبیت دونوں کا حامل، جہاں خود انفرادی حیثیت بھی رکھتا ہے اور امتیازی شان بھی۔۔۔۔ فراق نے غلط نہیں کہا ہے:

یہ میری طرزِ غزل بھی ہے ایک طرزِ غزل — یہ طرز، طرزِ غزل کا مگر شکار نہیں

○ ○ ○

(بسلسلہ ص ۲۱ ۔ ۔)

نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خود کو انتہائی سبک ہوتے محسوس کیا۔ اس کے وجود میں ایک عجیب طرح کی لطافت پیدا ہو رہی تھی۔ اسی طرح کے کیف سے وہ آج تک ناآشنا رہا تھا۔ لطف کی اس انوکھی کیفیت سے سرشار ہوتے ہوئے اس نے سر سے چہرے کی طرف بہہ کر آنے والے لہو کو انگلیوں سے صاف کیا، اور لذت کی انتہا سے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا کہ آگہی کی تکمیل فقط آخری لمحات سے کیوں وابستہ ہے؟

○ ○ ○

قاضی سلیم

سوندھی مٹی کے بت

(خط بہ نام مصنف)

بھائی اقبال متین۔ ہماری لعل کے ہاتھ پر خاکہ نما انشائیوں کا مجموعہ سوندھی مٹی کے بت مل گیا تھا۔ مگر انھیں دنوں ایک سفر درپیش ہوا، اب لوٹا ہوں تو ان سب تاثرات، کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں جو آپ کی کتاب ایک ہی نشست میں پڑھنے پر ذہن میں ابھرے تھے۔ آپ کی کتاب دوبارا انہیں پڑھوں گا اس لیے کہ پگڈنڈیاں پھوٹنے لگیں گی پھر تو یہ خط پوسٹ ہی نہیں ہو سکے گا۔

پہلا امپریشن بڑا سیدھا سادہ سا تھا۔ "واہ واہ کیا کتاب ہے کیا انداز بیان ہے! کیا نثر ہے مزا آگیا!" مزے کا لفظ اس سادہ حارن تاثر کی سطحیت کو ختم کر دیتا ہے۔ میر تقی میر نے شعر کے مزے کو تنقیدی اصطلاح کے طور اپنے مخصوص معنی میں لیا ہے (اسے آج ہر ادب پارے پر محیط کیا جا سکتا ہے) میرا خیال ہے پڑھنے والے پر ایک کیفیت طاری کر دینے کی صلاحیت تخلیق کار کی حاوی ہو جانے والی وہ مقناطیسی شکتی ہے جس سے پڑھنے والا پنا ماٹز ہو کر رہ جائے اور اپنے آپ کو تخلیق کار کے سپرد کر دے۔

مجھے برسوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میرے آدھے سر کا درد اتارنے کے لیے والد صاحب نے ایک ماہر روحانیات کو بڑی دور سے بلوایا تھا جو علوی عملیات سے سفلی اثرات کا توڑ جاننے کا دعویٰ کرتے تھے تین دن تک چھوٹی چھوٹی چٹھیوں پر نمرود، شداد، فرعون اور جانے کیا کیا لکھ کر رات بھر کچے دھاگے سے سر پر باندھتے اور ہر صبح ایک ایک چٹھی کھول کر بیری کی چھڑی سے اس پر ضربیں لگاتے اور میرے غیر مرئی دشمن کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے اس چیخ پکار سے میرے سر کا درد اور بڑھتا رہا تیسرے روز میں نے والد صاحب کی نظر بچا کر کہہ دیا یا حضرت میرے اندر کا شیطان آپ سے مضبوط ہے آپ کو بھی پچھاڑ کر رکھ دے گا۔ بد عقیدگی کا الزام دھر کے وہ تو بھاگ لیے مگر وہ دن اور آج کا دن میں نے کسی سیانے جانتے کے آگے سر جھکایا اور نہ کسی کم زور تخلیق کار سے بار مانی جاہل راہ فرار اختیار کرتے رہے۔ شاعری، افسانے، ناول کی کتابیں دس بیس صفحوں ہی میں ڈھیر ہوتی رہیں سوائے اس تخلیقی ادب کے جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔

فرانس کے سرریلسٹ آرٹسٹوں اور شاعروں کا یہ خیال صحیح تھا کہ لفظوں کی ادبی ترتیب میں جادوئی منتروں کا اثر چھپا ہوتا ہے میر نے جب ادب پارے کے مزے کا ذکر کیا تھا در اصل وہ اسی جادو اثری کی نشان دہی کر رہے تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون کے تازہ شمارے میں فراق گورکھپوری پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ان کے ہاں شعری کیفیت متن کے ہلکے پن کو چھپا لیتی ہے اس لیے بظاہر شعر اچھا لگتا ہے مگر ہوتا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شمس الرحمٰن فاروقی جیسے ورسٹائل دانشور کیفیت کو فروعی چیز سمجھ رہے ہیں حالانکہ ادب پارے میں کیفیت ہی سب کچھ ہے باقی سب تو ہم شما ہے اس بات کی تشریح آگے آئے گی۔

علم اور سائنس صحافت کی تحریریں منطق اور دلائل سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتی ہیں ادب کا طریقۂ کار طلسم بندی کا طریقۂ کار ہے منطقی شعور لکھنے والے کو جتنی آزادی دیتا ہے اسی تناسب سے ادب پارے میں گہرائیاں اور جتنیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہی باتوں باتوں میں پڑھنے والے کے دل پر قبضہ جمانا اور بہلا پھسلا کے اپنے مطلب کی دو چار باتوں میں سے نتیجہ نکالنے کا فن ہے جسے [illegible] کہانی کار ہیں

نے اپنے مجموعے "نجات سے پہلے" میں ذہن کا کونا ایک کہانی دو حصے لکھا ہے دھیرے دھیرے میں تمہارے اندر بسنا چاہتا ہوں ممکن ہے ایسے میں میرا کوئی انداز نظر میرا کوئی رنگ جھلک جائے "دیکھیے ادب میں بھی اپنی بات منوانے کی کوشش ضرور ہے مگر راست دل میں اتر کر چاہے ذہن سے ہو کر ہی گزر رہا ہے۔

اس لمبی چوڑی تمہید سے مراد صرف یہ تھا سوندھی مٹی کے بت کے اندر چھپے مرکزی نشان دہی کر سکوں جو آپ کی اس کتاب کی بنیادی خوبی ہے کہ پڑھنے والا آپ کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا افسانہ پڑھنے پر مجبور یہاں تک کہ کتاب ختم ہونے تک وہ کسی اور کام کے قابل ہی نہیں رہتا، میرے ساتھ تو یہی ہوا تھا۔ آپ کے افسانوں میں بھی یہی Dominating صلاحیت ہے (مگر افسوس آپ میری طرح دکن میں پیدا ہوئے خوبیوں کی کھوج کون کرے۔)

ہاں میں یہ کہہ رہا تھا پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہا لے جانے کا فن آپ جانتے ہیں کہ ہم جب آپ کے ساتھ چل نکلتے ہیں آپ کے موضوع سخن سے بھی کم ہی سروکار رہ جاتا ہے وہ مخدوم ہوں ادیب یا عبدالمنان سب آپ کے تخلیق کردہ کردار لگتے ہیں۔ یہاں ایک مسئلہ صاف کرتے چلیں۔ کچھ دنوں سے نئے افسانے میں کہانی پن کی تجدید پر لوگ بغلیں بجا رہے ہیں آپ کی اس کتاب میں کون سا کہانی پن ہے کہ قاری اس میں کھو جائے۔ ایک نوجوان افسانہ نگار انور خاں نے اپنے مجموعے یاد بسیرے میں ایک کمپیوٹر روبوٹ کے بارے میں ایک افسانہ شریک کیا ہے۔ وہ جیتا جاگتا انسان لگتا ہے کہ افسانہ نگار کے ایک دو صفحے کے تعارف کے بعد ہی ہم اسے بہ حیثیت ایک زندہ انسان قبول کر لیتے ہیں۔ یہ وہی Make Belief والی بات ہے۔ یہ طلسم بندی نہیں تو کیا ہے۔ وہی کیفیت، وہی مزا، مزے میں کھو جانے کی خواہش اسی کی خاطر تو آج کی مادی زندگی میں ہوسناک حد تک دوڑ کے ایسے دیوانے مل جاتے ہیں جو ادب لکھتے اور ادب پڑھتے ہیں ادب اور آرٹ کی یہی لذت اس کے وجود کا جواز بھی ہے ورنہ یہ تو ملکوں میں بھی آنے والے زمانوں میں پیدا ہونے لگیں گے۔

یہاں تک میں نے آپ کو صرف یہ بتایا ہے کہ آپ کی تحریر میں ایسا لطف چھپا ہے جو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ میں نقاد تو ہوں نہیں اس راز کی گتھیاں کھوج کر بتا سکوں۔ پھر بھی اوپر "مزے" کی تشریح کا وعدہ کیا ہے اس لیے کوشش کرتا ہوں کہ اپنے انداز ہی میں سہی تھوڑی بہت وضاحت کر سکوں۔

یہ تو ماننے کی بات ہے کہ جب تک کسی تخلیق میں فن کار کی ذاتی وابستگی شامل نہ ہو بات نہیں بنتی۔ بہت سے نقادوں کے ہاں اس بات کی ترجمانی ملتی ہے۔ نئے لکھنے والوں کو ہم ان کی نصیحتیں بھی کرتے رہتے ہیں مگر عمل پیرائی کتنی مشکل ہے۔ اس کے لیے شاید کسی صوفی کامل یا کم از کم ہمہ جہتی شخصیت ہی درکار ہوگی۔ ہم جیسے چھوٹے چھوٹے تخلیق کار محدود طور پر ہی اپنے آپ میں ڈوبنے اور مراقبے کے عمل سے گزرنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ زندگی کی خارجی کیفیت اور ذات کا باطن روحانی تجربہ نہ ہوتے ہوئے بھی متصوفانہ عمل سے ضرور قریب ہے۔ ہم حسب توفیق اس تجربے سے گزرتے ہیں اس سفر میں [illegible] قطرے مسرت کے قبول لاتے ہیں یہی تو وہ بہت مسرت نظم اور افسانے کے گرفت میں شامل ہو کر اپنا اثر دکھاتا ہے یہ اثر پذیری اسی کے تناسب پر منحصر ہے۔ باقی تو سب کچھ صنعت کا [illegible] فنی چابک دستی اور زبان دانی کا کھیل ہے۔ سوندھی مٹی کے بت کی تخلیق میں جو [illegible] شاید اسی لیے ہے کہ اس میں مسرت کا عنصر کچھ زیادہ ہی [illegible] چابک دستی کے زور پر لکھی جانے والی کتابوں کے [illegible] رہے ہیں [illegible]

ب سکے یارہ کہیں جو ادب پاروں سکے اس نازک فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے وہ آپ کی ذہنی رو کا تابع ہے۔ آپ لکھتے چلے جاتے ہیں الفاظ آپ کے لشکر بن کر ہمراہ چلتے ہیں۔ ایسی [illegible] لکھنے کی صلاحیت کم ہی لوگوں کو میسر آتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ خداداد ہی ہے یا اکتساب سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ [illegible] الکلام آزاد سے عبدالماجد دریابادی تک، عبدالماجد دریابادی سے جلیل قدوائی [illegible] تک، [illegible] سے [illegible] ساری تک کتنے لوگ ہیں جو صاحب طرز نثر نگار کہلائے جا سکیں، مگر [illegible] کی صلاحیت سے ایسے [illegible] جیسے [illegible] کے ہاتھ سے [illegible] سے قلم کا [illegible] ہے۔ [illegible] انصاری میں ایک خاص [illegible] تھی کہ ہر جگہ وہ ایک ہی انداز اختیار کرتے تھے خاص طور پر خود نوشت سوانح [illegible] اور خاکوں کی کتاب میں کوئی چبا چبا کر بات کرے، اپنی کارگزاریوں کی تشہیر کی خواہش ہر جگہ سر [illegible] رہے تو وہ ادب کی [illegible] سکتی ہے ادب پارہ نہیں بنتا۔ تخلیق کو تو جھرنے کی طرح پھوٹنا چاہیے:

جو قلم اپنے رواں جوں چلیں پروائیاں — رقص گریہ قدم، موسموں کے زیر و بم

دور جیسے دن ڈھلے، جھیل میں بجرا چلے — چاندنی جو زرفشاں، حور جیسے [illegible]

استعارے، رمز، ایچ پیچ سوالا اور پیچ

آپ کی تحریر کی ایک اور خصوصیت کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ اللہ میاں نے آپ میں ایک حیرت انگیز صلاحیت ودیعت کی ہے کہ [illegible] کسی کردار کے اندر گھس کر اپنی دھڑکنوں کو اس کے سینے کے [illegible] سے جوڑ لیں۔ جیسے ڈاکٹر لوگ سائنس کی مشین کو کسی کوما میں جانے [illegible] انسان سے جوڑ دیتے ہیں۔ یہ ایک پختہ مشق کہانی کار ہی کر سکتا ہے اس لیے کہ اسے مرے ہوؤں کو بھی کہانی کے ایک موڑ تک زندہ رکھنا [illegible] ہے۔ آپ جس حقیقی یا تخلیقی کردار کی تصویر کشی کرتے ہیں دس پانچ آڑی ترچھی لکیروں ہی میں وہ شباہت دینے لگتا ہے آپ کے [illegible] [illegible] شخص کے اندر باہر کی ساری سچائیوں کو کھنگال کر رکھ دیتے ہیں۔ ایک تجربے کے طور پر آپ کے بعض خاکوں سے دس پانچ جملے منتخب [illegible] تا ہوں۔ دیکھیے پورے قد و قامت کے ڈاکٹر عبدالمنان کھڑے ہیں:

"جو بھی ڈاکٹر صاحب سے ملا وہ انھیں کا ہو رہا۔ ادبی انجمن کے وہ گرتا دھرتا ہر اصلاحی ادارے کے وہ ان داتا۔ ساری نیکیاں ان کی، سارا علم و ہنر ان کا، ساری دانش وری ان کی، جب کوئی مت بن کر سامنے کھڑا ہو جائے تو ہمارے لیے پوجنے کے سوا چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے۔"

[illegible] طرح مضمون کا کوئی دوسرا پیراگراف آپ چنیں وہ بھی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو اپنے سمیٹ لے گا کہ خود مکمل نظر آئے گا۔

مخدوم کی سیاسی زندگی کا عکس دیکھیے: "شاہی سے مخدوم کی ہم گیری نے اپنی اولین کاوش ہی میں اسے ہیرو بنا دیا تھا۔ یہ ان دنوں کی [illegible] ہے جب ایک شخص کے ماتھے کی تیوری حیدرآباد کے ہر شخص کے ماتھے کی لکیر بن جاتی تھی۔" مخدوم کے اپنی دنیا سے [illegible] کے بارے میں یہ [illegible] و [illegible] رکھتے ہیں: "جب مخدوم کا جسمانی وجود ہم سے [illegible] سب سے دور ہو گیا مخدوم جانے جانے ہمارے قلم کی روشنی [illegible] خود اس اندرون [illegible] گئے۔

[illegible] کی عاشقی [illegible] زندگی کی پرچھائیاں کس طرح سمیٹی ہیں۔ " [illegible] کے پاؤں زنجیر ہونے سے مشیر سے [illegible] [illegible]

پر صفیہ اریب کے ساتھ، دوستوں کی محفلوں میں صفیہ اریب کے ساتھ، صبا کے دفتر میں صفیہ اریب کے ساتھ۔ صفیہ میں تمھاری محبتوں سے تنگ آگیا ہوں۔ مجھے آزادی سے سانس لینے دو۔ (اقبال متین) تم نے کس کے پلے باندھ دیا کیا اسے طبوس بنا کر پہن لوں۔۔۔۔۔" آج بھی اریب کا خیال آتا ہے تو سوچتا ہوں اللہ میاں سے خوش آمدید کہنے میں ذرا بھی تاخیر ہوئی ہوگی تو لوٹ آیا ہوگا جانے کہاں کہاں آسمانوں سے سر پھوڑتا بے اماں پھر رہا ہوگا یہ سب کچھ اس وقت تک جب تک کہ مشیتِ ایزدی اس پر مہربان نہ ہو جائے۔"

شاذ تمکنت کے اندر کا چور یوں پکڑا گیا۔۔۔۔ "اپنی خود ساختہ بے سکونی اور اضطراب کے لیے شاذ نے ایسے آئینے بنا لیے تھے جن میں اچھی بھلی سامنے کھڑی زندگی کرچیاں بن بن کر بکھرتی نظر آتی تھی یہ حقیقت نہیں حقیقت کو کیموفلیج کرنے کا ہنر تھا جو شاذ کو آگیا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ کیموفلیج کے اس ہنر نے اس سے عشقیہ شاعری کی بڑی نازک منزلیں طے کروالیں۔ کاش اس کی خود بینی خود احتسابی سے آنکھیں ملا سکتی۔"

المختصر آپ نے مختلف اور متضاد شخصیتوں کے خاکے کچھ اس دردمندی سے ترتیب دیے ہیں کہ اچھائیاں کچھ اور روشن ہو جاتی ہیں اور نفسیاتی جواز دے کر برائیوں کو بھی قابلِ قبول بنا دیا ہے۔ سچ ہے سچے آرٹسٹوں کے سروں پر پیرِ پیمبروں کا سایہ ہوتا ہے۔ ورنہ انسانی درد کہاں سے آتا؟ چلتے چلاتے ان باتوں کا بھی اظہار ہو جائے جو دلوں میں وسوسے ڈالنے والی ہیں۔ چلو فرزو بھائی کو گوارا کر لیا کہ:

بھلے برے یہی سب لوگ اپنی دنیا ہیں نقیبِ صبحِ بہاراں انھیں کی خیر منائیں

مگر میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ حالی پانی پتی کو آپ نے کس تقریب میں مدعو کر لیا آپ کے احباب کے جم گھٹے میں مولانا چیف گیسٹ ہی لگتے ہیں۔ الگ تھلگ اجنبی اجنبی مطمئناً ان پر آپ کا مضمون دل چسپ انداز میں لکھا گیا ہے مگر کسی حصے کی اچھائی کسی کتاب میں موجودگی کا جواز نہیں بن جاتی۔ دید نادید کا فارمولا کتاب کی تقسیم کے لیے آپ نے بنایا۔ دید میں تو سب یار ہنستے بولتے راضی خوشی چلے آئے مگر نادید میں سروجنی نائیڈو کے ساتھ بھرتی کے لیے اور کوئی ملا نہیں تو حالی کو گھسیٹ لیا گیا۔ سروجنی نائیڈو کی بات الگ تھی۔ اسی آشیانے سے اڑی بلبل تھیں حالی کا پانی پت تو گھوڑوں کی ٹاپوں سے اتنی بار روندا گیا کہ مٹی شاید ہی سوندھی بچی ہو۔ اتنا کچھ لکھا جا چکا کہ اب ان موضوعات پر اندازِ بیاں کی مشق ہی کی جا سکتی ہے۔ ایک اور نکتہ جو کھٹکتا ہے احباب کے بسترِ مرگ کے حالات کی بے جا طوالت حالاں کہ موت کا دھماکہ خیز کلائمکس بنانے میں کافی زورِ بیان صرف کیا ہے اس لیے کہ سب آپ سے قریب رگِ جاں سے قریب رہے ہیں مگر تفصیل کی تکرار سے Monotony درآئی ہے جو بوجھل لگتی ہے کہ کتاب بہرحال کتاب ہے اقبال متین کے جذبات سے اسے کیا لینا۔

اس کے علاوہ آپ نے اپنا تعارفی نوٹ مع فہرست لسیرے جات پتہ نہیں کیوں ضروری سمجھی انداز بھی بڑا عاجزانہ رکھا ہے اسے خود نوشت سوانح حیات میں شریک کرتے کہ آنے والے محققین کے کام آتی۔

میں آخر میں آپ کا مشکور ہوں کہ اپنی کتاب میں میرا ذکر ضروری سمجھا۔ مگر جو بہانہ آپ نے میری شرکت کا بنایا ہے اس سے آپ کی پاس داری اور دوست نوازی کا چور پکڑا جائے گا۔ بڑی ٹیکھا طنز چل رہا تھا فرزو بھائی مجھے یاد نہیں رہے اگر انھوں نے میری عیب جوئی اور غیبت کی تھی تو آپ کا ایک تردیدی جملہ ہی کافی ہوتا لیکن دوست کا ذکر آتے ہی دوست نوازی میں آپ بہہ گئے۔ کئی صفحوں تک مجھے ساتھ رکھا جیسے بات سے بات نکلتی چلی گئی ہو لوٹے تو ایسے لگا جیسے کوئی چونک پڑے۔ ہاں بھائی میں یہ کہہ رہا تھا یہ آپ کی نیک نفسی ہے کہ میرے لیے

ے نے مضمون کی اکائی کی قربانی دینی گوارا کرلی۔۔۔۔ میری شاعری کے بارے میں آپ کی رائے کسی سند سے کم نہیں۔

اب جب کہ کچھ سوال اپنی طرف سے اٹھاکر آپ کے طلسم سے نکل آیا ہوں تو اب میں یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ ان میں سب سے
خاکے سلیمان اریب اور ڈاکٹر عبدالمنان کے ہیں مخدوم، شاذ، راشد آزر کے ابواب میں بھی جہاں جہاں بصیرت کی کھڑکیاں سی کھل جاتی
ں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ سارے باب ہم پایہ ہیں ان میں کچھ سرسری (لطف ساجد کے بارے میں) رسمی (عابد روڈ کے سیٹھ کے بارے
ں) غیر ضروری (فرزو بھائی کے بارے میں) شریک ہیں۔ مگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کتاب کا مجموعی تاثر جادوئی چھڑی سے سب کو چھوتا، ان
ں جان ڈالتا چلا جاتا ہے۔

ہم دکھنیوں کے لیے تو ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ آپ کی کتاب کے ساتھ ہی ذکر یار چلے، اور صدق جائسی کی اس کتاب کی یاد تازہ
گئی "دربار دربار" جو معظم جاہ کے دربار کی سرگزشت ہے مگر تاثرات آج بھی تازہ ہیں۔ دکن کی عظیم تہذیب جن کے رنگ و بے میں بچی
ں ہے ان کے لیے تو یہ متفرق مضامین ایک مربوط ناول کا کینوس بن جاتے ہیں وہ سب جیتے جاگتے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جو اپنا اپنا رول
کرکے پردے کے پیچھے جاچکے ہیں یا جو آج بھی شمع قدروں کا بوجھ اٹھائے پھر رہے ہیں۔ یہ سب ایک ہی عہد کے پروردہ ہیں جنھوں نے
ب دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے، ایک دوسرے کو بنایا بگاڑا ہے ایک اور باطنی ربط بھی ہے۔ باہمی ہمدردانہ قسم کا ربط جو مصنف اور ان
ب کے بیچ آخر تک قائم رہتا ہے۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے آپ کی عمر ہم بچے ہوؤں سے لمبی کرے تاکہ ہمیں بھی بعد از مرگ آپ کی تحریر میں
رے جی جانے کی امید باقی رہے۔

آپ کا

قاضی سلیم

○ ○ ○

رفعت سروش

گم شدہ دوست!

نہ جانے تم کہاں ہو! کس شہر میں ہو، کیسے عالم میں
سنا ہے اب تمہارے بال ہیں شفاف چاندی کے
تمہاری نرگسی آنکھوں پہ اب عینک کا پردہ ہے
بہت ہی تیز ہے یہ زندگی کی دھوپ
تم کمہلا گئی ہوں گی
تمہارے عارضوں کے پھول بھی مرجھا گئے ہوں گے
لبوں پر کھیلتی تھی جو سنہری مسکراہٹ، کھو گئی ہوگی
جبیں پر وقت نے شاید کوئی تحریر لکھی ہو لکیروں سے
بہاروں کے گزرنے کے نشاں چہرے پہ ہوں گے کتنے تابندہ

تمہاری شخصیت میں تجربوں کا لوچ شامل ہو گیا ہوگا
تمہارے نرم لہجے میں لطافت اور نزاکت بڑھ گئی ہوگی
تمہاری شوخ چھب سے ذہانت جھانکتی ہوگی
نہ جانے تم کہاں ہو!!

تم جہاں ہو --- کوئی خط لکھو

تمہاری خوش نما تحریر کو،

اب بھی ترستی ہیں مری آنکھیں

ریت اور بگولے

وقت نے کھو دیا ہے مجھے!
یا کہ میں نے گنوایا اسے!!
میں نہیں جانتا --- کیا ہوا
ہاں مگر آج اپنے قبیلے سے دور
ایک صحرا میں ہوں --- اور اکیلا
ہر طرف ریت ہی ریت ہے،
اور بگولے کہ جن کی کوئی سمت طے کرنی دشوار ہے

وقت بے شک بگولہ نہیں
اپنے ہی گرد جو ناچتا ہے
وقت بڑھتا ہے --- بڑھتا ہے --- بے انت ہے
میں بگولوں کے نرغے میں ہوں،
جانے کب تک رہوں!

○ ○ ○

پروفیسر اشرف رفیع

آرزوئے ناتمام

وہ حسین انساں
جو مرے وجود میں گم ہے
ہر نفس اس کی جستجو ہے مجھے
وہ جو آئے تو
کھل اٹھے آنگن
میری آنکھوں میں بجلیاں چمکیں
میرے ہونٹوں پہ لوریاں مہکیں
مرا دن چٹکیوں میں گزرے گا
خواب ترسیں گے میری آنکھوں کو
چاند سورج پہ
مسکراؤں گی

الجھن

بچوں کے اسکول کی فیس
بجلی کا پانی کا بل
ٹی وی اور قالین کی قسطیں
بنیے کا ادھار
بس میں، دفتر اور رستے پر
بکھرے ہیں نظروں کے تار
کن کن چیزوں میں الجھا ہے
میرا چین سنگھار

○ ○ ○

ترجمہ: قاسم ندیم

ماں جانتی ہے

بیمار بچہ سوال کرتا ہے، دودھ کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟
ماں جانتی ہے، یہ سوال نہ جانے کب خون میں بدل جائے گا
بہت کچھ ہو رہا ہے، کس کے لیے ہو رہا ہے؟
ماں جانتی ہے، بچے تب تک دودھ نہیں پائیں گے
جب تک اپنا خون نہیں بہائیں گے
سرمئی شام کی آنکھوں میں
اندھیرے کی سیاہ گائیں رنبھانے لگی ہیں
ڈوبتی راتیں صبح کا پتہ پوچھ رہی ہیں
بچے کا سوال چاندنی پھیلنے کے بعد
دم دار تارے کی طرح بے حرکت ہے
ماں دیکھتی ہے، چاندنی کا دودھ
اس کی روشنی پی رہی ہے
آسماں کی ہریالی میں دم دار تارا اٹکا ہوا ہے
اس کے سینے میں سوال اتر گیا ہے
امریکہ میں دن ہے
یہاں کیسے رات ہے؟
اس میں کہیں کوئی چھلتا ہے ...... نہیں ...... نہیں
پیار تو لامحدود ہے
وہ ہر سورج کو چاندنی پلائے گا
اس کے توتلے سوال کے سکوت کو
جواب پانے کی سمت
خون کا گل ضرور، کھلائے گا
اس کی آنکھوں کے جھل مل دم دار تارے سے
سفر بندھے ہیں
بیٹا اپنا سوال
ماں کی سوکھی چھاتیوں میں تلاش کر رہا ہے
وہ بھلے ہی نہ جانے، ماں تو جانتی ہے
ممتا بھرے دودھ کا رنگ
خون کی سرخی سے، سفید کیسے ہو جاتا ہے!!

ویرانیِ دل

رات کے پرہول سناٹے میں
جب چھٹی حس جاگتی ہے
تب روح کے تار
جھنجھنا اٹھتے ہیں
کئی ہیولے سے
روبرو آکھڑے ہوتے ہیں
منتشر خیالوں کا ہجوم
قلانچیں بھرنے لگتا ہے
کسی خوف زدہ خرگوش کی طرح
جو ہلکی سی آہٹ پر بھی
سرپٹ دوڑ پڑتا ہے
پسینے کی چند بوندیں
میری پیشانی پر
ابھر آئی ہیں
تب میں آنکھیں کھول کر
روبرو دیکھتا ہوں اپنے
سائے کو
تب مجھے سورج کی تمازت
محسوس ہوتی ہے
اب سوچتا ہوں
وہ رات کا پرہول سناٹا
میرے اندر کہاں سے
در آیا تھا
آج کتنے ہی شناساؤں سے
ملاقات کی تھی میں نے
ان کے اندر کا سب خالی پن
میں اپنے اندر بھر آیا تھا
نہ جانے کتنے ہی
ویرانوں سے گزر کر
میں اپنے گھر آیا تھا

سعید شہیدی

جو کرم آپ کے دامن کی ہوا کرتی ہے
نہ دوا کرتی ہے وہ اور نہ دعا کرتی ہے

اپنے جینے سے اسے کیوں نہ لگائے رکھوں
دولت درد تو قسمت سے ملا کرتی ہے

آشیاں کب میں بناؤں کا گرے گی کب برق
مجھ کو ہر وقت یہی فکر رہا کرتی ہے

جذب ہو جاتے ہیں ہنگامے خوشی میں کبھی
اور خوشی کبھی ہنگامہ بپا کرتی ہے

اب ضرورت نہیں فانوس کی ان کو کوئی
اب چراغوں کی حفاظت تو ہوا کرتی ہے

پر کترکے جو رہا کرتا ہے صیاد مجھے
بے کسی قوت پرواز عطا کرتی ہے

اور بڑھ جاتی ہے کچھ قید کی میعاد سعید
کیوں یہ دنیا میرے جینے کی دعا کرتی ہے

شہر جلتے ہیں خون بہتا ہے محشر کا سماں ہے
[illegible] خوش ہوں مرے شہر میں اب امن اماں ہے

اس درجہ کرم ہے مرے صیاد کا مجھ پر
اب مجھ کو قفس پر بھی نشیمن کا گماں ہے

کیوں پوچھتے ہیں آپ خود اندازہ لگالیں
جو حال ہے میرا وہ مرے رخ سے عیاں ہے

کیسے میں بتاؤں ہے کہاں میرا نشیمن
پھیلا ہوا ہر سمت گلستاں میں دھواں ہے

چھٹ جائے گی تاریکی سحر ہوگی نمودار
لیکن وہ سحر میرے مقدر میں کہاں ہے

آجاؤ کہ اب دید کے قابل ہے یہ منظر
جو سامنے جلتا ہے وہ میرا ہی مکان ہے

میں ڈھونڈنے نکلا تھا سعید اس کے مکاں کو
حالاں کہ مکاں اس کا جہاں ہے نہ وہاں ہے

دن گزرا اور آئی رات
لے کر ارمانوں کی رات

ان کے لب پر میرا نام
یہ بھی مقدر کی ہے بات

آپ میں اپنا ہوں رہ بر
میں نہیں چلتا خضر کے ساتھ

اہل قفس کیسے بتلائیں
کیا ہیں گلستاں کے حالات

گلچیں نے بڑھ کر حق اپنا
مانگ رہا ہے کیوں خیرات

ان کا تصور ان کا خیال
کتنی سہانی ہے یہ رات

جو اپنے تھے غیر بنے
یوں ہی بدلتے ہیں حالات

افتخار نسیم

○

آسماں پر پردۂ ابرِ رواں کوئی نہ ہو
اے خدا اک دن تو اپنے درمیاں کوئی نہ ہو

یا مرے دل سے مٹادے دن گزرجانے کا خوف
یا زمیں وہ دے کہ جس پر آسماں کوئی نہ ہو

طول دینا ہے کہانی کو تو خوشیاں یاد کر
داستانِ غم میں حرفِ رائیگاں کوئی نہ ہو

پھول بھیجے ہیں جزیروں کی طرف لہروں کے ہاتھ
کوئی ہو شاید وہاں پر بھی جہاں کوئی نہ ہو

کیوں مرے سر پر ہی آئے یہ عتابِ آفتاب
کیوں مرے حصے میں آخر سائباں کوئی نہ ہو

آنکھ کو بھاتی نہیں یک رنگیِ دیوار و در
اب تو ایسا شہر ہو جس میں مکاں کوئی نہ ہو

آئیے گا ایک دن تو گھر سے باہر بھی نسیم
ڈھونڈیے گا اس کو بھی جس کا نشاں کوئی نہ ہو

زبیر شفائی

○

یہ کس طلسمِ تمنا کے پیچ اب کے ہیں
کہ سامنے بھی نظارے وہی عقب کے ہیں

سبھی کو شوق تھا خوش بو کے ساتھ چلنے کا
لباس ہی نہیں دل تار تار سب کے ہیں

یہ ارتعاش یہ شامِ شفق یہ نرم ہوا
فضا میں ثبت نشانات کس کے لب کے ہیں

ترے بدن کے نشیب و فراز کیا کہنا
کمر کے دونوں طرف پیچ و خم غضب کے ہیں

یہ کوہسار یہ سبزہ یہ چاندنی یہ ہوا
تم آرہے ہو کہ یہ اہتمام شب کے ہیں

گزر رہا تھا میں تخلیق کے عمل سے زبیر
یہ آسمان و زمیں میرے یار جب کے ہیں

○ ○ ○

راشد آذر

تیور ان کے بتا رہے ہیں
وہ ہم سے بہت خفا رہے ہیں

وہ ہم کو بھلا رہے ہیں ایسے
ہم جیسے کوئی خطا رہے ہیں

کیا شعر سے مل رہی ہے پونجی
اک نام ہی تو کما رہے ہیں

وہ رشتۂ جان و دل کہاں ہے
ہم زخم کسے دکھا رہے ہیں

آنکھوں کے چراغ تو ہوئے گل
اب ہم بھی بجھے جا رہے ہیں

کچھ مرگئے لوگ، جو ہیں باقی
اب دل سے اترتے جا رہے ہیں

دیکھو، محفل میں آج آذر
کس طرح اکیلے آرہے ہیں

○ ○ ○

مظفر ایرج

○

میں سمجھتا تھا مجھے خاک میں جو ملا گیا کوئی اور ہے
کوئی اور میرے سوا نہ تھا ، میں سمجھتا تھا کوئی اور ہے

جو بدن کا عالی مکاں ملا تو میں چند روز کو رہ گیا
مرا مستقل بھی ہے اک پتہ وہ مرا پتہ کوئی اور ہے

میں کرایہ سانسوں کا دے کے جسم کے اک شکستہ مکاں میں ہوں
کہ مکان دار تو اس شکستہ مکان کا کوئی اور ہے

وہی گرچہ ہم قدمی رہی مگر اک کمی سی کمی رہی
بڑی مدتوں میں پتہ چلا مرا راستہ کوئی اور ہے

جو دیارِ خیر سے لوٹ کر رکھا پاؤں اپنی زمین پر
تو لگا یہ جگ کوئی اور ہی ہے ، یہاں خدا کوئی اور ہے

اک عجیب بات یہ کل ہوئی کہ جو آئینے پہ نظر پڑی
تو میں سوچتا ہی یہ رہ گیا کہ یہ میں ہوں یا کوئی اور ہے

مری منزلِ سفرِ حسیں ، شبِ تارِ کنجِ لحد نہیں
نہ شراب و حور و خیام ہے مرا منتہا کوئی اور ہے

کبھی آ کے دل کی سرائے میں جو مقیم تھا سو مقیم ہے
وہ جو دور افق سے پرے نکل کے چلا گیا کوئی اور ہے

کوئی مظفر اس کو بلا رہا ہے کوئی مجاز کے نام سے
جسے جانتا ہوں میں وہ نہیں ہے ، بھلا برا کوئی اور ہے

ڈاکٹر سطوت شمیم

اس شہر میں تو عام یہ دستور ہوگیا
ہر شخص اپنی ذات میں مستور ہوگیا

اپنے طلسمِ ذات میں کھویا ہوا تھا میں
تجھ سے ملا تو اور بھی مسرور ہوگیا

میرے قریب آنے کی تھی جس کو جستجو
آواز دی تو اور بھی وہ دور ہوگیا

ادراک اس قدر کہ ہر اک شے خدا لگے
دیوانہ ہوشیار تھا ۔ منصور ہوگیا

سیلاب ایسا آیا کہ دنیا پکار اٹھی
دریا زمیں کی کوکھ کا ناسور ہوگیا

آئینہ تمام ہوئے ہم تو اے شمیم
عکسِ جمالِ یار بھی مغرور ہوگیا

○ ○ ○

غالب عرفان

کہیں بھی نکتہ داں کوئی نہیں ہے
گواہی دو جہاں کوئی نہیں ہے

نظر سورج بدن صحرا نوردی
سفر میں سائباں کوئی نہیں ہے

ابھرتی ہے وہیں پہچان اپنی
شناسائی جہاں کوئی نہیں ہے

سفینہ ہے ہواؤں کے حوالے
اگرچہ بادباں کوئی نہیں ہے

تمنا بٹ گئی ہے قافلوں میں
امیرِ کارواں کوئی نہیں ہے

عبث ہے بارشوں کی اب توقع
جہاں ابرِ رواں کوئی نہیں ہے

جنوں خود سر بکف ہوتا ہے عرفاں
جنوں کا امتحاں کوئی نہیں ہے

○ ○ ○

شکیل اعظمی

○

ہوا نہ ختم سروں سے عذاب بارش کا
وہی ہے شہر، وہی مسئلہ رہائش کا

زمیں کی کوکھ اجڑ جائے اب کی بارش میں
پتہ چلے نہ ہمیں آسماں کی سازش کا

یہاں کے لوگ بھی ہوتے تھے دیوتا جیسے
بڑا رواج تھا اس گاؤں میں پرستش کا

پہن رکھے تھے سبھی نے ضرورتوں کے لباس
کسی کو شوق نہ تھا جسم کی نمائش کا

کہ وہ ملے تو سلام و دعا نہ ہو اس سے
لحاظ اتنا بھی رکھا نہ جائے بندش کا

○ ○ ○

○

چڑھا ہوا ہے جو دریا، اترنے والا ہے
اب اس کہانی کا کردار مرنے والا ہے

ذرا سی دیر میں زنجیر ٹوٹ جائے گی
جنون اپنی حدوں سے گزرنے والا ہے

سنا ہے شہر میں آیا ہے جادوگر کوئی
تمام شہر کو تصویر کرنے والا ہے

شکیلؔ ہم سے کسی کو شکایتیں ہیں بہت
چلو کوئی تو ہمیں پیار کرنے والا ہے

○ ○ ○

آثم راندیری

(آثم راندیری گجراتی اور اردو کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی گجراتی غزلوں کے اردو میں ترجمے کیے ہیں)

○

بغیر سرفروشی آدمی سے کچھ نہیں ہوتا
یہ دنیا ہے کہ اس کی دوستی سے کچھ نہیں ہوتا

لگی کہتے ہیں جس کو وہ بھی ہونی چاہیے دل میں
محبت میں فقط دیوانگی سے کچھ نہیں ہوتا

رہِ الفت میں تو دل کا دیا ہی کام آتا ہے
یہاں عقل و خرد کی روشنی سے کچھ نہیں ہوتا

نمو کی جن میں قوت ہے نمایاں ہو کے رہتے ہیں
کسی کی دوستی اور دشمنی سے کچھ نہیں ہوتا

کسی کے دل میں ہوں مہماں کسی کی آنکھ میں رقصاں
کہا یہ کس نے آثم شاعری سے کچھ نہیں ہوتا

○ ○ ○

○

واہ رے اپنے عشق کا عالم
بارہ مہینے ایک ہی موسم

عشق میں دیکھا یہ بھی عالم
لب پہ تبسم ، آنکھیں پرنم

ماہ و انجم ، گل اور شبنم
چند اشارے وہ بھی مبہم

میرا دل اور ان کی نظریں
دونوں آفت کوئی نہیں کم

دامنِ دل سے حرفِ تمنا
کب تک آخر دھوتی شبنم

○ ○ ○

اوشا بھدوریا

○

آئینے پتھر سے ٹکراتے رہے
ہم زمانے بھر کو جھٹلاتے رہے
آگ سی دہکا گئے احساس میں
ذہن و دل پر پھول برساتے رہے
جن سے دل کو واسطہ کچھ بھی نہ تھا
کیوں محبت اپنی جتلاتے رہے
تھا مقدر میں سرابوں کا سفر
پھر بھی وعدوں پر یقیں لاتے رہے
وہ جلائیں گے مرے گھر میں چراغ
اب تو وہ حالات بھی جاتے رہے
یہ تعلق بھی غنیمت جانیے
وہ مرے سائے سے کتراتے رہے
ہم نے مانا اس کو پتھر کی لکیر
آپ جو ارشاد فرماتے رہے
سات پھیرے سات وچنوں کا سفر
ہم بھی کیسی ٹھوکریں کھاتے رہے
آپ نے اپنا ہمیں مانا مگر
لفظ تو معنی کو جھٹلاتے رہے
اب کہاں جینا رہی ہے چاندنی
حادثے سانسوں سے ٹکراتے رہے

○ ○ ○

○

یوں ہی روتا رہا آسماں رات بھر
پاس آیا نہ اک مہرباں رات بھر
تند لہریں کہانی سی کہتی رہیں
دل کا ساحل رہا بے زباں رات بھر
چاندنی سرد آنچل بھگوتی رہی
رات مجھ سے رہی بدگماں رات بھر
کھیل گڑیوں کا اب ختم بھی کیجیے
کون آخر رہے گا جواں رات بھر
رات بھر آگ برسے گی احساس پر
دل سے اٹھتا رہے گا دھواں رات بھر
سب ستاروں کی رفتار پڑھتے رہے
کون سنتا مری داستاں رات بھر
لمحے اپنے مرکز پہ ٹھہرے ہوئے
میں کہاں رات بھر تو کہاں رات بھر
ایک ہلچل سی سینے میں ہوتی رہی
راہ چلتا رہا کارواں رات بھر
کان آہٹ پہ ہیں آنکھ دہلیز پر
زندگی بن گئی امتحاں رات بھر

○ ○ ○

صغیر ملال

آگاہی

اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی تباہ شدہ علاقے سے زندہ بچ نکلنے والا شخص ہو۔ اس کی آنکھوں میں خلا اور چہرے پر ویرانی ا۔ اس کے سامنے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکی کو دیکھ کر خیال آتا تھا کہ وہ روشن دوپہر میں نیند پوری کر لینے پر اچھی خاصی خوب صورت ھائی دیتی ہوگی۔ دونوں ریستوراں کے پر شور اور گرد آلود ماحول میں اس قدر سکون سے آمنے سامنے بیٹھے تھے، جیسے گھر کی چھت پر سردیوں دھوپ میں شطرنج کھیل رہے ہوں۔ اگر جڑوں سمیت اکھڑا ہوا درخت دکھائی دیتا ہے تو پھر دونوں اتنے آرام سے کیسے بیٹھے ہیں ۔۔۔۔؟

نک اسے وہی پر اسرار گونج سنائی دی جیسے کوئی بند ہونٹوں سے گنگناتا ہے۔

"مجھے کیا!" اس نے سر جھٹک کر خود کو سرزنش کی۔

"اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔"

کچھ دنوں سے اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہوتی جا رہی تھی کہ وہ جہاں بیٹھتی اپنے آس پاس کی چیزوں کو انوکھے زاویوں سے دیکھتی اور ان غور کرتی۔ اور پھر ایک حد سے گزرنے پر اپنے بے سروپا خیالات پر خود ہی جھنجھلا جاتی۔ وہ ایک دل کش چہرے اور متوازن ذہن کی تعلیم ستہ عورت تھی، لیکن جب سے اس کی ملاقات مثالی سے ہوئی تھی۔ اس کی زندگی عام ڈگر سے ہٹ گئی تھی۔ ہرچند کہ مثالی سے ملاقات کے بعد ں نے اپنی زندگی میں ایک انتہائی خوش گوار تبدیلی محسوس کی تھی مگر ساتھ ہی وہ چند غیر متوقع الجھنوں میں گرفتار ہو گئی تھی، اور اب وہ ت آگیا تھا جب اسے حتمی طور پر کوئی فیصلہ کرنا تھا۔

اس قصے کا آغاز تقریباً دو ماہ قبل ایک سہانی صبح کو ہوا تھا۔

وہ مارچ کی ایک ایسی صبح تھی جس میں آدمی ایک مبہم سے خوف کے ساتھ خوش گوار موسم سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس موسم کی پہروں میں موسم گرما کے قدموں کی دھمک سنائی دیتی ہے، اور کبھی کبھی اچانک سامنے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں آسمان کا وہ کنارہ نظر آتا ہے جہاں سے گرد آلود آندھیاں اٹھتی ہیں۔

اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر آسمان پر بادل کے سفید و سیاہ ٹکڑوں کو دیکھا تھا، اور سرکس کے ان مسخروں کو یاد کر کے ہنس دی تھی جو پنے چہروں پر مختلف رنگوں کے نقش و نگار بنائے گھومتے ہیں۔

"مارچ کی دھوپ گندم کے خوشوں میں رس بھرتی ہے۔" اس کا خاوند کہا کرتا تھا۔ "تم جو ہمیشہ بارش کے آثار دیکھ کر خوش ہوتی ۔ تمھیں معلوم ہے بہار کی برسات کاشت کاروں کے لیے کتنی نقصان دہ ہے؟"

گھر سے نکلتے ہی اسے اپنے خاوند کے الفاظ یاد آئے تھے، اور اس نے بے اختیار اچھی فصلوں کے لیے دعا مانگی تھی۔ اس کا خاوند غابیوں کا شکار کرنے کئی دنوں سے دریا کے کنارے ایک گاؤں میں مقیم تھا۔

"یہ مرغابیوں کا آخری شکار ہوگا۔" اسے خیال آیا۔ "گرمی کی شدت میں اضافہ ہوتے ہی میدانوں سے زندہ بچ نکلنے والے پرندے

پہاڑوں پر واپس چلے جائیں گے، اور اس کا خاوند گندم کی کٹائی میں مصروف ہو جائے گا۔ اس کے بعد اسے مکئی بونے کے انتظامات کرنے ہوں گے، اور پھر وہ ہرنوں کے تعاقب میں روانہ ہو جائے گا۔"

اس نے بچپن میں اپنے باپ کو ایسی ہی زندگی گزارتے دیکھا تھا اور اب اپنے خاوند کے ساتھ ان ہی شب و روز میں زندہ تھی یہ خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی تھی جسے اس کی سہیلیاں رشک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ خود اسے بھی اپنے حالات سے کوئی شکوہ نہیں تھا، لیکن کچھ دنوں سے وہ رات کو اچانک سوتے سے اٹھ کر بیٹھ جاتی اور پھر صبح تک گھٹنوں پر سر رکھے یوں ہی بیٹھی رہتی تھی۔

"چہل قدمی۔ چہل قدمی۔ تھوڑی تھکن۔ تھوڑی تھکن ضروری۔" اس ڈاکٹر نے کہا تھا جو دیسی زبان پر قدرت نہ رکھنے کے باعث غیر ملکی سیاحوں کی طرح جملوں کے بنیادی الفاظ دہرا کر اپنا مدعا بیان کرتا تھا۔

اس کا خاوند ڈاکٹر کی یہ بات سن کر اسے کھلے علاقوں میں لے گیا تھا۔

"میرے ساتھ تمہاری سب کاہلی دور ہو جائے گی۔" وہ تقریباً ہر روز یہ بات دہراتا، اور اسے اپنے ساتھ شکار گاہوں میں لیے پھرتا۔ ایک دن اس نے ہرنوں کی ڈار کو نشانہ بنایا تو گولی ایک کالے ہرن کی پچھلی ٹانگوں کو ریزہ ریزہ کر گئی۔ لیکن زخمی ہرن اگلی دو ٹانگوں پر اپنا بقیہ مردہ وجود کھینچ کر بہت دور تک بھاگتا چلا گیا۔ اس بات پر اس کا خاوند بہت ہنسا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ کچھ دیر بعد ہرن بہ ہر حال ناتواں ہو کر رک جائے گا۔

اس رات جب درختوں کے درمیان جانور کو آگ پر بھونا جا رہا تھا تو ہڈیاں چننے والے قبیلے کے چند افراد اور آس پاس کے آوارہ کتے بھی الاؤ کے گرد جمع ہو گئے تھے، اور وہ اتنا قدیم منظر دیکھ کر رونے لگی تھی۔

صبح ہوتے ہی اس کے خاوند نے اسے گھر واپس بھجوا دیا تھا۔

شہر آکر اس نے صبح اور شام کی سیر کا وقت اور راستہ مقرر کیا تھا۔ صبح کے وقت وہ پچھلی آبادیوں اور بستیوں سے گزرتی ہوئی ساحل سمندر تک جاتی اور شام کو وہ گھر کے نزدیک واقع ایک پارک میں چہل قدمی کرتی تھی۔

سمندر کے سامنے کھڑے ہو کر اسے محسوس ہوتا کہ دنیا میں کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ اور پارک میں اسے وہ پرندے نظر آتے جو سارا دن افزائش نسل میں مصروف رہتے ہیں۔

پچھلی آبادیوں سے گزرتے ہوئے اس نے ایسے مناظر دیکھے جن کے بارے میں وہ اب تک کچھ نہیں جانتی تھی۔

دھوبی گھاٹ۔ مچھیروں کا محلہ۔ ہیجڑوں کی گلی۔ بونوں کا خاندان۔

ابتدا میں ایسی جگہوں سے گزرتے ہوئے اس کی اجنبی وضع قطع نے راہ گیروں کی توجہ مبذول کی، لیکن اس نے راستہ بدلنے کے بجائے اپنا لباس عامیانہ کر لیا، اور یوں بغیر نمایاں ہوئے ان علاقوں سے گزرنے لگی۔ ساحل سمندر سے واپسی پر وہ پھلوں کی منڈی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں مخصوص ذائقے کی چائے پیتی، اور اس دوران اپنی معاشرتی حیثیت چھپا کر بیٹھنے میں اسے ایک عجیب لطف محسوس ہوتا۔

چائے پینے کے دوران وہ ہوٹل کی کھڑکی سے پھلوں کی پیٹیاں نیلام ہوتے دیکھتی۔ زمیں دار گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث وہ

پھلوں کے سفر سے بہ خوبی آشنا تھی۔ اسے درختوں پر پہلے پہل کھلنے والے وہ پھول یاد آتے جو آہستہ آہستہ پھلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر جھریوں بھرے بوڑھے لڑکے انھیں احتیاط کے ساتھ درختوں سے اتار کر بوریوں اور پیٹیوں میں بند کرتے ہیں۔ ایک طویل سفر کے بعد پھل شہروں میں پہنچتے ہیں، اور بالآخر یہاں انھیں قاشوں اور پھانکوں میں تقسیم کر کے ایسے میزوں پر سجایا جاتا ہے جن پر چھت سے فانوس اور قندیلوں کی روشنیاں پڑتی ہیں۔ پھر قہقہوں اور خوش وقتی کی گفتگو کے دوران انھیں کھاتے ہوئے ان پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔

ایک روز اسے سڑک کے پار وہ بوڑھا جاتا نظر آیا جو اکثر سمندر کے کنارے دکھائی دیتا تھا۔ ساحل پر بوڑھا لاٹھی یوں ٹیک کر چلتا تھا جیسے وہ ریت میں کوئی چیز تلاش کر رہا ہو۔ پہلے دن بوڑھے کو ایسے چلتے دیکھ کر اسے خیال آیا تھا کہ سمندر کے کنارے آنے والوں نے کبھی نہ کبھی اپنی کوئی چیز ساحل پر ضرور کھوئی ہوتی ہے۔

اس روز بوڑھے کے اوجھل ہوتے ہی ہوٹل کے ایک کونے سے آنے والی چند پرجوش آوازوں نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی چائے چھلکاتے ہوئے شد و مد سے گفتگو کر رہی تھی۔

"جو چیز شروع ہوتی ہے وہ ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔" اس نوجوان نے کہا جس کی باتوں میں حیران کن روانی تھی۔

"ظاہر ہے۔" دوسرا نوجوان تمسخر کے انداز میں پہلے کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ "سب جانتے ہیں۔"

"معقولات کا انتہائی عمیق نکتہ ہے۔ غور سے سنو۔" پہلے نوجوان کے لہجے میں انتہا کی سنجیدگی تھی۔ "جو چیز شروع ہوتی ہے وہ ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن جس کا آغاز نہ ہو اس کا انجام بھی ناممکن ہے۔"

"پھر؟" کوئی جلد از جلد حتمی بات جاننا چاہتا تھا۔

"زمانہ ہمیشہ سے موجود ہے، اس لیے ہمیشہ موجود رہے گا۔ ازل اور ابد دونوں لامحدود ہیں۔"

"تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟" اس شخص نے پوچھا جسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ وہ اپنے وقت سے صدیوں بعد پیدا ہوا ہے۔

"جب زمانے کی ابتدا اور انتہا نہیں ہے تو اس کا درمیانی نقطہ کون سا ہوگا؟" نوجوان کا لہجہ سوالیہ تھا۔

یک لخت سب خاموش ہو گئے۔

"جو ساٹھ سال کی عمر میں فوت ہوا، اس کی زندگی کا وسط کب آیا؟" نوجوان نے اپنے سوال کو عام فہم بناتے ہوئے کہا۔

"تیس برس کی عمر میں۔" کسی نے فوراً جواب دیا۔

"درست۔" نوجوان بولا۔ "اس لیے کہ ہم اس کی ابتدا اور انتہا جانتے ہیں۔۔۔ لیکن زمانہ جو کہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس کا درمیانی عرصہ کیسے معلوم ہوگا؟"

ایک بار پھر سناٹا چھا گیا تھا۔

"ہر لمحہ زمانے کا وسطی لمحہ ہے۔" نوجوان نے مسکرا کر اپنی بات مکمل کی تھی۔ "قدیم علم میں کہا جاتا ہے کہ جسے ہم وقت یا زمانہ کہتے ہیں وہ حقیقت میں ایک لمحہ ہی ہے۔۔۔ ایک لمحہ جو ازل سے ابد تک محیط ہے۔۔۔ ماضی، حال اور مستقبل، ہم فقط اپنی سہولت کے لیے تخلیق کرتے ہیں۔"

گفتگو کے اختتام پر اس نے بھی نوجوان کی بات پر غور کیا تھا، اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اگر اس کے کندھوں پر بارہ سر ہوتے تب بھی وہ یہ مسئلہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ کچھ دیر تک وہ اپنی کم عقلی پر نادم ہو کر سر ہلاتی رہی، اور پھر گھر کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

راستے میں آنے والی مچھیروں کی مسجد سے وعظ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

"حضرت ابراہیم جب نمرود کی روشن کردہ آگ میں کودے تو آگ کی تپش ختم ہو گئی، لیکن اس کی روشنی برقرار رہی، اسی لیے دیکھنے والوں کو محسوس ہوا جیسے حضرت ابراہیم سرخ پھولوں کے درمیان کھڑے ہیں، لیکن ۔۔۔۔ لیکن جہنم میں اس کے برعکس ہو گا۔ آگ کی حدت کئی ہزار گنا بڑھ جائے گی، مگر شعلے تاریک ہو جائیں گے ۔۔۔۔ اور گنہگار ابد تک سیاہ آگ میں جلتے رہیں گے۔ ان کے ہاتھ آزاد ہوں گے لیکن وہ اپنے جسم سے چمٹے ہوئے کیڑے الگ نہیں کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ جب کیڑے ان کی آنکھوں میں سوراخ کرتے ہوئے دماغوں میں اتر رہے ہوں گے تو وہ پلکیں بھی نہیں جھپک سکیں گے۔" "بے بسی کی انتہا۔" اس نے سوچا۔ اگر مولوی کی تقریر کا عنوان رکھنا ہو تو یہی مناسب رہے گا۔ پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ خواب، چاہے خوش گوار ہوں یا بھیانک، ان کے عنوانات نہیں ہوتے۔ "ہر خواب بلا عنوان ہوتا ہے۔" اس پر منکشف ہوا، اور اچانک اس کا جی چاہا کہ وہ مولوی کو لے جا کر سمندر کے سامنے کھڑا کر دے اور پھر اس سے پوچھے کہ "اگر ہم چاہیں بھی تو کیا گناہ کر سکتے ہیں۔"

۲

"مزاحیہ تحریروں کی حیثیت ہمیشہ سے ثانوی رہی ہے۔ دنیا کے تمام شاہ کار، رنج و الم کی داستانیں ہیں۔ موت کا احساس مکمل مایوسی کو جنم دیتا ہے، اور یہی مایوسی سارے فلسفے اور ادب کی بنیاد ہے۔ چھوٹی چھوٹی محرومیوں سے پیدا ہونے والی حسرت ذہن میں گرہیں ڈالتی ہے۔ اسی لیے دنیا کا ہر انسان تھوڑا ہوش مند اور تھوڑا پاگل ہے۔ پاگل کی نشانی یہ ہے کہ وہ بدلتے موسموں میں بے چین ہو جاتا ہے، اور گزرتے بادل کے سائے کو پاؤں تلے روکنے کی کوشش میں ناکام ہو کر روتا ہے۔ پاگل پن بہت بڑی چیز ہے۔ ہوش مندی انسان کی انتہا نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی جانور ذہنی مریض نہیں ہو سکتا۔ صرف انسان ۔۔۔۔"

"پاگل کتے وغیرہ۔"

"وہ دماغ کے کیمیائی تناسب کا بگاڑ ہے۔ اس لیے جسمانی بیماری ہے۔ میں دماغ کی نہیں ذہن کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارا بدن ایک پودے کی طرح ہے۔ دماغ اس کا پھول اور ذہن خوش بو ہے۔ دماغ نظر آتا ہے۔ اس کی ایک شکل ہے لیکن ذہن ۔۔۔۔ خوش بو کو کیسے ناپیں؟ بچے برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔ مگر خوش بو کا انسان بنا کر اس میں آنکھیں نہیں لگائی جا سکتیں۔"

وہ اور مثالی، پارک میں چہل قدمی کے دوران گفتگو کر رہے تھے جس دن ہوٹل میں کوئی جگہ خالی نہ تھی، اس نے ناقابلِ فہم مسئلہ بیان کرنے والے نوجوان کو اپنی میز پر بیٹھنے کی اجازت دی تھی۔ اس دن کے بعد مثالی اس کے لیے وقت گزارنے کا بہترین ذریعہ بن گیا تھا۔ مثالی کا بدن نحیف تھا لیکن اس میں گفتگو کرنے کی بے پناہ طاقت تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولنے لگتا، اور پھر مسلسل بولتا تھا۔

"سناٹا کائنات کی حقیقت ہے۔" اس نے پہلے ہی دن اپنا موقف بیان کر دیا تھا۔ "قدرتی مناظر اور فطری تقاضے مجھے حیران نہیں کرتے۔ جسے ہم فطرت کہتے ہیں وہ صرف زمین کا منظر ہے ۔۔۔۔ زمین خود خلا کے ابدی سناٹے میں گردش کر رہی ہے۔ خلا میں کوئی پھول نہیں،

کھلتا، کوئی دریا نہیں بہتا، وہاں ازل سے ایک موسم قائم ہے۔ خاموشی کا موسم ---- اس موسم میں سانس لینے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، مگر ذی نفس فقط زمین پر بستے ہیں۔ ایک گورکن قبر کھودتا ہے اور دوسرا تھک کر اسے لالٹین سے روشنی دکھاتا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے قدیم اور اٹل منظر ہے۔ لیکن یہ منظر صرف یہاں ہے۔ زمین پر ---- اوپر چلے جاؤ۔ اوپر یا نیچے یا دائیں بائیں کہیں نکل جاؤ، بہت جلد سناٹا شروع ہو جاتا ہے ---- خاموشی ---- نمازیوں کے چلے جانے کے بعد مسجد میں طاری ہونے والی خاموشی کی طرح یہ خاموشی بھی مقدس ہے۔"

وہ اچانک ہنس پڑی تھی۔ "تم خاموشی کو حقیقت مانتے ہو اور اتنا بولتے ہو۔"

آج پارک میں بھی وہ حسبِ عادت مستقل بول رہا تھا۔

"کسی کے مرنے کی خبر سنتے ہی تصویروں میں اس کے چہرے کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔ مرنے والے کی آنکھوں میں گہرائی اور چہرے پر دانائی نمایاں ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ شروع سے ہم سے زیادہ جانتا تھا، لیکن اس نے اپنے علم کو نہایت کامیابی سے آخر تک ہم سے چھپائے رکھا، اور اسی کامیابی پر اب اس کی آنکھوں میں وہ چمک پیدا ہو گئی ہے جو اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔"

"تم کس قدر عجیب باتیں کرتے ہو!" اس نے چونک کر مثالی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"زندگی کی واحد حقیقت موت ہے۔" مثالی کی روانی قائم رہی۔

"لاکھ ہنگامے برپا کرو۔ ہلچل مچاؤ، لیکن زندگی کی حقیقت بار بار ابھر کر یوں سامنے آتی ہے جیسے ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر تیل کی چکنائی نمودار ہوتی ہے ---- تم نے کبھی غور کیا کہ ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد جب کسی محفل میں دو پرانے دوست غیر متوقع طور پر ملتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو کتنی عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ عمر گزرنے کے ساتھ خود میں آنے والی تبدیلیوں کے احساس سے دونوں کو گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ گرم جوشی سے گزرتی ہوئی باتیں اور واقعات دہراتے ہیں لیکن سب سے اہم موضوع پر زبان بند رکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی دوسرے سے یہ نہیں کہتا کہ "تمھیں اس قدر تیزی سے ختم ہوتے دیکھ کر مجھے افسوس ہوا ہے۔" اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ جواب میں اسے بھی یہی سننے کو ملے گا۔ انھیں اچانک اپنی گم کردہ توانائی اور توقعات یاد آتی ہیں، اور وہ جلد از جلد ایک دوسرے سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔"

"ہوتا ہوگا۔" اس نے کچھ کہنے کی خاطر کہا۔

"کیا؟" مثالی نے پوچھا۔

"یہی جو تم کہہ رہے ہو۔"

"یہی تو ہوتا ہے۔" مثالی نے اصرار کیا۔ "وقت بہت تبدیلیاں لاتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ اور جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ سمجھ گئی کہ اب وہ ایک سکہ نکالے گا اور سکہ اچھالنے سے پہلے خود سے پوچھے گا۔ "حکومت یا چاند ستارہ؟" اور جب سکہ زمین پر گرے گا تو وہ چاروں سمت سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ کر سرگوشیوں میں "حکومت!" کہے گا۔ یا خوشی سے اچھل کر بلند آواز سے "چاند ستارہ" پکارے گا، اور سکہ جیب میں ڈال کر دوبارہ چل پڑے گا۔

مثالی کی یہ ادا آج تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کبھی اسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک انتہائی باریک بین اور حساس شخص ہے، اس لیے یوں بے مقصد سکہ اچھال کر اپنے اعصاب کو وقتی سکون مہیا کرتا ہے، اور کبھی اسے خیال آتا کہ زیادہ مطالعہ اور غور و فکر اسے کہ ذاتی طور سے ذہنی طور پر مجروح کر گیا ہے۔

۳

ایک پرپیچ پہاڑی راستے پر وہ ٹھہر گئی تھی۔

"پہاڑی علاقوں میں گندم کی فصل دیر میں کاشت کی جاتی ہے۔" اس نے مثالی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے دیکھا میدانوں میں گندم کے ڈھیر لگے تھے، لیکن یہاں فصل اب تک کھڑی ہے۔ تقریباً دو ہفتوں بعد کوہستانی گندم کاٹنا شروع کریں گے۔"

"وجہ؟" مثالی نے بے دلی سے پوچھا۔

"موسم!" اس نے ایک لفظ کے سوال کا ایک لفظ میں جواب دیا، اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ "پہاڑوں پر سردی کا زور دیر میں ٹوٹتا ہے۔۔۔۔ گندم کی فصل کاٹنے کے بعد یہ لوگ مکئی کاشت کریں گے، اور اس کے ساتھ ہی ان کی نگاہیں ایک مرتبہ پھر آسمان سے لگ جائیں گی۔" یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگی۔ "تمھیں معلوم ہے پہاڑی لوگوں کی گردنیں اس لیے لمبی ہوتی ہیں کہ انھیں ہر وقت آسمان کی جانب دیکھنا پڑتا ہے۔" "کیوں؟" مثالی کے لہجے میں بے دلی کے ساتھ اکتاہٹ شامل ہو گئی تھی۔ وہ صرف اس موضوع میں دل چسپی لیتا تھا جس پر وہ خود بول سکے، اور اس کی سات نسلوں میں کوئی زراعت کا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔

"۔۔۔۔ اس لیے کہ پہاڑی علاقوں کی زمینیں بارانی ہوتی ہیں۔ اگر بارش میں تاخیر ہو جائے تو ان کا سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ تمھیں پہاڑوں میں کس قدر ندیاں نالے نظر آتے ہیں، لیکن زرعی اعتبار سے یہ بے کار ہیں۔ ان کے پانی کو کوئی راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ وادیوں میں پانی کا راستہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے پھر مسکرانے لگی۔ اسے مثالی کی بے بسی پر ہنسی آرہی تھی اس کا مثالی کو مختلف جغرافیائی ماحول میں لانے کا مقصد ہی یہی تھا۔

چند روز قبل اسے احساس ہوا تھا کہ مثالی اس سے مانوس ہونے کے بعد آہستہ آہستہ وابستگی کے مرحلے میں داخل ہو رہا ہے۔ کچھ دنوں میں اس کا خاوند گندم کی تقسیم سے فارغ ہو کر گھر واپس آنے والا تھا، اور اس کے سمجھانے کے باوجود مثالی یہ بدلی ہوئی صورت حال قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"میں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہوں گا۔" اس کے تمام دلائل سننے کے بعد مثالی نے کہا تھا وہ لرز گئی تھی۔

"میں اور تم بہت مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔" بالآخر اسے صاف کہنا پڑا۔ "تمھاری دل چسپیاں اور مشاغل مجھے مسحور کرتے ہیں۔ اس لیے کہ میرے لیے یہ سب کچھ بہت انوکھا ہے، اور میرے ساتھ تم یوں خوش رہتے ہو کہ میں تمھیں ایک مختلف ماحول کا احساس دلاتی ہوں۔ لیکن بہرحال، ہمارے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ ساتھ رہ سکیں۔"

"مثالی نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "۔۔۔۔ اور پھر دنیا ختم نہیں ہو رہی ہے۔ تمھاری باتیں اور طرز گفتگو میں نہیں بھولوں گی۔ ممکن ہے اگلی مرتبہ جب میں اکیلی رہ جاؤں تو تمھیں پھر ڈھونڈ نکالوں۔" اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"میرا مصرف فقط یہ ہے کہ فرصت کے لمحات لزارنے میں تمھارے کام آؤں۔" یہ جملہ ادا کرتے ہوئے مثالی کی آواز میں آنے والی گی اس پر بہت کچھ منکشف کر گئی تھی۔

"اوہ۔" اس نے دھیرے سے کہا تھا اور مثالی کو غور سے دیکھا تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب اسے خیال آیا کہ اب مثالی سے الگ ہونا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اس پر دونوں کا باہمی تضاد واضح کر دیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ مثالی اس کی بلند تر معاشرتی سطح پر سانس لینے میں دشواری محسوس کرے گا۔

دوسرے دن وہ مثالی کو پہلی مرتبہ اپنے گھر لے گئی تھی۔ اس نے مثالی کو اپنی خاندانی تصویریں دکھائیں۔

حویلیاں، اسلحہ، شکار کردہ درندے، پرانے وفادار ملازم، انعام یافتہ پالتو جانور، آبائی قبرستان۔

مثالی اس قدر مختلف ماحول میں داخل ہو کر کچھ دیر کے لیے الجھ سا گیا، لیکن وہ اس کا رخ بدلنے میں ناکام رہی تھی۔

"میں تمھارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔" مثالی نے رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا، اور وہ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتی رہی تھی۔

دوسرے دن اس نے سوچی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مثالی سے اسی ہوٹل میں ملاقات کی اور اس سے پوچھا۔

"تم کس حد تک میرا ساتھ دو گے؟"

"آخری حد تک۔" مثالی نے اطمینان سے جواب دیا تھا، اور وہ ایک بار پھر دہل گئی تھی۔ خیالات کی دنیا میں رہنے والا نحیف و نزار شخص، عملی طور پر بہت ضدی ثابت ہو رہا تھا۔

"----وادیوں میں پانی کی فراوانی ہوتی ہے، لیکن پہاڑی فصلوں کا وجود بارش سے وابستہ ہے۔" اس نے طویل خاموشی کے بعد وہیں سے گفتگو کا آغاز کیا۔ "----اسی لیے پہاڑوں کے رہنے والے، غریب اور پس ماندہ ہوتے ہیں۔ وہ بلندیوں سے میدان والوں کی لہلہاتی فصلیں دیکھتے ہیں اور بہتر زندگی کی تلاش میں نیچے اتر آتے ہیں۔"

"میدانی فصلوں کے لیے پانی کہاں سے آتا ہے؟" اب مثالی کا لہجہ اتنا لاتعلق نہیں تھا۔

"نہریں!" وہ اس سوال کے لیے پہلے سے تیار تھی۔ "----میدان میں پانی کا رخ پھیرا جا سکتا ہے۔ دریاؤں سے نہریں نکالی جاتی ہیں۔ بارش ہو یا نہ ہو دریا کا پانی نہروں کی صورت میں فصلوں کو سیراب کرتا ہوا گزرتا ہے لیکن جو دریا کسی وادی سے گزر رہا ہو اسے کسی دوسرے راستے پر نہیں ڈالا جا سکتا----اس کے پہلوؤں میں پہاڑ کھڑے ہوتے ہیں۔" "سمجھے؟"

"سمجھ گیا۔"

"اس لیے میدانوں کے زمین دار خوش حال ہوتے ہیں، اور فراغت کی زندگی گزارتے ہیں----اور خوش حالی اور فراغت کا امتزاج انھیں خطرناک بنا دیتا ہے۔" اپنے آخری جملے کا ردعمل معلوم کرنے کے لیے اس نے مثالی کی جانب غور سے دیکھا تھا۔

"میں تمھارے ساتھ ہوں۔" مثالی نے جواب دینے میں دیر نہیں کی تھی، اور وہ اس کی مستقل مزاجی سے چڑ گئی تھی۔

"سنو۔" آخر کار اس نے اپنے لہجے میں اپنائیت بھرتے ہوئے کہا۔ "جب جسمانی تعلقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو پھر میں ہی کیا ضروری ہوں تم کسی بھی لڑکی سے دوستی کر سکتے ہو۔ قلمی دوستی، ٹیلی فون پر دوستی یا اس طرح کی کوئی چیز----"

"تجھی دوستی۔" مثالی نے دہرایا، اور بے ساختہ ہنس پڑا۔ "تمھی دوستی کی بھی خوب رہی۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک خاموش مسکراتا رہا اور پھر اچانک سنجیدہ ہو کر بولا۔ "بدصورت عورتیں بہترین خطوط لکھتی ہیں، اور ٹیلی فون پر دل چسپ باتیں کرنے والی لڑکی کو ملاقات پر آمادہ کرنا نہایت دشوار کام ہے۔۔۔ اس لیے کہ سپاٹ چہروں والی دبلی پتلی لڑکیاں جانتی ہیں کہ ملاقات کے لمحوں میں سنگھار تختہ سے ابھرنے والے پسینے کے قطرے ان کی سانولی رنگت کو مضحکہ خیز طریقے سے نمایاں کر دیں گے۔"

"جو لڑکی تمھیں ملنے آئی وہ دبلی پتلی اور سانولی تھی۔" وہ اپنی ہنسی پہ بہ مشکل قابو پاتے ہوئے بولی۔ "اس لیے اب تمھارا خیال ہے ان جانی ملاقات کے لیے آنے والی تمام لڑکیاں اسی طرح کی ہوتی ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" مثالی نے اعتماد سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمام لڑکیاں۔۔۔ وہ تمام لڑکیاں جن کے خطوط میں چاشنی ہوتی اور جو ٹیلی فون پر سحر انگیز گفتگو کرتی ہیں، انتہائی معمولی شکل و صورت کی ہوتی ہیں۔۔۔ اور بعض اوقات تو اس سلسلے میں جسمانی مجبوریوں واسطہ پڑتا ہے۔"

اس بات پر وہ یوں ہنسی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

۴

اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی تباہ شدہ علاقے سے زندہ بچ نکلنے والا واحد شخص ہو، اور اس کے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھ خیال آتا تھا کہ وہ روشن دوپہر میں نیند پوری کر لینے پر اچھی خاصی خوب صورت دکھائی دیتی ہوگی۔

"مجھے کیا!" اس نے اپنا جھٹکا اور خود کو کہتے سنا۔ "اگر وہ ان لوگوں کی طرح پرسکون ہیں جو سردیوں کی دھوپ میں بیٹھ کر شر کھیلتے ہیں تو مجھے کیا، اور اگر مرد کی ظاہری حالت اس درخت جیسی ہے جو آندھی میں جڑوں سمیت اکھڑ جاتا ہے تو اس میں میرے لیے پریشا کیا بات ہے۔"

کچھ دنوں سے وہ بے پناہ اضطراب کا شکار تھی۔ اسے مسلسل ایک ایسی دھیمی سی گونج سنائی دیتی تھی جیسے کوئی بند ہونٹوں کے گنگنا رہا ہو۔ ابتدا میں وہ اس گنگناہٹ کو اپنی بے چینی کی بازگشت سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی تھی لیکن اچانک اسے محسوس ہوا تھا کہ یہ گن آواز ٹھوس اور حقیقی ہے۔ شہر بھر کا شور اس آواز کو دبانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ اس جان لیوا آواز سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہنگامہ خیز جگہوں کے وسط میں جا کھڑی ہوتی تھی۔ لیکن اس گونج کا تواتر اور تسلسل تمام چیخ پکار پر حاوی ہو گیا تھا۔ یہ آواز اس لکڑی کے تختے کی تھی جو سمندر کی سطح پر انتہائی مستقل مزاجی کے ساتھ تیرتا ہے، اور اپنے مقابل آنے والی بڑی سے بڑی لہر کے اوپر دوبارہ نمایاں ہو جاتا ہے

"پھر تم نے کیا سوچا؟" مثالی کے آنے پر اس نے روزمرہ کے لہجے میں پوچھا، اور گنگناہٹ کی وقتی عدم موجودگی پر دل میں شکر ادا کیا۔

"آگہی کا ابتدائی مرحلہ آشنائی ہے۔" مثالی نے نہایت سکون سے جواب دیا۔

چند لمحوں کے بعد جب اس پر مثالی کے جملے کا مفہوم واضح ہوا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

تم اس سلسلے کی آخری حد جانتے ہو۔" کچھ دیر بعد اس کی آنکھوں میں ساحل تک پہنچنے کے آثار دکھائی دیے۔

"ہاں۔" مثالی کی مسکراہٹ بے جواز تھی۔

"چلو۔" وہ مثالی کو چائے ختم کرنے سے پہلے ریستوران سے باہر نکال لائی اور خاموشی سے اپنے گھر کی جانب چلنے لگی۔

راستے میں بغیر کسی ظاہری وجہ کے اسے تمام وقت اپنا بچپن یاد آتا رہا۔۔۔۔ وہ عجیب حلیے کا آدمی جو سردیوں کی شاموں میں اس کے باپ کے پاس مختلف جانوروں کی کھالیں بیچنے آتا تھا۔۔۔۔ کھالیں، جو اس کے آبائی مکان کی دیواروں سے نصب تھیں۔۔۔۔ جانور، جن کی کھالوں کو دیواروں سے چسپاں ہوئے زمانہ گزر گیا تھا۔۔۔۔ بے شمار بلیاں پالنے والی وہ عورت جس کے سر میں ہمیشہ درد رہتا تھا۔۔۔۔ بڑ کا درخت جس کی شاخیں شام کو چڑیوں سے بھر جاتی تھیں۔۔۔۔ مزارعوں کے بچے جو اکثر بڑوں کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر مرتے تھے۔۔۔۔ سیاہ گھوڑا۔۔۔۔ ان کے اصطبل کا وہ سیاہ گھوڑا بہت عجیب تھا۔ اگر دوڑ پڑتا تو دوسرے گھوڑے اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی وہ پہلا ہی قدم اٹھانے سے انکار کر دیتا تھا، اور جب وہ ایک بار چل جاتا تو اسے اپنی جگہ سے ہلانا ناممکن تھا۔ ایک بار اس کا باپ تحصیل دار کو متنازعہ علاقہ دکھانے اسی گھوڑے پر روانہ ہوا تو اس نے معزز مہمان کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے زمین پکڑ لی۔ اس روز کالو کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا وہ گاؤں والوں کی یادداشت سے کبھی محو نہیں ہو سکتا تھا۔ آدھی رات کے وقت جب کالو نے آخری سانس لی تو وہ اس کے قریب کھڑی تھی۔

اس رات کا خیال آتے ہی اسے ایک مرتبہ پھر وہ گنگناہٹ بلند ہوتی محسوس ہوئی جو چند دنوں سے زمین اور آسمان کے درمیان گونجتی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر اپنی سوچوں کا سلسلہ منقطع کیا اور گھوم کر اس شخص کی جانب دیکھا جو کالو کے برعکس ایک بار رواں ہونے کے بعد رکنا نہیں جانتا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے مثالی کو ایک تاریک جگہ پر بٹھایا اور اسے ہدایت کی کہ جب تک اشارہ نہ کیا جائے وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔

"خوش حالی اور فراغت کی زندگی سے تخلیقی عمل فروغ پاتا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد مثالی نے سوچا۔ "۔۔۔۔ اور خوش نصیبی صرف ایک بار دروازے پر دستک دیتی ہے۔"

انتظار کے دوران اسے اپنے سوچے ہوئے موضوعات یاد آئے جن پر معاشی مصروفیات کے باعث وہ اب تک کہانیاں تحریر نہیں کر سکا تھا۔۔۔۔ جنگ جو قبیلے کے اس بہادر سردار کی کہانی جس کے گھر زمانہ صفات رکھنے والا بیٹا جنم لیتا ہے۔۔۔۔ پاگل ماں کے ہاتھوں پرورش پانے والے ہوش مند بچے کی کہانی۔۔۔۔ اس درویش کی کہانی جو ایسی جگہ قیام کرنا چاہتا تھا جہاں دو بادشاہوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ مثالی اس طرح کے چند موضوعات پر کہانیاں لکھنا چاہتا تھا اور محسوس کرتا تھا کہ اس راہ میں درپیش دشواریاں؛ جسمانی آسودگی ہی سے دور کی جا سکتی ہیں، اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ زندگی میں ایک بڑا عمل، ہمیشہ کی بے عملی کا جواز فراہم کر دیتا ہے۔

مثالی نے تاریکی میں بیٹھے بیٹھے تمام امکانات کا جائزہ لیا۔۔۔۔ پریشان خیالی سے یکسوئی اور تہی دستی سے ملکیت تک ایک جست کا مسئلہ تھا۔ اور اس جست کے لیے وہ زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جس لمحے مثالی کے سر سے کوئی سخت چیز ٹکرائی تو اسے خیال آیا کہ نیچی چھت والے کمرے میں اسے پاؤں کے بل کھڑے ہونے کی غلطی

(آگے ص ۱۶ پر)

خالد سہیل

جزیرہ

کیا تمھارے والدین زندہ ہیں؟
ہاں۔
آخری دفعہ ان سے کب ملے تھے؟
دس سال پہلے۔
تمھارے بھائی بہن ہیں؟
ہاں۔
ان سے آخری بار کب ملاقات ہوئی تھی؟
سات برس پیشتر۔
کہاں ملے تھے؟
راستے میں ملاقات ہو گئی تھی۔
کیا تمھارے دوست ہیں؟
کوئی نہیں۔
کیا تمھارا گھر ہے؟
نہیں۔
کہاں رہتے ہو؟
جہاں رات ٹھہر جائے۔
تمھاری آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟
کوئی نہیں۔
تو تم زندہ کیسے ہو؟
بس زندہ ہوں۔
تم کب سے اس طرح زندگی گزار رہے ہو؟
تقریباً بارہ برس سے۔
تم زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو؟
کچھ بھی نہیں۔
تمھاری زندگی کا مقصد کیا ہے؟
پتہ نہیں۔
کیا تمھارے لیے ویلفیر کا انتظام کروں؟
اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

رہائش کا انتظام؟
اس کی بھی حاجت نہیں۔
تمھیں کھانے پینے کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہوگی؟
نہیں۔
کیا ہم کسی طریقے سے تمھاری مدد کر سکتے ہیں؟
نہیں بہت بہت شکریہ۔
میری سوشل ورکر کے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔

اس شخص کو پولس ہسپتال لے آئی تھی تاکہ اسے داخل کر لیا جائے کیوں کہ وہ بہت ناتوان اور کمزور تھا۔ گلیوں بازاروں میں سوتا۔ بھوکا پیاسا رہتا تھا۔ چوں کہ سردی کا موسم آ گیا تھا اس لیے پولس پریشان تھی کہ کہیں وہ سردی سے اکڑ کر مر نہ جائے۔

"ڈاکٹر صاحب اسے داخل کر لیں تاکہ اس کی صحت بہتر ہو سکے۔" پولس مین نے مشورہ دیا۔
"کیا تم ہسپتال میں داخل ہونا چاہتے ہو؟"
"نہیں میں بیمار نہیں ہوں۔"
میں ڈاکٹر ہو کر بھی بے بسی کے دریا میں ڈوب گیا۔
میری سوشل ورکر نے اس کے والدین کو اطلاع دی اور وہ اسے گھر لے گئے۔
دو دن کے بعد پولیس اسے دوبارہ لے آئی۔
مسئلہ پھر وہی تھا۔
اس دفعہ سوشل ورکر نے اسے اس کی بہن کے پاس بھیج دیا۔
یہ حل بھی ایک ہفتے سے زیادہ کام نہ آسکا۔

پولس کا اصرار تھا کہ اس شخص کا ذہنی توازن درست نہیں اس لیے اسے چند مہینوں کے لیے پاگل خانے میں داخل کرنا چاہیے لیکن متفق نہیں تھا۔

میرے نزدیک مسئلہ اس کا نہیں تھا پولس کا تھا جو شہر میں ایک ایسے شخص کو برداشت نہ کر سکتی تھی جو روایتی انداز سے زندگی ارنا نہ چاہتا تھا۔

اس دفعہ سوشل ورکر نے اسے ایک بورڈنگ ہوم میں بھیجا۔ پولس نے اسے تنبیہہ کی کہ اگلی دفعہ اگر وہ شہر کی گلیوں میں سوتا ہوا گیا تو اسے جیل میں بند کر دیا جائے گا۔ وہ بے اعتنائی سے مسکرا دیا۔

ایک باپ بیٹا صبح کی سیر کرنے شہر کے باہر گئے تو بچے کو تالاب میں کچھ تیرتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اپنے باپ کو بتایا تو اندازہ ہوا کہ وہ ں تھی۔ ایمبولنس اس لاش کو لے کر آئی۔ میں لاش کو دیکھ رہا تھا اور پاس ہی وہ بچہ کبھی مجھے اور کبھی اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں ں حیرانی کے دیے ٹمٹما رہے تھے۔

"ابو"
"جی بیٹا"
"ابو میرے ٹیچر نے بتایا کہ جس چیز کے چاروں طرف پانی ہو اور زمین سے تعلق نہ ہو وہ جزیرہ ہوتا ہے۔"
"ہاں بیٹا"
تو یہ آدمی ایک جزیرہ تھا۔"
وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے بیٹے کو آغوش میں اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔

★ ★ ★

گیان پرکاش وویک

ہندی سے ترجمہ: قاسم ندیم

تصویریں

رمن اور میں۔ دونوں چپ۔ ہم دونوں میز کے آمنے سامنے ہیں لیکن لگتا ہے، ہمارے بیچ لفظوں کی لمبی دوری ہے۔ مکالمے کے تمام قافلے کہیں کوچ کر گئے ہیں۔ رمن جیسے دُکھ اور طیفے باز کے چہرے پر اداسی کی جھلک۔

بیچ بیچ سناٹا ہے، ہم دونوں کے درمیان۔ سناٹے میں شور۔ شور جیسے کوئی رو رہا ہو۔ شور جیسے دبے پاؤں لاکھوں آنسو زمین پر چل رہے ہوں۔ شور جس میں ماتم کی اندھی ہوائیں ہوں۔ شور جیسے بہت سارے قہقہے رو رہے ہوں۔

رمن ویڈیو فلم تیار کرکے لے آیا ہے۔ وی سی آر بھی ساتھ لایا ہے۔ وہ میرے ٹی وی پر اس فلم کو دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ پھر خاموشی کے کالے سمندر میں اتر جاتے ہیں۔ پتہ نہیں، وہ دل کی حالت کیسی تھی کہ ہم دوڑ پڑے تھے فساد زدہ علاقوں میں۔ فلم شوٹ کرنے۔

مجھے تو کیمرہ وغیرہ چلانا نہیں آتا۔ میں نے تو اپنی پوری زندگی میں کل جمع بیس پچیس فوٹو کھینچے ہیں، جن میں سے زیادہ تر خراب تھے لیکن رمن کی بات اور ہے۔ وہ کیمرے کا فن کار ہے۔ تین سال پردیس میں کام کا تجربہ ہے۔

رمن نے مجھے تیار کیا تھا۔ میں نے تھوڑا جھجکتے ہوئے کہا۔ "ہم مر بھی سکتے ہیں۔" اس نے فوراً بات رد کرتے ہوئے جواب دیا۔ "جو مر رہے ہیں وہ کیا شوق سے مر رہے ہوں گے؟" رمن مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کئی سوال تیر رہے تھے۔ وہ بے چین بھی تھا۔ دراصل وہ صرف فلم نہیں اتارنا چاہتا تھا، متاثرہ لوگوں سے بات چیت بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جب یہ بات بتائی تو مجھے اچھا لگا۔

ہم جب ٹکٹ لینے ٹکٹ کھڑکی پر پہنچے، بکنگ کلرک ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ اپنے جذبات روک نہیں پایا تھا۔ بول ہی اٹھا "لگتا ہے آپ کو آگ میں کودنے کا شوق ہے۔"

"بے شک ہے"، رمن نے سنجیدگی سے کہا۔ کچھ پل چپ رہنے کے بعد بولا۔ "ہم اپنی وصیتیں لکھ آئے ہیں۔"

"کیا؟"

"ہمارے حصے کا فساد کسی کو نہ ملے لیکن ہمارے حصے کا امن سبھی کو ملے۔"

ریزرویشن کی ہمیں ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ٹرین خالی تھی۔ دراصل لوگ جا نہیں رہے تھے، صرف آرہے تھے۔ جب ہم وادر اترے۔ سیکڑوں لوگ۔ حواس تھے۔ پریشان، شکستہ، ٹوٹے ہوئے، پیروں میں ٹوٹی چپلیں تھیں، پامری ہوئی امیدیں۔ یہ سفر کہاں تھا؟ ایک سراب تھا۔ سوشن رسن کے جزیرے تھے۔

میں نے ایک سے پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

* * *

"کہاں جاؤں؟" اس نے جواب کے بدلے سوال کا تھپڑ میرے منھ پر مارا۔ میں کانپ گیا۔ وہ پھر بولا جیسے کوئی بڑبڑا کر دروازہ کھولے، ویسے ہی، "میں بیس سال سے یہاں پر ہوں لیکن یہ چار چھ دن سے بھرا شہر مجھے پرایا سمجھتا رہا اور پھر اس شہر نے مجھے ایسے پھینکا جیسے ردی کاغذ کا ٹکڑا۔

رمن اور میں تھوڑا آگے بڑھے۔ ایک بزرگ کے سامنے رمن ٹھٹک کر رکا۔ بزرگوں کی آنکھوں میں مایوسی تھی، لگتا تھا انھیں مسکرائے ہوئے برسوں بیت گئے ہوں۔ رمن نے ان کا فوٹو کھینچنا چاہا تو وہ کراہتے ہوئے بولے، "برخوردار! فوٹو میرا نہیں، میرے بیٹوں کا کھینچ کر آؤ۔ میرے دو بیٹوں کا۔ خورشید اور شنکر ---- نہیں، تم کیا فوٹو کھینچو گے ان کا۔ ان کا فوٹو موت کھینچ رہی ہوگی۔ میں نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے اپنے جوان بیٹوں کا قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے ---- ہاں میں نے ان بجھتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اپنے بیٹوں کو تڑپتے ہوئے۔ وہ دونوں مرگئے۔ خورشید کی بات اتنی سنگین نہیں، صاحب! لیکن شنکر؟ شنکر کو میں نے گود لیا تھا، وہ میری گود سونی کر گیا۔"

"شنکر آپ کا بیٹا؟ لیکن آپ تو مسلمان ----" میں نے لگ بھگ کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا۔

"ہاں، شنکر میرا بیٹا۔ نریندر ناتھ ہمارے پڑوس میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی کو میں بھابھی کہتا تھا۔ افسوس کہ دونوں میاں بیوی بجلی کا کرنٹ لگنے سے مرگئے۔ رہ گیا تھا شنکر! شنکر کو میں لے آیا تھا۔ خدا سے میں نے دعا کی تھی کہ اے خدا مجھے ہمت دینا کہ میں شنکر کو شنکر کی طرح سنبھال سکوں۔ لیکن ---- لیکن"، بزرگ رونے لگے۔

میں نے رمن سے کہا "یہ بزرگ واپس اپنے گاؤں لوٹ رہے ہیں لیکن کتنے خالی ہیں؟ فساد نے بیٹے چھینے۔ مہانگر نے چھین لیا۔ زندگی ان کا سکون چھین لے گی۔"

ہم تھوڑا آگے بڑھے۔ ایک نوجوان ہم سے ٹکرا گیا۔ شاید بہاری تھا۔ بڑے بے بسی سے [illegible] آیا تھا۔ جست کے برتن تھے۔ ایک دری کچھ کپڑے اور ایک ڈبہ! وہ چپ ہوا۔ اس کی آواز لرزنے لگی۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ اپنی قمیض سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔ "آج یہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ وہی ڈبہ ہے، وہی برتن ہیں اور وہی کپڑے ۔۔ جب اس شہر میں آیا تھا، امید زندہ تھی، اب میں زندہ ہوں، لیکن امید مرچکی ہے۔"

ریلوے اسٹیشن سے اناؤنسمنٹ کیا جا رہا تھا، خاص گاڑیوں کے چلنے کا۔ بھیڑ حرکت میں آئی تھی۔ یہ بھیڑ پاگلوں کی بھیڑ نہیں تھی، اداس تھی، بے ضرر، یہ بھیڑ ایک عدد گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ بے گھر تھی۔

آج نئے سال کا تیرھواں دن تھا۔ اب بھی لوگوں کے پاس نیک تمناؤں کے خطوط آرہے تھے لیکن یہ کیسی نیک تمنائیں تھیں کہ گھر چھن جائے۔ چہروں پر جھلستے ہوئے صحرا تھے۔ آنکھوں میں تڑپتے ہوئے بیابان تھے۔

رمن نے باہر آکر مجھ سے پوچھا۔ "کہاں چلیں؟"

"میں نے کہا، دھاراوی یا جوگیشوری؟"

"وہاں کرفیو ہے۔"

"تو؟"

"وہاں چلتے چلتے کرفیو کے پاس بنوائیں گے۔ پاس بن جائیں گے۔ اس کی فکر مت کرو۔ یہاں میرے بہت سارے دوست ہیں۔ کچھ فون کرنے ہوں گے لیکن میں سوچتا ہوں کہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں چلتے چلیں۔"

"یہاں عیاشی کرنے آیا ہے کیا؟"

"تم چلو تو۔"

ہم ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں تھے۔ وہاں فساد کی کوئی تحریر نہیں تھی۔ کوئی چرچا نہیں تھا۔ اداسی کی لکیر تک نہیں تھی کسی کے چہرے پر۔ لگتا تھا، ہم کسی دوسرے شہر میں ہیں یا دوسرے ملک میں۔ یہاں منظر دوسرا تھا۔ ریشمی خاموشی۔ قہقہوں کے گل دستے۔ خوش بوئیں، فائیو اسٹاری موسم۔ امارت کا ایک احساس۔ ایک احساس کہ ہم ہیں۔ ابھی سب سے بڑی خوشی تھی۔ یہاں کوئی اداس نہیں تھا۔ اداس ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہ لوگ ہال میں بند تھے۔ اپنے آپ میں بند تھے۔ انھیں یقیناً خبر تھی کہ شہر کے ایک علاقے میں فساد ہو گیا ہے۔ لیکن یہ لوگ مطمئن تھے۔ کیوں کہ محفوظ تھے۔ لیکن یہ لوگ تب سب سے زیادہ گھبرائے تھے جب آگ کا دھواں ان کی اور آنے لگا تھا۔

رمن اور میں محوِ حیرت تھے۔ یہ لوگ اپنا وقت سیلی بریٹ کر رہے تھے۔ انتظار ایک جشن ہوتا ہے اور ملنا میلے جیسا۔ یہاں میلہ لگا ہوا تھا، غزل تھی۔ یہاں ریشمی اجالا تھا۔ چہل قدمی کرتی خاموشی تھی۔

اس شہر میں دنگا فساد تھا۔ یہ لوگ بے فکر تھے۔ ہم حیرت زدہ تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ رمن یہاں کیوں آیا ہے؟ اس شہر کے فرق کو محسوس کرنے کے لیے۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لیے۔ رمن اور میں ہال کے ایک کونے میں کھڑے تھے۔ ویٹروں نے شروع شروع ہمارے ساتھ بڑی تہذیب سے بات چیت کی۔ بعد میں وہ ہمیں تلخی سے دیکھنے لگے تھے۔ ان کے لیے ہم فالتو تھے۔ ڈسٹ بن میں پھینکے جانے لائق۔

رمن نے اشارہ کیا۔ ہم باہر چلے آئے۔ رمن نے ٹیکسی رکوائی۔ بولا۔ "دھاراوی!" ٹیکسی والا حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ کچھ پل سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے کے بعد بولا۔ "صاحب، مذاق چھوڑیے۔ بتائیے چلنا کہاں ہے۔"

"جوگیشوری!" میں نے کہا۔

ٹیکسی والا اب چڑ گیا تھا۔ تلخ لہجے میں بولا۔ "صاحب مرنے کا شوق ہے، کوئی اور طریقہ ڈھونڈیے۔ چھرے سے مرنا یا آگ میں جھلس کر مرنا بہت برا ہوتا ہے۔"

"سچ سچ؟" رمن نے ٹیکسی والے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں سچ سچ۔"

"لیکن جو وہاں مر رہے ہیں، کیا ان کا مرنا محض ایک خبر ہے؟"

"نہیں خبر نہیں صاحب، فطری بات ہے۔"

ہم ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولے۔ "اگر ہم تمھیں مجبور کریں وہاں چلنے کے لیے تب؟"

"میں تب بھی نہیں چلوں گا۔ کم از کم آج تو بالکل نہیں۔"

"کیوں؟ آج کیوں نہیں؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"وہ ذرا سا ہنسا۔ ہنسی دباتے ہوئے بولا۔ آج میرا جنم دن ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں اپنا جنم دن مناؤں اور تم لوگوں کو موت کے منھ میں دھکیل دوں۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"اسلم۔"

"ہم دونوں ہندو ہیں۔"

"بے شک۔ لیکن ٹیکسی میں بیٹھے ہم تینوں انسان ہیں۔" وہ تپاک سے بولا۔ ہمیں اس کا یہ جملہ اچھا لگا۔ جھلستے شہر میں سائے کی طرح۔ مرہم کے پھاہے کی طرح۔

رمن نے ٹیکسی والے کو اپنے ایک شناسا کا پتہ بتایا۔ ٹیکسی والا خوشی سے بولا۔ ہاں ٹھیک ہے، وہاں سب سیف ہے۔ لیکن یہی حال رہا تو سمندر کے کنارے کھڑا یہ شہر آگ کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔ پورا شہر خدا خیر کرے۔"

ہم اترے۔ کرایہ ادا کیا۔ مڑے۔ اچانک ٹیکسی کے پیچھے لکھے ہوئے جملے پر نظریں اٹک گئیں۔ "فخر سے کہو ہم ہندوستانی ہیں۔"

رمن کے شناسا صحافی تھے اور شاعر بھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ سنجیدگی سے بولے۔ دوستو! میں تمھارا خیر مقدم کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔ یہ شہر دنگوں کی زد میں ہے اور موسم کی آنکھوں میں نمی ہے۔ تعجب ہے ٹی وی روزانہ چار بڑے شہروں کے موسم کا حال بتاتا ہے اور اس بڑے شہر کے موسم کا حال؟ جہاں ہم سب ہیں۔ جہاں دنگے ہیں۔ کاش دوردرشن حال یوں بتاتا کہ اس مہانگر کا آسمان یوں تو صاف رہا لیکن جلتے مکانوں اور مرتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر روتا رہا۔ شہر میں آندھیاں نہیں چلیں لیکن آگ کے شعلے دہکتے رہے۔ دوردرشن یوں بھی بتاتا کہ آج دھوپ اداس رہی۔ ہوائیں نم رہیں اور وہ نمی آنسوؤں کی تھی۔ دوردرشن یہ بھی بتاتا کہ شہر میں سناٹا تھا یا شور شرابا۔

رمن کے دوست کچھ پل خاموش رہے۔ پھر بولے۔ ایک دہکتا ہوا سوال۔ کیا آپ لوگ محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ چار مہانگروں کا تاپ مان کتنا بدل گیا ہے؟ کتنا بدل گیا ہے موسم! موسم صرف باہر نہیں اندر بھی ہوتا ہے۔ ہاں جناب، میں اسی موسم کی بات کر رہا ہوں۔ کیا آپ اپنے اندر پت جھڑ کو محسوس نہیں کر رہے ہیں؟

رمن کے دوست صحافی تھے۔ صحافی حساس ہوتے ہیں، لیکن وہ جذباتی بھی تھے۔ کیوں کہ شاعر بھی تھے۔ وہ اکیلے رہتے تھے۔ اکیلا پن انھیں شاید اتنا خوف زدہ نہیں کرتا تھا جتنا دنگے کی خبر! وہ کچھ پل چپ رہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ رمن جیسا انسان بھی خاموش تھا۔ میں بھی چپ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ بولیں۔ وہ بولتے تو لگتا تھا کہ زخمی الفاظ ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔

وہ کچھ دیر تک چپ رہے۔ کھڑے ہوئے۔ کھڑکی کے پاس جاکر بھیگی ہوئی آواز میں گنگنانے لگے:

آگ دنگے کی لگائی تو ہے آسان مگر — خون کے اشک گراؤگے بجھانے کے لیے

اور شہر سچ مچ خون کے آنسو رو رہا تھا۔ انھوں نے آواز بدل کر ہماری طرف منھ کر کے کہا۔

"کیا پورا شہر؟" رمن نے پوچھا۔

رمن کے سوال پر وہ چونک اٹھے۔ بولے "میں تمھاری بات سمجھ رہا ہوں۔ شہر کا ایک حصہ جل رہا ہے۔ باقی حصہ اس جلتے ہوئے حصے

کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ انھوں نے رومال نکالا۔ اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو صاف کیا پھر بولے۔ پرکاش مارا گیا۔ مصور تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے اپنی چال میں لے گیا تھا۔ تصویر بنا رہا تھا۔ ایبسٹریکٹ پینٹنگ تھی۔ اس نے سوال کیا۔ بتا سکتے ہو اس پینٹنگ کا کیا سبجیکٹ ہے؟ "فسادہ" میں نے کہا۔ "ہاں" بالکل وہی۔ وہ فوراً بولا۔ اس کی آواز میں چمک تھی۔ پرکاش مارا گیا اور صغیر اسپتال میں پڑا ہے۔ شدید زخمی ہے۔ پرکاش اور صغیر ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ غضب کی ہم مزاجی تھی۔ بے پناہ خلوص تھا۔ پرکاش پرارتھنا کرتا تو صغیر اپنا ٹوان دن بند کر دیتا۔ صغیر نماز ادا کرتا تو پرکاش چپ چاپ بیٹھ جاتا۔ ان کے ایک ہی کمرے میں مندر تھا اور مسجد بھی۔ جب صغیر ٹھیک ہو کر اپنے کمرے میں پہنچے گا تو کتنا اکیلا ہوگا۔ تن تنہا اداس، مایوس۔ اس کا پرکاش کوچ کر چکا ہے۔

وہ کچھ پل خاموش رہے۔ جیسے لفظ مر گئے ہوں۔ جیسے درد ناک یادوں کی ارتھیاں ان کے کندھوں پر ہوں۔ جیسے پرکاش کے مر جانے پر وہ دکھی ہوں، جیسے صغیر کے گھائل ہونے پر فکر مند۔

ہم ایک ماحول پیدا کریں۔ پھر اس سے بچنا چاہیں۔ نہیں یہ ممکن نہیں۔ دوسروں کو غیر محفوظ کر کے خود کسی محفوظ خول میں اتر جانا سیڈیزم ہے۔ دیکھنا ہماری موت کا گواہ وہ منظر ہوگا جو ہم نے پیدا کیا ہے۔

"ان دنگوں کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ چلا کر بولے۔ "ہاتھ! کیا یہ مذاق نہیں ہے کہ ہم سب دنگے کے پیچھے کوئی نہ کوئی ہاتھ تلاش کر رہے ہیں اور اپنے ہاتھ جیب میں ڈال کر کھڑے ہیں۔"

ہم ایک دن ان کے گھر رہے۔ ہم نے باہر جانے کے لیے کہا تو انھوں نے روک دیا۔ "آج نہیں۔ کل دیکھنا۔ اگر حالات سازگار ہوئے تو۔"

"لیکن، ہم ایسے حالات کا جائزہ لینے آئے ہیں۔" رمن نے کہا۔

"جائزہ! ایسے کہہ رہے ہو جیسے کسی دفتر میں آڈٹ کرنے جانا ہو۔ پھر بھی میں تمھیں نہیں روکوں گا۔ کل چلے جانا۔"

اگلے دن سچ مچ ہمیں معلوم ہوا تھا، زندگی اور موت کے بیچ جو فاصلہ ہوتا ہے وہ مٹ چکا ہے۔ ہم نے دیکھا تھا اپنی ننگی آنکھوں سے۔ آدمی کے پیچھے جب موت بھاگتی ہے تو وہ کیسے بدحواس ہو کر دوڑتا ہے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔

اچانک ہمیں لگا، بہت سارے قدموں کی آوازیں ہماری اور آ رہی ہیں۔ تب ہاں تب ہمارے چہروں پر جو خوف طاری ہوا تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ اب تک ہم دوسروں کے چہروں کا جغرافیہ پڑھتے آئے تھے، لیکن اب ۔ ۔ ۔ ۔

ہم بے تحاشا بھاگتے رہے اور ایک عمارت میں گھس گئے تھے۔ سیڑھیاں چڑھتے گئے۔ ہم اتنی ساری سیڑھیاں چڑھ گئے تھے کہ شاید زمین سے زیادہ نزدیک آسمان نظر آتا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک ہم ایک دوسرے سے بول نہیں پائے تھے۔ رمن ہکلاتے ہوئے بولا۔ "پیچھے تم نے کچھ دیکھا؟"

"نہیں۔ کیوں کیا تھا؟"

"بچے کی لاش! اف کیسی ہوئی۔" رمن رک رک کر بولا۔ "کیا تم بے وجہ کسی بچے کو تھپڑ مار سکتے ہو۔؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں رمن کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ رمن کو میں نے روتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ رمن جیسے قہقہہ باز کا اس طرح سسکیاں لینا مجھے خوف زدہ کر تا تھا۔

ہمارے پاس وہ چھت تھی جہاں ہم اکڑوں بیٹھ سکتے تھے۔ اکڑوں چل سکتے تھے۔ ہمیں بھوک لگی تھی۔ ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سوائے بسکٹ کے تین ٹکڑوں کے۔ ہم وہ بسکٹ زیادہ دیر تک محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ طے تھا کہ اگلے دو تین دنوں تک ہمیں کھانے کے لیے کچھ نہیں ملنے والا ہے۔ ہم دونوں بسکٹ کا ایک ٹکڑا کھا گئے۔ ہمیں بے حد افسوس ہوا تھا کہ ہم کچھ زیادہ ہی کھا گئے ہیں۔ اب ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ فساد زدہ علاقے میں رہ کر حالات کو سمجھنا بڑی بات ہے مگر بند کمروں میں بیٹھ کر اس موضوع پر بولنا کتنا بے معنی ہے۔ ہم حالات کا حصہ بن گئے تھے۔ ڈرے سہمے، بھوکے، پیاسے، گھبرائے، بے چین۔ ایسا لگتا تھا ہم کسی بیاباں میں بھٹک گئے ہیں۔ ہم کسی جنگل میں آگئے ہیں۔ جہاں تین طرف آگ ہے اور چوتھی طرف سمندر۔

پورا دن ہم نے چھت پر گزار دیا۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ صاف صاف کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ رمن کیمرے پر آٹھ ایم ایم کا لینس لگا کر فلم اتار رہا تھا۔ اچانک اس نے کچھ مناظر فوکس کیے۔ گھبرا کر بولا۔ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس نے کیمرہ میرے حوالے کیا۔ میں دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ کیمرے کی آنکھ جس منظر کو پکڑ رہی تھی وہ کوئی وحشت تھی۔ کچھ لوگ تھے، آٹھ یا دس۔ آٹھ دس لوگوں کی بھیڑ میں ایک نوجوان تھا۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔ بھیڑ اسے ننگا کر رہی تھی۔ وہ انکار کر رہا تھا۔ لیکن بھیڑ اسے برہنہ کر چکی تھی اور پھر۔ ہاں میں نے اس بیچ اپنی لڑکھڑاتی سانس کو سنبھالا تھا۔ بھیڑ میں سے کسی نے بڑا سا پتھر اٹھایا۔ نوجوان شاید چیخا تھا۔ نہیں۔۔۔۔ اکیلی سڑک پر اکیلا وہ تڑپ رہا تھا۔ موت سے لڑ رہا تھا۔ سڑک پر چھوٹا سا خون کا تالاب بن گیا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا شاید اس کی زندگی کا یہ آخری مورچہ تھا۔ لیکن اس کی موت سے پہلے ہم مر گئے تھے۔ رمن اور میں۔ ہم جسمانی طور سے زندہ تھے مگر اندر سے مر گئے تھے۔ گھائل، ٹوٹے پھوٹے، غم زدہ۔ گھر میں اس نوجوان کے کبھی منتظر ہوں گے۔ لیکن کتنا لمبا ہوگا وہ انتظار۔ کبھی نہ ختم ہونے والا۔

رمن کراہ کر بولا۔ "دنگے کیوں ہوتے ہیں؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دنگے کبھی نہ ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ سامنے ہماری چھت سے کافی دور آگ کے شعلے اٹھنے لگے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ صرف دیکھ سکتے تھے۔ دنگے کی عبارت کتنی منحوس تھی۔ رمن کیمرہ پیک کرتے ہوئے بولا، چل چلتے ہیں، کب تک چھپے رہیں گے؟"

"رمن! وہاں چلنے کو بے شک چل لیکن جن کا سب کچھ لٹ گیا انھیں تیری کھوکھلی ہمدردی سہارا نہیں دے پائے گی۔"

پھر بھی ہم دونوں نیچے اتر آئے۔ اب ہم ڈرے ہوئے نہیں تھے۔ ہم غصے میں تھے۔ بے شک کوئی آئے، ہمیں مار ڈالے۔ جو مر رہے ہیں، وہ کیا صرف دنگوں میں مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں؟"

کچھ دیر پہلے ہم نے جہاں جھونپڑیاں دیکھی تھیں۔ اب جھونپڑیوں کی راکھ تھی، چلتے چلتے ہم اچانک ٹھٹھکے۔ دو بچے ان جلی ہوئی جھونپڑیوں میں بھٹک رہے تھے۔ میں نے بچوں کو پکارا۔ وہ رونے لگے۔ ایک بولا "بھوک لگی ہے۔"

رمن نے بیگ کھولا۔ بسکٹ کے دونوں ٹکڑے انھیں دے دیے۔ میں سوچنے لگا۔ یہ دو ٹکڑے ان کی بھوک سے کب تک لڑائی لڑ سکیں گے؟

رمن نے انھیں دلارتے ہوئے پوچھا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم گھر ڈھونڈھ رہے ہیں۔"

"گھر!" ہم دونوں چونک اٹھے۔

"ہاں! اپنا گھر۔"

ہم بچوں کو کس طرح بتاتے کہ اب تمہارا مقدر گھر نہیں بلکہ راکھ کا ڈھیر ہے۔ ہم انھیں گھر نہیں دے سکتے تھے۔ یہ بچے اب زندگی بھر اپنا گھر ڈھونڈتے رہیں گے۔

"رمن! یہاں سے چل یار۔"

"کیوں؟ کوفت ہو رہی ہے۔"

"نہیں، میں سوچ رہا تھا، زندگی کی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ وہ کہاں گئی؟ سیاہ جھونپڑیاں، دھواں، سڑاند، روتے بلبلاتے ہوئے لوگ۔ "یہ زندگی کا منظر ہے یا موت کا؟" ہم وہاں سے چل پڑے۔ چلتے رہے ----

رمن ایک ڈپارٹمینٹل اسٹور میں داخل ہوا۔ وہ شاید اس جوان اور دوشیزہ کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا جو ابھی ابھی کار سے اتر کر اسی اسٹور میں آئے تھے۔ رمن ان دونوں کے بالکل پاس جاکر بولا۔ "ویری فوٹو جینک"

"تھینکس۔" "کیا میں آپ کی ایک تصویر لے سکتا ہوں۔"

شیور، شیور ---- جوان چہک کر بولا۔ رمن کی شرارت میں سمجھ گیا تھا۔ فوٹو کھینچتے کھینچتے اس نے نوجوان سے سوال پوچھ لیا۔ آپ کچھ کچھ ٹینشن میں نظر آتے ہیں؟"

"لاٹ آف ٹینشن۔" دوشیزہ بولی۔

"کیا رائیٹ کی وجہ سے ٹینشن میں ہیں؟"

اوہ نو، لیو اٹ یار، آئی ڈونٹ مائنڈ۔ وھاٹ یو سے۔ فساد۔ رائیٹ۔ اکسٹرا۔ پرابلم اس بات کا ہے ینگ مین، میں نے جو سوٹ سلوایا ہے اس کے لیے سوٹیبل ٹائی نہیں مل رہی ہے۔

اوہ بھگوان! میں نے گہری سانس لی۔ کیا شہر ہے یہ؟ کسی کو گھر اجڑنے کا دکھ تو کسی کو میچنگ ٹائی نہ ملنے کا دکھ۔ رمن نے بسکٹ کے چار پیکٹ لیے۔ میں سمجھ گیا، وہ پھر کسی جھلستی بستی میں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔

ہمیں اس بستی کا نام معلوم نہیں تھا۔ بستی کا مطلب تو یہ ہوتا ہے نا جہاں لوگ بستے ہوں۔ یہاں سے لوگ اجڑ رہے تھے۔ ایک نکڑ پہ کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ ان سے ہٹ کر ایک کھڑا تھا۔ سنجیدہ۔ غمگین۔ اس نے ہمیں روکا۔ یہیں سے لوٹ جاؤ۔ آگے جانے کا مطلب ہے زندگی کی سرحد کے اس پار چلے جانا۔

"کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ ایک سپاہی ہمیں ڈرا رہا ہے؟" رمن نے بے رخی سے کہا۔

"میں تمھیں خوف زدہ نہیں کر رہا ہوں۔ شوق سے جاؤ لیکن تمھیں اس لیے روک رہا ہوں کہ تم میرے بیٹے جیسے ہو۔ میرا بیٹا دسمبر کے

فساد میں مارا گیا تھا۔"

کیا؟ رمن اور میں چونک اٹھے۔

اس کے بعد ہم دونوں دو دنوں تک بھٹکتے ہوئے لوگوں میں بھٹکتے رہے۔ ہم جب لوٹ رہے تھے تو ہمارا دماغ، ہمارا دل بھٹک رہا تھا۔ ہم کچھ کچھ بات کرتے، پھر چپ ہو جاتے۔ ہم خوف زدہ نہیں تھے۔ لیکن کتنے بدحواس، دکھی، پریشان تھے جیسے مدتوں سے بیمار ہوں۔ فساد وبائی مرض ہی تو ہے۔

واپس آنے کے بعد تین دنوں تک ہم ملے نہیں تھے۔ ہم اس قدر ٹوٹ چکے تھے کہ فساد کی بات تک نہیں کرنا چاہتے تھے۔

آج رمن وی سی آر لے آیا ہے، لیکن ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ اسے چلائیں۔ میں چپ ہوں وہ بھی چپ ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دل کی بات جانتے ہیں۔

آخر رمن بول اٹھتا ہے، یار، یہ کوئی پریم کہانی نہیں ہے کہ ہم اسے دیکھیں۔ فساد کو ہم دیکھ آئے ہیں۔ جھیل آئے ہیں۔ ویڈیو پر دیکھنا کچھ عجب لگے گا ہے نا؟"

"سنسنی خیز!" میں نے کہا۔

رمن اٹھا۔ وی سی آر سے کیسٹ نکال کر اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ مجھے لگا وہ فساد کا چہرہ توڑ رہا ہے۔ بے حد مکروہ و بھیانک چہرہ۔

(سلسلہ ص ۵۶)

پرکھوں کی روایات کے امین بھی ہیں اور محافظ بھی، انھوں نے اپنے جد امجد کے دور کے بیش تر مخطوطات، منقولات، معقولات اور مطبوعات کی جی جان سے حفاظت کی ہے، جن کے کچھ عکس اور تراشے اس کتاب میں شامل ہیں۔ "قومی اتحاد اور یگانگت کے گذشتہ ماحول اور معاشرے کو روشن کرنے والی یہ کتاب عہد حاضر کے لیے سرمایہ، بصارت و بصیرت کا مقام رکھتی ہے۔

پروفیسر جعفر نظام نے اس کتاب کا پیش لفظ تحریر کیا ہے اور بنسی راجہ کی سہ لسانی شاعری اور ان کے سفر ناموں کو خراج عقیدت ادا کیا ہے۔ کتاب عمدہ کاغذ پر کمپیوٹرائزڈ کتابت اور آفسیٹ طباعت سے آراستہ ہے۔ اشاعت مئی ۱۹۹۵ء۔ صفحات ۱۱۲۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد۔ قیمت سو روپے

○ ○ ○

اعتذار: سب رس اگست ۱۹۹۶ء کے شمارے میں ڈاکٹر رفعت النسا کے تبصرے شائع ہوئے تھے۔ ان کا نام ڈاکٹر رفعت النسا کے بجائے غلطی سے ڈاکٹر رفعت سلطانہ چھپ گیا۔ قارئین صحت فرمالیں۔ ڈاکٹر رفعت النسا یونیورسٹی آف میسور میں اردو کی لکچرر ہیں۔

(ادارہ)

نقد و نظر

[تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجی جائیں۔ تبصرہ نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

پہاڑ پر آگ (ناول) مصنف: انیتا دیسائی مترجم: م۔م۔ راجندر تبصرہ نگار: ڈاکٹر بیگ احساس

انیتا دیسائی انگریزی میں لکھنے والے ہندستانی مصنفین کا ایک روشن نام ہے۔ نو ناولوں اور چار افسانوی مجموعوں نے انھیں شہرت کی بلندی پر پہنچادیا ہے۔ انیتا کی تحریر میں بنگالی اور جرمن زبانوں کا حسین امتزاج ملتا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان کے والد ڈی۔ این مجدار بنگالی بزنس مین تھے اور ماں ٹونی نائم جرمن تھیں۔ انیتا نے ان کے والدین کے ہندستان لوٹنے کے بعد انگریزی سیکھی اور ۱۹۵۷ء میں مرانڈا ہاؤس سے انگریزی میں گریجویشن کیا۔ ناول لکھنے سے قبل انیتا دیسائی نے ایک فری لانس تبصرہ نگار کی حیثیت سے کتابوں پر بے شمار تبصرے لکھے ساتھ ہی وہ افسانے اور مضامین بھی لکھتی رہیں۔ ان کی پہلی کہانی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی جب وہ صرف نو برس کی تھیں۔

انعامات پانے کے سلسلے میں بھی انیتا خوش قسمت ہیں۔ زیرِ نظر ناول Fire on the Mountain پہاڑ پر آگ کو رائل سوسائٹی آف لٹریچر کا ونسفریڈ ہالٹ بائی ایوارڈ ۱۹۷۸ء میں ملا۔ اس کے علاوہ فیڈریشن آف انڈین پبلشرز ایوارڈ اور ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ان کے دو اور ناولوں Clear Light of the Day اور Custody کو ۱۹۸۳ء میں بکر پرائز کے لیے نامزد کیا گیا۔ بچوں کے لیے لکھی گئی تصنیف Village by the Sea کو گارجین پرائز مل چکا ہے۔ ایک اور ناول Baumgartner,s Bombay کو نیویارک میگزین ہداسا Hadassa کی جانب سے ۱۹۸۹ء میں انعام دیا گیا۔۔۔ بالی وڈ کے مشہور پروڈیوسر اسماعیل مرچنٹ نے ان کے ناول Custody پر مبنی ایک فلم "محافظ" بنائی۔ Fire on the mountain کا اردو ترجمہ مشہور اردو افسانہ نگار اور انگریزی کے صحافی م۔م۔ راجندر نے کیا ہے۔

اس ناول کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ: نندہ کول کارگ نانو میں دوسرا حصہ: راکا کی کارگ نانو میں آمد۔ تیسرا حصہ: الاداس کارگ نانو سے رخصت ہوتی ہے۔ یہی تین عنوانات اس ناول کی کہانی ہے۔ جو انھیں تین کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ پہلے حصے میں نندہ کول کے کردار کا تعارف اور راکا کی آمد کی اطلاع ہے۔ دوسرے حصے میں راکا کی آمد اور دونوں کرداروں کی کشمکش ہے۔ تیسرے حصے میں الاداس کارگ نانو آتی ہے۔ اور اس کا حسرتناک انجام ہوتا ہے۔

نندہ کول سابق وائس چانسلر کی بیوہ ہے۔ وہ مردم بیزار ہے اور سب سے الگ تھلگ شملہ کی ایک پہاڑی کسولی پر رہتی ہے۔ اسے اپنی زندگی میں کسی کی مداخلت پسند نہیں حتیٰ کہ وہ اپنے بچوں کے خطوط سے بھی خوف زدہ رہتی ہے۔ نندہ کول کے پاس ڈاکیہ اس کی بیٹی آشا کا خط لاتا ہے۔ جس میں آشا لکھتی ہے کہ وہ اپنی بیٹی تارا کو داماد راکیش کے ساتھ بھیج رہی ہے۔ تارا اور راکیش کی بیٹی راکا ٹائیفائڈ کا شکار ہوکر کمزور ہوگئی ہے۔ وہ اسے اس کے ماں باپ کے ساتھ نہیں بھیج سکتی۔ اس لیے راکا کو اس کے پاس بھیج رہی ہے۔ نندہ کول اس کرب میں مبتلا ہوجاتی ہے کہ اس کی تنہائی ختم ہوجائے گی۔ وہ راکا کو ایک زبردستی گھس آنے والی اجنبی لڑکی سمجھتی ہے ایک ایسا مچھر جو میدان سے اڑکر اسے

ستانے اور پریشان کرنے آگیا۔

راکا بھی سب بچوں سے مختلف الگ تھلگ رہنے والی لڑکی ہے۔ اسے اپنی پرنانی سے زیادہ مناظرِ فطرت سے دل چسپی ہے۔۔۔۔ وہ دونوں اپنے اپنے ایسے طریقے اختیار کر لیتے ہیں جن میں وہ اکٹھا بھی رہ سکیں اور ہر ایک کو یہ احساس بھی ہو کہ وہ دوسری سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔۔۔۔ لیکن یہ بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ راکا تو اپنی پرنانی کو بڑی حد تک نظر انداز کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے لیکن نندہ کول ایسا نہیں کر سکتی۔۔۔۔ راکا اس کے سوئے ہوئے ماضی کو جگا دیتی ہے۔ پرانی یادوں کی یلغار اسے راکا سے گفتگو کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ پھر ان کرداروں کے درمیان الاداس جو نندہ کول کی بچپن کی سہیلی ہے آتی ہے تو اس کی آمد نندہ کول کے زخموں کو ہرا کر دیتی ہے۔۔۔۔ بھدی اور کرخت آواز والی الاداس نے زندگی کو کس طرح جھیلا، کیا کیا مصیبتیں اٹھا کر وہ لیکچرر بنی اور پھر اس کے بعد ویلفیئر آفیسر بن جاتی ہے۔ سب کچھ نندہ کول سے کہہ کر یادیں تازہ کرتی ہے۔ الاداس نندہ کول سے مل کر رخصت ہوئی۔ پھر وہ جس گاؤں میں سوشل ورک کرتی ہے وہاں ایک شادی کو رکوا تھا جس میں لڑکی صرف سات برس کی اور مرد ادھیڑ عمر کا ہوتا ہے۔ اس ان پڑھ لڑکی کا باپ الاداس کا دشمن ہو گیا اور جب وہ کارگ نانو سے واپس ہو رہی تھی تو لڑکی کا باپ موقع پا کر اس پر حملہ آور ہوا، اسے اپنی ہوس کا شکار بنایا، پھر گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ جب فون پر نندہ کول کو اس سانحے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ اس صدمے کی تاب نہ لا کر مر جاتی ہے۔

اس چھوٹی سی کہانی بلکہ دو چھوٹی کہانیوں کو کرداروں کے محسوسات، ان کی ذہنی کش مکش اور ماحول کی عکاسی منفرد بناتی ہے۔ یہ تینوں کردار حقیقی دنیا کے ہوتے ہوئے بھی الگ تھلگ پر اسرار اور کسی اور دنیا کے لگتے ہیں۔ نندہ کول تو تنہا ہے ہی۔۔۔۔ لیکن راکا کو پہاڑ پر رہنے والی اپنی نانی کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ سے زیادہ جنگل کی آگ سے دل چسپی ہے۔۔۔۔ الاداس کا اصل کہانی سے کوئی تعلق نہیں اس کی اپنی کہانی ہے لیکن الاداس نندہ کول کی واحد سہیلی ہے جس نے ساری زندگی نندہ کول سے ربط قائم رکھا۔ جو نندہ کول کو سمجھتی ہے۔۔۔۔ الاداس کی موت کی اطلاع کے بعد نندہ کول کا محسوس کرنا کہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ اس کا حال اس کا ماضی۔۔۔۔ الاداس کا مرنا۔۔۔۔ کہانی کے تاثر میں بے پناہ اضافہ کرتا ہے۔۔۔۔ اور اختتام پر راکا کا کہنا کہ "دیکھو نانی میں نے جنگل میں آگ لگا دی۔۔۔۔ دیکھو جنگل جل رہا ہے۔۔۔۔" نندہ کول یہ سننے کے لیے زندہ نہیں رہتی کیوں کہ الاداس کی موت اس کے اندر ایسی آگ لگا چکی ہے جس میں جھلس کر وہ کبھی کے ختم ہو گئی ہے۔

تینوں کردار رفتہ رفتہ قاری کے وجود میں اترتے ہیں۔۔۔۔ آہستہ آہستہ ان کی گرہیں کھلتی ہیں۔ یہ سب محبت کے بھوکے کردار ہیں۔۔۔۔ لیکن ایک دوسرے کا درد محسوس کرتے ہیں۔

انیتا دیسائی کی پہچان یہی ہے کہ انھیں ماحول کی ہو بہو تصویر اتارنے میں ملکہ حاصل ہے۔ جزویات نگاری کی وہ ماہر ہیں۔ جزویات نگاری سے وہ کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرتی ہیں اور ان کی تخلیق کردہ پوری دنیا سانس لینے لگتی ہے۔ صرف تین چار انسانی کردار ہی نہیں درخت، پرندے، گھاس، چشمے، دریا حواس خمسہ کو بیدار کرتے ہیں۔ جنگل کی خاموشی ہو کہ آگ۔۔۔۔ انیتا انھیں پورے وجود کے ساتھ محسوس کرواتی ہیں۔۔۔۔ یہی ان کا فن ہے۔

انیتا بڑے خوب صورت پیکر بناتی ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی صدائیں، پھولوں کی بھینی بھینی خوش بو، پرندوں کی چہچہاہٹ، روشنی اور

گرمی و سردی کا بیان، مرغیاں، بطخیں، عقاب، کوئل، چھپکلی، طوطے ---- یہ سب مل کر مناظر کو تخلیقی بناتے ہیں۔ ساتھ ساتھ کرداروں کی نفسیات کے بیان پر بھی ابیتا کو عبور حاصل ہے ---- م۔م۔ راجندر کا ترجمہ تخلیقی سطح کو چھوتا ہے۔ کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ کیا ہوا ناول ہے۔ البتہ Great grand daughter کا ترجمہ انھوں نے کہیں پڑپوتی اور کہیں پڑنواسی کر دیا--- ساہتیہ اکادمی کی دوسری کتابوں کی طرح کتابت، طباعت اور کاغذ معیاری اور ٹائٹل خوب صورت ہے۔ قیمت ۶۰ روپے زیادہ نہیں ہے۔ یہ کتاب ساہتیہ اکادمی کے مرکزی دفتر اور شاخوں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

قدیم دکنی سلطنتیں اور سمستان (حصہ اول و دوم) (تاریخ) مؤلف: رمن راج سکسینہ تبصرہ نگار: موہن پرشاد

جناب ست گرو پرشاد ایڈوکیٹ مانے ہوئے ادیب تھے جنھوں نے "فرخندہ بنیاد حیدرآباد" لکھ کر حیدرآباد کی تاریخ کو محفوظ کر دیا۔ ان کے دوسرے بھائی ڈاکٹر رگھونند راج سکسینہ الہام اعلیٰ پائے کے رباعی گو تھے۔ وہ حیدرآباد کے رباعی گو شاعروں میں حضرت امجد کے معاصر تھے۔ ان کی یہ رباعی بہت مشہور ہوئی:

اخلاص و نیاز ایک دولت ہے میری لوگوں پہ محبت سے حکومت ہے میری
نقصان عدو کا بھی گوارا نہ رہا دشمن سے بھی نیکی کرنا فطرت ہے میری

ڈاکٹر آر۔ آر۔ سکسینہ الہام کے چھوٹے بھائی محترم پروفیسر مہندر راج سکسینہ ہیں۔ ان تینوں بھائیوں نے اردو کی خلوص کے ساتھ خدمت کی اور ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف اعزازی عہدوں پر رہے۔ مسٹر ست گرو پرشاد کے فرزند اول مسٹر رمن راج سکسینہ سینیر ایڈوکیٹ ادارۂ ادبیات اردو کے اعزازی نائب صدر رہیں بھی ہیں جنھوں نے اپنے تحقیقی کام کو جاری رکھا اور باوجود عدالتی مصروفیات کے کچھ نہ کچھ وقت نکال کر زیر تبصرہ کتاب کو منظر عام پر لایا۔ مؤلف کی اس کتاب سے پہلے دو اور کتابیں "آسمان جاہ کا حیدرآباد" اور "تذکرۂ دربار حیدرآباد" حال ہی میں شائع ہو چکی ہیں۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں جناب عابد علی خاں مدیر روزنامہ "سیاست" اور جناب امجد یوسف زئی نے مؤلف کا تعارف کرایا ہے۔ یہ کتاب ایک دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ قدیم دکنی سلطنتوں کا ریکارڈ تقریباً تلف ہو چکا ہے اور جو ریکارڈ دست یاب ہے وہ باقاعدہ ترتیب میں کسی ایک کتب خانہ میں بھی موجود نہیں ہے۔ پولیس ایکشن ۱۹۴۸ء سے پہلے ریاست حیدرآباد ہندستان کی سب سے بڑی مملکت تھی جس میں چار بڑے صوبے اور ہر صوبے میں چار چار اضلاع تھے اور اس مملکت کا وقار اور مرتبہ دیگر ریاستوں سے اونچا تھا۔ اور اس سلطنت کی اپنی فوج، سکہ اور ٹپہ تھا۔ اس لیے ان حالات سے واقفیت آج کی نسل کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس اہم تصنیف کے مطالعے سے نہ صرف حیدرآبادی بلکہ وہ تمام افراد جو تاریخ اور دیسی ریاستوں کا حال جاننے کا شوق رکھتے ہیں مستفید ہوں گے۔ مؤلف نے قدیم دکنی سلطنتوں اور سمستان کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں یوں لگتا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ ہندستان کی قدیم معاشرت اور اس کے اجمالی جائزے سے شروع کر کے گیارہ (۱۱) ہندو سلطنتوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں دوسرے باب میں دکن کے جاگیرداری نظام اور دکن کے والیانِ سمستان کا تعارف کرایا گیا ہے اور جملہ گیارہ (۱۱) سمستانوں کا پس منظر تفصیل کے ساتھ بیان

یا گیا ہے۔ کتاب کا گٹ اپ بہت عمدہ ہے اور بہت سی تصاویر بھی شامل ہیں۔ ویسے تو بہت سے ماہرینِ تاریخ نے دکن کی تاریخ پر مختلف تب شائع کی ہیں لیکن ان میں ہندو راجاؤں اور سمستانوں کے بارے میں کم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ کسی کتاب میں یک جا ان کی تفصیل میں ملتی۔ اس کتاب کے ہر باب میں تاریخی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے ابواب میں تسلسل قائم ہے۔ قیمت کتاب کی مناسبت سے بہت ہی کم ہے۔ یعنی صرف (۶۵) روپے ہے۔ یہ کتاب ادارۂ ادبیاتِ اردو، ادارۂ سیاست اور حسامی بک ڈپو مچھلی کمان سے دست یاب ہو سکتی ہیں۔

الانوار (مجموعہ کلام)   شاعر: محمد انوار اللہ فریس انصاری   تبصرہ نگار: وقار خلیل

حیدرآباد کے بزرگ اور قادر الکلام شاعر فریس انصاری کا یہ مجموعہ کلام ان کے ذہن و فکر اور ماحول کی روشنی اور طہارت سے عبارت ہے۔ الانوار چار ابواب: نورِ معرفت (نعتیہ شاعری) نورِ عقیدت (منقبت و سلام) نورِ حقیقت (غزلیہ اشعار) اور نورِ فراست (رباعیات و قطعات) پر مشتمل ہے۔

فریس انصاری صاحب نے اپنا تعارف سپردِ قلم کرتے ہوئے اپنے شعری مزاج، ماحول اور اپنے اساتذہ کے بارے میں مختصر ہی سہی مگر بڑی انکساری کے ساتھ تاثرات تحریر کیے ہیں اور علم شعری تحصیل کے نکات کو روشن کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میں نے دراصل بہ عمر ۱۴ سال (۱۹۴۲ء) سے شعر کہنا شروع کیا اور عمِ معظم خواجہ عبدالعلی صدیقی کی خدمت میں اپنا کلام بہ غرضِ اصلاح پیش کیا۔ آپ نے اصلاح کی بجائے علمِ عروض کی تفہیم فرمائی، بحور سے واقف کیا، پھر ایک ایک مصرع دے کر مشقِ سخن کرواتے رہے۔ اس طرح عرصے تک مشقِ سخن جاری رہی۔ جب کلام پیش کیا جاتا تو اغلاط سے آگاہ فرماتے، معائب و محاسن کی نشان دہی کرتے ہوئے اصلاح کا منصب ادا کرتے۔" اس طرح شعری تربیت آج مفقود ہو چلی ہے۔ غرض فریس انصاری نے اپنے عہد کے اساتذہ سے فیضانِ تربیت کے بعد اپنے کلام کو "الانوار" کے نام سے ترتیب دیا اور زیورِ طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ ان کے کلام میں سلاست، فکر و خیال کی ہم آہنگی، لفظوں کے دروبست کا ہنر اپنا تاثر چھوڑتا ہے۔ کلام میں تخلیقی روشنی اور ندرتِ فکر بھی نظر آتی ہے۔

نمونہ کلام:

سوتے میں مرے قسمتِ خوابیدہ جگادے   اللہ ! دکھادے رخِ زیبائے محمدؐ
آپ کا لے کے وسیلہ جو دعا کرتا ہوں   جو بھی میں مانگتا ہوں اس سے سوا ملتا ہے
باغِ دنیا میں سنبھل کر ہر قدم اپنا اٹھا   اس چمن میں ہیں یگانے چند، بے گانے ہزار
آنکھ بصیرت والی ہے   کوئی نہیں ہے حدِ نظر
جتنی چادر اتنے ہی پھیلاؤ پاؤں   جتنی گنجائش ہے اتنی احتیاط
خدا رزاق ہے کل دیکھ لیں گے   پلادے آج ساقی جس قدر ہے
فریس شعر و سخن میں مزہ بھی آئے گا   ذرا کلام میں شیرینی نبات بھی ہو

پوچھا گیا دیا سلائی کا   جو عمل اس کا ہے ثبوت ہے
لذت وصل ہے جدائی تک   وصل ہوتے ہی آگ لگتی ہے

فریس انصاری کا یہ مجموعہ اب سے نصف صدی ادھر کی شعری روایات اور کلاسیکی اسلوب سخن کا سیدھا سادہ اور دل کش نمونہ ہے۔ کتاب دبیز کاغذ پر نفاست کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ اشاعت: جون ۱۹۹۶ء۔ صفحات ۲۴۰ (مجلد)۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ 16-9-895 ملک پیٹھ قدیم حیدرآباد 500036 -

----

بنام علیم صبانویدی (مجموعہ خطوط)   مرتب: ڈاکٹر محمد علی اثر   تبصرہ نگار: وقار خلیل

علیم صبانویدی، جنوبی ہند کے معروف شاعر، ادیب اور نقاد ہیں۔ ان کی اب تک ۳۰ سے زائد کتابیں چھپ کر اردو شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھنے والوں کو مطالعے اور استفادے کی ساعتوں سے ہم کنار کر چکی ہیں۔ علیم صبا زود نویس اہل قلم ہیں۔ شعر و ادب کا کلاسیکی اور عصری شعور و ادراک رکھتے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ مکاتیب میں علیم صبانویدی کے نام (۸۲) نامور مشاہیر ادب اور مصنفوں کے خطوط یک جا کیے گئے ہیں، جن کے لکھنے والوں میں احتشام حسین، جمیل جالبی، رشید احمد صدیقی، فراق، مالک رام، مجنوں، وزیر آغا، عصمت چغتائی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان خطوط میں اہل قلم اصحاب نے علیم صبا کی مطبوعات کی یا تو رسید لکھی ہے یا پھر ان پر اپنے قلم برداشتہ تاثرات تحریر کیے ہیں۔ چند ایک خطوط مکتوباتی ادب کی افادیت کو ضرور روشن کرتے ہیں۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد علی اثر نے مکتوب نگاروں کے سوانحی اشارے لکھ کر کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کا تعارف بھی شامل ہے۔ اور مرتب کا مقدمہ بھی۔ علیم صبا نویدی (۱۵) شعری مجموعوں کے سخن ور، چار افسانوی کتابوں کے ادیب اور چار تحقیقی و تنقیدی کتابوں کے مصنف ہی نہیں چار مختلف شعری و ادبی موضوعات پر مطبوعہ کتابوں کے مرتب بھی ہیں۔ مکتوباتی ادب کے قارئین کو یہ کتاب دعوت مطالعہ دیتی ہے۔ اشاعت ۱۹۹۶ء۔ صفحات ۱۳۶۔ قیمت اسی روپے۔ ناشر ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز۔ امیر النسا بیگم اسٹریٹ۔ مونٹ روڈ۔ مدراس 600002 -

----

حیدرآباد کے بنسی راجہ   مصنف: ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ   تبصرہ نگار: وقار خلیل

راجہ گردھاری پرشاد باقی جنھیں "بنسی راجہ" کا خطاب میر محبوب علی خاں غفران مکان نے عطا کیا تھا، عہد محبوبیہ کے سخن ور اور بہ قول مہاراجہ کشن پرشاد "وہ ان چند باکمال اور زندۂ جاوید ہستیوں میں تھے جو جذبات خلق و مروت، سخاوت، شجاعت، رحم دلی، بے تعصبی نیک نیتی، کریم النفسی، انکساری، تواضع اور فروتنی جیسی صفات سے متصف اور اپنی مثال آپ تھے۔"

زیر نظر کتاب میں بنسی راجہ کے آباء و اجداد اور خاندانی حالات اور ان کی شخصیت نیز مملکت آصفیہ سے ان کی وابستگی اور کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی و شعری زندگی اور سفرناموں پر مشتمل ان کی کتابوں اور دیگر تصانیف پر سیر حاصل معلومات ان ہی کے خاندان کے سپوت ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ نے مختلف تاریخی حوالوں اور مستند دستاویزات کے تناظر میں یک جا لکھے ہیں۔ بعض تاریخی حوالوں کی صحت پر شک ممکن بھی ہے اور نہیں بھی۔ غرض مسعود مجاز کے تعارف کی ان سطروں سے ہم متفق ہیں کہ "بھاسکر راج صاحب اپنے

(ل ا ص ۱۲۔

بہ یادگار سید محی الدین قادری زور

سن اجراء : ۱۹۳۸ء فون : 310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۵۸ اکتوبر ۱۹۹۶ء شمارہ : ۱۰

فی پرچہ	:	۱۰ روپے
زر سالانہ	:	۱۰۰ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۲۵ روپے
مشرق وسطی اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۲ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲ (اے پی) انڈیا

پبلیکیشن اسسٹنٹ اقبال علوی کمپیوٹر کتابت شارپ کمپیوٹرس

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر و پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے ایس ایس گرافکس میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا

اس شمارے میں

مضامین

مطالعہ

غزلیں

افسانے

سب رس نومبر - دسمبر ۱۹۹۶ء کا مشترکہ شمارہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نمبر ہوگا۔

ڈاکٹر منیر الدین احمد

شیخ الاکبر محی الدین عربی

ابن عربی کا پورا نام، جن کو محی الدین (دین کو زندہ کرنے والا) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، محمد بن علی بن محمد الطائی الحاتمی تھا۔ مشرق میں آپ کو ابن عربی کہتے ہیں (قاضی ابو بکر بن العربی سے تمیز کرنے کی خاطر آپ کے نام کے ساتھ ال نہیں لگایا جاتا) جب کہ مغرب میں آپ ابن العربی اور ابن سراقتہ کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ آپ اندلس کے شہر مرسیہ میں ۲۷ رمضان المبارک ۵۶۰ھ مطابق ۱۱۶۵ء کو ایک معزز عرب خاندان میں پیدا ہوئے جو مشہور زمانہ سخی حاتم الطائی کے بھائی کی نسل سے تھا۔ آپ کے والد مرسیہ کے ہسپانوی الاصل حاکم محمد بن سعید مرذنیش کے دربار سے متعلق تھے۔ ابن عربی ابھی آٹھ برس کے تھے کہ مرسیہ پر موحدون کے قبضہ کر لینے کے نتیجے میں آپ کے خاندان کو وہاں سے ہجرت کرنا پڑی۔ چوں کہ اشبیلیہ پہلے سے موحدون کے ہاتھ میں تھا، اس لیے آپ کے والد نے لشبونہ (حالیہ پرتگال کا دارالحکومت لزبن) میں پناہ لی۔ البتہ جلد ہی اشبیلیہ کے امیر ابو یعقوب یوسف کے دربار میں آپ کو ایک معزز عہدہ کی پیشکش ہوئی اور آپ اپنے خاندان سمیت اشبیلیہ منتقل ہوگئے۔ جہاں پر ابن عربی نے اپنی جوانی کا زمانہ گزارا۔ ابتدائی تعلیم کے مراحل آپ مرسیہ اور لشبونہ میں طے کر چکے تھے، اشبیلیہ میں آپ کو اپنے وقت کے نام ور عالموں کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت ملی۔ مروجہ دینی اور دنیاوی تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ آپ کا بہت سا وقت صوفیا کی خدمت میں گزرتا تھا۔ تصوف کا سلسلہ آپ کے خاندان میں قائم تھا۔ چناں چہ آپ کے چچا ابو محمد عبداللہ بن محمد بن العربی کو اپنی وفات سے تین برس قبل طریقت کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ملی، جس کا سبب ایک نوجوان بنا تھا، جسے خود تصوف کا کوئی علم نہ تھا۔ آپ اپنے گھر کے قریب واقع ایک پنساری کی دکان پر جاکر بیٹھا کرتے تھے، جو جڑی بوٹیاں بیچتا تھا۔ ایک روز دکان دار کی غیر حاضری میں آپ وہاں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خوبرو لڑکا آیا اور آپ کو دکان کا مالک سمجھتے ہوئے آپ سے ایک خاص پودے کے سفید بیج مانگے۔ آپ ہنس دیے اور پوچھا کہ وہ کیا ہوتا ہے؟ لڑنے کہا کہ اسے ایک تکلیف ہے، جس کا علاج ایک عورت نے اس پودے کے سفید بیج بتایا تھا۔ آپ کے چچا نے کہا کہ میں تمھاری بے علمی کے سبب ہنسا تھا، کیوں کہ اس پودے کا بیج سفید نہیں سیاہ ہوتا ہے۔ اس پر لڑکے نے کہا۔ چچا میری اس بارے میں لاعلمی کا مجھے اللہ کی نظر میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، مگر آپ کی اللہ سے غفلت آپ کے لیے بہت نقصان کا موجب بنے گی، بالخصوص جب آپ عمر رسیدگی کے باوجود اس کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ بات ابن عربی کے چچا کے دل کو لگی اور ان کے اندر ایک انقلاب برپا کرنے اور ان کے طریقے کی طرف رجوع کرنے کا باعث بنی۔

اسی طرح آپ کے ماموں ابو مسلم الخولانی، جو ساری ساری رات عبادت میں گزارتے تھے اور جب ان کی ٹانگیں تھک جاتی تھیں، تو انھیں چھڑیوں سے مارتے تھے اور کہتے تھے کہ تمھیں مارنا بہتر ہے اپنی سواری کے جانور کو مارنے سے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کیا رسول اللہ صلعم کے صحابہ سمجھتے ہیں کہ حضور صرف ان کے لیے ہیں۔ اللہ کی قسم ہم ان پر اس طرح ہجوم کر کے آپ کی طرف آگے بڑھیں گے، کہ انھیں پتا چل جائے گا کہ انھوں نے اپنے پیچھے مردوں کو چھوڑا ہے، جو آپ کے مستحق ہیں (فتوحات مکیہ۔ جلد دوم۔ ص ۱۸)۔

دوسرے ماموں یحیٰی ابن یغمان تھے، جو ایک زمانے میں تلمسان کے بادشاہ تھے۔ ان کے زمانے میں ایک عابد زاہد شخص ابو عبداللہ التونسی تھے، جو لوگوں سے کنارہ کش تھے۔ اور تلمسان سے باہر ایک جگہ پر رہتے تھے۔ ایک روز وہ شہر میں جا رہے تھے، جب ابن عربی کے

ماموں کا اپنے جاہ و حشم کے ساتھ ادھر سے گزر ہوا۔ انھیں بتایا گیا کہ یہ شخص عابد وقت ہیں۔ انھوں نے اپنے گھوڑے کی لگام کو کھینچا اور شیخ کو سلام کیا، جواب میں انھوں نے بھی سلام کیا۔ بادشاہ لباس فاخرہ میں ملبوس تھا اس نے پوچھا: اے شیخ کیا میرے لیے ان کپڑوں میں، جو میں نے پہن رکھے ہیں، نماز کا ادا کرنا جائز ہے؟ شیخ اس پر ہنس دیے۔ بادشاہ نے ہنسنے کی وجہ پوچھی، تو کہا تمھاری بے عقلی اور اپنے نفس کو نہ جاننے پر اور تمھارے حال پر۔ میرے نزدیک تم اس کتے کی طرح ہو، جو ایک مردار کے خون میں سونگھتا پھرتا ہے اور اس کی غلاظت کے باوجود اسے کھاتا ہے، مگر جب پیشاب کرتا ہے، تو ٹانگ اٹھاتا ہے تاکہ پیشاب اسے گیلا نہ کردے۔ تم حرام سے بھرے ہوئے برتن کی طرح ہو، اور اپنے کپڑوں کے بارے میں پوچھتے ہو۔ جب کہ لوگوں کے مظالم تمھاری گردن پر ہیں۔ بادشاہ رو دیا، گھوڑے سے اترا اور اسی وقت اپنی بادشاہت سے دست بردار ہو گیا اور شیخ کے ساتھ ہو لیا۔ شیخ نے تین روز تک اسے اپنے پاس رکھا۔ پھر رسی لے کر اس کے پاس آیا اور کہا اے بادشاہ ضیافت کے دن گزر گئے۔ اب اٹھ جا اور لکڑیاں ڈھو۔ اس کے بعد وہ لکڑیاں اپنے سر پر اٹھا کر لاتا اور انھیں بازار میں لے جایا کرتا تھا۔ لوگ اس کی طرف تکتے تھے اور روتے تھے۔ وہ لکڑیاں بیچتا تھا اور اپنے لیے صرف گزارے کی رقم رکھتا تھا، باقی کے پیسے وہ صدقہ کر دیتا تھا۔ وہ اس شہر میں اپنی موت تک رہا۔ اس کو شیخ کے مقبرے کے باہر دفن کیا گیا۔ لوگ ابن عربی کی زمانے میں اس کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ جب شیخ حیات تھے اور لوگ ان سے دعا کے لیے کہتے تھے، تو وہ کہا کرتے تھے کہ یحییٰ بن یغمان سے دعا کے لیے کہو، کیوں کہ وہ بادشاہ تھے، پھر زہد اختیار کیا۔ اگر میں اس ابتلاء میں ڈالا گیا ہوتا، جس میں وہ ڈالا گیا ہے، تو میں شاید زہد اختیار کرنے میں کامیاب نہ ہوتا (فتوحات مکیہ۔ جلد دوم ص ۱۸)۔

ابن عربی لکھتے ہیں کہ میں نے اس چیز کا مشاہدہ اپنے زمانہ جاہلیت میں کیا تھا (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۸۵)۔ اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرا دخول اس طریقہ میں ۵۸۰ء میں ہوا، جب کہ آپ کی عمر بیس برس کی تھی۔ (فتوحات مکیہ۔ جلد دوم۔ ص ۴۲۵)۔ اس بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ اشبیلیہ کے کسی امیر کی دعوت میں مدعو تھے۔ جہاں پر آپ کی طرح دوسرے رؤسا کے بیٹوں کو بلایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد جب جام گردش کرنے لگا اور صراحی آپ تک پہنچی اور آپ نے جام کو ہاتھ میں پکڑا تو غیب سے آواز آئی: "اے محمد کیا تم کو اسی لیے پیدا کیا گیا تھا؟" آپ نے جام کو ہاتھ سے رکھ دیا اور پریشانی کے عالم میں دعوت سے باہر نکل گئے۔ گیٹ پر آپ نے وزیر کے چرواہے کو دیکھا، جس کا لباس مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ آپ اس کے ساتھ ہو لیے اور شہر سے باہر اپنے کپڑوں کا اس کے کپڑوں سے تبادلہ کیا۔ کئی گھنٹوں تک ویرانوں میں گھومنے کے بعد آپ ایک قبرستان پر پہنچے، جو ایک نہر کے کنارے واقع تھا۔ آپ نے وہاں پر ڈیرا لگانے کا فیصلہ کیا اور ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں جا اترے۔ دن اور رات ذکر الٰہی میں مصروف ہو گئے اور سوائے نماز کی ادائیگی کے وقت کے اس میں سے نہ نکلتے تھے۔ چار روز کے بعد آپ باہر نکلے، تو علوم کا ایک دریا لے کر لوٹے۔ (الدر الثمین فی مناقب الشیخ محی الدین۔ مصنفہ الشیخ ابراہیم بن عبد اللہ القاری البغدادی۔ بیروت ۱۹۵۹ء میں ۲۲۔ ۲۳) آپ نے اس کے بعد اپنے شیخ کی زیر نگرانی ایک نو ماہ کا چلہ کاٹا۔ ابن سودکین نے آپ سے روایت کیا: میری خلوت فجر کے وقت شروع ہوئی اور فتح (اسرار کا کھلنا) طلوع الشمس سے قبل وقوع میں آئی۔ فتح کے بعد مجھ پر "ابدار" کی حالت وارد ہوئی اور اس کے علاوہ دوسرے مقامات ترتیب وار آئے۔ میں اپنی جگہ پر قائم رہا چودہ مہینوں تک اور ان سارے اسرار تک رسائی حاصل کی، جنھیں میں نے فتح کے بعد تالیف کیا ہے۔ اور میری فتح اس لمحے میں ایک جذب (کی طرح) تھی۔" (کتاب وسائل السائل۔ مصنفہ شمس الدین اسماعیل بن سودکین:

ص ۲۱)۔ یہاں پر ابن عربی نے جس مقام "ابدار" کا ذکر کیا ہے، اس کی تشریح آپ نے دوسری جگہ پر ان الفاظ میں فرمائی ہے: "ابدار کو اللہ نے عالم میں اپنی تجلی کی مثال کے لیے اپنے حکم سے نصب کیا ہے۔ پس وہ خلیفۂ الٰہی ہے، جو عالم میں اللہ کے اسماء اور احکام اور رحمت اور قہر اور انتقام اور عفو کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے، جیسے سورج ظاہر ہوتا ہے چاند میں اور جب وہ پورے کو روشن کر دیتا ہے، تو اس کو بدر (پورا چاند) بنتے ہیں۔ گویا سورج اپنے آپ کو بدر کے آئینے میں دیکھتا ہے۔" (فتوحات مکیہ۔ جلد دوم۔ ص ۵۵۶)۔

آپ پہلے پہل سرکاری ملازمت میں کاتب (سیکریٹری) کے عہدے پر فائز تھے، جو دیوان سلطنت کا اہم عہدہ تھا۔ آپ کے والد وزیر ریاست تھے اور آپ کے خاندان کا شمار ملک کے باوقار لوگوں میں ہوتا تھا۔ اپنے روحانی تجربے کے بعد آپ نے ملازمت سے ہاتھ اٹھالیا اور طریقے کے دوسرے لوگوں کی طرف فقر کو اپنا شعار بنالیا۔ آپ کے مرشد شیخ یوسف بن مخلف الکومی کو خبر پہنچی کہ ابن عربی اپنا وقت قبرستانوں میں گزارتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے کسی موقعے پر کہا کہ سنا ہے کہ ابن عربی نے زندوں کی مجلس کو چھوڑ کر مردوں کی مجلس کو اختیار کر لیا ہے۔ ابن عربی نے انھیں پیغام بھیجا کہ آپ خود آکر دیکھیں کہ میں کن لوگوں کے ساتھ مجلس لگاتا ہوں۔ چناں چہ ایک روز وہ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد قبرستان میں گئے، جہاں پر ابن عربی حاضر ہونے والی ارواح کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ شیخ یوسف دھیرے سے آپ کے پہلو میں جاکر بیٹھے اور ابن عربی نے دیکھا کہ ان کا رنگ فق پڑ گیا تھا۔ ابن عربی نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا، مگر شیخ یوسف اپنے اندرونی کرب کے سبب مسکرا نہ سکے۔ جب مجلس ختم ہوئی، تو استاد کے چہرے پر رونق لوٹ آئی اور انھیں نے شاگرد کی پیشانی کو چوما۔ ابن عربی نے پوچھا: "استاد کون مردوں کے ساتھ مجلس لگاتا ہے، میں یا آپ؟" شیخ یوسف نے کہا: "خدا کی قسم میں مردوں کے ساتھ مجلس کرتا ہوں۔ اگر مجھ پر حال وارد ہو جائے تو میں سب کچھ چھوڑ دوں۔" اس کے بعد وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ جو کوئی لوگوں سے منھ موڑنا چاہتا ہے، اسے فلاں (مراد ابن عربی) کی طرح کرنا چاہیے، کیوں کہ اس میں عالم الغیب کی استقامت کا علم ہے، اور وہ مخالفت سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ علم الوفاق ہے اور اس میں ایسا علم پایا جاتا ہے، جس پر انسانی قوی قدرت نہیں رکھتے۔ (فتوحات مکیہ۔ جلد سوم ص ۴۵)۔

ابن عربی کی غیر معمولی صلاحیت اور علم کا چرچا اندلس میں پھیلنا شروع ہوا، تو مشہور فلاسفر اور قرطبہ کے قاضی القضاۃ ابو الولید ابن رشد نے آپ کے والد سے کہا کہ کسی وقت اپنے بیٹے کو میرے پاس بھیجیں۔ اس ملاقات کا حال ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "میں ایک روز قرطبہ میں وہاں کے قاضی ابو ولید بن رشد کے پاس گیا۔ انھیں میری ملاقات کا شوق تھا، اس سبب سے، جو انھوں نے میرے بارے میں سن رکھا تھا اور مجھ پر اللہ نے میری خلوت میں جو اسرار کھولے تھے، جن کے بارے میں ان کو پتا چلا تھا۔ وہ ان سنی ہوئی باتوں پر تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ میرے والد نے مجھے کسی حاجت کے سلسلے میں ان کے پاس بھیجا، اس قصد کے ساتھ کہ وہ مجھ سے ملیں، کیوں کہ وہ آپ کے دوستوں میں سے تھے۔ اور میں ابھی بچہ تھا، میری مسیں ابھی نہ بھیگی تھیں۔ جب میں داخل ہوا، تو وہ محبت اور تعظیم کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے معانقہ کیا۔ پھر مجھ سے کہا: ہاں۔ میں نے ان سے کہا: ہاں۔ اس پر ان کو بہت خوشی ہوئی کہ میں نے ان کی بات کو سمجھ لیا تھا۔ پھر میں جان گیا کہ وہ کیوں اس بات پر خوش ہوئے تھے۔ تو میں نے ان سے کہا: نہیں۔ اس پر ان کو انقباض ہوا اور ان کا رنگ بدل گیا۔ اور انھیں اپنے علم کے بارے میں شک پیدا ہوا۔ انھوں نے کہا، تم نے کشف اور فیض الٰہی میں اس امر کو کیسا پایا۔ کیا وہ وہی کچھ ہے، جو ہمیں سوچ و بچار سے ملتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں اور نہ، اور ہاں اور نہ کے مابین روحیں اپنے مواد سے اور گردنیں اپنے

اجسام سے اڑتی ہیں۔ ان کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ کانپنے لگے اور بیٹھ کر لاحول پڑھنے لگے اور وہ اس چیز کو جان گئے، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ اور یہ عین وہی مسئلہ ہے، جس کا ذکر اس قطب امام یعنی مداوی الکلوم نے کیا تھا۔ اور اس کے بعد انھوں نے میرے والد سے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، تاکہ وہ میرے سامنے اس چیز (علوم) کو پیش کر سکیں، جو ان کے پاس تھی، یہ جاننے کے لیے کہ کیا وہ موافق ہے یا مخالف۔ کیوں کہ وہ ارباب فکر اور (اصحاب) نظر و عقل میں سے تھے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اس بات پر کہ وہ ایسے زمانے میں تھے جس میں انھوں نے ایک شخص کو دیکھا، جو اپنی خلوت (چلہ) میں جاہل ہوتے ہوئے داخل ہوا اور اس طرح (علم سے مالا مال) خارج ہوا، بغیر لکچروں کے اور بحث (مباحثہ) کے اور بغیر (تحقیقی) مطالعے کے اور بغیر (استاد کے سامنے) پڑھنے کے۔ انھوں نے کہا کہ اس بات کو ہم نے (دلائل) سے جانا ہے، مگر ایسے (استعداد رکھنے والے) ارباب کو ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ سو اللہ کا شکر ہے کہ میں ایسے زمانے میں ہوں، جس میں ان ارباب میں سے ایک پایا جاتا ہے، جو بند دروازوں کو کھولنے والے ہیں۔ اور اللہ کا شکر اس بات پر کہ اس نے مجھے اس کو دیکھنے کی خصوصیت سے نوازا" (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۳۔ ۱۵۴)۔

قطب مداوی الکلوم نے اپنے اصحاب کو ایک جگہ پر جمع کر کے جو باتیں کی تھیں، ان میں سے یہ فقرے قابل غور ہیں اور غالباً ابن عربی انھیں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا: "ہر علم کے لیے انسان مخصوص ہوتے ہیں، جس کو نہ تو سب لوگ حاصل کر سکتے ہیں، نہ ہی اس کے لیے وقت میسر ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر گروہ میں مختلف فطرتوں کے لوگ پائے جاتے ہوں اور آپس میں موافقت نہ رکھنے والے اذہان موجود ہوں، اگر چہ اس جماعت کا مقصود ایک ہی ہو۔ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، اور اس کے ہاتھ میں میرے رمز کی مفتاح ہے۔ اور ہر مقام کے لیے مقال اور ہر علم کے لیے رجال اور ہر وارد کے لیے حال پائے جاتے ہیں" (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۴)

ایک اور ہستی کے ساتھ آپ کا ملنا تصوف کے اعتبار سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اور وہ بھی ایک ایسے وقت میں جب کہ آپ کو طریقے سے وابستہ ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ یہ تھے خضر علیہ السلام، جن کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر ابن عربی نے "فتوحات مکیہ" میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ "اور ہم کو خضر علیہ السلام کے بارے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ یوں ہے کہ ہمارے شیخ ابالعباس عریبی رحمۃ اللہ علیہ کے اور میرے درمیان ایک شخص کے بارے میں ایک مسئلہ جاری ہوا، جس کے ظاہر ہونے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش خبری فرمائی تھی۔ اور اس نے مجھے فرمایا کہ وہ فلاں بن فلاں شخص ہے اور میرے آگے ایک شخص کا نام بیان کیا، جس کو میں نام سے جانتا تھا اور دیکھا نہیں تھا۔ لیکن اس کی پھوپھی کے بیٹے کو میں نے دیکھا تھا۔ اور میں اس کے بیان میں متوقف تھا اور اس کو قبول نہ کیا تھا۔ یعنی اس کے بارے میں اس کی بات کو میں نہیں مانتا تھا۔ کیوں کہ میں اس کے بارے میں علی وجہ البصیرت تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ شیخ عریبی کا ضمیر اس پر پھر آیا اور شیخ کو دل میں میری اس بات سے رنج ہوا۔ اور مجھے اس سے کچھ آگاہی نہ ہوئی۔ کیوں کہ میں اس وقت ابتدائی حال میں تھا۔ اور میں اس سے اپنے گھر لوٹ آیا۔ ابھی میں راستے میں ہی گھر کی طرف آرہا تھا۔ اور ایک شخص مجھے ملا جسے میں نہیں جانتا تھا۔ اور اس نے مجھے ایک بڑے محب مہربان کی طرح پہلے اسلام علیکم کہہ کر فرمایا۔ اے محمد تم کو شیخ ابالعباس عریبی نے فلاں شخص کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا، وہ سچ ہے۔ اس کی تصدیق کرو۔ اور اس شخص کا نام لیا، جس کا ذکر ابو العباس نے کیا تھا۔ میں نے کہا: بہت اچھا۔ میں نے ان کے ارادے کو جان لیا اور اسی وقت میں شیخ صاحب مذکور کی طرف لوٹ آیا کہ ان کو اس واقعہ کی اطلاع دوں جب میں شیخ صاحب کے پاس آیا، تو

نوں نے مجھے فرمایا۔ اے ابا عبد اللہ جب میں تیرے پاس کوئی مسئلہ بیان کرتا ہوں، تو تیرا دل اس کے قبول کرنے سے متوقف ہو جاتا ہے، تو ہے تیرے لیے خضر علیہ السلام تک (کی) ضرورت پڑتی ہے کہ وہ تیرے آگے اس بات کو پیش کریں کہ فلاں شخص کی تصدیق کر لو، جو تیرے گے بیان کیا گیا۔ یہ واقعہ تمھارے لیے ہر ایک واقعے کے بارے میں، جو تم مجھ سے سن کر متوقف ہو جاتے ہو، کہاں تک ہو تا رہے گا۔ میں نے کہا: توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ فرمایا: قبولیت توبہ واقع ہو چکی۔ میں نے جان لیا کہ وہ شخص خضر علیہ السلام تھے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ میں نے شیخ صاحب مذکور سے اس بارے میں پوچھا کہ آیا راستے میں مجھ سے ملنے والے خضر علیہ السلام تھے؟ فرمایا: ہاں وہ خضر علیہ السلام تھے (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۸۶۔ ترجمہ مولوی محمد فضل خان۔ ص ۵۳۵۔ ۶۳۶)۔

ابن عربی نے پہلی بار ۵۹۰ھ میں اندلس کی سرزمین سے باہر کا سفر کیا۔ آپ نے تونس میں ابو القاسم بن قسی، جو المغرب میں راودون کے خلاف اٹھنے والے صوفیوں کے بانی قرار دیے جاتے ہیں، کی کتاب "خلع النعلین" کا درس لیا۔ بعد میں آپ نے اس کتاب کی شرح پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا۔ اسی سفر کے دوران آپ کی ملاقات ابو محمد عبد العزیز بن ابو بکر القریشی المہدوی کے ساتھ ہوئی، جن کی رمائش پر آپ نے اندلس کے صوفیا کے تذکروں پر مشتمل اپنی کتاب "روح القدس" لکھی۔ اس کتاب میں پچپن صوفیا کا تعارف کروایا گیا، ن کے ساتھ آپ کا رابطہ رہا یا جن سے آپ کا شاگردگی کا رشتہ تھا۔ غالباً اسی سفر کے دوران آپ کو ابو محمد عبد اللہ بن خمیس الکنانی کی خدمت یں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، جو پیشے کے اعتبار سے جراح (سرجن) تھے اور جن کا تذکرہ آپ نے اپنی کتابوں "روح القدس" اور "درۃ فاخرہ" میں کیا ہے۔ ان کی صحبت میں آپ ایک سال سے کچھ کم عرصہ رہے تھے۔ ان سے ملنے کے لیے جاتے ہوئے آپ نے اپنے استادوں ویعقوب اور ابو محمد الموروری کی سنت کی پیروی کی اور ان کی طرح ننگے پاؤں چل کر گئے۔ جب آپ نصف فاصلہ طے کر چکے تھے، تو آپ کو ایک نخص مخالف سمت سے آتا ہوا ملا، جس نے بتایا کہ شیخ نے مجھے تم سے ملنے اور یہ پیغام دینے کو کہا ہے کہ اپنی جوتیاں پہن لو۔ انھیں تمھاری آمد کا لم ہو چکا ہے اور انھوں نے تمھارے لیے کھانا بھی تیار کر رکھا ہے۔ اس شیخ کے پاس سے واپسی والے روز آپ کی ملاقات دوسری بار خضر علیہ سلام سے ہوئی۔ جس کے بارے میں آپ لکھتے ہیں: "پھر دوسری بار میرے لیے ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں تونس کی بندرگاہ میں کشتی کے اندر ھا، تو مجھے شکم میں درد پیدا ہوا اور کشتی والے سو گئے تھے۔ اور میں کشتی کے ایک طرف کھڑا ہو گیا اور سمندر کی طرف نظر کی، تو چاند کی روشنی یں دور ایک شخص مجھے نظر آیا۔ یہ رات چودھویں تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ شخص پانی پر چلا آتا ہے اور میرے پاس پہنچ کر میرے ساتھ کھڑا ہ گیا۔ اور ایک قدم اٹھایا اور دوسرے قدم پر تکیہ کیا۔ میں نے اس کے قدم کے نیچے دیکھا کہ اس کو تری پانی کی نہ لگی تھی۔ پھر ایک قدم رکھا ور دوسرا اٹھایا۔ تو دیکھا کہ وہ بھی اسی طرح خشک تھا۔ پھر ان کے ساتھ جو کلام کرنی تھی، وہ انھوں نے فرمائی اور مجھے السلام علیکم فرما کر لوٹ ئے۔ اور لب دریا ایک بلند ٹیلے پر جو منارہ واقع ہے، اس کی طرف تشریف لے گئے، جس کی مسافت ہم سے دو میل سے زیادہ تھی۔ انھوں نے س مسافت کو دو یا تین قدموں میں طے کیا۔ اور میں نے ان کا آواز سنا کہ وہ منارے کے اوپر اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں مشغول تھے۔ اور سارے شیخ جراح بن خمیس کنانی کی طرف تشریف لے گئے۔ وہ عالی خاندان سے تھے۔ اور بندرگاہ عبدون میں رہتے تھے۔ میں ان کے پاس سے ی رات کو آیا تھا۔ جب میں شہر میں داخل ہوا، تو ایک صالح مرد سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے کہا کہ کل رات کو کشتی میں خضر علیہ سلام کے ساتھ آپ کی کیسی گزری۔ انھوں نے آپ کو کیا فرمایا تھا (اور آپ نے انھیں کیا کہا تھا)۔" (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۸۶۔

ترجمہ مولوی محمد فضل خان ۔ ص ۷۳۶) ۔

عین ممکن ہے کہ اس سفر کے دوران آپ کی ملاقات قطب زمان ابوالنجاء المعروف بہ ابومدین کے ساتھ بھی ہوئی ہو، جو شیخ ابن خمیس الکنانی کے استاد تھے ۔ اور جن کے مناقب کا ذکر ابن عربی اپنی کتابوں میں بار بار کرتے ہیں اور ان کا شمار اپنے شیوخ میں کرتے ہیں ۔ واپسی کے راستے میں آپ تلمسان میں ابوعبداللہ الطرطوسی سے ملے، جن کے بارے میں آپ کے دل میں گرہ تھی، کیوں کہ یہ بات آپ تک پہنچی تھی کہ وہ شیخ ابومدین کے خلاف تھے ۔ ایک رات خواب میں آپ کو رسول اللہ صلعم کا دیدار ہوا ۔ حضورؐ نے پوچھا کہ تم اس شخص سے کیوں کراہت کرتے ہو ۔ عرض کیا اس کے ابومدین سے بغض کرنے کی وجہ سے ۔ حضورؐ نے فرمایا: کیا وہ اللہ سے اور مجھ سے محبت کرتا ہے؟ عرض کیا: یا رسول اللہ وہ اللہ سے اور آپ سے محبت کرتا ہے ۔ فرمایا کہ تم کیوں اس کے ابومدین سے بغض کرنے کے سبب اس سے بغض کرتے ہو اور کیوں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنے کے سبب اس سے محبت نہیں کرتے؟ عرض کیا: یا رسول اللہ میں نے اللہ کی قسم خطا کھائی اور غفلت کا مرتکب ہوا مگر اب میں تائب ہوتا ہوں اور میں اس شخص سے تمام انسانوں سے بڑھ کر محبت کرتا ہوں ۔ جب بیدار ہوئے، تو قیمتی پارچہ جات اور بہت سی نقدی لے کر ان کے دروازے پر پہنچے اور ساری واردات سنائی، جس پر وہ رو دیے، انھوں نے تحفے کو قبول کیا اور اس رویے کو اللہ کی طرف سے ایک تنبیہ کے طور پر جانا ۔ اور ان کے دل سے ابومدین کے بارے میں ساری کراہت جاتی رہی اور محبت نے اس کی جگہ لے لی ۔ ابن عربی نے اس کراہت کا سبب جاننا چاہا اور کہا کہ ابومدین ایک صالح شخص ہیں ۔ اس نے کہا کہ میں بجایہ میں ان کے پاس تھا، جب عیدالاضحیٰ کی قربانی کا گوشت آیا اور انھوں نے سارا اپنے اصحاب میں تقسیم کر دیا اور مجھے اس میں سے کچھ نہ دیا ۔ اس سبب سے میں ان سے کراہت کرنے لگا ۔ مگر اب میں نے اس سے توبہ کر لی ہے (فتوحات مکیہ ۔ جلد چہارم ۔ ص ۴۹۸ ۔ ۴۹۹) ۔

خضر علیہ السلام کے ساتھ آپ کی تیسری ملاقات بھی غالباً اسی سفر کے دوران ہوئی، جس کا حال آپ نے اس طرح بیان کیا ہے: "اس تاریخ کے بعد میں بطور سیر نکلا اور بحر محیط کے کنارے کنارے چلا جاتا تھا اور میرے ساتھ ایک دوسرا شخص تھا، جو صالحین کے خرق عادات اور کرامات کا منکر تھا ۔ میں ایک ویران اور ٹوٹی پھوٹی مسجد میں داخل ہوا تاکہ میں اور میرا ساتھی اس میں نماز ظہر پڑھیں ۔ دیکھا کہ منقطع الی اللہ مردان خدا کی ایک جماعت ہمارے پاس مسجد میں داخل ہوئی ۔ اور نماز پڑھنے کا ارادہ فرما رہے تھے ۔ اور ان میں وہ مرد بھی تھا، جس نے میرے ساتھ دریا پر گفتگو کی تھی اور جس کے بارے میں مجھے کہا گیا تھا کہ وہ خضر علیہ السلام ہیں ۔ اور ان میں ایک مرد عظیم الشان بڑے قدر والا تھا ۔ اور میرے اور اس کے درمیان قبل ازیں دوستانہ محبت کی ملاقات ہو چکی تھی ۔ پس میں کھڑا ہوا اور ان کو سلام کہا ۔ اور انھوں نے مجھے سلام فرمایا اور میرے ساتھ بہت خوش ہوئے اور ہم کو نماز پڑھانے کے لیے امام بنے ۔ جب ہم نماز سے فارغ ہوئے، تو امام صاحب نکلے اور میں ان کے پیچھے نکلا اور مسجد کے دروازہ کو آئے ۔ مسجد کا دروازہ مغربی جانب بحر محیط کے سامنے اس مقام میں واقع تھا، جس کو بکہ کہتے ہیں ۔ میں ان کے ساتھ مسجد کے دروازہ پر بات کر رہا تھا ۔ اتنے میں وہ شخص جس کے بارے میں میں نے کہا تھا کہ وہ خضر علیہ السلام ہیں، آئے اور مسجد کے محراب میں سے ایک چھوٹی سی چٹائی اٹھا کر زمین سے قریباً سات گز کی بلندی پر ہوا میں بچھا دی اور ہوا میں چٹائی پر کھڑے ہو کر نفل پڑھنے لگے ۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا: کیا تم اس مرد خدا کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں ۔ اس نے مجھے کہا کہ آپ چلیں ان سے پوچھیں ۔ میں اپنے ساتھی کو کھڑا ہوا چھوڑ کر اس کی طرف آیا ۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے، تو ان کو السلام علیکم کہا اور اپنے لیے نظم (کی ہوئی) ان کو پڑھ کر سنائی ۔ شغل

المحب عن الھوا۔ یسرہ۔ فی حب من خلق الھوا۔ و سرّہ (دوست نے محبت کو روک رکھا ہے اور خوش کرتا ہے۔ اس کی محبت میں جس نے ہوا کو پیدا کیا اور اس کو مسخر کیا) العارفون عقولھم معقولۃ۔ عن کل کون تر تنفیہ مطہرہ (عارفوں کے عقول معقول ہوتے ہیں۔ ہر ایک کون سے، وہ عقل خدا کو پسند آتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں) فھو لدیہ مکرمون وفی الوریٰ۔ احوالھم مجھولۃ و مستورہ (پس وہی اس کے نزدیک باعزت ہیں اور لوگوں میں۔ ان کے احوال مجہول اور چھپے ہوئے ہیں) پس مجھے فرمایا اے فلانے تم نے کیا کیا، تم نے جو کچھ دیکھا وہ اسی منکر کے حق میں تھا، اور میرے ساتھی کی طرف اشارہ فرمایا، جو صالحین کی خرق عادات کا منکر تھا۔ اور مسجد کے صحن میں بیٹھا ہوا اس کو دیکھ رہا تھا، تاکہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہے اور جیسے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہے۔ پھر میں نے اپنا رخ اس منکر کی طرف کیا اور اس کو کہا کہ تم اب کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا کہ اب دیکھنے کے بعد کیا کہا جاسکتا ہے۔ پھر میں اپنے ساتھی کی طرف لوٹ آیا۔ اور وہ دروازہ مسجد پر میرے انتظار میں تھے۔ ایک گھڑی میں نے اس کے ساتھ بات چیت کی اور اس کو کہا کہ یہ کون صاحب ہیں، جو ہوا میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور میں نے اس سے جو واقعہ قبل ازیں اس کے ساتھ پیش آیا ذکر نہیں کیا تھا۔ تو مجھے فرمایا کہ یہ خضر علیہ السلام ہیں اور پھر چپ رہے۔" (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۸۹۔ ترجمہ مولوی محمد فضل خان۔ ص ۶۳۶۔ ۶۳۷)

واپسی کے راستے میں آپ عبد اللہ القلفاط سے ملاقات کے لیے جزیرہ طریف میں رکے۔ وہاں پر ان کے درمیان ایک دلچسپ بحث چل نکلی۔ سوال یہ تھا کہ شاکر غنی اور صابر فقیر میں سے کون افضل ہے۔ ابن عربی نے اپنے لیے فقر کا ہی رستہ اختیار کیا تھا۔ چناں چہ فرماتے ہیں: "میں کسی حیوان کا ہرگز مالک نہیں ہوں اور نہ ہی اس کپڑے کا، جس کو میں پہنتا ہوں۔ کیوں کہ وہ بھی میں معین شخص سے، جو مجھے اس میں تصرف کا اذن دے، بطور عاریت لے کر پہنتا ہوں۔ اور اس زمانے میں کہ جس میں کسی چیز کا مالک ہوتا ہوں، اسی وقت یا بذریعہ ہبہ کے یا بذریعہ آزاد کرنے کے، اگر وہ چیز قابل آزاد کرنے کے ہو، خارج ہو جاتا ہوں۔ یہ حال مجھے اس وقت حاصل ہوا۔ جب کہ میں نے خدا تعالیٰ کے لیے عبودیت اختصاص کے تحقق کا ارادہ کیا تھا۔ تو اس وقت مجھے کہا گیا کہ تیرے لیے یہ بات درست نہیں ہو سکتی، حتیٰ کہ تجھ پر کسی کی کوئی حجت قائم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ گر اللہ تعالیٰ چاہے، تو اس کی بھی حجت مجھ پر نہ ہو۔ تو مجھے کہا گیا کہ یہ تمہارے لیے کس طرح درست سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی حجت تم پر قائم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ دلائل اور حجج منکروں پر قائم کیے جاتے ہیں نہ کہ خدا تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرنے والوں پر دلائل اور براہین اہل دعاوی اور اصحاب حظوظ نفس و مال و متاع والوں پر قائم کیے جاتے ہیں۔ اور جو کہے کہ میرا کوئی حق نہیں ہے اور نہ اموال و متاع دنیا سے کوئی حظ و حصہ ہے، اس پر حجج و دلائل قائم نہیں کیے جاتے۔" (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۹۶)۔

ابن عربی ساری عمر فقر کے اصول پر قائم رہے، جس کا ثبوت وہ واقعہ ہے کہ جب آپ کو قونیہ کے بادشاہ کیکاؤس کی طرف سے ایک مکان بنا کر دیا گیا، جس پر ایک لاکھ درہم صرف ہوئے تھے۔ تو آپ کا قیام اس مکان میں بہت مختصر عرصے کے لیے تھا۔ کیوں کہ ایک روز آپ نے وہ مکان ایک بھکاری کو، جس نے آپ سے بھیک مانگی تھی، یہ کہہ کر دے دیا کہ میرے پاس دینے کو بس یہی ایک چیز ہے (فتوحات مکیہ۔ چہارم۔ ص ۵۶۰)

جب آپ سفر سے اپنے شہر اشبیلیہ واپس لوٹے، تو ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ آپ لکھتے ہیں: "میں نے افریقہ میں جامع تونس سے مشرق کی طرف واقع ابن مثنیٰ کے محل میں نماز عصر کے وقت ایک معین دن، جس کی تاریخ میرے پاس ہے، کچھ شعر لکھے تھے۔ پھر میں اشبیلیہ

لوٹا۔ اور دونوں شہروں کے درمیان تین مہینوں کا قافلے کا سفر حائل ہے۔ میرا ایک شخص سے ملنا ہوا، جسے میں نہیں جانتا تھا۔ اس نے اتفاقیہ طور پر بعینہٖ وہی اشعار پڑھے، جو میں نے کسی کو لکھ کر نہ بھیجے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اشعار کس کے ہیں۔ اس کہا: محمد بن العربی کے، گویا میرا نام لیا۔ میں نے پوچھا کہ اس نے انھیں کب حفظ کیا تھا۔ اس نے عین وہی تاریخ بتائی، جب میں نے انھیں منظوم کیا تھا، اگرچہ اس دوران اتنا وقت گزر چکا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس کے سامنے انھیں کس نے پڑھا تھا، کہ وہ انھیں حفظ کر سکا۔ اس نے کہا کہ میں ایک رات مشرقی اشبیلیہ میں اصحاب الطریق کی مجلس میں بیٹھا تھا، جب ایک اجنبی شخص کا، جو سیاح لگتا تھا، وہاں سے گزر ہوا۔ وہ ہمارے پاس بیٹھا اور ہم سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے یہ اشعار پڑھے، جو ہمیں بہت پسند آئے اور ہم نے انھیں محفوظ کر لیا۔ پھر ہم نے پوچھا کہ وہ اشعار کس کے ہیں۔ اس نے کہا فلاں شخص کے اور میرا نام لیا۔ پھر ہم نے کہا کہ ابن مثنیٰ کے محل کو، ہم اس ملک میں نہیں جانتے۔ اس نے کہا کہ وہ جامع تونس سے مشرق کی طرف ہے اور وہاں پر وہ اس گھڑی منظوم کیے گئے ہیں۔ میں نے انھیں اس سے محفوظ کر لیا۔ پھر وہ، ہم سے غائب ہو گیا اور ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی ہمیں پتہ ہے کہ وہ، ہم سے کیسے رخصت ہوا اور نہ ہی، ہم نے اس کے بعد اسے دیکھا ہے۔" (فتوحات مکیہ۔ جلد سوم۔ ص ۳۳۸۔ ۳۳۹)۔

سے مشرق کی طرف ہے اور وہاں پر وہ اس گھڑی منظوم کیے گئے ہیں۔ میں نے انھیں اس سے محفوظ کر لیا۔ پھر وہ، ہم سے غائب ہو گیا اور ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی ہمیں پتہ ہے کہ وہ، ہم سے کیسے رخصت ہوا اور نہ ہی، ہم نے اس کے بعد اسے دیکھا ہے۔" (فتوحات مکیہ۔ جلد سوم۔ ص ۳۳۸۔ ۳۳۹)۔

اگلے ہی سال ابن عربی پھر فاس (مراکو) میں تھے، جب الموحدون فوجیں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے اندلس بھیجی گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی کا رجحان زیادہ سے زیادہ شمالی افریقہ کی طرف ہوتا جا رہا تھا، جہاں پر آپ کو صوفیا کی صحبت ملتی تھی، جن کی قربت آپ کی اپنی روحانی ترقی کے لیے اہم تھی۔ مگر اندلس میں آپ کے والدین مقیم تھے اور دوسرے رشتہ دار رہتے تھے۔ آپ کی دو غیر شادی شدہ بہنیں تھیں۔ خود آپ کی شادی غالباً ہو چکی تھی۔ کیوں کہ آپ اپنی صالحہ بیوی مریم بنت محمد بن عبدون بن عبدالرحمان البجائی کا ذکر کرتے ہیں، جو ایک امیر کبیر کی بیٹی تھی اور آپ کی طرح طریقے پر چلنے کی متمنی تھی۔ انھوں نے خواب میں ایک انسان کو دیکھا، جسے انھوں نے کبھی زندگی میں نہ دیکھا تھا، مگر جو کشف میں انھیں نظر آیا کرتا تھا۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیا آپ الطریق پر چلنے کی خواہش مند ہیں۔ آپ نے کہا اللہ کی قسم میں ایسا کرنا چاہتی ہوں، مگر نہیں جانتی کہ اسے کیسے اختیار کروں۔ اس شخص نے جواب دیا پانچ باتوں سے توکل، یقین، صبر، عزیمت اور صدق کے ساتھ۔ ابن عربی نے خواب کو سن کر تصدیق کی کہ یہی صوفیا کا مذہب ہے (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۲۷۸)

۵۹۳ھ میں ابن عربی پھر ایک بار فاس میں تھے، جہاں پر ایک کشف میں آپ کا روحانی درجہ دکھایا گیا۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ مسجد الازہر میں، جو عین الجبل کے پہلو میں واقع ہے، آپ نے عصر کی نماز کے دوران ایک نور کو دیکھا، جو ہر چیز کو منور کر رہا تھا، جو آپ کے سامنے تھی، جب کہ آپ یہ تمیز بالکل کھو بیٹھے تھے کہ آگے کیا ہے اور پیچھے کیا۔ اور آپ کشف میں جہتوں میں فرق نہ کر سکتے تھے۔ بلکہ ایک گلوب کی طرح تھے اور جہتوں کو صرف ایک مفروضے کے طور پر نہ کہ حقیقی رنگ میں تصور کر سکتے تھے۔ اس قسم کا تجربہ آپ کو پہلے بھی ہو چکا تھا، مگر اس کی کیفیت ایسی تھی کہ آپ کو صرف سامنے کی چیزیں دکھائی دیتی تھیں، جب کہ اس کشف نے ہر طرف کی چیزوں کو ظاہر و باہر کر دیا تھا۔ (فتوحات مکیہ۔ جلد دوم۔ ص ۴۸۶)

ابن عربی ایک مصفا شیشہ کی طرح تھے، جس میں ہر چیز کا عکس پڑتا تھا اور پوشیدہ ترین حقیقتوں کو جان جاتے تھے۔ آپ کو کشف میں
المتوکلین دکھائے گئے، جو آپ کے استاد ابو محمد عبداللہ المورروری تھے۔ آپ نے کشف میں دیکھا کہ توکل کا سارا اسٹیشن ایک چکی کی طرح
ے گرد گھوم رہا ہے۔ ابن عربی نے ان سے ملاقات ہونے پر انھیں اس بارے میں بتایا تو وہ مسکرائے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ اسی طرح ابن
ھتے ہیں کہ انھیں اپنے وقت کے قطب الزمان سے بھی ملنے کی سعادت ملی۔ یہ واقعہ ۵۹۳ھ میں فاس میں پیش آیا۔ جب اہل الطریق ابن
ن کے باغ میں جمع تھے اور ان میں الاشعل القبائیلی بھی تھے، جو بجایہ کے رہنے والے تھے اور ان کا ہاتھ شل تھا۔ وہ ہر ملاقات پر صرف قرآن
رے میں بات کرتے تھے۔ اور کسی کو ان کے مقام کا علم نہ تھا۔ باتوں باتوں میں اقطاب کا ذکر ہونے لگا۔ ابن عربی نے کہا: بھائیو میں
لپنے وقت کے قطب کے بارے میں بتاؤں اور اس شخص کی طرف رخ موڑا، جس کے قطب الوقت ہونے کے بارے میں انھیں اللہ
اب میں اطلاع دی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ بات بیان کرو، جو اللہ نے تمھیں بتائی ہے مگر اس کا نام نہ لینا۔ جب مجلس ختم ہوئی، تو وہ آپ
س آیا اور اس بات کا شکریہ ادا کیا کہ ابن عربی نے اس کا راز نہ کھولا تھا۔ پھر اس نے کہا کہ اب جب کہ تمھیں اس بات کا پتہ ہے، اس
راہبهاں پر ٹھہرنا درست نہیں ہے۔ اس کے بعد ابن عربی کی اس کے ساتھ ملاقات نہیں ہوئی (فتوحات مکیہ۔ جلد چہارم۔ ص ۷۶۔ روح
ں میں ان پر علاحدہ باب موجود ہے)

۵۹۴ھ میں فاس کے مقام پر آپ پر خاتم الاولیاء کی حقیقت کھولی گئی (فتوحات مکیہ۔ جلد سوم۔ ص ۵۱۴)۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو
ر وطن جانا پڑا، جس کا سبب شاید یہ ہو کہ آپ کے والد کی وفات کے بعد، جو غالباً ۵۹۰ھ کے لگ بھگ ہوئی تھی، آپ پر گھر بار کی ذمہ
آن پڑی تھی۔ چناں چہ جب سے آپ کے خاندان نے آبائی وطن مرسیہ کو چھوڑا تھا، آپ پہلی بار وہاں پر لوٹ کر گئے، جس کا مقصد وہاں
ید اد کو ٹھکانے لگانا ہو سکتا ہے۔ البتہ راستے میں آپ نے مریہ کے مقام پر،، جہاں ابن عریف (مصنف محاسن المجالس) نے صوفیوں کے
بتی دائرہ قائم کر رکھا تھا، اپنی کتاب "مواقع النجوم" صرف گیارہ روز کے اندر تصنیف کی (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۳۳۴)۔ یہ
ھ کی بات ہے۔ جس سال مرسیہ کے مقام پر آپ کے دل میں اللہ کی طرف سے یہ بات ڈالی گئی کہ میرے بندوں کو اس کرم کے بارے
اؤ، جو میں نے تم پر کیا ہے (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۷۰۸)

"الدرۃ الفاخرہ" میں شیخ صالح العدوی کی سوانح حیات میں ابن عربی لکھتے ہیں کہ شیخ نے آپ سے آپ کی بہنوں کے بارے میں پوچھا،
ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ آپ نے بتایا کہ بڑی کی منگنی امیر ابو الاعلیٰ بن غاذون کے ساتھ ہو چکی ہے۔ مگر شیخ نے کہا کہ امیر اور ابن عربی
لد دونوں اس شادی سے پہلے وفات پا جائیں گے اور ماں اور دونوں بہنوں کی کفالت ان کے کندھوں پر آن پڑے گی۔ چناں چہ یہی ہوا
طرف سے ابن عربی پر زور ڈالا جانے لگا کہ وہ ریاست کی ملازمت اختیار کر لیں۔ بلکہ خود امیر المومنین کی طرف سے آپ کو یہی پیغام ملا،
کے لانے والے قاضی القضاۃ یعقوب ابو القاسم بن تقی تھے مگر آپ نے انکار کر دیا۔ آپ کو امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا
میر نے کہا آپ کی بہنوں کے بارے میں پوچھا اور مناسب رشتہ تلاش کر کے خود ان کی شادی کرنے کی پیش کش کی، مگر ابن عربی نے کہا
یہ کام اپنے طور پر کرنا چاہتے ہیں، امیر نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے کو ذمے دار سمجھتے ہیں۔ غالباً اس طرح وہ ابن عربی کے والد کی
ت کا صلہ دینا چاہتے تھے۔ جب ابن عربی نے بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تو امیر نے انھیں سوچ کر جواب دینے کو کہا اور اپنے دربان کو

ہو کر گھر لوٹے، تو امیر کا ایلچی امیر کا پیغام لے کر پہنچ گیا، جس میں امیر نے اپنی پیش کش کو دوہرایا تھا۔ آپ نے ایلچی کا شکریہ ادا کیا، اور اسی روز اپنے خاندان سمیت فاس کے لیے روانہ ہوگئے۔ امیر نے چند دنوں کے بعد آپ کے بارے میں پوچھا، تو بتایا گیا کہ آپ فاس کوچ کر گئے ہیں۔ دونوں بہنوں کی شادی آپ نے وہاں پر کر دی اور اس طرف سے فارغ ہو کر اپنی دیرینہ خواہش مکہ کی زیارت کے بارے میں سوچنے لگے۔ آپ کی والدہ کا غالباً ان ہی دنوں میں انتقال ہوا، کیوں کہ آپ لکھتے ہیں کہ انھوں نے بیوگی کے سات سال دیکھے۔ آپ کا ارادہ عرصے سے مشرق کی طرف کوچ کر جانے کا تھا، مگر ماں اور بہنوں کا ذمے داری کے سبب اس کو ملتوی کرتے رہے۔ مغرب آپ جیسے عبقری انسان کے لیے بہت محدود تھا۔ اور آپ کو نظر آرہا تھا کہ جب تک آپ کی پزیرائی مشرق میں نہیں ہوگی، اس وقت تک آپ کا مشن دنیائے اسلام کے اندر نہ پھیل سکے گا۔

مغرب میں یوں بھی صوفیا کے خلاف بہت کچھ زہر پھیل چکا تھا۔ ان کے سیاسیات میں حصہ لینے کے نتیجے میں حکومتیں ان کا قلع قمع کرنے کو پھرتی تھیں۔ ابن عربی نے اشبیلیہ کو جس طرح خاموشی کے ساتھ چھوڑا تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حکمرانوں کے ساتھ تعلق توڑ چکے تھے۔ ایک اور واقعے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ "روح القدس" میں ابو محمد عبداللہ بن ابراہیم الملقی الفخار کے تذکرے میں آپ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ایک بار سلطان ابوالعلی نے آپ کے لیے اور آپ کے ساتھیوں کے لیے دو روز تک کھانا بھجوایا تھا، جس میں سے آپ نے کچھ نہ کھایا، بلکہ جب پوچھا گیا، تو کہا کہ آپ اس کھانے کو جائز نہیں سمجھتے، کیوں کہ وہ حرام کا کھانا ہے۔ یہ بات مقامی لوگوں نے بہت سنگین جانی اور صوفیا کو خطرہ پیدا ہوا کہ شاید سلطان ان کے خلاف کوئی اقدام اٹھائے گا۔ بعد میں آپ کو ابن الطریف نے کہا کہ ایسا سخت رد عمل نہ دکھایا جاتا تو بہتر ہوتا آپ نے جواب دیا کہ یہ بات اتنی دیر تک ممکن ہے، جب تک انسان کا راس المال، یعنی دین محفوظ رہے (فتوحات مکیہ۔ جلد چہارم۔ ص ۵۴۰)۔

قربت الٰہی کا مقام آپ کو ۵۹۷ھ کے ماہ محرم میں ایک سفر کے دوران ملا۔ جہاں ایک طرف آپ کو اس انعام کی خوشی تھی، وہاں پر دوسری طرف آپ اس مقام میں اپنی تنہائی کو دیکھ کر ڈر گئے۔ آپ کو یاد آیا کہ ابو یزید اس مقام میں مسکینی اور فقر کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور کسی کو وہاں پر نہ پایا تھا۔ آپ نے سوچا کہ اس مقام کو اپنا وطن بنانا ہے، تو وحشت کیسی۔ آخر وطن کے ساتھ ہر کسی کو محبت ہوتی ہے۔ اور وحشت تو بے وطنی سے مخصوص ہے۔ "جب میں اس مقام میں داخل ہو گیا اور اس میں اپنے آپ کو اکیلا پایا، اور میں نے سمجھ لیا کہ اگر کسی کو میرا اس میں ہونے کا پتہ چلے، تو وہ اس کو نہیں جان پائے گا تب میں نے اس کے پہلوؤں اور خصوصیات کی دریافت شروع کی۔ اور اگرچہ میں اس میں تھا اور اللہ کے اس سے مخصوص کردہ انعامات کو دیکھتا تھا، مجھے پتا نہیں تھا کہ اس مقام کا نام کیا ہے۔ میں حق تعالیٰ کے اوامر کو اپنے پر تواتر سے نازل ہوتے ہوئے اور اس کے سفیروں کو اترتے اور مجھ سے مؤانست کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔" آپ اس حیرت کے عالم میں تھے کہ آپ کی ملاقات انحال کے مقام پر ایک صوفی سے ہوئی اور آپ نے عصر کی نماز جامع مسجد میں پڑھی۔ جہاں پر امیر ابو یحییٰ بن واجتن آن ملے، جن کے ساتھ آپ کی دوستی تھی۔ انھوں نے آپ کو اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی۔ مگر آپ ان کے کاتب (سیکرٹری) کے ہاں ٹھہرے، جن کے ساتھ آپ کی موانست تھی۔ آپ نے ان کے سامنے اپنے اکلاپے کی شکایت کی ایک ایسے مقام پر ہوتے ہوئے، جس میں آپ بہت خوش تھے۔ اور جب کہ وہ آپ کی ڈھارس بندھا رہے تھے، آپ نے ایک شخص کا سایہ دیکھا اور آپ اس کی طرف اٹھے کہ شاید آپ کو اس کے ذریعے مسرت ملے۔ اس نے آپ سے معانقہ کیا۔ آپ نے غور سے دیکھا، تو وہ ابو عبدالرحمان السلمی تھے، جن کی روح کو جسم دے کر اللہ نے آپ پر

س کھاتے ہوئے آپ کی طرف بھیجا تھا۔ "میں نے کہا کہ میں آپ کو اس مقام میں دیکھ رہا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے یہ مقام پایا . اسی میں میری موت ہوئی۔ میں اس میں ہوں اور اس میں رہوں گا۔ میں نے ان سے اس میں اپنی سراسیمگی اور دوستوں کی عدم موجودگی کا . کیا۔ انھوں نے کہا کہ اجنبی پریشان ہو جاتا ہے۔ اب جب کہ اس مقام کو پانے میں تم پر عنایت الہیٰ ہو چکی ہے، تمھیں اللہ کا شکر ادا کرنا ہ۔ اور میرے بھائی، کس کو بھلا یہ مقام ملتا ہے۔ کیا تمھیں یہ بات نہیں بھاتی کہ اس مقام میں خضر تمھارے ساتھی ہوں۔ " (فتوحات مکیہ۔ ردوم۔ ص ۱۶۱)۔

ابن عربی عرش الہیٰ کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنے ایک کشف کا حال بیان کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں آپ کی زندگی کا ایک نیا ق اٹھا گیا۔ "جان لو کہ اللہ نے عرش کو نورانی ستونوں پر، جن کی ماہیت کو میں نہیں جانتا، کھڑا کیا ہے۔ البتہ میں نے ان کو دیکھا ہے۔ اور ، کا نور بجلی سے مشابہہ ہے۔ اور ساتھ ہی میں نے اس کا سایہ دیکھا، جس میں بے مقدار راحت ہے۔ اور وہ سایہ اس عرش کے مقعر کا سایہ ، جو اس پر مستویٰ کے نور، یعنی الرحمان ہے، کو چھپاتا ہے۔ اور میں نے ایک خزانے کو عرش کے نیچے دیکھا، جس میں سے یہ الفاظ نکلے: ل ولاقوة الا باللہ العلی العظیم۔ اور یہ خزانہ آدمؑ تھے، جن پر اللہ کی صلوات ہوں۔ اور میں نے اس کے نیچے بہت سے دوسرے خزانے دیکھے، ن کو میں پہچانتا تھا۔ اور میں نے خوب صورت پرندوں کو اس کے اطراف میں اڑتے ہوئے دیکھا۔ اس کے خوب صورت ترین پرندوں ں سے ایک کو میں نے دیکھا، اس نے مجھے سلام کیا، جس سے مجھے کہا گیا کہ اس کو اپنا ساتھی بنا کر مشرقی ممالک کو جاؤں۔ جب مجھ پر یہ ساری ت کھولی گئی، اس وقت میں مراکش کے شہر میں تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ کہا گیا کہ اس کا نام محمد الحصار ہے اور وہ فاس شہر میں ہے ں نے اللہ سے مشرقی بلاد کے سفر کی درخواست کی تھی، اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں نے کہا: حکم سر آنکھوں پر۔ میں نے اس سے کہا کہ اللہ نے چاہا تو عین وہی پرندہ میرا ساتھی ہو گا۔ جب میں فاس شہر میں آیا، تو میں نے اس کے بارے میں پوچھ بھیجا۔ وہ میرے پاس آیا۔ میں نے پوچھا . کیا اس نے اللہ سے کسی چیز کے بارے میں درخواست کر رکھی تھی۔ اس نے کہا: ہاں، میں نے کہا تھا کہ مجھے بلاد مشرق پہنچایا جائے۔ اس پر ے کہا گیا کہ فلاں شخص تمھیں ساتھ لے جائے گا، اور میں تمھارا اس وقت سے انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کو ۵۹۷ھ میں اپنا ساتھی بنایا اور سے دیار مصر تک لے کر گیا، جہاں پر اس نے وفات پائی، اللہ اس پر رحم کرے " (فتوحات مکیہ۔ جلد دوم۔ ص ۴۳۶)

۵۹۷ھ کے ماہ رمضان میں ابن عربی اپنے ساتھی محمد الحصار کی معیت میں بجایہ میں داخل ہوئے۔ اسی سال آپ کے شیخ ابو النجاء عروف بہ ابن مدین نے، جو اس شہر کے باسی تھے، وفات پائی۔ "عنوان الدرایہ" میں ابن عربی کے اپنے الفاظ میں ایک خواب کو اس طرح ان کیا گیا ہے: میں نے ایک رات دیکھا کہ میں نے آسمان کے تمام نجوم کے ساتھ نکاح کیا ہے، اور ان میں سے کوئی ستارہ باقی نہ بچا، جس ے ساتھ میں نے بے حد لذت روحانی کے ساتھ نکاح نہ کیا ہو۔ جب میں اس سے فارغ ہوا، تو مجھے حروف عطا کیے گئے، ان کے ساتھ بھی میں نے ح کیا۔ میں نے اپنی یہ رویا ایک شخص کو سنائی، جس نے اس کو ایسے شخص کے سامنے پیش کیا، جو رویا شناس اور ان کی تعبیر کا ماہر تھا۔ اور ں نے اس شخص سے کہہ دیا تھا، جس نے رویا کو پیش کرنا تھا کہ میرا ذکر نہ کرے۔ جب اس نے رویا کو پیش کیا، تو وہ بہت مرعوب ہوا۔ ں نے کہا کہ یہ ایسا سمندر ہے، جس کی گہرائی کو کوئی نہیں جان سکتا۔ اس رویا کے دیکھنے والے پر اوپر والے علوم کھولے گئے ہیں اور علوم رار اور ستاروں کے خواص۔ جس میں اس کے زمانے کا کوئی شخص شریک نہیں ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ رہا، پھر اس نے کہا کہ اگر : شخص اس شہر میں ہے، تو وہ نوجوان اندلسی ہی ہو سکتا ہے، جو یہاں پر آیا ہے (بحوالہ فتوحات مکیہ۔ جلد چہارم۔ ص ۵۵۹۔ سوانح حیات)

بجایہ سے آپ ۵۹۸ھ کو تونس پہنچے، جہاں پر آپ اپنے دوست ابو محمد عبد العزیز بن ابو بکر القریشی المہدوی کے ہاں ٹھہرے، وہاں پر آپ نے آٹھ سال کے اپنے قیام کے دوران دوست کی فرمائش پر اپنی کتاب "روح القدس" رقم کی تھی۔ اس دفعہ بھی آپ نے وہاں پر ایک کتاب "انشاء الدوایر" لکھنی شروع کی، جو آگے سفر پر روانہ ہوجانے کے سبب مکمل نہ کی جا سکی۔ اس کی تکمیل بعد میں مکہ میں ہوئی۔ تونس کی یادگار ایک اور واقعہ بھی ہے، جس کا تعلق آپ کی روحانی ترقی سے ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ جب میں اس منزل (منزل زمین کشادہ) میں داخل ہوا، تو میں اس وقت تونس میں تھا، مجھ سے ایسی چیخ نکلی، جس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ مجھ سے یہ امر وقوع میں آیا تھا۔ سوائے اس کے کہ جس کسی نے وہ چیخ مجھ سے سنی، وہ سب گر کر بے ہوش ہوگئے اور پڑوس کی عورتیں، جو چھت کی سطح پر سے، ہم کو دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے بعض گھر کے صحن میں گر گئیں اور باوجود بلندی کے ان میں سے کسی کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ ان سب سے پہلے جو ہوش میں آیا، وہ میں ہی تھا۔ اس وقت ہم ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ وہاں جس کسی کو میں نے دیکھا، وہ سب بے ہوش تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ ہوش میں آئے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کو کیا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو کیا ہوا تھا کہ آپ نے ایک ایسی چیخ ماری، جس کا اثر آپ اس جماعت میں دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا، خدا کی قسم مجھے اس بات کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ میں نے ایسی چیخ ماری تھی۔" (فتوحات مکیہ - جلد اول - ص ۱۶۳)۔

تونس سے آپ اپنے ساتھی محمد الحصار سمیت مصر پہنچے، جو وہاں پر وفات پا گئے۔ آپ کی منزل مکہ تھی، جہاں پر آپ القدس (یروشلم) سے ہوتے ہوئے ۵۹۹ھ میں وارد ہوئے۔ مکہ آپ کے نزدیک عالم الغیب اور عالم الشہود کا مقام اتصال ہے اور یہیں پر آپ نے اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" کی تصنیف کی بنیاد ۵۹۹ھ میں رکھی، جس کی تکمیل ۶۲۷ھ میں جا کر ہوئی۔ بلکہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد بھی ۶۳۵ھ تک اس میں اضافہ کیا جاتا رہا، جب ابن عربی نے اس کی دوسری نوشت اپنے ہاتھ سے تیار کی۔ یہاں پر یہ امر ملحوظ رہے کہ لفظ فتح کے عربی زبان میں کئی معنی ہیں۔ اردو میں عام طور سے اس لفظ سے جنگ میں جیتنا مراد لیا جاتا ہے جب کہ عربی میں فتح کے معنی کھولنے اور راز افشا کرنے کے بھی ہیں۔ "فتوحات مکیہ"، جس کا پورا عنوان "فتوحات مکیہ فی معرفہ الاسرار المالکیہ والملکیہ" ہے، سے مراد مکہ کو فتح کرنا نہیں ہے، بلکہ مکہ کے سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھانا اور اس کے روحانی خزائن تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ یہ کتاب ابن عربی کا Opus Magnus ہے، جس کو آپ نے اپنے عزیز دوست اور تیئیس برسوں کے خادم عبد اللہ بدر حبشی یمنی کے نام معنون کیا۔ یہ شخص، جو ابو الغنائم ابن ابو الفتوح معزانی کا آزاد کردہ غلام تھا، کئی ایک مشہور صوفیا کا خادم رہ چکا تھا۔ ابن عربی اس کے بے حد مداح تھے اور آپ نے اس کا تذکرہ اپنی کتاب "روح القدس" میں علاحدہ طور پر بھی کیا ہے۔

ابن عربی بار بار اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنی تصانیف میں کچھ بھی اپنی طرف سے نہیں لکھتے، بلکہ وہ چیزیں آپ کے دل میں الہامی طور پر ڈالی جاتی ہیں۔ "فہرست المؤلفات" میں وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ میں نے دوسرے مصنفین کی طرح کوئی چیز نہیں لکھی۔ اگر لکھتا ہوں تو محض اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس لاوے سے، جو مجھ پر اللہ کی طرف سے بہتا ہے اور قریب ہوتا ہے کہ مجھے بھون ڈالے۔ "فتوحات مکیہ" کے ابواب کی ترتیب بھی الہامی ہے۔ مگر وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ان کی کتاب قرآن کی طرح وحی الہیٰ ہے۔ البتہ اس کتاب کے مضامین اور اس میں بیان ہونے والے نکات مصنف کی غیر معمولی تخلیقی قوت کا پتہ دیتے ہیں۔ ۵۶۰ ابواب میں تقسیم شدہ کتاب کے اندر زمین اور آسمان کے درمیان پائی جانے والی کون کون سی چیزیں نہیں بیان ہوئیں، جن کی طرف شاید و بایدہی کسی دوسرے مصنف کی نظر گئی ہو۔

ماری حیرت زدگی سے منہ کھولے ابن عربی کی دنیا میں داخل ہوتا ہے، جس میں حجراسود باتیں کرتا ہے، بلکہ ایک موقع پر کعبہ اپر کو اٹھتا ہے ور ابن عربی کو اپنی جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ ان کا کلمہ شہادت ایک لڑی کی طرح پرو دیا جاتا ہے اور حجراسود کے اندر جگہ پاتا ہے، جس کے یے ایک طاق پیدا ہوجاتا ہے۔ پھر ابن عربی کی ملاقات طواف کے دوران ایک فرشتے سے ہوتی ہے، جو نہ زندہ تھا، نہ مردہ، وہ بہ یک وقت رکب اور بسیط اور محاط اور محیط تھا۔ جو بغیر رمز کے کلام نہیں کرتا تھا، جس کو فصحا کی فصاحت اور بلغا کی بلاغت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہر سوال کا جواب اس پر لکھا ہوا ملتا تھا، کیوں کہ وہ نہ متکلم تھا اور نہ کلیم۔ اس کا علم اس سے علاحدہ نہیں تھا، نہ ہی اس کی ذات اس کے اسما سے غیر تھی۔ وہ علم تھا اور معلوم اور علیم۔ وہ ابن عربی کو دعوت دیتا ہے اس کی پیدائش کے اسرار کو اخذ کرکے اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" میں لکھنے لی۔ یہ کتاب ایسی ہے کہ انسان اس کو عادی زمرہ بندی کے کسی بھی سسٹم میں نہیں لاسکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کے مضامین کا حاطہ نہیں کیا جاسکا۔ عبدالوہاب الشعرانی (المتوفی ۹۷۳ھ) نے "فتوحات مکیہ" کا خلاصہ "لواقح الانوار القدسیہ المنتقاۃ من الفتوحات المکیہ" کیا پھر اس خلاصے کا خلاصہ بعنوان "الکبریت الاحمر من علوم الشیخ الاکبر" پیش کیا ہے۔

مکہ میں ابن عربی کا پہلا قیام دو برس کا تھا۔ جس کے دوران وہاں کے علمی اور مذہبی حلقوں میں آپ کی وجہ سے ایک غیر معمولی ہلچل پیدا ہوئی۔ آپ کی تصنیفی سرگرمیوں کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے اس دوران میں اپنی کتاب "روح القدس" کے مسودے لو مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ تین دوسری کتابیں ("مشکواۃ الانوار"، "حلیہ الابدال"، اور "تاج الرسائل") تحریر کیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آپ نے "فتوحات مکیہ" پر کام شروع کیا، جس کے ۵۶۰ ابواب کی فہرست ابتدائے کار میں ہی تیار کرلی گئی تھی۔ مصنف کو اندازہ تھا کہ یہ کام ایک پوری عمر کا متقاضی تھا۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ آپ کے لکھنے کی رفتار فی روز تین جزو تھی۔ جس میں آپ سفر یا حضر میں کبھی ناغہ نہ کرتے تھے۔ آپ نے اپنی تصنیفات کی تعداد ۲۵۱ دی ہے، جب کہ عثمان یحییٰ کی ببلیوگرافی میں آپ کی ۸۴۶ کتابوں کے عنوان درج کیے گئے ہیں۔

آپ بلند پائے کے شاعر بھی تھے۔ مکہ میں آپ کی شاعری اپنے نقطہ عروج پر پہنچی، جہاں پر آپ کا دوستانہ تعلق ابو شجاع ظاہر بن رستم بن ابو رجاالاصفہانی اور ان کے خاندان کے ساتھ تھا، جس کی ایک نوخیز لڑکی نظام عین الشمس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ آپ کی شاعری کی روح بنی۔ خود آپ نے اپنے دیوان "ترجمان الاشواق" میں نظام کا ذکر تعریفی رنگ میں کیا ہے۔ مگر بعد میں جب آپ پر مخالفوں نے عاشقانہ شاعری کرنے کا الزام لگایا، تو آپ نے اس کا رد کرنے کے لیے اس دیوان کی شرح ("ذخائر الاعلاق") لکھی، جس میں ثابت کیا کہ آپ کے اشعار تصوف کے مروجہ طریق سے ذرہ بھر ہٹ کر نہیں ہیں۔

ابن عربی کو مکہ میں کشفی طور پر خاتم الاولیا ہونے کی خوش خبری سنائی گئی، جب کہ اس سے پہلے آپ کو ۵۹۴ھ میں فاس میں صرف اس مقام کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ چناں چہ آپ لکھتے ہیں: "میں نے اس قسم کا خواب خود دیکھا اور اسے اللہ کی طرف سے بشارت جانا، کیوں کہ وہ حدیث نبوی سے مطابقت رکھتا تھا، جس میں رسول اللہ صلعم نے اپنی مثال دوسرے انبیاء سے دی تھی۔ حضور صلعم نے فرمایا میری مثال انبیاء میں ایسی ہے، جیسے کوئی شخص دیوار بنائے، مگر ایک اینٹ کی اس میں کسر چھوڑ دے۔ اور میں وہ اینٹ ہوں۔ چناں چہ میرے بعد کوئی رسول نہیں ہے اور نہ نبی۔ اس طرح حضور صلعم نے نبوت کو دیوار سے تشبیہ دی ہے اور انبیاء کو اینٹوں سے، جن سے وہ دیوار کھڑی کی جاتی ہے۔ اور یہ تشبیہہ انتہائی خوب صورت ہے۔ کیوں کہ یہاں پر دیوار مشار الیہ ہے، جس کا ظہور اینٹوں کے بغیر ممکن نہیں۔ چناں چہ

حضور صلعم خاتم النبیین تھے۔ میں ۵۹۹ھ میں مکہ میں تھا، جب میں نے جیسے خواب میں کعبہ کو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنا ہوا دیکھا، جس میں ایک ایک اینٹ سونے کی اور ایک ایک چاندی کی تھی۔ اور عمارت مکمل ہو چکی تھی اور کوئی کسر باقی نہ تھی۔ جب کہ میں اس کی طرف اور اس کے حسن کی طرف دیکھ رہا تھا، میں نے اپنے رخ کو رکن الیمانی اور الشامی کے درمیانی طرف موڑا، جب کہ رکن الشامی قریب تر تھا، تو میں نے دیکھا کہ دو اینٹیں، سونے اور چاندی کی، دیوار میں موجود نہ تھیں۔ ایک اوپر والی قطار میں سونے کی اینٹ نہ تھی اور اس کے ساتھ والی قطار میں چاندی کی اینٹ کم تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ مجھے ان دونوں اینٹوں کی جگہ پر لگا دیا گیا۔ اس طرح میں عین وہی دو اینٹیں تھا اور دیوار مکمل ہو گئی اور کعبہ میں کوئی نقص نہ رہ گیا۔ اور میں کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا اور مجھے علم تھا کہ میں کھڑا ہوں اور مجھے پتہ تھا کہ میں عین وہ دو اینٹیں ہوں۔ مجھے اس بارے میں شک نہیں تھا کہ وہ دونوں عین میری ذات تھیں۔ اور میں بیدار ہو گیا اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اور میں نے سوچا کہ میں اپنی صنف کے اتباع میں رسول اللہ صلعم کی طرح ہوں، جیسے آپ انبیاء علیہم السلام میں تھے۔ اور ممکن ہے کہ میں وہ ہوں جس پر اللہ ولایت کو ختم کرے گا۔ اور یہ چیز اللہ پر مشکل نہیں ہے۔" (فتوحات مکیہ۔ جلد اول۔ ص ۳۱۸۔ ۳۱۹)۔

ابن عربی ۶۰۱ھ میں مکہ سے روانہ ہو کر بغداد، موصل اور دوسرے شہروں سے ہوتے ہوئے ۶۰۳ھ میں قاہرہ پہنچے، جہاں پر آپ پر ارتداد کا الزام لگایا گیا مگر ایوبی حاکم الملک العادل نے آپ کی جان بچائی۔ ۶۰۴ھ میں آپ پھر مکہ میں وارد ہوئے اور ایک سال تک وہاں پر قیام کیا۔ اس کے بعد آپ ایشیاء کوچک چلے گئے، جہاں سے ۶۰۷ھ میں قونیا پہنچے۔ جہاں پر سلطان کیکاؤس نے آپ کا ولولے کے ساتھ استقبال کیا اور آپ کی رہائش کے لیے ایک مکان بنوایا، جسے آپ نے بعد میں ایک بھکاری کو دے دیا۔ قونیا میں آپ کی آمد مشرقی تصوف میں ایک انقلاب کا پیش خیمہ بنی۔ جس کا وسیلہ آپ کے شاگرد اور سوتیلے بھائی صدر الدین قونوی بنے، جن کی ماں سے آپ کی شادی ہوئی۔ صدر الدین قونوی، جو آگے چل کر تصوف کے علائم میں شمار ہوئے، مولانا جلال الدین رومی کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ آپ نے ابن عربی کی کتاب "فصوص الحکم" پر شرح لکھی، جو آج تک حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔ وہاں سے آپ بغداد تشریف لے گئے، وہاں پر یا جیسے دوسری روایات میں آتا ہے، مکہ میں آپ کی ملاقات شیخ شہاب الدین عمر بن محمد السہروردی سے ہوئی۔ دونوں دیر تک بغیر کچھ کہے ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے رہے، پھر جدا ہو گئے۔ جب بعد میں شیخ شہاب الدین سے پوچھا گیا کہ آپ نے شیخ محی الدین کو کیسا پایا، تو انھوں نے کہا "میں نے انھیں ایک سمندر کی طرح پایا، جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔" ابن عربی کی رائے شیخ شہاب الدین کے بارے میں یہ تھی "میں نے انھیں ایک عبد صالح پایا" (مناقب ابن عربی۔ ص ۲۹)۔

اسی سال کی بات ہے کہ امیر اشبیلیہ نے بہت بڑی رقم مکہ بھیجی اور اپنے نمائندے کو ہدایت کی کہ اس مال کو سوائے اس سرزمین کے رہنے والوں کے اور کسی کو نہ دیا جائے۔ اتفاق ایسا تھا کہ اس سال مکہ میں مشائخ، علماء، فقہاء اور ہر فن علم کے ماہرین جمع تھے، جیسا دیر دیر تک نہیں ہوتا تھا۔ سب نے ابن عربی کے بارے میں اجماع کیا کہ ان کے سوا کوئی دوسرا مال تقسیم نہیں کرے گا۔ آپ جب اس سے فارغ ہوئے تو فرمایا: اگر اجماع توڑنے کا خطرہ نہ ہوتا، تو میں اس چیز سے باز رہتا۔ جب وجہ پوچھی گئی تو جواب دیا: اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود نہ تھی، بلکہ تفاخر۔ صاحب مغرب نے میرے سامنے تمام ملوک پر فخر کرنا چاہا تھا کیوں کہ اسے علم تھا کہ میرے سوا کوئی دوسرا اس مال کو تقسیم نہیں کرے گا۔ یہ بات اشبیلیہ پہنچی تو امیر رو دیا۔ اس نے کہا: شیخ نے درست فرمایا، یہی میرا ارادہ تھا (مناقب ابن عربی۔ ص ۳۳۔ ۳۴)

(باقی ص ۲۹ پر)

ڈاکٹر محمد علی اثر

سید محمد غوث غوثی
دکنی کا ایک قادر الکلام سخن ور

غوثی دکنی اردو کا ایک قادر الکلام اور پر گو سخن ور ہے، جس کی تصانیف میں قصص الانبیا کے موضوع پر زائد از ساڑھے بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ایک ضخیم مثنوی کے علاوہ مناقب شیخ عبد القادر جیلانی کے موضوع پر "ریاض غوثیہ" اور "غوثیہ" کے نام سے دو منظومات، "ضیافت نامہ، حضرت محمدؐ" کے زیر عنوان ایک قصیدہ اور قدیم اردو نثر میں پارہ عم کی تفسیر (تفسیر غوثی) کا پتہ چلتا ہے۔

غوثی کا تذکرہ سب سے پہلے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "مدراس میں اردو" میں کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "شاہ غوثی ارکاٹ کے باشندے صوفی منش آدمی تھے۔ ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا" (۱) کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست میں "ریاض غوثیہ" کے مصنف کی حیثیت سے غوثی کا تعارف کرواتے ہوئے انھوں نے اطلاع دی ہے کہ "شاہ غوثی حیدر آباد کے شاعر ہیں" (۲)۔ اور پھر جب انھوں نے کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ سنٹرل لائبریری) کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کی تو غوثی کی اسی مثنوی کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شاہ غوثی کو بیجاپور سے تعلق تھا" (۳)۔

غوثی کے وطن کے بارے میں مولوی نصیر الدین ہاشمی کے مذکورہ تینوں بیانات متضاد ہیں۔ ایک میں انھوں نے غوثی کو ارکاٹ کا باشندہ بتایا ہے۔ دوسرے میں حیدر آباد کا متوطن لکھا ہے اور تیسرے میں ان کا تعلق بیجاپور سے بتایا ہے (۴)۔

نصیر الدین ہاشمی، غوثی کے مکمل نام سے بھی ناواقف تھے۔ اسی لیے انھوں نے کہیں شاعر کا نام شاہ غوثی لکھا ہے اور کہیں غوث جانی۔ ہاشمی صاحب کی تقلید میں ڈاکٹر زور (۵)، ڈاکٹر افضل اقبال (۶) اور کاوش بدری (۷) نے بھی غوثی کا نام شاہ غوثی یا غوث جانی تحریر کیا ہے۔

غوثی تخلص کے درج ذیل پانچ شاعروں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ غوثی: غلام حسین، محمد عتیق اللہ ملقب ابن محمد امام قادری مرید و خلیفہ شاہ احمد اللہ قادری۔
مصنف "فوائد المعرفت بد رحمانی" (۱۲۳۱ھ)۔ مترجم "شبہات ابن حجر" (۸)

۲۔ غوثی: فخر الدین گجراتی۔ احمد آباد کے مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے (۹)۔

۳۔ غوثی: محمد غوث ابن قطب الدین قاضی، حیدر آبادی (۱۰)۔

۴۔ غوثی: میر احسن اللہ (۱۱) چنگل پیٹی۔ مصنف "شہادت جنگ سلطانی" (۱۲۱۶ھ) (۱۲)۔

۵۔ غوثی: سید محمد غوث قادری المعروف بہ غوث جانی۔ ابن افصحی آرکاٹی، شاگرد و مرید حضرت سرہ اللہ الترجانی بغدادی متوفی ۱۱۷۱ھ) (۱۳)۔

آخر الذکر دونوں شعرا ہم عصر ہیں اور ان کی زبان و بیان میں بھی بڑی حد تک یکسانیت نظر آتی ہے۔ اس لیے غوثی آرکاٹی سے پہلے یہاں غوثی چنگل پیٹی کا سرسری تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر آمنہ خاتون میر احسن اللہ غوثی چنگل پیٹ کا رہنے والا تھا جو

مدراس کے جنوب مغرب میں چھتیس میل کے فاصلے پر واقع ہے (۱۴)۔ مثنوی شہادت جنگ سلطانی کے درج ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ خوشی چنگل پیٹی کو "شاہ محمد علی" نے "راہ ہدایت" دکھائی اور "ملا شریف اور" بندے علی شاہ" نے بالترتیب اسے صرف و نحو اور تصوف کی تعلیم دی:

مرے تھے شاہ استاد محمد علی　　کروں کیا میں تعریف بے شک ولی
تھے محمود بندر میں ملاں شریف　　فضیلت سزاوار تھی ان کے تئیں (۱۵)

....

کتب نحو و تصریف تصنیف کی　　عجب فیض ان کا جو تعریف کی (۱۶)

....

اتھے ایک درویش عالی مقام　　شب و روز تھا فقر وفاقے سے کام
تھا بندے علی شاہ مشہور نام　　شب و روز حاضر تھا خوشی غلام (۱۷)

خوشی چنگل پیٹی نے یہ مثنوی اپنے ایک دوست محمد غفور ویلوری کی فرمائش پر تصنیف کی تھی:

کہے دوست میرے مجھ تھے شتاب　　کہو جنگ شاہ کا، بناؤ کتاب
رہن ہار ایلور مشہور تر　　محمد غفور اسم ان کا گھر (۱۸)

"شہادت جنگ سلطانی" ۱۷۵۰/ ابیات پر مشتمل ہے۔ شاعر نے اس مثنوی کو پچیس داستانوں میں منقسم کرکے ہر داستان کی سرخی کے طور ایک ہم قافیہ شعر (مطلع) لکھا ہے۔ جس کی بحر مثنوی کی بحر سے مختلف ہے۔ درج ذیل اشعار سے مثنوی کی تاریخ تصنیف اور تعداد اشعار کا۔ چلتا ہے:

ہزار ایک دو سو بھی سولا میں سال　　مرتب کیا ماہِ رجب کمال
کیا داستاں جب کتاب پچ بیس　　کیا بیت چھ سو پنجاہ پچیس (۱۹)

راقم الحروف کے خیال میں میر احسن اللہ خوشی اور سید محمد غوث خوشی دو علاحدہ شخصیتیں ہیں۔ سید محمد خوشی مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری کے رفقائے خاص میں شمار ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باقر آگاہ کی متعدد تصانیف کے آخر میں ان کی تاریخی نظمیں اور قصیدے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو منظومات کی سرخیاں ملاحظہ ہوں:

۱۔ قصیدہ در تعریف "حسرت عشق" (باقر آگاہ) از سید محمد غوث خوشی (۲۰)

۲۔ تاریخ "حیرت عشق" (باقر آگاہ) از سید محمد غوث خوشی (۲۱)

مندرجہ بالا شواہد کی روشنی میں خوشی کا پورا نام سید محمد غوث قرار پاتا ہے۔ جہاں تک خوشی کے وطن کا تعلق ہے اس کے کلام اندرونی شہادتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ وہ محمد پور (ارکاٹ) کا باشندہ تھا اور غالباً اپنے مرشد حضرت سراللہ الترجاہی کے نام کی مناسبت سے غوث جاہی کے نام سے مشہور تھا۔

محمد پور کا غوثی رہن ہار کتے ارکاٹ جس بلدے کو اظہار
تخلص جس کا غوثی ہے مذکور (؟) وطے ہے غوث جاں نام مشہور (۲۲)

غوثی کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے والد افصحی تخلص کرتے تھے اور انھوں نے "نوبہار" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی:.

باپ کا سن نام مج اب اے عزیز فاتحہ پڑ گر ہے تج میں (کچ) تمیز
افصحی مج باپ ہے ، ہو میں غلام جس فضیلت کا تھا دکھن بیچ نام
طبع کا تھا جس کی ایسا کچ عروج روح بی واں لگ نہ پونچ کر خروج
گرکرے پھلبن میں او سحرِ حلال عندلیب ہوگنگ بھولے قیل و قال
شعر اس کا سلک جہاں کا ہے درر آبرو کھویا ہے جس کے گن گہر
اوکھلایا ہے اچنبا " نو بہار " عاشقاں قرباں ہیں جس پر نت ہزار (۲۳)

، چل کر وہ یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ اس کے والد ہاشم پیر کے نواسے تھے اور وہ یادِ حق، سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہیں تھے۔ رحم دلی اور
سومیت ان کے اوصاف تھے:

خلق خوش سوں بحر ہو پھل نیر کا تھا نواسہ اب سو ہاشم پیر کا
یادِ حق سوں تھا نہ غافل ایک تل تھی صفت معصوم کی ہور رحم دل (۲۴) .

افصحی بیجاپوری کے نانا حضرت ہاشم حسینی علوی معروف بہ ہاشم پیر محمد ابراہیم عادل شاہ اور محمد عادل شاہ کے مرشد اور وجیہہ الدین
ں گجراتی کے برادرزادہ تھے (۲۵)۔ افصحی بیجاپوری کی تصنیف "نوبہار" نایاب ہے لیکن ان کی ایک اور مثنوی " وفات نامہ مخفی " کا پتہ
ہے، جس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ کی زینت ہے (۲۶) اس مثنوی میں بھی ہاشم پیر کا ذکر ملتا ہے:

پیا سو کون ہاشم پیر تیرا سوکے دل کے چمن کوں نیر میرا (۲۷)

ں نے غزلیں اور مرثیے (۲۸) بھی لکھے ہیں۔ درجِ ذیل غزل کے چند اشعار سے ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

جو سندر صبح کو آکر مجھے کیری اپڑ نکلے لیاؤ مکھ سرج کو ہے جو تس آنگے سحر نکلے
یہ البیلی نکل آنے ، دوجگ سدبد بھلائی ہے نہ جانو حب کہ کیا ہوئے کہیں سندر سلور نکلے
اگر پڑ علم نیہ مجنوں ہوا ہے افصحی سب تم بنسومت ، عشق مکتب میں گیا سو بےخبر نکلے (۲۹)

ج ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ غوثی کے والد افصحی نے "ریاضِ غوثیہ" کی تصنیف (۱۱۶۹ھ) سے چار سال قبل یعنی ۱۱۶۵ھ میں وفات
:

جب کہ او اس عالمِ فانی میں تھا دل مرا غفلت کے حب بالی میں تھا
واقعہ ہو اس کا گزرتے چار سال پن ہوانئیں کم مرا ہرگز ملال
آہ مج بابا کا جب تک جان تھا گھر مرا گوہر کا گویا کان تھا

بس کر اب خوشی توں کاں لگ روئے گا　　رات دن رورو کے انکھیاں کھوئے گا (۳۰)

خوشی نے اپنے کلام میں یہ بھی اطلاع دی ہے کہ ان کی والدہ، اپنے شوہر (فصیحی) کی وفات کے ۲۳ سال بعد، جب کہ وہ ایک اور مثنوی "غوثیہ" (۱۱۸۸ھ) تصنیف کر رہے تھے بہ قید حیات تھیں۔ وہ اپنی والدہ کی بہت عزت اور تکریم کرتے تھے اور متمنی تھے کہ ان کے بچے بھی اپنی داد کی خدمت کریں کیوں کہ وہ ایک عبادت گزار اور نیک سیرت خاتون تھیں:

سو وہ قوم میں رابعۂ عصر ہیں　　او بیبیاں منے عابدِ دہر ہیں
وہ واصل ہیں، عابد ہیں شب زندہ دار　　خدا کی تجلی انوں پر ہزار (۳۱)

خوشی کے کلام کی اندرونی شہادتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ وہ دکنی اردو کے باکمال شاعر اور انشا پرداز مولانا باقر آگاہ ویلوری کے قریبی احباب میں شامل تھے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے مولانا آگاہ کی تقریباً تمام کتابوں کے آخر میں مدحیہ نظمیں یا قطعہ ہائے تاریخ تحریر کیے ہیں۔ وہ ایک درویش صفت، سنی المذہب اور قادری المشرب بزرگ تھے۔ "غوثیہ" کی تصنیف (۱۱۸۸ھ) کے وقت ان کی اولاد کمسن تھی اس کتاب کے آخر میں وہ اپنی اولاد کو مخاطب کر کے انھیں صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرنے، خدا کے خوف سے ڈرنے، جاہلوں کی صحبت اختیار کرنے، ابلیس پر ہمیشہ لاحول بھیجنے، جوا نہ کھیلنے، عالموں کی صحبت اختیار کرنے، غیبت سے بچنے، یتیموں سے اچھا سلوک کرنے اور مہمان نوازی کرنے کی نصیحت کرتے ہیں:

اگرچہ بج اولاد ہے سن صغیر　　ہے امید حق سوں ہووئے گی کبیر
ترک صوم و رمضان کوں مت کرو　　اپس دل میں خوفِ خدا نت دھرو
رکھو تیوج صحبت سوں لچنے کوں دور　　نکو نرد بھکیو سج کر سرور
عدو آدمی کا سو ابلیس ہے　　او مردود پر مکر تلبیس ہے
کرو صحبتِ عالماں اختیار　　انن کا ہوے تم پو تا فیض بار
کلام الٰہی کرو خوب یاد　　ہے حافظ کا درجہ نہایت زیاد
نکو عیب کس کا کرو آشکار　　رہو دور غیبت سیتے باوقار
یتیماں یسیراں سوں نیکی کرو　　نظر نت شفقت کی ان پر دھرو
ضعیفاں پو نیکی کرو بے شمار　　دھرو زیر دستاں اپر بھوت پیار
رکھو بھوت مہمان کوں دوست تر　　دیوے حق سو ان کوں کھلاؤ مگر (۳۲)

خوشی نے قدیم اردو کے دیگر شاعروں کی طرح اپنا تخلص خوشی اور خوشیا دونوں طرح استعمال کیا ہے:

یو خوشی انبیاں کا ذکر اکثر　　محباں بات کرتا تھا نکو تر

....

حاسداں کو دے حسد کی آگ　　خوشیا توں لے قلم کی باگ

مثنوی "ریاضِ مسعود" میں غوثی نے والاجاہ کی مدح میں اشعار کہے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نواب والاجاہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے:

اتا کہتا ہوں وصفِ شاہ اعظم   ہمارے ملک کا سلطاں مکرم
ہے والا جاہ اب شاہِ زمانہ   جہاں میں جس کی ہمت کا فسانہ
وہ طالع میں ہے ثانیِ سکندر   شجاعت میں ہے رستم سوں بھی برتر
ہے غوثی بہوت سا شہ کا قرض دار   نہ کوئی کرتا براہ احوال اظہار
یو والا جاہ کا منظور نظر کر   مراد اس میں مری حاصل ہے یکسر (۳۳)

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب والاجاہ نے ان کی قدر افزائی اور سرپرستی نہیں کی۔ چناں چہ مثنوی "قصص الانبیا" اور "غوثیہ" میں ان کے مقروض اور مفلوک الحال ہونے کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غوثی اپنے بھائیوں سے بچھڑ گئے تھے۔ وہ بارگاہِ الٰہی میں دست بہ دعا ہیں کہ بہت جلد قرض سے سبک دوش ہو جائیں اور ان کے بچھڑے ہوئے بھائی انھیں مل جائیں:

کرو قرض میرا ادا غوثِ پاک   رکھو یادِ حق میں مجھے تا بلاک (۳۴)

....

الٰہی میں نہایت ہوں گنہ گار   ہوا ہوں بہوت عالم کا قرض دار
مرے بھایاں پڑے ہیں مج سیتی دور   انوکے ہجر میں ہوں روز و شب چور
ملے ہیں جوں کہ یوسف سار یعقوب   مرے بھایاں ملایا صورت خوب
الٰہی گرچہ ہوں تیرا گنہ گار   ولے تیرا ہوں بندہ تو ہے غفار
بخش مرا گناہ رکھ سات ایماں   ادا کر قرض سب غوثی کا رحماں (۳۵)

مولوی نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے کہ غوثی نے ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا اور ان کا مزار ان کے پیر و مرشد حضرت سر اللہ الترجالی کے مزارِ مقدس کے روبہ رو ہے (۳۶)۔ "بہارِ اعظم جاہی" کے مؤلف نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ غوثی کے پیر و مرشد شہر بغداد کے متوطن تھے، ان کا نسب نامہ مادری و پدری حضرت غوث الورئ پر منتہی ہوتا ہے۔ حضرت الترجالی جدِ نواب سعادت اللہ خاں (متوفی ۱۱۴۲ھ) کے اواخر میں ارکاٹ تشریف لائے اور "لالہ پیٹ" کی پہاڑیوں پر سکونت پذیر ہوگئے۔ (۳۷)

غوثی ایک قادر الکلام شاعر اور نثر نگار تھا۔ اب تک اس کی درج ذیل پانچ کتابیں دست یاب ہوئی ہیں۔ ۱۔ ریاضِ غوثیہ (۱۱۴۹ھ) ۲۔ غوثیہ (۱۱۸۸ھ) ۳۔ قصص الانبیا (۱۱۹۱ھ) ۴۔ ضیافت نامہ ۵۔ تفسیرِ غوثی (۳۸)۔

۱۔ ریاضِ غوثیہ: ۵۴۴۰ / ابیات پر مشتمل اس مثنوی کے آٹھ قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے جن میں سے چار نسخے انجمن ترقیِ اردو کراچی کے کتب خانے کی زینت ہیں اور ایک ایک نسخہ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری۔ حیدر آباد۔ کتب خانہ، سالار جنگ۔ حیدر آباد، ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ حیدر آباد اور انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے کتب خانے کا سرمایہ ہے۔ "ریاضِ غوثیہ" کے نام سے ظاہر ہے کہ اس مثنوی میں شاعر نے

محبوب سبحانی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے سوانح اور مناقب کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ درجِ ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اسی موضوع پر لکھی ہوئی فارسی تصنیف "مناقبِ غوثیہ" کا دکنی ترجمہ ہے جسے خوشی نے اپنے ایک دوست غلام محی الدین کی فرمائش پر سپردِ قرطاس کیا ہے:

یک محب میرا محی الدین کا غلام   تھا غلام محی دیں کر اس کا نام
سو او یک دن اپنے دل کا مدعا   مج سوں یوں بولا تھا لئی التجا
ہے "مناقب غوثیہ" جو فارسی   اس کوں ہندی بول کر جوں آرسی

اس مثنوی کے آغاز میں خوشی نے لکھا ہے کہ قدیم سخن وروں اور نثرنگاروں نے مختلف اصناف ادب میں اپنا زورِ قلم دکھایا ہے۔ کسی نے کہانی لکھی ہے تو کسی نے قصہ گوئی میں کمال حاصل کیا ہے۔ کسی نے قصیدہ گوئی کے فن میں "گوہر رولے ہیں" تو کسی نے مخمس، مستزاد اور ترجیع بند میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ کوئی غزل گوئی میں مہارت حاصل کر کے صاحبِ دیوان ہوا ہے، کسی نے نثرنگاری کے میدان میں اپنا مقام پیدا کیا ہے اور کسی نے "زنانی شعر" کہہ کر اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ لیکن میں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے اور یہ راہ مجھے مثنوی مولانا روم نے دکھائی ہے:

کوئی کہانی۔ کوئی قصہ بول گئے   کوئی قصائد بیچ گوہر رول گئے
کوئی مخمس کوئی بولیا مستزاد   کوئی ترجیع بند میں پایا مراد
کوئی غزل کہہ صاحبِ دیواں ہوا   نثر کا کاغذ کوئی لایا چوا
کوئی زنانی شعر بولا ذوق سوں   کوئی مردانہ کیا ات شوق سوں
بحر جس کے دل کوں جیسا خوش لگیا   اس میں ہو غواص او گوہر چنیا
میں ولیکن بحر میں کس نئیں ملیا   سب سوں نیارا راہ لے اپنی چلیا
بحر منج نادر پڑی ہے دھوم کا   مثنویِ مولویِ روم کا
بحر کوں اس کم نہ جان اے یار توں   ہے عمیق پر درِ شہوار سوں
اب براکو مج کوں یا کوئی بھلا   میں چلا اس بحر میں گھوڑا چلا (۴۰)

اس مثنوی میں خوشی نے اپنے والد افضلی کے علاوہ دبستانِ بیجاپور اور گولکنڈے کے چند ایسے باکمال سخن وروں کا تذکرہ کیا ہے۔ جو "ریاض غوثیہ" کی تصنیف کے وقت بہ قیدِ حیات نہیں تھے۔ ان شعرا میں ملک الشعرا نصرتی، ہاشمی بیجاپوری، ملک ت الشعرا ملا غواصی اور سید محمد فراقی اور ان کی مشہور زمانہ مثنویوں "گلشنِ عشق"، "یوسف زلیخا"، "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور "مرآۃ الحشر" کے نام شامل ہیں:

نصرتی جو بحرِ گلشن میں نہنگ   گوہرِ مقصود لایا اپنے سنگ
افضلی ہو عندلیبِ خوش نوا   نوبہا اپنا کھلایا بے بہا
پھر غواصی "قصہ سیف الملوک"   کہہ گیا کہ شعر کے فن سوں سلوک

دھر فراقی وصلِ رب کا اشتیاق او " مراۃ الحشر " بولیا لے فراق
ہاشمی بولیا " زلیخا " ذوق سوں عشق میں چک رو کے کھویا شوق سوں
سب او اپنی طبع کا جودت دکھا چھوڑ گئے آخر کوں یہ خالی سرا

(۴۱)

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں مولوی سخاوت مرزا نے "ریاضِ غوثیہ" کے زمانہ تصنیف کا تعین کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "ممکن ہے کہ اس نے ان میں سے بعض شعرا کو دیکھا ہو، اس کی یہ تصنیف فراقی بیجاپوری (کی) وفات کے بعد کی ہے اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ غوثی "فراقی بیجاپوری تقریباً ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) کا ہم عصر اور وسط بارھویں صدی ہجری کا بیجاپوری الاصل شاعر ہے اور میر تقی میر اور سودا کا معاصر ہے۔" (۴۲) مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "ریاضِ غوثیہ" کی تاریخِ تصنیف ۱۱۹۱ھ تحریر کی ہے (۴۳)۔

مولوی سخاوت مرزا کا یہ کہنا بڑی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ غوثی بارھویں صدی ہجری کے ربعِ دوم کا شاعر اور میر و سودا کا ہم عصر تھا لیکن اسے بیجاپوری الاصل قرار دینا گویا خود شاعر کے بیان کی تردید کے مترادف ہے۔ غوثی نے اپنی مثنوی "قصص الانبیا" کے درجِ ذیل اشعار میں خود کو محمد پور (ارکاٹ) کا متوطن لکھا ہے۔

محمد پور کا غوثی رہن ہار کہتے ارکاٹ جس بلدے کو اظہار
تخلص جس کا غوثی ہے مذکور ولے ہے غوث جمای نام مشہور (۴۴)

جہاں تک "ریاضِ غوثیہ" کی تاریخِ تصنیف کا تعلق ہے مذکورہ بالا دونوں محققین کے بیانات درست نہیں ہیں کیوں کہ خود غوثی نے "عندلیبِ باغ" کے اعداد سے اس مثنوی کی تاریخ تحریر ۱۱۶۹ھ نکالی ہے:

اس کی دھر تاریخ کا پھر میں خیال جب جنابِ قدس میں کیتا سوال
تب کرم کر ہج پو ہاتف غور سوں کان میں دل کے کہا اس طور سوں
باغ یو باغاں کوں سارے داغ ہے اس کی تاریخ "عندلیبِ باغ" ہے (۴۵)

مثنوی "ریاضِ غوثیہ" کا آغاز "حمد" سے ہوتا ہے۔ پچاس حمدیہ اشعار کہنے کے بعد غوثی نے مناجات میں ۴۶، نعت رسولؐ میں ۴۸، معراج نبیؐ میں ۱۳۶، منقبت علی میں ۲۸/ اور منقبت محبوب سبحانی میں ۱۸ شعر لکھے ہیں اور پھر "ستائشِ سخن و سخن شناسانِ انصاف دوست و مذمتِ حاسدانِ بے مغز سراسر پوست" کے عنوان کے تحت ۴۶/ اشعار اور "روز و شب از دردِ مفارقت پدرِ خود مالیدن و از حصولِ علم بے بہرہ ماندہ دست تاسف مالیدن" کے زیرِ عنوان ۲۵ شعر کہے ہیں۔ مکمل مثنوی کو غوثی نے حضرت محبوب سبحانی کے عرس کی تاریخ کی مناسبت سے گیارہ ابواب میں منقسم کرکے ہر باب کو "چمن" کا نام دیا ہے اور ہر چمن کو گیارہ گلدستوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ذیل میں مذکورہ عناوین کے ابتدائی اشعار درج کیے جاتے ہیں:

حمدِ حق سوں ہونٹ اول کھولنا بعد از اس کے دل منگیا سو بولنا

....

قادرا قادر ہے توں قدرت مآب   فضل سوں تیرے ہے ہر یک فیض یاب

....

نعتِ احمد محمد پچھے ہے ضرور   سب نبیاں کے بعد جس کا ہے ظہور

....

زلفِ جاناں سوں لی خوش بو یک رین   عطر یا عنبر تھی یا مشکِ ختن

....

اے دلِ شیدا مرے ٹک بول اب   کس کا عاشق ہے سو مجھ پو کھول اب

....

منقبت بولوں گا اب مجھ پیر کا   غوث الاعظم ہادیِ گنبھیر کا

....

اے درِ دریائے دل یعنی سخن   فیض سوں تجھ ہے مزین ہر کرن

....

حسبِ حال اپنا تو اے دل بول رے   سل زبان کے تیغ کا ٹک کھول رے (۴۶)

مثنوی "ریاض غوثیہ" کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے جگہ جگہ متعدد اقسام کے پھولوں پھلوں اور پرندوں کا تذکرہ کرکے منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر چمن پھولاں سوں مالا مال ہے   پھول ہیں کتیں زرد ہور کتیں لال ہے
عیش کا صدبرگ دے صد برگ کوں   رنگ پہ ہر گل رخ کے بھیجا برگ کوں
کاکلِ سنبل تے گوندیا بال میں   گال پر لالہ کے لایا خال میں
یاسمن کے عطر سوں پر تر کیا   بوکوں شبو کے سبھوں پر موکیا
خوش منظر کے خوش نظر سوں تس سہا   برگوں میں ریحاں کے لایا ارگجا
لاجھلے کوں موگرے کے موگری بیل   کردیا میں باغ میں خوش بو کا کھیل
بھاگلِ اورنگ رنگ پر اک شہاب   میں پنھایا اس کے تئیں سب سرخ باب
اشرفی سا خوش نما گل اشرفی   ایک گل پر تھے فدا گل اشرفی
کیا گلِ فردوس کی خوبی بتاؤں   بس ہے اس خوبی پہ شاہد اس کا پاؤں
چاندنی کے چند نے پونس گلِ چاندنی   اس پہ یہ نوری کی باندی چاندنی
شعلہ ہو گل نار کے گل نار گل   لادیوے روشنی گل زار گل

بلبل سوں خوش الحانی ہو کر سیوتی   سیوتی کی ہوئے مرید آ ریوتی

....

گل کے تھالاں اس قدر اس میں لگا   بن کوں پھر سکھیاں کے بیچ من لب چلیا
آب کا ہے فیض جگ پر عام سب   نم تختی سوں بھریا ہے عام سب
باغ میں سب روت ہے شبنم سوں   بارج پانا میں ہے یاقوت کوں
اول مت بکری کوں توں کہری ہے بو   نہیں ہے یہ بکری نگر فرنی ہے بو
جیوں سیہ بختاں ہریک جامن نول   ہے گگن پر تھاڑ کے جیسے زحل
ہیر کو چنتا ہے پھرتل ہیر ہیر   ہیرنا ہو ہیرسوں کے ہیر ہیر
کیا قضا سوں مل قدر صنعت کرے   دوربک انار میں مرجاں بھرے
عشق سوں لیمو نہیں پیلا ہے کچ   فکر ترشی کے لیے وہ پیلا ہے

....

لحن داؤدی جو طوطی جب بہائے   بار بدہ بدہ کھوئے تک سو گنوائے
قمریاں کوکو کے کوکو کوپہ کو   ہے سبھی کے ملک میں لک وہ سوہ سو
سرخ کی کیا تیز پیاری ہے وہ بیل   جیوں کبوتر باز کی چادر زنبیل
کوک سے کوئل کے کرکے بن تمام   درد سے دوکھوں سے دوکھے بن تمام
رقص سوں رقصاں ہیں طاؤساں تمام   شوق سوں سوزاں ہیں فانوساں تمام

۲۔ **غوثیہ:** ـــ غوثی ارکاٹی کی دوسری مثنوی "غوثیہ" ہے۔ اس کے کل ابیات کا علم نہیں ہو سکا۔ غوثیہ کے دو قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ناقص الاول نسخہ ادارۂ ادبیات اردو (مخطوطہ نمبر ۹۳۷) کی زینت ہے اور دوسرا مکمل نسخہ انجمن ترقی اردو ۔ پاکستان (مخطوطہ نمبر ۳۷۳ (۳)) کا مخزونہ ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے افسر صدیقی نے اس مثنوی کے جملہ اشعار کی تعداد نہیں بتائی۔ البتہ درج ذیل اشعار نقل کیے ہیں جن سے "غوثیہ" کا آغاز ہوتا ہے:

الٰہی دونوں جگ کا آدھار توں   ہمیں سب ہیں بندے نرنکار توں
کیا کن میں مثلاں سارا عیاں   ہوا جلوہ گر تج سوں سارا جہاں
فلک کوں ملک سوں سنواریا تمام   زمیں کوں دیا انس سوں نسب عام (۴۷)

"ریاض غوثیہ" کی طرح غوثی کی زیر نظر مثنوی کا موضوع بھی حضرت محبوب سبحانی کے مناقب اور اوصاف ہے۔ "غوثیہ" دراصل اسی نام کی ایک فارسی تصنیف کا دکنی اردو میں منظوم ترجمہ ہے (۴۸) غوثی نے یہ مثنوی ۱۱۸۸ھ میں رمضان المبارک کی ستائیس ویں شب (شب قدر) میں مکمل کی۔ تاریخ تصنیف کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اتا لاتو تاریخ اوپر مزاج   جو تاریخ کوں بول کر ایس تمج

کہ کس سن میں ہوی انصرام یو کتاب   جو ہجری و نبوی عالی جناب

مفصل عبارت میں تاریخ کھول   بھی ایضاً عروفات میں اسکوں بول

ابھارا سو اس اپر آٹ سال   و " روضہ صفا " پچ گن کر نکال

۱۱۸۸ھ   ۱۸۸۲+۶=۱۱۸۸

کیا شہرِ رمضان میں اختتام   ستاویس دیں شب کی تھی نیک نام

شبِ قدر جس شب میں پروردگار   بخشتا ہے عاصیاں کے تئیں کرد گار (۴۹)

"غوثیہ" کے آخر میں شاعر نے اپنے بچوں کو مخاطب کرکے ایک "پند نامہ" تحریر کیا ہے جس میں نیکی، شرافت اور اخلاق کو اپنانے تلقین کی گئی ہے۔ ان نصیحتوں کے درمیان غوثی نے بادشاہِ وقت کی صحبت سے پرہیز کرنے کی بھی ہدایت کی ہے:

نکو صحبتِ شہہ کرو اختیار   کہ سلطاں کی صحبت ہے مانند نار

رھنا آگ سوں دور بہتر ہے بات   کہ سلطان سوں ڈرنا ہے ولیچ بات (۵۰)

۳۔ **قصص الانبیاء:** غوثی کی یہ معرکتہ الآرا مثنوی ہے۔ جو بہ قول ڈاکٹر زور ساڑھے بارہ ہزار اشعار پر پھیلی ہوئی ہے اور اردو کی ضخیم ترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ قصص الانبیاء دراصل اسی نام کی ایک تصنیف کا دکنی ترجمہ ہے "سبب تالیف کتاب قصص الانبیاء در زبان دکنی می گوید" کی سرخی کے تحت غوثی نے لکھا ہے:

یو غوثی انبیاں کا ذکر اکثر   محباں ساتھ کرتا تھا نکوتر

بہد نج کوں ہوکے سب اہلِ محفل   جو رکھتے تھے محبت دل سوں کامل

زبان دکنی منے اس نظم کوں بول   جو آوے فہم میں ہر اک کے تئیں کھول

مجھے تحریص سوں ان کے ہوا شوق   رہا نئیں چین یک تل لئی ہوا ذوق

قصص جو انبیا کا فارسی ہے   نصِ قرآن سوں جوں آرسی ہے

سو اس کا ترجمہ کرتا ہوں میں اب   مری تو طبع کر جولان یارب

الٰہی کے فضل سوں تو بخش الہام   کہوں تا نظم دکھنی بہ خوش افہام (۵۱)

قصص الانبیا کو غوثی نے تین دفتروں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے کا آغاز "قصص نورِ محمدؐ از احد تا آدمؑ احوال می گوید" سے ہوتا ہے اس کے بعد حضرت آدمؑ سے حضرت ایوبؑ تک تمام انبیا کے واقعاتِ حیات قلم بند کیے گئے ہیں۔ دوسرا حصہ سکندر ذوالقرنین سے حضرت عیسیٰؑ اور یحییٰ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ تیسرے اور آخری حصے میں غوثی نے حضورِ اکرم حضرت محمد صلعم کی سیرتِ طیبہ اور شمائل بیان ہیں۔

مثنوی "قصص الانبیا" کے تینوں دفتروں پر مشتمل مکمل قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ (حیدرآباد) کتب خانہ ... ۵ از بیاضِ ا

(حیدر آباد) اور کتب خانہ، انجمن ترقیِ اردو۔ کراچی کی زینت ہیں۔ اس کے علاوہ دفترِ اول کے دو نسخے کتب خانہ، آصفیہ (اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری (حیدر آبا) میں اور ایک نسخہ کتب خانہ، ادارۂ ادبیاتِ اردو (حیدر آباد) کا مخزونہ ہے اور دفترِ دوم کا ایک نسخہ اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری (کتب خانہ، آصفیہ) میں محفوظ ہے۔ کتب خانہ، انجمن ترقیِ اردو۔ ہند (دہلی) میں بھی اس مثنوی کے پانچ مخطوطے محفوظ ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ "قصص الانبیا" کے کتنے دفتروں کا احاطہ کرتے ہیں۔

اس مثنوی کا تاریخی نام "ریاضِ مسعود" ہے جس سے سنہ ۱۱۹۱ھ مستخرج ہوتا ہے۔ درجِ ذیل اشعار میں خوشی نے صوری اور معنوی دونوں طریقوں سے اس مثنوی کی تاریخِ تصنیف نکالی ہے:

برس ہجری اگیارا سو اکیانو   بھرے پر یو بنیا ہے نسخہ، نو

ہے نام اس کا سنو جو "ریاضِ مسعود"   ہے تاریخ اس اسم کے بیچ مشہور

"ریاضِ مسعود" میں تاریخ ظاہر   اگیارا سو نود (پر) ایک نادر

مثنوی "خوشیہ" میں شاعر نے اپنے بچوں کو بادشاہِ وقت کی صحبت اختیار نہ کرنے کی ہدایت کی تھی لیکن پیشِ نظر مثنوی کے آخر میں اس نے نہ صرف اپنے مقروض ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ نواب والاجاہ کی مدح بھی کی ہے۔ "والاجاہ" کو خوشی نے "شاہِ زمانہ"، "شاہِ اعظم"، "سلطانِ مکرم"، "ثانیِ سکندر" "رستم سوں بھی برتر" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

انا یکتا ہوں وصفِ شاہ اعظم   ہمارے ملک کا سلطاں مکرم

ہے والا جاہ اب شاہِ زمانہ   جہاں میں جس کی ہمت کا فسانہ

وہ طالع میں ہے ثانیِ سکندر   شجاعت میں ہے رستم سوں بھی برتر

دکن ہور ہندسوں محتاج آکر   سے جاتے بھر در و گوہر

ہے خوشی بہوت ساشبہہ قرض دار   نکوئی کرتا برا احوال اظہار

یو والا جاہ کا منظورِ نظر کر   مراد اس میں مری حاصل ہے یکسر

۴۔ ضیافت نامہ: خوشی نے قصیدے کی ہیئت میں ۱۰۴/ اشعار پر مشتمل ایک نظم "ضیافت نامہ" کے عنوان سے لکھی ہے۔ ضیافت نامہ کے دو قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے: ایک ادارۂ ادبیاتِ اردو (حیدر آباد) کی زینت ہے (۵۲) اور دوسرا کتب خانہ، انجمن ترقی اردو (کراچی) کا مخزونہ ہے (۵۳)۔ قصیدے کا آغاز درجِ ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

اول کریم حق کی صفت ہے بعد ختمِ مرسلاں   ان پر درود رب سدا جو آل ہیں اصحابیاں

مرشد حق کے جو فرمان سے بولا روایت خوشیا   مرقوم ہے راوی ستی سننا ضیافت کا بیاں

اس سلسلے میں اس نے "ضیافت نامہ" کی فضیلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ اس قصیدے کے مطالعے سے قارئین کی مشکلیں آسان ہو جائیں گی اور اگر کوئی شخص اس نظم کو چالیس دن تک پڑھتا رہے تو اس کے گھر میں شادی ہوگی اور ترقی کے راستے کھل جائیں گے:

گردوں کی جو گردش سے آوے جو ہر کوئی امی | پائے ضیافت مصطفیٰ آسان ہوں گے مشکلاں
گا ہے یہ ضیافت مصطفیٰ پاس دن جو کوئی پڑے | شادی ہووے اس گھر منے پاوے مرادیں نعمتاں

اس نظم میں خوشی نے حضرت عثمان کے یہاں اور بعد ازاں خاتون جنت کے گھر رسول اللہ صلعم کی ضیافت کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں حضرت عمر اور حضرت ابوبکر صدیق کے علاوہ متعدد صحابہ رسول مدعو تھے۔ چند اشعار دیکھیے:

دعوت کیے عثمان نے یک دن پیمبر کی سنو | لے کر حکم سرور کا جو تیار کرتے گئی مکار
سب کچھ مہیا کرکے او بولے خبر سرور کو جا | سن کر چلے سرور نے لے ہمراہ سب اصحاب یار
شیر مرتضیٰ ، صدیق ، عمر باقی اتھے کئی امی | تھا شہر سب آراستہ مشتاق تھے سب ہشیار
کرتے قدم پر شاہ کے یک یک طبق گوہر نثار | ہر یک قدم پر یوں بچھیں بروے کئی آزاد ہار

"ضیافت نامہ" کا اختتام درج ذیل اشعار پر ہوتا ہے:

اے سرور شہ انبیا اے فاطمہ خیرالنسا | دنیاں کی غفلت دور کر کرنا کرم برماسیار
داسی ہے خوشی امی اے فاطمہ بنت رسول | کرنا عطا بندے اپے ہر دو جہاں کے نعمتاں
ہے صدق جو عدل و حیا شیر خدا کا دے لگن | کر خاتمہ ایمان سے اے خاتم پیغمبراں
مرشد کے جو ارشاد سے خوشی اتا پایا ظہور | جو کچھ کہ اس میں ہے صفت طاقت نہیں کرنے بیاں

۵۔ تفسیر خوشی: یہ خوشی کا ایک نثری رسالہ ہے جس میں "پارۂ عم" کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ "تفسیر خوشی" کا واحد نسخہ کتب آصفیہ (حیدرآباد) کی زینت ہے (۵۴)۔ بہ قول نصیر الدین ہاشمی اس تصنیف کا آغاز سورہ عم یتساءلون سے ہوتا ہے اور اختتام سورۂ قدر پر۔ قرآن حکیم کی آیتیں سرخ روشنائی سے لکھی گئی ہیں اور اس کے بعد لفظی معنی کے ساتھ مختصر الفاظ میں تشریح کی گئی ہے (۵۵)۔

نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ کی وضاحتی فہارس میں دو منظومات "چکی نامہ" اور "شادی نامہ" کو خوشی ارکاٹی کی تصانیف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "خوشی کے مرشد کا نام قدرت اللہ تھا" (۵۶)۔ لیکن مذکورہ دونوں نظمیں ۱۸ ویں صدی کے ایک اور صاحب تصنیف بزرگ فی العال شاہ کرنولی کی ہیں۔ ان نظموں میں فی العال شاہ نے واضح الفاظ میں اپنے والد اور پیر حضرت شاہ قدرت اللہ کا تذکرہ کیا ہے۔ لہٰذا "چکی نامہ" اور "شادی نامہ" (۵۷) کو فی العال شاہ کی تصانیف قرار دینے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

حوالے:

(۱) نصیر الدین ہاشمی - دکن میں اردو ص ۳۰۲ - (۲) نصیر الدین ہاشمی - کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ص ۸۹۵ - (۳) نصیر الدین ہاشمی - کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست (جلد ۱) ص ۲۱۹ - (۴) ڈاکٹر جمیل جالبی نے "تاریخ ادب اردو" کی پہلی جلد میں خوشی کو بیجاپوری بتایا ہے۔ دیکھیے کتاب مذکور ص [illegible] - (۵) ڈاکٹر زور - تذکرۂ اردو مخطوطات - ادارۂ ادبیات اردو (جلد ۱) ص ۳۴۹ - (۶) افضل الدین اقبال - مدراس میں اردو [illegible] - (۷) [illegible] ادبا و شعراء - مشمولہ ارکاٹ اور دیگر مقالات کا ادبی سرمایہ - مرتبہ ڈاکٹر جلال عرفان - [illegible] - (۸) نصیر الدین ہاشمی - کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست ص ۱۵۸ (مخطوطہ نمبر ۲۰۳) - (۹) سید شمس اللہ قادری - تحقیق اردو [illegible] ص ۲۵۴ - (۱۰) یادگار الشعرا - اسپرنگر (ترجمہ طفیل احمد) اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ص ۱۲۵ - (۱۱) ڈاکٹر احمد [illegible]

شہادت جنگ سلطانی کی اشاعت کے اسباب" مشمولہ سالنامہ "مخزن" (جہانگیر کالج، بابت ۱۹۸۸ء) ص ۵۳ – (۱۲) ایضاً ص ۵۳ – (۱۳) عبدالقادر ناظر، "مدارس میں اردو" جلد اعظم جاہی مطبوعہ مدراس ۱۹۹۱ء ص ۱۹۶ – (۱۴) ڈاکٹر آمنہ خاتون۔ شہادت جنگ سلطانی کی اشاعت کے اسباب "مخزن" ص ۵۳ – (۱۵) ایضاً ص ۵۸ – (۱۶) ایضاً – (۱۷) ایضاً – (۱۸) ایضاً – (۱۹) ایضاً ص ۵۹ – (۲۰) – (۲۱) باقر آگاہ – "مثنوی تحیرہ معراج آگاہی" (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ مخطوطہ نمبر ۳۴۷ – (۲۲) خوشی ارکاٹی۔ قصص الانبیاء بحوالہ دکن کے چند تحقیقی مضامین (نصیر الدین ہاشمی) ص ۹۳ – (۲۳) خوشی، قصص الانبیاء (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ (حیدرآباد) مخطوطہ نمبر ۱۱۱ – (۲۴) ایضاً (۲۵) اکبر الدین صدیقی و محمد علی اثر۔ تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو (جلد ۶) ص ص ۲۲۸–۲۲۹ – (۲۶) افسحی بیجاپوری۔ وفات نامہ۔ مخطوطہ نمبر ۳۳ کتب خانہ سالار جنگ (حیدرآباد) – (۲۷) ایضاً ص ۲۱۰ – (۲۸) افسحی کا ۲۲ اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ کتب خانہ سالار جنگ (مخطوطہ نمبر ۳ بیاض مراثی) میں محفوظ ہے۔ جس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے۔

وہ گل علی نبی کے پرچھاں نکل چلے ... زخمی دلاں سوں مرہم ریحاں نکل چلے
ماتم سوں افسحی کے نہیں شمع بوجھنے ... کیوں تا جلے جو شمع دل و جاں نکل چلے

(۲۹) افسر صدیقی امروہوی۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو (کراچی) (جلد اول) ص ۲۰۷ – (۳۰) خوشی ارکاٹی۔ بیاض خوشیہ (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ (حیدرآباد) مخطوطہ نمبر ۲۲۷ – (۳۱) خوشی ارکاٹی۔ خوشیہ۔ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو (مخطوطہ نمبر ۳۹۷) ورق ۸۲ – (۳۲) ایضاً – (۳۳) "قصص الانبیاء" بحوالہ دکن کے چند تحقیقی مضامین (نصیر الدین ہاشمی) ص ۹۷ – (۳۴) خوشی ارکاٹی۔ خوشیہ (قلمی) مخطوطہ نمبر ۳۹۷ ادارۂ ادبیات اردو ورق ۸۱ ب – (۳۵) ایضاً "قصص الانبیاء" (قلمی) ادارۂ ادبیات اردو۔ مخطوطہ نمبر ۱۱۹۲ ورق ۲۳۲ – (۳۶) نصیر الدین ہاشمی نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ مدراس کے کسی مصلی نامی شاعر نے خوشی کی تاریخ وفات بھی نکالی تھی۔ دیکھیے دکن کے چند تحقیقی مضامین ص ۹۲ – (۳۷) بیاد اعظم جاہی مؤلفہ غلام عبدالقادر ناظر مطبوعہ مدراس ۱۹۹۱ء – ص ۱۹۶ – (۳۸) "مدراس میں اردو" کے مؤلف نے خوشی کی تصانیف میں "ریاض خوشیہ" کا تذکرہ نہیں کیا – (۳۹) خوشی – ریاض خوشیہ (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ مخطوطہ نمبر ص ۱۸ – (۴۰) ایضاً ص ۱۹ – (۴۱) ایضاً ص ۲۳۷ – (۴۲) مولوی عظمت مرزا – ریاض خوشیہ – نوائے ادب – بمبئی – اپریل ۱۹۹۷ء ص ۷۱ – (۴۳) نصیر الدین ہاشمی – وضاحتی فہرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ جلد اول) ص ۲۱۹ – (۴۴) خوشی – قصص الانبیاء (قلمی) مخطوطہ نمبر ۱۱۵ ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد) – (۴۵) ایضاً ریاض خوشیہ (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ مخطوطہ نمبر ۲۲۷ ص ۲۲۷ – (۴۶) ایضاً – (۴۷) خوشی ارکاٹی – خوشیہ (قلمی) بحوالہ مخطوطات انجمن مرتبہ افسر صدیقی (جلد پنجم) ص ۱۸۹ – (۴۸) ایضاً صفحہ ۱۸۹ – (۴۹) خوشی – خوشیہ (قلمی) مخطوطہ نمبر ۳۹۷ ورق ۸۱ ب – (۵۰) ڈاکٹر زور – تذکرۂ مخطوطات – ادارۂ ادبیات اردو (جلد چہارم) ص ۱۸۳ – (۵۱) خوشی – قصص الانبیاء (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ – (۵۲) مخطوطہ نمبر ۳۱۸ مخزونہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو – حیدرآباد – (۵۳) افسر صدیقی – مخطوطات انجمن ترقی اردو (کراچی) (جلد اول) ص ۲۰۵ – (۵۴) مخطوطہ نمبر تفسیر ۳۳ – (۵۵) نصیر الدین ہاشمی – وضاحتی فہرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ (جلد دوم) ص ۳۱۸ – (۵۶) ایضاً ص ۳۰۲ – (۵۷) مرتبین مخطوطات انجمن ترقی اردو (کراچی) (جلد اول) نے بھی نصیر الدین ہاشمی کی تقلید میں انھیں کے حوالے سے مذکورہ دونوں نظموں کو خوشی کی تصانیف میں شمار کیا ہے جو غلط ہے جو فہرست کو رہیں ہے۔

(سلسلہ ص ۱۹۱ – ابن عربی)

اگلے برسوں میں ابن عربی نے متعدد سفر کیے۔ ۶۱۲ھ میں آپ مکہ میں تھے۔ اس دوران آپ کے تعلقات صلاح الدین ایوبی کے بیٹے الملک الظاہر کے ساتھ، جو حلب کا حاکم تھا، دوستانہ تھے۔ ایک واقعے سے، جس میں آپ نے ایک شخص کی سزائے موت کو معاف کرنے کی سفارش کی تھی، پتہ چلتا ہے کہ وہ آپ کی کس قدر عزت کرتا تھا۔ (فتوحات مکیہ۔ جلد چہارم۔ ص ۵۳۹)۔ ۶۲۰ھ میں آپ نے دمشق کو اپنا وطن بنا لیا، جہاں کے حاکم الملک العادل نے آپ کو وہاں پر آکر رہنے کی دعوت دی تھی۔ وہاں پر آپ نے ۲۸ ربیع الآخر ۶۳۸ھ مطابق ۱۲۴۰ء کو وفات پائی اور جبل قاسیون کے دامن میں دفن کیے گئے، جو آج تک مرجع خواص و عام ہے۔ مجھے ۱۹۸۰ء میں وہاں پر حاضر ہو کر دعا کرنے کی اور ۱۹۸۸ء میں آپ کے مزار پر جانے کی سعادت نصیب ہوئی، جہاں پر ابن عربی کی کوئی یادگار نہیں پائی جاتی۔ صرف کچھ روں کا ایک قطعہ عربوں کے زمانے کی یادگار ہے واتک ہے۔

○ ○ ○

مطالعہ

ڈاکٹر جگدیش لال آزاد

(ڈاکٹر جگدیش لال آزاد جو مخدوم پور میں ہوئے قتل عام کے چشم دید گواہ ہیں)

بے نام رشتے

(مصنف: ڈاکٹر کے۔ایل۔گاندھی)

تواریخ اقوام کے بہت سے اوراق انسانی خون سے آلودہ ہیں۔ ان بربریت کے پرستاروں میں چنگیز خان، ہلاکو خان اور نادر شاہ کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ ان خوں خوار انسانی درندوں نے بے شمار انسانوں کا قتل عام کر کے کلہ مینار بنائے۔ ان گنت شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی عبادت گاہوں کو مسمار کیا۔ اور کتب خانوں کو نذر آتش کر دیا۔

عہد کہن کی بربریت کی تازہ مثال آج سے تقریباً پچاس سال سے پہلے تقسیم ہند کے وقت سرحد کے دونوں طرف ایک وبائے عظیم کی شکل میں نازل ہوئی۔ 1946ء میں جب آزادی کا آفتاب جلوہ افروز ہوا۔ اس کے ساتھ ہی لاکھوں بے قصور انسانوں کی زندگی کے چراغ ہمیشہ کے لیے بجھا دیے گئے۔ ان گنت عورتوں کی بے حرمتی کی گئی اور بے شمار بچے یتیم ہو گئے۔ لاتعداد گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔

کے۔ایل۔گاندھی کا ناول بے نام رشتے اسی قتل عام کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ مخدوم پور جو پاکستان کے ضلع ملتان کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور جہاں ہندو اور مسلمان ہمیشہ یک آہنگی سے رہتے تھے۔ ۲۶ / ستمبر ۱۹۴۷ء کو قتل و غارت گری کا شکار ہو گیا۔ مذہبی جنون میں اندھے ہو کر انسان نے انسان کو ہی نہیں مارا، انسانیت کو زندہ دفن کر دیا۔ جن لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ان کا قصور صرف یہی تھا کہ وہ اقلیت میں تھے اور حکومت کی بے پناہ قوت اور اکثریت کی تنگ نظری ان کی تباہی اور بربادی پر آمادہ تھی بقول مصنف: "اس عالم کو دیکھ کر ایک باعقل و باہوش انسان کو یہی لگتا تھا کہ شاید خدا نے آدمی کو جنت سے اس لیے نکالا تھا کہ آدمی میں انسان بننے کی صلاحیت بہت کم تھی۔"

ناول کا مرکزی کردار سیما ہے جسے اپنی چھوٹی بچی کے ساتھ مخدوم پور کے سانحہ عظیم کے وقت اغوا کر لیا جاتا ہے۔ سیما نسوانی حسن کا مجسمہ ہے۔ اس میں غیرت مندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ سیما اپنے اغوا کرنے والے نوجوان کو جسے جنسی خواہشات نے اندھا کر دیا ہے موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ بے ہوشی کے عالم میں اسے ایک نوجوان زاہد اپنی حویلی میں لے جاتا ہے۔ وہ سیما کو پناہ دیتا ہے۔ اور اس کی بیٹی کو بھی فسادیوں کے چنگل سے رہا کراتا ہے۔ وہ خود سیما کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے سامنے شادی کی تجویز پیش کرتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو سیما کی بے بسی کا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ لیکن زاہد تو صحیح معنوں میں زاہد تھا سیما کے پرزور دلائل کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اور اسے باعزت نزدیکی پناہ گاہ میں پہنچا دیتا ہے۔

ناول کے دوسرے کردار بھی ابھر کے سامنے آتے ہیں۔ نرملا جو اتفاقیہ سیما سے ملتی ہے وہ بھی دردناک حالات سے گزرتی ہے۔ اس کی بے آبروئی کرنے والا ایک مسلمان تھانیدار تھا۔ نرملا ایک دلالہ کے چنگل میں پھنس جاتی ہے۔ جو اسے پانچ تارہ ہوٹل کی چکاچوند سے

مرعوب کرکے کال گرل بننے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کا نام نرملا سے شگفتا ہو جاتا ہے۔ اس کی رہائی تب ہوتی ہے جب ایک فراخ دل نوجوان نیرج اس کو ازدواجی بندھن میں باندھ لیتا ہے۔ اس کا نام نیا نام سجیدا رکھا جاتا ہے۔

ناول میں، ہماری اقتصادی اور معاشرتی زندگی کی خامیاں ابھر کر آتی ہیں۔ سیما جب ایک کامیاب سماج سیوکا بن کر اپنے سسرال میں جاتی ہے تو اس کے ساس اور سسر انسانیت کو بالائے طاق رکھ کر اس سے بہت شرمناک سلوک کرتے ہیں۔ اس کے بیش قیمت اثاثہ یعنی عصمت پر شک کرتے ہیں۔ اس کا خاوند من موہن جو موت کے منھ سے بچ کر آجاتا ہے اس کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کو اپنانے سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ ایک ہندو سماج کی گھناؤنی تصویر ہے جس کا خیال آتے ہی دل میں ایک عجیب طرح کی افسردگی چھا جاتی ہے۔ اور اس فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ناول کا نقطہ، عروج بہت رومانی ہے۔ لکھنو سے سات میل دور ایک گاؤں میں فرقہ وارانہ فساد کی نوبت آجاتی ہے اس کی وجہ بھی ہندو سماج کی تنگ نظری ہے۔ ایک ہندو لڑکی اس لیے عیسائی بن جاتی ہے کہ کوئی ہندو لڑکا بنا جہیز کے اس سے شادی نہیں کرتا تھا۔ سیما نے جس پختگی اور عقل مندی سے اس معاملے کو سلجھایا وہ اپنی مثال آپ ہی ہے۔

ایک دوسرے گاؤں میں اسی طرح کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جہاں کچھ ہندو پریوار سماجی بے رحمی کو ناقابل برداشت سمجھ کر مسلمان بن جاتے ہیں۔ اس سے آس پاس کے ہندوؤں میں کافی ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس گاؤں کو گھیر لیتے ہیں۔ سیما ایک سماج سیوکا کے طور پر ہندوؤں کو سمجھاتی ہے کہ اکثریت میں ہونے کے ناتے سے انھیں ... ں کی رکھشا کرنی چاہیے۔ مسلمانوں کو وہاں سے نکال کر ایک محفوظ جگہ پر پہنچانے کا انتظام بھی کر دیا جاتا ہے۔ اسی اثنا میں ایک مہذب در خوب صورت نوجوان سیما کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ نوجوان زاہد تھا جو پاکستان کے محکمہ، خارجہ کے رکن کی حیثیت سے ہندوستان میں متعین تھا اور اپنے رشتہ داروں سے ملنے اسی گاؤں میں مقیم تھا، تاریخ کا رخ بدل گیا۔ زاہد نے ایک وقت سیما کی جان و عصمت کی حفاظت کی تھی اور آج سیما نے زاہد اور دوسرے مسلمانوں کے ایک ہجوم کو تحفظ دے کر ثابت کر دیا تھا کہ بقول مصنف " نہ تو ہر ہندو ہر ایک مسلمان سے بہتر ہوتا ہے۔ اور نہ ہر ایک مسلمان ہر ایک ہندو سے بہتر ہوتا ہے۔ دونوں سے افضل تر وہ ہوتا ہے جو ہندو اور مسلمان ذات پات کی تفریق سے بالا ہو کر انسان ہوتا ہے......"

شام و شفق آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کی ایک پردرد کہانی ہے لیکن اس کا پیغام آج بھی ہندوستان کے حالات سے مطابقت رکھتا ہے اور بہت عرصے تک Relevant رہے گا۔ اس ناول میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کے اقتباسات بہت ہی موزوں ہیں۔ جہاں قرآن شریف کے "سورہ نور" جس میں بدفعلی کرنے والے مسلمان کو کو کھلے عام کوڑے لگانے کی ہدایت کی گئی ہے کا ذکر ہے وہاں سنت تلسی داس کے دوہے اور گیت کے شلوک بہت ہی موزوں مواقع پر قلم بند کیے گئے ہیں۔

ناول کے مختلف کرداروں کی تشکیل اس موثر انداز سے کی گئی ہے کہ ان میں کوئی بھی بناوٹی نہیں لگتا۔ یہ کردار اکثر ابدی سچائیوں اور قدروں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رحمت جو ایک نوجوان ہے، کہتا ہے کہ آدمی ہی ہے وہ ہندو، مسلمان، سکھ یا پارسی ہو، تعصب کا چشمہ پہن لیتا ہے تو پھر وہ ہر چیز کو اسی نظر سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے، انسانیت کی نگاہ سے نہیں۔ اسی طرح جب پاکستان ... نے ہوئے کچھ نوجوانوں نے گاڑی کے ڈرائیور اور کلینر کو چائے پر مدعو کیا۔ تو انھوں نے ہچکچاہٹ ظاہر کی۔ نوجوانوں نے انھیں یہ کہہ ... وہ کر دیا کہ ہم سب ایک ہی دھرتی کے بیٹے ہیں۔ اگر سیاسی وجوہات سے روئے زمین کے اس خطے پر لکیر کھینچ دی گئی تو کیا ہوا؟

شام و شفق ایک ایسا دلچسپ قصہ ہے جو قاری کو ایک ہی نشست میں پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی زبان بہت ہی سلیس، عام فہم اور شگفتہ ہے۔ سماجی، سیاسی اور معاشرتی واقعات کو بہت خوبی سے قلم بند کیا ہے۔ بہت سے اہم مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے قاری کی دلچسپی کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہ قصہ ہر اس انسان کو پڑھنا چاہیے جو اس ملک اور برصغیر کی سمسیاؤں کے بارے میں سوچتا ہے اور ان کو حل کرنا چاہتا ہے۔ مصنف کے بارے میں بھی دعا ... ند کرے زور قلم اور زیادہ" تاکہ وہ ... سی طرح سے ادب کی خدمت میں پیش پیش رہیں اور قارئین کے لیے اسی طرح کے ... عبرت آمیز قصے پیش کرتے رہیں۔

مصحف اقبال توصیفی

O

نام لکھو اس پہ میرا
اب پھینکو پتھر میرا

یہ دل کی گیلی مٹی
یہ مٹی کا گھر میرا

مجھ پہ جھکا میرا سایہ
ہاتھوں میں خنجر میرا

ماں نے کہا" تو میرا ہے "
وہ بولی ۔ شوہر میرا

صبح ہوتے لوٹا دینا
یہ انجر پنجر میرا

ان آنکھوں نے دیکھا ہے
سب اندر باہر میرا

بستر پر اک لاش ملی
رات نے کھولا گھر میرا

کیسی اس کی ناؤ چلی
ڈوب گیا پتھر میرا

شکوے کی بھی ایک رہی
کیا حق تھا اس پر میرا

O

موج میں طوفان سا ۔ جاں میں بھنور ہے الگ
وحشتِ صدا میں گھرا آنکھ کا گھر ہے الگ

سر کو چھپائیں کہاں ۔ بارشِ سنگ ہر طرف
دل کو سنبھالیں کہ یہ کانچ کا گھر ہے الگ

تو جو بہت پاس ہے دور ہے دیکھوں ذرا
پاس بلاؤں اسے تجھ سے اگر ہے الگ

چشمِ معانی میں ہے اور ہی منظر کوئی
لفظ وہی ۔ لب وہی ۔ دل پہ اثر ہے الگ

وہ نہ برا مان جائے میں کہیں کچھ کہہ نہ دوں
بھائی کا اپنے خیال مجھ پہ نظر ہے الگ

وقت کی اس ریت میں بیج جو ہم بو گئے
اس کا ثمر ہے الگ اس کا شجر ہے الگ

رفعت سروش

○

شانوں پہ زندگی کے قصیدوں کا بوجھ ہے
رسموں کی ہے کمند، رواجوں کا بوجھ ہے

یہ کون ہے جو رخ سے اٹھاتا نہیں نقاب
ملتی نہیں نظر کہ حجابوں کا بوجھ ہے

سناٹے کی زبان سمجھنا ہوا محال
میری سماعتوں پہ تو سمتوں کا بوجھ ہے

حرص و ہوس کے خار چبھوتی ہے ہر نظر
اس پھول سے بدن پہ نگاہوں کا بوجھ ہے

زہرہ، زحل، عطارد و مریخ و مشتری
میری زمیں پہ کتنے ستاروں کا بوجھ ہے

عاری ہیں ذہن روشنیِ علم سے، مگر
ـنے کو سب کے سر پہ کتابوں کا بوجھ ہے

ملتی نہیں کہ دوست ہیں، محدود یا رقیب
ـروں پہ ان کے کتنی نقابوں کا بوجھ ہے

دوسروں کا درد بٹائیں کہ آج کل
ـدھوں پہ سب کے اپنی صلیبوں کا بوجھ ہے

ـا توڑنا بھی چاہوں تو ممکن نہیں سروش
ـے تعلقات پہ صدیوں کا بوجھ ہے

○

نفرتیں اور رنجشیں، حرص و ہوس
زندگی کیا دے گئی اب کے برس

کچھ دنوں سے اک عجب احساس ہے
خود مرا ہی جسم ہے میرا قفس

کیا بتاؤں ان سے ملنے کا سبب
اک سکوں ملتا ہے مجھ کو اور بس

جب گلے شکوے ہوئے سارے تمام
پھر گلے ملنے میں کیا ہے پیش و پس

اعتبارِ زندگی جاتا رہا
موت نے یورش وہ کی اب کے برس

تشنہ لب بھونروں کا موسم آگیا
ہر کلی کا چوستے پھرتے ہیں رس

○ ○ ○

زبیر شفائی

○

پتھر اچھالتا ہوں
آواز ڈھالتا ہوں

ویران ہے حویلی
آسیب پالتا ہوں

پایاب ہے سمندر
موتی نکالتا ہوں

پانی نہیں چمن میں
شبنم ابالتا ہوں

اک چیز کھو گئی ہے
نس نس کھنگالتا ہوں

میں ناخدا نہیں ہوں
کشتی سنبھالتا ہوں

یہ بھی زبیر وہ بھی
حیرت میں ڈالتا ہوں

○ ○ ○

○

بہ لذت سادگی سے چل رہا ہوں
مگر بادِ صبا کو کھل رہا ہوں

ہوا میں تھرتھری پانی میں شورش
ترے چہرے سے آنکھیں مل رہا ہوں

جدائی کے تصور سے پریشاں
پریشاں ہی نہیں پاگل رہا ہوں

ابھرنے کا بھی منظر دیدنی تھا
اسی رفتار سے میں ڈھل رہا ہوں

بچھڑنے کی طرح ہے آج ملنا
میں اس موجودگی میں کل رہا ہوں

چلی آتی ہیں بے دستک صدائیں
اکیلا لقمہ لقمہ پل رہا ہوں

زبیر احساس ہے وہ سرد آتش
کہ میں بجھنے کی خاطر جل رہا ہوں

○ ○ ○

ڈاکٹر کرامت علی کرامت

○

شیشۂ گل یوں ہے طوفانی ہوا میں مبتلا
خامشی ہے یورشِ سنگِ صدا میں مبتلا

یوں رندھی ہے سانس جینا بن گیا یکسر محال
ہر کوئی ہے زہر آلودہ فضا میں مبتلا

اپنے ہی کردار کی دوزخ جلاتی ہے اسے
جس کو دیکھو ہے وہی جرم و سزا میں مبتلا

گر گئی پتوار ، بے قابو ہوا ہے بادباں
اہلِ کشتی ہیں فریبِ ناخدا میں مبتلا

کون پہنچائے گا ہم تک روشنی امید کی ؟
عکسِ ماضی ہے شکستِ آئنہ میں مبتلا

ہوش کس کو ہے کہ زادِ راہ کی رکھے خبر
کارواں ہے رہ زنیِ رہ نما میں مبتلا

ہے مشیت اس کی، اس میں دخل اپنا کچھ نہیں
کون کہتا ہے کہ انساں ہے خطا میں مبتلا

فکر و جذبہ گو کرامت کا انوکھا ہے مگر
شعر اس کا ہے شکستِ نارَوا میں مبتلا

رفعت صدیقی

○

پہلے یہ شکایت تھی کہ پتھر نہیں ملتا
پتھر ہے تو شیشے کا کوئی گھر نہیں ملتا
اک عمر سے اک بُعد سا ہم میں ہے ابھی تک
وہ مجھ میں ہے اور مجھ سے ہی کھل کر نہیں ملتا
آوارہ مزاجی نے کوئی سمت نہ رکھی
رستہ تو ہے مانوس، مگر گھر نہیں ملتا
یوں سامنے اک عالمِ صد رنگ ہے لیکن
جو دل کو لبھائے وہی منظر نہیں ملتا
میں دیکھتا رہتا ہوں خلا میں اسے اکثر
پھر کیوں وہ کبھی آکے زمیں پر نہیں ملتا

سعدی تسکین

○

تمہاری یاد جب بے حد ستائے
ہم اپنے شعر خود ہی گنگنائے

غم و آلام کی جب یورشیں ہوں
کوئی کیا حوصلہ جینے کا پائے

مظالم پر مظالم ڈھانے والو
ہمیں تھے دار پر جو مسکرائے

نکل کر تیری محفل سے نہ جانے
کہاں جاکر یہ دل تسکین پائے

منوہر مالگونکر

ترجمہ : ڈاکٹر یونس اگاسکر

چٹکی بھر نسوار

ماں نے اطلاع دی، مجھے ایک صدمہ لگا۔

"مانو کاکا آرہے ہیں" وہ بولی۔

"خدا خیر کرے" میرے منھ سے نکلا۔ "کیوں نہ ہم انھیں تار کر دیں کہ ہم تو خود ہی مکان چھوڑ رہے ہیں کیوں کہ میرا تبادلہ ہو گیا ہے یا کوئی اور وجہ بتا دیں؟"

"نہیں بیٹے!" ماں نے کہا "وہ اب تک ریل گاڑی پر سوار ہو چکے ہوں گے"۔

پھر مجھے تسلی دینے کی خاطر آگے بولی "دیکھیے بھی انھوں نے لکھا ہے کہ وہ یہاں دو یا تین روز سے زیادہ نہیں ٹھہر سکیں گے۔"

"انھیں اس گرمی میں دلی آنے کی کیا ضرورت آپڑی؟"

"انھیں کسی وزیر سے ملنا ہے۔"

"کیا کہا؟ تب تو وہ ہفتوں یہاں ڈیرا ڈالے رہیں گے۔ وزیروں سے ملنے میں ہفتوں کیا مہینوں نکل جاتے ہیں۔ خدا خیر کرے۔"

"اگر تمھارے مانو کاکا یہ طے کریں کہ انھیں کسی وزیر سے ملنا ہے تو پھر دن ہو یا رات، وہ کسی نہ کسی طرح اس سے مل ہی لیں گے۔ ماں نے کہا۔

ماں تو ہمیشہ ہی سے اپنے مائکے والوں کی وکالت کرتی رہی ہے۔ پھر مانو کاکا تو ان کے بھائی ٹھہرے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے وزیروں کے سلسلے میں ہو سکتا ہے مجھے کوئی تشویش لاحق ہو۔ میں ایک تو آمور داخلہ سکریٹری ہوں اور اس اعتبار سے وزیروں کو خدا سے بھی دو درجے بالا سمجھنے کا عادی بنا دیا گیا ہوں۔ جو لوگ صرف ایک درجہ بلند تصور کیے جاتے ہیں، انھیں سکریٹری کہا جاتا ہے۔

میں پلیٹ فارم پر منتظر تھا کہ گاڑی آگئی۔ مانو کاکا ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبے کے دروازے میں کھڑے تھے۔ اپنے سفید بالوں اور بارعب مونچھوں کے ساتھ وہ نمایاں لگ رہے تھے۔ وہ اب تک دکنی برہمنوں کا روایتی گھٹنا کوٹ پہنتے ہیں اور سرخ ریشمی پگڑی باندھتے ہیں اور کندھوں پر سفید انگوچھا ڈالتے ہیں۔

جیسے ہی میں ڈبے میں پہنچا انھوں نے ایک ٹوکری مجھے تھما دی "اسے باہر لے جاؤ۔ جلدی!" انھوں نے سرگوشی کی "میں قلیوں سے باہر ملوں گا۔"

میں نے کسی چور کی طرح اسے باہر ٹوکری بغل میں دبائی اور دیکھا تو ایک بھاری بھرکم مارواڑی نے جس نے ایک ٹوکری کو گھونٹ میں

چھپار کھا تھا، ٹکرا گیا۔ لیکن میری معذرت کے جملے ٹوکری سے نکلنے والی عجیب سی آوازوں میں دب کر رہ گئی وہ ایک غصے سے بھرے ہوئے بلو نگڑے کے احتجاجات تھے۔ "سٹ سٹ۔ پھٹ پھٹ۔ میاؤں۔ مِی آؤں۔ مِی مِی آؤں!"

میں جھکائی دے کر بھاگ کھڑا ہوا اور بھیڑ میں شامل ہو کر سکھوں کی ایک برات کے ساتھ دبتا دباتا گیٹ کے باہر نکل گیا۔

نانو کاکا نے باہر آنے میں کافی دیر لگا دی۔ جب اسٹیشن یارڈ تقریباً خالی ہو چکا اور آخری تانگا بھی روانہ ہو چکا تب کہیں وہ ایک ٹکٹ چیکر کی معیت میں جو ان کی ہر بات کی گردن ہلا ہلا کر تائید کر رہا تھا، گیٹ سے باہر نکلے۔

"تھرڈ کلاس میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور رزرویشن کے بغیر سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ملنا ممکن نہ تھا اس لیے مجبوراً تھرڈ کلاس کے ٹکٹ پر سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا پڑا" قریب آتے ہی نانو کاکا نے وضاحت کی۔ "لیکن سارا معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے سلجھ گیا۔ وہ نوجوان ٹی سی بڑا شریف آدمی نکلا۔ تم نے دیکھا نہیں وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آیا تاکہ پھر کوئی الجھن نہ پیدا ہو۔ بلو نگڑے نے البتہ مفت میں سفر کیا۔ اب کیسا ہے وہ؟

"بالکل چپ چاپ ہے" میں نے کہا۔ "شاید مر چکا ہے" میں نے پر امید ہو کر سوچا۔

ہم کار میں جا بیٹھے اور میرے سیکنڈ گیر بدلنے سے پہلے ہی نانو کاکا بولے "تم منسٹر کو مجھ سے کب ملا رہے ہو؟ میں یہاں دو روز سے زیادہ نہیں رک سکوں گا..... حد سے حد تین روز تک۔"

اب صاف گوئی ضروری تھی۔ میں نے کہا "دیکھیے ماماجی! میں صرف ایک نو آموز انڈر سیکریٹری ہوں....... اور یہ کام میرے منصب سے بالا ہے کہ منسٹروں سے ملاقات کی درخواست کرتا پھروں۔"

"اوہ!" نانو کاکا بولے "میں تو یہ امید کر رہا تھا کہ... اوہ... میں سمجھ گیا۔ خیر کوئی بات نہیں" انھوں نے ایک چٹکی بھر نسوار سونگھی، اپنی انگلیوں کو نرمی سے انگوچھے پر رگڑا اور سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یوں آنکھیں موندے اور بھویں چڑھائے ہوئے گویا کسی گہری سوچ میں ہوں۔ ساتھ ہی انھوں نے خالص دکنی انداز میں اظہارِ تاسف کے لیے زبان بھی ٹکاری۔

ماں دہلیز پر منتظر ملیں۔ ان کا چہرہ مسکراہٹوں سے معمور تھا۔

بلو نگڑے کو دیکھ کر تو ان کے منھ سے خوشی کی چیخیں نکل گئیں اور انھوں نے نانو کاکا کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انھوں نے نانو کاکا کو میری ہی خواب گاہ میں ٹھہرایا ہے۔ نتیجے میں مجھے پشت کے برآمدے میں لیٹنے کے لیے ایک چارپائی ڈالنی پڑی۔

ماں کے اصرار پر میں نے دفتر سے دو روز کی چھٹی لے رکھی تھی۔ چناں چہ دوپہر کو میں نانو کاکا کو کار میں بٹھا کر نارتھ بلاک لے گیا۔

وہ منسٹر سے ملنے کے لیے اندر چلے گئے اور میں کار پارک میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ دو گھنٹے بعد جب وہ لوٹے تو رنگا رنگ مراٹھی گالیاں دیتے ہوئے۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کروں اس لیے چپ چاپ گاڑی چلاتا رہا۔ کچھ دیر بعد ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ بولے "دو گھنٹے تک میں ایک چپراسی سے دوسرے چپراسی تک دھکے کھاتا رہا، راہداریوں میں جوتیاں چٹخاتا رہا اور آخرکار صرف ڈپٹی سکریٹری تک رسائی حاصل کر کے آج سے تین روز بعد کا وقت حاصل کر سکا۔ شرم ناک! شرم ناک!"

اور پھر مراٹھی گالیوں کی ایک اور قسط شروع ہو گئی۔ لسانی ہنگامی حالات میں ہمارے نانو کاکا ہمیشہ اپنی مادری زبان سے رجوع ہو جاتے تھے۔

ایک شوخ زرد رنگ کی اسپورٹس کار جس کا ہارن ایک مسلسل دھماکے کی طرح گونج رہا تھا، ہمارے پاس سے بہت تیزی سے گزر گئی۔ گاڑی چلانے والے نوجوان نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

"کتنا بدتمیز آدمی ہے! کون تھا وہ؟" نانو کاکا نے پوچھا۔

"اس کا نام ہے رتی رام۔ میری ہی منسٹری میں کام کرتا ہے۔"

"اچھا!"

"لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ حضرت برکت علی کے پاس ٹریڈ کمشنر ہوکے جا رہا ہے یعنی کہ سفیر برکت علی لیکن اب ان کا کہنا ہے کہ وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔" میں نے محض سلسلۂ گفتگو جاری رکھنے کے لیے بات بڑھائی۔

تم بھی اپنا تقرر بیرونِ ملک کیوں نہیں کرا لیتے؟" نانو کاکا نے دریافت کیا۔ "بیرونِ ملک تقرر کا معاملہ بھی منسٹر سے ملاقات کا وقت حاصل کرنے ہی کے زمرے میں آتا ہے ماما!" میں نے کسی قدر ترشی سے جواب دیا۔ "اس کے لیے رسوخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں رتی رام دلی والے پارٹی باس سوہن لال رتی رام کا بیٹا ہے۔"

نانو کاکا ایک جھٹکے سے ساتھ سیدھے ہو گئے۔ "کیا کہا؟ تم کیا کہہ رہے تھے؟ سوہن لال رتی رام کا بیٹا۔ کتنی عجیب بات! خوب! خوب! وہ دوبارہ سیٹ کی نشست سے ٹیک لگائے دیر تک مجھے گھورتے رہے۔ "ٹھہرو، مجھے سوچنے دو۔ تمھارے پاس ایک بند گلے کا جودھ پوری کوٹ ہے؟ ہے نا؟ بہت خوب! اور تمھیں پگڑی باندھنا آتا ہے؟ نہیں؟ کوئی بات نہیں یہ کام کر دوں گا حالاں کہ میں بھی اس میں ماہر نہیں ہوں۔ اب ان کالروں اور نکٹائیوں کا زمانہ نہیں رہا۔ چلو پہلے گھر چلتے ہیں۔ جب تم کپڑے بدل چکو گے تو ہم ان سے جا کر ملیں گے۔"

"کن سے ملیں گے۔"

"لالا سوہن لال سے..... اور کس سے؟"

"آپ انھیں جانتے بھی ہیں؟"

"قطعی نہیں۔" نانو کاکا نے کہا۔

بہرحال میں نے اپنا جودھ پوری کوٹ پہنا اور نانو کاکا نے ایک بڑی سی نارنجی پگڑی میرے سر پہ باندھی۔

"تمھیں اب برتاؤ کرنا ہے جیسے تم میرے........ میرا مطلب ہے اے ڈی سی ہو" جب ہم سوہن لال سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے تو نانو کاکا نے تاکید کی۔

بے داغ سفید لباس میں ملبوس ایک سکریٹری نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں ایک سفید اور ٹھنڈے کمرے میں لے جا کر بٹھانے کے بعد بڑے مہذب طریقے پر ہماری آمد کا سبب دریافت کیا۔

"یوں ہی چلے آئے" نانو کاکا نے عمومی انداز سے کہا" زمین داروں کے کنونشن کے تعلق سے دلی آنا ہوا تھا۔ اب آپ سے کیا چھپا ہے۔ آج کل ہم زمین داروں کو بھلا کون پوچھتا ہے۔ اس لیے ہم غیر سرکاری طریقے پر ہی مل لیتے ہیں۔ وی۔ پی نے بھی مجھے تار کیا تھا کہ ان سے مل لوں لیکن وہ تو کل تک واشنگٹن سے لوٹنے والے نہیں ہیں۔ اس لیے سوچا لالا جی ہی سے مل لوں اور انھیں بتا دوں کہ ہم زمین داروں نے کسانوں کے ووٹوں کے لیے کون سی راہ نکالی ہے........"

نانو کاکا قدرے ہچکچائے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ سیکریٹری کو متاثر نہیں کر پا رہے ہیں۔ اور وہ محض اخلاقاً ان کی باتیں سن رہا ہے۔

اور مختلف ہے۔

"مجھے بتا کر جا ہو گا کہ لالہ جی اس وقت خالی ہیں یا نہیں" - سیکریٹری نے کہا" وہ ملاقاتیوں سے وقت مقرر کیے بغیر شاذ ہی ملتے ہیں۔"

لالہ جی اتفاقاً خالی تھے کیوں کہ بغل والے کمرے سے ان کے حقے کی دھیمی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی - اور پھر ہم نے اس گرگٹ سیکریٹری کو ان سے بات کرتے سنا۔

"آج کون سا دن ہے" مانو کاکا نے مجھ سے دریافت کیا۔ مجھے ان کی آواز غیر معمولی اونچی لگی۔

"منگل" میں نے بتایا۔

"اوہ بس منگل! اور اتوار کو میں بیروت میں تھا..... حیرت ہوتی ہے نا؟"

میں نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا "یقیناً" میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور اگر میں نے حضرت کی بات مان لی ہوتی تو اب تک ملک سے باہر ہی ہوتا۔ اولڈ ایچ پی تو مجھے وزیر خارجہ تک کھینچ لے جانے کے لیے بے تاب تھا۔"

بغل والے کمرے میں سنائی دینے والی حقے کی متواتر گڑگڑاہٹ اچانک تھم گئی۔

"کیا کہا تم نے؟" مانو کاکا نے پوچھا حالاں کہ میں نے اپنا منہ تک نہیں کھولا تھا۔

"میں کیوں نہیں رکا؟ تمھیں معلوم ہے پچھلی بار جب ہم جینوا میں تھے تو ایچ پی نے کیا کیا؟ اس نے مجھے روئی کے مذاکرات میں شامل کرا لیا تھا۔ اس کے علاوہ بمبئی سے ایس کے کے تار پر تار چلے آ رہے تھے......."

ٹھیک اسی وقت لالا سوہن لال رتی رام اندرونی کمرے سے ڈگمگاتے ہوئے باہر آئے۔ سیکریٹری ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ اسی لمحے سے چند ایک غرانٹ سیاست داں کی شکر ریز خوش اخلاقی میں ڈوب گئی۔ جیسے ہی تعارف کا سلسلہ ختم ہوا سکریٹری کو فوری کافی، مٹھائی اور پان آرڈر دینے کے لیے روانہ کیا گیا۔

کچھ دیر تک محتاط انداز میں زمین داروں، ووٹوں اور موسم کے بارے میں لفظی زور آزمائی ہوتی رہی پھر وہ دونوں مطلب کی بات آ گئے۔

"سنا ہے آپ حضرت برکت علی کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔" سوہن لال نے ایک دل پذیر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اوہ اولڈ ایچ پی! آپ کو کیسے پتا چلا ہماری دوستی کا؟ دراصل ہم دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا۔ آج بھی یہ بات مجھے بہت متاثر کرتی ہے کہ وہ کوئی بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے بغیر نہیں کرتا۔ جب پی۔ ایم نے اسے سفارت پیش کی تو اسے قبول کرنے پر اسے کس نے آمادہ کیا؟"

"آپ نے؟"

"درست کہا۔ میں نے....... گڈ اولڈ ایچ۔پی۔"

"ہا۔ہا۔ہا۔ہا" سوہن لال نے اپنے پان سے داغ دار دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ "ایسی صورت میں میرے لیے یہ ایک مبارک دن ہے جو آپ اس غریب خانے پر تشریف لائے۔ نہایت ہی مبارک.... کیوں کہ میرا بیٹا.... وہ آج کل وزارت خارجہ میں ہے.... حضرت برکت علی کے ہاں ٹریڈ کمشنر کے عہدے پر جا رہا تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ معاملات کیسے پیچ در پیچ ہوتے ہیں۔ لگتا ہے کسی نے

میرے بیٹے کے تعلق سے سفیر صاحب کے کان بھر دیے۔ مہاجر کی جائیداد کے لین دین کا معاملہ تھا۔ ورنہ اصل وجہ ایک قطعی قانونی ......"

نانو کاکا نے ہاتھ کے اشارے سے مزید وضاحت کو غیر ضروری بتلاتے ہوئے کہا" یہ کون سا مشکل کام ہے ؟ میں ایچ بی کو لکھ دوں گا کہ وہ یہ کام کر دیں۔ نہیں، نہیں، اس میں شکریے کی کیا بات ہے ؟ بہرحال ہمیں یعنی ہم جیسی عوامی شخصیتوں کو ایک دوسرے کے کام آتے رہنا چاہیے۔ہاہاہا..... پھر نیکی کا بدلہ نیک ہے۔"

نانو کاکا نے اپنی چاندی کی نسوار دانی کھولی اور چٹکی بھر نسوار سونگھی۔ پھر اپنے انگوچھے کو جھٹکتے ہوئے ایک بے نیازی کے ساتھ وزیر فلاح کا ذکر کر دیا۔ سوہن لال کے چہرے پہ چپکی ہوئی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"کیا وہ آپ کے دوست ہیں ؟" انھوں نے قدرے تجسس سے پوچھا۔

"نہیں دوست تو نہیں ہیں" نانو کاکا نے اعتراف کیا" دوست تو نہیں ہیں۔"

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی" سوہن لال نے سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا" کیا کہوں بڑا ہی احسان فراموش نکلا وہ شخص۔ میں نے اسے ٹکٹ دیا۔ہر طرح سے اس کی مدد کی لیکن بدلے میں مجھے کیا ملا؟"

پتا چلا کہ وزیر موصوف اور لالا سوہن لال جو کبھی ایک دوسرے کے انتہائی گہرے دوست تھے پچھلے ایک سال سے یعنی جب سے وزیر موصوف نے اپنی بیٹی کی شادی لالا سوہن لال کے بیٹے سے کرنے کے پیغام کو ٹھکرایا ہے، ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے ہیں۔

"اسے کوئی راج کمار چاہیے" سوہن لال نے نتھنے پھلاتے ہوئے کہا" آج کل راجوں مہاراجوں کی حیثیت ہی کیا ہے ؟ بس! ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ وزیر صاب نے اپنے سارے راستے خود ہی بند کر لیے ہیں۔ مجھے تعجب ہوگا اگر انھیں اگلے الیکشن کے لیے ٹکٹ مل جائے۔ سخت تعجب، وہ میرے علم کے مطابق ابھی تک انھوں نے جنم کنڈلیاں بھی نہیں ملائی ہیں۔ دونوں طرف کے جیوتشی بھی ابھی تک یہ طے کرنے کے لیے نہیں ملے کہ یہ رشتہ مبارک ہو گا کہ نہیں۔"

"بڑی شرم کی بات ہے" نانو کاکا نے بھی نتھنے پھلائے" بڑی شرم کی بات! ویسے کس ریاست کا راج کمار ہے وہ؟"

"کوئی دو کوڑی کی ریاست ہے ننورا"

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ البتہ نانو کاکا ایک مرتبہ پھر یہ وعدہ کرنا نہیں بھولے کہ وہ آج ہی اولڈ ایچ بی کو خط لکھ دیں گے۔ جب ہماری کار روانہ ہوئی تو لالا جی اور ان کا سکتر اعلا دونوں نانو کاکا کو پورج سے سر جھکا کر رخصت کر رہے تھے۔

اس شام کو نانو کاکا حیرت انگیز طور پر خاموش تھے اور رات کا کھانا کھاتے ہی سو گئے۔ لیکن صبح اٹھے تو حسب معمول چہک رہے تھے۔

"آج ہم وزیر موصوف کے گھر جا رہے ہیں۔ اسی وقت!" انھوں نے اعلان کیا۔

"مجھے تو معاف ہی رکھیے ماما پلیز!" میں نے دہائی دی۔

"تمھاری گاڑی بہت پرانی ہو گئی ہے اور بہت چھوٹی بھی ہے۔ ہمیں اس سے کہیں زیادہ بارعب چیز کی ضرورت ہے۔ تم نے دیکھا وہ سیکریٹری شروع میں ہمارے ساتھ کیسی سرد مہری سے پیش آیا تھا۔ اگر ہم ایک بڑی گاڑی میں گئے ہوتے تو اس کا برتاؤ بالکل مختلف ہوتا۔"

"کیوں نہ ہم ٹیکسی میں چلیں ؟"

"نہیں، ٹیکسی نہیں، ایک بڑی گاڑی جسے ایک وردی پوش شوفر چلاتا ہو۔ جتنی بڑی ہو، اتنی اچھی۔"

مجھے یاد آیا کہ میرا ایک شناسا چند ماہ ہوئے ایک بھاری بھرکم، شاندار گاڑی کو جو شاید کسی شاہی جلوس میں چلنے کے لیے ہی بنائی گئی

ہوگی، نکالنے کی فکر میں تھا میں نے نانو کاکا کو یہ بات بتائی۔
"بن گئی بات! ہم اسے ایک مختصر ٹرائل کے لیے باہر لے جائیں گے۔" انھوں نے جھٹ سے تجویز پیش کی۔
"مجھے یقین ہے کہ ہم اصلی خریدار لگیں تو یہ بات ممکن ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایسے لگتے بھی ہیں۔ یہ موٹر گاڑیوں کے دلا دولت مند شخص کو میل بھر دوری سے سونگھ سکتے ہیں۔"
"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو" نانو کاکا نے کہا "ساری تفصیلات مجھ پر چھوڑ دو!"
"اور وہ وردی پوش شوفر کہاں سے آئے گا؟"
وہ تمہارے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟" نانو کاکا نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔
انھوں نے اپنی چیک بک نکالی۔ ایک ہزار روپے کا ایک چیک لکھا اور پھر اسے احتیاط سے موڑ کر اپنے ایک پرانے کوٹ کی اندرو جیب میں رکھ لیا۔
"اب اپنے دھوبی کو بلاؤ!" وہ مجھ سے بولے۔
میں جاکر دھوبی کو بلا لایا۔ نانو کاکا نے اسے وہ کوٹ دیا اور پھر اسے باہر لے جاکر کچھ سمجھاتے رہے اس کے بعد ہم سکا آٹو ڈیلر س۔ یاں پہنچے اور نانو کاکا نے مذکورہ کار کی ٹرائل لینے کی بات چھیڑی۔
ابھی ہم نے منیجر سے گفتگو شروع ہی کی تھی کہ دھوبی تیزی سے دکان میں داخل ہوا اس کے ایک ہاتھ میں نانو کاکا کا پرانا کوٹ لٹک تھا اور دوسرے میں چیک لہرا رہا تھا۔
"اچھا ہوا آپ مل گئے سرکار!" وہ ہانپتے ہوئے بولا "یہ دیکھیے آپ کے کوٹ کی جیب میں کیا رہ گیا تھا۔"
نانو کاکا نے وہ چیک ہاتھ بھر کی دوری پر تھاما اور کئی بار زبان کو چٹکارا۔
"میں بھی کتنا بے پروا ہوں۔ بار بار ایسی غلطی کرتا ہوں۔ اوپر سے بیرر چیک ہے۔ کوئی بھی بھنا سکتا تھا۔ یہ رکھ لو شریف آدمی" انھوں نے دھوبی سے کہا "یہ تمہاری ایمان داری کا انعام ہے حالاں کہ ایمان داری کا کوئی مول نہیں ہو سکتا۔"
یہ کہہ کر انھوں نے اسے دو روپے کا ایک نوٹ اور شاباشی دی۔
دولت مندی کی اس نمائش کے بعد کار سے متعلق ساری بات چیت بہت آسان ہو گئی۔ گاڑی میں نے چلائی۔ سفید جودھپوری کو اور نارنجی پگڑی میں۔ اور نانو کاکا پچھلی سیٹ پر شاہانہ انداز سے اس طرح بیٹھے کہ سرتاپا وہی لگ رہے تھے جو وہ لگنا چاہتے تھے یعنی کہ رجواڑے کے خاندانی راج جیوتشی۔
جب ہم اس گاڑی میں بیٹھ کر وزیر موصوف کی رہائش گاہ تک گئے تو سارے ملازمین اور سکریٹری نانو کاکا کی پذیرائی میں لگ گئے لیکن نانو کاکا نے اپنی آمد کا مقصد بتانے سے صاف انکار کر دیا اور ملاقاتیوں کا دفتر حاضر کرنے پر اصرار کرتے رہے۔
"ہم محض ایک رسمی ملاقات کے لیے آئے ہیں" انھوں نے اعلان کیا "میں منسٹر صاحب کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ یہ محض ایک ر ہے جیسے ہم اسٹیٹ والے حسب سابق نبھاتے چلے آرہے ہیں۔ ہز ہائی نس ان آداب کے سختی سے پابند ہیں۔"
ان لوگوں نے ملاقاتیوں کا دفتر پیش کیا اور میں یہ دیکھ کر دل سے نانو کاکا کا قائل ہو گیا جب انھوں نے بڑے فراٹے سے نہ صرف ا نام درج کیا بلکہ اس میں "مہاراجا منور کے خاندانی راج جیوتشی" کا اضافہ بھی کر دیا۔ اخیر میں انھوں نے دلی کا پتہ بھی لکھ دیا۔ یہ میرے گ

(باقی ص ۵۳ پر)

فاروق خالد

گڑیا

صبح کا اجالا پھیلنے کے ساتھ ہی نیلم اٹھ جاتی، اپنی ننھی منی آنکھوں سے صبح ہوتے دیکھتی اور چڑیوں کی چہچہار کو کانوں میں رس گھولتے سنتی اس دوران کبھی یوں بھی ہوتا کہ نیند کا غلبہ اسے دوبارہ آدبوچتا اور وہ اپنی بھاری بوجھل پلکوں کے بوجھ تلے دبے ایک غیر محسوس طریقے سے تحلیل ہوتی ہوئی کہیں گم ہو جاتی لیکن اسی لمحہ یا اس سے چند لمحات بعد مالکین کی تیز نوکیلی آواز اس کے وجود کو جیسے نوچ کر بستر سے نکال باہر کرتی اور وہ نیند سے مار کھائی ہوئی آنکھوں کو مستعد کرتے ہوئے فوراً ہی اٹھ بیٹھتی اور اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام پر مامور کر دیتی؛ کرنا ہوتا تھا اور پھر یوں ہوتا کہ اس کا مختصر سا جسم جو آج سے سات برس پہلے قدرت کے کارخانے سے ایک نئے نکور بلور کی مانند ڈھل کر نکلا تھا اس کی چار دیواری میں متحرک اور متعین خدمات کے پٹوں پر سوار ہو جاتا اور وہ ایک گراری سے نکل کر دوسری گراری میں اور ایک پٹے پر چڑھ کر دوسرے پٹے پر پھیلتی ہوئی مختلف نوعیت کے چھوٹے بڑے کام سرانجام دیتے ہوئے تھکن سے چور اور درد کے مارے ہوئے جسم کو رات کے گہرے تاریک سمندر میں انڈیل دیتی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں پیدا کی گئی ہے، کس لیے بنائی گئی ہے اور کس سوچ کے تحت تخلیق کی گئی ہے۔ وہ شروع سے ہی اس گھر میں تھی اور یہ شروع کہاں سے شروع ہوا تھا اس بارے میں بھی وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس کی امی کون تھی، ابا کیسے تھے اور کہاں گئے، یہ بھی اسے نہیں بتایا گیا تھا۔ اسے اگر بتایا گیا تھا تو صرف یہ کہ برتن احتیاط سے دھونے ہیں۔ کپڑے پوری توجہ سے استری کرنے ہیں اور بوٹ اچھی طرح سے پالش کرنے ہیں۔ اسے یہ کام کرتے ہوئے یا اس انداز میں اپنے شب و روز گزارتے کبھی ملال نہیں ہوا تھا۔ دراصل ایسا کوئی تصور اس کے پاس تھا ہی نہیں وہ کام کرتی تھی اور خوش ہوتی تھی ایسے ہی جیسے ہم صبح سویرے اٹھتے ہیں، بھاگم بھاگ سائیکل چلاتے ہوئے دفتر پہنچتے ہیں، صاحب کو سلام کرتے ہیں اور دن میں کوئی پچاس مرتبہ "یس سر، یس سر" کہنے کے علاوہ جی کہتے نہیں تھکتے۔ سارا دن دفتری کاموں میں مغز ماری کرنے، غلطیاں کرنے، کاٹنے اور ٹھیک کرنے، افسردہ ہونے اور پریشان ہوتے ہوئے اس دوران کبھی کبھار دوست کی کسی بات پر مسکرا لینے اور اس فضا میں مقید ہو کر آٹھ دس گھنٹے گزارنے کے بعد جب گھر پہنچتے ہیں، ماہوار تنخواہ کا وہ مختصر حصہ جو ہم نے بہ صد مشکل قرض اور زندگی کے باقی تقاضوں کی دست برد سے بچایا ہوا ہوتا ہے اسے سستی عیاشیوں کی تحویل میں دے کر سنیما دیکھتے ہوئے، اچھی برانڈ کا سگریٹ نوچتے یا اپنے قد سے اونچے ہوٹلوں میں بیٹھ کر اپنے تئیں خوش ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اتنی بات ضرور تھی کہ اس کی خوشی کی نوعیت ہماری حاصل کردہ خوشیوں کے مختصر اور ناپائیدار وقفوں سے کہیں زیادہ بالاتر اور مسرت آگیں تھی۔ اس کے پاس یکساں اور گہری طمانیت تھی، وہ کام میں بھی خوشی محسوس کرتی تھی اور آرام میں بھی جب کہ ہمیں اپنے وجود کو خوشی کے خود ساختہ سانچوں میں ڈھالنے کے لیے کئی جگہوں پر اور کئی طریقے سے ناخوش اور افسردہ ہونا پڑتا ہے۔ باتیں سننی پڑتی ہیں اور خاموش رہنا پڑتا ہے۔

نیلم اس گھر میں کام کرتی تھی، کپڑے دھوتی تھی، کھانے پکانے کی اشیا بازار سے لاتی، باورچن کا کہا مانتی تھی اور مالی کا حکم سنتی تھی وہ متفرق کاموں میں بڑی آپا کا ہاتھ بٹاتی تھی اور موٹر ڈرائیور جو کام اسے کہتا وہ بھی کرتی تھی۔ وہ سب کا کہا مانتی اور سب کے کام آتی تھی لیکن

اس کے باوجود روفی سے اس کے تعلقات بڑے خوش گوار تھے۔ روفیہ اس گھر کی اکیلی اولاد تھی، اس کے ابا تھے، امی تھی اور یہ خود تھی جس سے سب پیار کرتے تھے۔ اس کے پیار کی خاطر سب کچھ کرتے تھے۔ روفی اچھے اچھے کپڑے پہنتی اور ہر روز اسکول جاتی تھی اس کی عمر نیلم جتنی ہی ہوگی، یوں سمجھیے کہ اگر انیس بیس کا فرق نہ بھی تو اٹھارہ بیس کا فرق ضرور رہا ہوگا۔ نیلم اگر سات سال کی ہوگی تو روفی بھی کوئی ساڑھے سات برس کی رہی ہوگی۔ یہ تفاوت بظاہر دکھائی نہیں دیتا تھا اور یہی محسوس ہوتا کہ ان دونوں کی عمروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نیلم تو بہت سے کام کرتی تھی لیکن ان کے علاوہ اسے اپنے چھوٹے موٹے کام بھی کرنے ہوتے تھے۔ ان تمام مصروفیات سے بچ نکلنے کے بعد اسے جو وقت ملتا اس دوران وہ کوٹھی کے کسی الگ تھلگ کونے میں پناہ لیتی اور سرخ پیلے دھاگوں اور رنگ برنگی اون کے مختصر سے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر عجیب و غریب قسم کی اشیا بنانے میں مشغول رہتی تھی۔ گیلی مٹی اور گوندھے ہوئے کچے آٹے سے گڑیاں بناتی، انھیں تنکوں کی رسوئی میں چھپا دیتی اور چھوٹی چھوٹی پلیٹوں میں جو دراصل بیر اور کوک کے خالی ڈھکن ہوتے، خود اپنے ہاتھوں سے کھانا ڈال کر لے جاتی اور اسے گڑیوں کے سامنے رکھ کر ان سے بے معنی اور ادھوری باتیں کیا کرتی تھی اس دوران اگر روفی اس کے پاس آجاتی تو دونوں مزے سے مل کر کھیلتیں اور آپس میں باتیں کرتیں۔ یہ دونوں دوست تھیں اور بیش تر وقت اکٹھی رہتی تھیں۔ اسکول سے آنے کے بعد جب روفی اکیلی ہوتی اور نیلم کو اور کوئی کام نہ کرنا ہوتا تو یہ دونوں باغ میں تتلیوں کی تلاش میں نکل جاتیں اور رنگ برنگی تتلیوں کو پکڑ پکڑ کر ڈبے میں جمع کرنے لگتیں۔ کبھی کبھار ان میں جھگڑا بھی ہو جاتا تھا اس موقع پر دونوں ایک دوسرے کو تبادلے میں دی ہوئی اشیا واپس لے لیتیں تھیں اور غصے اور افسردگی کے عالم میں تھوڑے ہی فاصلے پر الگ الگ بیٹھ جاتی تھیں تب اچانک یوں ہوتا کہ نیلم تیزی سے اٹھتی اور روفی کے پاس جا کر اپنے ننھے منے لہجے کو صحیح سلامت کرتے ہوئے پوچھتی "روفی کل اسکول سے جو تم رنگین تصویروں والی کتاب لائی تھیں کیا ایسی ہی کوئی اور تمھارے پاس ہے؟" روفی جو اپنی گڑیا کے کپڑے الٹے سیدھے کر رہی ہوتی ایک دم چہک اٹھتی اور بڑے پیارے انداز میں کہتی۔ "اس وقت تو میرے پاس نہیں ہے، لیکن میں تمھیں لا دوں گی۔" روفی اپنی سانس کی پھوار نیلم کے چہرے میں گم کرتے ہوئے پوچھتی۔ "کیا یہ تمھیں بہت پسند ہے، اچھا میں تمھارے لیے ایسی دو کتابیں لیتی آؤں گی، اب تو خوش ہو نا۔ بس اتنی سی بات تھی ناراض ہو گئی۔" "میں کب ناراض ہوتی ہوں تم تو خود مجھ سے نہیں بولتی تھیں۔"

وہ یہ باتیں کرتیں اور دوبارہ مل بیٹھتی تھیں۔ جس جگہ یہ کوٹھی واقع تھی چوں کہ اس کے اردگرد اور کوئی رہائش گاہ نہیں تھی اور یہاں نیلم کے علاوہ روفی کے عمر کی اور کوئی لڑکی بھی نہیں تھی اس لیے ان دونوں کی دوستی آپ ہی آپ پیدا ہو گئی تھی جس میں یہاں کے مخصوص حالات کا گہرا دخل تھا۔ یہ دونوں مل جل کر کھیلتیں کودتیں اور وسیع و عریض کوٹھی میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتیں لیکن ان کی سرگرمیوں پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی کسی نے نیلم کو روفی کے ساتھ کھیلنے پر منع کیا تھا کیوں کہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ نیلم روفی کے پاس کھیلنے نہیں جاتی تھی بلکہ روفی اس کے ساتھ بیٹھنا، باتیں کرنا اور کھیلنا پسند کرتی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ کھیلتیں اور اچھل کود میں مصروف رہتی تھیں۔ مگر کبھی یوں بھی ہوتا کہ یہ دونوں کسی درخت کے نیچے بیٹھی قینچی سے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ رہی ہوتیں کہ اچانک ایک شور اٹھا ہوتا جیسے آسمانی بجلی کڑکی ہو اور ماحول کو منتشر کرنے اور فضا کو چیر دینے والی ایک گرج دار آواز سنائی دیتی۔ "نیلم۔" روفی کے پاپا جنھیں کہیں جانے کی جلدی ہوتی دھاڑتے "نیلم کی بچی جوتے پالش ہو گئی یا نہیں...."

روفی کے بابا ایسے تھے جنھیں ہمیشہ کہیں جانے کی جلدی ہوتی تھی اور پھر وہاں سے لوٹنے کی بھی جلدی ہوتی تھی۔ یہ ہر وقت ایک نامعلوم اور سمجھ میں نہ آنے والی تیز رفتار صورت حال کا سامنا کیے رہتے تھے۔ انھیں ہر بات میں ہر چیز کی جلدی ہوتی تھی۔ بعض اوقات یوں

ہی ہوتا کہ یہ اپنی جلد بازی کو اس قدر بڑھا دیتے کہ جلدی میں خود پیچھے رہ جاتے اور ان کی جلد بازی بہت آگے نکل جاتی۔

نیلم فوراً اٹھی، گڑیوں اور باقی ماندہ چیزوں کو کسی کونے میں سمیٹتی اور پالش کیے ہوئے جوتے لے کر صاحب کے پاس پہنچنے کو اٹھتی روفی جو ان موقعوں پر نیلم کی عارضی غیر موجودگی کے باعث پریشان ہو جاتی تھی تیز لہجے میں کہتی۔ "نیلم تم کہاں جا رہی ہو، بیٹھی رہو۔ دیکھتی نہیں ہو، ابھی گڑیا کے فراک کا دوسرا بازو سینا ہے۔" وہ اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتی۔ "تم اسے ٹھیک کرو پاپا کو جوتے میں دے آتی ہوں۔" لیکن وہ خود جوتے دے آنے کے بجائے کسی اور کو تلاش کر کے اسے یہ کام کہہ کر فوراً لوٹ آتی تھی۔

چند روز ہوئے، روفی کے گھر اس کے پاپا کے ایک دوست کچھ عرصہ ٹھہرنے کی غرض سے آئے۔ ان کے ساتھ ان کا چھوٹا لڑکا سلیمان بھی تھا جو دوسری جماعت میں پڑھتا تھا اور بڑا باتونی تھا۔ یہ یہاں رہا تو ان دونوں کا دوست بن گیا اور یہ سب اکٹھے آپس میں کھیلنے لگے۔ سلیمان ان دونوں سے ذرا چھوٹا تھا مگر باتیں بہت کرتا تھا۔ اور اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے انھیں خوب ہنساتا تھا۔ نیلم کو اب جو بھی کام کرنا ہوتا تھا اسے جلدی جلدی ختم کرتی اور کھیل کود میں ان کے ساتھ شریک ہو جاتی تھی۔ ایک روز روفی اپنے پاپا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر شہر گئی ہوئی تھی۔ نیلم کو کچھ کام کرنا تھا۔ وہ باورچی خانے میں تھی اور سلیمان بے چارہ اکیلا ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ وہ کچھ دیر تو دیوار گیر کیلنڈر کی خوب صورت تصویروں سے جی بہلاتا پھر اکتا کر باہر نکل آیا اور نیلم سے ملنے چل دیا۔ نیلم اسے کہیں دکھائی نہ دی تو یہ اکیلا ہی باغ کو چل دیا اور ادھر ادھر بلا مقصد آوارہ گردی کرتا رہا۔ دوسری طرف نیلم باورچی خانے سے فارغ ہو کر سلیمان کو تلاش کرتے کرتے باغ میں پہنچی تو اس نے دیکھا سلیمان ایک درخت کے نیچے بیٹھا بہت سے پتوں کو جمع کیے کچھ بنا رہا ہے۔ وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئی اور پورے انہماک سے اسے کام کرتا ہوا دیکھنے لگی۔ نیلم سلیمان کو پتوں سے کھیلتے دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک خالی گلاس پر پڑی جو پیچ کے ساتھ زمین پر پڑا تھا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور اسے کوٹھی کے اندر کہیں رکھنے کے لیے اٹھی لیکن تھوڑی دور جا کر پلٹ آئی اور مسکراہٹ بھرے لہجے میں سلیمان سے بولی۔

"سلیمان! پانی پیو گے؟" سلیمان نے گردن کی ہلکی سی جنبش سے انکار کر دیا اور بولا۔ "میں ابھی پی کر آیا ہوں، پانی کو چھوڑو یہ دیکھو میں کیا بنا رہا ہوں۔ اس نے کھجور کے تین لمبے لمبے پتوں کو ایک دوسرے میں پیوست کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اچھا تو میں یہ گلاس اندر رکھ دوں، ایسا نہ ہو کہ کہیں ٹوٹ جائے۔" نیلم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اندر بھاگ گئی۔ سہ پہر کے وقت نیلم نے سلیمان کو اپنی گڑیاں اور ان کے رنگ برنگے فراک دکھائے جو اس نے خود سیے تھے۔ سلیمان بڑے شوق سے ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بہت متاثر ہوا ہو، وہ ایک بڑی سی گڑیا کو اٹھائے بولا.... "بازار میں کتنے کو مل جاتی ہے۔" نیلم جواب میں زور سے ہنسی اور بولی۔ "واہ جی واہ! بازار سے کہاں ملتی ہے۔ یہ تو میں نے خود بنائی ہے۔" "اچھا..... " سلیمان نے تحیر زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ دوسرے دن بھی یہ دونوں اکٹھے کھیلتے رہے، سلیمان نے اسے بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیاں سنائیں جن میں زیادہ تر لطیفے تھے۔ نیلم یہ چھوٹی چھوٹی باتیں سن سن کر ہنستی اور ہنستے ہنستے اس سے پوچھتی، یہ تم نے کہاں سے سنے ہیں۔ "واہ! سنی کہاں سے تھیں.... " وہ بھی بڑے غرور سے بولا۔ "میرے ابا جان بتاتے ہیں، مجھے تو اور بھی بہت سی کہانیاں یاد ہیں۔"

باتوں کے دوران اچانک نیلم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ تم یہاں بیٹھو میں تمھیں ایک چیز دکھاتی ہوں، دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔" وہ بھاگ کر اندر گئی اور تتلیوں کے پروں والا ڈبہ اٹھالائی اور اسے رنگوں سے مزین باریک اور مہین پر دکھانے لگی۔ روفی اندر سوئی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ بھی آنکھیں ملتے ہوئے ان کے پاس آ گئی اور اس نے جب سلیمان کو اس قدر دلچسپی سے پروں کو دیکھتے ہوئے

پاپا تو تیز لہجے میں نیلم کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "تمھارے کہاں ہیں۔ یہ تو میرا ڈبہ ہے۔" نیلم نے روفی کو جواب دیا۔ اور ایک خو صورت پر نکال کر سلیمان کو دکھانے لگی جو بہت لمبا اور چمک دار تھا۔ سلیمان بڑے انہماک سے یہ دیکھ رہا تھا، اس نے پر کو اپنی انگلیوں پکڑا اور اسے گھماتے ہوئے وارفتگی سے سرشار لہجے میں بولا۔ "یہ تو بہت ہی خوب صورت ہے۔" روفی جو یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اچانک بڑی اور اس نے نیلم سے پروں کا ڈبہ چھین کر اپنے بازوؤں میں چھپالیا۔ نیلم نے اسے لینا چاہا تو اس نے ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر اور بولی۔ تم چور ہو، تم نے میرے پر چرا لیے ہیں، یہ سب پر میرے ہیں نکل جاؤ ہمارے گھر سے۔"

سلیمان بے چارہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا اور ان دونوں کے بیچ آتا ہوا بولا۔ "روفی تم اس سے کیوں لڑتی ہو، نیلم کے پر اسے وا کر دو۔" "نہیں سلیمان یہ سب چیزیں ہماری ہیں۔" روفی جو، اب خاموش ہو گئی تھی اور اس کے آنسو کہیں غائب ہو گئے تھے بڑی اونچی آواز بولی۔ "یہ کوٹھی ہماری ہے اور باغ بھی اور یہاں جو تتلیاں آتی ہیں۔ انھیں ہم کھانا کھلاتے ہیں۔"

روفی نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں کو خوشی سے بھینچا اور انھیں زبان سے صاف کرتے ہوئے بولی۔ "آؤ سلیمان اندر چلیں، تمھیں اپنے کھلونے دکھاتی ہوں۔ کیا تمھارے پاس ناچنے والا ہاتھی ہے جو پھوں پھوں کرتا ہو، میرے پاس ہے۔ میرے پاپا میرے لیے لندن سے لائے تھے، آؤ میں تمھیں دکھاؤں۔" روفی اور سلیمان بہت دیر تک ان کھلونوں سے دل بہلاتے رہے جو پھوں پھوں کرتے، چوں چوں اور شوں شوں کرتے تھے اور ادھر نیلم اکیلی ایک تنہا درخت کے نیچے بیٹھی اپنی دردناک سسکیوں کو سمیٹنے میں مصروف تھی۔

روفی نے اٹھ کر فریج کھولا اور سکوئش کی بوتل نکال لائی جس میں سے اس نے اور سلیمان نے کئی گلاس ٹھنڈے مشروب کے پیے، میں سلیمان نے روفی کو اپنے اسکول کے متعلق دل چسپ اور مزے دار باتیں سنائیں اور روفی نے اسے اپنی سہیلیوں کے قصے بتائے جو بڑ شریر تھیں اور اس سے لڑتی جھگڑتی تھیں۔ "ہاں! لڑکیاں ہوتی ہی خراب ہیں۔" سلیمان بولا "تم ان سے کبھی نہ ملا کرو۔" "میں تو ان سے بھی نہیں کرتی، یہ خود مجھے تنگ کرتی ہیں، کسی دن میں نے انھیں اپنے ڈرائیور سے پٹوانا ہے۔" روفی نے ترش رو ہوتے ہوئے کہا۔

شام کے وقت سلیمان کمرے میں اکیلا بیٹھا رنگ دار پنسلوں سے ایک سفید کاغذ پر کچھ بنا رہا تھا کہ نیلم اندر داخل ہوئی اور اس پاس کھڑے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں بولی۔ "ذرا دکھانا مجھے یہ پنسلیں، ہائے کتنی خوب صورت ہیں۔" سلیمان جس نے دل میں فیصلہ کر تھا کہ وہ اب نیلم سے کبھی نہیں بولے گا بلکہ صرف روفی سے یا اس کے کھلونوں سے کھیلے گا اسے کوئی جواب نہ دیا اور برابر الٹی سیدھی لکیر کھینچتا رہا۔ نیلم چپکے سے اس کے پاس بیٹھ گئی اور میز پر پڑی بہت سی رنگین پنسلوں سے ایک کو اٹھا کر غور سے دیکھنے لگی، سلیمان نے کے ہاتھ سے پنسل چھین لی اور بولا۔ "نیلم ہم تم سے نہیں بولتے، روفی کہتی ہے تم چور ہے۔" نیلم کو یہ سن کر جس اذیت ناک بے چارگ احساس ہوا اس کا بیان مشکل ہے، اس کے ننھے ننھے ہونٹ جو طمانیت کا نکھار لیے متوازن اور یک سو تھے آپ ہی آپ کھل گئے اور وہ حیر و استعجاب کے عالم میں سلیمان کو دیکھنے لگی۔ اس نے سلیمان سے مزید کوئی بات نہ کی اور یہاں سے اٹھ کر باہر دالان میں چلی گئی اور ریک پڑے ہوئے جوتوں کو گرد و غبار سے پاک کرنے میں مشغول ہو گئی، پھر اس نے فرش دھویا اور دیواروں کی جھاڑ پونچھ کی جس کے متعلق ا فوری احکامات موصول ہوئے تھے۔ سب کام کر چکنے کے بعد اس کے دل میں یہ خیال ایک انگڑائی لے کر پیدا ہوا کہ وہ جائے اور روفی سلیمان کے ساتھ مل کر کھیلے مگر اس نے اس خیال کو ایک طویل ہچکی کے ذریعے مار ڈالا اور آپ ہی آپ رونے لگی۔ وہ اٹھی اور رسوئی چھپائی گڑیوں کو نکال کر ان سے اکیلی کھیلتی رہی، ان سے ہنستے، کبھی مسکراتے اور کبھی گہری سنجیدگی طاری کرتے ہوئے الٹی سیدھی باتیں کر رہی اور جواب نہ پا کر ان کی سج دھج اور انھیں سنوارنے میں نئے سرے سے مشغول ہو گئی۔

شام کو جب روفی کے پاپا، ممی اور سلیمان کے اباجان اکیلے گھر لوٹے تو روفی بسورتے ہوئے کہا۔ "ممی! نیلم ہمیں کھیلنے نہیں دیتی اور ہماری چیزیں خراب کرتی ہے۔" روفی کی ممی نے اسے دلاسا دیا اور بولی۔ "اس حرام زادی کی یہ مجال، کہاں ہے وہ؟ تم یہاں کھیلو میں ابھی اس کم بخت کو ٹھیک کرتی ہوں۔" ہوا یہ کہ اس شام جو اب رات میں تبدیل ہو رہی تھی روفی کی ممی کو نیلم دکھائی نہ دی اور اندر جا کر اپنے خاوند کے پاس بیٹھ گئیں جو سلیمان کے ابا سے باتیں کر رہے تھے۔ اس رات ان کی باتوں کا سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا جو آہستہ آہستہ شور و شغب میں ڈوب گیا۔ دوسری صبح روفی نے نیلم کو پاس کھڑے دیکھ کر کہا۔ "نیلم میرے فراک کو استری کر دو، ذرا جلدی، مجھے اسکول جانا ہے اور ہاں اب ہمارے ساتھ نہیں کھیلنا، سلیمان کہتا ہے کہ وہ مجھے بہت سی کہانیاں سنائے گا اور اچھی اچھی چیزیں لاکر دے گا۔" نیلم نے اپنی بے نور لا طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور فراک اٹھا کر چلی گئی۔

فراک پہن چکنے کے بعد روفی نے تیز آواز میں نیلم سے پوچھا۔ "اور تم نے میرے جوتے کیوں نہیں پالش کیے۔" پھر وہ بھاگتی ہوئی اپنی ممی کے کمرے کی طرف گئی اور کھلے دروازے کو کھٹکھٹانے کے بعد پکاری۔ "ممی! ممی، یہ نیلم میرا کہا نہیں مانتی..." اس کی ماں جو ابھی تک سوئی ہوئی تھی چنگھاڑتی ہوئی اٹھی اور روفی کے قریب پہنچ کر اپنی سرخ و سیاہ آنکھوں کو مٹکا کر پھیلاتے ہوئے بولی۔ "کہاں ہے یہ نیلم کی بچی۔"

نیلم کو اس روز اتنی مار پڑی، اتنی مار پڑی کہ بے چاری روتے روتے یک لخت چپ ہو جاتی اور پھر رونے لگتی۔ اس روز اس نے تمام کام آنسوؤں سے تر آنکھیں لیے متورم ہاتھوں سے کیے۔ نیلم نے جو برتن صاف کیے خیال ہے کہ ان کی صفائی میں پانی کے ساتھ اس کے آنسوؤں کی نمی بھی شامل تھی اور کپڑے دھوئے ان میں بھی یہی نمی مصروفِ کار رہی تھی۔ پردوں دیواروں اور کھڑکیوں کی جھاڑ پونچھ میں کپڑے یا برش سے زیادہ نیلم کے آہوں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس روز وہ زیادہ تر روتی رہی اور اور کھوئی کھوئی سی رہی لیکن کسی نے بھی تو اس کے پاس آکر نہ پوچھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے اور کس لیے روتی رہی ہے۔ باورچن کو اسے کھانا دینا یاد رہا اور نہ مالی نے اسے خوش کرنے کے لیے پھول لاکر دیے، وہ کس کے پاس جاتی کسے پکارتی؟ اس بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتی رہی اور اس کا پورا وجود ایک سرد احتجاج کے زیر اثر منجمد ہوتا رہا۔ رات کو جو کھانا اس نے کھایا وہ بہت کم تھا۔ محض اتفاق کہیے کہ اس رات بس اتنا ہی بچ پایا تھا اس نے جیسے تیسے یہ لقمے زہر مار کیے اور اپنی گڑیوں کو بازوؤں میں چھپائے ایک متعفن چارپائی کی غلیظ آنتوں میں دفن ہو گئی۔ یہ چارپائی کھلے آسمان تلے پڑی تھی اور انسانوں سے کافی فاصلے پر تھی۔ وہ بستر سے بے نیاز فوم اور ربڑ سے لاتعلق اور اوپر نیچے کی چادر سے بے خبر فقط ایک چیتھڑا ہوتے ہوئے تکیے کے سہارے سو رہی تھی اور دور اوپر فضا کی بلندیوں میں سے نظر کرتے ہوئے یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے کوئی گڑیا اپنی ہی جیسی سہیلیوں کے ساتھ کسی گہری کھڈ میں پڑی آرام کر رہی ہو جسے لاڈلے بچوں نے ایک بے کار کھلونا جان کر یہاں ڈال دیا ہے۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی کیلشیم جم کر سفید پڑ گئی تھی اور بھیگے ہوئے لمبے سیاہ بالوں کی لٹیں گردن میں حمائل تھیں۔

------- O O O -------

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجی جائیں۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

سیرۃ امیرالمومنین حضرت عثمان بن عفانؓ مولف: مورخ احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری
(قدیم عرب تاریخ انساب الاشراف کا اردو ترجمہ) مترجم کا نام: مولوی محمد حبیب اللہ صاحب بی۔اے۔(عثمانیہ)
تبصرہ نگار: ڈاکٹر سید رشید الحسن (مرحوم) نظر ثانی: ڈاکٹر محمد یوسف الدین۔

عہد رسالتؐ کا درخشاں دور، تاریخ اسلام میں، ایک زریں عہد تسلیم کیا جاتا ہے، ہجرت مدینہ کے بعد، سرکار دو عالمؐ نے وہاں ایک مملکت قائم کی، اور تمام باشندگان شہر کو، جو مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں، عیسائیوں اور بت پرستوں پر مشتمل تھے، ایک تحریری دستور عطا کیا، جو ہم تک پہنچا ہے۔ سرکار دو عالمؐ کی دس سالہ مدنی زندگی میں یہ مملکت، جو ابتداء دس مربع میل سے کم تھی، دس لاکھ مربع میل پر پھیل گئی، اور خلیفہ ثالث، امیرالمومنین حضرت عثمان بن عفانؓ کے عہد میں یہ مملکت، تین براعظموں ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں پھیل گئی۔ عہد خلافت عثمانؓ میں، بحیرہ روم کے مختلف جزیروں کے علاوہ اسپین کا ایک حصہ بھی فتح ہو چکا تھا۔ مسلمان مورخ طبری کے علاوہ انگریز مورخ گبن کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

عہد رسالتؐ کے زریں دور کے بعد، خلافت راشدہ کا عہد، سنہرا دور سمجھا جاتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نامور پروفیسر مولانا شبلی نے خلیفہ ثانی فاروق اعظمؓ، امیرالمومنین حضرت عمر بن الخطابؓ پر الفاروق جیسی لاجواب تحقیقی کتاب لکھی، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبہ دینیات پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی نے خلیفہ اول امیرالمومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ پر ایک بڑی اچھی تحقیقی کتاب لکھی۔

اب ڈاکٹر سید عبداللطیف کے قائم کردہ انسٹیٹیوٹ آف انڈو مڈل اسٹڈیز حیدرآباد کی جانب سے خلیفہ ثالث امیرالمومنین حضرت عثمان بن عفانؓ کی سوانح عمری "سیرۃ امیرالمومنین حضرت عثمان بن عفانؓ" علمی دنیا کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ یہ ایک قدیم عرب مورخ احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری کی مشہور عرب تاریخ انساب الاشرف جلد ۵ کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔ مورخ بلاذری ایک قدیم مورخ ہے اور مورخ ابن سعد اور مورخ طبری کی درمیانی کڑی ہے۔ عربی زبان میں جو کتاب جتنی پرانی ہے، اتنی ہی زیادہ معلومات آفرین ہے کہ ان مسلمانوں کے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔

کتاب مذکور کے مترجم مولوی محمد حبیب اللہ صاحب مرحوم (برادر اکبر ڈاکٹر محمد حمید اللہ) تھے۔ صاحب موصوف نائب ناظم بندوبست (لینڈ ریکارڈ) تھے۔ مولوی محمد حبیب اللہ صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک نامور سپوت تھے، مرحوم نے انتقال سے قبل، اپنے ایک قریبی رشتہ دار ڈاکٹر محمد یوسف الدین (سابق صدر شعبہ مذہب و ثقافت عثمانیہ یونیورسٹی) سے خواہش کی کہ طباعت سے قبل وہ بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ ڈاکٹر محمد یوسف الدین سے علمی دنیا بخوبی واقف ہے، مشہور نقاد اور مفکر مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے سفر نامے "تاثرات سفر دکن" میں لکھا ہے:

"شعبہ مذہب و ثقافت کے استاذ، ڈاکٹر محمد یوسف الدین پرانے ملنے والے نکلے، کئی، کئی کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں، ایک بڑے علمی خاندان کے فرد، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے عزیز ہیں، سرتاپا علم ہیں بلکہ علم داں بھی۔ نئی نئی کتابوں کے عن قریب طبع و اشاعت کی خوش خبریاں

ا سے سننے میں آئیں، خصوصاً فن حدیث میں مصنف عبدالرزاق وغیرہ کی۔ گھنٹوں ان سے صحبت رہی ہر بار، یہی گمان گزرتا کہ کسی اچھے
ب خانے میں بیٹھے ہوئے، مصروف مطالعہ ہیں۔ یا پھر الملل والنحل (شہرستانی) کے قسم کی کتاب کے ورق سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ اللہ ان
کام میں برکت دے، ان سے بڑی، بڑی توقعات ہیں"

زیر تبصرہ کتاب کے ص ۱۰ پر انسٹیوٹ کے موجودہ صدر مولوی اصغر اشرف صاحب نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر محمد یوسف الدین کے
ت زندگی، خود ان کے لائق ماموں مولوی نصیرالدین ہاشمی (مؤلف: دکن میں اردو، اور: یورپ میں دکھنی مخطوطات) نے بڑی
یل سے ان کے ڈاکٹریٹ کے مطبوعہ مقالے: اسلام کے معاشی نظریے پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہ نامہ: سب رس حیدرآباد میں سے بیان
یے ہیں۔"

ڈاکٹر محمد یوسف الدین نے علمی انہماک سے حقِ نظرِ ثانی ادا کیا ہے۔ مترجم نے کہیں کہیں عربی عبارت لکھ کر چھوڑ دی تھی ڈاکٹر
سف نے قدیم عربی لغت کی کتابوں: قاموس، تاج العروس وغیرہ دیکھ کر ترجمہ مکمل کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مورخ بلاذری کی اس تاریخ
، طبقات ابن سعد سے ڈھائی تین سو حوالے ہیں، طبقات ابن سعد کے اردو ترجے از مولانا عبداللہ عماری صاحب سے مقابلہ کر کے۔
ری کے ان حوالوں کو قریب سے قریب تر کر دیا ہے تاکہ آئندہ ریسرچ کرنے والوں کو حوالہ دینے میں سہولت ہو سکے۔ پھر ان کے علاوہ
رخ بلاذری نے طول طویل عبارتوں کے بعد جلی سرخیاں دی ہیں، پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ذیلی سرخیاں بھی لگائی
۔ پھر کتاب کی ابتدا میں عنوانوں کی ایک طویل فہرست بھی دی ہے، مزید برآں، کتاب مذکور کی ابتدا میں ۴۶ صفحات پر مشتمل حضرت
ان بن عفانؓ کے زریں کارناموں پر ایک معلومات آفریں نوٹ بھی لکھا ہے۔

مورخ بلاذری نے خلیفۂ ثالث امیرالمومنین حضرت عثمان بن عفانؓ کے حالات زندگی۔ ولادت سے وفات (شہادت) تک بڑی
میل سے بیان کیے ہیں کہ اس مبارک دور کا سماں آنکھوں میں سماجاتا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے جمہوری دور میں عوام کو تقریر، تحریر اور
ارِ ضمیر کی آزادی حاصل تھی، خلیفۂ ثالث امیرالمومنین حضرت عثمان ذی النورین، بحیثیت صدر مملکت، وقتاً فوقتاً اپنے گورنروں کی مجلسِ
اورت طلب کیا کرتے تھے۔ تین براعظموں پر پھیلی ہوئی وسیع مملکت کے باشندوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً تجربہ کار
ی صلاحیت رکھنے والوں کے وفد بنا کر مملکت کے مختلف حصوں میں بھیجا کرتے تھے۔ جو وہاں کے حالات سے باخبر ہو کر مملکت کی ترقی
لیے سفارشات پیش کرتے اور بر سرِ موقع عوامی شکایتوں کا ازالہ بھی کرتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کو رفاہِ عامہ کے کاموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ کنویں کھدوائے، مدینۂ منورہ کے خانگی کنوؤں کو خرید کر وقف کیا
ہر کوئی ان سے استفادہ کر سکے۔ آب پاشی اور آب رسانی کے لیے نہریں کھدوائیں، مسجد میں آتے تو لوگوں سے بیماروں کا حال اور بازار کا
بھی دریافت فرماتے۔ سڑکیں بنوائیں، مکۂ معظمہ میں مسجدِ حرام کو توسیع دی، اور مدینۂ منورہ میں مسجدِ نبوی کو توسیع دی (جس کا
سلہ آج تک بھی جاری ہے)۔ مسجدوں کی توسیع کے ساتھ ساتھ مدرسوں کو بھی ترقی دی۔ کاروانی بری تجارت کے ساتھ ساتھ بحری تجارت
بھی ترقی دی، ملک شام و لبنان کے ساحل پر روشن مینار (لائٹ ہوز) تعمیر کیے، بندرگاہوں کو ترقی دی اور حکومت کی جانب سے جہاز
زی کے کارخانے قائم کیے۔ خود حضرت عثمانؓ قبیلۂ قریش کے نامور ملک التجار تھے۔ قابل افراد کو اپنے پاس سے سرمایہ فراہم کرتے تھے،
اربت کے کاروبار کو بڑی ترقی دی (مضاربت کے کاروبار میں ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا شخص محنت کرتا ہے اور منافع
حسبِ تصفیہ دونوں شریک رہتے ہیں)۔

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں، جہاد میں شرکت کے لیے امام حسنؓ اور امام حسینؓ عراق گئے تو وہاں دیکھا کہ دریائے دجلہ اور فرات کے کنارے ہزاروں فرجی بھائیوں کے لیے پن چکیوں سے آٹا پیسا جارہا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت کے دوران مدینہ منورہ وغیرہ میں ہوائی چکیاں نصب کیں تاکہ لوگوں کو "چکی کی مشقت" سے نجات ملے۔

شمالی افریقہ کے تیونس، الجزائر اور مراکش فتح ہوئے تو وہاں کے بت پرست بربروں کو جان و مال، عزت و آبرو کے علاوہ ان کے بر کردوں کی بھی حکومت کی جانب سے حفاظت ہونے لگی۔

تین براعظموں پر پھیلی ہوئی وسیع مملکت کی دفاع کے لیے فوجی چھاؤنیوں کے علاوہ حضرت عثمانؓ نے گھوڑوں اور اونٹوں کی پرورش کے لیے، بڑے پیمانے پر ایک سرکاری چراہ گاہ مختص کی، اس چراہ گاہ سے ہر سال ایک ہزار گھوڑے اور اتنے ہی اونٹ فراہم ہوتے تھے۔

امیر المومنین حضرت عثمانؓ کو خانہ جنگی مطلق پسند نہ تھی، اور اس کے لیے انھوں نے اپنی جان تک قربان کر دی۔ حضرت عثمانؓ کا رہتی دنیا تک، سب سے بڑا زرین کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے حکومت کی جانب سے قرآن مجید کے متعدد نسخے صحابہ کرام سے لکھوائے، اا اپنی وسیع مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں قرآن مجید کے مخطوطے بھجوائے۔ آج بھی شہر سمرقند میں عہدِ عثمانی کے دور کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔ ایک دوسرا مخطوطہ قرآن جو حضرت عثمانؓ اپنی شہادت کے وقت تلاوت فرما رہے تھے، وہ آج بھی استنبول، ترکی کے مشہور میوزیم "توپ کاپی سرائے" میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف الدین نے بیان کیا ہے کہ جب وہ ترکی کے سفر پر گئے تو ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی سرکردگی میں اس مصحفِ عثمانی کے دیدار کی سعادت حاصل کی، وہ ایک گز لانبا اور آدھا گز چوڑا ہے، اور قرآن مجید کے اندر حضرت عثمانؓ کے خون کے نشانات بھی ہیں۔

قصہ مختصر اردو ادب کے فن تاریخ و سوانح میں سیرۃ امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اس دلچسپ معلومات آفریں کتاب کی اشاعت پر انسٹیٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدرآباد کو علمی دنیا کی طرف سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اس ضخیم معلومات آفرین کتاب کی طباعت میں تاج یوسف فاؤنڈیشن ٹرسٹ نے پانچ ہزار کا عطیہ دیا ہے اور اردو اکاڈمی حیدرآباد نے بھی ہزار کا عطیہ دیا ہے۔ انسٹیٹیوٹ نے اب تک اردو، انگریزی، ہندی اور تلنگی میں ۴۵ کتابیں شائع کی ہیں جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔ یقینِ واثق ہے کہ سیرۃ امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ علمی دنیا میں ویسے ہی مقبول خاص و عام ہوگی۔

صفحات = ۲۴۸، قیمت = تیس روپے، ملنے کا پتہ = حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس، ہیڈکوارٹر معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

o ooo o

پروفیسر مسعود حسین خان کی ادبی خدمات (تحقیقی مقالہ)، مصنف: ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ، تبصرہ نگار: ڈاکٹر بیگ احساس

بعض لوگ اپنی زندگی میں ہی لیجنڈ بن جاتے ہیں۔ ان کا بت اتنا خوب صورت ہوتا ہے کہ ان پر پتھر تو کیا پھول کی پتی بھی پھینکو تو ان کے چاہنے والوں کو ناگوار گزرتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان ایسی ہی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کے کئی پہلو ہیں ادیب، شاعر، نقاد، محقق، مفکر، دانشور، ماہر لسانیات اور اعلیٰ عہدہ دار ہیں۔ بہ قول پروفیسر مغنی تبسم "پروفیسر مسعود حسین خاں پر وہی شخص کام کر سکتا ہے جو مختلف علوم بالخصوص لسانیات، سماجیات، تاریخ اور کسی حد تک فلسفہ اور سیاست سے بہرہ رکھتا ہو اور اردو شا

ب کی گہری آگہی رکھتا ہو ۔ "ظاہر ہے کسی اسکالر کا اتنے علوم میں ماہر ہونا ممکن نہیں لیکن ریحانہ سلطانہ نے بڑی محنت کے ساتھ اس کام کو
را کیا ۔ اس مقالے کو سات (۷) ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے حیات اور شخصیت والے باب میں اختصار کے ساتھ پروفیسر صاحب کے حالات
ندگی اور شخصیت کو سمیٹا ہے ۔ اس میں خاندانی شجرہ بھی ہے ۔ اور شعبوں کی سیاست کا ذکر بھی ہے ۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جس لڑکے نے
پنی تعلیم کا آغاز جامعہ ملیہ سے کیا ، وہی اس جامعہ کا وائس چانسلر بنا ۔ مسعود صاحب نے خود نوشت لکھ کر شائع کروادی تھی ۔ اب ایسے پہلو
تاش کرنا جن کا ذکر خود نوشت میں بھی نہ ہو ایک مشکل کام تھا ۔ ڈاکٹر ریحانہ نے اس مرحلے کو کامیابی سے سر کیا ۔

ادبی تنقید والے باب میں ڈاکٹر ریحانہ نے تنقیدی مضامین پر بحث کی ہے ۔ اسلوبیاتی تنقید کی داغ بیل پروفیسر مسعود حسین خاں
نے ہی ڈالی تھی جس سے گوپی چند نارنگ ، مغنی تبسم اور مرزا خلیل احمد بیگ نے متاثر ہو کر اس تنقیدی دبستان کو مستحکم کیا ۔ لسانیات والا
حصہ بے حد اہم ہے ۔ یہ کتاب کا سب سے وقیع حصہ ہے ۔ مسعود صاحب کی اہم تصنیف "مقدمہ ۔ تاریخ زبانِ اردو" پر ڈاکٹر ریحانہ نے بحث کی
ہے ۔ اصل میں مسعود صاحب کی علمی شہرت اس کتاب کی بناء پر ہوئی ۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۹۴ء تک اس کتاب کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔
اکٹر ریحانہ نے اسی کتاب کے ہر باب کا تجزیہ کیا ۔ کہیں کہیں مسعود صاحب سے اختلاف بھی کیا ۔ "اردو کا المیہ" مسعود صاحب کے ان مضامین
مجموعہ ہے جو انھوں نے "ہماری زبان" میں بطور اداریہ لکھے ۔ ڈاکٹر ریحانہ امرت رائے اور گیان چند کے اعتراضات کو بے معنی قرار دے کر
سعود حسین خان صاحب کی تائید کرتی ہیں ۔ صوتیات والا باب بھی اہم ہے ۔ اردو صوتیات پر ابتدائی کام کرنے والوں میں وہ زور صاحب اور
سروری صاحب کو شمار کرتی ہیں ۔ "تحقیق و تدوینِ متن" والے باب میں مسعود صاحب کی پانچ کتابوں پرت نامہ ، بکٹ کہانی ، ابراہیم نامہ ،
صہ ۔ مہر افروز و دلبر اور عاشور نامہ پر ڈاکٹر ریحانہ نے مدلل بحث کی ہے ۔ لغت نگاری کے باب میں وہ پروفیسر اشرف رفیع سے متفق نظر آتی
ہیں کہ دکنی اردو کی لغت ایک قدیم زبان کی لغت ہونے کے اعتبار سے ڈکشنری سے زیادہ فرہنگ سے مشابہ ہے ۔ شاعری کی سلسلے میں ڈاکٹر
ریحانہ نے یہ بالکل درست تجزیہ کیا کہ مسعود صاحب نے اپنی نثر نگاری کے مقابلے میں اپنی شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دی ۔ خود نوشت
والے باب میں انھوں نے خود نوشت کی مختصر تاریخ لکھی اور پھر "وردِ مسعود" پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔

بعض واقعات کے حوالے نہیں دیے گئے ۔ مثلاً فرخ آباد اور قائم گنج والا حصہ انھوں نے کہاں سے حاصل کیا اس کا پتہ نہیں چلتا ۔
کہیں کہیں اقتباسات اچانک شروع ہو جاتے ہیں ۔ لیکن یہ فروگذاشتیں بے حد معمولی ہیں ۔

ایک ایسے دور میں جب کہ ہماری تدریسی تحقیق بہت بدنام ہو چکی ہے ۔ یہ ایک عمدہ مقالہ ہے ۔ اس مقالے نے ہماری تدریسی
تحقیق کے معیار کو بلند کیا ہے ۔ اس مقالے کو ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے اپنی استاد پروفیسر اشرف رفیع کے نام معنون کیا ہے ۔ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ
نے بڑی محنت اور غیر جانب داری سے پروفیسر مسعود حسین خان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے ۔ پروفیسر اشرف رفیع جو اس مقالے کی نگران
ہیں اور ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ ، دونوں ہی ایک اچھے مقالے پر ہماری مبارک باد کے مستحق ہیں ۔

{ ناشر: دکن پبلیشرز حیدرآباد ، قیمت = ۱۱۰ (ایک سو دس) روپے ملنے کا پتہ: حسامی بک ڈپو ۔ مچھلی کمان ۔ حیدرآباد }

o ooo o

"سہ ماہی توازن" مالیگاؤں مدیر: عتیق احمد عتیق تبصرہ نگار: ڈاکٹر بیگ احساس

سہ ماہی "توازن" مالیگاؤں نے ممتاز افسانہ نگار حمید سہروردی کا گوشہ شائع کیا ہے ۔ حمید سہروردی ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والے
افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں ۔ ان کا فن جس بھرپور جائزے کا متقاضی تھا اسے اب سہ ماہی توازن نے پورا کیا ۔ اس گوشے میں

۱۲ مقالے شامل ہیں۔ نظام صدیقی کا مقالہ "نئے عہد کی افسانوی تخلیقیت کا علم بردار۔ حمید سہروردی" نسبتاً طویل مقالہ ہے۔ نظام صدیقی ۔
لکھا کہ حمید سہروردی نے ادارہ گزیدہ ترقی پسند افسانوی روایت اور فیشن زدہ جدید پسند افسانوی اور لاافسانوی تقلیدیت سے گریزاں جد
عالمی اور قومی زندہ متحرک روایت سے استفادہ کر کے ایک نئے رنگ و آہنگ کا اضافہ کیا ہے۔ اب ہمارا انتقاد فن کار کو منفرد ثابت کرنے ۔
لیے اسے ترقی پسندی اور جدیدیت سے غیر متاثر ثابت کرنے لگا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے دور میں بھی اچھے افسانے لکھے ۔
اور جدید رجحان کے زیر اثر بھی تبدیلی آئی۔ حمید سہروردی کی شناخت جدید افسانہ نگار کی ہے اور ان کا نام بھی جدید افسانہ نگاروں کے ساتھ
جاتا ہے۔ لنڈاویننگ کے مضمون کے اقتباس کا ترجمہ احسن یوسف زئی نے کیا ہے۔ لنڈاوینٹنگ کا یہ خیال صحیح ہے کہ جدیدیت سے متا
ہونے والے تقریباً تمام قلم کاروں نے ایسی غیر ڈرامائی کہانیاں لکھی ہیں جن میں تخیل، سرریلزم اور مذہبی اور دیومالائی کر اسطوری عناصر کو بر
گیا۔ حمید سہروردی نے بھی یہی کیا لیکن ان کے افسانوں میں رشتوں کا اظہار جس انداز سے کیا ہوا ہے وہ ان کو بہت سے ہم عصروں ۔
مختلف کرتا ہے۔ ابراھیم اختر خود بھی اچھے افسانہ نگار ہیں ان کا مضمون "حمید سہروردی کا تخلیقی رویہ" ایک تخلیقی تجزیہ ہے۔ ڈاکٹر ارتا
افضل کا "حمید سہروادی دیکھتی آنکھ اور سوچتے ذہن کا فن کار" اچھا مضمون ہے۔ ان کا یہ مطالعہ اہم ہے کہ عصری ادب کو پرکھنے کے معیا
اور تنقیدی قدریں اسی ادب کے بطن سے پیدا ہونی چاہئیں۔ طارق سعید کا مضمون "حمید سہروردی..... عقب کا دروازہ..... تفکر و تعقل
اساس" شکیل احمد خاں کا "حمید سہروردی کی افسانہ نگاری عقب کا دروازہ" کے آیئنے میں، رحمن حمیدی کا "جدید اردو افسانے کا انوکھا فن ؟
... حمید سہروردی" سجاد اختر کا "عقب کا دروازہ..... نئی جہتوں کی تلاش" اچھے مضمون ہیں ان کے علاوہ اختر سہیل بیابانی، ڈاکٹر مادھوری شا
سید اختر اور حامد اکمل کے بھرپور مضامین میں حمید سہروردی کے فن کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔

o ooo o

حمید سہروردی کے دو مضامین "جدید اردو افسانہ" اور "میں اور میرے افسانے" اور ان سے سید احمد قادری کا لیا ہوا انٹرویو ؟
شامل ہیں۔ ان مضامین اور انٹرویو سے افسانہ نگار کا نقطہ نظر واضح ہوتا ہے۔ "گوشے کا اختتامی باب زریں" کے عنوان سے جوگیندر پال، ظ
پیامی، جیلانی بانو، اختر یوسف، ڈاکٹر انور سدید، مظہر الزماں خاں، ڈاکٹر بیگ احساس، نجم باگ اور رؤف صادق کے تاثرات اور مختصر مضامیں
شامل ہیں۔ توازن کے اس شمارے کے ٹائیٹل میں حمید سہروردی کی تصویر کے ساتھ حمید سہروردی کے فن کے بارے میں مدیر کا ایک
تنقیدی نوٹ بھی شامل ہے۔

{ناشر: عتیق احمد عتیق، قیمت = ۲۵ روپے، ملنے کا پتہ: ۳۵۴ نیا پورہ مالیگاؤں 423203 Pin (مہاراشٹرا)}

o ooo o

دھوپ دریا (مجموعہ کلام) مصنف: شکیل اعظمی تبصرہ نگار: علی ظہیر

شکیل اعظمی نوجوان شعرا میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ "دھوپ دریا" اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ ایک
سو پچیس (۱۲۵) صفحوں پر پھیلا ہوا یہ مجموعہ، غزلوں، نظموں اور نثری نظموں پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر شکیل کا رجحان غزل کی طرف زیا
ہے۔ یہاں بھی انھوں نے اس صنف میں اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔ جیسے:

ہم بھی سو جاتے تھے معصوم فرشتوں کی طرح — اور یہ رات بھی حساس نہیں پہلے کی طرح
تمام جسم پہ نیلی سی موج دوڑ گئی — کسی نے جھیل سی آنکھوں میں سنگ چھوڑ دیا

اسی میدان میں شکیل اعظمی کی مزید ترقی کی امید کی جاسکتی ہے۔ جدید اردو شاعری میں شغف رکھنے والوں کو یہ مجموعہ ضرور پڑھنا چاہیے۔
{صفحات: ۱۳۶، قیمت = ۵۰ (پچاس) روپے ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی}

o ooo o

قوس قزح (مجموعہ کلام) مصنف: شکیل اعظمی تبصرہ نگار: علی ظہیر

نظیر علی عدیل حیدر آباد کے اساتذہ سخن میں شمار کیے جاتے تھے۔ حضرت صفی اورنگ آبادی کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ حضرت امجد حیدر آبادی سے بھی آپ کا تعلق رہا ہے۔ بقول ڈاکٹر اشرف رفیع..." ان کی ساری زندگی فکر و فن کی آبیاری میں گزری۔ وہ ایک زود گو، پر گو شاعر تھے۔ ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ غالب ہے:

خود خدا کو بھی کسی کا واسطہ درکار ہے — ورنہ اس پر خود بہ خود ایماں کوئی لایا نہیں
سایہ و قد لازم و ملزوم ہوں تو ہوں مگر — ایک قد ایسا ہے جس کا واقعی سایا نہیں

جن قارئین کو دبستان صفی اورنگ آبادی اور صوفیانہ رنگ کی شاعری پسند ہے ان کے لیے یہ مجموعہ ایک تحفے سے کم نہیں۔
{صفحات: ۱۷۶، قیمت: ۵۰ (پچاس) روپے ملنے کا پتہ: حسامی بک ڈپو مچھلی کمان۔ حیدر آباد}

o ooo o

سفر سانسوں کا (مجموعہ کلام) مصنف: فاروق شکیل تبصرہ نگار: علی ظہیر

فاروق شکیل کا یہ مجموعہ بنیادی طور پر غزلوں کا مجموعہ ہے لیکن اس میں ان کی نظمیں (جن میں کچھ آزاد نظمیں بھی ہیں) اور گیت بھی شامل ہیں۔ فاروق شکیل حضرت نظیر عدیل کے فرزند اور شاگرد بھی ہیں۔ بقول شکیل کے ان کے والد کے خون کی تاثیر اور رہنمائی نے ان کی شاعری کو جلا بخشی۔

شکیل روایت میں رہ کر نئی حسیت کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً:

بچوں کی بھوک اس سے جو دیکھی نہیں گئی — وہ شخص اپنے سخت اصولوں سے ہٹ گیا

موضوع عشق میں بھی وہ جدت طرازی کرتے ہیں۔

ڈھونڈو نہ محبت کو شیشے کے مکانوں میں — اگتا ہے کہیں پودا سنگین چٹانوں میں

بہ حیثیت مجموعی فاروق شکیل سے ہم امید کر سکتے ہیں وہ اردو شاعری کی روایت سے رشتہ رکھتے ہوئے نئے خیالات کا اظہار کامیابی سے کرتے رہیں گے۔

{صفحات: ۱۱۹، قیمت = ۴۰ (چالیس) روپے ملنے کا پتہ: 23-2-190 مغل پورہ۔ حیدر آباد۔ ۲}

o ooo o

آپ کے بعد (مجموعہ کلام)   مصنفہ: پروین ضابط بینش   تبصرہ نگار: علی ظہیر

محترمہ پروین ضابط بینش کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے۔ بینش کی شاعری کا معیار چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو ایک بات مسلمہ ہے کہ نہایت معصوم فطرت اور حساس ذہن رکھنے والی خاتون ہیں۔ ان کے موضوعات اور دلچسپیوں کو دیکھ کر ایک فرحت سی ہوتی ہے۔ بینش مشق سخن جاری رکھیں تو جدید خواتین شعراء میں اپنا مقام بنا سکیں گی۔ بینش کا انداز شاعری ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہوگئے کتنے مرتب سب یہاں   کھوئی ہے سادگی جانے کہاں
آہٹ کوئی قدموں کی آئے مری جانب بھی   لب ریز ہوا بینش اب صبر کا پیمانہ

(یہ کتاب مصنفہ سے مفت طلب کی جا سکتی ہے۔ ملنے کا پتہ: 8-2-608/43 غفار کالونی، روڈ نمبر 15 ، بنجارہ ہلز۔ حیدرآباد۔

(سلسلہ ص ۱۴۱۔ چٹکی بھر ناس)

پتہ تھا۔

اس کے بعد ایک لفظ کہے بغیر انتہائی عجلت میں ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے کار میں جا بیٹھے اور بہ آواز بلند بولے" مہاراجا ست کنا کے محل چلو۔ مجھے ان کی دی ہوئی ساری جنم کنڈلیاں لوٹانی ہیں۔"

جیسے ہی ہماری گاڑی گیٹ سے باہر نکلی، میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک جسیم، سیاہ، کھدر پوش شخص بالائی منزل کی ایک کھڑکی سے جھانکتا ہوا دکھائی دیا۔

ہم نے ابھی چائے ختم ہی کی تھی اور ننھے بلو نگڑے کو جس نے فرش پر تلیا بنادی تھی۔ رفع حاجت کے آداب سکھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ سفید مثلث والی ایک کار دروازے کے سامنے آکر رکی اور نانو کاکا نمسکار کرتے ہوئے وزیر فلاح کا استقبال کرنے کے لیے جو انھیں سے ملنے کے لیے تشریف لائے تھے، باہر نکل گئے۔

نانو کاکا اپنی مہم کی تکمیل کے بعد کل رخصت ہوگئے۔ مجھے پتا ہی نہ چل سکا کہ وہ وزیر موصوف سے کس لیے ملنا چاہتے تھے۔ البتہ میں یہ سوچ کر ضرور پریشان ہوں کہ جب وزیر موصوف کو پتا چلے گا کہ نانو کاکا کبھی کسی ننور نامی ریاست سے سو میل کے فاصلہ پر بھی نہیں رہے تو کیا ہوگا؟ حالاں کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ نانو کاکا سارے معاملے کو اس طرح سنبھال لیں گے کہ ان کے انگوچھے کی ایک تہہ بھی بگڑنے نہیں پائے گی۔

البتہ میں اس وقت خطرے کے دائرے سے باہر رہنا ہی پسند کروں گا۔

------- O O O-------

وقار خلیل

وفیات

000 نامور ادیب اور دانشور **ڈاکٹر سید محی الدین ظفر اوگانوی** (ولادت یکم جنوری ۱۹۳۹ء) بہ عارضۂ سرطان (کینسر) ۲۱ / جون ۱۹۹۶ء کو رحلت کرگئے۔ ڈاکٹر ظفر، مغربی بنگال اقلیتی کمیشن کے اعزازی صدر تھے۔ انھوں نے ۱۹۶۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی اور پھر کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے اور کالج سروس کمیشن کے ممبر بھی ہوئے، وہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے رکن اور بہار میں اردو تحریک کے فعال رہنما تھے۔ اردو کے افسانوی ادب میں ظفر اوگانوی کا نام زندہ رہے گا۔

000 ممتاز شاعر اور ادیب **ڈاکٹر پرکاش چند مونس** (ولادت ۷ / ستمبر ۱۹۱۱ء بجنور) بہ عارضہ کینسر طویل علالت کے بعد ۱۱ / جولائی ۱۹۹۶ء کو جے پور میں رحلت کرگئے۔ اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی اور پیشہ وکالت تھا۔ ایک شعری مجموعہ "خس و خاشاک" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر مونس کی کتاب "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" مطبوعہ ۱۹۷۸ء ہندی اردو کے ادبی حلقوں میں اہمیت رکھتی ہے۔ "ڈاکٹر مونس ہمارے عہد کے نامور اسکالر اور "ادیب ڈاکٹر گیان چند جین کے بڑے بھائی تھے۔

000 مشہور شاعر و ادیب **محمود سروش** (ولادت ۱۱ / مارچ ۱۹۱۱ء) کا ۴ / جولائی ۱۹۹۶ء کو بمقام ممبئی انتقال ہوا۔ سروش مرحوم کا مجموعہ کلام "متاعِ ہنر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ وہ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ کئی ہندوستانی زبانوں سے واقف تھے۔ انھوں نے بے شمار مضامین اور کتابوں کے ترجمے کیے جن میں کرشن چندر کا ایک مشہور ناول "موت کے بعد" شائع ہو چکا ہے۔ فلمی کہانی نویس کی حیثیت سے شہرِ نگاراں بمبئی میں ان کی خاصی شہرت رہی ہے۔

000 حیدرآباد کے ایک اچھے شاعر **حفیظ فضا** نے ۲۰ / جولائی ۹۶ء کو انتقال کیا۔ وہ ادبی ٹرسٹ بک ڈپو سے چند برسوں تک وابستہ رہے۔ محنت کش اور متوسط طبقے کے فرد تھے اور غزلیہ شاعری میں اپنے روایتی کلاسیکی اسلوب کے سبب جانے پہچانے جاتے ہیں۔ روزناموں میں ان کا کلام چھپتا رہا ہے۔

000 جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق کارگزار وائس چانسلر **پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی** (ولادت ۲ / مئی ۱۹۲۵ء) ۳۰ / جولائی ۱۹۹۶ء کو رحلت کرگئے۔ پروفیسر فاروقی، اسلامی علوم اور عہدِ حاضر کی اسلامی سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ماہنامہ "جامعہ" کے برسوں مدیرِ اعزازی رہے۔ سہ ماہی اردو مجلہ "اسلام اور عصرِ جدید" اور انگریزی میگزین "اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج" کے بھی مرتب رہے، فاروقی مرحوم کی اہم تصانیف میں "جدید ترکی ادب کے ارکانِ ثلاثہ اور ذاکر حسین کے سوانح "شہیدِ جستجو" ہیں۔

000 خوش فکر غزل گو شاعرہ **محترمہ نایاب سلطانہ** طویل علالت کے بعد ۶۹ سال کی عمر میں ۲ / اگست ۱۹۹۶ء کو رحلت کر گئیں۔ کلام کا مجموعہ مرتب تھا افسوس کہ زندگی میں زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا، نایاب کی غزلیہ شاعری قدیم و جدید اسالیبِ سخن سے عبارت رہی ہے۔ پڑھنے کا انداز بھی خوب تھا۔ ادارے کی ادبی اور شعری محفلوں میں نایاب سلطانہ شریک ہوا کرتی تھیں۔ مرحومہ معروف فلمی اداکارہ نگار سلطانہ کی ہمشیر تھیں۔

ooo بزرگ صحافی **محمد عبدالرحمان علمی** سابق ایڈیٹر روزنامہ نظام گزٹ کا طویل علالت کے بعد ۳ / اگست ۱۹۹۶ء کو انتقال ہوا۔ علمی مرحوم نے روزنامہ "سیاست" میں بھی بہ حیثیت سب ایڈیٹر اپنی خدمات انجام دیں۔ اور انتخاب پریس سے بھی وابستہ رہے۔

ooo منشی پریم چند کے صاحبزادے اور ہندی کے مشہور افسانہ نگار اور نقاد **امرت رائے** کا ۴ / اگست کو ۷۵ سال کی عمر میں بہ عارضہ قلب الہ آباد میں انتقال ہوا۔ امرت رائے نے پریم چند کی مشہور سوانح عمری "قلم کا سپاہی" لکھی تھی، جس کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی وہ ہندی ماہنامہ "ہنس" کی ادارت کے فرائض عرصے تک انجام دیتے رہے۔ امرت رائے ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے، مارکسزم سے متاثر دانشور تھے، ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسند مصنفین یو۔پی کے رکن تھے۔

ooo جدید لب و لہجے کے خوش فکر شاعر **محمد عبدالقوی** (ادبی نام: **قوی سیف**) ۴ / اگست ۱۹۹۶ء کو بہ عارضہ قلب اچانک رحلت کر گئے۔ عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ شعری مجموعہ "ایک چٹکی آگ" ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا قوی سیف اچھے ڈرامہ نویس افسانہ نگار اور شعر و ادب کا عصری ذوق رکھنے والی نئی نسل میں جانے پہچانے قلم کار رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کی ڈرامائی تخلیقات نشر ہوتی رہی ہیں۔ قوی سیف ممتاز افسانہ نویس عوض سعید مرحوم کے بھتیجے تھے۔

ooo ممتاز طنز و مزاح نویس ادیب **دلیپ سنگھ** ۸ / اگست ۱۹۹۶ء کو بہ عارضہ قلب دہلی میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً ۶۴ سال تھی۔ وہ ۱۹۳۲ء میں ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) میں پیدا ہوئے اور ملک کی تقسیم کے بعد سے دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وزارت خارجہ حکومت ہند میں ملازمت کے سبب دلیپ سنگھ کو بیرونی ممالک خصوصاً مغربی ملکوں میں رہنے کا موقع ملا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے بھی ان کی تحریریں فیچر اور ڈراموں کی صورت میں مقبول ہوئیں۔ حکومت پنجاب نے ان کے ناول "دل دریا" پر ادبی ایوارڈ عطا کیا تھا۔ مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے "گوشے میں قفس کے" اور "سارے جہاں کا درد" شائع ہو کر قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ دہلی اور بمبئی کے اردو روزناموں میں دلیپ سنگھ کے طنز و مزاح سے روشن کالم بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ جلسوں میں دلیپ سنگھ نے متعدد بار شرکت کی اور اپنی زعفران زار تحریروں سے سند قبولیت حاصل کی۔

ooo معروف اور بزرگ افسانہ نویس، ناول نگار اور صحافی **ولی الرحمان شیدا** (ادبی نام: **شین مظفر پوری**) ۔ ۴ / اگست ۹۶ء کو آبائی وطن ستیامڑھی (بہار) میں رحلت کر گئے۔ بہار اردو اکیڈمی کے دو ماہی جریدے "زبان و ادب" کے وہ مدیر تھے۔ افسانوی مجموعے جو شائع ہو کر مقبول ہوئے ان کی تعداد آٹھ ہے۔ وہ پریم چند اور علی عباس حسینی سے متاثر بزرگ افسانہ نویس تھے

ooo صاحبزادہ **میر معین الدین علی خاں مضمر** نظام کالج اور جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ چار شعری مجموعے زندگی میں ہی شائع ہوئے۔ ۲۷ / اگست ۹۶ء کو بہ عارضہ قلب قریب ساٹھ سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ صاحبزادہ میکش اور صاحبزادہ جہاں دار افسر کے عزیزوں میں تھے۔ کم سخن، شریف النفس اور قدیم طرز سخن کے شاعر تھے۔

ooo ممتاز سخنور **الحاج امیر احمد خسرو** بہ عارضہ تنفس ۷۷ سال کی عمر میں ۱۰ / ستمبر ۱۹۹۶ء کو رحلت کر گئے خسرو مرحوم، دکن ریڈیو اور آل انڈیا ریڈیو سے برسوں وابستہ رہے اور پھر مدد گار ناظم کی حیثیت سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ امیر احمد خسرو جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل، خوش فکر شاعر تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے اکوا (بچوں کا ادب) اور "اجالوں کا زبان" شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ نامور شاعر حضرت خورشید احمد جامی مرحوم کے برادر خورد تھے اور جامی میموریل سوسائٹی کے بانی بھی

بیادگار سید محی الدین قادری زور

سن اجراء : ۱۹۳۸ء
فون ، 310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نمبر

جلد : ۵۸ — نومبر ، ڈسمبر ۱۹۹۶ء — شمارہ : ۱۱ ، ۱۲

اس خاص شمارے کی قیمت
بیس روپے (Rs.20/=)

فی پرچہ	:	۱۰ روپے
زرسالانہ	:	۱۰۰ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۲۵ روپے
مشرق وسطی اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۷ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : اِدارہ ، اَدبیاتِ اُردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

کمپیوٹر کتابت "جے جے کمپیوٹرس" سدی پٹم ، حیدرآباد ۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر پرنٹر پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او ایس گرافکس میں طبع کرواکے ادارہ ادبیاتِ اردو سے شائع کیا

اس شمارے میں

ڈاکٹر زور اور ان کے کارنامے

رفقاءِ زور

☆ ☆ ☆

پہلی بات

۸ / نومبر ۱۹۹۶ ء کو ادارہ ء ادبیاتِ اردو کی سرپرست محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ (بیگم زور) رحلت کرگئیں۔ وہ ڈاکٹر زور کی رفیقہ ء حیات ہی نہیں بلکہ رفیقہ ء کار بھی تھیں۔ انھیں کے پر خلوص تعاون سے ڈاکٹر زور کے لیے یہ ممکن ہوسکا کہ ادارہ ء ادبیاتِ اردو کی اپنے منشا اور اپنی امنگوں کے مطابق صورت گری کرسکیں۔ ادارہ ء ادبیاتِ اردو کی شان دار عمارت "ایوانِ اردو" انھیں کی عطا کردہ زمین پر تعمیر کی گئی۔ انھیں شعروادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ خود بھی شعر کہتی تھیں۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو نعت گوئی کے لیے وقف کردیا تھا۔ ان کے نعتیہ کلام کے تین مجموعے شائع ہوے۔ ہم ان کے غم میں سوگوار ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالی انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔

ο ο ο

"سب رس" کا پیشِ نظر شمارہ زور نمبر ہے۔ ادارہ ء ادبیاتِ اردو میں ہر سال بانیِ ادارہ کی برسی کے موقع پر "یومِ زور" منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر ایک ادبی اجلاس منعقد کیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۵ ء کے ادبی اجلاس میں ادارہ ء ادبیاتِ اردو کے نایاب مخطوطات اور نوادر پر مضامین پڑھے گئے تھے۔

۱۹۹۶ ء کے ادبی اجلاس کا موضوع "ڈاکٹر زور کے تحقیقی کارنامے" تھا۔ جو مضامین "سب رس" میں اشاعت کے لیے دست یاب ہوے انھیں اس نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔

(ادارہ)

سید رفیع الدین قادری

ڈاکٹر زور ۔ یادوں کی انجمن میں

ڈاکٹر صاحب نے اردو کی خدمت نہ تو شہرت کی خاطر کی نہ پروفیسر اور صدر شعبہ ہونے کے ناطے، بلکہ اردو کی خدمت ان کے مزاج اور فطرت میں داخل تھی۔ انھوں نے آنکھ کھولی بھی تو اردو ماحول میں اور آنکھ بند ہوئی بھی تو اردو ماحول میں۔

جب ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں دکنی ادب کے میدان میں سرگرم عمل دیکھتے ہیں تو ہمیں تاریخی پس منظر کی طرف بھی دیکھنا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ تسخیر گولکنڈہ کے بعد مغل شہنشاہ اپنا اثر و رسوخ بھی پیدا نہ کرسکے تھے کہ شمال میں مغل حکومت کو زوال آنے لگا۔ مغلوں کے جانشین آصف جاہی حکم ران نے خود دکن میں مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل کرنے کے لیے قطب شاہی روایات کو اپنایا۔ دکنیوں کی قطب شاہی تہذیب سے اس لیے محبت و عقیدت تھی کہ یہ تہذیب ان کی سماجی زندگی کا ایک جز بن چکی تھی اور وہ مغل تہذیب سے قریب نہ ہوسکے۔ ڈاکٹر صاحب کی ادبی نشو و نما اسی دکنی ماحول میں ہوئی۔ اس تہذیب میں جو قطب شاہی سرچشموں سے سیراب ہوئی تھی اور اسی کا ایک عنصر دکنی زبان تھی جسے انھوں نے اپنی توجہ کا اولین مرکز بنالیا اور اسی قدیم اردو ادب کی بازیافت کی مہم میں عمر بھر خلوص، دردمندی اور لگن کے ساتھ مصروف رہے۔

ڈاکٹر صاحب نہایت مخلص، صاف دل اور بے باک انسان تھے۔ وہ بلند کردار، اعلیٰ ظرف، بہی خواہِ ملک و قوم تھے۔ کبھی کسی کی برائی کے درپے نہیں ہوتے۔ دوست تو دوست دشمنوں کے ساتھ بھی فیاضانہ سلوک کیا۔ وہ ہر شخص سے اس کی سطح پر آکر گفتگو کرتے۔ غریب ہو کہ امیر، چھوٹا ہو کہ بڑا ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے اور سب کے ساتھ ان کا طرزِ عمل مخلصانہ رہا۔ اسی بنا پر آپ کے تعلقات ہمیشہ وسیع اور عمیق رہے۔ اس لیے بھی کہ تعلقات کی بنیاد کبھی ذاتی غرض نہ رہی۔ یہی وجہ ان کی مقبولیت کی ضامن بنی۔

اردو کے لیے انھوں نے بڑے بڑے امرا کو ہموار کیا۔ اپنے ادبی کاموں سے دوسروں کو متاثر و مرعوب کیا مگر خود کسی سے مرعوب نہ ہوئے۔ اردو کے معاملات میں نواب سالار جنگ جیسے امیروں کو اپنا ہم خیال بنایا تو دوسری طرف مغرب زدہ عہدہ داروں کو اردو کی خدمت کے لیے کمربستہ ہونے پر مجبور کیا۔ نواب سالار جنگ کے پاس ڈاکٹر صاحب کا اکثر آنا جانا تھا اور تاریخی نوادرات و مخطوطات وغیرہ کے سلسلے میں دونوں ہم مذاق تھے اسی وجہ وہ ان کے درباری تکلفات سے اور پابندیوں سے بے نیاز تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت، دماغی ساخت اور سرشت میں اعلیٰ درجہ کی وسیع النظری اور فنی خصوصیات کا ہم آہنگ اور خوش گوار امتزاج موجود تھا جو اردو کے ماضی اور حال کے ادیبوں میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے کردار اور عمل سے دکنی کے نوجوان ادیبوں کی رہنمائی کا احسن فریضہ انجام دیا۔ ان کی نثر عام فہم اور سادہ ہے جس میں روانی اور بے ساختہ پن کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور دل کشی ہے۔

ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے والد بزرگوار کے سائے سے بہت جلد محروم ہوگئے ایک ایسی رحمت سے جس کے فیوض و برکات سے زندگی بھر استفادہ کیا جاتا تھا۔ ایک ایسی شخصیت جس نے زندگی تمام زبان و ادب اور ملک کی خدمت میں گزار دی، اس کے فیض سے

.م ہوگئے۔ جس طرح وہ اردو کے لیے میر کارواں اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے روحِ رواں تھے۔ خاندان کے سربراہ شفقت و محبت کا گنجینہ
: ان کا مسکراتا ہوا چہرے آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔

والد صاحب کا شمار ان خوش نصیب اور برگزیدہ اصحاب میں ہوتا ہے نصرت و کامرانی ہمیشہ جن کے قدم چومتی رہی۔ اس لیے ہم نے
یں کبھی افسردہ و جبیدہ نہیں دیکھا۔ ان کا ایک شعر ہے:

زندہ دل ہنستے ہنستے گزر جائیں گے زندگی سانس لیتی رہے گی یوں ہی

وہ ہمیشہ اپنے علمی ادبی کاموں میں منہمک رہتے۔ ہر چیز اور ہر بات کے لیے وقت مقرر ہوتا۔ گھڑی کی سوئی کے ساتھ کام کرتے۔ صبح
فجر کے ساتھ اٹھتے عبادات سے فارغ ہونے کے بعد ناشتہ فرماتے بہت مختصر سا اکثر یہی کہتے ناشتہ بہ قدر بادام۔ ریڈیو سے خبریں سنتے۔ اخبار
ھتے پھر احباب کے ضروری خطوط کے جواب لکھتے اور کالج جاتے وقت پوسٹ کر دیتے۔ ٹھیک صبح نو بجے ہم سب کو تیار ہو جانے کہتے خود اپنے
، بھر کے پان بنا کر بٹوے میں رکھ لیتے اور ہم سب بھائیوں اور بہنوں کو ساتھ لے کر ہم لڑکوں کو مدرسہ، عالیہ اور بہنوں کو محبوبیہ گرلز
ل اور زنانہ کالج پر چھوڑتے ہوئے اپنے کالج پہنچتے۔ واپسی پر بھی اسی طرح گھر آتے۔ راستے میں ہر ایک سے سوال ہوتا کہ آج کیا تعلیم
ئی۔ گھر آنے پر پھر ادارۂ ادبیاتِ اردو کے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ ساتھ ساتھ مضامین بھی لکھتے جاتے کچھ دن بعد کتابی شکل میں وہ
یریں ہمارے سامنے آتیں۔ صبح یا شام کے وقت روزانہ کاتب صاحب کی حاضری ہوتی اور عموماً رات کے کھانے کے بعد پروف دیکھے
تے۔ رات کا کھانا سب کے ساتھ ٹھیک ۸ بجے کھاتے چاہے کوئی بھی موسم ہو۔ اپنا ہر کام خود کرتے اور ہمیشہ تلقین کرتے رہتے کہ اپنا کام
: کرنا چاہیے۔

وہ ایک عملی شخصیت کے حامل تھے۔ تیز کام افراد کو پسند کرتے تھے ہر کام وقت پر انجام پاتا وہ جب کسی کو کام حوالے کرتے تو تاکید
تے کہ بجلی کی طرح جانا اور بادل کی طرح آنا۔

ڈاکٹر صاحب کو اپنے والد حضرت غلام محمد قادر زعم سے بے حد محبت اور لگاؤ تھا ہر روز وہ اپنے باغ سے گلاب اور موتیا کے پھول
گاہ شریف لے جاتے اور ہر سال بڑے اہتمام کے ساتھ عرس شریف کی سہ روزہ تقاریب منعقد کرتے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو ڈاکٹر صاحب کا جسم تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اسی کے کاموں اور اسی کی ترقی اور وسعت کے پروگراموں میں مصروف
تے۔ جو بھی ادیب، شاعر، صحافی حیدرآباد آتے انھیں ضرور ادارہ دکھاتے۔ سچ ہے ایوانِ اردو ان کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

قیامِ آندھرا پردیش کے بعد ڈاکٹر صاحب نے یومِ محمد قلی قطب شاہ کی بنا ڈالی۔ ہر سال بڑے شاندار پیمانے پر اس تقریب کا اہتمام
تے۔ اسے آج قومی تہوار کی شکل حاصل ہو گئی ہے۔

انھوں نے یومِ قلی منانے کی وجہ یہ بتائی کہ محمد قلی کا دور سارے ہندستان کے لیے فخر و مباہات کا باعث ثابت ہو سکتا ہے قومی یک
ی، لسانی رواداری اور ترقیاتی نقطہء نظر سے قطب شاہوں کا زمانہ قابلِ ستائش ہے۔

وہ بڑے کھلے ذہن کے مالک تھے۔ اردو زبان کے ساتھ دوسری زبانوں ہندی اور تلگو وغیرہ کا معاملہ آتا تو کبھی ان کی مخالفت نہیں
تے اور یہی کہتے کہ ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں اس کو بھلا اس کو برا کہنا زیب نہیں دیتا۔

(باقی ص ۵۱ پر)

محمد نسیم الدین فریس

ڈاکٹر زور مکاتیب کے آئینے میں

ڈاکٹر زور ایک کثیر الجہات اور ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے ۔ ان کی ذات مختلف علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا سرچشمہ و مصدر تھی ۔ بلاشبہ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور متعدد انجمنیں ان کی ذات سے وابستہ تھیں ۔ یقین ہے کہ مختلف اصحابِ علم و دانش، اربابِ اقتدار، مشاہیر اور عمائدین سے ان کی مراسلت رہی ہوگی مگر افسوس کہ ان کے خطوط مرتب نہیں کیے گئے اور ان پر کماحقہ دادِ تحقیق نہیں دی گئی ۔ زیرِ نظر مضمون کی ترتیب کے سلسلے میں ڈاکٹر زور کے جو مکاتیب راقم التحریر کے پیشِ نظر رہے ان میں سے بیش تر ماہ نامہ "سب رس" حیدرآباد کے "یادگارِ زور نمبر"....... میں شائع ہوئے ہیں ۔ کچھ ماہ نامہ "سب رس" کراچی بابتہ ستمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئے اور کچھ ڈاکٹر محمد بن عمر کی کتاب "ڈاکٹر زور" میں شامل ہیں ۔ ڈاکٹر زور کے جو مکاتیب شائع ہوئے ہیں ان سے ان کی سیرت و شخصیت کے پوشیدہ گوشے اور نئے رخ سامنے آتے ہیں ۔ علمی و ادبی دنیا میں وہ محقق، نقاد اور ماہرِ لسانیات و صوتیات کی حیثیت سے مشہور ہیں ۔ خطوط کی دنیا میں وہ ایک محبت کرنے والے شوہر، شفیق باپ، ہمدرد استاذ، مخلص دوست اور بزرگ رہ نما کے روپ میں جلوہ گر ہوئے ہیں ۔

ڈاکٹر زور کو اپنی شریکِ حیات محترمہ تہنیت صاحبہ سے بے حد محبت تھی جس کا اظہار ان کے متعدد خطوط سے ہوتا ہے ۔ بیگم تہنیت زور نواب رفعت یار جنگ صوبہ دار اورنگ آباد کی صاحب زادی اور حیدرآباد کے ایک ذی حشم خاندان کی چشم و چراغ ہیں ۔ یہ نہایت دین دار، پردہ نشین اور گھریلو خاتون ہیں ۔ مبداءِ فیض سے شعر و سخن کا نہایت پاکیزہ اور رچا ہوا ذوق پایا ہے ۔ ان کے کلام کے تین مجموعے ذکر و فکر (۱۹۵۵ء) صبر و شکر (۱۹۵۶ء) اور تسلیم و رضا (۱۹۵۹ء) شائع ہو چکے ہیں جو حمد، نعت اور منقبتوں پر مشتمل ہیں ۔ حیرت ہے کہ دکن کی خواتین کے علمی و ادبی کارناموں پر جو کتابیں لکھی جا چکی ہیں ۔ ان میں بیگم تہنیت زور کا ذکر نہیں ہے ۔ کم زور صحت کے باوجود بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور کا دستِ راست بنی رہیں ۔ زور صاحب بھی اپنی اطاعت شعار، لائق اور عالی نسب بیوی کو بے حد چاہتے تھے ۔ اہلیہ کی علالت انھیں افسردہ اور پریشان کر دیتی تھی ۔ وہ اپنے سارے معمولات اور علمی و ادبی سرگرمیوں کو پس پشت ڈال کر بیگم صاحبہ کے علاج معالجے اور تیمار داری میں تن دہی سے جٹ جاتے تھے ۔ چناں چہ سید مبارز الدین رفعت کے نام ۱۷/ جولائی ۱۹۵۷ء کے مرقومہ خط میں لکھتے ہیں:

> "میں خود آپ کو لکھنے والا تھا مگر بیوی کو ہارٹ اٹیک ہو رہے تھے ۔ بڑا پریشان رہا ۔ اب کچھ رو بہ صحت ہیں مگر عرصے تک لیٹے رہنا ہوگا ۔ میرے معمولات روزمرہ میں فرق آگیا کسی کو نہ لکھ سکا ۔"

(بہ حوالہ ماہ نامہ "سب رس" حیدرآباد، یادگارِ زور نمبر)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متعاقب ماہ و سال کے دوران بھی بیگم صاحبہ کی صحت متاثر رہی ۔ اس عرصے میں زور صاحب نے خواجہ حمید الدین شاہد کو جتنے خطوط لکھے ان سب میں اہلیہ کی علالت کا ذکر ہے چناں چہ ۴/ نومبر ۱۹۵۹ء کے مکتوبہ ایک خط میں شاہد صاحب کو لکھا ہے:

"بیگم صاحبہ کی صحت کی وجہ سے پریشان ہوں ۔ بیگم صاحبہ کو فم معدہ میں درد ہوتا تھا اور سینے میں بھی ۔

کارڈیو گرام کیا گیا تو قلب کے عارضے کا بھی شبہ ہے۔ اس لیے کئی روز سے لٹا دیا گیا ہے۔ پستی بھی محسوس کرتی ہیں۔ مجھے ہر وقت ان کے قریب نہ ہونے سے بے چینی رہتی ہے........ جب تک حسب معمول چلنے پھرنے نہ لگیں پریشان رہوں گا۔"
(ماہ نامہ سب رس کراچی ستمبر ۸۰، ص نمبر ۲۱)

آخری جملے سے زور صاحب کی ذہنی کیفیت اور اہلیہ کی بیماری کے نتیجے میں ان کی تشویش اور پریشانی کا اظہار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر زور اپنے بچوں کے حق میں ایک مشفق پدر اور ذمہ دار باپ تھے۔ ان کی شفقت اور ذمہ دارانہ رویے کا اندازہ ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جن میں انھوں نے اپنی صاحب زادیوں کی تعلیم، ملازمت اور نسبت وغیرہ کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ شاہد صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تسنیم آرک ٹیکچر اور توفیق بی۔ اے میں شریک ہورہی ہیں.......... تہذیب کا ابھی کچھ نہیں ہوا۔ بڑی فکر ہے۔ خدا کرے کہ جلد کسی اچھے گھر میں طے پا جائے۔ لکچراری کا ابھی کچھ نہ ہوا۔"
(مکتوبہ ۲۵ / جون ۱۹۵۹ء بہ حوالہ ماہ نامہ سب رس کراچی ستمبر ۱۹۸۰ء ص نمبر ۱۸)

ڈاکٹر زور کے تربیت یافتوں میں خواجہ حمید الدین شاہد ایک خاص امتیاز کے حامل ہیں۔ وہ برسوں ڈاکٹر زور، ادارہ ادبیات اردو اور سب رس سے وابستہ رہے۔ تقسیم ملک کے چند برس بعد انھوں نے پاکستان میں توطن اختیار کیا۔ ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر زور نے انھیں جو خط لکھے ان میں وہ اپنے شاگرد کے بارے میں باپ کی طرح متردد اور فکر مند نظر آتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کو کیا کام ملا اور ماحول کیسا ہے کچھ اس بارے میں بھی لکھیے۔ کسی نہ کسی طرح اصل حالات بھی معلوم ہونے ضروری ہیں۔ میں بہت فکر مند ہوں۔" (مورخہ یکم جولائی ۵۹ء بہ حوالہ سب رس کراچی ستمبر ۸۰ء ص ۱۹)

ڈاکٹر زور کو خواجہ حمید الدین شاہد سے نہایت گہرا تعلق خاطر تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ شاہد صاحب پاکستان میں اپنا اور اپنے استاد کا نام روشن کریں۔ وہ خطوط کے ذریعہ شاہد صاحب کو علمی و ادبی کاموں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد بھی جب وہاں کے مجلوں میں اپنے شاگرد کی کوئی تخلیق نہیں دیکھتے تو انھیں افسوس ہوتا ہے اور وہ فوراً تنبیہہ کرتے ہیں:

"وہاں سے جو رسائل اور جرائد آتے ہیں ان میں آپ کا نام ڈھونڈتا ہوں کہیں نظر نہیں آتا مایوسی ہوتی ہے۔"
(مورخہ ۹ / ڈسمبر ۵۹ء بہ حوالہ "سب رس" کراچی ستمبر ۸۰ء ص ۲۲)

۲۰ / فروری کے مکتوبہ ایک خط میں شاہد صاحب کو نصیحت کرتے ہیں:

"وہاں کی علمی دنیا میں شہرت اور رسائی حاصل کیجیے۔ جب تک یہ نہ ہو وہاں کا وجود وعدم بے کار ہے۔ تعجب ہے کہ اب تک آپ نے اس میدان میں قدم نہ رکھا اور اگر رکھا تو اس کا ثبوت نظر نہیں آیا۔" (بہ حوالہ ایضاً ص نمبر ۲۴)

ڈاکٹر زور کی شخصیت کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ کام کرنے کے علاوہ کام کروانے کے ڈھنگ سے بھی خوب آشنا تھے۔ تحقیق و تنقید اور تصنیف و تالیف کا کام کرنے والوں کی جیسی ٹیم انھوں نے اپنے احباب اور شاگردوں کی شمولیت سے تیار کی تھی اس کی مثال سرسید کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتی۔ وہ نئے قلم کاروں کی نہایت فراخ دلی سے حوصلہ افزائی کرتے اور ان کی نگارشات کو سراہتے تھے تاکہ نئے لکھنے والوں میں خود اعتمادی پیدا ہو اور وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں جمے رہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام ایک مکتوب میں ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تعریف میں یوں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

"آپ کا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ میرے پاس آیا تھا۔ اس کو پڑھ کر آپ کی لیاقت، محنت اور عزت میری نگاہ میں بڑھ گئی ہے۔
بڑی خوشی ہوئی آپ نے بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ فوراً شائع کی جائے۔

(مورخہ یکم مئی ۱۹۵۸ء۔ ماہ نامہ "سب رس" حیدر آباد ۱۹۲۳ء ص ۳۳۴)

زور صاحب نہایت جوہر شناس اور علمی و ادبی صلاحیتوں کے پارکھ واقع ہوئے تھے۔ اگر کسی نوجوان میں انھیں تصنیف و تالیف استعداد کا ہلکا سا پر تو بھی نظر آتا تو وہ اسے اس میدان میں آگے بڑھانے کے لیے مسلسل کوشاں رہتے اور مختلف بہانوں سے اسے تحریک تحریص دلا کر سرگرم عمل رکھتے۔ ان کی بصیرت اور جوہر شناس نظروں کی داد دیجیے کہ وہ ۱۹۵۸ء میں جب کہ خلیق انجم نے ہنوز پی ایچ۔ ڈی، داخلہ بھی نہیں لیا تھا ان سے کہتے ہیں:

"آپ دلی میں اردو کے سب سے بڑے ماہر اردو رہیں گے۔ اس کے لیے بڑی ریاضت اور سعی کی ضرورت ہے۔
چوں کہ آپ میں صلاحیتیں ہیں اس لیے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیے ورنہ ضائع ہو جائیں گی۔ وقت بڑا قیمتی ہے اس کا خیال رکھیے۔" (مورخہ ۲۴/اپریل ۵۷ء "سب رس" حیدر آباد زور نمبر ۱۹۶۳ء ص ۳۶۱)

زور صاحب کو قدیم شعراء کے کلام اور حالات و سوانح کی تحقیق و تنقید کے علاوہ ان کے مزارات کی نشان دہی اور تحفظ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ وجہی کی قبر کی دریافت اور شمس الدین فیض کے مزار کا تحفظ ان کے اہم کارنامے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ دکن کی طرح اہلِ شمال قدیم سخن وروں کے مزارات کا تحفظ کریں۔ اس ضمن میں خلیق انجم کو متوجہ کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مشاہیر شعرائے اردو کی یادگاروں اور آخری آرام گاہوں پر تختیاں لگانے کے بارے میں آپ نے اب تک کیا کام کیا ہے۔" (مورخہ ۱۴/فبروری ۵۸ء سب رس" زور نمبر ص ۳۵۸)

انھیں کے نام ایک اور خط میں اس کام کے طریقے اور فوائد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ دلی کے شعراء و مشاہیر کی آخری آرام گاہوں پر مضامین کا سلسلہ جلد شروع کیجئے۔ تصویر کے ساتھ مکمل جغرافیہ، حال اور تفصیلات ضرور لکھیے۔ یہ کام آپ کی شہرت کا باعث بھی ہوگا اور ضروری بھی ہے۔"

(مکتوبہ ۷/مارچ ۵۸ء "سب رس" زور نمبر۔ ص ۳۶۰)

گوپی چند نارنگ اور خلیق انجم کے علاوہ اسلم پرویز سے بھی ڈاکٹر زور نے مشفقانہ اور مخلصانہ تعلق خاطر کا اظہار کیا ہے۔ وہ ان کی مصروفیات کے بارے میں باخبر رہنا چاہتے تھے۔ چناں چہ خلیق انجم کے نام ایک مکتوب میں اسلم پرویز کے بارے میں استفسار کیا ہے اور ان کے کیریر کے تعلق سے فکر مندی ظاہر کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"نارنگ صاحب کی ریڈری کی خبر سے بھی خوشی ہوئی۔ اسلم پرویز کا کیا ہوا مجھے ان کی فکر ہے۔ آپ کی پی ایچ۔ ڈی کا بھی خیال رہتا ہے۔" (مرقومہ ۴/ستمبر ۶۱ء "سب رس" زور نمبر ص ۳۶۳)

اسلم پرویز کے نام ایک خط میں ڈاکٹر زور نے غالباً علم غیب کے اشارے پر یہ لکھا تھا۔

"ڈاکٹر خلیق انجم اور آپ سے میری بہترین توقعات ہمیشہ وابستہ رہیں گی۔"

(مورخہ ۲۵/اپریل ۶۲ء "سب رس" زور نمبر ص ۳۶۴)

وقت نے ثابت کر دیا کہ زور صاحب نے تیس بتیس سال قبل گوپی چند نارنگ، خلیق انجم اور اسلم پرویز کے بارے میں

اندازے قائم کیے تھے اور ان سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ غلط نہیں تھیں۔

زور صاحب ایک بارعب اور دبنگ شخصیت کے مالک تھے صورتاً بھی اور سیرتاً بھی۔ ان کے سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ وہ قدرے سریع الغضب بھی واقع ہوئے تھے لیکن جس تیزی سے انھیں غصہ آتا تھا اسی تیزی سے غائب بھی ہو جاتا تھا۔ وہ منہ پر کہنے کے عادی تھے دل میں رکھنے کے نہیں۔ کسی مسئلے میں نظریاتی اختلافات علم و تحقیق کی دنیا میں نئے نہیں ہیں لیکن اعلیٰ ظرف وہ ہوتے ہیں جو علمی نزاع کو شخصی تنازعہ نہ بنائیں۔ بھاگ متی کے بارے میں ڈاکٹر زور اور پروفیسر ہارون خان شیروانی کے مابین علمی مناقشے سے اہلِ نظر اچھی طرح واقف ہیں لیکن اس اختلافِ رائے کے باوجود زور صاحب نے پروفیسر شروانی سے شخصی طور پر نہایت خوش گوار تعلقات بحال و برقرار رکھے جس کا ثبوت ثانی الذکر کے نام ان کے خط سے ملتا ہے جس میں وہ نہایت خلوص سے کشمیر میں شروانی صاحب کو خوش آمدید کرتے۔ ان کے لیے مناسب قیام گاہ ڈھونڈتے اور انھیں وہاں کے تاریخی مقامات کی سیر کراتے نظر آتے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

"آپ تشریف لائیں تو تمام تاریخی مقامات میرے ساتھ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ مجھے بھی ان کا شوق ہے اور جاتا رہتا ہوں........ کسی مناسب جگہ قیام کا انتظام رہے گا مطمئن رہیے....... آنے کی تاریخ اور وقت سے مطلع فرمائیں تو میں خود حاضر ہو کر استقبال کروں گا۔" (مرقومہ ۲۲/ستمبر ۶۲ء "سب رس" زور نمبر)

ڈاکٹر زور کو ایوانِ اردو سے وہی نسبت ہے جو ان کے محبوب شاعر محمد قلی قطب شاہ کو چارمینار سے تھی۔ اس ایوان کے ساتھ انھیں ذہنی اور جذباتی لگاؤ تھا جس کا اظہار ان کے مکاتیب میں بھی ہوا ہے۔ وہ ایوانِ اردو کو ایک علمی تحقیقی اور تہذیبی مرکز نیز مختلف ادبی سرگرمیوں اور اردو زبان کی مختلف تحریکوں کا منبع و سرچشمہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ ہمیشہ اس کے فروغ اور استحکام کے لیے ساعی، کوشاں اور فکرمند رہے اور اس کی ترقی کے لیے ان تمام ذریعوں اور وسیلوں کو بروئے کار لایا جو ان کی دسترس میں تھے۔ چناں چہ ادارے کی امداد کے سلسلے میں گوپی چند نارنگ سے جو تعاون حاصل کیا اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"ادارہ ادبیاتِ اردو کو گذشتہ سال ڈھائی ہزار روپے ملے تھے امسال درخواست دی ہے کہ اس میں اضافہ کیا جائے اور گوپال ریڈی صاحب کو لکھا ہے کہ وہ کوشش کریں۔ آپ مل کر یاد دلائیے۔"

(مورخہ ۲۰/اکتوبر ۶۰ء "سب رس" زور نمبر ص ۷۳۴)

ماسبق اوراق میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی کہ خطوط و مکاتیب کے آئینے میں ڈاکٹر زور بہ حیثیت شوہر، باپ، استاد اور دوست کس انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں، پیش آیند اوراق میں ان کے خطوط کی بعض دیگر خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے گی جن سے زور صاحب کے مزاج اور سیرت کے کچھ اور پہلو سامنے آتے ہیں۔

ڈاکٹر زور نہایت خوش مزاج اور ظریف الطبع تھے۔ احباب کی مجلس ہو یا شاگردوں کا اجتماع وہ ہر جگہ چہکتے، قہقہے لگاتے اور زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط میں بھی ظرافت کی چاشنی اور طنز کی چٹکیاں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ "بیگم صاحبہ کے پاؤں میں اب بھی درد ہے اور ایک طرح کا عذرِ لنگ پیدا ہو گیا ہے۔" (بہ نام نارنگ ۲۶-۷-۵۷ء)

۲۔ "آزاد صاحب ۲۶/ کا دن میرے لیے محفوظ رکھیں۔ ان کے رونی صورت والے دوست سے وزارتِ تعلیم میں ملنا ہے۔" (بہ نام نارنگ ۱۹-۸-۵۸ء)

۳۔ "دلی میں گرمی تھی یہاں پہنچا تو پھر برف خانے میں بند ہو گیا۔ بلا کی سردی ہے۔" (بہ نام عارف الدین حسن ۷-۲-۶۲ء)

۴۔ "راستے میں ایک ایک فٹ برف ہے۔ گاڑیاں پھسل رہی ہیں۔ ڈسمبر کے وسط میں نکلنے کا ارادہ ہے دعا فرمایئے کہ خیریت کے ساتھ یہ پل صراط پار کر سکوں۔" (بہ نام مارننگ ۱۸-۱۱-۶۱ء) "پل صراط" توجہ کا طالب ہے۔

۵۔ حکومت کی جانب سے ادارے کو حسب دل خواہ امداد نہ ملی تو لکھتے ہیں (طنز کا انداز دیکھا چاہیے) "آج آزاد صاحب کا خط بھی آیا ہے اور خوش خبری بھی ملی ہے مگر سمندر سے شبنم والی بات ہے۔" (بہ نام مارننگ ۲۶-۷-۵۷ء)

بے پناہ سادگی اور بے ساختگی کے باوجود زور صاحب کے خطوط میں عربی، فارسی اور اردو کے اشعار و ضرب الامثال بھی ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زور کی نوک زبان پر تھے۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ "آپ جیسے اصحاب وہاں اردو کے لیے جو کچھ توجہ فرمار ہے ہیں غنیمت ہے مگر ضرورت ہے کہ مزید توجہ منعطف ہو۔ حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی"۔ (بہ نام ممتاز احسن ۵-۶-۵۷ء)

۲۔ "اگر آپ ان پر لکھیں تو بجائے خود دکن کے چند بڑے عوامی خدمت گزاروں کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ تازہ خواہی داشتن ایں داغ ہائے سینہ را۔" (بہ نام مبارز الدین رفعت ۱۲-۸-۵۶ء)

۳۔ "میری قسمت بھی عجیب ہے۔ اس اہتمام سے درگاہ کی عمارتیں بنوائیں اور کچھ عرصے کے بعد اس سے بے تعلق ہو گیا۔ ایوان اردو بنا۔ اپنی زندگی ہی میں چھوڑ آیا۔ اب یہاں کشمیر اردو اکیڈمی کی بنیاد ڈال رہا ہوں۔ شاید یہ عمارت بن جانے کے بعد اس کو بھی چھوڑ دوں۔ موتو قبل ان تموتو کی مثل صادق آرہی ہے۔" (بہ نام شاہد ۴-۷-۶۱ء)

۴۔ "تہذیب کے لیے پاکستان کا پیام آیا ہے۔ اپنے ارادے کے خلاف وہاں دینا پڑے تو وہ مقولہ صادق آئے گا۔ عرفت ربی بفسخ العزایم۔" (بہ نام شاہد ۲۸-۳-۶۰ء)

ڈاکٹر زور نے یہ خطوط نہایت سادہ، رواں اور عام فہم زبان میں لکھے ہیں۔ دوران تحریر ان کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ ان کے مکاتیب کبھی شرمندۂ اشاعت بھی ہوں گے اس لیے انھوں نے ان میں عبارت آرائی اور انشاء پردازی کی کوشش نہیں کی۔ لیکن غیر شعوری طور پر ان کے خامہ پرزور سے ایسے جملے ٹپک پڑے ہیں جن سے انشاء پردازی کا جمال اور حسن ادب ہویدا ہوتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ "یہاں بارش شروع ہو گئی ہے۔ مطلع ابر آلود ہے۔ پھوار جاری ہے۔ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی ہر طرف سبزہ اور موسم خوش گوار ہے مگر اب دل میں امنگ اور طبیعت میں جوش کی کمی ہوتی جارہی ہے"۔ (بہ نام شاہد ۱-۷-۵۹ء)

۲ "خوش قسمت ہیں آپ کہ اس قدر جلد قدر دان بھی پیدا ہو گئے ورنہ کتنے ایسے پھول ہوں گے جن کی بہار بے کسی اور ناقدر دانی کی وجہ سے بہت جلد ختم ہو گئی اور آج دنیا انھیں جانتی بھی نہیں۔" (بہ نام صاحب زادہ میکش حیدر آبادی، بحوالہ "ڈاکٹر زور" مرتبہ محمد بن عمر)

زور صاحب کی مکتوب نگاری کا خاص وصف یہ ہے کہ انھوں نے یہ خطوط قلم برداشتہ لکھے ہیں اور ان میں پوری صاف گوئی اور بے باکی سے اپنے جذبات و خیالات اور مختلف واقعات پر اپنے رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خطوط میں تعلقات کی شیرینی اور خلوص کی مہک پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط سے نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کی طرح تنقید نگاری اور ابو الکلام آزاد کی طرح انشاء پردازی کا کام نہیں لیا۔ ان کے خطوط نجی علائق و روابط کی تفسیر اور ذاتی و خانگی معاملات کی تصویریں ہیں۔ لیکن اس بے تکلفی اور بے نیازی کے باوجود ان کے خطوط ادبی محاسن، نزاکتوں اور ان کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں اہم داخلی شہادتوں سے مملو ہیں۔ اس لیے ان کی ادبی اور تحقیقی

(باقی ص ۳۴ پر)

ڈاکٹر سید عباس متقی

نقوش زور از خامہ کمزور

جب کبھی میں ادارہ ادبیات آتا ہوں اور یہاں کے ذخیرہ کتب، سلیقہ مندی، کیٹلاگ، حسن انتظام، نوادرات اور مخطوطات کو بہ نظرِ غائر دیکھتا ہوں تو دل سے محض داد و تحسین کے کلمات ہی نہیں نکلتے بلکہ روح کی گہرائی سے دعائیں بھی امڈ پڑتی ہیں۔ بارہا میں نے ڈاکٹر زور کی تصاویر دیکھیں، سچ تو یہ ہے کہ تصاویر دیکھنے کے بعد مرحوم کو زندگی کے آئینے میں متحرک دیکھنے کی آرزو انگڑائیاں لیتی ہے لیکن بقول وجد "جانے والے کبھی نہیں آتے: جانے والوں کی یاد آتی ہے" ان سے ملاقات محض ان کی تحریروں یا ان پر مرقوم دوسروں کی تحریروں کے وسیلے ہی سے ہوئی۔ چیک کی شیروانی اور اسی کپڑے کی ٹوپی میں ملبوس ڈاکٹر زور چہرے مہرے سے کوئی وضع دار نواب معلوم ہوتے ہیں۔ خلافی آنکھیں بصیرت اور نکتہ رس ذہن کی غماز، خط و خال چغلی کھاتے ہیں کہ رعب و داب اس شخص میں فطرتاً ودیعت ہے۔ وضع قطع سے یہ ادیب سے زیادہ منتظم اور کرارے منتظم لگتے ہیں، لیکن تحریروں میں یہ کچھ اور ہی انداز سے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان، تنقید، تحقیق، شعر گوئی، قہقہے، علمی شغف، تصنیف، تالیف، تنظیم، تدریس، توبیخ، تاریخ، غرض ایک ایسی شخصیت جسے منشور کی آنکھ سے دیکھا جا رہا ہو۔ ہر رنگ دوسرے رنگ سے جدا، ہر کیفیت، کیفیتِ دگر، ہر ادا انرالی، ہر عمل منفرد، ڈاکٹر زور نے اپنا تخلص شاید اپنی شخصیت کے مکمل عرفان کے بعد ہی تجویز کیا تھا۔ قلم میں زور، قدم میں زور، تحریر میں زور، اہتمام میں زور، انتظام میں زور، احباب میں زور، اقربا میں زور غرض جدھر دیکھیے ایک زور ہے، ایک قوت ہے، ایک توانائی ہے، جو سب کو مرعوب کرتی ہے کسی سے مرعوب ہوتی نہیں، جب ہم زور کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ خدا نے ان کے اوقات میں بڑی برکت دی تھی۔ جس زمانے میں لوگ شعر کی تقطیع سیکھتے ہیں، الفاظ کی تذکیر و تانیث سے واقفیت حاصل کرتے ہیں، درست تلفظ تک اپنی زبان کو پہچانتے ہیں۔ اس سن میں ڈاکٹر زور کتابیں لکھتے ہیں، کتابیں لکھواتے ہیں، مختلف اداروں سے وابستہ ہیں تو مختلف انجمنوں کے سربراہ۔ ان کی زندگی بظاہر زیادہ طویل نہ رہی لیکن اس وقفہ عمر میں ان کے کارناموں کی فہرست پچاسوں کارگرد اور فعال شخصیتوں کی عمروں اور ان کے کارناموں پر بھاری ہے یہ محض ان کی لگن، ان تھک کوشش اور نہ تھمنے والی رفتار کی دین ہے۔ روایتاً یہ بات کہی جاتی ہے کہ فلاں شخص بجائے خود ایک ادارہ تھا، ایک انجمن تھا لیکن ماضی قریب میں اگر یہ روزمرہ کسی پر چسپت ہوتا ہے تو وہ سارے ہندوستان میں صرف ڈاکٹر زور کی ذات گرامی ہے۔ موصوف نے اپنے پیچھے اپنی "ذات" چھوڑی ہے جس کا تسمیہ تو معلوم ہے تتمہ نہیں معلوم۔ جو چیز ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں ملی اور نہ ان پر مرقوم دوسروں کی تحریروں میں، وہ ہے "تکان" جو ان پر اس انداز سے مسلسل کام کرتے رہنے کے باوجود کبھی طاری نہیں ہوئی۔ لیکن شاید جو بے تکان کام کرتے ہیں نسبتاً جلد تھک جاتے ہیں۔ انھیں گوارا نہ ہوا کہ جہاں بے تکان کام کیا ہے وہاں تھک ہار کر سو جائیں۔ اس لیے اپنی تکان اتارنے کے لیے ارضِ کشمیر کا انتخاب کیا اور واقعی وہ جگہ ہے بھی ایسی ہی جہاں تکان آسودگی کے ساتھ اتاری جاسکے۔

ادارہ ادبیات اردو ڈاکٹر زور کے خوابوں کی تعبیر ہے جو اردو اور اردو والوں کی خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے خاموش استعارہ ہے کہنے کو تو یہ ایک عمارت ہے لیکن اس عمارت میں ڈاکٹر زور کے خواب، بہزادِ دکن فیاض الدین مرحوم کے ذوقِ سلیم کے علاوہ سیکڑوں عشاقِ

اردو کی امنگیں موجود ہیں۔ یہاں کے نوادرات گویا دکن کا دوسرا حصہ ہم ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہاں میرا ماضی، میرے ملک کا ماضی میرے قوم کا ماضی، ہر قید و بند سے آزاد مسلسل متحرک ہے اور میں یہاں عہدِ ماضی کو ایسے جیتا جاگتا دیکھتا ہوں گویا میں اپنے وجود کے سا "آج" سے "کل" میں پہنچ گیا ہوں۔

ڈاکٹر زور مرحوم کی دو خصوصیات دیگر صاحبانِ زبان و ادب سے انھیں ممیز کرتی ہیں۔ اولاً ان کا بے پایاں خلوص ہے۔ یہ خلوص ہی جلوہ گری تھی جس نے انھیں ایک عظیم المرتبت انسان اور ایک صاحبِ طرز ادیب بنادیا۔ ثانیاً ان کی کشادہ قلبی ہے جو فی زمانہ عنقا ہی سمجھیے وہ دوسروں کی صلاحیتوں اور لیاقتوں سے محض واقف ہی نہیں ہوتے بلکہ بڑھاوا دینے میں کوئی امر انھیں مانع نہ رکھتا۔ آج اعتراف محض زبا ہوتا ہے جس کا دل کی گہرائی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ہر کار کرد اپنی کارکردگی پر قصیدے سننا پسند کرتا ہے۔ دوسرے کے کارناموں پر دو لفظ کہ انھیں گوارا نہیں۔ دل اتنے مختصر ہوگئے ہیں کہ ان میں ذاتِ دیگر کی گنجائش ہی نہیں، لیکن زور مرحوم ایسا اعتراف کرتے تھے گویا وہ دوسرا کی صلاحتیں نہ ہوں خود ان کی اپنی صلاحیتیں ہوں اس کا ثمرہ یہ برآمد ہوا کہ نیا خون ان کے اطراف گردش کرنے لگا۔ پھر تو انھوں نے جس جو کام دیا وہ حق بہ حق دار رسید کے مترادف تھا۔ یہ عدم سیاست اور غیر مصلحت پسندانہ ماحول ہی تھا جو ڈاکٹر زور کے لیے اس درجہ ممد معاون ثابت ہوا کہ ان کے قلم سے دربہائے درخشاں برآمد ہوئے۔ روحِ تنقید، اردو شہ پارے، عہدِ عثمانیہ میں اردو کی ترقی، داستانِ ادب حیدرآباد، حیاتِ میر مومن، مرقع سخن، متاعِ سخن، بادۂ سخن اور کلیاتِ قلی جیسی عظیم الشان تصنیفات نے دامنِ اردو مالا مال ہوا۔

مرحوم اپنے طریق کے منفرد شخص تھے۔ جو ان سے ملتا بس انہی کا کلمہ پڑھتا اور زور اپنی عالی ظرفی کے سبب خود اس کا کلمہ پڑھتے دونوں کی آپسی شہادت کے نتیجے میں زبان اردو کی خدمت ہوتی رہتی۔ ان کے ملنے والوں میں جہاں علما تھے وہیں غربا بھی تھے۔ جہاں شعرائے وہاں ادبا بھی جہاں مولوی تھے وہاں رند بھی۔ کوئی ان سے نالاں نہیں کسی کو ان سے شکایت نہیں۔ وہ مرزا غالب کے مشرب پر فائز تھے۔ و قومی یک جہتی کے علم بردار تھے۔ زندگی بھر محبت تقسیم کی۔ پیار بانٹا اور اپنی زندگی کو ایسا مینارہ نور بنایا جس کی ضیا پاشی مدتوں جاری رہے گی۔

جب ڈاکٹر زور کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جاتا ہے تو کچھ انکشافات یوں بھی سامنے آتے ہیں کہ موصوف کے مزاج میں جلد بازی اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کم کرنے اور لینے کا جذبہ بہ درجہ اتم موجود تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی طبائع کاموں کے دوران وقوع پذیر کمزوریوں پر کماحقہ نظر رکھ سکتی ہیں نہ ان کے تدارک میں ممکنہ حد تک فعال ہو سکتی ہیں۔ جس کے نتائج سے فاضل تنقید نگار واقف ہیں ادارہ ادبیات اردو کی عمارت اور جائے وقوع کو جب ہم تاریخ کے دو ادوار اور نسلوں کے دو امتزاج کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے نہ عمارت کا ڈیزائن ہی حصارِ ماضی کو توڑا ہے اور نہ مافیہ نے۔ کیوں نہ ہو کہ زور مرحوم کے نظریات، اعتقادات اور جذبات کا ایک جزو لاینفک "ماضی" بھی تھا۔ وہ دورِ شاہانہ کے طمطراق اور خیر سگالی ماحول اور خدمات کو کبھی فراموش نہ کر سکے۔

حضرتِ زور اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جسے تصوف کدہ کہنا چاہیے۔ ان کے والدِ بزرگوار اپنے وقت کے صوفی منش آدمی تھے۔ وعظ و نصائح اور ذکر و فکر ان کے خاندان کی چیز تھی۔ عنفوانِ شباب سے اواخرِ عمر تک موصوف نے اپنے خاندان کی میراثِ عزیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ تصوف و سلوک سے عملاً بیگانہ رہے۔ ذکر و فکر سے انھیں کوئی علاقہ نہ تھا۔ اگر وہ اپنے والدِ بزرگوار کے تتبع میں سجادہ نشین ہو جاتے تو وہ اس میدان کے مرد بھی قرار پاتے کہ خدا جب کسی کو لیاقت تامہ عطا فرماتا ہے تو وہ لیاقت جس راہ پر نکل پڑتی ہے اپنی منزلیں آپ برانگیختہ کر لیتی ہے۔ لیکن حضرت زور نے اردو کی خدمت اور شعرائے قدیم کے اعترافِ خدمات کو اپنا نصب العین بنایا تھا اور ہر دو امور میں وہ اس حد تک

کامیاب نظر آتے ہیں کہ اب آئندہ راہ گیروں کو شاید ہی ایسی منزلیں مل سکیں۔

جب ہم ڈاکٹر زور کے کارہائے نمایاں کو بہ غور دیکھتے ہیں تو دو باتیں بہ طورِ خاص نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو قوتِ استدلال، لیاقت و صلاحیت انھیں ودیعت تھی ان کی بھرپور دستگیری ہو پائی۔ اہل الرائے اس امر تک ناواقف نہیں کہ جن چراغوں میں تیل ہوتا ہے وہ پھر جل اٹھتے ہیں لیکن انھیں روشن رکھنے کے لیے کانچ کے حباب بھی چاہئیں۔ کتنے ہی چراغ ایسے ہیں جو محض دست گیری، محبت اور پرورش کے حباب نہ ہونے پر آندھیوں کے جھکڑ سے بجھ بجھ گئے اور جب وہ بجھ گئے تو پھر روشن نہ ہو سکے۔ زور مرحوم ایک اچھے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بزرگوں نے دست گیری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ماتحتوں نے ہر حکم بجالانے کو اپنی سرخ روئی خیال کیا۔ احباب نے ساتھ دیا۔ اربابِ مجاز حتی المقدور ممد و معاون رہے۔ زور مرحوم کے عمر نے وفا نہ کی ورنہ انھوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ یقیناً شرمندہ تعبیر نہ رہتے۔

ڈاکٹر زور نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ زندگی کے اختصار سے وہ کماحقہ، واقف تھے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ ان کی زندگی کے پروگرام لمحہ، موت تک مدون تھے۔ وہ کسی لمحے کو گنوانا پسند کرتے تھے نہ کسی شخص کو، جس لمحے میں جو کام ممکن تھا کیا اور جس شخص سے جو کام ممکن تھا لیا۔ احباب نے جو ان کے اشاروں کو سمجھا اور کر گزرے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ زور کو اگر دکن کا "سرسید" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے ان دونوں بزرگوں میں کچھ قدریں مشترک پائی جاتی ہیں۔ زور مرحوم نے اپنی عزم کی لغت آپ مرتب کی تھی۔ اس میں شکست بے چارگی، اور مایوسی کے الفاظ مرقوم ہی نہ تھے۔ انھیں کام کرنے کا ذوق ہی نہیں جنون تھا۔ اور بحمد اللہ جس کام کی بسم اللہ کی اتمام من اللہ کے جذبے سے کی۔ کیوں نہ ہو کہ جس کے زمرہ احباب میں میر نواز جنگ، ڈاکٹر طاہر علی خاں، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر سیادت علی خاں، پروفیسر محمد علی خاں، عبدالرزاق راشد، اور عمر یافعی جیسے کواکب ضیا بار ہوں اس کی ہمتوں اور حوصلوں کو جس قدر مہمیز ہو کم ہے۔ ادارہ ادبیاتِ اردو محض زور کا زور نہیں بلکہ اس میں کچھ ایسے لوگوں نے لہو دیا ہے جو بنیاد کے پتھر کی طرح کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ حضرت زور کو اردو زبان اور اس کی ترویج و اشاعت سے جو خداداد محبت اور نوجوانوں کے اندر انشا پردازی و شاعری جیسے ذوقِ لطیف کو پیدا کرنے سے جو انسیت تھی وہ اس فہرست سے اجاگر ہے جو ادارہ ادبیات اردو کے قیام کے مقاصد کے طور پر مرقوم ہے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں کہ فرداً فرداً ان مقاصد کو وا کیا جائے تاہم ایک دو باتیں بہ ہر حال لکھی جاتی ہیں تاکہ زور کے جذبات کو خراج پیش کیا جائے "ملک کے نوجوانوں میں انشاء پردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔ تاریخِ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت ایک ایسا مکمل کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں اور جس کا ایک حصہ اناث کے لیے وقف رہے گا۔"

مندرجہ بالا تحریر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر زور کو اپنی قوم کے نونہالوں کے مستقبل اور اردو کے مستقبل کی کس درجہ فکر لاحق تھی۔

آخر میں بدر شکیب کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے مضمون کو پایہ اختتام تک پہنچادوں کہ بیسویں صدی کے ربعِ اول میں دکن میں دو شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ ایک بہادر یار جنگ اور دوسرے ڈاکٹر زور۔ پہلا شخص میدانِ سیاست کا شناور تھا تو دوسرا زبان و ادب کا اور دونوں ہی نے اپنی پر وقار شخصیت سے دکن اور پورے برِ صغیر کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ ایک نے خطابت میں اپنا نام پیدا کیا تو دوسرے نے ادبیات میں اول الذکر کی جواں مرگی نے اس کے سیاسی مشن کو ناکام کر دیا لیکن ثانی الذکر کے کارنامے اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اردو زبان زندہ ہے۔

(یوم زور منعقدہ ۲۵/ ستمبر ۱۹۹۴ء میں یہ مضمون پڑھا گیا)۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

ڈاکٹر زور اور آصف جاہی دور کا ادب

زور صاحب ان نابغۂ روزگار اور جامع حیثیات شخصیات میں تھے جو تاج محل کی طرح بن جاتی ہیں، بنائی نہیں جا سکتیں۔ زور نے شاعری بھی کی اور افسانے بھی تحریر کیے لیکن اردو کے اولین ماہرِ لسانیات، دکنی کے ممتاز محقق، حاملِ بصیرت ادبی مورخ، بالغ نظر نقاد اور صاحبِ طرز انشاء پرداز کی حیثیت سے انھیں پایۂ اعتبار حاصل ہے........ اس نوعیت کی باتیں لوگ باگ بالعموم ہر کہہ و مہہ کے بارے میں لکھ جاتے ہیں لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں یہ سب کہتے ہوئے بھی زور صاحب کے صحیح مقام و مرتبہ کی نشان دہی کرنے سے قاصر ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ زور صاحب نے لسانیات کی سمت یوں ہی توجہ نہیں دی، تاریخ، تحقیق اور تنقید کے تعلق سے بھی ان کا رویہ ایسے ہی نہیں تھا وہ اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتے تھے جس کی تفہیم کے بغیر زور صاحب کی تحریروں کی معنویت تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس ضمن میں "داستانِ ادبِ حیدرآباد" کا "دیباچہ" اہمیت رکھتا ہے بلکہ سب سے پہلے اس کا عنوان "کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو" جو زور صاحب کے تحقیقی مزاج کی گرہوں کو کھولتا، حیدرآباد کے شعر و ادب سے ان کے دل سوز، جذباتی اور والہانہ تعلقِ خاطر کی ترجمانی کرتا اور حیدرآبادی تہذیب کے تعلق سے ان کی بے اختیارانہ اور اٹوٹ وابستگی کی شناخت بن جاتا ہے۔ یہ بات خاطر نشان رہے کہ زور صاحب نے یہ "دیباچہ" یکم جنوری ۱۹۵۱ء کو تسوید کیا۔ اس کی ابتدا ہی اس جملے سے ہوتی ہے "حیدرآباد ابھی ابھی ایک انقلاب سے دوچار ہوا ہے۔" چناں چہ اس انقلاب کے اسباب و علل اور اس کے عمل اور ردِ عمل کو ذہن میں رکھتے ہوئے زور صاحب نے غیر معمولی بصیرت اور دور اندیشی کے ساتھ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی تحریروں میں جس مستقبل کے آئینہ داری کی ہے وہ قابلِ توجہ ہے اور آج پینتالیس سال گزر جانے کے بعد آپ ہم سب شاہد ہیں کہ زور صاحب کی پیشین گوئی کتنی درست تھی۔ ان کے الفاظ ہیں:

> "جغرافی لحاظ سے یہ مرز بوم تلنگانہ میں واقع ہے اور اس وجہ سے اس میں تلنگی کا اور سرکاری تعلق سے ہندی کا بول بالا ہوگا۔ ایسی صورت میں عربی، فارسی اور اردو کا اگلا سا چرچا اس شہر کی سرکار دربار میں شاید باقی نہ رہے۔" (۱)

دراصل یہی احساس بنیادی محرک تھا کہ زور صاحب نے اردو شعر و ادب کی تلاش و جستجو کو اپنی زیست بنالیا بلکہ اپنی عمرِ عزیز کا پل پل اس کے لیے وقف کر دیا۔ فارسی، عربی اور بالخصوص اردو کے قلم کاروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے اور ان کے شعری و ادبی کارناموں کو محفوظ کرنے کی سمت توجہ دی۔ گویا یہ معاشرے کا قرض تھا جو انھوں نے اپنی ذات پر واجب سمجھا اور اس کو ادا کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اب حالات بدل چکے ہیں اور عربی و فارسی کی مقبولیت روز بہ روز کم ہوتی جارہی ہے اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان سب کے بارے میں بھی ضروری معلومات یک جا کر دی جائیں۔ ورنہ ان میں سے اکثر شاید ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیے جائیں گے اور عہدِ رفتہ کے اربابِ کمال کا نام نیک اس طرح ضائع ہو جانا نہ صرف کمال کی ناقدری بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے کمال کے دروازے بند کر دینے کے مترادف ہوگا۔" (۲)

اس مقصد کا حصول یوں ہی ممکن نہیں تھا۔ آج تو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اور انجمنیں غرض کیا کچھ موجود

ہیں کہ چاہیں تو پراجکٹس وغیرہ کی صورت میں ایسے کام کرائے جاسکتے ہیں۔ آج سے نصف صدی قبل کا تصور کیجیے، ایسی سہولتیں کہاں تھیں لیکن زور صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور ان کی شخصیت ایسی سحر انگیز تھی کہ انھوں نے کام کرنے والوں کی اپنے اطراف کہکشاں سی جمع کرلی تھی۔ چناں چہ انھوں نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے خود کو تیار کرلیا تھا۔ یہ بھی ان ہی کی زبانی سنیے:

"اس صورت حال کے پیش نظر مناسب معلوم ہوا کہ حیدرآباد کے علم و فضل اور شعر و سخن کی مکمل تاریخ کو محفوظ کرنے کی خاطر راقم الحروف نے جو خاکہ تیار کیا تھا اس کو سامنے رکھ کر حیدرآبادی ادب کا جائزہ لیا جائے اور اس سلسلے میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کو اجمالی طور پر ہی سہی مگر قلمبند کرلیا جائے۔" (۳)

مختصر یہ کہ ایک مقصد سعید کو ملحوظ رکھتے ہوئے زور صاحب نے قلم اٹھایا۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو شعروادب کے وہ بائے نایاب جو خاک ہو چکے ہیں ان کو ڈھونڈ نکالیں اور اردو شعروادب کا ایوان کچھ اور سجے کچھ اور منور ہو۔ زور صاحب نے ارسطو جاہ کے بارے میں تر قیم کیا ہے:

"حیدرآباد کو سلطنت آصفی کا پایہ تخت اور علم و فضل اور سیاست و اقتدار کا مرکز بنے ہوئے چند ہی سال گزرنے پائے تھے کہ ایک ایسی شخصیت برسرِاقتدار آئی جو شعر و سخن اور علم و فضل کے لیے ابرِرحمت ثابت ہوئی اور شاعروں اور ادیبوں کی ایسی قدر و منزلت کی کہ جس کی نظیر حیدرآباد اور خود اردو زبان کی تاریخ میں نظر سے نہیں گزرتی۔" (۴)

اور اگر میں زور صاحب کے بارے میں یہ عرض کروں تو صائب ہوگا کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کو چند ہی سال گزرنے پائے تھے کہ یہاں کے اورنگ شعروادب پر ایک ایسی شخصیت جلوہ گر ہوئی جو شعر و سخن اور علم و فضل کے لیے ابرِ رحمت ثابت ہوئی اور عہد آصف جاہی کے شاعروں اور ادیبوں کے فن پاروں کو یوں منظرِعام پر لائی کہ جس کی نظیر حیدرآباد اور خود اردو زباں کی تاریخ میں نظر سے نہیں گزرتی۔

زور صاحب نے دکنی اور بالخصوص قطب شاہی دور کی کئی تصانیف کو منظرِعام پر لایا اور پھر جہاں تک آصف جاہی عہد کا تعلق ہے اس کے بیش تر شاعروں مثلاً فیض، رمز، مائل، کیفی اور عزیز وغیرہ کے بارے میں زور صاحب کی تحقیقات اپنی مرتبت آپ رکھتی ہیں۔ "مرقع سخن" کے علاوہ "عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی" زور صاحب کے وہ یادگار کارنامے ہیں کہ اردو دنیا کبھی اس بارِاحسان سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔

"داستانِ ادبِ حیدرآباد" کو آصف جاہی عہد میں اردو کی ترقی کے باب میں خاصا اونچا مقام حاصل ہے ۲۲۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اصل متن لگ بھگ ۲۰۰ صفحات کا احاطہ کرتا ہے۔ ان ۲۰۰ صفحات میں حیدرآباد کے ۳۰۰ سالہ اردو عربی اور فارسی شعروادب کا تفصیلی جائزہ یوں بھی ممکن نہیں تھا اور ایسا ہے بھی نہیں۔ زور صاحب نے اجمال اور اختصار سے کام لیا ہے۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ اہل قلم کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کے کلام وغیرہ کا مجمل جائزہ ہی نہیں، متعلقہ ادوار کی علمی و ادبی تحریک اور ان کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے تہذیبی اور معاشرتی حالات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ زمانے کے سرد و گرم پر زور صاحب کی گہری نظر رہی ہے۔ وہ انقلاباتِ زمانہ کو گہرائی سے اور ان کے صحیح سیاق و سباق میں دیکھنے کی نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے نری تحقیق سے کام نہیں لیا بلکہ معاشی، معاشرتی تہذیبی اور ادبی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا ہے۔ چناں چہ نوازش علی خاں شیدا، میر عالم، مہ لقا بائی چندا اور چندو لال شاداں وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی تنظیمی صلاحیتوں، علم دوستی اور شعروادب سے ذاتی دلچسپی ہی کا بیان نہیں ہے بلکہ ان کی فنِ تعمیر سے دلچسپی، ان کی داد و دہش، غرباء پروری اور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کا احوال بھی تر قیم کرگئے ہیں کہ یہ پڑھتے ہوئے اس دور کے حالات کی ایک بھرپور اور دل آویز تصویر صفحہ قرطاس پر ابھر آتی ہے۔ فخرالدین خاں شمس الامراء کے بارے میں زور صاحب نے جو بھی لکھا ہے اس کو درجہ

استفاد حاصل ہے ۔ شمس الامراء کی علم دوستی، سائنسی علوم سے ان کے شغف، مدرسہ فخریہ کے قیام اور ان کے سنگی چھاپہ خانے کے ذیل و نیز ان کے فرزندوں رفیع الدین خاں نامور جنگ اور بدر الدین خاں رفعت جنگ کے تعلق سے زور صاحب کی تحریریں ہماری علمی تاریخ کا گراں بہا حصہ رہیں گی ۔ زور صاحب نے کہیں کہیں تو متعلقہ دور کے لسانی منظر نامہ کو بھی پیش کر دیا ہے ۔ نظام الملک آصف جاہ دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

" جس وقت نظام الملک آصف جاہ کا نیر اقبال دکن کے کہساروں میں طلوع ہوا تھا اس زمانے میں یہاں کے شاعر اور ادیب اسی زبان میں لکھتے تھے ۔ جو عہد قطب شاہی میں رائج تھی اور جس میں فعل، مفعول کے مطابق نہیں بلکہ فاعل کے مطابق استعمال کیا جاتا تھا اور ہندی الفاظ کی کثرت قابل فخر سمجھی جاتی تھی ۔ " (۴)

برج بھاشا کے تعلق سے یہ بھی سماعت فرمالیں:

" نواب صادق جنگ مرحوم، اعلیٰ حضرت کے مقربان خاص سے تھے ۔ ان کی اردو شاعری اور برج بھاشا کا کلام انھیں دور عثمانی میں اس طرح ممتاز رکھے گا جس طرح عبد الرحیم خان خاناں کی شخصیت، شہنشاہ اکبر کے نور تن میں تھی ۔ " (۵)

زور صاحب نے صرف آصف جاہی سلاطین "امراء اور یہاں کے شاعروں اور ادیبوں وغیرہ ہی کے حالات کو گوشہ گمنامی سے نہیں نکالا بلکہ شاعروں اور ادیبوں کا بھی ذکر کیا ہے جو آصف جاہی سلطنت کے قیام کے بعد حیدر آباد آئے ۔ ایسے شاعروں میں سب سے پہلے محمد انور یکا بیان ہے اور پھر قابل ذکر نام خواجہ بابا خاں بخاری کا ہے جو صاحب دیوان تھا ۔ زور صاحب نے لکھا ہے کہ نظام الملک اس سے مل کر خوش ہوئے کہ اپنی لڑکی (ہمشیرہ ناصر جنگ) اس کو بیاہ دی ۔ بابا خاں نے حیدر آباد ہی میں وفات پائی ۔

" داستان ادب حیدر آباد " کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ زور صاحب نے جہاں مختلف قلم کاروں کی مطبوعات کے نام لکھے ہے شمر مخطوطات کی بھی نشان دہی کی ہے ۔ میں چند ایک کے نام درج کر رہا ہوں میر یحییٰ عاشق علی خاں کا منتخب دیوان جس کا حوالہ تذ مخطوطات اردو میں موجود ہے ۔ہدایت کی تحریر کردہ ارسطو جاہ کی ہجو، اس کا بھی حوالہ تذکرہ مخطوطات اردو میں موجود ہے ۔ میر احمد علی عصر کی رباعیات کا مجموعہ، خود عصر کا تحریر کردہ (مخزونہ: ادارہ ادبیات اردو) بچو لال تمکین کی اردو نثر، تقریظ دیوان فیض (مخزونہ: از ادبیات اردو) .... یہ اور ایسے ہی مواد کے باعث " داستان ادب حیدر آباد " کی جامعیت اور وزن کی اہمیت سدا بہار رہے گی ۔ زور صا کو بھی اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ تھا انھوں نے اپنے دور کے اشرافیہ کی روایتی عاجزی اور انکساری کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے:

" کیا تعجب کہ حیدر آبادی ادب کا یہ سرسری اور حقیر سا جائزہ ہی مستقبل کے حیدر آبادی ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایسے نقوش قدم کا کام کر جائے جن سے علم و فضل اور شعر و سخن کے گزرے ہوئے کاروان کی یاد تازہ ہوتی ہے اور اہل حیدر آباد کے علاوہ دوسرے مقامات کے اہل نظر بھی معلوم کر سکیں کہ اس شہر کی تاریخ کیسے کیسے علمی و ادبی کارناموں سے معمور رہی ہے اور دکن کا یہ شہر کس طرح صدیوں تک سرچشمہ فضل و کمال اور گہوارہ علم و فن ثابت ہوا ۔ " (۶)

داستان ادب حیدر آباد " کی افادیت پر نصیر الدین ہاشمی صاحب نے یوں روشنی ڈالی ہے:

" اگر چہ داستان میں جھوٹ، سچ، صدق و کذب سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن حیدر آباد کے ادب کی داستاں حقیقت بردار اور صداقت کی آئینہ دار ہے .... شگفتہ انداز میں حیدر آباد کی ادبی تاریخ کو اجاگر کیا گیا ہے ۔ " (۷)

"داستانِ ادبِ حیدر آباد" کا اجمال و اختصار اپنی جگہ (حالاں کہ اس کے باوجود اس میں خاصی جامعیت پائی جاتی ہے) لیکن زور صاحب نے فیضِ سخن، بادہ سخن، متاعِ سخن اور کیفِ سخن و نیز مرقعِ سخن کی جلدوں میں آصف جاہی عہد کے ممتاز شاعروں کے بارے میں خاصی تفصیل سے کام لیا ہے۔ یہ اپنے عہد کے ان نمائندہ شاعروں کے کلام کا انتخاب اور اس پر تنقید و تبصرہ ہے جن سے آج بھی ان کے عہد کی ادبی تاریخ کا ایوان جگمگاتا ہے۔ سچ پوچھیے تو ان میں بیش تر شاعر وہ ہیں جن کا اہلِ دکن حق ادا کرنے سے قاصر رہے حالاں کہ ان کے صحیح مقام کے بازیافت ہوتی تو یہ شاعر اردو کے ممتاز کلاسیکی شاعروں کی صف میں بھی نمایاں ہوتے۔

"فیضِ سخن" میں زور صاحب نے میر شمس الدین محمد فیض کے حالاتِ زندگی پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری پر ایک بسیط تبصرہ کیا ہے۔ فیض ایک بے مثال فن کار تھے۔ ایک طرف اگر ان کی باطنی کرامات اہمیت رکھتی تھیں تو دوسری طرف انھوں نے روایتی شاعری سے انحراف کرتے ہوئے عصری حسیت کا ثبوت دیا ہے۔ زور صاحب فن کار کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے کن کن پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں ملاحظہ ہو:

> "فیض ایک اعلیٰ پائے کے اور ترقی پسند شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے کلام کو محض عشق عاشقی کا ترجمان ہی نہیں رکھا۔ بلکہ اپنے عہد کی سیاست اور سماجی حالات کی اصلاح کا بھی ذریعہ بنایا۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف کئی غزلوں میں اشارے کیے ہیں۔" (۸)

اور پھر فیض کے فیوضِ باطنی کے بارے میں سماعت فرمائیں:

> "شعر و سخن سے زیادہ تصنیف و تالیف کی دنیا میں مشہور تھے اور تصنیف و تالیف اور علم و فضل ان کے فیوضِ باطنی اور کشف و کرامات کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔" (۹)

فیض کی صلاحیتوں اور فن کارانہ مہارت کا حق تو یہ ہے کہ اردو دنیا کو اندازہ نہیں اور ان لوگوں نے جن کو اس طرف توجہ دینی تھی کماحقہ توجہ نہیں دی۔ زور صاحب کے پیشِ نظریہ بھی تھا کہ دکن کی ادبی، شعری اور تہذیبی قدر و قیمت کو اجاگر کیا جائے۔ انھوں نے فیض جیسے شاعروں کے بارے میں نہایت دل جمعی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ استخراجِ تاریخ کے سلسلے میں فیض کو جو ملکہ تھا اس کے باب میں لکھتے ہیں:

> "فیض نے بڑے دل چسپ اور تاریخی قطعات لکھے ہیں جو ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ استخراجِ تاریخ میں فیض کو خداداد ملکہ حاصل تھا۔ دکن کے کسی اور شاعر نے اتنی تاریخیں نہیں نکالیں۔ صرف شمس الامرا اور ان کے متعلقہ کاموں کے لیے انھوں نے پانچ ہزار تاریخیں استخراج کی تھیں۔" (۱۰)

"رمزِ سخن" سدا نند جوگی بہاری لال رمز کی حیات اور شاعری کے بارے میں زور صاحب کی تحقیق و جستجو کا ثمرہ ہے۔ رمز کا اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی دیوان ہے۔ زور صاحب نے مختلف زاویوں سے رمز کی شاعرانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ رمز کے سوانح زیادہ موثق اور مستند ہے کہ زور صاحب نے رمز کی خود نوشت سے استفادہ کیا ہے۔ یوں اس کتاب کی ادبی ہی نہیں تاریخی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔

زور صاحب تحقیق کے جدید اور اعلیٰ اصولوں سے باخبر تھے اپنے قیامِ یورپ کے دوران ان کی ایسی صلاحیتوں کو فروغ پانے کا موقع ملا وہ اس ہنر سے واقف تھے کہ تحقیق کے لیے کن ذرائع کا استعمال کرنا چاہیئے کونسے واسطے قابلِ اعتماد ہوتے ہیں، اولین ماخذات کیا ہیں۔ ان تک رسائی کیسے حاصل کی جائے اور پھر ان سے استفادہ......... ان مساعی کا اندازہ ان کی کئی تحریروں سے ہوگا۔ "مرقعِ سخن" کی جلد اول میں لکھتے

ہیں:

"شاعروں کے حالات اور کلام کی فراہمی میں ہر ممکنہ ذرائع (ذریعہ) سے استفادہ کیا گیا ہے۔" (۱۱)

"بادہ ء سخن" میں مائل کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں لکھتے ہوئے انھوں نے صراحت کی:

"آخر میں مائل کے فرزند رشید مولوی جمال احمد صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنے مایہ ء فخر والد کے کلام (مطبوعہ اور قلمی) اور حالاتِ زندگی کی فراہمی میں کشادہ دلی سے میری مدد فرمائی۔" (۱۲)

حفیظ الدین پاس کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے مختلف گل دستوں اور مذکروں سے پاس کی جو غزلیں مل سکیں ان ہی سے اس کیا گیا ہے اور کسی کا شکریہ ادا کیا گیا ہے کہ غزلوں کی فراہمی میں مدد دی، تو کسی اور کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولوی معین الدین صاحب رہبر فاروقی کا بھی شکریہ ضروری ہے کہ انھوں نے پاس کے کسی قریبی رشتہ دار سے ان کی مرض الموت وغیرہ کے متعلق معلومات فراہم کیں۔" (۱۳)

یہی تحقیقی روش تھی کہ زور صاحب کی تحریریں آج بھی آبرو مند ہیں اور آئندہ بھی اردو تحقیق کی آبرو رہیں گی۔

"کیف سخن" سید رضی الدین حسن کیفی کی حیات، انتخابِ کلام اور جائزہ ء کلام پر مشتمل ہے۔ کیفی اردو کے صفِ اول کے شاعروں میں جگہ پانے کا استحقاق رکھتے ہیں لیکن ان کی طرف ایسی توجہ نہیں دی گئی۔ زور صاحب نے "کیف سخن" سے اس حق کو ادا کی سعی کرتے ہوئے کیفی کے حالاتِ زندگی تفصیل سے پیش کیے ہیں۔ ان کی پیدائش، بچپن، تعلیم سے بے نیازی، ملازمت، ان کی بذلہ گوئی اور ان کی صحافتی اور معاشرتی سرگرمیوں کا بھی جائزہ ہے۔ زور صاحب نے کیفی کے بارے میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ:

"انھوں نے ۱۰۰ سو سے زیادہ طویل اور معرکہ کی نظمیں مختلف قومی اور ترقی پسند موضوعوں پر لکھی ہیں جن کے مطالعے سے جامعہ عثمانیہ کے قیام کے وقت اور اس سے قبل کے حیدر آباد کی علمی اور سماجی تحریکات سے آگاہی ہوتی ہے۔" (۱۴)

ڈاکٹر احمد حسین مائل بھی اپنے دور کے نامور شعرا میں رہے۔ زور صاحب نے "بادہ ء سخن" میں مائل کی حیات پیش کرتے ہوئے ... کی شاعری ہی کا جائزہ نہیں لیا، ان کے دور کی شاعرانہ چشمکوں پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔ یہ کچھ ایسے معروضی زاویہ سے ہے کہ تحقیق و تنقید کی مثال سامنے آتی ہے۔ زور صاحب کے بہ موجب "مائل کے قریب قریب پندرہ ہزار اشعار کا پتہ چلا ہے۔" اور "فیض کے بعد مائل قادر الکلام اور اعلیٰ پائے کا شاعر حیدر آباد میں کوئی پیدا نہیں ہوا۔" مائل کی انفرادیت کو زور صاحب ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

"مائل کو اپنے ہم عصروں پر یہ فضیلت ہے کہ انھوں نے دبستانِ لکھنو کی بھی پیروی کی ہے اور دبستانِ دہلی سے بھی علاحدہ نہیں رہے۔ زبان کی ترقی کے خیال میں مختلف فصیح الفاظ اور متروکات کا خیال بھی بالائے طاق تھا۔ ان کی فراخ حوصلگی قابلِ ستائش ہے۔ اس آزادی کو گمراہی کا مترادف سمجھنا (جیسا کہ سمجھا گیا ہے) صحیح ہو یا نہ ہو مگر وہ لکیر کے فقیر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں یکسانیت مفقود ہے۔ باوجود ان باتوں کے وہ پر گو اور کہنہ مشق نظر آتے ہیں۔ زبان میں لوچ، بیان میں شوخی ہے۔ خیالات میں صداقت، تخیل میں رفعت ہے۔" (۱۵)

"متاعِ سخن" کو بھی زور صاحب کی اس عہد کی تحقیقات میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ نواب عزیز یار جنگ کی حیات، شخصیت اور شاعری پر تبصرہ و تنقید ہی نہیں ان کے عہد کی معاشرت اور ادبی صورت حال بھی روشن ہو جاتی ہے۔ زور صاحب کا تحقیقی شعور ہی نکھرا ہوا نہیں تھا ان کا تنقیدی ذوق بھی بغایت شستہ تھا۔ ان کی تنقید کو سائنٹفک تنقید

سے قریب رکھا جاسکتا ہے اور پھر ان کا اسلوب کہ کسی تکلف کے بغیر وہ اپنے مافی الضمیر کو پیش کر دیتے ہیں ۔ نواب عزیز یار جنگ کے بارے میں یہ اقتباس:

"عزیز کوئی پیشہ ور شاعر نہیں ہیں بلکہ فطری مناسبت اور بزرگوں کے فیضانِ صحبت کی وجہ سے بچپن ہی سے شعر و سخن کا جو ذوق پیدا ہو گیا تھا اسی کے اقتضا سے شعر گوئی پر مجبور رہے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیتیں شگفتگی ، شوخی اور بانکپن ہے ۔ ان کی طبیعت کی خودداری استغنا اور رندمزاجی ان کے کلام میں جگہ جگہ اپنی جھلکیں دکھاتی ہے ۔" (۱۶)

زور صاحب نے "مرقعِ سخن" (جلد دوم) میں حفیظ الدین پاس کے بارے میں لکھا ہے چوں کہ پاس کا قابلِ لحاظ کلام ان کو دستیاب نہیں ہو سکا اس لیے انھوں نے ایسی شرح و بسط کے ساتھ اور مجموعی طور پر ان کی شاعری پر بحث نہیں کی ، تاہم پاس کی شخصیت اور شاعری کے پس منظر ، ان کے خاندانی حالات وغیرہ پر خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے ۔

آصف جاہی عہد کے تعلق سے زور صاحب کا ایک اور اہم بالشان تحقیقی کارنامہ "عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی" ہے ۔ یہ کتاب تاریخی اور تحقیقی ، دونوں زاویوں سے اہمیت رکھتی ہے اس کتاب (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) میں اس سے ربع صدی قبل سے حیدرآباد دکن میں اردو زبان و ادب کی نشو و نما کا اجمالاً لیکن جامع جائزہ ہے ۔ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی اردو نوازی کے خصوص میں اردو شاعروں اور انشا پردازوں کی قدردانی ، حیدرآباد ہی نہیں ہندوستان بھر کے اردو اداروں اور انجمنوں کی حوصلہ افزائی اور اردو رسائل اور اخبارات کی امداد ، صحافت کی ترقی ، جامعہ عثمانیہ کی تشکیل ، دار التالیف اور دار الترجمہ کے قیام اور فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کی کاوشوں کو دل نشین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے سلطان العلوم کے دورِ حکومت کے بارے میں زور صاحب نے لکھا ہے:

"حضرت سلطان العلوم کا دورِ حکومت اردو کی ترقی کے لحاظ سے گذشتہ تمام عہدوں سے ممتاز ہے اور یہ امتیاز نہ صرف دکن کے عہد ہائے ماضی تک محدود ہے بلکہ تمام ہندوستان میں کہیں اور کسی وقت بھی اردو زبان اور ادب کی سرپرستی اس اعلیٰ پیمانہ پر نہیں ہوئی ۔" (۱۷)

زور صاحب کو جہاں جہاں اس امر کا احساس رہا ہے کہ کماحقہ مواد دستیاب نہ ہونے کے سبب انھوں نے متعلقہ موضوع سے ایسا انصاف نہیں کیا جس کا وہ متقاضی تھا لیکن ان کے پیشِ نظر یہ نکتہ بھی رہا کہ جس قدر بھی مواد دستیاب ہو چکا ہو اس کو منظرِ عام پر لے آنا چاہیے کہ کہیں وہ زمانہ کے دستبرد کا نشانہ نہ بن جائے ، ضائع نہ ہو جائے ۔ اگر وہ اس مواد کو (جو اور جتنا ہے) پیش کر دیں تو ممکن ہے آنے والے اس سلسلے میں مزید کھوج کریں ۔ انھوں نے "عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی" اور "داستانِ ادبِ حیدرآباد" کے علاوہ "مرقعِ سخن" کے "دیباچہ" میں بھی اس موقف کا اظہار کیا ہے لکھتے ہیں:

"بہت ممکن ہے ان ہی شاعروں سے متعلق مزید تحقیق و تفتیش کے ذریعے اور زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں اور ان کے کلام کے ایسے مجموعے بھی مل سکیں جو اس وقت دستیاب نہ ہو سکے ۔ یہ بعد میں کام کرنے والے اور دکن کی اردو شاعری سے ذوق رکھنے والوں کا کام ہے کہ وہ ان ابتدائی تعارفی مساعی کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوں اور ان میں سے ہر شاعر پر ایک جداگانہ کتاب مرتب کریں ۔" (۱۸)

بعد کے حالات و واقعات اور ادبی رفتار نے ثابت کر دیا ہے کہ [illegible] نے جہاں جہاں خشتِ اول رکھی تھی ان میں سے کئی

ایک پر آنے والوں نے شان دار محارات کھڑی کر دی ہیں۔ ان شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں مزید معلومات فراہم ہوئی ہیں، ان کے بارے دریافت ہوئے ہیں، مخطوطات کی تدوین عمل میں آئی ہے اور کئی مطبوعات منظر عام پر آئی ہیں کہ اردو شعروادب کی تاریخ میں گہرائی اور کیا گیرائی، نیا منظر نامہ، نیا بسیط افق نگاہوں کے سامنے ہے......... اور اصحاب نے بھی دکنی شعروادب سے دلچسپی لی اور اصحاب بھی آصف جاہی عہد کے ادب کی دریافت میں گراں قدر کردار ادا کیا ہے لیکن زور صاحب کے کارنامے، کیفیت اور کمیت، دونوں اعتبار ممتاز کہے جاسکتے ہیں کہ عہد آصف جاہی کی تاریخ جس طرح کسی ایک حکمران کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، زور صاحب کی خدمات کے تذکرے کے بغیر بھی یہ تاریخ ادھوری اور ناتمام رہے گی۔

o ooo o

o ۱ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "داستان ادب حیدرآباد"
o ۲ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "داستان ادب حیدرآباد" (ص ۱۲)
o ۳ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "داستان ادب حیدرآباد" (ص ۱۵)
o ۴ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "داستان ادب حیدرآباد" (ص ۶۳)
o ۵ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" حیدرآباد ۱۹۳۴ء (ص ۲۷)
o ۶ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "داستان ادب حیدرآباد" (ص ۱۵)
o ۷ نصیر الدین ہاشمی (تبصرہ) یادگار زور مرتبہ مجلس ادارت ماہ نامہ "سب رس" حیدرآباد ۱۹۶۳ء (ص ۱۶۷)
o ۸ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "داستان ادب حیدرآباد" (ص ۱۳۸)
o ۹ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "داستان ادب حیدرآباد" (ص ۱۳۹)
o ۱۰ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "داستان ادب حیدرآباد" (ص ۱۳۷)
o ۱۱ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "مرقع سخن" (جلد اول) ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۳۵ء (ص ۱۳)
o ۱۲ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "بادہ سخن" حیدرآباد ۱۹۳۵ء (ص ۳۲)
o ۱۳ " مرقع سخن" جلد دوم (۱۳۷)
o ۱۴ " کیف سخن"
o ۱۵ " متاع سخن"
o ۱۶ " مرقع سخن" جلد اول (ص ۲۷۵)
o ۱۷ ڈاکٹر زور "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۳۴ء (ص ۱۲)
o ۱۸ " مرقع سخن" جلد اول (ص ۱۳)

oo ooo oo

پروفیسر حبیب ضیا

بلند پایہ محقق اور ماہرِ زبان... ڈاکٹر زور

ڈاکٹر زور بہ یک وقت شاعر بھی تھے اور افسانہ نگار بھی۔ بلند پایہ محقق بھی تھے اور نامور نقاد بھی۔ لسانیات پر انھوں نے جن عالمانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی موضوع پر قدرت اور علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تحریر کردہ کتاب "ہندوستانی لسانیات" اس موضوع پر ایک اہم کتاب ہے اس کتاب میں انھوں نے پہلی مرتبہ لسانیات کے بہت سے اہم گوشوں پر قلم اٹھایا ہے اور زبان کے لیے اصول قواعد مرتب کیے ہیں۔ ڈاکٹر زور سے پہلے اس اہم موضوع پر اردو میں بہت کم مواد دستیاب ہوتا ہے اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اردو کا نام بطور خاص لیا جاسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ "پنجاب میں اردو" کے سوائے اس وقت تک لسانیات میں کوئی اہم تحقیقی کارنامہ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔ اس لحاظ سے لسانیات پر ڈاکٹر زور کی تحریر کردہ کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ڈاکٹر زور نے موضوعات کے اعتبار سے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے حصہ اول میں جن موضوعات پر انھوں نے بحث کی ہے وہ یہ ہیں:

لسانیات، زبان، فطری ارتقا، ارادی تشکیل، دنیا کی زبانیں، ہند آریائی ارتقا، جدید ہند آریائی زبانیں، ہندی کی غیر آریائی زبانیں۔

حصہ دوم میں صرف پانچ عنوانات پر ڈاکٹر زور نے قلم اٹھایا ہے لیکن یہ تمام مضامین دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ مضامین کے عنوانات ہیں۔

ہندوستانی کا آغاز ہندوستانی کا ارتقاء، ادبی بولیاں، ہندوستانی کی ہمہ گیری، عہد حاضر۔ اس کتاب کے تمام موضوعات اپنی جگہ انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور بیشتر ایسے ہیں جن پر ڈاکٹر زور نے پہلی مرتبہ بحث کی ہے ان مضامین کے مطالعے سے ڈاکٹر زور کی عالمانہ صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان اور اس کی لسانی خصوصیات پر ان کی نظر کتنی گہری ہے۔ یوں تو تمام مضامین موضوع کے اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں لیکن "ادبی بولیاں" کے زیرِ عنوان انھوں نے دکنی، گجراتی اور شمالی ہندوستانی کا جو لسانی تجزیہ کیا ہے اور مختلف حروف اور الفاظ کی مثالیں دے کر جو فرق بتایا ہے۔ وہ لسانیات کے ماہرین اور اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والوں کو دعوت فکر دیتا ہے۔

ڈاکٹر زور کا کہنا ہے کہ ہندوستانی کی متعدد علاقوں کی جداجدا بولیوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ کسی زبان کی مختلف شاخیں اسی وقت اہم سمجھی جاتی ہیں جب وہ تحریر کے لیے مستعمل ہوجائیں۔ اس معیار کے لحاظ سے ہندوستانی کی صرف تین شاخیں قابل ذکر ہیں۔ گجراتی دکنی اور دوآبہ کی اردو۔ گجرات میں اردو کی ترقی کے اسباب بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ گجرات کی ہندوستانی ایک حد تک راجستھانی اور ان السنہ سے متاثر ہوئی تھی۔ اس کے ثبوت کے لیے انھوں نے دکنی اور گجراتی کے اختلاف کی مختلف مثالیں دی ہیں۔ ڈاکٹر زور کا یہ قابلِ قدر کارنامہ دنیائے اردو کے لیے ناقابل فراموش ہے۔

دکنی اور گجراتی زبان کے اختلافات واضح کرنے کے لیے انھوں نے مختلف حروف کی مثالیں دی ہیں۔ اور خوب محمد چشتی کی خوب ترنگ کو بنیاد بناکر حروف اور الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔

کا، کی، کے حروف اضافت ہیں جو ایک لفظ کا تعلق دوسرے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں۔ دکنی میں ان کے لیے کیرا، کیری، کیرے بھی مستعمل ہیں۔ ڈاکٹر زور نے بتایا ہے کہ گجراتی میں یہ حروف مستعمل نہیں۔ خوب ترنگ سے انھوں نے جو مثالیں پیش کی ہیں ان میں چند ملاحظہ ہوں: کا، کی، کے محذوف ہوتا ہے جیسے۔

جس کا دماغ کے لیے تس کا دماغ اس کی تفصیل کے لیے اس تفصیل دل کے پچھے کے لیے دل پچھل

ڈاکٹر زور نے دکنی اور گجراتی زبان کے فرق کو واضح کرنے کے لیے بہت سی مثالیں دی ہیں اور کافی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ گجراتی میں چند حروف ایسے استعمال ہوتے ہیں جو دکنی میں نہیں جیسے مانہ، مانھی وغیرہ۔ لسانیات کے سلسلے میں انھوں نے ایک اور اہم پہلو کی طرف پہلی بار اشارہ کیا ہے۔ ان کی تحقیق کا یہ لسانیاتی پہلو بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے مختلف حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ گجراتی میں سوں، تھیں، تے کے علاوہ ایک شکل "سوئے" بھی مستعمل تھی۔ یہ حروف دکنی میں کسی کے پاس نہیں ملتے۔ اسی طرح انھوں نے دکنی اور گجراتی الفاظ کے املا اور تلفظ پر بھی عالمانہ رائیں دی ہیں۔ صوتی اختلافات کے علاوہ انھوں نے بہت سے صرفی اور نحوی اختلافات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ فعل کی تذکیر و تانیث اور اسماء کے جمع بنانے کے قاعدوں سے بھی انھوں نے بحث کی ہے۔

ڈاکٹر زور نے جہاں بے شمار کتابیں مختلف موضوعات پر لکھیں۔ انھوں نے اردو زبان کی ترویج کے لیے بھی نمایاں کام انجام دیے۔ بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے خود کو اردو اور اس کی بقا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہ کر ایسے طلبہ کو تحقیقی کام میں شریک کرتے ہیں جس کی ان میں صلاحیت موجود ہے۔

دیانت دارانہ نقد و بحث بھی ڈاکٹر زور کی ایک خوبی مانی جاسکتی ہے۔ مقدمے کو وہ مقدمہ ہی رکھتے ہیں قصیدہ نہیں بناتے۔ ادب کو پرکھنے اور جانچنے کا وہ فطری سلیقہ رکھتے تھے اس لیے محاسن کے ساتھ معائب کی نشان دہی بھی اس خوبی سے کرتے کہ مصنف کی دل شکنی ہونے کے بجائے اس کے حوصلے بلند ہو جاتے اور وہ اپنی تحریر میں موجود خامیوں کا خود اعتراف کر لیتا۔ ڈاکٹر زور کی تحریر کردہ تمام کتابیں اس بات کی غماز ہیں کہ جس موضوع پر انھوں نے قلم اٹھایا اس کے ساتھ پورا انصاف کیا۔ کسی موضوع میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ روحِ تنقید اردو کی پہلی تنقیدی کتاب ہے جو یورپی طرزِ تنقید سے اہلِ اردو کو روشناس کرانے کا سبب بنی۔

دکنی زبان و ادب پر ڈاکٹر زور کامل عبور رکھتے تھے۔ ادب اور تاریخ کے خشک مضامین پر جب انھوں نے قلم اٹھایا تو وہ ان کی زبان اور طرزِ تحریر سے دل چسپ ہوگئے۔

میں آخر میں، یہ کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ ڈاکٹر زور میرے استاد نہیں تھے۔ لیکن میں نے ۱۹۶۰ء میں دکنی زبان کی قواعد انھیں کی تحریک پر لکھی۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل اس کے نگران کار تھے۔ ڈاکٹر زور نے اس موضوع کا انتخاب نہ کیا ہوتا تو دکنی اور دکنی زبان کی قواعد پر تھوڑی بہت جو بھی میری معلومات ہیں وہ صفر کے برابر ہوتیں۔ وقتاً فوقتاً وہ قیمتی مشورے بھی دیا کرتے۔ اور کتاب کی تکمیل تک تحقیقی کام کی رفتار پر نظر رکھتے۔ دکنی قواعد کے لیے مجھے ماہانہ دو سو روپے منظور کیے گئے تھے۔ اس زمانے میں دو سو روپیے کی خاصی اہمیت تھی اور خصوصاً ایسے گھرانے میں جہاں بہ یک وقت کئی بچے حصول علم میں منہمک ہوں اس رقم کی اور بھی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو چیک پر دستخط کر دیتے۔ دکنی قواعد کا مسودہ مکمل ہوتے ہی انھوں نے حاشیے میں لکھ دیا "یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہندی میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن افسوس کہ چند پیچیدگیوں کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ بہ ہرحال دکنی کی اس کتاب کی اشاعت میں ڈاکٹر زور ہی کی کاوشیں شامل ہیں۔ ان کی شفقت اور حوصلہ افزائی کو میں فراموش نہیں کر سکتی۔

(باقی ص ۴۳، پر)

پروفیسر اشرف رفیع

ہندوستانی صوتیات ایک مطالعہ

ڈاکٹر زور کی ہمہ جہت شخصیت کا ہر پہلو بڑا تابناک رہا ہے۔ وہ نہ صرف دکن کے لیے منارہ، نور تھے بلکہ دنیائے لسان و ادب کے
اج بھی ان کے کارنامے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کی طرف زمانے نے زیادہ توجہ صرف کی۔ نقادوں نے ان کو بہ
ت محقق، ماہر دکنیات، مورخ و مرتب جانچا پرکھا اور ان کے کام کی تحسین و تنقید بھی کرتے رہے۔ تاہم ان کی ادبی اور علمی شخصیت کا وہ
جس میں وہ بہ یک وقت محقق، نقاد، ماہرِ دکنیات، مورخ اور مرتب بن کر سامنے آتے ہیں اور اس خاص میدان میں اپنی اولیت منواتے
رہ ہے ان کی لسانی خدمات کا پہلو جس کی طرف بہت ہی کم توجہ ہوئی ہے۔ ہماری کم توجہی سے ان کے مقام و مرتبہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑ
بلکہ ہماری سائنٹفک بصیرت اور علمی آگاہی پر ضرور حرف آسکتا ہے۔

ڈاکٹر زور کے جس علمی کارنامے کا یہاں تعارف پیش کیا جارہا ہے وہ ان کی زندگی کے تیسرے دہے کا کارنامہ ہے۔ یعنی اس صدی
تیسرے دہے میں ان کی علمی شخصیت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ چوتھے دہے کے وسط میں ان کا ذہن اور ان کی زندگی کا نصب العین
ہونے لگتا ہے۔ ۱۹۲۵ء (جب کہ انھوں نے جامعہ، عثمانیہ سے بی۔ اے۔ کیا تھا) سے ۱۹۳۵ء تک، ان کی زندگی کا یہ دور مصروف ترین
نتائج خیز لمحات کا حامل رہا ہے۔ اس دہے میں انھوں نے ایم۔ اے (اگست ۱۹۲۷ء) کیا اور ریاست حیدرآباد کے تعلیمی وظیفے پر لندن میں
تعلیم و تحقیق کی تکمیل کی۔ وہاں سے واپسی پر (۱۴ فروری ۱۹۳۱ء) شعبہ، اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈر مقرر ہوئے اور اس کے بعد
یسر۔ اس عرصے میں ایک اندازے کے مطابق کم و بیش دس کتابیں اور پچاس سے زیادہ مضامین لکھے۔ (ادارہ، ادبیات اردو ڈاکٹر زور کا
ت نامہ تیار کرے تو ان کی کتابوں اور مضامین کی تعداد کا صحیح تعین ہو سکتا ہے۔) ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۱ء کے آغاز تک وہ یورپ میں رہے اور
چار سالہ قیام کے دوران انھوں نے لسانیات میں دو اہم تصانیف پیش کیں۔ ۱۹۲۷ء میں "اردو کے آغاز و ارتقا" پر لندن یونیورسٹی میں
باقی تحقیق میں مصروف رہے۔ اس وقت تک ہماری زبان کے لسانی پہلوؤں پر علمی اور تحقیقی کام بہت کم ہوا تھا۔ اور جو کچھ ہوا تھا وہ
ری زبانوں کے متعلق اور دیگر زبانوں میں تھا۔ ڈاکٹر زور کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اردو والے اردو زبان کے آغاز اور اس کے
ی ارتقا کے بارے میں اس وقت تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے اور نہ اپنی زبان کے سائنٹفک مطالعے کی طرف توجہ کی۔ جو چند تحریریں
وقت تک ملتی تھیں ان میں اردو کے آغاز اور اس کی لسانی خصوصیات کے متعلق منتشر، سطحی اور غیر مدلل و جذباتی باتیں تھیں۔ جنھیں
ر عالمانہ تحقیقات کی رو سے زیادہ وقیع نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ اس کمی کو دور کرنے اور اردو زبان کے مطالعے کو سائنٹفک بنانے کے لیے
ر زور نے قیام یورپ کے زمانے میں لسانیات کے جدید اصول اور اطلاقی لسانیات سے واقفیت پیدا کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی۔
مقصد کے لیے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن میں پروفیسر آر۔ یل۔ ٹرنر اور ماہرِ اردو زبان و ادب ڈاکٹر گراہم بیلی کی مدد اور مشوروں
بعد "اردو کے آغاز و ارتقا" پر مقالہ لکھا۔ مقالے کی تکمیل کے بعد پیرس گئے۔ وہاں کے قومی مدرسہ، السنہ، مشرقیہ (National
School of Oriental Studi میں ڈاکٹر جیولس بلوک (رکنِ ادارہ، تحقیقات عالیہ پیرس یونیورسٹی) کے لکچرز سے

استفادہ کیا۔ ساتھ ہی اردو کی گجراتی شکل پر ڈی۔ لٹ کے لیے کام کرنا شروع کیا (جو نامکمل رہ گیا) مشہور ماہر لسانیات پروفیسر واندر کیس اور فارسی، عربی اور سنسکرت زبان کے ماہر پروفیسر بن وے نست (رکن ادارہ تحقیقات عالیہ پیرس یونیورسٹی) پروفیسر مسی یون پروفیسر عربی (قومی مدرسہ السنہ مشرقیہ) پروفیسر سلون لیوی (پروفیسر سنسکرت، کالج دے فرانس) کے لکچرز اور مشوروں سے اردو کے علاوہ فارسی عربی اور سنسکرت زبان کے لسانی عناصر کے تجزیے سے متعلق علمی بصیرت حاصل کی۔ ان ہی قابل اساتذہ کی رہنمائی میں اپنی تالیف Hindustani Phonetics کا خاکہ تیار کیا۔ اردو کے صوتی تجزیے و تشریح میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے صدر شعبہ صوتیات پروفیسر Loyed James سے لسانیات کے اصول و ضوابط اور انگریزی صوتیات کی تعلیم حاصل کی۔ پیرس میں سوربون یونیورسٹی کے ادارہ صوتیات میں مدموزیل دیران سے تجرباتی صوتیات کے لیے آلات اور مشینوں پر اردو زبان کو قلم بند کرنے میں رہبری حاصل کی (تمہید۔ ہندوستانی لسانیات) جس کے عکس "ہندوستانی صوتیات شامل کیے ہیں اکتوبر ۱۹۳۰ء میں Impremerie L Union Type-graphique پیرس میں چھپوا کر شائع کیا۔

ستمبر ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر زور نے لسانیات پر اپنی دوسری کتاب "ہندوستانی لسانیات" شائع کی۔ "ہندوستانی صوتیات" کے پیش لفظ اور "ہندوستانی لسانیات" کی تمہید میں زور صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان دونوں تصانیف میں انہوں نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے منظورہ لندن یونیورسٹی کا بیش تر مواد شامل کیا ہے۔ Hindustan Phonetics کے تعارفی حصے میں اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں اپنے نظریے کی وضاحت کی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان میں پروفیسر شیرانی بھی تقریباً اسی زمانہ میں اردو کے آغاز کے بارے میں انہی خطوط پر سوچ رہے تھے جن خطوط پر غور و فکر کرکے ڈاکٹر زور اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو کے آغاز کا سرچشمہ پنجابی ہے۔ ۱۹۲۸ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں لفظی اور صوتی تغیرات کے لحاظ سے اردو اور جدید پنجابی میں گہرا اشتراک ثابت کیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے پروفیسر شیرانی سے ایک قدم آگے بڑھ کر نواح دہلی اور دوآبہ گنگا جمنا میں بولی جانے والی زبان کا اثر بھی اردو پر ثابت کیا۔ ہندوستانی صوتیات کے پہلے باب میں (ص ص ۱۹۲۰ء) وہ کہتے ہیں:

"اردو کی بنیاد بارھویں صدی عیسوی میں پنجاب میں بولی جانے والی زبان پر ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اردو نواح دہلی اور دوآبہ گنگا جمنا میں بولی جانے والی زبان پر مبنی نہیں ہے۔ کیوں کہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔"

آگے چل کر وہ اس قطعی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کا مشترک سرچشمہ تھی"

ڈاکٹر زور اور پروفیسر شیرانی نے یہ کام اس وقت کیا جب اردو کی اصل عام طور پر برج بھاشا سمجھی جارہی تھی۔ ان دونوں نے بہ یک وقت تقابلی لسانیات کی مدد سے اردو کی ابتدا کے بارے میں پنجابی زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ ڈاکٹر زور نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے نواح دہلی کی زبان یعنی کھڑی بولی کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی جدید دور کے ماہرین لسانیات نے اس سلسلے میں گہری چھان بین کرکے اردو کی ابتدا کے متعلق جو نظریات قائم کیے ہیں وہ ڈاکٹر زور کے نظریے سے ہی روشنی لے کر کسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ استاذ محترم پروفیسر مسعود حسین خاں کو بھی غالباً ڈاکٹر زور کے بیان ہی سے اپنا نظریہ قائم کرنے میں تحریک ملی ہوگی۔

ڈاکٹر زور کے بعد تقابلی اور تاریخی لسانیات میں ہم نے بہت کچھ ترقی کرلی صوتیات میں پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر گوپی چند
ں، پروفیسر گیان چند جین نے اپنے اپنے طور پر کام کیا ہے بسوط انداز میں۔ تاہم Hindustani Phonetics سے بہتر کتاب
ک پیش نہیں کی جاسکی۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں آج بھی اس کتاب سے حوالہ جوئی کا کام لیا جاتا ہے۔ سنیتی کمار چٹرجی جیسے ماہر لسانیات
بھی اس سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں ہندوستانی زبان کے تاریخی ارتقا اور مابعد تغیرات کا ایک مختصر خاکہ
ں کیا گیا ہے۔ ہندوستانی کے دو خاص روپ شمالی اور جنوبی (دکنی) اور ان کے اہم لسانی انحرافات اور اختلافات پر مختصر گفتگو کی گئی ہے
، خصوصیت سے حیدرآباد کے تعلیم یافتہ لوگوں کی روزمرہ زبان کا جائزہ لیا ہے۔ صوتیاتی نقطہ نظر سے شمالی اور جنوبی ہند کی اردو کے
وتوں، Vowels جڑواں مصوتوں (Diphthongs) مصمتوں Consonants ہکار مصمتوں (Aspirated
Aspirated Voiced retroflex vibrant ہکار مصبتی معکوسی ارتعاشی مصمتوں یعنی consonant
consonant غیر ہکار مصمتوں Inaspirated Consonants ذخیرہ الفاظ، قواعد زبان اور مرکب الفاظ سے مثالیں پیش
، خصوصاً دکنی زبان کی تشکیل اور صوتیاتی ہیئت کے بارے میں گراں قدر معلومات فراہم کی ہیں۔

دوسرے باب میں حیدرآباد کی مروجہ دکنی زبان (جسے تعلیم یافتہ افراد بھی بولتے ہیں) کے نظام اصوات Sound system پر
ث کی ہے۔ اس باب کو مطالعے کی سہولت کے لیے صوتیاتی بنیادوں پر دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ پہلے حصے میں مصوتوں اور جڑواں
توں Vowels and Diphthongs کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ اردو زبان میں کم از کم نو (۹) بنیادی
تے اور چھ (۶) جڑواں مصوتے ہیں۔ اردو میں ان پندرہ اصوات کی کوئی تحریری شکل متعین نہ ہونے کی وجہ سے ہندیوں کے لیے اردو
ظ کا صحیح تلفظ مشکل ہو جاتا ہے اسی لیے زور صاحب نے ایک تفصیلی چارٹ میں ہر مصوتے کے لیے ایک خاص علامت مقرر کی ہے۔ اسی
ٹ میں انہوں نے I.P.A (انٹرنیشنل فونٹک اسوسی ایشن) کی علامات املا اور مروج و مستعمل رومن حروف کو بھی ساتھ ساتھ پیش کیا
۔ پہلی مرتبہ اس چارٹ کے حوالے سے زور صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ رومن حروف و علائم، اردو اور مشرقی زبانوں کے تلفظ کاری
پوری طرح ادا نہیں کر پاتیں کیوں کہ رومن علامتوں میں ایک سے زیادہ اصوات کے اظہار کے لیے ایک ہی حرف استعمال کیا جاتا ہے
ب کہ I.P.A کے چارٹ میں ہر صوت آزادانہ طور پر ایک علاحدہ حرف کے ذریعے ظاہر کی جاتی ہے۔ بنیادی مصوتوں کے مقامات تلفظ کو
ر زور نے ایک الگ چارٹ پر پیش کیا ہے۔ ایسی کوشش سب سے پہلے جون رلس نے ۱۹۵۳ء میں کی تھی جو اپنے ابہام کی وجہ سے مقبول
سکی اس کے بعد مشہور انگریزی ماہر صوتیات ڈینیل جونز نے زبان کی اٹھان کے چار درجے فرض کرکے مصوتوں کی ادائگی کے وقت
ن کی حرکت کے درجات مقرر کیے ہیں۔ زور صاحب نے اس چارٹ کو بنیاد بنا کر ہندوستانی اردو کے حیدرآبادی لب ولہجہ میں مصوتوں کی
گی کے وقت زبان کی پوزیشن کا اظہار کیا ہے۔ پھر ان پندرہ مصوتوں کے علاحدہ علاحدہ، زبان کی پوزیشنوں کے اعتبار سے، مزید وضاحت
لیے Palatograms (تالوی نقشے) اور صوتی نگارش کے ریکارڈس پیرس میں تیار کرکے شامل کیے۔ اس باب کے حصہ (ب)
یت Nasalization کے سلسلے میں دلچسپ اصول بنا کر انھیں مثالوں کے ذریعے سمجھایا ہے۔ خاص طور پر یہاں دکنی تلفظ کے
میں ان کی ژرف نگاہی اور گہرے مشاہدے کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس مطالعے میں مفرد اور مرکب الفاظ دونوں سے استفادہ کیا ہے۔

تیسرے باب میں مصمتوں Consonants اور ادغام Assimilation کا تجزیہ کیا ہے۔ مصوتے اور مصمتے میں خاص

امتیاز یہ ہے کہ مصوتے کی ادائیگی بے روک ٹوک ہوتی ہے۔ جب کہ مصمتے میں کہیں نہ کہیں رکاوٹ آتی ہے۔ مصوتے تنہا ادا ہو سکتے ہیں اور مصمتے، مصوتے کے ساتھ ہی ادا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اردو کے صوتی نظام میں مختلف زبانوں کے اشتراک، اس کے اسباب اور حدود و تعداد کا تعین کیا ہے۔ اردو مصمتوں کا لسانیاتی سطح پر بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے اور دکن میں ان کے تلفّظی اختلافات پر روشنی ڈالی ہے۔ مصمتوں کی تلفظ کی وضاحت کے لیے کائموگراف، پالٹیوگراف اور مشینی نگارشات (Inscriptions) دیے ہیں۔ ہندوستانی اور خصوصاً دکنی کے صوتی نظام کا تجزیہ غالباً پہلی مرتبہ ڈاکٹر زور ہی نے لسانیاتی لیباریٹری میں کیا ہے۔ ایک ایک آواز کو بڑی احتیاط سے ریکارڈ کیا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین ڈاکٹر زور کی اس کوشش کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس کی نظیر تا حال اردو اور ہندی کی کسی کتاب میں نہیں ملی گو "دھوتی و گان" میں انگریزی آوازوں کا اسی طرح تجزیہ کیا گیا ہے۔ ہندی آوازوں کا نہیں۔ (لسانی مطالعہ ص ۲۹۶)

Assimilation کے سلسلے میں بولی جانے والی زبان اور اردو کے املا (رسم خط) میں قابل لحاظ اختلافات کی نشان دہی کی ہے اور اس کا سبب ڈاکٹر زور نے انضمام اور ادغام قرار دیا ہے جو عموماً رجعی (Regressive) ہوتا ہے۔ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک قسم وہ ہے جو صوتی تاروں کے عمل کو متاثر کرتی ہے دوسری نرم تالو اور تیسری زبان کے عمل کو متاثر کرتی ہے۔ انضمام اور ادغام کی وضاحت کے لیے مرکب الفاظ کی ان آوازوں کی تفصیل دی ہے جو متعاقب اصوات کے اثر سے بدل جاتی ہیں۔ مثلاً "چپ بیٹھو" میں "پ" کی آواز "ب" کے ساتھ مدغم ہو کر "چب بیٹھو" ہو جاتی ہے۔ (اسی طرح بدتر = بتر، بادشاہ = باشا، پادشاہ = پاشا ہو گیا ہے) بندشی مصمتی مصمتے ہکار اور غیر ہکار دونوں بعض وقت غیر ہکار غیر مصمتی ہو جاتے ہیں جیسے تفسیر تصبیر، اب تک، اپ تک میں بدل جاتا ہے۔

چھٹے باب میں اصوات کے اوصاف مثلاً بل (Stress) اور سر لہر (Intonation) سے بحث کی گئی ہے۔ اردو الفاظ میں بل اور سر لہر کے اظہار پر ڈاکٹر زور نے سب سے پہلے غور کر کے اس کی نشان دہی Hindustani Phonetics میں کی ہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے 1954 میں اپنے انگریزی رسالے PP. 21-26 (A Phonetic and phonological study of words in URDU) میں سر لہر اور بل سے بحث کی ہے۔ ان کے بعد پروفیسر جین کا خیال ہے کہ ساگر یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کے رمیش چندر مہروترا نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ لفظوں کے تلفظ میں مختلف صوت رکنوں پر بل یعنی Stress کی کمی بیشی ہوتی ہے اور ہر لفظ کی ادائیگی میں سر لہر Intonation موجود ہوتی ہے۔

سر لہر صوتی تاروں میں ارتعاش کی کمی بیشی سے ظہور میں آتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر رمیش چندر مہروترا نے بل کی کوئی خاص تقسیم نہیں کی ہے ڈاکٹر زور نے بل کی کچھ قسمیں بھی بیان کی ہیں۔ انہوں نے دو رکنی الفاظ کے صوتی اظہار کے سلسلے میں اس بات کا ادعا کیا ہے کہ لفظ کے دونوں ارکان پر یکساں بل دیا جاتا ہے بیک وقت ممکن ہے ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور پروفیسر گیان چند جین دونوں نے اس سے اختلاف کیا ہے جیسے، جب، اس، جس اور آ، جا کی ادائیگی میں بیک وقت دونوں ارکان پر stress کرنا ناممکن ہے۔ دو اور تین رکنی الفاظ میں بل (stress) سے متعلق اصولوں کو زور صاحب اور پروفیسر مسعود حسین خاں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ زور صاحب نے بتیس ۳۲ / اصول دریافت کیے ہیں پروفیسر گیان چند نے ان ۳۲ / اصولوں پر اعتراض کرتے ہوئے (لسانی مطالعے ص ص ۱۱۴، ۱۱۳) ان اصولوں کا تین زمروں میں احاطہ کر لیا ہے۔ پروفیسر جین چوں کہ ماہر عروض بھی ہیں اس لیے انہوں نے عروض سے مدد لیتے ہوئے اس مسئلے کا آسان حل ڈھونڈھ نکالا ہے۔ لیکن جس زمانے میں زور صاحب یہ Hindustani Phonetics، لکھ رہے تھے۔ کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی تھی اور اس وقت تک بھی تحقیق معتبر تھی آج یہ لسانیات کا ایک اہم موضوع بن گیا ہے اور اس کے کئی مباحث اور مسائل

سامنے آرہے ہیں ۔ چناں چہ اب stress بل اور Intonation سر لہر کا مطالعہ سماجی لسانیات کا اطلاقی شعبہ بھی ہو سکتا ہے جس میں مختلف سماجی رتبے Social Status سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لب و لہجہ میں مختلف موڈس modes کے دوران الفاظ کے بل اور سر لہر کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اس مطالعے سے انسانی نفسیات کے کئی گوشے کھل کر سامنے آسکتے ہیں ۔ اس مطالعے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل انھیں صوتی آلات پر جانچنا پرکھنا بھی ضروری ہے تاکہ قطعی نتائج پیش کیے جاسکیں ۔

۱۱۶ صفحات کی Hindustani Phonetics میں کئی غلطیاں بھی در آئی ہیں جس میں بڑا دخل Composing کا معلوم ہوتا ہے ۔ کمپوزر کے لیے مشکل یہ تھی کہ اسے ایک غیر زبان کو رومن حروف پر Dicritical Marks یعنی (نشانات نگارش) بھی لگانے تھے ۔ اکثر غلطیاں Dicritical Marks کی کمی بیشی سے ہو گئی ہیں ۔ مثلاً صفحہ ۴۹ پر اردو مصوتوں اور جڑواں مصوتوں کا مفصل چارٹ دیا گیا ہے ۔ جس میں I.P.A اور رومن علامتوں کے مقابل اردو علامتیں زور صاحب نے پہلی مرتبہ متعین کی ہیں (جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) تاکہ غیر اردو داں کو صحیح تلفظ کرتے ہوئے تکلف نہ ہو ۔ اس چارٹ کے سلسلہ نمبر ۴ پر بھینس کی I.P.A علامت پر انفی علامت جو اردو ہند سے (۸) کی طرح ہوتی ہے لکھی جانی چاہیے تھی وہ درج نہیں ہے جس سے بھینس کا انفی تلفظ ادا نہیں ہوتا اور بھینس بھیس ہو جاتی ہے ۔ صفحہ ۴۱ پر شمال اور دکن میں جمع بنانے کا قاعدہ پیش کیا گیا ہے وہاں دکن اور شمالی ہند کی اردو سے مثالیں دی گئی ہیں ۔ point B کے تحت مثال نمبر ۲ میں ہکار آوازوں کی ادائیگی کا فرق واضح کرنے کے لیے دو لفظ لکھے ہیں " وہ دھوتیں " وہ کی ہکار آواز دکنی میں بھی لگادی گئی ہے حالاں کہ ہم آج بھی وہ نہیں ود کہتے ہیں اسی صفحے پر شمالی اور جنوبی ہند کی زبان کا حوالہ دیتے ہوئے اسما کی مثال دی ہے جس میں آدمی اور ادمی ہونا چاہیے تھا مگر دونوں جگہ آدمی ہی لکھ دیا ہے عام طور پر کتابت Typograpy میں یہ غلطیاں معمولی اور بہت معمولی ہو سکتی ہیں لیکن ایک فنی اور سائنٹفک موضوع پر لکھی کتاب میں کمپوزنگ کی ایسی غلطیاں بھی بری طرح کھٹکتی ہیں ۔

ڈاکٹر زور کی اس کتاب اور ہندوستانی لسانیات پر اب تک چند ایک مضامین اور تبصرے ہی لکھے گئے تقریباً سبھی مضمون نگاروں نے جن میں پروفیسر گیان چند کا نام سرِفہرست آتا ہے ڈاکٹر زور کے ان کارناموں کو خوب سراہا اور تعریف کی ہے ۔ کئی ماہرین السنہ و لسانیات نے ان کتابوں سے استفادے کا اعتراف بھی کیا ہے ان میں پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی ، پروفیسر مسعود حسین خاں ، ڈاکٹر شوکت سبزواری ، پنڈت دتاتریہ کیفی ، رمیش چندر مہروترا ، پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے نام لینا کافی ہوگا ان سب سے بڑھ کر ڈاکٹر زور کے استاد پروفیسر جیولس بلوک نے Hindustani Phonetics پر تعارت لکھتے ہوئے نہایت شفقت سے ڈاکٹر زور کی اس میدان میں اولیت کا تذکرہ کیا ہے وہ ان کی لیاقت ، ریاضت ، علمی شغف اور نکتہ رسی پر مہرِ تحسین ہے ۔ جیولس بلوک کے الفاظ ملاحظہ ہوں (ترجمہ)

" ہندوستان کی زبانوں میں ہندوستانی ، جو دنیا تمام میں مطالعے کا خصوصی محور رہی ہے اس کا ایسا توضیحی مطالعہ خصوصاً تلفظی اعتبار سے اب تک نہیں کیا گیا ۔ اکثر و بیشتر تلفظ کی جانب بڑے عالمانہ اشارے ملتے ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اس موضوع پر کام نہیں کیا گیا ۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جس کی philologists اور علمابِ لسانیات کو عملی مقاصد کے لیے یکساں ضرورت ہے یہ بات قابلِ تحسین ہے کہ اس خصوص میں ایک ہندوستانی مسلم اسکالر (ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری) نے سب سے پہلے قدم اٹھایا ۔ (Hindustani Phonetics P-5)

ڈاکٹر زور پہلے شخص ہیں جنہوں نے ایک طرف صوتی اور لسانی اصولوں کے مطابق اردو زبان کے مطالعے کی بنیاد ڈالی اور اس زبان کی تاریخ لکھی ۔ Hindustani Phonetics ان کی دلی آرزوؤں کی نمائندگی کرتی ہے جو اردو زبان اور خصوصیت سے ارضِ دکن کے ساتھ وابستہ ہیں ۔

ڈاکٹر محمد علی اثر

ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرہ مخطوطات

ڈاکٹر زور جامعہ عثمانیہ کے ان نام ور اور قابلِ فخر فرزندوں میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے اپنی بے پناہ تحقیقی و تدریسی اور تنظ... صلاحیتوں کے ذریعے کم و بیش چار دہوں تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ وہ اپنی ذات میں ایک فرد یا انجمن ہی نہیں بلکہ ایک ادار... کی حیثیت رکھتے تھے۔ تاریخِ ادبِ اردو میں ان کی ہمہ جہت، متنوع اور رنگارنگ شخصیت ایک مینارہ، نور کی طرح ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔ وہ بیک وقت اردو کے ایک صاحبِ نظر نقاد، بلند پایہ محقق، ماہرِ دکنیات، ماہرِ لسانیات ہونے کے علاوہ ایک مورخ، مدون، مدیر، شاعر ا... افسانہ نگار بھی تھے۔ مختلف موضوعات پر انھوں نے چار درجن سے زائد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی اولوالعزمی صرف صفحہ، قرطاس تک محدود نہیں تھی، وہ ایک باعمل اور فعال شخصیت کے مالک بھی تھے۔ انھوں نے ایک طرف ایک پروفیسر، ایک پرنسپل اور ایک صد... شعبہ کی حیثیت سے سینکڑوں تشنگانِ علم کی پیاس بجھائی تو دوسری طرف ساہتیہ اکیڈمی، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی، رسالہ "آج کل" اور نہ جا... کتنے ہی علمی، ادبی اور تحقیقی اداروں کے مشیر اور سرگرم کارکن کی حیثیت سے اردو کی بقا اور فروغ کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں

اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ڈاکٹر زور نے یوں تو متعدد کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں لیکن ادارہ ادبیات... اردو کی تاسیس اور فروغ ان کی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر زور کے علمی و ادبی فتوحات اور ان کی کامیابی و کامرانی میں ان کی تنظیم... صلاحیتوں کا بڑا دخل ہے۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں سے سرفراز کیا تھا۔ اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے انھوں... نہ صرف اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا بلکہ اپنے اطراف خلوص اور ذمے داری کے ساتھ کام کرنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بھی بنالیا تھا۔ بقول... سید حرمت الاکرام:

> "انھوں نے (ڈاکٹر زور) نے اپنی منصبی معروفیات کے متوازی، مضامین اور کتابیں لکھنے، دکنی ادب پر تحقیق کرنے، مخطوطات حاصل کرنے، انھیں مرتب کرنے، دوسروں سے مضامین اور کتابیں لکھوانے، ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالنے اور "سب رس" کو فروغ دے کر، ایک ادبی اور علمی جریدے کے سانچے میں ڈھالنے، نیز پے در پے مشکلات کا مقابلہ کرکے "ایوانِ اردو" کا سنگِ بنیاد رکھنے اور اس کی تعمیر کو پایہ، تکمیل تک پہنچانے کے جو کارنامے انجام دیے ان کے پیشِ نظر یہ تسلیم کرنا اور کہنا پڑتا ہے کہ زور نے اردو کے لیے صرف شاعرانہ الفاظ میں نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اپنا لہو دیا" (۱)

ڈاکٹر زور دکنی اور دکنیات کے سب سے بڑے عاشق اور پرستار تھے۔ انھیں دکنی ادب سے ہی نہیں بلکہ دکن کی ہر چیز سے بے پنا... محبت اور عقیدت تھی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ سرزمینِ دکن سے تعلق رکھنے والے باکمال شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات کے علاوہ دکن کی... ہر چیز کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرلیا جائے چناں چہ اس مطمحِ نظر کے حصول کے لیے وہ تاحیات کوشاں رہے۔ اس سلسلے میں ان کے ... مضامین اور مقالے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، جن میں انھوں نے متعدد معروف اور غیر معروف اہلِ قلم کی نگارشات کو دنیائے ادب...

متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ ان مضامین میں زور صاحب کی محققانہ ژرف نگاہی، عالمانہ بصیرت اور ناقدانہ نکتہ سنجی اپنے بام عروج پر نظر آتی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو ادارے کے ذخیرہ نوادرات کو انھوں نے قدیم بادشاہوں کے فرامین، یادداشتوں، پروانوں، دستاویزوں، احکام، اسناد، سکوں کتبوں اور مہروں، تصویروں، وصلیوں اور خطاطی کے نمونوں سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ قلمی کتابوں کے حصول کے سلسلے میں انھوں نے راستے کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے، دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور اس کے صلے میں سینکڑوں بیش بہا اور ان مول مخطوطات جمع کیے۔ ڈاکٹر زور نے نہ صرف دکنی اردو کے قدیم ادبی مراکز گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، اورنگ آباد، وغیرہ سے شخصی طور پر کتابیں حاصل کیں بلکہ ریاست حیدرآباد کے باہر بھی اپنے آدمی بھیج بھیج کر مذہبی خانقاہوں، درگاہوں، درس گاہوں، عبادت گاہوں، اور اہل علم گھرانوں سے بے شمار قلمی نوادرات اکٹھا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

جہاں تک ڈاکٹر زور کے مرتبہ قلمی کتابوں کی توضیحی فہرستوں کا تعلق ہے، یہ ان کا ایک عدیم المثال تحقیقی کارنامہ ہے۔ تلاش و تحقیق کی دشوار گزار منزلیں طے کرتے ہوئے محقق کو کیسی جاں فشانی اور عرق ریزی سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اسے وہی لوگ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جنھیں اس ہفت خواں کے طے کرنے کا موقع ملا ہو۔ سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرکے سیپیاں، مرجان اور موتی نکال لانا بے شک ایک بہت بڑا کام ہے لیکن ان موتیوں کو جانچنا، پرکھنا اور پھر ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنا اس سے بھی بڑا کام ہے۔ ڈاکٹر زور نے ایک صاحب بصیرت پارکھ اور مخطوطہ شناس کی حیثیت سے قدیم اردو ادب کے نادر و نایاب مخطوطات کو اہل علم کے سامنے پیش کرکے تاریخ ادب اردو میں ڈھائی تین صدیوں کا اضافہ کیا ہے۔

ادارہ ادبیات اردو کا کتب خانہ عربی، فارسی، اردو اور خصوصاً دکنی کے ذخیرہ مخطوطات کے اعتبار سے دنیا کے چند اہم اور قابل فخر کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ اس کتب خانے میں محفوظ ایک ہزار چار سو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرستیں چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ایک ہزار ایک سو پچاس مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں پانچ جلدوں میں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان شائع کیں۔ پانچویں جلد کی اشاعت کے چوبیس سال بعد ۱۹۸۳ء میں محمد اکبرالدین صدیقی مرحوم اور راقم الحروف کے اشتراک سے چھٹی جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔

ڈاکٹر زور نے اپنی ذاتی سعی و کاوش اور خصوصی توجہ کے ذریعے ادارہ ادبیات اردو میں اردو، فارسی، عربی اور ہندی کے پانچ ہزار سے زیادہ مخطوطات جمع کیے۔ ان کی مہم پسند طبیعت نے انھیں صرف قلمی نوادر یکجا کرنے کی طرف ہی راغب نہیں کیا بلکہ ان مخطوطات کی توضیحی فہرست رقم کرنے کی جانب بھی اکسایا۔ وہ اس بات سے بہ خوبی واقف تھے تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے قلمی کتابیں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ زور صاحب نے ان فہرستوں کو مرتب و شائع کرکے نہ صرف اردو کے متعدد غیر معروف اور گوشہ گم نامی میں چھپے ہوئے اہل قلم کو متعارف کروایا ہے، بلکہ ادارے سے استفادہ کرنے والوں کے امکانات کو بھی وسیع تر کر دیا ہے۔ اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ کسی بھی زبان کے قلمی نسخوں کی توضیحی فہرستیں بنیادی کتب حوالہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان سے استفادہ کیے بغیر کوئی بھی تحقیقی کام نامکمل اور ادھورا رہے گا۔ ادارہ ادبیات اردو میں دکنی اردو کے مخطوطات کا قابل لحاظ ذخیرہ محفوظ ہے اور جہاں تک دکنی ادب کی چھان بین اور تلاش و تحقیق کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا دشت بے کراں ہے، جس کی سیاحی میں راستے کی صعوبتیں اور کٹھن مرحلے اور بھی زیادہ درپیش ہوتے ہیں۔ قدیم مخطوطات کے سمندر کی غواصی کرکے ان مول موتی عام پر لانا کوئی آسان کام نہیں۔ بقول ڈاکٹر زور:

> "مذکرہ مخطوطات کی ترتیب کے سلسلے میں مؤلف کو جو زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں اور جو وقت صرف ہوا ہے اس کا اندازہ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جنھیں قلمی نسخوں سے کام لینے کا تجربہ ہو۔ اگر مخطوطوں کے مصنفوں کے

نام سنہ یا زمانہ تصنیف اور زمانہ کتابت وغیرہ کی تحقیق میں بیسیوں قلمی و مطبوعہ کتب کی ورق گردانی کرنی پڑی اور بڑا وقت صرف ہوا (۲) ۔"

ڈاکٹر زور کو دکنی مخطوطات کو پرکھنے اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے علاوہ انھیں روانی سے پڑھنے کا بھی غیر معمولی ملکہ تھا یہی وجہ ہے کہ دکنی شعرا اور ادیبوں کے بارے میں ان کے بیانات استناد کا درجہ رکھتے ہیں ۔

"تذکرہ مخطوطات" کی پہلی جلد ۱۹۴۳ء میں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے پہلی بار شائع ہوئی ۔ ۴۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں دو سو پچھتر مخطوطات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے ۔ ۱۹۸۴ء میں اسی جلد کا عکسی ایڈیشن ترقی اردو بیورو دہلی کی جانب سے منظر عام پر آیا حال ہی میں راقم الحروف نے استاد محترم پروفیسر مغنی تبسم کے زیر نگرانی تذکرہ مخطوطات کی پہلی جلد کو ترمیم و اضافے کے ساتھ مرتب کیا۔ یہ کتاب اشاعت کے آخری مراحل میں ہے ۔ ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ اس جلد میں پچھتر مخطوطات ایسے ہیں جن کا کوئی اور نسخہ ادارہ ادبیات اردو کے علاوہ کسی اور کتب خانے میں نہیں ملتا (۳) پچاس قلمی کتابیں خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یا ان پر ان کے دست خط ثبت ہیں ۔ اس جلد میں متعدد ایسے قلمی نسخے بھی ہیں جو اب تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکے ۔ اس کتاب میں قدیم دکنی شعرا اور ادیبوں کے مخطوطات کے علاوہ شمالی ہند کے مصنفین کی قلمی کتابیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں (۴) ۔ ڈاکٹر زور نے نہ صرف مخطوطے کا مختصر خلاصہ پیش کیا ہے بلکہ مصنف کے واقعات حیات، کتاب کی ادبی قدر و قیمت اور اس کے ماخذوں پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے اور ممکنہ حد تک دیگر نسخوں کی نشان دہی بھی کر دی ہے ۔ یہ کام بڑی جگر کاوی اور جاں فشانی کا تھا جسے زور صاحب نے محققانہ دروں بینی اور ناقدانہ نکتہ سنجی کے ساتھ دل کش اسلوب میں پایہ تکمیل کو پہنچایا ۔ اس تذکرے میں ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء اور ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء کے درمیانی زمانے سے تعلق رکھنے والی قلمی کتابوں کی تفصیل محفوظ ہو گئی ہے ۔ کتاب میں مصنفین مخطوطات کے اسمائے گرامی اور اشاریے کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے مرتب کی ہوئی فہرست بھی شامل ہے ۔ تذکرہ مخطوطات کی جلد اول کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں شامل بعض مخطوطات "فرماں رواؤں جیسے محمد قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ، علی عادل شاہ ثانی والی بیجاپور، عبداللہ قطب شاہ والی حیدرآباد، واجد علی شاہ والی لکھنو اور نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے رشحات قلم ہیں (۵) ۔"

تذکرہ مخطوطات کی دوسری جلد، جلد اول کی اشاعت کے آٹھ سال بعد ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی ۔ "اس میں عربی کے ۴۸، فارسی کے ۰۰، اردو کے ۲۵۱ اور ہندی کے ۵ "اس طرح جملہ ۵۵۴ مخطوطات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے ۔ پہلی جلد کے مقابلے میں اس تذکرہ مخطوطات کی ترتیب کا کام ڈاکٹر زور نے بہت رواروی اور عجلت میں کیا ہے ۔ چناں چہ اس کتاب کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے:

> " ۱۹۴۳ء میں جو تذکرہ اردو مخطوطات شائع ہوا تھا ۔ اس میں مخطوطوں پر تفصیلی اور تقابلی نظر ڈالی گئی تھی ۔ اب نہ اتنا وقت تھا اور نہ اگلی سی صحت اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ کم سے کم وقت اور محنت میں زیادہ مخطوطات کا ایک اجمالی تذکرہ قلم بند ہو جائے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر تذکرہ مخطوطات کی یہ دوسری جلد مرتب کی گئی ہے ۔ اس میں ۵۰۰ سو قلمی کتابوں کی تفصیلات پیش نظر ہو گئی ہیں (۶) ۔"

ڈاکٹر زور کی دیگر مصروفیات اور عجلت پسندی کے باوجود تذکرہ مخطوطات کی دوسری جلد کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ اس میں ۱۴ مخطوطات ایسے ہیں جن کے مصنفین ہندو ہیں اس طرح ہندو کاتبوں کی تعداد ۲۳ ہے اور ۱۴ قلمی کتابیں قدیم ہندی اور سنسکرت تصانیف کے ترجموں پر مشتمل ہیں ۔ اس کتاب میں دو درجن کے قریب مخطوطات ایسے ہیں جن کی کتابت ۷۴۳ھ / ۱۳۳۶ء اور

۱۰ھ / ۱۵۵۱ء کے درمیانی زمانے میں کی گئی اور تقریباً ایک درجن قلمی کتابیں عمدہ کاغذ، بہترین نقش و نگار اور خطاطی کے اعلیٰ نمونوں کی
ت رکھتی ہیں۔ غالباً یہ تمام نسخے کسی شاہی کتب خانے کی زینت بن چکے ہیں۔

جلد اول کی طرح "تذکرہ مخطوطات" کی دوسری جلد میں بھی عطیہ دہندگان کے اسماء گرامی اور اشخاص، کتب اور مقامات کا اشاریہ
شامل ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ایچ۔ ای۔ ایچ۔ دی نظامس اردو ٹرسٹ کی اعانت سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا جو ۱۷۶ صفحات پر محیط ہے
کتاب کا تیسرا اور عکسی ایڈیشن ترقی اردو بیورو دہلی کی جانب سے ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔

تذکرہ مخطوطات کی دوسری جلد کی اشاعت کے چھ سال بعد ۱۹۵۷ء میں تیسری جلد چھپی۔ یہ کتاب ۸۹۰ صفحات اور ۲۰۰ قلمی نسخوں کی
یحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں متعدد ایسے صاحبِ دیوان شعرا کا تذکرہ اور نمونہ کلام درج ہے جن کے نام یا تخلص سے بھی اردو دنیا
شنا تھی۔ مثلاً مجدوی اورنگ آبادی، مفتوں اورنگ آبادی، واجد دہلوی، شہوار، مظفر، اشفاق، انور وغیرہ۔ بعض ایسے شعرا اور ادبا کی
شات بھی اس جلد کی زینت ہیں جن کی تصانیف سے اردو دنیا ناواقف تھی۔ اس کتاب میں بعض ایسے بیش بہا مخطوطات کا بھی تذکرہ
ل ہے، جن کے مطالعے سے حیدرآباد کی سماجی تہذیبی اور علمی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ جیسے "ماہنامہ جوہر" "تفسیرِ تنزیل (۷) وغیرہ۔
لرہ مخطوطات کی تیسری جلد میں بھی زور صاحب نے منتخب مخطوطات کی فہرست اور اشاریے کے علاوہ تینوں جلدوں کے عربی، فارسی،
ی اور اردو مخطوطات کی اجمالی فہرست شاملِ کتاب ہے۔ اس کا دوسرا عکسی ایڈیشن ترقی اردو بیورو جانب سے ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔

تذکرہ مخطوطات کی چوتھی جلد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ ۲۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۲۰۰ قلمی
کتابوں کی توضیح کی گئی ہے۔ اس جلد میں بھی تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے متعدد نئے مخطوطات اور ان کے
مصنفین کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس جلد کے مندرجات میں بھی ابتدائی تینوں جلدوں کا
اتباع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا عکسی ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں ترقی اردو بیورو کے اہتمام منظر عام پر آیا۔ تذکرہ
مخطوطات کی دیگر جلدوں کے مقابلے میں چوتھی جلد کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں اعلیٰ درجے کی
خوش نویسی کے نمونوں کی توضیحات محفوظ ہو گئی ہیں۔ اس جلد کے مخطوطات نمبر ۸۹۲ تا ۸۹۹ ایسے نادر و نایاب
اور بیش بہا نسخے ہیں جن کی خطاطی سورت کے محمد زاہد علی ولد حسن محمد نے کی ہے جو اعلیٰ پایہ کے خطاط تھے۔
ڈاکٹر زور نے اطلاع دی ہے کہ "ان کے فرزند محمد صابر کو آصف جاہ اول نے داروغہ جواہر خانہ اور بعد کو
"صابر خاں" خطاب دے کر کرناٹک کا صوبہ دار بھی بنایا تھا (۸)۔"

خطاطوں کا تذکرہ چل نکلا ہے تو یہاں اس بات کا انکشاف بھی خالی از دل چسپی نہ ہوگا کہ ادارے میں مشہورِ زمانہ خطاط محمد مومن،
ر اعظم بہادر شاہی، محمد کاظم گیلانی اخلاص رقم، محمد تقی ولد محمد مومن اعظم شاہی کی خوش نویسی کا ایک البم بھی محفوظ ہے جسے امیر رستم
اں نے ۱۱۱۵ میں تیار کروایا تھا۔ اس قلمی بیاض میں خطاطی کے مختلف نمونے متعدد اعلیٰ پایہ کے خطاطوں اور خوش نویسوں سے لکھوائے
ہیں۔ بقول ڈاکٹر زور

"اس کا ہر صفحہ وصلی کے طور پر نیلی اور سرخ جدولوں کے درمیان طلائی کام سے مزین کیا گیا ہے (۹)۔"

اسی طرح اس جلد میں متعدد قلمی بیاضوں اور مخطوطوں کی توضیح کے درمیان ڈاکٹر زور نے جگہ جگہ شمالی اور جنوبی ہند کے اعلیٰ پائے
، خطاطوں اور خوش نویسوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں ان کا یہ بیان ادارہ ادبیاتِ اردو سے وابستہ اہلِ علم و دانش کو آج بھی

دعوت فکر دیتا ہے کہ:

"اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دکن کے خوش نویسوں کے جتنے شاہ کار، ادارے میں محفوظ ہیں اتنے کسی اور ایک ہی کتب خانے میں { خواہ وہ سالار جنگ میوزیم ہو یا کتب خانہ آصفیہ، اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری، یار کارڈ آفس ہو (آرکائیوز) } موجود نہیں ہیں (۱۰)۔"

چوتھی جلد کے منظر عام پر آنے کے ایک سال بعد ہی ڈاکٹر زور نے ۱۹۵۹ء میں تذکرہ مخطوطات کی پانچویں اور ان کی مرتبہ آخری جلد شائع کی۔ ۳۴۶ صفحات پر پھیلی ہوئی اس ضخیم جلد میں ۲۵۰ قلمی کتابوں کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اس وضاحتی فہرست میں ڈاکٹر زور نے قلمی کتابوں کی خصوصیات کا اگرچہ کہ مفصل جائزہ لیا ہے تاہم مصنفین کے واقعات حیات کے سلسلے میں صرف ماخذوں کی نشان دہی کی ہے چناں چہ وہ لکھتے ہیں۔

"پانچویں جلد میں بھی مخطوطوں کی خصوصیات پر زیادہ زور دیا گیا ہے، مصنفوں اور شاعروں کے حالات کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔ صرف حوالوں اور ماخذوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے تاکہ تحقیق کرنے والے اصحاب کتابوں تک پہنچ جائیں (۱۱)۔"

دیگر فہارس مخطوطات کی طرح اس تذکرہ مخطوطات میں بھی ڈاکٹر زور نے پانچوں جلدوں کی قلمی کتابوں کی اجمالی فہرست کے پہلو بہ پہلو مصنفین مخطوطات کے اسمائے گرامی، پیش نظر تذکرہ مخطوطات کی موضوع کے اعتبار سے مرتب کی ہوئی فہرست اور کتابوں، شخصیتوں اور مقامات کا بہ لحاظ حروف تہجی اشاریہ بھی شامل کیا ہے۔ اس جلد کو مرتب کرنے کے بعد ڈاکٹر زور نے یہ اطلاع دی تھی کہ:

اس میں ۲۵۰ مخطوطات سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس کی اشاعت کے بعد ادارے کے جملہ ۱۱۵۰ مخطوطات کے بارے میں تفصیلات (۵ جلدوں میں) منظر عام پر آ رہی ہیں۔ ابھی تقریباً چار ہزار مخطوطات ایسے ہیں۔ جن کی ایسی ہی توضیحی فہرست مرتب اور شائع کرنی ہے اس تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے (۱۲)۔"

مخطوطات کی توضیحی فہرستیں معلومات کا خزانہ ہوتی ہیں بقول جمیل الدین عالی:

"مخطوطات اپنی جگہ ایک تاریخ اور تماشہ ہوتے ہیں جن میں مختلف ادوار کے سوچنے اور لکھنے والوں کے ذہنی سفر اور زبان کے بدلتے ہوئے مناظر دکھائی دیتے ہیں (۱۳)۔"

ڈاکٹر زور سے پہلے بعض مستشرقین نے اور بعد کو پروفیسر سروری، حکیم شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی اور دیگر اہل علم نے بھی اردو مخطوطات کی فہارس مرتب و شائع کی تھیں۔ لیکن ان فہرستوں میں سے مخطوطے کے مندرجات اور اس کی ظاہری ہیئت پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے اور متعدد توضیح طلب امور تشنہ رہ گئے ہیں۔ مگر ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرہ مخطوطات میں مخطوطے کی ظاہری حالت جیسے تقطیع، اوراق نمبر خط، مسطر، سنہ تصنیف، سنہ کتابت، کاتب کا نام، کاغذ، روشنائی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر متن میں ایک سے زیادہ رنگوں کی روشنائیاں ہوں تو ان کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اگر کسی کسی مخطوطے کی مرمت اور درستگی کے دوران قلمی نسخے کے چاروں طرف کاغذ کی باریک پٹی چسپاں کی گئی ہو تو اس عمل کی "حوضہ بندی" کی اصطلاح کے ذریعے صراحت کی ہے۔ اگر کوئی ورق درمیان سے یا کنارے سے ٹوٹ رہا ہو، خستہ ہو کر ضائع ہونے کے قریب ہو اور ایسے مقامات کو محفوظ کرنے کے لیے کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا متعلقہ مقام پر چسپاں کر دیا جائے تو "چٹ بندی" کے اس عمل کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ مخطوطے کی جلد، جزبندی، کرم خوردگی، آب رسیدگی اور کہنگی وغیرہ کی تصریح بھی کی ہے۔ اگر

کسی وجہ سے متن متاثر ہوا ہے یا متعدد آفات برداشت کرنے کے باوجود متن محفوظ ہے تو اس کی بھی وضاحت کی ہے۔ ایسے مقامات جو کرم خوردگی، آب رسیدگی یا کسی اور وجہ سے ناقابلِ قرات ہوگئے ہوں تو نقطے لگائے ہیں۔ مخطوطے کے درمیان کہیں اگر خطاطی کے نادر نمونے یا تصویریں، اشکال یا نقشے ہوں تو ان کی تعداد اور خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں۔

مخطوطے کے موضوع اور متن کی صراحت کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے "آغاز" اور "اختتام" کی سرخی کے تحت چند ابتدائی اور اختتامی سطریں من و عن درج کردی ہیں تاکہ اس کا مختصر نمونہ سامنے آجائے۔ اگر کسی مخطوطے کی درمیانی عبارت سے کسی تاریخی واقعے پر روشنی پڑتی ہو، یا کسی تاریخی حقیقت کی نفی ہوتی ہو تو متن کے اس حصے کا حسب ضرورت اقتباس بھی درج کیا ہے۔ قلمی نسخوں کے "ابتدائیوں" "سرخیوں" اور "ترقیموں" سے ڈاکٹر زور نے بھرپور استفادہ کیا ہے اور کاتب کی "ابتدائی"، "درمیانی" یا اختتامی عبارت کو جوں کا توں نقل کیا ہے۔

اگر مخطوطے کے کسی مقام پر مصنف نے اپنے بارے میں یا کاتب نے مصنف کے بارے میں کوئی اشارہ کیا ہو یا کسی اور کے بابت معلومات بہم پہنچائی ہوں تو ایسے مقامات کی خصوصی طور پر وضاحت کی ہے۔ یہ کام نہ صرف تحقیقی دروں بینی اور وسعت مطالعہ کے ذریعے پایہ، تکمیل کو پہنچ سکتا تھا بلکہ کافی محنت طلب بھی تھا اور صبر آزما بھی۔ ڈاکٹر زور کی ژرف نگاہی اور دروں بینی کی وجہ سے ان کا شمار اردو کے صفِ اول کے مخطوطہ شناسوں میں کیا جائے گا۔

oo ooo oo

حواشی و حوالے

۱ "یادگار زور" ص ۱۲۷۔

۲ "تذکرہ، اردو مخطوطات" (جلد اول) ص ۱۳۔

۳ حالیہ عرصے میں چند ایسے مخطوطات کا بھی پتہ چلا ہے، جن کے دیگر نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں (دیکھئے تذکرہ، مخطوطات ادارہ، ادبیاتِ اردو جلد ۱) ترمیم و اضافہ محمد علی اثر)۔

۴ "تذکرہ، مخطوطات" (جلد اول) ص ۱۳۔

ایضاً ص ۱۳۔

"تذکرہ، اردو مخطوطات" (جلد دوم) ۔ترقی اردو بیورو ایڈیشن۔ص ۲۵۔

"تذکرہ، اردو مخطوطات" (جلد سوم) ص ۷۔

"تذکرہ، نوادر ایوانِ اردو" ۔ص ۱۷۔

۱۰ ایضاً

۱۲ "تذکرہ، اردو مخطوطات" (جلد پنجم) ص ۵۔

۱ مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو۔ کراچی ۔(جلد پنجم) ص ۲۔

oo ooo oo

ڈاکٹر محمد انورالدین

ڈاکٹر زور کی مرتبہ تواریخ ادب و تذکرے

اردو دنیا میں ڈاکٹر زور کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ دکنی تحقیق کے میر قافلہ اور اردو میں لسانیات کے ابوالآباء تھے۔ انھوں نے ادب کے مختلف شعبوں کو اپنے فکر و نظر کی جولان گاہ بنایا۔ تنقید، تحقیق، لسانیات، صوتیات، افسانہ نگاری، ادبی تاریخ، سوانح نگاری، مکتوب نگاری، شاعری غرض یہ کہ ادب کا کونسا پہلو تھا جسے ان کے قلم گہربار نے اپنی تراوش سے نہیں سنوارا۔ موضوعات کے تنوع اور رنگا رنگی کے اعتبار سے اردو کا شاید ہی کوئی اہل قلم ان کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

دکنی اور دکنیات سے زور صاحب کو خاص وابستگی اور شغف تھا۔ بلکہ یہ ایک طرح سے ان کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ دکنی سے قطع نظر اردو زبان و ادب کی تاریخ بھی ان کے تحقیقی مطالعہ کا خاص موضوع تھی۔ ان تمام موضوعات سے متعلق انھوں نے بے شمار مضامین و مقالات کے علاوہ کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ لیکن پیش نظر مقالے میں ان کی صرف ایسی تصانیف کا ذکر کیا جائے گا جو ادب کی تاریخ اور تذکرے کے دائرے میں آتی ہیں۔ یہ تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱) اردو شہ پارے ۲) تاریخ ادب اردو ۳) دکنی ادب کی تاریخ اور ۴) داستان ادب حیدرآباد۔

اردو شہ پارے

جس زمانے میں ڈاکٹر زور اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تکمیل نیز اردو زبان کے لسانی اور صوتیاتی مسائل پر تحقیقی کام کے سلسلے میں لندن اور پیرس میں قیام پذیر تھے اسی دوران انھیں آکسفرڈ، کیمبرج، پیرس اور اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانوں میں قدیم اردو کی نایاب قلمی کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا۔ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جن کے نسخے ہندوستان میں بھی موجود نہیں تھے۔ ڈاکٹر زور نے محسوس کیا کہ ان نادر مخطوطات کو علمی دنیا میں متعارف کرانا ضروری ہے۔ اس مطمح نظر سے انھوں نے فرصت نکال کر اس ادبی ذخیرے کے بہترین حصوں کا انتخاب جمع کرنا شروع کیا۔ انتخاب کے ساتھ ساتھ وہ ان کتابوں کے مصنفین کے حالات و کوائف بھی جمع کرتے گئے۔ چھٹیوں میں جب وہ ہندوستان آئے تو یہ سارے انتخابات ان کے ساتھ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کو یورپ ہی میں ایک انگریزی مقدمے کے ساتھ نسخی ٹائپ کے حروف میں چھپوائیں لیکن یہاں احباب کے اصرار پر انھیں اس کتاب کی طباعت اور اشاعت کے متعلق اپنے سابقہ خیال کو بدل دینا پڑا اور انھوں نے اسے اردو شہ پارے کے عنوان سے اردو مقدمے کے ساتھ حیدرآباد ہی میں چھپوانے کا ارادہ کیا۔ یورپ کے کتب خانوں سے انھوں نے جو انتخابات فراہم کیے تھے حیدرآباد آنے کے بعد ان میں چند اور اضافے بھی کیے جن میں نواب عنایت جنگ بہادر اور پروفیسر آغا حیدر حسن کے گراں قدر کتب خانوں میں محزونہ بعض نادر و نایاب مخطوطات کے انتخابات شامل ہیں۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں کے قلمی نسخوں میں انھیں عبداللہ قطب شاہ، غواصی اور ابن نشاطی کی تصاویر دستیاب ہوئیں۔ محکمہ آثار قدیمہ (سابقہ ریاست حیدرآباد کے گنجینہ نوادرات) سے انھوں نے علی عادل شاہ دوم، سید شاہ راجو، ابوالحسن تاناشاہ اور محمد قلی قطب شاہ کی تصاویر کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کی چند اردو غزلوں کے خوش خط قطعات جو انھیں کے دور میں انھیں کے لیے بطور وصلی لکھے گئے تھے کے فوٹوز حاصل کیے اور ان سب کو اس کتاب میں شامل کیا۔

اردو شہ پارے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ دکنی ادب کی تحقیق میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس قدر گراں مایہ کتاب اس سے قبل
ر اس کے بعد نہیں چھپی یہ وہ کتاب ہے جس نے دکنیات کے میدان میں مطالعے کی بنیاد فراہم کی اور محققین کے لیے نئی راہیں ہموار کیں۔
دو میں ولی اورنگ آبادی سے ماقبل ادبی تاریخ لاعلمی کے دھندلکوں میں مخفی تھی۔ ڈاکٹر زور نے اس کتاب میں قدیم شہ پاروں کی روشنی
ں ولی سے پہلے کی ادبی تاریخ کو مربوط مرتب کرنے کی کوشش کی۔ قدیم اردو کے شہ پاروں کے اس انتخابی عمل میں ادبیت کو ترجیح دی گئی
ہے اور انھیں تاریخ وار یکے بعد دیگرے مرتب کرکے اردو زبان و ادب کا ارتقاء دکھایا گیا ہے۔

اردو شہ پارے کے مشمولات اور ان کے اہم خدوخال اس طرح ہیں۔

مقدمہ: مقدمے کا آغاز تمہید کے سرنامے سے ہوتا ہے جس میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ مقدمے کی غرض و غایت اس دور کی
ل ادبی تاریخ کا احاطہ نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ جو شہ پارے متعارف کرائے جارہے ہیں ان کی تخلیق کس زمانے میں، کن ہاتھوں
ے، کس ماحول میں اور کس طریقے پر عمل میں آئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں "شاعروں اور کتابوں کے تعلق سے جو کچھ حالات لکھے
ئے ہیں وہ (سوائے چند معمولی اور غیر معروف چیزوں کو چھوڑ کر) راقم کی ذاتی تفتیش اور اصل ماخذوں کے مطالعے کا نتیجہ ہیں" مقدمہ چار
ابواب پر منقسم ہے جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

باب اول: اردو ادب کی ابتدائی کوششیں۔ جس میں شمالی ہند، گجرات اور دکن کے اولین شعرا مثلاً امیر خسرو، شاہ علی جیو گام
دھنی اور خواجہ بندہ نواز وغیرہ کا ذکر ہے۔

باب دوم: اردو ادب بیجاپور میں.. اس باب میں عادل شاہی عہد کے بیجاپوری شعرا مثلاً شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان
الدین جانم، آتشی، مقیمی، امین، صنعتی، رستمی، ملک خوشنود، نصرتی اور ہاشمی وغیرہ کا ذکر ہے۔

باب سوم: ۔ اردو ادب گولکنڈہ.. میں اس عنوان کے تحت دبستانِ گولکنڈہ کے جن شعرا کا ذکر ہے ان میں فیروز، محمود، محمد قلی، وجہی، احمد،
حسن شوقی، خیالی، عبداللہ قطب شاہ، غواصی قطبی، جنیدی اور ابن نشاطی اہم ہیں۔

باب چہارم: ۔ اردو ادب مغلوں کی حکومت.. میں اس باب کے ضمن میں افضل، شیخ جیون، جعفر زٹلی جیسے شعراءِ شمال کے علاوہ دکن اور
گجرات کے عاجز، ضعیفی، امین، ذوقی، بحری، عشرتی، ولی ویلوری اور ولی اورنگ آبادی وغیرہ کے حالات و تصانیف پر روشنی ہے۔

اس کے بعد مضامین اور مصنفین کے اعتبار سے اس انتخاب میں شامل شہ پاروں کی دو علاحدہ فہرستیں دی گئی ہیں۔ اس کے بعد
کتاب کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جو قدیم اردو شہ پاروں کے انتخاب پر محتوی ہے۔ اس میں بھی نظم اور نثر کے حصے علاحدہ علاحدہ ہیں۔

اردو شہ پارے کے آخری حصے میں مقدمے کے مشمولات سے متعلق آٹھ ضمیمے شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر زور کا خیال تھا کہ اردو شہ پارے کی طرز پر اردو کے بعد کے دور کے ادبی کارناموں سے بھی انتخابات کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں
نے اس منصوبے کا خاکہ بھی تیار کیا تھا۔ جس کے تحت یہ پورا کام تین جلدوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلی جلد ابتدا سے ولی تک۔ دوسری جلد
ولی سے حالی تک اور تیسری جلد حالی سے موجودہ زمانے تک کی اہم ادبی تصانیف کے انتخابات پر مشتمل تھی۔ زمانی تعین کے ساتھ زور
صاحب نے دوسری اور تیسری جلد کے مرتبین کا بھی انتخاب کیا تھا۔ دوسری جلد کا کام عبدالقادر سروری صاحب اور تیسری جلد کا کام سید محمد
صاحب کے تفویض کیا گیا تھا۔ لیکن زور صاحب کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا اور اردو شہ پارے کی دوسری اور تیسری جلد کی ترتیب و
اشاعت تعویق و تعطل کا شکار ہو گئی۔ اس میں کوئی دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ اردو شہ پارے کی اشاعت نے اردو زبان کی ادبی تاریخ کو
اصالت بخشنے اور اردو کی قدامت اور بزرگی قائم کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ زور صاحب نے اپنے زمانے کے دستیاب وسائل اور مواد کی روشنی

میں اردو شہ پارے کو تحقیق و استناد کے اعتبار سے جامع اور ٹھوس بنانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ لیکن انھیں اس امر کا احساس بھی تھا کہ اس قسم کے کام کبھی مکمل اور خالی از اسقام نہیں ہوتے چناں چہ وہ رقم طراز ہیں۔ "کوئی شخص بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں جو کام پیش کر رہا ہوں وہ ہر حیثیت سے مکمل ہے۔ آئے دن دکنی دور کی جو نئی نئی کتابیں برآمد ہوتی جا رہی ہیں ان کی رفتار ظاہر کرتی ہے کہ بہت جلد ہمیں اس جلد کا ایک ضمیمہ یا دوسرا حصہ شائع کرنا پڑے گا۔ بہ حالتِ موجودہ یہ کہا جا سکتا ہے اس کتاب میں ان تمام قلمی تصنیفات کے انتخاب دے دیے گئے ہیں جو اس وقت دستیاب ہو سکی ہیں یا جنھیں کچھ ادبی حیثیت حاصل ہے۔ یہی حال مقدمے کا بھی ہے جس میں ان شہ پاروں اور ان کے مصنفین پر تاریخی حیثیت سے نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ بھی اس دور کے ادب اردو کی ایک مکمل تاریخ نہیں ہو سکتی جتنی معلومات فراہم کی جا سکتی تھیں۔ ان کے پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے (مقدمہ ص ص ۶-۷)۔

اسے زور صاحب کی بصیرت کہیے یا پیش بینی کا کمال کہ ان کا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ چناں چہ مابعد دور میں دکنیات کے میدان میں جو نئی نئی تحقیقات ہوئیں، ان کی روشنی میں اردو شہ پارے کے بعض مندرجات اور بیانات تصحیح طلب قرار پائے۔

تاریخ ادب اردو

اس کتاب پر مصنف کے نام کی بجائے مرتبہ ادارہ ادبیات اردو درج ہے لیکن اہلِ علم پر یہ حقیقت الم نشرح ہے کہ یہ دراصل ڈاکٹر زور ہی کے تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے۔ چناں چہ ماہ نامہ سب رس ۱۹۶۳ء یادگار زور نمبر میں ڈاکٹر زور کے مقالہ نما کے مرتب وقار خلیل نے اس کتاب کو ڈاکٹر زور کی تصانیف میں شامل کیا ہے (ص ۳۹۰) یہ کتاب ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد کی مطبوعات کے سلسلے کی ساتویں کڑی کے طور پر پہلی مرتبہ ۱۹۴۰ء میں منظرِ عام پر آئی اور تا حال اس کی دس اشاعتیں نکل چکی ہیں۔ ڈاکٹر زور کے زمانے میں ادارہ ادبیات اردو کے ہمہ گیر اور ہمہ جہتی منصوبوں میں ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ دنیا کی اہم زبانوں کی ادبی تواریخ اردو میں شائع کی جائیں۔ اس منصوبے کے تحت مولوی میر حسن صاحب انگریزی ادب، مولوی سید ابو الفضل صاحب عربی ادب، پروفیسر عبد القادر سروری صاحب ہندی ادب اور ڈاکٹر زور کو اردو ادب کی تاریخ قلم بند کرنے کا کام تفویض کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر زور کی مرتبہ تاریخ اتنی ضخیم ہو گئی کہ اس کی طباعت کا فی الفور اہتمام نہ ہو سکا۔ لیکن ادارہ ادبیات اردو کے امتحانوں کے سلسلے میں ایک مختصر اور جامع تاریخ ادب کی شدید ضرورت تھی چناں چہ زور صاحب نے اپنی ضخیم تاریخ کے سمندر کو ایجاز و اختصار کے کوزے میں بند کر کے تاریخِ ادب اردو کی شکل میں پیش کیا۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ اردو کی ابتدا سے عہدِ ولی تک کا احاطہ کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس میں دبستانِ دکن کے تمام اہم شعرا اور ان کی تصانیف پر سرسری لیکن تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصے کے پہلے جزو میں دہلی میں اردو ادب کے آغاز و ارتقا سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں دورِ حاتم سے لے کر عہدِ مصحفی و انشا تک کا جائزہ لیتے ہوئے "اردو نثر کی ترقی" کے عنوان سے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور ان کی تخلیقات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اسی حصے کے دوسرے جز میں دکن میں اردو ادب کا احیا کے عنوان سے اٹھارویں صدی عیسوی کے دکنی شعرا اور جدید علوم و فنون کے عنوان سے نواب شمس الامراء اور ان کے دار الترجمے کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرے حصے میں دبستانِ لکھنو اور دبستانِ دہلی کی ادبی خدمات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے دبستانِ لکھنو کے شعرا میں خلیق، نسیم، آتش و ناسخ، انیس و دبیر اور شوق اہم ہیں اور دبستانِ دہلی کے شعرا میں ذوق، غالب، مومن، ظفر، شیفتہ، آزردہ اور مجروح قابلِ ذکر ہیں۔

چوتھے حصے کا عنوان "اردو ادب کا دورِ جدید" ہے۔ اس میں سرسید، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد اور ذکاء اللہ جیسے نثر نگار اور امیر، داغ، تسنیم، اکبر، شاد، چکبست اور اقبال جیسے شعرا شامل ہیں۔ اس حصے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر زور نے دکن کے بعض اہم

اور نثرنگاروں کو تاریخ ادب اردو کی پوری روایت کے پس منظر میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ دکن
م میں گردھاری پرشاد باقی، ڈاکٹر احمد حسین مائل، جلال الدین توفیق، رضی الدین حسن کیفی اور طیبہ بیگم کا ذکر شامل ہے۔
اسی باب کے دوسرے جزو میں اردو کے مختلف تحقیقی و تصنیفی اداروں مثلاً دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ، انجمن
. اور ہندوستانی اکیڈیمی، ادارہ ادبیات اردو اور اردو اکیڈیمی جامعہ ملیہ کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ اور تیسرے جزو میں اردو
کے عنوان سے اردو اخبارات و رسائل پر ایک مختصر نوٹ لکھا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے یہ کتاب ڈاکٹر زور کے
لیقی و سائنٹیفک بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ گذشتہ نصف صدی کے دوران تحقیق و تنقید نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس
میں اس کتاب کی کئی باتیں ساقط الاعتبار قرار پائی ہیں۔ لیکن اختصار و جامعیت کے پہلو سے یہ کتاب بہرحال اپنی قدر و قیمت رکھتی

ب کی تاریخ

دکنی ادب کی تواریخ میں زور صاحب کی یہ تصنیف اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۶۰ء
عام پر آئی اور تب سے آج تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ زاہد از ربع صدی کا عرصہ گزرنے کے باوجود
بیت اور افادیت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی۔ اس گراں قدر کتاب میں ڈاکٹر زور نے ارض دکن میں دکنی زبان اور شعر و ادب کے
یلہ اور سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ پوری کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں دکن کے قدیم ادبی و شعری مراکز مثلاً گلبرگہ، بیدر،
رگولکنڈے کے سخن طرازوں اور نثرنگاروں کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف پر ایجاز و اختصار کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ زمانی
یہ کتاب ۱۳۵۰ء سے ۱۷۵۰ء تک یعنی چار سو سال کی مسافت پر مشتمل ہے۔
باب اول میں عہد بہمنی کے عنوان کے تحت جن شعرا کے حالات اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے ان میں شیخ عین الدین گنج العلم،
سینی حضرت خواجہ بندہ نواز، عبداللہ حسینی، نظامی بیدری، مشتاق، لطفی، فیروز، اشرف، شاہ میراں جی شمس العشاق اور سید شہباز
ل ہیں۔ لیکن ان میں شیخ عین الدین گنج العلم سے منسوب دکنی تصانیف معروف الاسم اور معدوم الوجود ہیں اور حضرت خواجہ بندہ
نسوب معراج العاشقین ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب مرحوم کی تحقیق کے مطابق مخدوم شاہ حسینی بلکانوری کی تصنیف ثابت ہو چکی ہے۔
دوسرے باب میں عادل شاہی عہد کے عنوان سے دبستان بیجاپور کے جن سخنوروں کے حالات اور تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے ان
بان الدین جانم، عبدل بیجاپوری، مقیمی، حسن شوقی، صنعتی، رستمی، ملک خوشنود، نصرتی اور ہاشمی قابل ذکر ہیں۔
تیسرے باب میں قطب شاہی عہد، گولکنڈہ اور حیدرآباد کی سرخی کے تحت دبستان گولکنڈہ کے جن نمائندہ سخن طرازوں کے حالات
ار ناموں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے ان میں محمد قلی قطب شاہ، ملا خیالی، محمود، فیروز، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، شاہ راجو اور طبعی
ل ذکر ہیں۔
پانچواں باب ۔ مغل عہد، حیدرآباد اور اورنگ آباد کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں سترہویں صدی عیسوی کے اواخر اور
صدی عیسوی کے نصف اول کے جن دکنی شعرا اور ان کی تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں بحری، روحی، مرزا، قادر، ضعیفی،
اہ حسین ذوقی، وجدی، فراقی، ولی ویلوری، ولی اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی اہم ہیں۔

کتاب کا آخری باب "دکنی ادب کا اثر شمالی ہند کی اردو پر" ہے۔ اس میں ڈاکٹر زور نے بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ شمالی ہند میں اردو زبان میں تخلیقی ادب کی روایت کا آغاز دکنی کی شعری روایت کے زیر اثر ہوا۔

یہ کتاب اردو ادب کی علاقہ واری تواریخ میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بارے میں خود مصنف کا یہ خیال تھا کہ "گو یہ کتاب دکنی ادب کی تاریخ پر حرفِ آخر نہیں لیکن دکن کی علمی و ادبی تحریکوں اور کاوشوں کو عام اردو دانوں، طلبہ اور عوام میں متعارف کرانے کا ایک ذریعہ ہے۔"

داستانِ ادبِ حیدرآباد

ڈاکٹر زور کی مرتبہ ادبی تواریخ کے سلسلے کی ایک کڑی "داستانِ ادبِ حیدرآباد" ہے جو ۱۹۵۱ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی اس کتاب میں ۱۰۰۰ھ سے ۱۳۷۰ھ تک یعنی تقریباً پونے چار صدیوں کے دوران، شہر حیدرآباد کی علمی و ادبی تحریکات اور ان کے پس منظر نیز یہاں کی مردم خیز سرزمین سے اٹھنے والے اربابِ علم و دانش اور اصحابِ کمال کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ داستانِ ادب حیدرآباد دس ابواب پر محیط ہے۔ پہلا باب ۱۰۰۰ھ تا ۱۰۵۰ھ کے دوران دکنی کے ابتدائی سخن وروں اور ان کی تصانیف کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب عہدِ ابن خاتون اور ابنِ نشاطی ۱۰۵۰ھ تا ۱۱۰۰ھ کا احاطہ کرتا ہے۔ تیسرا باب ۱۱۰۰ھ تا ۱۱۵۰ھ کے دور انتشار سے متعلق ہے چوتھے باب میں ادب و شعر کا احیا کے عنوان سے ۱۱۵۰ھ تا ۱۲۰۰ھ کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں باب عہدِ ارسطو جاہ ۱۲۰۰ھ تا ۱۲۲۰ھ کے مشاہیرِ ادب کے اکتسابات کا تعارف کراتا ہے۔ چھٹا باب چندا اور چندو لال ۱۲۲۰ھ تا ۱۲۵۰ھ کے آصف جاہی کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ ساتواں باب شمس الامراء اور شمس الدین فیض ۱۲۵۰ھ تا ۱۲۸۰ھ اور آٹھواں باب مختار الملک اور وقار الملک ۱۲۸۰ھ تا ۱۳۲۰ھ اور نواں باب عہدِ کشن پرشاد، شاد یمین السلطنت ۱۳۲۰ھ تا ۱۳۵۰ھ کے عہد سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کے حالات و ادبی خدمات کے مطالعے پر مبنی ہے دسویں اور آخری باب کا عنوان جامعہ عثمانیہ ۱۳۵۰ھ تا ۱۳۷۰ھ ہے اس میں جامعہ سے نسبت رکھنے والے اہلِ قلم کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ "یہ کوئی مبسوط تاریخ یا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا جائزہ ہے جو زیادہ تر مؤلف کے تاثرات پر مشتمل ہے اور جس میں پہلی بار اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے نہ صرف شاعروں بلکہ ہر موضوع کے نثرنگاروں کی نسبت بھی ضروری معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔" چوں کہ اس کتاب میں ڈاکٹر زور نے حیدرآباد کے علم و فضل اور شعر و سخن کی تاریخ، تاریخ ادب کے جدید اصولوں کے مطابق باقاعدہ زمانی ادوار بندی کے ساتھ قلم بند کی ہے اس لیے راقم الحروف نے ادبی تواریخ کے ضمن میں اس کا مطالعہ کیا ہے۔

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ ڈاکٹر زور نے اردو کے قدیم اور جدید مختلف مشاہیر اور اہلِ قلم کی حیات اور سوانح پر بھی مستقل تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ جن میں سرگذشت غالب، حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، حیات میر محمد مومن، سرگذشت حاتم، حیات گارساں دتاسی وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن فنی اعتبار سے ان کا شمار تذکروں میں نہیں ہوتا۔ یہ ایک فرد کے سوانح حیات ہے۔

o ooo o

ڈاکٹر نسیم الدین فریس

ڈاکٹر زور اور تدوین متن

ڈاکٹر زور نے زبان و ادب کے مختلف شعبوں جیسے تحقیق، تنقید، تخلیق، تاریخ اور لسانیات وغیرہ میں اپنے علم و فن اور فکر و آگہی کے روشن ارتسامات چھوڑے ہیں لیکن پیش نظر مقالے میں زور صاحب کے صرف ان کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے جو تدوین متن سے تعلق رکھتے ہیں۔ راقم الحروف کو ڈاکٹر زور کی فتوحات قلم میں چھ کتابیں ایسی نظر آئیں جو تدوین متن کے دائرے میں آتی ہیں۔ ان میں تین معروف ہیں یعنی (۱) کلیات محمد قلی قطب شاہ (۲) تذکرہ گلزار ابراہیم اور (۳) مثنوی طالب و موہنی۔ باقی تین غیر معروف ہیں۔ ڈاکٹر زور پر لکھی گئی کسی کتاب میں ان کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ یہ تین کتابیں ہیں (۱) ارشاد نامہ (۲) ابراہیم نامہ اور (۳) تاج الحقائق۔ ذیل میں سلسلہ وار ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ: دکنی ادب کی تحقیق اور قدیم متون کی تدوین و تہذیب کے سلسلے میں ڈاکٹر زور کا سب سے اہم اور عہد آفریں کارنامہ سلطنت گولکنڈہ کے پانچویں فرماں روا اور شہر حیدرآباد کے بانی و موسس سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی تدوین و اشاعت ہے جس کے نتیجے میں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کی کلاہ اعزاز ولی اورنگ آبادی کے بجائے محمد قلی قطب شاہ کے سر کی زینت بنی۔ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اس کی تکرار محض تحصیل حاصل ہوگی اس لیے یہاں صرف ان پہلوؤں پر گفتگو کی جائے گی جو تدوین متن کے مسائل سے علاقہ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے یہ کلیات کتب خانہ نواب سالار جنگ کے مخزونہ کلیات محمد قلی کے دو مخطوطوں نیز اسی کتب خانہ میں محفوظ ایک قدیم نسخے کے چیدہ چیدہ اوراق اور پروفیسر آغا حیدر حسن کے کتب خانے میں موجود اس کلیات کے ایک اور نسخے کی مدد سے مرتب و مدون کیا۔ ان نسخوں کے علاوہ انھوں نے کلیات محمد قلی کے مزید چار نسخوں کی نشان دہی بھی کی ہے جو انھیں دستیاب نہ ہوسکے۔ ان میں سب سے اہم، کتب خانہ آصفیہ کا نسخہ ہے۔ یہ نسخہ مولوی عبدالحق کے زیر مطالعہ رہا اور اس کے متعلق انھوں نے رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۲۲ء میں ایک بسیط مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ بعد میں یہ نادر و نایاب نسخہ کتب خانہ آصفیہ سے خارج کر کے آصف جاہ سابع کے ذاتی کتب خانے میں داخل کیا گیا لیکن اس کے بعد یہ نسخہ ناپید ہوگیا۔ کلیات محمد قلی کے اس گم گشتہ مخطوطے کی بازیافت کے لیے نظامس ٹرسٹ کی جانب سے ایک ٹیم بھی تشکیل دی گئی تھی لیکن وہ بھی اس کی تلاش میں ناکام رہی۔ قیاس ہے کہ دکنی شاعری کا یہ گوہر نایاب پرانی حویلی کے عتائق و نوادرات کے سمندر میں تہہ نشین ہے لیکن وہاں تک کسی محقق کی رسائی ایں خیال است و محال است جنوں کے مماثل ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون میں اس مخطوطے کے متنی معارض، متنی محاسن پر تفصیلی روشنی محاسن پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

کتب خانہ آصفیہ کا مذکور الصدر مخطوطہ کلیات محمد قلی کا مکمل ترین نسخہ تھا اگر یہ ڈاکٹر زور کو دست یاب ہوتا تو ان کے کام کے لیے سونے پر سہاگہ ثابت ہوتا لیکن افسوس کہ یہ انھیں میسر نہ ہوسکا۔ اس نسخے میں محمد قلی کی وہ مشہور غزل بھی شامل ہے جس کا مطلع یہ ہے:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا پیا باج یک تل جیا جائے نا

مولوی عبدالحق نے غزل کے چار شعر نقل کیے ہیں۔ مقطع میں محمد قلی کا تخلص "قطب شہ" موجود ہے (۱)۔ ڈاکٹر زور کے پیش نظر کلیات

محمد قلی کے جو مخطوطات رہے ان میں سے کسی میں یہ غزل درج نہیں ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اسے اپنے مرتبہ کلیات میں شامل کیا ہے اس سلسلے میں قضیہ یہ ہے کہ یہ غزل اختلافِ متن و تخلص کے ساتھ کلیاتِ غواصی کے واحد قلمی نسخے مخزونہ کتب خانہ آصفیہ میں بھی موجود ہے { لیکن کلیات غواصی کے مرتب محمد بن عمر نے اسے محمد قلی کی غزل باور کر کے اپنے مرتبہ کلیات میں شامل نہیں کیا ہے } اس کے علاوہ یہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی مملوکہ ایک قدیم بیاض میں بھی غواصی کے تخلص کے ساتھ مرقوم ہے۔ ان شواہد کے پیش نظر ڈاکٹر مسعود حسین خان نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ محولہ غزل غواصی کی ہے نہ کہ محمد قلی کی۔ وہ کہتے ہیں کہ ملک الشعرا کے کلام کا بادشاہ کے کلام میں شامل ہونا قرین قیاس ہے لیکن بادشاہ کے کلام کا ملک الشعرا کے کلام میں شامل ہونا مستبعد ہے (۲)۔ بہر حال محمد قلی سے منسوب یہ غزل محققین کے مابین متنازعہ فیہ ہے۔

کتب خانہ سالار جنگ میں مخزونہ کلیات محمد قلی کے جو دو نسخے ڈاکٹر زور کے پیش نظر رہے ان میں پہلا نہایت قدیم مطلا و مصور شاہی نسخہ ہے جسے سلطان محمد قلی کی حسین حیات نسخ کیا گیا ہے اس میں اکثر جگہ اس نے اپنا تخلص معانی اور شاذ قطب یا قطب شہ استعمال کیا ہے۔ دوسرا نسخہ بھی شاہی ہے لیکن بادشاہ کی وفات کے بعد مرتب کیا گیا ہے اس نسخے میں شاعر کا تخلص بالعموم قطب شاہ درج ہے۔ شاید اسی فرق و اختلاف کی وجہ سے بعض محققین کو یہ تسامح ہوا کہ پہلا نسخہ محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہے اور دوسرا نسخہ محمد قلی قطب شاہ کا۔ چناں چہ اسی سہو کے سبب عبد الجبار خاں صوفی ملکاپوری نے "تذکرہ شعرائے دکن" میں نسخہ دوم کی اکیاون غزلوں کو محمد قطب شاہ کی تخلیق قرار دیا ہے (۳)۔ ڈاکٹر زور نے نہایت دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی سے اس التباس کو دور کیا اور بہ دلائل ثابت کیا کہ معانی اور قطب شاہ محمد قلی ہی کے تخلص ہیں۔

کلیاتِ محمد قلی میں غزلیات کے علاوہ قصائد، مراثی، مثنویات، رباعیات اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ زور صاحب نے ان نظموں کو موضوع کی مناسبت سے مختلف عنوانات دیے ہیں حالاں کہ اصل متن میں عنوانات نہیں ہیں۔ اس عنوان بندی کا ایک فائدہ تو یہ ہے اس سے نظموں کا موضوعاتی تعین ہوا ہے جس کی بدولت کسی خاص موضوع کی نظم کو تلاش کرنے میں سہولت ہو گئی ہے۔ لیکن فنِ تدوین کے اعتبار سے مرتب کو یہ اختیار نہیں ہے کہ متن میں اپنی طرف سے کسی بات کا اضافہ کرے۔ حیرت ہے کہ اس کلیات کی ترتیب ثانی میں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بھی اسی روش کی تقلید کی ہے۔

ڈاکٹر زور کا مرتبہ کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے زیر اہتمام ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ ایک ہزار اڑسٹھ صفحات پر مشتمل اس کلیات میں ڈاکٹر زور کے قلم سے تین سو پچیس صفحات پر محتوی ایک علمی و تحقیقی مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس کلیات کی ترتیب و اشاعت ڈاکٹر زور کا ایسا وقیع کارنامہ ہے جس سے اردو زبان میں تحقیق و تدوین کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

تذکرہ گلزار ابراہیم: ڈاکٹر زور نے علی ابراہیم خاں خلیل (۱۱۴۸ / ۱۷۳۵ء تا ۱۲۰۸ / ۱۷۹۳ء) کے مشہور تذکرے "تذکرہ گلزار ابراہیم" کی بھی تدوین کی۔ یہ تذکرہ علی ابراہیم نے ۱۱۹۸ / ۱۷۸۴ء میں بہ زبان فارسی قلم بند کیا تھا۔ مشہور مستشرق جان گلکرسٹ کی فرمائش پر میرزا علی لطف نے ۱۲۱۵ / ۱۸۰۱ء میں گلزار ابراہیم کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام گلشنِ ہند رکھا۔ گلشنِ ہند علامہ شبلی نعمانی کی تصحیح و تحشیہ اور بابائے اردو مولوی عبد الحق کے عالمانہ مقدمے کے ساتھ مولوی عبد اللہ خاں حیدر آبادی کے زیر اہتمام ۱۹۰۶ء میں لاہور سے شائع ہوا

گلزار ابراہیم میں ۳۱۹ شعرا کے تراجم اور کلام کا نمونہ شامل ہے جب کہ گلشنِ ہند میں لطف نے صرف اہتر شعرا کے حالات درج کیے

ہیں ۔ اس کی تلافی کے مقصد سے انجمن ترقی اردو ہند کی ایما پر ڈاکٹر زور نے تذکرہ گلزار ابراہیم کو ایک خاص نہج پر مرتب کیا ۔ انھوں نے اپنے مرتبہ نسخے میں ان تمام شعرا کو شامل کیا جو گلشن ہند میں بار نہ پاسکے تھے ۔ اس میں انھوں نے حسب موقعہ یہ بھی واضح کیا ہے کہ کن شعرا کے تراجم میں لطف نے کوئی اضافہ اور کن شعرا کے ہاں کوئی اضافہ نہیں کیا ۔ لطف نے گلشن ہند میں گلزار ابراہیم کے جن بیانات سے اختلاف کیا ہے زور صاحب نے ان کی نشان دہی بھی کی ہے ۔

ڈاکٹر زور نے گلزار ابراہیم کے آغاز میں ایک پر مغز مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں انھوں نے تذکرہ نگاری کی روایت کے پس منظر میں گلزار ابراہیم کی اہمیت اور قدر و قیمت کا تعین کیا ہے ۔ علی ابراہیم کے روایت کردہ کوائف و اخبار کی صحت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں ۔

> "علی ابراہیم اردو کے وہ واحد تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے شاعر کے حالات اور ان کے متعلق تاریخیں جمع کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں ، اور خوبی یہ ہے کہ ان کی کوششیں جس حد تک بار آور ہو سکتی تھیں اور ہوئیں اتنی کسی اور تذکرہ نویس کی نہیں ہو سکتی تھیں اور نہ ہو سکیں " (۴) ۔

ڈاکٹر زور کا مرتبہ تذکرہ گلزار ابراہیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس میں طبع ہو کر ۱۹۳۴ء میں منظر عام پر آیا ۔ اس میں گلزار ابراہیم کے متن کے ساتھ علامہ شبلی کا مرتبہ تذکرہ گلشن ہند معہ مقدمہ عبدالحق بھی بجنسہٖ شامل ہے ۔

مثنوی طالب و موہنی: دکنی ادب پاروں کی ترتیب و تہذیب کے سلسلے میں ڈاکٹر زور کا آخری کارنامہ مثنوی طالب و موہنی کی تدوین ہے ۔ یہ مثنوی سید محمد والہ موسوی (۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۰ء مزار ترچناپلی) کی تصنیف ہے ۔ اس میں انھوں نے بہار الشعرا کے تاریخی شہر پرینڈہ کے ایک ہندو مہاجن کی دختر موہنی اور ایک مسلمان نوجوان طالب کے عشق کی المیہ داستان نظم کی ہے ۔ یہ مثنوی انھوں نے ۱۱۵۰ھ کے آس پاس حیدرآباد میں تخلیق کی ۔ ڈاکٹر زور نے اسے ۱۹۵۷ء میں ادارہ ادبیات اردو کے سلسلے میں مطبوعات کے تحت شائع کیا ۔ کتاب کا آغاز ایک مختصر تمہید سے ہوتا ہے ۔ جس میں انھوں نے صراحت کی ہے کہ زیر بحث مثنوی تذکرہ مخطوطات جلد سوم کی ترتیب کے دوران ان کے مطالعے میں آئی ۔ طالب و موہنی کوئی بہت زیادہ طویل مثنوی نہیں ہے لیکن اس میں اہمیت کے دو پہلو پائے جاتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ اس کی تصنیف ایسے دور میں ہوئی جب کہ معیاری دکنی زبان زوال پذیر ہونے لگی تھی لیکن شمالی ہند کی اردو کے غلبہ و تسلط سے دکن کے شاعر اور ادیب ابھی پوری طرح متاثر نہیں ہوئے تھے ۔ اس اعتبار سے یہ اردو کے لسانی ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے ۔ اس کی اہمیت کا دوسرا پہلو جس کی طرف ڈاکٹر زور نے اور ان سے قبل مولوی نصیرالدین ہاشمی نے "مدراس میں اردو" میں اشارہ کیا تھا (۵) وہ یہ ہے کہ میر کی مشہور مثنوی "دریائے عشق" والہ کی اسی مثنوی پر مبنی ہے ہرچند کہ میر نے کہیں اس اعتراف نہیں کیا لیکن ان کو مثنوی کے بیشتر مقامات طالب و موہنی سے ماخوذ نظر آتے ہیں بالخصوص خاتمے میں تو انھوں نے گویا اس کا چربہ اتارا ہے ۔

ڈاکٹر زور نے اصل مثنوی سے قبل والہ کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا تعارف رقم کیا ہے ۔ مثنوی کا خلاصہ لکھنے سے انھوں نے یہ کہہ کر احتراز کیا کہ نصیرالدین ہاشمی نے "مدراس میں اردو" میں اس کا مکمل خلاصہ پیش کیا ہے ۔ اس کے بعد انھوں نے اس مثنوی کے مخطوطے کی خصوصیات اور متنی معارض پر روشنی ڈالی ہے ۔

ڈاکٹر زور نے یہ مثنوی صرف ایک مخطوطے کی مدد سے مرتب کی ہے جو ادارہ ادبیات اردو کا مخزونہ ہے ۔ اس میں کاتب نے کوئی ترقیمہ نہیں لکھا جس کی وجہ سے اس کے نام ، مقام کتابت اور سنہ وغیرہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ۔ اس مثنوی کا دوسرا مخطوطہ انڈیا آفس لندن

کے کتب خانے کی زینت ہے جس کا ذکر نصیر الدین ہاشمی نے "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں لکھا ہے ۔ لیکن یہ نسخہ زور صاحب کی د
رس" میں نہیں تھا ۔ اگر یہ بھی ان کے پیشِ نظر ہوتا تو دونوں کے تقابل و موازنے سے جو متن تشکیل پاتا وہ صحت اور معیارِ تدوین کے ا
سے بہ درجہ اعلیٰ ہوتا ۔

نصیر الدین ہاشمی نے "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں اس مثنوی کے طویل اقتباس درج کیے ہیں جو انڈیا آفس کے نسخے سے مَ
ہیں ۔ راقم الحروف نے جب ان اقتباسات کا ڈاکٹر زور کے مرتبہ متن کے اشعار سے تقابل کیا تو پتہ چلا کہ ان میں متعدد مقامات پر متن
قرأت کے اختلافات پائے جاتے ہیں ۔ بعض مقامات پر تو سالم مصرعے ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے ۔ مثلاً مثنوی کے درمیان وآل
"کیفیت غزلہا کہ طالب بہ ایں مضمون می گفت" کے زیر عنوان ایک غزل لکھی ہے ۔ ڈاکٹر زور کے مرتبہ متن میں اس غزل کے اشعار د
مطلعوں کے بعد مثنوی کے اشعار کی طرح مختلف القوافی ہوگئے ہیں ۔ اور ان کی جملہ تعداد دس ہے جب کہ ہاشمی صاحب نے انڈیا آفس کے
سے اس غزل کا جو متن نقل کیا ہے ۔ اس کے اشعار غزل کی ہیئت میں ہیں اور ان کی تعداد نو ہے (۶) ۔ ہاشمی صاحب نے اس مثنوی کے کل ا
کی تعداد نہیں دی لیکن زور صاحب کے مرتبہ متن میں یہ تعداد ۱۰۵۷ ہے ۔ تدوینِ متن کے فنی معیار سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر زور کا یہ کام ا
ہی مخطوطے پر مبنی ہونے کی وجہ سے تشنگی کا احساس دلاتا ہے ۔ لیکن ایک قدیم شہ پارے کے تحفظ کا خیال کیا جائے تو ان کا یہ کام بھی ا
اور افادیت کا حامل ہے ۔

ارشاد نامہ : ڈاکٹر زور نے بیجاپور کے مشہور صوفی شاعر شاہ برہان الدین جانم کی عارفانہ مثنوی "ارشاد نامہ" بھی مدون کی تھی ۔ اس
آغاز میں انھوں نے ایک بسوط اور معلوماتی مقدمہ بھی لکھا ہے لیکن افسوس کہ کسی وجہ سے یہ مقدمہ نامکمل اور ادھورا رہ گیا ۔ مقدمے
انھوں نے جانم اور ان کے والد میراں جی شمس العشاق کے سلسلہ، نسب، سنینِ ولادت و وفات، تصانیف اور دیگر کوائف کی تحقیق کی ہے
کتاب ایک سو چوراسی صفحات پر مشتمل ہے اور مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے زیر اہتمام مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد میں طبع ہوئی ہے ۔
میں عسیر الفہم الفاظ کے معنی متن کے درمیان ہی درج کیے گئے ہیں ۔ زور صاحب نے جانم کا ارشاد نامہ کس سن میں مرتب کیا ٹھیک سے
نہیں کیوں کہ کتاب میں اس کی صراحت نہیں ملتی البتہ کلیات محمد قلی میں عرضِ مرتب کے تحت انھوں نے اشارتاً ہے کہ ارشاد نامہ
رسائل شاہ برہان کی ترتیب کا کام انھوں نے ۱۹۳۷ء کے بعد اور ۱۹۴۰ء سے قبل شروع کیا تھا (۷) ۔ اسی طرح انھوں نے تذکرہ مخطو
جلد اول میں ارشاد نامے کے قلمی نسخے کی وضاحت میں لکھا ہے "ان [جانم] کے تفصیلی حالات کتاب ارشاد نامہ و دیگر رسائل شاہ برہان
چھپ چکے ہیں ۔ یہ کتاب مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے شائع ہو رہی ہے (۸)" ۔ چوں کہ تذکرہ مخطوطات جلد اول ۱۹۴۳ء
شائع ہوئی اس لیے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے ارشاد نامہ ۱۹۴۳ء کے آس پاس مرتب کر کے چھپوایا تھا ۔

ڈاکٹر زور نے ارشاد نامہ کو ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے مخزونہ نسخے کی مدد سے مرتب کیا تھا ۔ ان کا مرتبہ متن ۲۲۲۰ اشعار پر
ہے جب کہ اردو شہ پارے اور دکنی ادب کی تاریخ میں انھوں نے ارشاد نامہ کے اشعار کی تعداد ڈھائی ہزار بتائی ہے اور یہی تعداد مو
عبدالحق نے رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء میں بیان کی ہے ۔ زور صاحب کا مرتبہ متن واحد نسخے پر مبنی ہے ۔ بعد میں مولوی اکبر الدین صدیقی
کتب خانہ درگاہ امین الدین اعلیٰ (بیجاپور) کے مخزونہ تین نسخوں کی مدد سے ارشاد نامہ کی تدوین کی جو ۱۹۷۱ء میں شعبہ اردو عثمانیہ یونیور
سے "قدیم اردو" کی ایک جلد کی صورت میں شائع ہوا ۔

سکھ سہیلا : ارشاد نامہ کے ساتھ ہی ڈاکٹر زور نے سکھ سہیلا بھی مرتب کیا ۔ یہ بھی شاہ برہان الدین جانم کی ایک صوفیانہ نظم ہے جو

چار مصرعوں کے اٹھائیس بندوں پر مشتمل ہے۔ زور صاحب نے اس کا مکمل متن مرتب کیا ہے لیکن اپنے ماخذی نسخے یا نسخوں کا حوالہ نہیں دیا حیدرآباد میں سکھ سہیلا کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہیں۔ راقم الحروف نے زور صاحب کے مرتبہ متن کا اس نظم کے نسخہ آصفیہ سے تقابل کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں میں متعدد مقامات پر اختلافات نسخ موجود ہیں۔ ڈاکٹر زور نے مشکل الفاظ کے معنی متن کے درمیان میں ہی درج کیے ہیں۔ جانم کی اس نظم کو ڈاکٹر حفیظ سید (الہ آباد یونیورسٹی) نے انگریزی مقدمے اور ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے(۹)۔

ڈاکٹر زوؔر کے مرتبہ "ارشاد نامہ" میں سکھ سہیلا کے بعد "منتخبات نظم و نثر شاہ برہان" کے عنوان سے جانم کی نظموں، حجت البقا، بشارت الذکر، منفعت الایمان، وصیت الہادی، نکتہ واحد، رموز الواصلین، خیال اور دہروں کے نمونے شامل ہیں۔ عنوان کے برخلاف نثر کا کوئی نمونہ نہیں دیا گیا ہے۔ راقم الحروف کا قیاس تھا کہ نظموں کے نمونے اس بیاض سے ماخوذ ہیں جو مولوی اکبرالدین صدیقی کے بقول زور صاحب کے نجی کتب خانے میں محفوظ ہے اور یہ مولوی عبدالحق کی مملوکہ اس مشہور بیاض کا مثنیٰ ہے جس میں شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے جانشینوں کا بیش تر کلام درج ہے(۱۰)۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون "حضرت شاہ برہان الدین جانم" مشمولہ رسالہ اردو بابتہ جولائی ۱۹۲۷ء میں اسی بیاض سے جانم کا بہت سا کلام پیش کیا ہے۔ راقم الحروف نے زور صاحب کے منتخبات کا مولوی عبدالحق کے منقول اقتباسات سے تقابل کیا تو پتہ چلا کہ زور صاحب کا ماخذ یہی مضمون ہے کوئی مخطوطہ یا بیاض نہیں۔

ابراہیم نامہ: تدوینِ متن کے سلسلے میں ڈاکٹر زور کا ایک کارنامہ بیجاپور کے شاعر عبدل کی مثنوی ابراہیم نامہ کی تدوین ہے۔ اس نادر مثنوی کا ایک نسخہ راجہ اوندھ (مہاراشٹرا) کے کتب خانے میں اور دوسرا نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر زور نے موخرالذکر نسخے سے اس مثنوی کو نقل کر کے چھپوایا ہے۔ انھوں نے اس مخطوطے کی جو نقل لی تھی۔ اسے مجلد کر کے ادارہ ادبیاتِ اردو میں قلمی نسخے کے طور پر محفوظ کر دیا ہے۔ اس کے ترقیمے میں وہ رقم طراز ہیں۔ "۱۳۵۵ء میں نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے کے مخطوطے سے یہ کتابیں نقل کی گئی ہیں۔" زور صاحب نے اسی نقل کو جوں کا توں طبع کروایا ہے۔ یہ کتاب مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے مطبعِ ابراہیمیہ حیدرآباد میں طبع ہوئی لیکن اس میں تاریخِ طباعت درج نہیں۔ البتہ کلیاتِ محمد قلی کے ایک بیان سے (جس کا حوالہ قبل ازیں "ارشاد نامہ" کے ذکر میں دیا گیا ہے) اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء کے درمیان زیرِ ترتیب رہی۔ بہ حالت موجودہ ڈاکٹر زور کا مرتبہ "ابراہیم نامہ" ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مقدمہ نہیں ہے مشکل الفاظ کے معنی ان کے نیچے ہی خفی قلم سے درج ہیں۔

ابراہیم نامہ کی ادبی، لسانی اور تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر مسعود حسین خان نے نسخہ سالار جنگ اور نسخہ اوندھ کی مدد سے اس کا تنقیدی متن مرتب کیا اور اسے ایک مفید مقدمے سے آراستہ کر کے ۱۹۶۹ء میں شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کیا۔

تاج الحقائق: ڈاکٹر زور نے دکنی نثر کی مشہور کتاب تاج الحقائق بھی مرتب کی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر زور نے اسی کو پیشِ نظر رکھ کر "تاج الحقائق" کا متن تیار کیا تھا۔ تذکرہ مخطوطات جلد سوم میں وہ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے راقم الحروف نے اس [تاج الحقائق] کو اشاعت کے لیے مرتب کیا تھا اور اس کا بہت بڑا حصہ چھپ بھی چکا ہے۔ لیکن بعد کو وہ کام رک گیا اور یہ کتاب اب تک شائع نہ ہو تو ہو سکی"(۱۱)۔

تاج الحقائق کی تدوین کا کام زور صاحب مکمل نہ کر سکے اور وہ ادھورا ہی رہ گیا۔ بہ حالت موجودہ یہ اسی ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں صرف تین باب ہیں۔ تیسرا باب بھی ناقص ہے۔ اس نامکمل کتاب کا جو نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے اس میں

ڈاکٹر زور نے اپنے قلم سے کاتب کی اصلاح کی ہے۔ ایک جگہ (ص-۷۵ پر) انھوں نے لکھا ہے "بعد اصلاح پروف ثانی روانہ کریں۔" نیچے ان کے دستخط ہیں جن پر انھوں نے ۲۹-۹- کی تاریخ ڈالی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے ۱۹۲۹ء میں یہ کتاب پروف کی منزل میں تھی۔

تاج الحقائق کے مصنف کے تعلق سے محققین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعضوں نے اسے وجہی کی تصنیف قرار دیا ہے اور بعض اسے وجہی کی تصنیف نہیں مانتے۔ ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر زور کو بھی اس بحث میں سخت اضطراب تھا۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں جو ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی انھوں نے پہلے تو یہ تسلیم کیا ہے کہ "سب رس کے علاوہ وجہی کی ایک اور کتاب تاج الحقائق بھی اردو نثر میں موجود ہے۔ لیکن بعد میں یہ بھی لکھا ہے کہ "مجھے شبہ ہے کہ یہ وجہی کی تصنیف ہے بھی یا نہیں" (۱۲)۔ مصنف کے بارے میں اسی اضطراب و اشکال کے سبب غالباً انھوں نے اس کتاب کی تدوین کی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ڈاکٹر نور السعید اختر نے الحقائق کو مرتب کر کے ڈاکٹریٹ کی سند لی اور ۱۹۷۰ء میں اسے بمبئی سے شائع کیا۔

ڈاکٹر زور کے مرتبہ قدیم متون کے اس جائزہ کے آخر میں "قصص خوب ترنگ" کا ذکر بھی ضروری محسوس ہوتا ہے۔ جو میاں خوب محمد چشتی گجراتی کی صوفیانہ مثنوی "خوب ترنگ" کے انتخاب پر مبنی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے "لے کونتے دو خوب ترنگ" کے عنوان سے فرانسیسی زبان میں شائع کی۔ اس کی ترتیب میں انھوں نے انڈیا آفس لائبریری لندن میں محزونہ "خوب ترنگ" کے دو قلمی نسخوں کو پیش نظر رکھا۔ اصل کتاب سے قبل ایک مختصر مقدمہ بھی شامل ہے جس میں مصنف اور اس کی تصنیف کا سرسری تعارف قلمی نسخوں کی وضاحت اور منتخب شدہ حکایتوں کا خلاصہ درج ہے۔ یہ کتاب دراصل زور صاحب کا ایک طویل مقالہ ہے جو اولاً ایشیاٹک جرنل پیرس بابتہ ستمبر ۱۹۳۲ میں شائع ہوا پھر اسی کے آف پرنٹس کو انھوں نے کتابی شکل میں بھی شائع کیا۔ اس میں انھوں نے "خوب ترنگ" کی دس ایسی حکایتوں کا متن پیش کیا ہے جن میں حقیقت و معرفت کے اسرار و غوامض اور رموز و نکات بیان کیے گئے ہیں۔ حواشی میں زور صاحب نے اختلاف نسخ کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنی کتاب "ڈاکٹر زور" میں اس مثنوی کا نام "حب ترنگ" اور مصنف کا نام بحری لکھا ہے (۱۳)۔ لیکن اس سلسلے میں ان سے تسامح ہوا ہے۔ مثنوی کا اصل نام خوب ترنگ اور مصنف کا نام خوب محمد چشتی ہے۔

حواشی:

(۱) عبدالحق مولوی، قدیم اردو، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۱۔
(۲) مسعود حسین خاں، ڈاکٹر قدیم اردو، جلد دوم، حیدر آباد ۱۹۶۷ء ص ۲۰۳۔
(۳) عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری، تذکرہ شعرائے دکن، جلد دوم، ص ۳۲۷-۲۰۔
(۴) زور، ڈاکٹر سید محی الدین قادری، تذکرہ گلزار ابراہیم، علی گڑھ ۱۹۳۴ء، ص ۳۳۔
(۵) نصیر الدین ہاشمی، مدراس میں اردو، حیدر آباد، ۱۹۳۸ء، ص ۲۹۔
(۶) ایضاً یورپ میں دکھنی مخطوطات، حیدر آباد، ۱۹۳۲ء، ص ۴۳۰۔
(۷) زور، ڈاکٹر سید محی الدین قادری، کلیات سلطان محمد قلی، حیدر آباد ۱۹۴۰ء، ص ۷۔
(۸) ایضاً تذکرہ مخطوطات جلد اول حیدر آباد ۱۹۴۳ء، ص ص ۱۹-۲۰۔
(۹) اکبر الدین صدیقی، ارشاد نامہ، حیدر آباد ۱۹۷۱ء مقدمہ، ص ۴۰۔
(۱۰) ایضاً ایضاً ، ص ۴۲۔

ڈاکٹر داؤد اشرف

ادارہ ادبیات اردو

ریاست حیدرآباد کی مالی امداد

ریاست حیدرآباد کے آخری دو حکمرانوں نواب میر محبوب علی خان آصف سادس اور نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کے بارے میں عام طور پہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ان کے در سخاوت بیرونی اور غیر ملکی شخصیتوں اور بیرون ریاست کے اداروں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ اور نہایت فراخ دلی کے ساتھ نوازش و کرم کی بارش ہوا کرتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی حیات اور کارناموں پر نظر ڈالیں اور خاص کر ادارہ ادبیات اردو کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس فیاضی کا مظاہرہ استحقاق کی بنیاد پر کیا جاتا تھا نہ کہ امتیاز کی بنیاد پر۔ اندرون ریاست کام کرنے والی ملکی شخصیتوں اور اداروں نے اس مدد و تعاون سے کم یا بہت کم استفادہ کیا تو اس کے اسباب دوسرے تھے۔ یہ اسباب و حقائق اس مضمون کا موضوع نہیں ہیں لیکن جہاں تک ڈاکٹر زور بانی ادارہ ادبیات اردو و معمار ایوان اردو کا تعلق ہے سرزمین دکن پر ان کے فقید المثال کارناموں میں یہ کارنامہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا کہ انھوں نے اپنے ادارے کے لیے اور اس کی عمارت کی تعمیر کے لیے جہاں دیگر وسائل سے استفادہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، حکومت ریاست حیدرآباد سے بھی خاطر خواہ امداد حاصل کی اور اس امداد میں اضافے کے سلسلے میں بھی اپنی جد و جہد کو کامیاب بنایا۔ سابق ریاست حیدرآباد کا آخری دور اور حالات مشکل اور نامساعد نہ ہوتے تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ اس ادارے کو اس دور میں ہی مزید غیر معمولی ترقی دینے میں کامیاب رہتے۔ اردو زبان و ادب کی اس فعال شخصیت کی ان کاوشوں کی تفصیلات آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کے محافظ خانے کے ریکارڈز میں دستیاب ہیں۔

ڈاکٹر زور کی درخواستوں پر ادارہ ادبیات اردو کی امداد میں اضافہ اور پریس خریدنے کے لیے پچاس ہزار روپے کی امداد منظور ہوئی تھی۔ ذیل میں ان کارروائیوں کا خلاصہ اور امداد سے متعلق معلومات پیش کی جارہی ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی امداد سے متعلق ادارے کے معتمد اعزازی سید محی الدین قادری زور نے ۱۹۴۳ء میں حکومت ریاست حیدرآباد کے نام اپنی ایک درخواست میں لکھا تھا کہ یہ ادارہ گزشتہ بارہ سال سے اردو کی ہمہ جہتی قدمت انہام رے رہا ہے۔ ادارے کے ملیہ کا بڑی حد تک خانگی عطیوں پر انحصار ہے۔ صرف گزشتہ تین سال سے سررشتہ تعلیمات سے تین ہزار دو سو روپے سالانہ امداد مل رہی ہے۔ جب کہ ادارہ، اردو کی خدمت کے لیے گزشتہ چار سال میں اوسطاً بارہ ہزار روپے سالانہ خرچ کرتا ہے۔ اگر حکومت کی جانب سے اس ادارے کو قابل لحاظ سالانہ امداد عطا نہ کی جائے اور اس کے لیے ایک سرکاری عمارت فراہم نہ کی جائے تو ادارے کی کارکردگی اور سرگرمی باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ ادارہ ہندوستان کے مشترکہ قومی تمدن کی اور اردو زبان کی خدمت بلا لحاظ مذہب و ملت انجام دے رہا ہے۔ چناں چہ اس کے ارباب کار میں حیدرآباد اور وہبات کے سینکڑوں غیر مسلم اصحاب بھی شریک ہیں۔ ادارے کے نو مختلف شعبوں کی ترقی کے لیے بھاری رقومات درکار ہیں۔ ان نو شعبوں میں تعلیم بالغان، اشاعت کتب، قیام کتب خانہ، تحفظ علمی و ادبی آثار، میوزیم، شعبہ نسواں، تیاری اردو

انسائیکلو پیڈیا، ماہ نامے کی اشاعت اور دفتری کاروبار کے شعبے شامل ہیں۔ ایسے وسیع اور عمدہ خدمات کے پیش نظر ادارے کا موازنہ کم از کم پچاس ہزار روپے سالانہ ہونا چاہیے تاکہ بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس میں توسیع و ترقی کی گنجائش رہے۔ فی الحال حکومت کی جانب سے بتیس ہزار روپے سالانہ کی مالی امداد اس علمی و ادبی ادارے کی ترقی کا باعث ہوگی۔ اور یہ امر حکومت کے لیے دشوار نہیں ہے کیوں کہ حکومت ریاست حیدرآباد کی جانب سے بیرون ریاست کے متعدد اداروں کو اس سے بھی زیادہ سالانہ امداد دی جاتی ہے۔

ڈاکٹر زور کی درخواست پر معتمد تعلیمات نے اس رائے کا اظہار کیا کہ یہ ادارہ اردو کی خدمت کر رہا ہے اور اپنی افادیت کا ثبوت دے رہا ہے اس لیے یہ ادارہ امداد کا مستحق ہے۔ علم و ادب کی سرپرستی حکومت کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ اس ادارے کی مدد حکومت ریاست حیدرآباد کی روایات کے مطابق ہوگی۔ لہٰذا اس ادارے کو سالانہ بارہ ہزار روپے امداد کی منظوری مناسب ہوگی جو اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ اس کا کام حکومت کی رائے میں تشفی بخش ہو۔ امداد کی یہ شرط بھی ہونی چاہیے کہ اس ادارے کی اعلیٰ ترین مجلس میں بالالتزام جامعہ عثمانیہ کا ایک نمائندہ منظورہ سرکار اور ناظم تعلیمات بحیثیت رکن شریک رہیں۔ نیز ادارے کے کتب خانے یا علمی ذخیرے سے ان محققین ادب اور تاریخ کو استفادے اور ریسرچ کا موقع منظورہ شرائط کے تحت دیا جائے یہ شرط اس لیے بھی ضروری ہے کہ حال ہی میں انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن نے اس امر پر زور دیا ہے کہ ایسے امدادی اداروں کے ساتھ یہ شرط عائد کرنا تحقیقی کاموں کے لیے ضروری ہے جن کے پاس کوئی علمی یا تاریخی ذخیرہ موجود ہو اور اس ادارے میں اس وقت ایسا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ مجوزہ اضافہ رقم کی نسبت یہ پابندی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس کا نصف حصہ ایک بلڈنگ فنڈ کے لیے مختص کر دیا جائے جو ادارے کی نئی اور مستقل عمارت کی تعمیر اور اس کے فرنیچر خصوصاً اس کے کتب خانے کے فرنیچر کے لیے محفوظ رہے۔ سررشتہ فینانس نے ادارہ ادبیات اردو کو تین ہزار دو سو روپے سالانہ کی موجودہ مالی امداد کی بجائے دس ہزار روپے سالانہ امداد دینے سے اس شرط کے ساتھ اتفاق کیا کہ اس ادارے کی کارکردگی آئندہ بھی حکومت کے نزدیک اطمینان بخش رہے گی اور ادارہ اپنی مطبوعات کے دو دو نسخے سررشتہ کو فراہم کرے گا۔ اس کے حسابات کی باضابطہ تنقیح دفتر صدر محاسبی سے کرائی جائے گی اور ادارے کی سالانہ رپورٹ سررشتہ تعلیمات میں داخل کی جائے گی۔ اس سال یہ اضافہ زائد از موازنہ اور آئندہ سال شریک موازنہ کیا جائے۔ باب حکومت (کابینہ) نے اس کارروائی کے پیش ہونے پر ادارہ ادبیات اردو کو موجودہ تین ہزار دو سو روپے سالانہ کی بجائے دس ہزار روپے سالانہ امداد جاری کرنے کی سفارش کی نیز باب حکومت نے معتمد تعلیمات اور سررشتہ فینانس کی جانب سے تجویز کردہ شرائط سے بھی اتفاق کیا۔ نواب میر عثمان علی خان آصف سابع نے باب حکومت کی رائے کے مطابق فرمان مورخہ ۲۴ / جنوری ۱۹۴۴ء کے ذریعے ادارہ ادبیات اردو کی امداد کو بہ شرائط مجوزہ تین ہزار دو سو روپے سے بڑھا کر دس ہزار روپے سالانہ کر دینے کی منظوری دی۔

ادارے کی امداد میں اضافہ منظور ہونے کے تقریباً ڈھائی سال بعد ڈاکٹر زور نے ایک اور درخواست حکومت ریاست حیدرآباد کو پیش کی جس میں انھوں نے لکھا کہ اس ادارے کی جانب سے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر اب تک ڈیڑھ سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور نو سال سے ہر ماہ دو رسالے شائع کیے جا رہے ہیں۔ روز بہ روز بڑھتی ہوئی طباعتی ضروریات کے پیش نظر ادارے کی ایک اعلیٰ پائے کے ٹائپ پریس کی شدید ضرورت ہے اور اس کے لیے ادارے نے رقم جمع کرنی شروع کر دی ہے۔ توقع ہے کہ ادارہ پبلک چندوں سے پچاس ہزار روپے کی رقم جمع کر سکے گا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک اچھے پریس کے لیے ایک لاکھ روپے سے زیادہ صرفہ ہوگا اس لیے حکوت سے استدعا ہے کہ مطبع کے قیام کے لیے پچاس ہزار روپے کی امداد منظور کرے۔ صدر المہام فینانس نے اس درخواست پر رائے دیتے ہوئے لکھا کہ ادارہ

ادبیات اردو مفید خدمات انجام دے رہا ہے اور اس ادارے میں ایک اچھے مطبع کے قائم ہو جانے سے اردو ادب کی توسیع و اشاعت میں بڑی مدد ملے گی ۔ جہاں تک ان کے ذاتی تجربے کا تعلق ہے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حیدرآباد میں طباعت کی اطمینان بخش سہولتیں میسر نہیں ہیں ۔ اگر صحیح معنوں میں جدید طرز کے مطبع کو قائم کرنے میں امداد دی جائے تو اس میں نہ صرف عوام بلکہ حکومت کا بھی فائدہ مضمر ہے ۔ اس لیے یہ امداد حسب ذیل شرائط کے تحت منظور کی جاسکتی ہے:

۱ امداد کی رقم ادارے کی طرف سے جمع کردہ رقم سے متجاوز نہ ہوگی ۔

۲ امداد کی رقم کسی صورت میں بھی پچاس ہزار سے زائد نہ ہوگی ۔

۳ ادارے کو مجموعی خرچ سے متعلق تفصیلی تختہ جات پیش کرنے ہوں گے ۔

۴ عائد شدہ اخراجات کی تنقیح حکومت کی جانب سے ہوا کرے گی ۔

۵ امداد کی رقم یک مشت ادا نہیں کی جائے گی بلکہ جتنی بھی اور جب بھی ضرورت ہوگی رقم کی ادائیگی عمل میں آئے گی ۔

صدر المہام تعلیمات نے صدر المہام فینانس کی رائے سے اتفاق کیا ۔ باب حکومت کے اجلاس میں صدر المہام فینانس کی رائے کے مطابق امداد کی منظوری صادر کرنے کے بارے میں قرارداد منظور کی گئی ۔ اس قرارداد پر نواب میر عثمان علی خان آصف سابع نے اپنے فرمان مورخہ ۲۳ / ستمبر ۱۹۴۶ء کے ذریعے ہدایت دی کہ ادارہ ادبیات اردو کو سررشتہ فینانس کی پیش کردہ شرائط پر مجوزہ امداد دی جائے ۔

پریس کے قیام کی غرض سے حکومت کی اس پچاس ہزار روپے کی منظورہ امداد سے استفادہ نہیں کیا جاسکا کیوں کہ اس سلسلے میں یہ شرط عائد کر دی گئی تھی کہ ادارے کی جانب سے جمع کردہ رقم کی مساوی رقم حکومت کی جانب سے جاری کی جائے گی ۔ یہ رقمی منظوری ستمبر ۱۹۴۶ء میں دی گئی تھی اس وقت اور اس کے بعد کے دو سال کے دوران ریاست جن حالات سے دوچار تھی ان حالات میں علمی ، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا سنجیدگی کے ساتھ جاری رہنا بے حد مشکل تھا ۔ ادارے کی جانب سے شائع کردہ ایک کتابچے " ادارہ ادبیات اردو کے تئیس ۲۳ سال " میں لکھا ہے " ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء تک کا دور ادارے کے لیے بڑا نازک دور رہا ہے ۔ اضلاع کی شاخیں تقریباً معطل ہو گئیں کتابوں کی اشاعت اور امتحانات کے کاروبار بھی متاثر ہوئے اور نتیجتہً ادارے کی ترقی کی رفتار میں ٹھیراؤ پیدا ہو گیا ۔ " ظاہر ہے ان حالات میں ادارے کی جانب سے پریس کے قیام کے لیے چندوں سے رقم اکٹھا کرنا ممکن نہ تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت سے اس سلسلے میں مساوی رقم یا Matching grant حاصل نہیں کی جاسکی ۔

ایوانِ اردو کی اس خوب صورت عمارت کی تعمیر میں حکومت ریاست حیدرآباد کی جانب سے محفوظ کی گئی رقم کام آئی ۔ جنوری ۱۹۴۴ء میں ادارہ ادبیات اردو کی امداد بڑھ کر دس ہزار روپے سالانہ کر دی گئی تھی مگر اس رقم کا نصف حصہ بلڈنگ فنڈ کے لیے مختص تھا چنانچہ ۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۸ء پانچ ہزار روپے سالانہ بلڈنگ فنڈ میں محفوظ کیے جاتے رہے ۔ ایوان اردو کی عمارت جس زمین پر کھڑی ہے وہ ڈاکٹر زور کی اہلیہ کی ملک تھی ۔ ان کی جانب سے یہ اراضی بطور عطیہ دی گئی ۔ اس کی بنیاد پر عمارت کی تعمیر کے لیے رقم ۵ سال سے اس مقصد کے لیے حکومت کی طرف سے محفوظ کی جاتی رہی تھی حاصل کر لی گئی ۔ ڈاکٹر زور نے ایوان اردو کی افتتاحی تقریب منعقدہ ۲۲ / مارچ ۱۹۶۰ء میں جو تقریر کی تھی اس میں اس کا تذکرہ ملتا ہے ۔ تاہم یہ وضاحت ضروری ہے کہ حکومت ریاست حیدرآباد کی متذکرہ امداد اس عمارت کے جملہ مصارف کا صرف ایک حصہ تھی دیگر مصارف کی پابجائی دوسرے وسائل سے کی گئی جن میں عطیہ اراضی بھی شامل ہے ۔

ڈاکٹر مصطفیٰ علی خاں فاطمی

نواب عنایت جنگ

(ڈاکٹر زور کے رفیق اور ادارۂ ادبیات اردو کے محسن)

نواب عنایت جنگ بہادر حیدرآبادی تہذیب و شائستگی کا ایک کامل نمونہ تھے۔ حیدرآبادی تہذیب در حقیقت مغلیہ اور قطب شاہی تہذیب کا عطر مجموعہ ہے اور نواب عنایت جنگ اس کی خوش بو۔ ان کے مزاج میں نرمی، انکساری، گفتگو میں عالمانہ وقار اور شخصیت میں ایسی کشش تھی کہ جو بھی ان سے ایک بار ملتا وہ ہمیشہ کے لیے ان کے اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا۔ آپ خاندانی امیر تھے اور سونے پہ سہاگا یہ کہ اپنے والدِ محترم نواب اشرف الدولہ، رکن السلطنت تہور جنگ سے دربارِ آصف جاہی کے آداب اور حیدرآبادی روایات کی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ نواب تہور جنگ آصف سابع حضور نظام میر عثمان علی خاں کے اتالیقِ خاص تھے۔ مروجہ تعلیم گھر پر ہی ہوئی اور پھر مدرسہ، عالیہ اور نظام کالج سے تعلیمی مراحل طے کیے۔ مشرقی علوم والسنہ کے ساتھ ساتھ یورپی زبانوں انگریزی اور فرانسیسی کے رسیا تھے۔ فارسی میں آپ کے استاد محمد علی شوشتری سناد الملک تھے۔ اسی لیے نواب عنایت جنگ اہل زبان کی طرح بے تکلفی اور روانی سے فارسی بولتے تھے۔ وہ جب علوم و فنون تہذیب و تاریخ اور دین اور مذہب پر گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا تھا کہ موتی رول رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران مخاطب کی بات بڑی توجہ سے سنتے اور ساتھ ہی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگالیتے تھے۔ اگر اس میں کچھ اضافے کی ضرورت محسوس کرتے تو اپنے شخصی معلومات کے اظہار سے اس کو مکمل کر دیتے۔

نواب عنایت جنگ ایک خوش عقیدہ شیعہ تھے۔ رواداری اور احترام انسانیت ان کا مسلک تھا۔ ان کی دیوڑھی میں محرم کی مجالس بڑی پابندی اور مکمل آداب کے ساتھ منعقد ہوتی تھیں۔ بہت ہی ستھرا اور نکھرا ذوقِ سماعت رکھتے تھے اسی لیے صحیح واقعات کربلا کے بیان، ان کے تجزیے، علمی استدلال اور استخراجِ نتائج کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجلس کے بعد نجی محفلوں میں نواب عنایت جنگ کی تعمیری تنقید اور تاریخی معلومات سے ذاکر و خطیب خود مستفید ہوتے تھے۔ نقد و نظر کے معاملے میں بڑے کھرے واقع ہوئے تھے۔ بے جا تعریف و تحسین کے وہ قطعاً قائل نہ تھے۔ مردم شناسی اور قدردانی میں بھی نواب عنایت جنگ یکتا تھے۔ مختصر یہ کہ نواب عنایت جنگ ایک نیک سیرت، سنجیدہ طبیعت، ہمدردِ قوم و ملت، علم دوست، ہنر پرور، فیاض، رحم دل، ملنسار اور متقی امیر ابن امیر اور شیدائے امام حسین علیہ السلام تھے۔

ان کی وقف کردہ دیوڑھی "حسینیہ" کی مجالس عزا میں، میں نے نواب عنایت جنگ کو کبھی صدر میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ اپنے صاحب زادوں کے ساتھ وسیع صحن میں سیڑھیوں کے قریب گھنٹہ سوا گھنٹہ عجز و انکسار کی تصویر بنے خاموش کھڑے رہتے تھے۔ ان کے اس معمول میں سیاسی انقلابات جاگیر و مناصب کے خاتمے سے بھی ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ نواب عنایت جنگ کی سب میں زیادہ متاثر کرنے اور دل موہ لینے والی چیز ان کا درباری طرز کا سلام تھا جو ان کے بعد پھر دیکھنے میں نہ آیا۔ در حقیقت یہ سلام، تشکر اور امتنان کا اظہار اور حسینی اخلاق کا تبرک تھا جو بعد مجلس ہر کس و ناکس، بچے بوڑھے سب میں تقسیم ہوتا تھا۔ بہ ایں ہمہ وہ ایک وسیع المشرب انسان دوست تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی گلشن باغ اور الوال کی جاترا میں جاتے، حضرت شاہ خاموشؒ کی خانقاہ میں سماع سنتے اور دیگر مشائخین کے عرسوں میں

شرکت کرتے تھے۔ گھر آنے مہمانوں اور طالب علموں کی بات پوری توجہ اور انہماک سے سنتے، خاطر تواضع کرتے اور ان کی روانگی پر مشایعت کرنا یعنی دروازہ تک لے جاکر خدا حافظ کہنا خود پر واجب سمجھتے تھے۔ چھوٹے بڑے، عالم و عامی ہر ایک کے ساتھ ان کا یہی برتاؤ تھا۔

دکن کی تاریخ اور حیدر آباد کی تہذیب پر علمی اور تحقیقی کام کرنے کے لیے انھوں نے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس میں پروفیسر سید محمد، جناب اکبرالدین صدیقی، رائے محبوب نارائن شریک تھے۔ تمام اراکین نے بہ اتفاق آرا انھیں اس کمیٹی کا صدر منتخب کیا تھا۔ اس کے ایک جلسے میں پروفیسر سید محمد صاحب نے اپنا ایک مضمون "حیدر آباد کے مدرسے" پیش کیا تھا۔ رائے محبوب نارائن سے حیدر آبادی شادیوں کی ضیافتیں، عطر، پھول، پان اور رخصتی کے رسوم پر مضامین لکھنے کی نواب صاحب نے فرمائش کی تھی۔ مضامین کے لکھوانے، سرخیاں دینے اور پیش کردہ مضامین میں اپنی شخصی معلومات کے اضافے سے انھیں درجہ کمال تک پہنچانے میں نواب عنایت جنگ بڑی دل چسپی کا اظہار کرتے تھے۔ ایک بار رائے محبوب نارائن سے "حقہ" پر مضمون لکھنے کو کہا اور گڑاکو کے کئی نسخے بھی عنایت کیے تھے۔ امراءِ گولکنڈہ کے مرثیوں کا ذکر آیا تو اس میں "شیوا پا" کا بھی نام لیا اور محبوب نارائن صاحب سے کہا کہ ان کا رثائی کلام بھی جمع کرو۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سب موقعوں پر انھوں نے کئی مضمون نگاروں سے مضامین لکھوائے۔ انھیں پڑھوا کر سنا اور بے حد خوش ہوئے۔ ہتھیاروں کی بات چھڑ جاتی تو بے شمار نام تلواروں، خنجروں، کٹار، پیش قبض، تیے اور جمبیوں کے گناتے تھے۔ زرہ بکتر کے اقسام لوازمات، محل استعمال پر تفصیلی روشنی ڈالتے تھے۔

نواب عنایت جنگ کی دلی خواہش تھی کہ حیدر آباد دکن میں کوئی ایسا ادارہ قائم ہو کہ اس میں دکنی سلطنتوں کے آثار اور یہاں کے لسانی، ادبی، علمی، فنی اشیا اور تہذیبی نوادرات جمع اور محفوظ ہو جائیں۔ انھیں ایک چھت کے نیچے قرینے سلیقے سے دیکھنے سمجھنے اور مطالعہ و تحقیق سے اپنے ورثے کی قدر و قیمت جاننے کے مواقع فراہم ہوں۔ آصف سابع میر عثمان علی خاں کے ۳۸ سالہ دور حکومت میں مغربی تمدن اور مشرقی اقدار کے امتزاج اور ربط و ضبط کو نواب صاحب نے بہ چشم خود دیکھا، جانچا اور پرکھا تھا۔ تہذیبی مظاہر اور نوادرات کی پرکھ میں عنایت جنگ بہادر کو اتنا ملکہ تھا کہ سالار جنگ سوم اپنے میوزیم کے لیے آپ سے مشورہ کرتے تھے اور تعین قیمت میں بھی آپ کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ عنایت جنگ کی دیوڑھی میں ایک بہترین کتب خانے کے علاوہ ایک موروثی میوزیم بھی تھا جس میں خاندانی ہتھیار، لباس، خلعت، ہمہ اقسام کے ظروف، بیدری سامان، چوبی قلم دان، تصاویر وغیرہ محفوظ تھے۔ ان کی لائبریری میں مخطوطات کا بھی بڑا ذخیرہ تھا۔ وہ خود بھی مخطوطات اور مطبوعات خریدنے اور انھیں پڑھنے کے شوقین تھے۔ جب وہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے قائم کردہ ادارۂ ادبیاتِ اردو اور اس کے اغراض و مقاصد سے واقف ہوئے تو ادارے کے کتب خانے اور میوزیم کے لیے اپنے عطیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پروفیسر اکبرالدین صدیقی نے نواب عنایت جنگ کی عنایتوں اور عطایا کی تفصیل نہایت خوب صورت لفظوں میں قلم بند کی ہے، جس سے ڈاکٹر زور کی مساعی اور نواب صاحب کی دریادلی کا پتہ چلتا ہے۔

" ادارۂ ادبیاتِ اردو کے قیام کے بعد ڈاکٹر زور مرحوم نے اس امر کی کوشش کی کہ دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس کو ایک تحقیقاتی مرکز کی شکل دی جائے۔ اس مقصد کے لیے مطبوعات سے زیادہ مخطوطات کی ضرورت تھی۔ مخطوطات بے قیمت بھی ہوتے ہیں اور لاقیمت بھی، بے حقیقت بھی ہوتے ہیں اور مقدس بھی۔ یہ مردوں کی طرح دفن بھی ہوتے ہیں اور بعض زندوں کی طرح حیات دوام بھی حاصل کرتے ہیں۔ یہ کبھی برسرِ بازار بھی آتے ہیں اور کبھی سات پردوں میں چھپے ہوئے بھی رہتے ہیں۔ اس لیے ان کا حاصل کرنا جہاں آسان تھا وہاں مشکل بھی ہوا۔ جب خریدار پیدا ہوئے تو قیمتوں کو پر لگ گئے ایسے کہ سرکار دربار ہی میں ان کی رسائی ہو سکے۔ ان حالات میں

ادارے کے لیے مخطوطات کا جمع کرنا، جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا لیکن ڈاکٹر زور نے ہمت نہ ہاری اور خریدنے کا خیال چھوڑ کر حصول عطایا فکر کی اور اپنے دوست احباب میں اس کا چرچا کیا۔ شدہ شدہ نواب صاحب معز (نواب عنایت جنگ) تک رسائی ہوی۔ نواب صاحب مر خود یہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا مرکز بنے جہاں دکن کے آثار اور اس کا ادب محفوظ ہوجائے۔ اس کا تمدن اور معاشرت، اس کے رسم و رواج ا روایات پر مشتمل ... یا ایک جگہ جمع ہوجائیں۔ نواب صاحب نے زور صاحب کی تجویز سنی تو پھولوں نہ سمائے اور اپنے عطایا کا سلسلہ شرو کردیا۔ یہ عطایا ایک رقعے سے لے کر ایک دفتر تک ہیں اور سنگریزوں سے لے کر جواہر تک۔ مخطوطات میں تقریباً سو (۱۰۰) کا ذکر تذکرہ مخطوطات کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو جلد اول تا پنجم میں آگیا ہے اور ابھی کئی ایسے مخطوطات ہیں جن ذکر باقی ہے۔"

ایک سو مخطوطات میں سے نمونے کے طور پر چند اہم اور نادر مخطوطات کی کتابیاتی تفصیل حسب ذیل ہے:

سلسلہ نمبر	مخطوطہ نمبر	عنوان کتاب	مصنف	سنہ	زبان	فن
۱	۵۵۰	معارف محمدیہ (مثنوی)	بہادر اولیا حسینی	۱۰۰۰ھ	عربی، فارسی اور اردو	مثنوی
۲	۲۵۰	تحفۃ النصائح	سید محمد یوسف حسینی	۱۰۵۷ھ		
۳	۱۴۸	کلیات سودا (مع دیباچہ فارسی)	مرزا محمد رفیع سودا	۱۱۹۴ھ	اردو	شاعری قـ
۴	۱۰۰/۹۲/۳۱/	روضۃ الشہدا (مختلف سنین کے سکتے)	محمد فیاض ولی ویلوری	۱۱۳۰ھ	اردو	واقعات
۵	۱۷	چندر بدن و مہیار	مقیمی	۱۱۲۸ھ	دکنی اردو	مثنوی
۶	۸	سیف الملوک و بدیع الجمال	غواصی	۱۰۳۸ھ	دکنی اردو	مثنوی
۷	۳۳	پنچھی باچھا	وجدی، وجیہہ الدین مصنفہ مکتوبہ	۱۱۴۶ھ ۱۲۶۳ھ	دکنی اردو	مثنوی
۸	۲۳	حامہ علی	شاہ عبدالعلی	۱۱۱۰ھ	دکنی اردو	مثنوی
۹	۱۲۵	ستاولی	فقیر اللہ شاہ حیدر	۱۲۳۳ھ	دکنی اردو	قصیدہ شـ مثنوی
۱۰	۲۲۵	شرح چغمنی (مکتوبہ مصنف مترجم)	شاہ علی متوطن ادھونی	قریب ۱۲۵۰ھ	اردو ترجمہ فارسی سے	علم ہیئت
۱۱	۲۳۴	تاریخ بدر نواب بدر عالم (بیگم واجد علی شاہ اختر) مرتبہ واجد علی شاہ	واجد علی شاہ اختر مرتب	۱۲۷۶ھ (مصنفہ و مکتوبہ)	اردو	مکتوبات خطوط

مرزا عطا ضیا برہان پوری کی کئی قلمی کتابیں مثلاً داستان چار چمن، دستور العمل اور رنگ زیب وغیرہ اسی طرح لالہ منسا رام کی ضوا آصف جاہ، تاریخ رشید الدین خانی، تاریخی خطوط آصف جاہ اول، حالات نادر شاہ، خطوط اورنگ زیب، خطوط موسوی خاں فطرت وغیرہ۔ نواد

عنایت جنگ نے سلاطین قطب شاہیہ کے خطوط بھی ادارے کو عطا کیے اور انھیں اپنی نگرانی میں بہ عنوان "مکاتیبِ سلاطین شاہیہ" بہ غرض طباعت مرتب بھی کروایا۔

ان مخطوطات اور بے شمار مطبوعات کے علاوہ جن کا سلسلہ کم و بیش (۴۰) سال پر محیط ہے نواب عنایت جنگ نے ادارے کے میوزیم کے لیے مغلیہ اور آصف جاہی فرامین، احکام، اسناد، طغرے، مشہور کاتبوں کی وصلیاں، خطاطی و خوش نویسی کے نادر نمونے، مصوروں اور نقاشوں کی بنائی ہوئی تصاویر، تصویر چے (Miniature Paintings) اپنے جد بزرگوار رکن الدولہ وزیر اعظم سلطنت آصفیؒ خلعت ہفت پارچہ اور اپنے والد محترم اشرف الدولہ تہور جنگ کا درباری لباس معہ برطانوی کرچ (تلوار)، بے شمار قدیم ہتھیار، تلواریں، سکے، مہریں وغیرہ بطور عطیہ دی ہیں۔

اپریل ۱۹۷۰ء میں وہ کربلائے معلیٰ چلے گئے اور دس مہینے بعد ۵ فبروری ۱۹۷۱ء جمعہ کے دن مصدر الطاف و عنایت حسینؑ نے اپنی جان نثارِ رہ یار کر دی اور سید الشہداء کے پائین میں دفن ہوئے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہء پارینہ را

○ ○ ○

(سلسلہ ص ۵)

یہی وجہ ہے کہ وہ یوم محمد قلی کے موقعے پر تلگو اجلاس بھی منعقد کرتے۔ تلگو کے ادیبوں اور شاعروں کو یکجا کرتے اور ایک پلیٹ فارم پر لاتے۔ اس طرح ہندی والوں سے ان کے تعلقات بڑے خوش گوار تھے۔ ہم لوگوں کو اردو کے ساتھ ساتھ تلگو اور ہندی سیکھنے اور مہارت پیدا کرنے کی ہمیشہ تلقین کرتے۔

آخر زمانے میں کشمیر منتقل ہوئے اردو زبان کی خدمت کا جذبہ انھیں وہاں لے گیا مختصر سے عرصے میں وہاں بھی ادارۂ ادبیاتِ اردو کی شاخ قائم کر دی اور کئی کتابوں کی اشاعت عمل میں لائی گئی۔

ڈاکٹر صاحب جیسے رہنماؤں کی بے لوث خدمات کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اردو ادب نہ صرف زندہ ہے بلکہ تحقیق، تنقید اور تخلیق کی سمت عصری حسیت اور شعور کے ساتھ سرگرم عمل ہے اور یہی ڈاکٹر صاحب کا نصب العین تھا۔

منظر امکانی - اختر سعیدی

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد ' سے انٹرویو:

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد اپنی وضع داری اور دردمندی کے حوالے سے ایک سچے اور کھرے انسان ہیں۔ وہ زندگی کے کسی گوشے میں مصنوعی پن کو اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ انھوں نے جن چیزوں کو ابتدائی مرحلے پر قبول کیا تھا ان ہی کے سہارے زندہ، جب کہ اس دوران ان گنت لوگ کچھ سے کچھ ہوگئے۔ ممکن ہے اپنے نظریات اور تہذیبی رویے میں ایسی وابستگی بعض لوگوں کے نزدیک تنگ نظری تصور کی جائے لیکن یہ ایسی وفاداری ہے جس کے بارے میں مرزا غالب نے کہا تھا:

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے

خواجہ حمید الدین شاہد نے خود کو موسموں کی صورت نہیں بدلا، انھوں نے اپنے کل کو جس مقصد اور نظریے سے روشن بنایا تھا "کل" میں وہ آج بھی زندہ ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے "آج" کی پسندیدگی اور شہرت کے رنگ ماضی سے قدرے مختلف ہیں، خواجہ صاحب کو کسی بھی بات کا ملال نہیں۔ ان سے محبت اور احترام کرنے والوں کا حلقہ بھی خاصا وسیع ہے۔ علمی اور ادبی حلقوں میں ار تذکرہ کیا جاتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی ایک طالبہ نے ان کے علمی کارناموں پر ایم۔ فل۔ کیا تھا اور دوسری ایک اور طالبہ پی ایچ۔ ڈی۔ کیا ہے۔ خواجہ صاحب اردو ادب کے نامور اسکالر ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم کے پسندیدہ شاگردوں میں شمار کیے جا ہیں۔ ڈاکٹر زور کی خصوصی توجہ سے خواجہ صاحب کی زندگی میں انقلاب آیا۔ علم و ادب کا فروغ ان کی زندگی کا مقصد بنا۔ اپنے اسی مقصد خاطر خواجہ صاحب نے خود کو محدود کر لیا ہے۔ ادب میں ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ حیدرآباد دکن کے ایک کالج میں ادب پڑھا لگے اور پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں استاد ہوگئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈاکٹر محی الدین زور کے قائم کردہ ادارے ادبیات اردو اور "سب رس" سے وابستہ رہے۔

اس طرح سترہ برس تک تدریسی شعبے اور علم و ادب سے وابستہ رہنے کے بعد سقوط حیدرآباد دکن کے بعد پاکستان آگئے اور یہا اردو لغت بورڈ میں نائب مدیر ہوگئے۔ اس ادارے سے ۱۹۷۵ء میں ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے پھر کہیں ملازمت نہیں کی۔ کراچی انھوں نے "ایوان اردو" قائم کیا اور کراچی سے ایک ادبی جریدہ "سب رس" ہی کے نام سے جاری کیا جو اب تک نامساعد حالات کے با بالقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے وہ اس کی پرورش اولاد کی طرح کر رہے ہیں۔

خواجہ صاحب کی علمی اور ادبی مسافت نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ اس طویل مسافت کے دوران بہت موسم آئے لیکن ان کے چہرے کے رنگ مدھم نہیں ہوئے تاہم چار برس قبل (یہ انٹرویو ۱۹۹۳ء میں لیا گیا تھا) ان کی اہلیہ کے انتقال ہو جا کے بعد وہ نڈھال سے ہوگئے ہیں۔ عارضہ قلب کے مریض تو پہلے ہی تھے لیکن اس سانحے کے بعد ان کی عام صحت بھی متاثر ہوئی ہے۔ اس غم کے باوجود وہ اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف ہیں اور نواب بہادر یار جنگ اکیڈمی کی صدارت کی ذمہ داریاں بھی پوری کر رہے ہیں ادبی جریدے سب رس کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا ہے اور پھر لکھنے پڑھنے کا کام بھی جاری ہے۔ وہ علمی اور ادبی اجتماعات میں کبھی کبھار دکھائی دیتے ہیں گو وہ پہلے والی بات نہیں۔ ستائش اور صلے کی تمنا سے الگ ہو کر کام کرنے والی اس شخصیت کو دیکھ کر یہ یقین [illegible] لوگوں [illegible] نہیں ہوئی

س: آپ اپنے نظریات میں اس قدر پابند کیوں ہیں، جب کہ بیش تر معاصرین نے وقت کے ساتھ خود کو بدلا ہے۔ کیا تبدیلی کا عمل آپ کے خیال میں مناسب اور مثبت رویہ نہیں؟

ج: تبدیلی زندگی کی ضرورت بھی ہے اور زندہ ہونے کی گواہی بھی۔ یہ تو تبدیلی کا جواب ہوا۔ اب میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ، کیا لری تبدیلی اور فیشن میں کوئی فرق نہیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ آپ کا جواب بھی یہی ہوگا کہ اگر تقابلی مطالعے اور تجزیے سے اپنے نظریات اور لرز زندگی میں تبدیلی کی جائے تو یقیناً یہ عمل مثبت ہوگا لیکن اگر صرف اس خیال سے خود کو تبدیل کر لیا جائے کہ دوسرے تبدیل ہو رہے ہیں ذ یہ تقلید ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے ہی لوگ جو خود کو تبدیل کرتے ہیں وہ آنکھیں بند کر کے سوچتے ہیں، بلکہ اس میں بیش تر لوگ یسے دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے حالات کے دباؤ میں خود کو بدلا ہے۔ ہمارے چاروں طرف جو ناآسودگی پائی جاتی ہے اس کے پس منظر میں ندھی تقلید کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس اندھی تقلید کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی کا خود اپنی ذات سے رشتہ باقی نہیں رہتا یا کم زور ہو جاتا ہے۔ پ کے اخبار جنگ کی کامیابی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اسے کسی ایک حلقے کا ترجمان نہیں بنایا گیا۔ میر خلیل الرحمن مرحوم اگر حالات سے مجھوتہ کر لیتے اور ذاتی مفادات کے لیے عہدے قبول کرنے پر تیار ہو جاتے تو اس اخبار کی مقبولیت مثالی نہ رہتی۔ میر صاحب نے یہی تعلیم پنی اولاد کو بھی دی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں اور اساتذہ نے تقلید اور خود غرضی سے ہمیشہ دور رہنے کی تلقین کی۔ میں نے جہاں ہیں اپنے نظریات میں جھول پایا اس کو دور کیا، لیکن بلاوجہ فکری تبدیلی کے حق میں نہیں ہوں۔ اس کی وضاحت یوں کر دوں کہ جب میں یہ سمجھتا ہوں جھوٹ بولنا بری بات ہے تو اس کو ہر جگہ برا سمجھتا ہوں۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ جہاں کہیں مجھے جھوٹ بولنے سے فائدہ پہنچے وہاں میں اس کی معنویت ہی بدل دوں۔ میں پاکستان ہجرت کر کے آیا تو تدریسی شعبے میں سترہ سال کا تجربہ تھا، میری خواہش تھی کہ تدریسی شعبے سے وابستہ ہو جاؤں لیکن اس کے لیے میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں خوشامدیں کروں یا رشوت دوں۔ میں برصغیر کی ایک بڑی یونیورسٹی تک اپنی محنت اور کوشش سے پہنچا تھا۔ میری پہلی کتاب ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی اور "اردو میں سائنسی ادب" کا تھیسیس میں نے زمانہ طالب علمی میں لکھا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل علمی و ادبی حلقوں میں مقام بنا لینے کے باوجود مجھے یہاں اجنبی سمجھا گیا۔ یہاں میرا مطلب یہ نہیں کہ جن لوگوں نے بھی اچھی ملازمتیں حاصل کیں انھوں نے غلط ذرائع ہی اختیار کیے۔ لیکن میرے ساتھ کچھ الگ حالات پیش آئے اور میں نے حالات سے مجھوتہ نہیں کیا۔ میں یہ بھی کہتا چلوں کہ میرے لیے ملازمت کا مقصد صرف پیسہ کمانا نہ تھا۔ خدا کے فضل سے مالی اعتبار سے کبھی مجھے پریشانی نہیں ہوئی۔ میں "اردو لغت بورڈ" میں بھی خدمت کے جذبے سے ملازم ہوا تھا، جہاں جو مجھے تنخواہ ملتی تھی اتنی ہی تنخواہ میں اپنے ڈرائیور کو دیا کرتا تھا۔ گو میں کوئی بڑا سرمایہ دار بھی نہیں تھا اور نہ ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہاں علم و ادب کو اولیت حاصل تھی۔ عملی زندگی میں بے پناہ تعاون کرنے والی رفیقۂ حیات میسّر آئی۔ خاندانی نظام کی وجہ سے یہ سہولت حاصل رہی کہ میں اپنے علمی اور ادبی شوق کو غم روزگار سے آزاد رہ کر جاری رکھ سکوں۔ "اردو لغت بورڈ" سے ۵۸ سال کی عمر میں ریٹائر ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے طور پر کام کروں اور میں نے ادبی جریدے کا آغاز کیا جسے ابھی تک جاری رکھے ہوئے ہوں۔

س: تدریسی شوق کو جاری رکھنے کے لیے آپ کوئی درس گاہ بھی قائم کر سکتے تھے، کیا آپ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کے لیے اپنے خاندان سے تعاون حاصل کرتے؟

ج: میں نے یہ عرض کیا کہ میں کوئی سرمایہ دار انسان نہیں ہوں جب کہ ایک اچھے تعلیمی ادارے کے لیے معقول سرمایہ کاری کی ضرورت

[illegible]

گیا۔ میں اب گذشتہ اٹھارہ برس سے ادبی جریدہ نکال رہا ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ ادبی جرائد کو اشتہارات نہیں ملتے کیوں کہ ادبی رسائل کے پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہوتا ہے۔ میں اپنے ذاتی مراسم سے کام لے کر اشتہارات حاصل کر سکتا ہوں لیکن یہ میرے بس میں نہیں کہ اپنے رسالے کے لیے اشتہارات مانگنے لوگوں کے پاس جاؤں۔ اشتہارات کی فراہمی کے لیے آدمی بھی رکھے لیکن اس سے اخراجات میں الٹا اضافہ ہوا کچھ دوست اور ادارے اپنے طور پر تعاون کر دیتے ہیں مگر افسوس کہ آج کل ادبی اور علمی رسائل پڑھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ لوگ اد کتابیں اور رسائل خرید کر پڑھنے کے قائل نہیں رہے شاید۔

س: آپ سقوط حیدر آباد دکن کے عینی شاہدوں میں ہیں، آپ کے خیال میں اس کا ذمہ دار کون تھا؟

ج: سقوط حیدر آباد دکن کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور کئی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ حال ہی میں قطب الدین عزیز صاحب کی ایک کتاب آئی ہے۔ آپ نے میری ذاتی رائے معلوم کی ہے اور اتفاق سے میں اس بڑے سانحے کے وقت حیدر آباد ہی میں تھا، میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ اسی حوالے سے میں قاسم رضوی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہوں۔ قاسم رضوی ایک جذباتی انسان تھے ان میں سیاسی بصیرت نہیں تھ اگر ہوتی تو حیدر آباد دکن کے مسلمانوں کا قتل عام نہ ہوتا۔ قاسم رضوی کے جذباتی انداز نے بہت نقصان پہنچایا۔ حیدر آباد دکن پر حملے کے وقت حیدر آباد کے نوجوان ٹینکوں کے سامنے لیٹ گئے اور حیدر آباد دکن کے نواحی علاقوں میں بڑے مظالم ڈھائے گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اپنی جغرافیائی صورت حال کی وجہ سے اگر معاملات کو سیاسی بات چیت کے ذریعے سلجھالیا جاتا تو بھی عملی صورت حال یہی رہتی یعنی حیدر آب بھارت ہی کا حصہ بنتا، لیکن مذاکرات کی صورت میں اتنا زبردست جانی اور مالی نقصان نہ ہوتا اور اہل حیدر آباد اپنے گھروں کو چھوڑ کر یوں بھاگتے، پاکستان میں انھیں نت نئے ناموں سے نہ پکارا جاتا۔ تاریخی حقائق یہی ہیں کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حیدر آباد دکن میں مسلمان اقلیت میں تھے، لیکن اس کے باوجود حیدر آباد میں حکم ران تھے۔ حیدر آباد دکن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات کی نوعیت بالکل مختلف رہی ہے وہ برسوں ایک ساتھ رہے تھے سمجھ دار اور پڑھے لکھے ہندو خود بھی چاہتے تھے کہ معاملہ بات چیت کے ذریعے نپاجائے۔ لیکن قاسم رضوی کے جذباتی پن نے حالات کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنائے رکھا۔ قاسم رضوی کے مداحوں کو شاید میری صاف گوئی سے دکھ ہو لیکن میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار ہے۔ نواب بہادر یار جنگ سے میرے ذاتی مراسم رہے ہیں۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھے، قائد اعظم کے قریب ترین ساتھی اور ایک سچے مسلمان بھی۔ لیکن ان کی سیاست میں جذباتیت کا غلبہ نہ تھا۔ انھوں نے ایک جلسے میں جس میں قاسم رضوی نے اپنے گھر بار مسلمانوں کو دے دینے کا اعلان کیا تھا، قاسم رضوی کو ایک خطاب بھی عطا کیا تھا لیکن آئندہ برسوں میں وہ ایک جذباتی شخص ثابت ہوئے۔ تاہم ان کے اسی جوش و جذبے نے انھیں مقبول بھی بنایا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آخری دنوں میں انھوں نے ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ ہم لال قلعے پر آصفی جھنڈا لہرا دیں گے۔ دوسرے ہی روز ہندوستان کے ایک اہم شخص نے کہا کہ، ہم قاسم رضوی کو اسی قلعے میں قید رکھیں گے۔ لیکن قاسم رضوی کی مقبولیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ حیدر آباد کے حکم ران ایک طرح بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ سقوط حیدر آباد دکن برصغیر کی مسلم تاریخ کا ایک اہم سانحہ ہے اور تحریک پاکستان میں دکن کے حکم ران نواب م عثمان علی خاں کی خدمات تاریخ کا حصہ ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن افسوس کہ اس کو فراموش کیا جا رہا ہے پہلے اخبارات میں خصوصی ایڈیشن چھپا کرتے تھے اب ایک آدھ مضمون آجاتا ہے۔

س: یوں تو ہر شخص کو اپنے آبائی شہر اور علاقے سے خصوصی محبت ہوتی ہے لیکن اس محبت میں خود کو محدود کر لیا جائے تو انسانی فکر بھ محدود ہو جاتی ہے۔ آپ کی تصانیف میں اسی آبائی علاقوں کے رنگوں کا غلبہ ہے۔ آپ کا ادبی جریدہ بھی اسی فکر کا ترجمان ہے اور عملی طور پر آ

صرف بہادر یار جنگ اکیڈمی کے لیے فعال دکھائی دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کی شہرت بھی محدود ہو کر رہ گئی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ میں ادب اور زندگی میں شہرت کو کامیابی کی دلیل نہیں سمجھتا۔ میں نے ایم۔اے۔ کا تھیسیس "اردو میں سائنسی ادب" لکھا تھا تو اس کو دور تک محسوس کیا گیا۔ اردو ادب میں یہ ایک منفرد موضوع تھا۔ اس سے آگے نظر ڈالیں تو آپ کو میری پہلی کتاب "سرگزشت ادبیات اردو" دکھائی دے گی۔ یہ کتاب ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ ادبیات اردو کی اس تاریخ کو اگر آپ محدود قرار دیں تو یہ آپ کا فیصلہ ہوگا۔ "اردو میں سائنسی ادب" بھی میرے آبائی شہر کی داستان نہیں تھی۔ میں نے خود کو کبھی محدود نہیں رکھا۔ میرے رسالے سب رس میں بھی بنیادی طور پر ادب ہی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ کراچی میں "ایوان اردو" کو بھی محدود نہیں رکھا گیا۔ میں ایسے تعلیمی اور سماجی اداروں کے لیے بھی کام کرتا ہوں جنھیں دوسرے علاقوں کے لوگ چلا رہے ہیں۔ دیار ادب میں، میں نے اپنی شناخت اپنے علاقے سے پیدا نہیں کی بلکہ اپنی صلاحیتوں اور کارکردگی سے یہ ثابت کیا ہے کہ میں ادب کا شعور رکھتا ہوں۔ اس سے اگلے مرحلے پر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ حیدرآباد دکن کے ادیب اور شعرا نے جو کام کیا ہے اسے منظر عام پر لاؤں۔ حیدرآباد دکن کی علمی اور ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا خاص طور پر اردو کی خدمات کو۔ اس ریاست نے پورے برصغیر کے نام ور اہل علم اصحاب سے تعاون کیا۔ "دکن میں اردو" تو ایک تحقیقی کتاب ہے، لیکن عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام جو تراجم ہوئے ہیں ان کی مثال کسی دوسری جگہ سے نہیں دی جاسکتی۔ اردو زبان اور اردو ادب کے فروغ کے سلسلے میں حیدرآباد دکن کو اردو تاریخ سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ نواب بہادر یار جنگ اکیڈمی تک خود کو محدود کرلینے کا سبب یہ ہے کہ اب میری صحت اچھی نہیں رہتی عمر کا تقاضا بھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اکیڈمی کو تمام اہل علم کے لیے کارآمد بنایا جائے۔ یہاں علمی اور ادبی تقاریب کے لیے کوئی پابندی نہیں رکھی گئی ہے۔ جہاں تک جریدے سب رس کا تعلق ہے اس میں معیاری ادب بنیادی شرط ہے۔ میرے خیال میں جو شعرو ادب اپنی تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار نہ ہو اس کی حوصلہ افزائی بھی جرم ہے۔ میں آزاد غزل اور تجریدی افسانوں وغیرہ کو پسند نہیں کرتا لہٰذا ان کی اشاعت سے معذرت کرلیتا ہوں۔

○ ○ ○

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

دیار دکن کا ایک روشن چراغ

پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی

پروفیسر اکبرالدین صدیقی صاحب گذشتہ نصف صدی سے دکنیات کے امام تھے۔ ان کی شخصیت میں، ہم کو دبستانِ دکن کی ترجمانی ا آصفیہ تہذیب کی جلوہ سامانی نظر آتی ہے۔ وہ حیدرآباد میں چار قندیل (۱) جلا کر آباء و اجداد کے علوم کے خزانے لٹا رہے تھے اور اردو زبا ادب، تاریخ اور لسانیات کے جلوے دکھا رہے تھے اور مرجعِ امام بنے ہوئے تھے۔ ان کے پاس دکنیات کا ایک عمدہ کتب خانہ بھی تھا۔ میر نزدیک ان کا علمی وجود دکن کا دل تھا اور ان کا سینہ دکنیات کا سفینہ تھا۔

پروفیسر اکبرالدین صدیقی صاحب کا رنگ سرخ و سفید تھا جسم گدار، قد نکلتا ہوا، چہرے پر جلال شاہی اور فروغِ صبح گاہی، گفتگو و اند نظر میں آصفیہ تہذیب کی جلوہ سامانی، حیدرآباد کے دورِ گذشتہ کی نشانی، اور کلچر کی ترجمانی ان کی شخصیت سے عیاں تھی۔

پروفیسر اکبرالدین صدیقی صاحب نے جو تحفے اردو ادب کو عطا کیے ہیں ان کی فہرست طویل ہے۔ انھوں نے مختلف رسالوں می مقالات بھی لکھے ہیں ان کو اگر جمع کیا جائے تو ایک عمدہ تحقیقی مقالات کا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ صدیقی صاحب کبھی ہم کو قندھارِ دکن کے او سے روشناس کراتے ہیں کبھی بے نظیر شاہ کے دیوان کا جلوہ دکھاتے ہیں کبھی پریم چند کی کہانیوں کا دفتر باز کرتے ہیں کبھی کلمۃ الحقائق تشریح فرماتے ہیں کبھی چندر بدن مہیار کے دل کش قصے سے ہمارا دل بہلاتے ہیں۔ کبھی پھول بن کے پھولوں سے ہمارا دامن بھر دیتے ہیں کبھی ارشاد نامہ سے دلوں کو شاد کرتے ہیں۔ اور کبھی خوش دہاں کے کلام سے ہمیں خوشبوؤں کا تحفہ عطا کرتے ہیں۔ خوش دہاں کا کلام ان کی آخری تصنیف ہے۔ ان تمام کتابوں میں صدیقی صاحب نے جو مقدمے تحریر فرمائے ہیں وہ نہایت عالمانہ ہیں ان میں تحقیق اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ ارشاد نامہ پر جو طویل مقدمہ انھوں نے رقم فرمایا ہے اس میں بہت سے لعل و گہر ہیں۔ ان مقدموں میں پہلا کام صدیقی صاحب نے یہ کیا کہ ان کتابوں کے خلاصے موجودہ اردو زبان میں لکھے ہیں اس لیے کہ اب اصل دکنی زبان کو سمجھنے والے کتنے ہیں؟ پھر ان کتابوں کی زبان کا لسانی مطالعہ کیا ہے اور دکنی قواعد کا استنباط بھی کیا ہے۔ زبان کے مطالعے سے اصول اخذ کیے ہیں۔ ہر کتاب میں مشکل الفاظ پر مشتمل ایک فرہنگ بھی مکمل گئی ہے جو کتاب کے آخر میں موجود ہے۔ صدیقی صاحب کے مقدمے خود کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ارشاد نامہ کا مقدمہ ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے اور اپنی جگہ پر مکمل کتاب ہے۔ پھر ہر کتاب پر تحقیق کرتے وقت صدیقی صاحب نے ان تمام نسخوں کو اپنے سامنے رکھا ہے جو مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ مثلاً چندر بدن مہیار پر جو مقدمہ لکھا ہے اس میں ان تمام کتابوں پر طویل مباحث الگ الگ ہیں جو اس قصے پر لکھی گئی ہیں: میری مراد ان نظموں سے ہے جن میں چندر بدن مہیار کا قصہ منظوم شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسی نظمیں گیارہ ہیں اور ہر نظم پر علاحدہ بحث کی گئی ہے۔ صدیقی صاحب نے اپنی تحقیقی بحثوں میں ان متعلقہ امور پر بھی نظر ڈالی ہے جن کا تعلق کتاب سے ہے۔ مثلاً ایک عمدہ بحث انھوں نے لفظ گجری پر کی ہے کہ گجری کس زبان کو کہتے ہیں ہر چند کہ اہلِ گجرات یہ تصور رکھتے ہیں کہ گجری وہ

ان ہے جو گجرات میں پروان چڑھی۔ یعنی اردو کی وہ شکل جس کا نشو و نما گجرات میں ہوا مگر اکبر الدین صدیقی صاحب اس تصور کے مخالف ہیں
وفیسر محی الدین قادری زور فرماتے ہیں کہ "جب اکبر نے گجرات کی مسلم حکومت پر قبضہ کر لیا اور اس پر مغل حکومت قائم ہو گئی تو گجرات
ء ادبا، شعرا اور علما نے دکن کی حکومتوں خصوصاً عادل شاہی حکومت کی طرف رجوع کیا اور وہ ان کے درباروں سے وابستہ ہو گئے ین
.ات کے باعث یہ ادبا۔ اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں جس کو وہ گجرات سے لائے تھے"

اکبر الدین صدیقی صاحب اس نظریے کو قبول نہیں کرتے اور وہ اپنا ایک الگ نظریہ قائم کرتے ہیں۔ ان کے نظریے میں وزن
سوس ہوتا ہے اس لیے کہ مثلاً برہان الدین جانم گجرات سے تشریف نہیں لائے تھے۔ وہ بھی اپنی زبان کو گجری زبان قرار دیتے ہیں۔ اس
.ے میں صدیقی صاحب اس طرح رقم طراز ہیں: "واقعہ یہ ہے کہ لفظ گجری نے گجرات سے متعلق ہو کر غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ میراں جی
نے تو اس کا نام بھی نہیں لیا لیکن جانم نے گجری کا لفظ استعمال کیا ہے اس کا تعلق گجرات سے نہیں ہے دکن کے اکثر قصبات میں خواہ حیدر آباد
است کے ہوں یا میسور ریاست کے، شاہراہ پر کسی مخصوص جگہ روزانہ بھاجی ترکاری یا دیگر ضروریاتِ زندگی کی یا مستعملہ سامان کی عارضی
کانیں لگتی ہیں اور بازار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چوں کہ یہ دکانیں مستقل نہیں ہوتیں اس لیے ان کا کاروبار دو تین گھنٹے سے زیادہ
یں ہوتا اور چوں کہ یہ گزرگاہ پر ہوتی ہیں اس لیے ان کو گزری کہا جانے لگا اور کثرتِ استعمال سے گجری ہو گیا۔ چناں چہ آج بھی اکثر قصبات
یہ بازار لگتے ہیں اور گجری ہی کہلاتے ہیں" (۲)۔

صدیقی صاحب دکنی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ محققین کی غلط فہمی کا باعث اردو کے دو روپوں قدیم اور جدید یا معیاری زبان کا
.ری ڈھانچہ ہے کیوں کہ اردو کے قدیم روپ FORM اور معیاری زبان کے روپ میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور یہ تغیرات اور
بابِ تحقیق اور ماہرینِ لسانیات کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ایک مکتبِ خیال ایسا بھی ہے جو اس سرمائے کو اپنانے سے انکار کرتا ہے اور
نی اور اردو کو علاحدہ شاخیں ماننے پر مصر ہے۔ دوسرا مکتبِ خیال ہندی کے ماہرین لسانیات کا ہے اس دور کو ہندی میں ملانے کا خواہاں ہے
روہ اودھی، کھڑی، برج، قنوجی، چھتیس گڑھی، اور بھوجپوری کی طرح دکھنی کو بھی ہندی کی ذیلی شاخ سمجھتے ہیں۔
اس میں شک نہیں کہ یہ نظریات بادِ ہوا ثابت ہوئے اور دکنی محققین نے مفروضات کے اس غبار کو جتنہ نشین کر دیا" (ارشاد نامہ
(۵،

سچی بات تو یہ ہے کہ صدیقی صاحب نے ارشاد نامے کے مقدمے میں بنیادی سوال اٹھائے ہیں اور عالمانہ بحثیں کی ہیں۔

صدیقی صاحب سے میرے تعلقات کی داستان اس دور سے شروع ہوتی جب میں نو عمر تھا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی
ری لے کر سری وینکٹیشور یونیورسٹی تروپتی میں لکچرر بن کر آیا تھا۔ پروفیسر عبد العلیم صاحب سابق وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی کی زیر
رانی میں نے عربی تنقید پر ریسرچ کیا تھا۔ مضمون نگاری کا شوق تھا۔ اس دور ہیں یعنی ۱۹۶۴ء میں صدیقی صاحب سب رس کے ایڈیٹر تھے۔
ں نے ایک مقالہ بھیجا فوراً کارڈ آیا کہ مقالہ فلاں ماہ میں شائع ہو گا۔ ان کے خطوط کا ایک ذخیرہ میرے پاس محفوظ ہے۔ پھر خطوط کا تبادلہ
ابر جاری رہا لیکن جب صدیقی صاحب نے سب رس کی ادارت چھوڑ دی تو خط و کتابت کم ہو گئی اس لیے کہ مضامین لکھنے کا سلسلہ باقی نہ

صدیقی صاحب ۳۱ برس سب رس کے مدیر رہے۔ اس عرصے میں وہ پابندیٔ وقت کے ساتھ رسالہ نکالتے رہے۔ اہلِ علم سے مقالات حاصل کرتے۔ خصوصاً خاص نمبر نکالنے میں ان کو مہارت تھی۔ سال میں دو نمبر تو روایتاً نکلتے تھے یعنی ادارہ نمبر اور قلی قطب شاہ نمبر۔ ان کے علاوہ خاص نمبر نکلتے رہتے تھے۔ خصوصاً غالب پر ایک ضخیم نمبر نکلا جو دو جلدوں میں ہے۔ فرماتے تھے کہ رسالے کو وقت پر نکالنے کے لیے یہ یک وقت ۳ شماروں کا مواد موجود رہنا چاہیے۔ سب رس کو نکالنے کے لیے ان کو چند مخصوص سہولتیں حاصل تھیں۔ ایک کاتب اور ایک پریس ان کے اختیار میں تھا۔ ان دونوں نے تا عمر ان کے ساتھ اخلاص و محبت کا معاملہ کیا۔ صدیقی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ان تعلقات کی وجہ سے کتابت اپنے اختیار میں رہتی ہے اور طباعت میں تاخیر نہیں ہوتی۔ بس پریس والوں کی یہ شرط تھی کہ پروف روکا نہ جائے۔ اس اصول پر صدیقی صاحب کار بند تھے۔ ان کو اردو کتابوں کے شائع کرنے کا خاص سلیقہ تھا اور ذوق بھی۔ اس فنی مہارت کی وجہ سے انھوں نے اپنی تمام کتابیں خود شائع کیں اور درجنوں کتابیں دوسرے مصنفین کی اپنی نگرانی میں شائع کرائیں ان پر محنت صرف کی اور ان کے پروف پڑھے اردو مصنفین کی اس طرح مدد کر کے ان کو حقیقی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

میں ترو پتی یونیورسٹی میں کام کر رہا تھا کہ میرے پیر کی ہڈی میں جوڑ پر درد شروع ہوا۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب میرے شعبے میں لکچرر تھے انھوں نے مشورہ دیا کہ نظام نے ایک ہاسپٹل نیا نیا کھولا ہے اس کا نام ہے نظام آرتھوپیڈک ہاسپٹل۔ وہ صرف ہڈی کے امراض کے لیے ہے۔ مجھے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی اسکیم کے مطابق ایک لکچر رائے درگ میں دینا تھا۔ لہذا میں جامعہ محمدیہ رائے درگ گیا۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب بانی جامعہ محمدیہ اس وقت حیات تھے وہ خود جلسے میں شریک ہوئے۔ میں اردو میں زبانی لکچر دے رہا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ عربی میں بولیے۔ ندوے کی تعلیم کا فیض تھا کہ میں نے باقی لکچر عربی میں دیا۔

اتفاق دیکھیے کہ اس دن حضرت سلطان العلوم نظام آصف جاہ سابع عثمان علی خاں کا انتقال ہوا تھا فضا سوگ وار تھی۔ میری تقریر ختم ہوتے ہی مائک مولانا اسماعیل صاحب نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آصف جاہ سابع پر ایک عالمانہ تقریر فرمائی۔ فرمایا کہ آج سے حقیقی طور پر ہمارا تاریخی اور تہذیبی رشتہ مغلوں سے منقطع ہو گیا۔ مغلیہ سلطنت کی وارث حکومت و ریاست کا تصور اس آخری نظام کی موت سے ذہن سے جاتا رہا۔ مولانا اسماعیل صاحب نے آصف جاہ سابع کا ایک واقعہ بیان کیا کہ وہ سری رنگاپٹنم کے پاس سے گزر رہے تھے جب قریب پہنچے تو حکم دیا کہ کھڑکی بند کر دو تاکہ سلطان کی روح کو میرے گزرنے سے تکلیف نہ پہنچے ان تاریخی واقعات کے باعث جن میں نظام کی فوجیں سلطان کے خلاف انگریزوں سے مل کر لڑی تھیں۔ لطف یہ آیا کہ جب مولانا اسماعیل صاحب نے فرمایا کہ کھڑکی بند کر دو تو فوراً مدرسہ محمدیہ کے ایک طالب علم نے دوڑ کر سامنے کی کھڑکی بند کر دی۔ حالاں کہ انھوں نے یہ قول نظام کا نقل کیا تھا۔ اس پر مجمع قہقہہ زار بن گیا۔

الغرض میں رائے درگ سے چل کر صبح سویرے نظام ہسپتال پہنچا۔ اس حسنِ اتفاق پر دل پھولے نہ سمایا کہ ایک طرف سامنے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی عمارت کھڑی تھی اور دوسری طرف ہسپتال کی بلڈنگ۔ صبح کا سہانا سماں تھا۔ دل کو بڑی خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور فرمایا کہ ہڈی کی ٹی۔ بی ہے ہسپتال میں داخل ہو جایئے ر۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ہسپتال میں داخلہ لے لیا۔ پھر میں نے پروفیسر اکبرالدین صدیقی صاحب کو مطلع کیا اور اپنا حال زار بتایا۔ وہ سراپا محبت و شفقت فوراً اپنی کار سے آگئے۔ تسلی و تشفی دی ہر بار گھر کا پکا ہوا کھانا ساتھ لاتے۔ خوب دیر تک بیٹھتے میں تو وقت خالی کر کے آیا تھا۔ کام کچھ نہ تھا۔ چالیس دن داخل دفتر رہا پھر ڈاکٹر نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو آپ کی ٹانگ کا

یشن ہو گا ۔ ٹانگ ۲ سے ۸ انچ تک چھوٹی ہو جائے گی مگر اونچے جوتے سے اس کی تلافی کر دی جائے گی ۔ میں نے صدیقی صاحب سے یہ معاملہ
ل کیا وہ خاموش رہے ۔ رات کو میں نے غور کیا کہ دو برس سے یہ ہلکا درد مجھ کو ہے اگر ٹی ۔ بی ہوتی تو بغیر دوا علاج کے کام تمام ہو چکا ہوتا ۔ ا
، پڑوسی مریض سے میں نے مشورہ کیا کہ پہلے ہندستان کے مشہور ہسپتال ویلور کرسچین کالج میں دکھالوں تو پھر آپریشن کے معاملے پر غور
مائے ۔ وہ ہسپتال ترو پتی سے صرف ۷۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ ان پڑوسی مریض نے میری تائید کی ۔ پھر جب صدیقی صاحب حسب
ل تشریف لائے تو میں نے ان سے مشورہ طلب کیا ۔ انھوں نے بھی اس امر کی تائید کی اور فرمایا کہ ویلور کا شفاخانہ عالمی شہرت کا حامل ہے
وہاں ضرور جائیں ۔ ویلور میں ایک اہم عربی مدرسہ باقیات الصالحات ہے جس کو جنوبی ہند کا دیو بند کہا جاتا ہے وہاں اس دور میں مہتمم
ناسید صبغۃ اللہ بختیاری صاحب قدس سرہ تھے ۔ وہ ایک بڑے عالم دین تھے وہاں میں چالیس دن رہا ۔ وہاں خوب علمی مباحث چھڑتے ۔
نا مجلسی گفتگو کے امام تھے ۔ ساری مجلس زعفران زار بنی رہتی ۔ مولانا بختیاری صاحب عمدہ شاعر بھی تھے ۔ ان کا تخلص وفا تھا ۔ بلا مبالغہ
، کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنا پورا دیوان بڑی سرشاری سے مجھ کو سنا ڈالا ۔ مولانا بولتے زیادہ تھے ایک دن فرمایا کہ جب سے آپ ی آئے
تنا بولتا ہوں کہ تھک جاتا ہوں ۔

ویلور کے ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ ہڈی ٹھیک ہے گوشت میں انفکشن ہے پنسلین کے انجکشن لگائے اور میں چنگا ہو گیا ۔ اللہ کا شکر ادا
، ٹانگ کٹتے کٹتے بچی ورنہ تیمور لنگ کہلاتا ۔

الغرض اس واقعے کی وجہ سے حضرت صدیقی صاحب کا تعلق جو کتابی تھا اور خطوط کے ذریعے قائم تھا حقیقی بن گیا اور چوں کہ ان کے
کار تھی اور پوری عمران کو یہ عظمت حاصل رہی مگر آخر میں پٹرول کی الرجی ہو گئی تھی جس کے باعث کار فروخت کرنی پڑی ۔ حیدر آباد میں
لیس دن میں نے گزارے اس اثنا میں بقر عید پڑی ۔ پرہیز میرے لیے کچھ نہ تھا ۔ بقر عید کے دن حضرت صدیقی صاحب کے گھر سے بہت کچھ
ر میں بھی انواع و اقسام کے کھانے دیکھ کر اپنی بیماری بھول گیا ۔ حضرت صدیقی صاحب بہت دیر تک تشریف رکھتے اور گفتگو ساری علمی
تی ۔ اس طویل گفتگو میں مختلف مواقع پر صدیقی صاحب نے ایسے ایسے راز کھولے کہ میں انگشت بہ دنداں رہ گیا ۔ فرمایا کہ مولوی
یل پانی پتی نے مولانا حالی کے مضامین کا ایک مجموعہ جمع کیا تھا اور پھر اس کو مولوی عبد الحق صاحب بابائے اردو کے حوالے کر دیا ۔ جب
اسلے چھپے تو ان پر مولوی صاحب کا نام تھا ۔ شیخ چاند کے بعض مقالات اور کتابوں کے بارے میں بھی انھوں نے یہی انکشاف کیا مگر اب
ن کے نام یاد نہ رہ گئے ۔

میرے حیدر آباد کے اس طویل قیام کے دوران صدیقی صاحب کے ساتھ دو بار اس بیمار کی عیادت کے لیے حضرت وقار خلیل صاحب
ریف لائے اور ادارۂ ادبیات اردو کے ایک مخلص کار پرداز محترم جمال الدین صاحب نے بھی اس اجنبی مریض کی عیادت کی ۔

پھر وہ وقت آیا کہ پروفیسر صدیقی صاحب ریٹائرڈ ہوئے اس کے معاً بعد میسور یونیورسٹی کی بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ میں شرکت
، میسور تشریف لائے وہاں سے محض مجھ سے ملنے کے لیے کالی کٹ یونیورسٹی تشریف لائے ۔ میں ڈاکٹر قدرت اللہ صاحب اور پروفیسر
ا تینوں مل کر کالی کٹ شہر گئے وہاں سمندر کا ساحل دیکھا ۔

صدیقی صاحب سے میں نے شکایت کی کہ لکھنے کی کثرت کے باعث درمیانی انگلی میں گھٹا پڑ گیا ہے اس پر خود انھوں نے مجھے اپنی انگلی

دکھائی اور فرمایا کہ یہ گھٹا بڑھتا رہتا ہے اور میں اس کو کاٹتا رہتا ہوں۔

صدیقی صاحب نے خدا کے فضل سے دو حج کیے۔ ایک حج کے موقعے پر میں نے فرمائش کی کہ میرے لیے کچھ کتابیں خرید کر اپنے ساتھ لائیں چناں چہ وہ میری فرمائش پر کتابیں ساتھ لائے اور ان کو پارسل سے مجھے روانہ کر دیا۔

ان کو کتابوں سے عشق تھا۔ وہ کتابیں خریدتے تھے اور جمع کرتے تھے اس شوق کے نتیجے میں ان کا اپنا ایک کتب خانہ تیار ہو گیا۔ میں ان کے گھر میں قیام کرتا۔ ایک بار فرمایا کہ چلیے آج میں آپ کو اپنا کتب خانہ دکھاؤں۔ کتابیں کچھ نیچے کمرے میں تھیں مگر بڑا حصہ دوسری منزل پر ایک بڑے کمرے میں تھا۔ پورا کمرہ کتابوں سے پر تھا۔ اس ذخیرے میں خصوصیات دکنیات کی تھی۔ صدیقی صاحب نے دکنی مخطوطات بھی کافی جمع فرمائے تھے اور ان کو منھ مانگی قیمتیں دے کر خریدا تھا۔ ایک بار مجھ کو بھی لکھا کہ مخطوطات کی تلاش ترو پتی میں قدیم گھرانوں میں کروں، پیسوں کی پروانہ کیجیے۔ ان کے کتب خانے کی دوسری خصوصیت رسالے ہیں۔ ان کے پاس ہندستانی اور پاکستانی رسائل و مجلات کا بڑا ذخیرہ تھا۔ معارف و آج کل وہ خریدتے تھے باقی رسائل ان کی علمی عظمت کے باعث ان کے پاس آتے تھے۔

میری کتاب عصرِ حاضر کی اسلامی تحریکیں شائع ہوئی اور معارف میں اس پر تبصرہ نکلا۔ فوراً خط آیا کہ آپ کی کتاب پر تبصرہ میں نے معارف میں پڑھا ہے۔ میں شرمندہ ہوا اور خدمت میں کتاب نذر کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے، کتاب پڑھوا کر سنی اور بعض امور کی وضاحت طلب کی۔ یہ ان کا خلوص تھا۔

میں نے یہ تجویز پیش کی کہ کتب خانے کو وقف کر دیجیے اور وہ اسی گھر میں رہے۔ فرمایا کہ ارادہ یہ ہے کہ اس کتب خانے کو نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کو دے دوں اور وہ ایک الگ ذخیرے کے طور پر وہاں محفوظ رہے گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ پورا ذخیرہ نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری چلا گیا اور وہاں اس نیک نفس، عاشقِ دکن اور عالمِ دکنیات کے علمی شوق کی یہ شمع روشن ہے۔

رابطہ ادبِ اسلامی کا ایک سیشن حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ میں پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب اور دوسرے اصحابِ علم کے ساتھ اسکائی لائن ہوٹل میں ٹھہرا۔ میں نے صدیقی صاحب سے ان کے گھر نہ ٹھہرنے کی معذرت کی اور ان سے عرض کیا کہ آپ بھی جلسے میں شرکت فرمایے وہ بولے کہ میں تو اسلامیات میں کیا جانتا ہوں۔ یہ ان کی خاکساری تھی ورنہ دکنیات پر مہارت کے باعث ان کی نظر سلاسلِ تصوف پر عالمانہ تھی۔ ان کی مرتب کردہ کتابیں اس امر پر شاہد عادل ہیں۔

صدیقی صاحب کا ڈرائینگ روم بہت مرصع تھا اس میں اساطین اردو کی عمدہ تصویریں فریم کی ہوئی آویزاں تھیں۔ میں اس میں قیام کرتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ کہیں زور صاحب کھڑے ہیں کسی طرف سے مولوی عبدالحق صاحب تشریف لا رہے ہیں کہیں غالب تشریف فرما ہیں اور کہیں میر۔ مغرب بعد صدیقی تشریف لاتے اور تقریباً ۱۰ بجے تک گفتگو کرتے رہتے۔ اس علمی گفتگو کا موضوع دکنی ادب یا آخری نظام کے عمدہ کارناموں کا ذکر ہوتا۔ فرمایا کہ جب پہلی بار حیدرآباد شہر میں نل کا پانی سپلائی کیا گیا تو وزیرِ اعظم نے نظام کے سامنے پانی کے ٹیکس کا فائل رکھا۔ نظام نے کہا کہ کیا میں اپنی رعایا سے پانی کا ٹیکس لوں گا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

صدیقی صاحب کو حکومت آصفیہ کے بارے میں جتنی معلومات تھیں اب ان کا عشرِ عشیر بھی کسی کو نہیں معلوم۔ میں نے عرض کیا کہ ان معلومات کو املا کرا دیجیے تو یہ محفوظ ہو جائیں۔ صدیقی صاحب نے سنا اور مسکرا کر چپ ہو گئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب کا

خط یہاں پیش کروں جس سے ان کے اندازِ تحریر کا بھی اندازہ ہوگا اور مصروفیات کا بھی۔

۱۹۷۲/۶/۲۴ء

محب مکرم   سلام مسنون

گرامی نامہ ملا میں نے کتابوں کے دو نسخوں کے پہنچنے کی اطلاع دی تھی (۳) شاید آپ اس وقت نکل گئے ہوں اور خط آپ تک نہ پہنچ سکا (۴) عربی ادب سے متعلق میں کیا رائے دے سکتا ہوں سب رس میں تبصرے کے لیے کسی اور کو دوں گا۔ میں دس جون کو دلی گیا۔ لٹریری سب کمیٹی کی میٹنگ تھی۔ احتشام صاحب بھی آئے تھے ان سے آپ کی کتاب کا ذکر آیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اوپر نام کچھ ہے اور اندر کچھ (۵) اب آپ انھیں دوسری ایک نام والی مجلد کتاب بھیجے۔ میں یہاں سے بھیجتا تو اس پر آپ کی تحریر نہ ہوتی اور ممکن ہے کہ انھیں ناگوار ہوتا۔ آپ مبارک ہیں کہ ماجد صاحب نے آپ کی خاطر سفر کی زحمت گوارا کی (۶)۔

آپ نے مقالہ "گجری کی تحقیق" لکھا اور ہماری زبان میں بھیج دیا اب شائع ہو تو دیکھوں گا (۷) دیر نہیں ہوگی اب وہ پندرہ روزہ ہوگیا ہے۔ گجری میرے مفہوم میں گزری ہی ہے کوئی مانے یا نہ مانے۔ اس لفظ نے ماہرین لسانیات کو تو چونکا دیا ہے۔ اور ابوالکلام کے متعلق کیا خیال ہے؟ (۸)

اکبرالدین

وہ دکنیات کی آبرو تھے۔ وہ شرافت، انسانیت اور اعلیٰ اخلاق کے علم بردار تھے، مخلص، نیک نیت، مددگار اور دوسروں کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اردو کے مصنفین کی مدد کر کے وہ خوش ہوتے تھے۔ خدا معلوم کتنے مصنفینِ اردو کی کتابیں شائع کردیں۔ ان کے پروف دیکھے اور ان پر اپنا وقت صرف کیا۔ میری چار کتابیں انھوں نے شائع کیں اور دو کو فروخت بھی کردیا۔ ایک کتاب "تنقیدی نظریات کا مطالعہ" ادیب فاضل میں ان کی عنایت سے مقرر ہوگئی اور خود وہ ناظم امتحانات تھے کتابیں فروخت کر کے برابر ہزار دو ہزار روانہ فرماتے رہتے۔ میں نے صدیقی صاحب کو لکھا کہ آپ کی اسٹیٹ میں ایک دکان خیاط کی ہے۔ بادامی رنگ کی شیروانی چاہتا ہوں۔ ناپ انھوں نے درزی کے پاس رکھوادی تھی۔ بس شیروانیاں برابر حیدرآباد سے وہ مجھے پارسل کردیا کرتے تھے۔ اس پر مجھے یہ واقعہ یاد آیا کہ پروفیسر محمد مجیب صاحب رہتے تھے جامعہ ملیہ دہلی میں مگر ان کی شیروانیاں لکھنؤ میں باقر درزی کے یہاں سل کر پارسل سے آتی تھیں ان کا ایک نظام تھا اس بارے میں۔۔ صدیقی صاحب کے خطوط میں بھی شیروانیوں کا ذکر ہے۔

صدیقی صاحب نے آغاپورہ میں ایک عمدہ بنگلہ بنوایا تھا جو نہایت وسیع سڑک پر تھا۔ وہ چوراہا تھا اس پر بنا پر چار قندیلیں روشن تھیں۔ ایک لطیفہ یہ پیش آیا کہ میں کافی عرصے کے بعد حیدرآباد گیا اور آغاپورہ پہنچا۔ صدیقی صاحب کا گھر بھول گیا ایک دوسرے گھر میں پہنچا صاحب خانے بولے کہ ایک پروفیسر سامنے رہتے ہیں ان سے مل لیجیے۔ وہ بھی پروفیسر ہی ہیں۔ خیر میں نے حاضری دی اور یہ واقعہ بیان کیا۔ صدیقی صاحب مسکرائے۔ صدیقی صاحب نے چار دوکانیں اور ایک مکان تعمیر کیا۔ ان دکانوں سے ان کو آمدنی ہوجاتی تھی۔ ماشاء اللہ ہمیشہ وہ خوش حال رہے اعلیٰ زندگی گزاری۔ پوری عمر وہ کار نشیں رہے۔ ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک انٹرویو میں شرکت کے لیے گیا صدیقی صاحب صبح کو مجھے اپنی کار سے لے کر عثمانیہ یونیورسٹی تشریف لے گئے اور ۴ گھنٹے اپنی کار میں بیٹھے میرا انتظار کرتے

ہے ۔ جب میں سارے کام سے فارغ ہو گیا تو پہلے صدر شعبہ عربی کو اپنی کار سے آرٹس کالج میں چھوڑا اور مجھے لے کر اپنے گھر آئے ۔ اتنا اخلاق اور ایسا خلوص میں نے کم انسانوں میں دیکھا ہے ۔ وہ حیدرآباد جس کی درباری سازشوں سے مولانا شبلی گھبرا گئے تھے اسی حیدرآباد میں اکبرالدین صدیقی جیسے انسانیت دوست، اعلیٰ اقدار کے حامل، خلوص کا مجسمہ اور اردو کے لیے اپنی زندگی کو قربان کرنے والے اور دکنیات پر جان دینے والے کم نظر آتے ہیں جن کے ذکر سے دلوں کو روشنی ملتی ہے جس سے بھی ان کا ذکر آتا ہے وہ ان کی محبت و خلوص میں سرشار نظر آتا ہے ۔ دلی، لکھنو اور علی گڑھ کے اساطینِ اردو کے بارے میں بہت سی کہانیاں اور قصے سننے کو ملتے ہیں مگر صدیقی صاحب کے بارے میں صرف محبت و خلوص کی چاندنی ہی ہر طرف نظر آتی ہے ۔ ان کی شخصیت اور ان کے پاکیزہ اعمال پر علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار صادق آتے ہیں:

خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی ، اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل ، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب ، اس کی نگہہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل و پاک باز
اس کا مقام بلند ، اس کا خیالِ عظیم — اس کا سرور اس کا شوق ، اس کا نیاز ، اس کا ناز

حواشی:

(۱) ان کا گھر محلہ آغاپورہ چار قندیل کے سامنے واقع ہے ۔

(۲) ارشاد نامہ مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی ۱۹۷۱ء شائع کردہ شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی ۔ حیدرآباد ۔ ص ۴۲

(۳) میری کتاب عربی شاعری کے جدید رجحانات ۔

(۴) میں علی گڑھ کے سفر میں تھا۔

(۵) میری کتاب "تنقیدی نظریات کا مطالعہ" پروفیسر احتشام حسین صاحب کے مقالے کے ساتھ شائع ہوئی ۔ اس کا نام پہلے تنقید کے اصول و نظریات" رکھا تھا بعض نسخوں میں اندر یہی نام رہ گیا۔

(۶) ادیب کبیر مولانا عبدالماجد دریاآبادی سے میں نے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا ۔ انھوں نے لکھا میں تو ابھی لکھنو سے آیا ہوں ۔ اب آپ صبح دس بجے بارہ بنکی اسٹیشن آجائیے ناشتہ میری طرف سے ہوگا ۔ چنانچہ حضرت تشریف لائے اور تین گھنٹے گفتگو ہوئی ۔ میں نے اس کو قلم بند کر لیا ہے ۔

(۷) بعد میں رائے بدل گئی اور معارف کو بھیج دیا اور مقالہ شائع ہو گیا۔

(۸) پروفیسر سید رضی الدین احمد کی ضخیم تصنیف ۔

○ ○ ○

وقار خلیل

ادارے کی خبریں

ooo ڈاکٹر زور کی صاحبزادی تہذیب یحییٰ فاروقی ایوان اردو میں

شعبہ خواتین ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ایوان اردو پنجہ گٹہ میں ۱۵/ستمبر ۱۹۹۶ء دن گیارہ بجے محترمہ تہذیب فاروقی، محترمہ توقیر قیوم دختران ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی تقریب کا انعقاد کیا گیا ہے جلسے کی صدارت محترمہ صفیہ انکولوی ماہر تعلیم ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات حکومت مہاراشٹرا نے کی اور ڈاکٹر اشرف رفیع صاحبہ نے کاروائی چلائی۔ تہذیب یحییٰ فاروقی تقریباً ایک دہے کے بعد اپنی والدہ محترمہ تہنیت صاحبہ کی عیادت کے لیے پاکستان سے تشریف لائی ہیں ان کے ہمراہ ان کی ہمشیرہ محترمہ توقیر قیوم صاحبہ بھی آئی ہوئی ہیں۔ شعبہ خواتین میں ان دونوں مہمانوں کا خیر مقدم کیا گیا۔ آغاز میں ڈاکٹر اشرف رفیع نے جو ویمنس کالج کوٹھی، حیدرآباد میں تہذیب صاحبہ کی ہم جماعت رہیں، اپنے زمانے کے طالب علمی کی بہت سی یادیں تازہ کیں۔ انھوں نے کہا کہ تہذیب صاحبہ اسم با مسمیٰ طالبہ رہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے حسن صورت سے تو نوازا تھا، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور محترمہ تہنیت صاحبہ کی تربیت نے حسن اخلاق میں یکتا کر دیا تھا۔ تہذیب اپنے وقت کی بہترین طالبہ رہیں اور اپنی ہم عمر لڑکیوں میں بڑی مقبول رہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے تہذیب صاحبہ کو شعر و شاعری سے شغف رہا اور ادبی سرگرمیوں میں بھی ان کا نام بڑا معتبر سمجھا جاتا رہا۔ شادی کے بعد پاکستان منتقل ہوگئیں اور اب کراچی یونیورسٹی میں عربی کی استاذ ہیں چوں کہ اردو سے شغف ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ یہ اپنی ادبی سرگرمیوں میں آج بھی فعال ہیں۔ ڈاکٹر اشرف رفیع نے کہا کہ ان کی بہن توقیر قیوم بھی کراچی میں اردو کی ایک فعال کارکن ہیں۔

محترمہ تہذیب یحییٰ فاروقی صاحبہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس ادارے کی بنیاد میں نہ صرف ان کے والد محترم ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا بلکہ ان کی والدہ محترمہ تہنیت النساء صاحبہ (اردو کی پہلی صاحب دیوان نعت گو شاعرہ) کا ایثار اور ان کے تمام بھائیوں اور بہنوں کی چھوٹی چھوٹی محنتیں اور خون پسینہ بھی شامل ہے۔ شعبہ خواتین جو دراصل ۱۹۳۸ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کی کارکردگی پر انھوں نے خوشی اور طمانیت کا اظہار کیا۔

پاکستان میں اردو شاعری کے منظر نامہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے محترمہ ادا جعفری، نزہت اکرام، نجمہ خان کا نام خاص طور پر لیا اور کہا کہ پروین شاکر ایک ایسی شعری آواز تھی جس کی گونج میں بہت سی آوازیں دب گئی تھیں۔ پروین شاکر کے انتقال کے بعد بہت سے نام ابھر کر آنے لگے ہیں۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ نے پاکستان میں اردو کی بقا اور ترویج کے بارے میں کچھ سوالات کیے جن کا تہذیب یحییٰ فاروقی صاحبہ نے اطمنان بخش جواب دیا۔ محترمہ توقیر صاحبہ نے بھی جلسے کو مخاطب کیا۔ محترمہ صفیہ انکولوی صاحبہ نے اپنے صدارتی خطبے میں اس خصوصی اجلاس کے انعقاد پر اور شعبہ خواتین کی کارکردگی پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اختتام سے قبل محترمہ اشرف رفیع نے مرحوم شعرا جناب امیر احمد خسرو اور جناب برق یوسفی کے انتقال پر تعزیتی قرارداد منظور کی اور دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔ آخر میں ڈاکٹر اشرف رفیع کے شکریے پر یہ کامیاب محفل اختتام کو پہنچی۔ بعد ازاں ایک غیر رسمی مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔

٥٥٥ ادبی اجلاس: شعبہ خواتین، ادارہ ادبیات اردو

شعبہ خواتین، ادارہ ادبیات اردو کا خصوصی ادبی اجلاس ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۶ء گیارہ بجے دن ایوان اردو پنجہ گٹہ میں منا
صحافی شاعرہ محترمہ نور جہاں ثروت صاحبہ کا خیر مقدم کیا گیا۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے کی اور محترمہ ساجدہ خاتوا
(بیگم یونس سلیم صاحب) نے بحیثیت مہمانان خصوصی شرکت کی۔ شعبہ خواتین کی معتمد پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ نے اجلاس ک
چلائی۔

اس اجلاس میں محترمہ قمر جمالی نے اپنا افسانہ "الاؤ" تبصرے کے لیے پیش کیا اور مہمان شاعرہ محترمہ نور جہاں ثروت صاحب
شعری تخلیقات سے نوازا۔ علاوہ ازیں اجلاس میں موجود شاعرات کا کلام پیش کیا گیا۔ اجلاس میں خواتین و حضرات کی خاصی تعداد شرک
آغاز میں پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ نے مہمان شاعرہ، صحافی نور جہاں ثروت صاحبہ کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ محترمہ اردو کی بہترین
صحافت میں ان کے نام ایوارڈز کی طویل فہرست شامل ہے۔ "بے نام شجر" ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔

محترمہ قمر جمالی کے افسانے "الاؤ" پر تبصرے کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ نے کہا کہ قمر جمالی پلاٹ کا تا
میں خاصی مہارت رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں بیانیے کی خوب صورتی، کشمکش احساس اور تجسس قاری کی توجہ کو پوری طرح اپ
میں کر لیتے ہیں۔ انھوں نے بہت کم مدت میں افسانوی میدان میں اپنے لیے ایک علاحدہ راہ بنالی ہے جس کی وجہ ان کا نام معتبر افسانہ
کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ جناب راشد آزر نے کہا کہ یہ افسانہ ایک اپاہج کی اندرونی کشمکش کا احاطہ کرتا ہے۔ افسانہ نگار
کوڑھی کے جذبات کی عکاسی نہایت چابک دستی سے کی ہے۔ افسانے کی کامیابی ایک نہایت شکست خوردہ کردار کو ایک مثبت
حیثیت سے تسلیم کروانا ہے۔ اس افسانے میں قمر کی فنی ارتقاہی نہیں بلکہ زبان و بیان پر گرفت بھی کافی مضبوط ہے جو مستحسن ہے۔
حسین نے کہا کہ سماج کا ایسا کردار جو ہر طرح سے ناقابل توجہ ہے اس پر قلم اٹھانا بڑی ہمت کی بات ہے جس کے لیے قمر جمالی مبارک
مستحق ہیں۔

محترمہ نور جہاں ثروت صاحبہ نے اپنی شعری تخلیقات پیش کرنے سے قبل کہا کہ وہ حیدر آباد پہلی مرتبہ آئی ہیں مگر انھیں
طرح اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ یہاں کے ادیبوں، شاعروں بالخصوص خواتین کی ادبی سرگرمیوں کو دیکھ کر انھیں بے پناہ مسرت ہو
انھوں نے دو نظمیں اور دو غزلیں پیش کیں جنھیں سامعین نے بہت سراہا۔ بعد ازاں محترمہ بشریٰ عبد الواحد صاحبہ، محترمہ سلطا
الدین صاحبہ، محترمہ ساجدہ خاتون صاحبہ، ڈاکٹر اشرف رفیع اور محترمہ سیدہ مہر نے اپنا کلام پیش کیا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعی
نے اپنے قیام پاکستان کے دوران تخلیق کیے گئے کچھ ہائیکو اور نثری نظمیں سنائیں۔

صدر جلسہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید صاحبہ نے قمر جمالی کا افسانے اور تمام شاعرات کے کلام کی تحسین کی۔ انھوں نے کہا کہ مہما
محترمہ نور جہاں ثروت صاحبہ اپنی نظموں اور غزلوں میں ایک منفرد لب و لہجے کی حامل ہیں۔ ان کے اشعار میں شعری روایت کے ساتھ
حسیت انھیں معتبر شاعرہ کا درجہ عطا کرتی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر اشرف رفیع صاحبہ کے شکریے پر یہ کامیاب محفل اختتام کو پہنچی۔

○○○ امتحانات ادارہ ادبیات اردو

۱۴ تا ۱۶ / اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات اردو ماہر، اردو عالم اور اردو فاضل ایک ساتھ حیدرآباد اور اضلاع کے مراکز پر منعقد ہوئے۔ حیدرآباد میں امتحانات کا مرکز برائے ذکور و اناث اردو ہال حمایت نگر رہا۔ دوران امتحانات صدر ادارہ پروفیسر جعفر نظام، معتمد عمومی ادارہ پروفیسر مغنی تبسم، معتمد شعبہ امتحانات پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ، شریک معتمد امتحانات ڈاکٹر محمد انور الدین نے معائنہ کیا۔ ڈاکٹر عطاء اللہ خان اور وقار خلیل نے صدور نگران کار مرکز حیدرآباد کے فرائض انجام دیے۔

اضلاع محبوب نگر، نلگنڈہ، کریم نگر، نظام آباد، کرنول، گلبرگہ (کرناٹک)، نارائن پیٹھ، ملی پلی (بیدر)، مدور منڈل، سنگاریڈی، کاماریڈی، ٹیکمال، پوچم پاڈ پراجکٹ، شمس آباد، درگاہ جہانگیر پیراں، دھارور منڈل کے مراکز پر امتحانات منعقد ہوئے۔ ریاستی انجمن ترقی اردو کے اضلاعی نمائندوں نے ان مراکز کا دوران امتحان معائنہ کیا۔ جملہ (731) امیدواروں نے امتحانات میں شرکت کی۔ اردو ماہر میں (135) اردو عالم میں (181) اور اردو فاضل میں (415) امیدواروں نے فارمس داخل کیے۔

ادارے کے امتحانات اردو عالم اور اردو فاضل کو علی الترتیب ایس ایس سی اور انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیے جانے کے سلسلے میں ادارے کی طرف سے ریاستی وزیر اعلیٰ تعلیم جناب بشیرالدین بابو خاں اور بورڈ آف انٹرمیڈیٹ کے عہدے داروں سے مشاورت و مراسلت کے مراحل زیر دوران ہیں، ان امتحانات کے نصاب کی از سرنو ترتیب و تشکیل کے مراحل طے پارہے ہیں۔

○○○ ادبی اجلاس یوم زور

دبستان دکن کے نامور محقق، نقاد اور ادارہ ادبیات اردو کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی **۴۴ ویں برسی کے موقع پر اتوار ۲۹ / ستمبر ۱۹۹۶ کو ۱۱ بجے دن** "ایوان اردو" میں یوم زور کا ادبی اجلاس پروفیسر جعفر نظام صاحب صدر ادبیات اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر زور کے تحقیقی کارناموں پر عثمانیہ یونیورسٹی سنٹرل یونیورسٹی اور ایس وی یونیورسٹی کے پروفیسر دیگر اسکالروں نے گراں قدر مقالے پیش کیے اور ڈاکٹر زور کی دکنیات شناسی، تحقیقی شعور اور خطہ دکن سے ان کی والہانہ وابستگی کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ ابتدا میں پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ نے خیر مقدمی خطاب کرتے ہوئے یوم زور کے اس اجلاس کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر زور کے علمی ادبی اور تحقیقی کارنامے تاریخ ادب کا ناگزیر حصہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر زور نے اپنی تحقیق سے اردو ادب کی تاریخ میں اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے جامعات میں ریسرچ کی رفتار پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دکنی اردو اور حیدرآباد کے ادب پر خاطر خواہ ریسرچ کی ضرورت ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں دکنی پر کچھ کام ضرور ہوا ہے مناسب ہوگا کہ حیدرآباد کی یونیورسٹیوں میں دکنی زبان و ادب کا پوسٹ گریجویشن ڈپلوما کورس شروع کیا جائے تاکہ اسکالرز دکنیات پر کام کرنے کی اہلیت پیدا کریں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "پروفیسر زور کے تحقیقی مضامین" کے زیر عنوان بسوط مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر زور کی دو کتابوں ادبی تحریریں اور نگارشات زور کے علاوہ دیگر تحقیقی مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی دکنیات شناسی اور علمی و ادبی اسلوب نگارش کو خراج ادا کیا۔ ڈاکٹر محمد انور الدین صدر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد نے ڈاکٹر زور کی مرتبہ تواریخ ادب و تذکرے کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اس ضمن میں ڈاکٹر زور کی تصانیف اردو شہ پارے، تاریخ ادب اردو، دکنی ادب کی تاریخ اور داستان ادب حیدرآباد کا جائزہ لیا اور کہا کہ دکنی اور آصف جاہی دور کے ادب منظر عام پر لانے میں ڈاکٹر زور کا اہم حصہ رہا ہے۔ اردو شہ پارے میں ولی سے قبل کی ادبی اور

شعری تاریخ کو ڈاکٹر زور نے مستند مخطوطات کی روشنی میں پیش کر کے اہم خدمت دی۔ پروفیسر اشرف رفیع نے ڈاکٹر زور کی اہم تصنیف "ہندوستانی صوتیات" پر مقالہ پیش کیا اور کہا کہ یہ کتاب ہندوستانی لسانیات اور صوتیات شناسی میں اولیت رکا مقام رکھتی ہے۔ پروفیسر صاحبہ نے کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے آنے والے تعلیمی سال میں ایم اے کے لیے ایک خصوصی پرچہ ڈاکٹر زور اور دکنیات پر بھی رہے گا۔ محترمہ نے ایک تجویز یہ بھی اجلاس میں پیش کی کہ ادارہ ادبیات اردو میں ایک گوشہ زور کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ڈاکٹر داؤد اشرف نے ادارہ ادبیات اردو کو حکومت حیدرآباد کی امداد کے موضوع پر ریاستی دفتر اسناد کے ریکارڈز کی روشنی میں تحقیقی مضمون پیش کیا اور کہا کہ ادارے کی طرف سے اس کے بانی معتمد ڈاکٹر زور نے اردو پریس کے قیام کے لیے ۱۹۴۴ء میں درخواست دی تھی جسے محکمہ تعلیمات اور حضور نظام نے منظور کیا تھا۔ پچاس ہزار روپیے کی اس امداد سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں استفادہ نہ کیا جاسکا البتہ ایوان اردو کی تعمیر کے سلسلے میں ادارے کو حکومت حیدرآباد کی گرانٹ جو محفوظ تھی تعمیر کے لیے حاصل ہوسکی۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے ڈاکٹر زور کی مرتبہ تذکرہ مخطوطات ادارہ کی ۵ جلدوں پر مقالہ پیش کیا اور کہا کہ ڈاکٹر زور نے نصف صدی تک دکن اور دکنیات پر مسلسل تحقیق کر کے گراں قدر خدمات انجام دیں وہ دکنی کے عاشق تھے اور اس عشق کا علمی اظہار تذکرہ مخطوطات کتب خانہ ادارے کی پانچ جلدوں میں نظر آتا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر اثر نے ڈاکٹر زور کو منظوم خراج عقیدت بھی ادا کیا اور داد پائی۔ ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے "قدیم متون کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر زور کا حصہ" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر زور کی مرتبہ کتابوں کلیات محمد قلی قطب شاہ، ارشاد نامہ (جانم) سکھ سہیلا، ابراہیم نامہ اور تاج الحقائق کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تحقیق تنقید اور تخلیق کے شعبوں میں قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید سابق صدر شعبہ اردو ایس وی یونیورسٹی تروپتی نے ڈاکٹر زور اور آصف جاہی دور کے ادب پر مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر جاوید نے کہا کہ ڈاکٹر زور نے عہد آصفی کے ادب اور کلچر کو روشن کرنے میں اپنی غیر معمولی علمی بصیرت و بصارت کو کام میں لاتے ہوئے حیدرآبادی شعراء احمد حسین مائل، عزیز یار جنگ، کیفی حیدرآبادی، شمس الدین فیض اور جوگی بہاری لال رمز جیسے بلند پایہ شعرا کو متعارف کروایا۔ اس کے علاوہ مرقع سخن کی تین جلدوں میں عہد عثمانی کی ربع صدی کی تاریخ کو محفوظ کر دیا ہے یہ وہ کارنامہ ہے جسے ہمارا ادب کبھی فراموش نہ کر سکے گا جناب مصطفیٰ شروانی نے بھی مخاطب کیا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر زور کی صاحبزادی محترمہ تہذیب یحییٰ فاروقی کی تہنیتی نظم ان کے بھائی جناب سید رفیع الدین قادری نے سنائی۔ محترمہ تہذیب نے اپنی نظم میں ڈاکٹر زور کو خراج عقیدت ادا کیا۔ پروفیسر جعفر نظام نے صدارتی تقریر میں یوم زور کے اس ادبی اجلاس کے تمام مقالوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ فاضل مقالہ نویس حضرات نے ڈاکٹر زور کی تحقیقی، تخلیقی اور علمی گوشوں کا نہایت بسوط انداز میں احاطہ کر کے زور شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ پروفیسر جعفر نظام نے کہا کہ ادارے کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" میں یہ مقالے شائع کیے جائیں گے۔ جناب منظور احمد کنوینر یوم زور نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے یوم زور کی کاروائی ریکارڈ کی۔

٥٥٥ ایوان اردو میں جناب شمس الرحمن فاروقی کا لکچر

مامور نقاد اور دانشور جناب شمس الرحمان فاروقی نے ۶ / نومبر کی شام ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام "ایوان اردو" میں منعقدہ خیر مقدمی ادبی اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے داستانی ادب اور طلسم ہوش ربا کے بارے میں عالمانہ اور بصیرت افروز لکچر دیا۔ اور کہا کہ اس طویل اور شاہکار داستان کی ۴۶ دستیاب جلدوں میں ہماری تہذیب، تاریخ اور کلچر کے گراں بہا خزانے چھپے ہیں جو ہمارا شاندار تہذیبی ورثہ

ہے ۔ جناب فاروقی نے کہا کہ انھوں نے گیارہ سال کی محنت اور تلاش کے بعد طلسم ہوش ربا کی تمام جلدیں مہیا کیں ۔ ان داستانوں کا مطالعہ
ری ہے اور میری تمنا ہے کہ فن داستان گوئی پر ایک بسوط کتاب لکھوں ۔ بظاہر یہ ایک فرد کا کام نہیں ہے ۔ ان شاہکار داستانوں پر
معات میں ڈگری سطح پر کام کیا جانا چاہیے جناب شمس الرحمان فاروقی نے کہا کہ ان داستانوں کو محفوظ کیا جانا ازحد ضروری ہے ۔ اردو کی
عیاری ادبی نثر کے وافر نمونے ہمیں ان داستانوں میں ملتے ہیں ۔ اس لیے ان داستانوں سے تلاش و جستجو کے بعد نامانوس الفاظ کی فرہنگ بھی
تیب دینی چاہیے ۔ ناول اور داستان کے فرق کا ذکر کرتے ہوئے جناب فاروقی نے کہا کہ دونوں میں باہمی ربط اور تعلق تو نہیں ملتا ۔
ستانیں ویسے تحریری شکل میں ملتی ہیں ۔ اصل میں یہ زبانی سننے اور سنانے کی چیزیں ہیں ۔ انیسویں صدی عیسوی میں اردو داستان گوئی کا آغاز
اور طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ ایسی داستانوی کتابیں جو کیفیت و کمیت میں شاہکار تخلیقات کا درجہ رکھتی ہیں آج کے مشینی اور
سروف زمانے میں نایاب ہو گئی ہیں ۔ حالاں کہ ان داستانوں میں سماج اور تہذیب کا لازوال خزانہ پنہاں ہے ۔ جناب فاروقی نے کہا کہ نئی
ل کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے قدیم اور کلاسیکی سرمایہ ادب کا مطالعہ کریں ، مغربی علوم کی تحصیل کے ساتھ مشرقی تہذیب و تمدن سے واقفیت
ہرنو کے قلمکاروں کے لیے ضروری ہے ۔ مغربی اقوام نے ہمیشہ مشرقی اقدار اور روایات کا استحصال کیا ہے ۔ ابتداً پروفیسر مغنی تبسم معتمد
ومی ادارہ ادبیات اردو کے " ایوان اردو " میں جناب فاروقی کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی دانشورانہ شخصیت اور تجربہ علمی کو خراج
سین پیش کیا اور کہا کہ جناب شمس الرحمان فاروقی برصغیر ہند و پاک کے مانے ہوئے نقاد ہیں ۔ انھوں نے عصری ادب کو نقد و نظر کی نئی راہ
رسے آشنا کیا ہے ۔ اگرچہ کہ وہ اپنے تنقیدی نظریات میں شدت پسند اور کبھی کبھی انتہا پسندی سے کام لیتے ہیں ۔ پروفیسر مغنی تبسم نے
اب فاروقی کو ڈاکٹر زور کی طرح معروف اور تیز رفتار قلمکار کا نام دیا اور کہا کہ فاروقی صاحب کی تنقیدی کتابیں اس کی شاہد ہیں ۔ پروفیسر
غنی تبسم نے بھی کہا کہ جناب فاروقی نقاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں لیکن وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی ہیں ۔ اس خوشگوار ادبی اجلاس کی
مدارت صدر ادارہ پروفیسر جعفر نظام نے کی ۔ اس موقع پر ایوان اردو کا وسیع و عریض آڈیٹوریم باذوق ادبی اسکالرز ، جامعات کے اساتذہ ترقی
سند ، جدید اور کلاسیکی قدروں کے حامل اصحاب دانش سے روشن تھا ۔ جناب شمس الرحمان فاروقی نے مختلف ادبی نکات اور فن داستان گوئی
، جزئیات پر مشتمل سوالات کا تشفی بخش جواب دیا ۔ مسز مظہری مہدی ، راشد آذر ، قدیر زماں ، ڈاکٹر علی الدین انصاری اور ریاست علی تاج
نے سوالات اٹھائے اور تشفی چاہی آخر میں جناب شمس الرحمان فاروقی نے اپنے کلام سے نوازا ۔ پروفیسر جعفر نظام صاحب نے صدارتی خطاب
تے ہوئے جناب فاروقی کے فکر و فن کی تحسین کی اردو میں داستان گوئی کے فن پر ان کی بصیرت افروز خطبے کی ستائش کی ۔ ابتداء میں جناب
س الرحمان فاروقی نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا اور گرانقدر مخطوطات اور مطبوعات نیز اردو میوزیم کے آراستہ ذخیرہ
ذیب کی ترتیب پر اظہار اطمنان کرتے ہوئے ڈاکٹر زور بانی ادارہ اور کارکنان ادارہ کی ستائش کی ۔

ooo محترمہ تہنیت النساء بیگم (بیگم زور) کا جلسہ تعزیت

محترمہ تہنیت النساء صاحبہ بیگم زور مرحوم کا جلسہ تعزیت ۱۵ / نومبر ۱۹۹۶ء گیارہ بجے دن " ایوان اردو " میں منعقد ہوا ۔ الحاج مرزا
لور بیگ صاحب نے جلسے کی صدارت کی ۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے بتایا کہ زور صاحب کے خاندان سے ان کے خاندان کے دیرینہ مراسم
ہے ۔ ڈاکٹر زور نے ان کی تربیت عزیزوں کی طرح کی ۔ زور صاحبہ ایک صوفی گھرانے کے چشم و چراغ تھے ، محترمہ بیگم زور صاحبہ رفعت
رجنگ ثانی کی صاحبہ زادی تھیں ۔ رفعت یار جنگ نے جاگیردارانہ ماحول سے ہٹ کر تہذیب کو نیا رخ دیا اور قدیم اور جدید روایات میں

امتزاج پیدا کیا۔ محترمہ بیگم زور کو بھی روایت ورثے میں ملی تھیں۔ ڈاکٹر زور نے جو علمی ادبی کارنامے انجام دیے، ان میں ان کی شریکِ حیات کے تعاون کو بڑا دخل رہا۔ محترمہ تہنیت النساء صاحبہ نے ڈاکٹر زور کو علمی کاموں کے لیے گھریلو امور سے بے نیاز کر دیا۔ ایوانِ اردو کی تعمیر کے لیے حکومت نے ادارے کو پچاس ہزار کی گرانٹ منظور کی تھی۔ عمارت کی تعمیر کے لیے زمین خریدنے کے لیے رقم موجود نہ تھی اور اندیشہ تھا کہ حکومت گرانٹ واپس لے لے گی۔ اس نازک مرحلے پر بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر زور کے اضطراب کو محسوس کیا اور فراخ دلی کے ساتھ اپنی قیمتی زمین بطور عطیہ ادارے کو دے دی۔

ڈاکٹر غیاث صدیقی نے اپنے مضمون میں پروفیسر زور کے علمی و ادبی کاموں پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں انھوں نے بیگم زور کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ بیگم زور اعلیٰ پائے کی شاعرہ تھیں انھوں نے حبِ نبیؐ میں ڈوب کر جو کچھ اردو والوں کے لیے پیش کیا وہ نہ صرف بیش قیمت اثاثہ ہے بلکہ نئی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی نے تہنیت النساء بیگم صاحبہ کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوے ان کے کلام کا نمونہ پیش کیے۔

ڈاکٹر زیب حیدر نے بھی محترمہ تہنیت النساء بیگم کی شاعری پر مقالہ پڑھا جس میں ان کے کلام کے تینوں مجموعوں صبر و شکر، ذکر و فکر اور تسلیم و رضا کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا تھا۔

ڈاکٹر زور کے فرزند جناب سید رفیع الدین قادری نے اپنی والدہ مرحومہ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوے "طوطیِ دکن محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور" کے عنوان سے اپنا مضمون سنایا انھوں نے بتایا کہ مرحومہ اس رفیع الشان خاندان کی دخترِ نیک اختر تھیں جس کے اکثر و بیشتر افراد عالم و فاضل تھے اور گراں قدر خدمات انجام دے کر موردِ الطاف و انعاماتِ شاہان ہوتے رہے۔ ان کا ددھیالی سلسلہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے دادا نواب رفعت یار جنگ اول ایک روشن خیال مدبر تھے۔ مدرسہ نظامیہ، مدرسہ اعزہ، نظام کلب اور سیول سروس کلاسس کا قیام آپ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے چچا سر نظامت جنگ انگریزی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کی دو پھوپھیاں خیر النساء بیگم خیر اور زینت النساء بیگم ساجدہ دردمند نعت گو شاعرات تھیں۔ آپ کی والدہ اسما بیگم صاحبہ نہایت متقی، پرہیزگار عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔ میری والدہ نے محبوبیہ گرلز ہائی اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ بڑی ذہین اور صاحب قلم تھیں۔ حافظہ غیر معمولی تھا۔ مطالعے کا شوق تھا۔ آپ کا صبر و ضبط مثالی تھا۔ ہمارے والد ڈاکٹر زور کا انتقال ہوا تو نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اس صدمے کو برداشت کیا اور ہم کو سہارا دیا۔ انھیں اپنے خاندان کی عزت و حشمت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ نادار طلبا اور بیواؤں کی مدد کرتیں۔ ان کی ممتا نہایت شفقت بھری تھی۔ اب ہم ہمیشہ کے لیے ان کی دعاؤں اور برکتوں سے محروم ہو گئے ہیں۔

جناب رمن راج سکسینہ صاحب نائب صدر ادارہ ادبیاتِ اردو نے اپنے مضمون میں محترمہ تہنیت النساء بیگم زور کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوے بتایا کہ ڈاکٹر زور کے علمی، ادبی اور دکنیات سے متعلق تحقیقاتی کاموں میں بیگم صاحبہ زور کا خاص حصہ رہا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر زور گھریلو مسائل، بچوں کی تعلیمی ضرورتوں اور دیگر امور سے بے نیاز رکھا۔ ڈاکٹر زور کی خواہش پر انھوں نے اپنی قیمتی زمین ادارے کو بطور عطیہ عنایت فرمائی۔ بیگم زور ایک اچھی ادیب اور اعلیٰ مرتبت شاعرہ تھیں۔ ان میں وہ تمام خصوصیات تھیں جو حیدرآباد کے بڑے گھرانوں کی بیگمات میں ہوا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر زور صاحب سے میرے چچا ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ الہام کے قریبی تعلقات تھے۔ اس تعلق کی بنا پر ڈاکٹر زور میرے چھوٹے چچا پروفیسر مہندر راج سکسینہ اور مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ محترمہ بیگم زور اسی خلوص اور شفقت کو برقرار رکھتی تھیں۔ بیگم صاحبہ زور کے انتقال سے نہ صرف ادارہ ادبیاتِ اردو اپنے سرپرست اعلیٰ سے محروم ہو گیا بلکہ یہ علاقہ، حیدرآباد تہذیب

وشرافت کی اس عظیم شخصیت سے محروم ہو گیا جس کی تلافی ناممکن ہے۔

صدرِ جلسہ الحاج مرزا شکور بیگ صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ ڈاکٹر زور مرحوم کے والد اور میرے والد میں بڑی دوستی تھی۔ ایک بار زور صاحب کے والد نے میرے والد سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا شاعر ہو۔ میرے ذہن میں دو تخلص ہیں مجاہد اور غازی۔ میرے والد نے کہا زعم کا بیٹا زور ہی اچھا ہو سکتا ہے اس طرح یہ تخلص مشہور ہوا۔ ڈاکٹر زور کا دینی اور فقیرانہ گھرانا تھا۔ ان کی شادی ایک رئیس گھرانے میں ہوئی۔ اس خاندان میں بھی مذہبیت تھی اس طرح قرآن السعدین ہوا۔ دونوں طرف اسلامی تعلیم کی برابری قائم تھی۔ اگر بیگم صاحبہ نہ ہوتیں تو ڈاکٹر زور کے لیے ناممکن تھا کہ وہ اتنے کارنامے انجام دیتے۔ زور صاحب کے انتقال کے بعد بیگم صاحبہ نے ہمت سے کام لیا اور بچوں کو اچھی تربیت دی۔ بچوں کو جب دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت نصیب کرے اور اولاد کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

آخر میں پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارۂ ادبیاتِ اردو نے مخاطب کیا اور کہا کہ محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ ادارے کی سرگرمیوں سے باخبر رہتی تھیں اور وقتاً فوقتاً مفید مشوروں سے نوازتی تھیں۔ جب ہاشم علی اختر صاحب جب ادارے کے صدر تھے، ادارے کی مجلس انتظامی نے بیگم زور صاحبہ اور پروفیسر مہندر راج سکسینہ صاحب کو ان کی ادارے سے دیرینہ وابستگی اور بے مثال خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سرپرستِ ادارہ بنایا تھا۔ بیگم زور صاحبہ کی وفات سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ماں کی شفقت سے محروم ہو گئے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم نے محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ کے سانحۂ ارتحال پر حسبِ ذیل قرار دادِ تعزیت پیش کی، جسے منظور کیا گیا اور دو منٹ کی خاموشی کے بعد جلسہ اختتام کو پہنچا۔ جناب منظور احمد نے جلسے کی کارروائی انجام دی۔

○○○ **قرارداد تعزیت** ادارۂ ادبیاتِ اردو کا یہ اجلاس محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ (بیگم زور صاحبہ) کے سانحۂ ارتحال پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ مرحومہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانیِ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی نہ صرف رفیقِ حیات تھیں بلکہ رفیقِ کار بھی تھیں۔ ادارۂ ادبیات کو ترقی دینے اور اس کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں بیگم زور کا اہم حصہ رہا ہے۔ اس کی ایک زندہ مثال ایوانِ اردو کی یہ شاندار عمارت ہے۔ ایوانِ اردو کی تعمیر ممکن نہ ہوتی اگر بیگم زور اس کے لیے زمین کا عطیہ نہ دیتیں۔

محترمہ ایک اعلیٰ گھرانے کی چشم و چراغ تھیں، وہ نواب رفعت یار جنگ کی تیسری صاحب زادی تھیں۔ ان کا ننھیالی سلسلہ نواب نصیر جنگ اول کے واسطے سے مولانا عبدالباری فرنگی محل سے ملتا ہے۔

محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ کی ابتدائی تعلیم محبوبیہ گرلز اسکول میں ہوئی تھی جہاں سے انھوں نے سینیئر کیمبرج کیا۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ اردو ادب سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ وہ ایک بلند پایہ شاعرہ تھیں اور تہنیت تخلص کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو نعت و منقبت کے لیے مختص کر دیا تھا۔ ان کے نعتیہ اور منقبتی کلام کے تین مجموعے ذکر و فکر، صبر و شکر اور تسلیم و رضا شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ان مجموعوں پر ملک کے معیاری جرائد نے تبصرے شائع کیے اور خراجِ تحسین پیش کیا۔ نقادوں اور دانشوروں نے بھی ان کے کلام کو سراہا۔

محترمہ تہنیت بیگم صاحبہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی سرپرست تھیں وہ ادارے کے امور سے گہری دلچسپی رکھتی تھیں۔ اور وقتاً فوقتاً اپنے مشوروں سے ہماری رہنمائی کرتی تھیں۔ بیگم زور کے رحلت کر جانے سے ان کا شفیق سایہ ہمارے سر سے اٹھ گیا ہے۔ اس کے لیے ہم جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ ہم مرحومہ کے فرزندوں، صاحب زادیوں اور دیگر لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ آج کا یہ اجلاس مرحومہ کو

خراجِ عقیدت کرتے ہوئے اللہ سے دعاگو ہے کہ وہ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا کریں۔

اردو ریفریشر کورس کے شرکاء کا ایوانِ اردو میں خیر مقدم

○○○ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے ریفریشر کورس میں شریک ہونے والے مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ کا ۲۰ / نومبر ۱۹۹۶ء کو ۶ بجے شام ایوانِ اردو میں خیر مقدم کیا گیا۔ اساتذہ صاحبان نے ادارہ ادبیاتِ اردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا اور ادارے کے اردو میوزیم، شعبہ کتب خانہ، شعبہ "سب رس"، شعبہ خطاطی اور شعبہ امتحانات کے تعلق سے معلومات حاصل کی۔ پروفیسر مغنی تبسم معتمدِ عمومی ادارہ نے مہمانوں کو ادارے کے تمام شعبوں سے متعارف کرایا اور ادارے کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ بعد میں معائنہ ایوانِ اردو میں ایک محفلِ شعر منعقد ہوئی۔ جناب غلام جیلانی رکنِ مجلسِ انتظامی ادارہ نے اس محفلِ شعر کی صدارت کی۔ مہمان شعراء جناب قاسم امام (بمبئی)، ڈاکٹر منظور احمد انعامدار (بیجاپور)، ڈاکٹر ریاست حسین فاروقی (اودے پور) اور ضمیر احمد ضمیر کرناٹک کے علاوہ میزبان شعراء پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر اشرف رفیع، جناب مضطر مجاز، جناب وقار خلیل، جناب رئیس اختر، جناب ستار صدیقی، ڈاکٹر صبیحہ نسرین، جناب مظہر مہدی اور جناب نصرت محی الدین نے کلام سنایا۔ جناب وقار خلیل نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر ایوانِ اردو میں مہمان لکچرر محترمہ یاسمین جہاں (کرناٹک)، محترمہ وزیرہ بیگم (میسور) امتیاز بیگم (بلاری)، سیدہ عقیلہ غوث پیڑ، اقبال احمد (چترادرگ)، صابر حسین (ہزاری باغ بہار)، ڈاکٹر جلیل اشرف (بہار)، پیرزادہ فہیم الدین (کرناٹک) محمد ثناء اللہ شریف (کرناٹک) ڈاکٹر محمد حمید اللہ (بہار) سید دستگیر پاشاہ (بیجاپور) اور ڈاکٹر عبد المناف (بنگلور) کے علاوہ محترمہ فاطمہ عالم علی خان، ڈاکٹر بیگ احساس، ڈاکٹر مصطفیٰ علی فاطمی اور جناب اسامہ فاروقی موجود تھے۔

جناب خواجہ محمد سرور مرحوم کا تعزیتی جلسہ

○○○ ادارہ ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام ۲ / ڈسمبر کو ۱۱ بجے دن ایوانِ اردو میں جناب خواجہ محمد سرور حسین لائبریرین ادارہ کے سانحہ ارتحال پر جلسہ تعزیت جناب سید شاہ تقی الدین قادری (فرزند ڈاکٹر زور) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ممتاز ادیب و شاعر جناب ذکی شاداب نے سرور مرحوم کی علمی و ادبی صلاحیتوں پر اظہارِ خیال کیا۔ جناب وقار خلیل نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے خواجہ محمد سرور صاحب کی ۱۵ سالہ خدمات پر روشنی ڈالی جو بحیثیت لائبریرین مرحوم نے ادارے میں انجام دیں اور کہا کہ وہ بڑے فرض شناس تھے۔ اسکالرس کی مقدور بھر اعانت اور متعلقہ کتابوں کی فراہمی میں ش باوجود پیرانہ سالی پیش پیش رہے۔ فارسی زبان پر انھیں مہارت حاصل تھی اور اکثر اسکالرس سرور صاحب سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ پروفیسر مغنی تبسم معتمد ادارہ ادبیاتِ اردو نے خواجہ محمد سرور مرحوم کو نیک انسان اور بہ پابندی وقت شعبہ کتب خانہ ادارہ کے فرائض بحسن و خوبی انجام دینے والے فرد کا نام دیا اور کہا کہ مرحوم نے بہ وجہ پیرانہ سالی وظیفے پر سبکدوشی کی خواہش کی تھی مگر ادارے نے ان کی دیرینہ خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں کام کرتے رہنے کا مشورہ دیا تھا اور وہ تادمِ آخر ادارے کے کارگزار کارکن رہے اور اپنی علمیت اور مخطوطہ شناسی کے ہنر سے اسکالرس کی رہنمائی کرتے رہے۔ سرور مرحوم نے قطب شاہی عہد کی اہم فارسی کتاب "حدیقۃ السلاطین" کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا۔ ایسے شریف النفس فرد کی وفات رنج و ملال کا باعث ہے۔ کرسیِ صدارت سے قرار دادِ تعزیت پیش کی گئی جسے دو منٹ کی خاموشی اور دعا کے بعد منظور کیا گیا۔ جناب وقار خلیل نے جلسے کی کاروائی انجام دی۔

۔ تعزیت جناب محمد عبدالرشید مرحوم

000 ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ۵ / ڈسمبر کو ۱۱ بجے ایوان اردو میں کتب خانہ ادارہ کے اسسٹنٹ لائبریرین جناب محمد
الرشید کے سانحہ ارتحال پر جلسہ تعزیت ڈاکٹر مصطفیٰ علی فاطمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ نے رشید
م کی ادارے سے پانچ سالہ وابستگی اور شعبہ کتب خانہ میں ان کی مخلصانہ خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا اور کہا کہ ادارے نے جو بھی ذمہ
ی ان کے تفویض کی مرحوم نے خوش اسلوبی کے ساتھ اسے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ ممتاز شاعر جناب رحمان جامی اور رشید مرحوم کے صاحب
ے ممتاز موسیقار عبدالرب عارف نے بھی مخاطب کیا۔ سینیئر کارکن ادارہ جناب وقار خلیل نے بھی اپنے شریک کار کی وفات پر اظہار
ت کرتے ہوئے انھیں ادارے کا ایک بے لوث اور مخلص کارکن قرار دیا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر فاطمی نے کتب خانے کی فہرست سازی اور
لرز کی رہنمائی میں رشید مرحوم کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انھیں خراج ادا کیا۔ قرار داد تعزیت منظور کی گئی اور دو منٹ کی خاموشی اور
ئے مغفرت کے بعد جلسہ اختتام کو پہنچا۔ وقار خلیل نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

رے کا معائنہ

000 ستمبر اکتوبر اور نومبر / ۱۹۹۶ء میں حسب ذیل اصحاب نے ادارہ ادبیات اردو کا معائنہ کیا اور اپنے گراں قدر تاثرات قلم
کیے۔

محترمہ تہذیب زور یحییٰ فاروقی صاحبہ، محترمہ نور جہاں ثروت صاحبہ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، جناب شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر
لستار دلوی، پروفیسر ابوالفضل سید احمد، مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ: جناب یحییٰ نشیط، جناب قاسم امام، محترمہ
مین جہاں محترمہ وزیرہ بیگم بخاری، ڈاکٹر عبدالمناف، جناب فہیم الدین پیرزادہ، ڈاکٹر محمد عبداللہ، جناب جلال الدین، محترمہ سیدہ عقیلہ
ث، جناب بی اقبال احمد، محترمہ یاسمین جہاں، محترمہ وسیمہ بیگم، محترمہ امتیاز بیگم بخاری، ڈاکٹر ضمیر احمد ضمیر، جناب محمد صابر حسین،
ب محمد ثناء اللہ شریف، جناب سید دستگیر پاشا، جناب ریاست حسین فاروقی، ڈاکٹر منظور احمد۔

تاثرات

000 **محترمہ تہذیب زور یحییٰ فاروقی (کراچی)** ۳۵ سال بعد ایوان اردو میں شعبہ خواتین کی
ت پر آنے کا شرف حاصل ہوا اور ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب اور ان کے زیر نگرانی کام کرنے والے تمام افراد کی محنت و خلوص اور اردو دلچسپی
بہت متاثر ہوئی۔

ایوان اردو کے کتب خانے اور قدیم دستاویزات اور مخطوطات اور نایاب کتب کی حفاظت وغیرہ پر جو کام کیا جارہا ہے۔ اس سے بے
خوشی اور تسلی ہوئی یہ ان مول سرمایہ ہے جس کے یہ اصحاب نگراں ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مزید ہمت و حوصلہ اور خلوص و
عطا فرمائے کہ اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہیں..... آمین (۱۵ / ستمبر ۱۹۹۶ء)

000 **محترمہ نور جہاں ثروت (دہلی)** ادارہ ادبیات اردو میں اردو سے محبت کرنے والوں اور اس کے
بل کو سنوارنے والوں کی روح بسی ہوئی ہے۔ یہاں پہنچ کر یقین کامل ہو جاتا ہے کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج کو کوئی روک نہیں سکتا

اس ادارے کا ماضی اپنے حال میں زندہ ہے۔ یہاں قائم شعبہ جات اور ان میں کام کرنے والوں کی لگن دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ میوزیم اور اس کے نوادر جس سلیقے اور احتیاط سے رکھے گئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر میں ادارہ ادبیات اردو میں نہ آتی تو زندگی اکارت ہونے کا احساس ہوتا۔ خدا اس ادارے کو قائم و دائم رکھے۔ (۳۱/اکتوبر ۱۹۹۶ء)

000 **ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط (مہاراشٹرا)** ادارہ ادبیات اردو میں رکھی تاریخی اشیاء اور کتب خانے بیش بہا ذخیرہ دیکھ کر ماضی نظروں کے سامنے آگیا۔ اللہ اللہ کیا قربانیاں تھیں ہمارے اسلاف کی کتنی محنت سے جمع کیا یہ سرمایہ۔ اللہ ا محنت کرنے کی ہمیں بھی توفیق نصیب فرمائے اور اردو کے اس گراں قدر خزانے کو استعمال کرنے کا شعور ہمیں نصیب کرے آمین ثمہ آمین...... (۴/نومبر ۱۹۹۶ء)

000 **جناب شمس الرحمن فاروقی (الہ آباد)** ادارہ ادبیات اردو میں ایک بار اور حاضری کی سعادت ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ گزشتہ چند برسوں میں جناب مغنی تبسم کی سربراہی اور ان کے ہم کاروں کی کوشش کے نتیجے میں ادارے کی حالت بہت بہتر ہوئی ہے۔ تصاویر، وصلیوں اور دستاویزوں کی نمائش کا انتظام پہلے سے بہتر ہے اور ان کی تعداد بھی گذشتہ سے زیادہ ہے اور ان میں بعض تو ایسی ہیں کہ وہ دنیا میں کہیں اور نہ ملیں گی۔ کتابوں اور مخطوطات کا بھی انتظام و انصرام پہلے سے خوب تر ہے علاوہ برایں اردو زبان کی ترویج اور فروغ کے لیے ادارے نے بہت سے نئے کام شروع کردیے ہیں اور انھیں بہ حسن و خوبی انجام دیا جارہا۔ کاش اس ادارے کو خاطر خواہ مالی اعانت مل سکے تاکہ اس کی گراں بہا دستاویزیں، کتابیں اور مخطوطات زیادہ محفوظ ہوسکیں اور مائیکرو فلم وغیرہ کے ذریعے وہ دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل سکیں........ (۶/نومبر ۱۹۹۶ء)

000 **اجتماعی تاثرات اساتذہ صاحبان (جامعات ہند)** ایوان اردو کی سیر نے ہم سب کا دل باغ باغ کردیا۔ یہ ایک تہذیبی خزانہ ہے جس کی حفاظت ہم سب پر لازم ہے۔ ہمیرے ساتھ آئے تمام لکچررس کے لیے یہ شام کئی اعتبارات سے یادگار رہی۔ یہاں صرف ماضی کی عظمتیں ہی نہیں، حال کا سحر بھی ہے۔ حیدرآباد کے منفرد شعرائے کرام کی موجودگی نے ادارے کی اس محفل کو باوقار بنایا ہے۔ یہ مرکز حیدرآباد کی تہذیب و تمدن کا مرکز بھی ہے۔ جس پر آنے والی نسلیں ہمیشہ فخر کریں گی........ (۲۰/نومبر ۱۹۹۶ء)

00 جناب قاسم امام لکچرار شعبہ اردو برہانی کالج ممبئی۔ o جناب فہیم الدین پیرزادہ لکچرار باسپیٹ (کرناٹک)۔ o ڈاکٹر محمد عبداللہ (بہار)۔ o جناب جلال الدین ونوبھا بھادے یونیورسٹی ہزاری باغ (بہار)۔ o محترمہ عقیلہ غوث۔ o جناب ڈی اقبال احمد (چتر ادرگ کرناٹک)۔ o محترمہ یاسمین جہاں (ٹمکور کرناٹک)۔ o محترمہ وسیم بیگم مہارانی آرٹس کالج میسور۔ o محترمہ امتیاز بیگم بخاری (بنگلور)۔ o ڈاکٹر ضمیر احمد ضمیر، ڈاکٹر عبدالمناف (بنگلور)۔ o جناب محمد صابر حسین ہزاری باغ (بہار)۔ o جناب محمد ثناء اللہ شریف (بہار)۔ o جناب سید دستگیر پاشاہ انجمن ڈگری کالج (بیجاپور)۔ o جناب ریاست حسین فاروقی (اودے پور)۔ o جناب ڈاکٹر منظور احمد انعامدار (انجمن کالج بیجاپور)۔

000 **پروفیسر عبدالستار دلوی** صدر شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی و صدر مہاراشٹر اردو اکیڈمی۔ ادارہ ادبیات اردو نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوپاک کے نامور اردو اداروں میں سے ایک ہے۔ اس ادارے کے بانی پروفیسر زور جو اردو کے ممتاز محقق اور عالم تھے، انھوں نے اپنی علمی و ادبی مصروفیت کے ساتھ اردو کے تعلق سے انتظامی اور تعمیری امور سے گہری دلچسپی لی اور یہ شان دار ادارہ

قائم کیا جو تشنگانِ علم کے لیے تحقیقی بنیادی مواد فراہم کرتا ہے ۔ اس کے نادر مخطوطات، اس کی توضیحی فہرستیں، نایاب مطبوعات، نوادرات اہم وغیرہ ہیں اور نئے انتظامیہ کے تحت پروفیسر مغنی تبسم کی زیرِ نگرانی نہایت سلیقے سے محفوظ کیے گیے ہیں ۔ "سب رس" اس ادارے کا ہی نہیں بلکہ اردو کے ادبی رسائل اور بطورِ خاص دکنی اردو کے حوالے سے اردو میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے معیار میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے ۔ اس ادارے کے اربابِ حل و عقد اپنی اس گراں قدر اردو خدمات کے لیے لائقِ صد مبارک باد ہیں...... (۲۴ / نومبر ۱۹۹۶ء

000 **پروفیسر ابوالفضل سید احمد** رکن مجلس عاملہ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ (کراچی) ۔ پیارا شہر حیدرآباد دکن، پیارا القدیم ادارہ ادبیات اردو، پیارے کارکن، جان و دل سے اردو کی خدمت میں لگے ہوئے، بے حساب محبتوں سے مجھے نوازا، میں بھلا ان کا کون ہوتا ہوں، سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا، ان سب کی محبتوں نے میرا اور میری بیگم کا دل جیت لیا ۔ یہی محبتیں ہمارے گلوں کا ہار ہیں ایوانِ اردو کے تفصیلی معاینے کے بعد ہم انتہائی خوش گوار یادیں لیے بوجھل دلوں سے اس پیاری جگہ سے رخصت ہو رہے ہیں..... (۲۶ / نومبر ۱۹۹۶ء)

---

00 000 00

(سلسلہ ص ۱۰)

اہمیت سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا ۔ ادبی اطراف و ابعاد سے قطعِ نظر ڈاکٹر زور کے خطوط اس اعتبار سے بھی نہایت اہم ہیں کہ ان میں وہ ایک ،، معاشرتی اور سماجی زندگی جیتے نظر آتی ہے ۔ یہ مکاتیب ایسا آئینہ ہیں جس میں زور صاحب ذمہ داریاں نبھاتے نظر آتے ہیں ۔ ان کے ذریعہ ان کے بطون، ذہنی و نفسیاتی کیفیت اور مختلف رویوں کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے ۔ اس کے علاوہ مختلف مسائل میں ان کے موقف کی تشخیص و توجیہہ میں بھی ان سے مدد مل سکتی ہے ۔

---

0 0 0

(سلسلہ ص ۲۱)

عثمانیہ یونیورسٹی کے U.G.C. Minor Project کے تحت اب میں دکنی کی جدید قواعد لکھ رہی ہوں ۔ یہ اسی قواعد کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے ۔ چھپ کر منظرِ عام پر آجائے تو میری محنت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر زور کے اس خواب کی تکمیل بھی ہو سکے گی جو وہ اس زبان کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے کے تعلق سے دیکھا کرتے ۔ دکنی زبان سے صحیح معنوں میں دلچسپی رکھنے والے دانش ور ڈاکٹر زور کے مشن کو آگے بڑھانے میں اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں ۔

(یومِ زور منعقدہ ۲۵ / ستمبر ۱۹۹۴ء میں پڑھا گیا ۔)

------- 0 0 0 -------

وقار خلیل

وفیات

000 **اسماعیل ظریف** حیدرآباد کے بزرگ اور قادر الکلام طنز ومزاح کے شاعر تھے، طویل علالت کے بعد ۵ / اکتوبر ۱۹۹۶ء کو رحلت کر گئے۔ زندہ دلان حیدرآباد اور ماہنامہ شگوفہ کے مستقل معاون قلم کار تھے۔ شعری محفلوں میں ان کی شرکت اور سخن وری زندگی اور زندہ دلی کی بہار دکھاتی تھی۔ عمر بھی کوئی ستر برس کے قریب ہوگی، وضع دار، ملنسار اور سنجیدہ طبع فرد تھے۔ ان شعری مجموعے کی اشاعت کی طرف زندہ دلان حیدرآباد اور ریاستی اردو اکیڈمی کو مل کر پہل کرنی چاہیے۔

000 **وجاہت سندیلوی** معروف مزاح نگار ادیب وجاہت سندیلوی ۱۱ / اکتوبر ۱۹۹۶ء کو سندیلہ اتر پردیش میں رحلت کر گئے۔ وہ یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ زمین دار گھرانے کے فرد تھے۔ بی۔ اے اور یل۔ یل۔ بی کی ڈگریاں لی تھیں، وکالت کرتے تھے۔ اردو میں بچوں کے لیے بھی لکھتے رہے۔ آٹھ مطبوعہ کتابوں میں دھوپ کی عینک اور رقص تماشائی مشہور ہیں۔

000 **رام لعل** اردو کے جہد ساز، معتبر اور نامور افسانہ نگار رام لعل بعارضہ کینسر ۷۵ برس کی عمر میں ۱۷ / اکتوبر ۱۹۹۶ء کو لکھنو میں انتقال کر گئے۔ اس طرح اردو افسانہ نگاری اور اردو کے لیے جد وجہد کا ایک دور ختم ہوا۔ آں جہانی رام لعل نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ادبی اور علمی خدمات انجام دیں۔ ۵۰۰ پانچ سو افسانے لکھے اور ۱۴ چودہ افسانوی مجموعے شائع کیے۔ وہ ایک نامور ناول نویس اور انشائیہ نگار بھی تھے۔ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی مہم کو مہمیز کرنے میں رام لعل کی خدمات اور شخصی اثرات کو بڑا دخل رہا ہے۔ وہ تقسیم ہند کے بعد لاہور سے ہجرت کر کے لکھنو میں بس گئے تھے اور یہیں ریلوے ڈپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کر لی تھی انسان دوست اور سیکولر اقدار کے نمائندہ فن کار تھے۔ ان ہی کی کوششوں سے لکھنو میں کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کی یادگار کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ پاکستان اور مغربی ممالک کے سفر ناموں پر مشتمل رام لعل جی کی کتاب "زرد پتوں کی بہار" کو اردو ادب کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ سینئر اردو افسانہ نویس حیات اللہ انصاری نے رام لعل کی وفات کو اردو کا ایک عظیم نقصان قرار دیا ہے جس سے ہم سب کو اتفاق ہے۔

000 **کالوجی رامیشور راؤ شاد** بزرگ اردو شاعر کالوجی رامیشور راؤ شاد ۱۱ / نومبر ۱۹۹۶ء کو ۸۹ سال کی عمر میں اپنے وطن ہمنکنڈہ ورنگل (آندھرا پردیش) میں بہ عارضہ السرا انتقال کر گئے۔ شاد، ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ سماجی قومی اور سیاسی خدمات کا ریکارڈ شاہد ہے کہ آنجہانی شاد، سیکولر روایات اور اردو دوستی کے لیے ضلع ورنگل میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک شعری مجموعہ شائع ہوا تھا۔ قدیم انداز سخن کے اس شاعر کی وصیت کے مطابق ان کا جسد خاکی کاکتیہ میڈیکل کالج ورنگل کے حوالے کیا گیا۔ شاد مرحوم کے بھائی پدماو بھوشن کالوجی نارائن راؤ تلگو کے ادیب ہیں اور اردو شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔

000 **خواجہ محمد سرور مرحوم** ادارہ ادبیات اردو کے لائبریرین خواجہ محمد سرور ولد خواجہ عبید اللہ (ولادت ۲ / جنوری ۱۹۱۵ء) مورخہ ۳۱ / نومبر ۱۹۹۶ء کو بہ حالت بیند علی الصبح انتقال کر گئے۔ سرور مرحوم گزشتہ پندرہ سال سے کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں کارگزار رہے۔ حیدرآباد کی تاریخ اور مخطوطات پر ان کی خاص نظر تھی۔ ایوان اردو آنے والے اسکالرس کی مقدور بھر رہنمائی میں وہ ہمیشہ مخلص اور مستعد رہے۔

سرور مرحوم شرفائے حیدرآباد کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان

بدرجہ اول کامیاب کیا تھا۔ پائیگاہ وقار الامراء میں بہ حیثیت پیروکار ملازم تھے اور ۳۲ سال تک کارگزار رہے۔ ۱۹۶۸ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد چند برسوں تک پیشہ وکالت سے وابستہ رہے اور پھر ادارے میں لائبریرین کے عہدے پر کام کرنے لگے۔ ۱۹۹۰ء میں مشہور قطب شاہی فارسی تاریخ "حدیقۃ السلاطین" کا اردو ترجمہ اپنے طور پر شائع کیا اور پھر ایک سال بعد ایک کتابچہ نادر شاہ کے حملوں کے بارے میں طبع کرایا۔ سرور مرحوم آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے حرفِ تابندہ کے زیر عنوان لکھتے رہے۔ وہ بے حد شریف النفس اور ستودہ صفات بزرگ تھے۔

○○○ **جناب محمد عبدالرشید** ادارہ ادبیاتِ اردو کے اسسٹنٹ لائبریرین ۳/ دسمبر ۱۹۹۶ء کو مختصر علالت کے بعد تقریباً ۶۵ سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔ رشید مرحوم گذشتہ پانچ سال سے کتب خانے سے منسلک تھے۔ انھوں نے کتابوں کے کیٹلاگنگ کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ ریسرچ اسکالرس کی خندہ پیشانی کے ساتھ مدد کرتے تھے۔ مرحوم اسم بامسمیٰ تھے جو کام بھی ان کے تفویض کیا جاتا رہا اسے پورے لگن توجہ اور محنت سے انجام دیا۔ بقول پروفیسر مغنی تبسم "رشید مرحوم ادارے کے مخلص اور بے لوث خدمت گزار تھے۔"

○ ○○○ ○



جلسہ تعزیت محترمہ تہنیت النساء بیگم مرحومہ (بیگم زورؔ) منعقدہ ۲۱ / نومبر ۱۹۹۶ء ۔ دائیں سے بائیں: پروفیسر مغنی تبسم، جناب محمد منظور احمد،
جناب رمن راج سکسینہ، جناب مرزا شکور بیگ صاحب اور جناب سید رفیع الدین قادری۔



یوم زورؔ (ادبی اجلاس منعقدہ ۲۹ / ستمبر ۱۹۹۶ء) دائیں سے بائیں، پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید،
پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر جعفر نظام اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔

The "S... ...rdu ...onthly
Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad - 500482 (A.P.)

سب رس کتاب گھر کی کتابیں

مٹی مٹی میرا دل	(شاعری)	پروفیسر مغنی تبسم	50 = 00
اگلے موسم کا انتظار	(شاعری)	اسلم عمادی	16 = 00
سخن	(شاعری)	وقار خلیل	30 = 00
برطانیہ کی سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ		حبیب حیدرآبادی	75 = 00
تنہائی	(شاعری)	صدیقہ شبنم	55 = 00
خاک انا	(شاعری)	راشد آزر	10 = 00
آب دیدہ	(شاعری)	راشد آزر	10 = 00
تیسرا مجسمہ	(افسانے)	عوض سعید	15 = 00
بے نام موسموں کا نوحہ	(افسانے)	عوض سعید	30 = 00
منزل شوق	(شاعری)	راشد آزر	25 = 00
خاکے	-	عوض سعید	30 = 00
کف گل فروش	(شاعری)	سعید شہیدی	50 = 00
میں کتھا سناتا ہوں	(افسانے)	عاتق شاہ	35 = 00
تحقیقی نقوش	(مضامین)	ڈاکٹر محمد علی اثر	75 = 00
حیدرآباد دکن کے اردو اخبارات	(تذکرہ)		50 = 00
مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے	(تحقیق)	ڈاکٹر شاذ تمکنت	50 = 00
خود رو	(شاعری)	بشارت علی بشارت	80 = 00
سونے چاندی کے بت	(افسانے)	خواجہ احمد عباس	35 = 00
کہانیاں	(منتخب افسانے)	وحید انور	125 = 00
صباحت زہرہ	(شاعری)	صبیحہ نسرین	70 = 00
ادھورا سفر	(افسانے)	قدیر زماں	60 = 00
آٹھواں سفر	(افسانے)	غلام جیلانی	50 = 00
مخدوم محی الدین	(روسی سے ترجمہ)	اسامہ فاروقی	100 = 00
لفظوں سے آگے	(مقالات)	پروفیسر مغنی تبسم	60 = 00
دھواں دھواں چراغ جاں	(شاعری)	علی الدین نوید	60 = 00
رقص تنہائی	(شاعری)	علی اصغر	50 = 00
حنظل	(افسانے)	ڈاکٹر بیگ احساس	60 = 00
شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے تحقیقی مقالات		نعیم الدین	40 = 00
گمان کا صحرا	(شاعری)	مصحف اقبال توصیفی	80 = 00
قریہ فکر	(شاعری)	اسلم عمادی	60 = 00
کربلا تا کربلا	(شاعری)	ڈاکٹر وحید اختر	120 = 00
بڑا آدمی	(ناول)	محسن علی	200 = 00
شام ڈھلے سویرا	(شاعری)	مصطفٰی شباب	65 = 00
آصف سابع میر عثمان علی خاں		طیبہ بیگم	125 = 00
جنوبی ہند میں رباعی گوئی	(تذکرہ)	صاحب حیدرآبادی	40 = 00
صبح و طریق وفا	(شاعری)	راشد آزر	16 = 00
جدید اردو افسانے میں عصری حسیت	(تنقید)	یاسمین فاطمہ	25 = 00
پس پردہ	(مضامین)	آغا حیدر حسین دہلوی	25 = 00
عبدالحق کے خطوط	(مضامین)	محمد اکبر الدین صدیقی	25 = 00
تاریخ یورپ عہد جدید	(تاریخ)	سید علی محسن	150 = 00
حیدرآباد کے ہندو راجہ	(تذکرہ)	بھاسکر راج سکسینہ	100 = 00
میں بھی افسانہ تم بھی کہانی		اقبال متین	37 = 00